فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ٥ الاية
وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ٥ الاية

نجم الفتاویٰ

جلد دوم

کتاب الطہارۃ والصلاۃ

طہارت اور نماز سے متعلق تقریباً سات سو سے زائد
اہم فتاویٰ جات کا مدلل ومفصل مجموعہ

تالیف

شیخ الحدیث مفتی سید نجم الحسن امروہوی دامت برکاتہم
مہتمم ورئیس دارالافتاء جامعہ دارالعلوم یاسین القرآن

جدید ترتیب وتبویب

مفتی وقار احمد
استاذ جامعہ دارالعلوم یاسین القرآن (نارتھ کراچی)

فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ الاية
وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝ الاية

نَجْمُ الْفَتَاوٰى

تالیف

شیخ الحدیث مفتی سیّد نجم الحسن امروهوی دامت برکاتهم
مہتمم ورئیس دارالافتاء جامعہ دارالعلوم یاسین القرآن

جلد دوم

کتاب الطهارة والصلاة

طہارت اور نماز سے متعلق تقریباً سات سو سے زائد
اہم فتاویٰ جات کا مدلل و مفصل مجموعہ

جدید ترتیب و تبویب
مفتی وقار احمد
استاذ جامعہ دارالعلوم یاسین القرآن (نارتھ کراچی)

کتاب کا نام	نجم الفتاویٰ (جلد دوم) ''کتاب الطهارة والصلوٰة''
مؤلف	حضرت شیخ الحدیث مفتی سیّد نجم الحسن امروہوی دامت برکاتہم
ترتیب وتبویب	مولانا مفتی وقار احمد صاحب (استاذ جامعہ دارالعلوم یاسین القرآن نارتھ کراچی)
کمپوزنگ، سیٹنگ	بھائی شکیل احمد صدیقی صاحب
سن اشاعت	۱۴۳۱ھ بمطابق ۲۰۱۰ء
مطبع	پرنٹ مارک 0321-3939101, 0321-9270048
ناشر	شعبہ نشر واشاعت دارالعلوم یاسین القرآن نارتھ کراچی

حاصل کرنے کیلئے رابطہ کیجئے

شعبۂ نشر واشاعت، جامعہ دارالعلوم یاسین القرآن نارتھ کراچی

0301-3452678 021-32064664021-38302662

مکتبہ المعارف، سلام کتب مارکیٹ بنوری ٹاؤن کراچی

0333-2833755

نیز ملک کے تمام مشہور کتب خانوں پر بھی دستیاب ہے

فہرست کتاب الطہارۃ

فصل فی الوضو

(وضو کے فرائض، واجبات، سنن، مستحبات، آداب ومکروہات کا بیان)

﴿فصل فی الغسل﴾

(غسل کے مسائل کا بیان)

فصل فی التیمم
(تیمّم کے مسائل کا بیان)

﴿فصل فی النجاسات واحکام التطہیر﴾

(نجاسات کے احکام اور پاکی کا طریقہ)

فصل فی احکام الماء
(پانی اور کنویں وغیرہ سے متعلق احکام کا بیان)

فصل فی احکام الجنب والمعذور

(جنبی اور معذور سے متعلق مسائل کا بیان)

فصل فی الحیض والنفاس

(حیض ونفاس سے متعلق مسائل کا بیان)

فصل فی المسح الخفین و الجبیرۃ

(موزوں اور پٹی وغیرہ پر مسح سے متعلق مسائل کا بیان)

﴿فصل فی المسائل الجدیدة و المتفرقة المتعلق بالطهارة﴾

(طہارت سے متعلق جدید اور متفرق مسائل کا بیان)

فہرست کتاب الصلوٰۃ

فصل فی المواقیت

(اوقات نماز سے متعلق مسائل کا بیان)

فصل فی الاذان

(اذان واقامت سے متعلق مسائل کا بیان)

فصل فی شروط الصلاۃ وارکانها و واجباتها وسننها و آدابها

(نماز کی شرائط، فرائض، ارکان، واجبات، سنن اور آداب کا بیان)

﴿فصل فی الامامة والجماعة﴾

(امامت اور جماعت سے متعلق مسائل کا بیان)

فصل فی المسبوق واللاحق

(مسبوق اور لاحق کے مسائل کا بیان)

﴿فصل فی القراءة﴾

(نماز میں قرأت اور پڑھنے والے کی غلطیوں سے متعلق مسائل کا بیان)

﴿فصل فیما یفسد الصلاۃ وما یکرہ فیہا﴾

(نماز کے مفسدات اور مکروہات کا بیان)

﴿فصل فی السنن والنوافل﴾

(سنن اور نفل نمازوں کا بیان)

فصل فی التراویح

(تراویح سے متعلق مسائل کا بیان)

فصل فی الوتر

(وتر سے متعلق مسائل)

فصل فی سجود السهو والتلاوة

(سجدۂ سہو اور سجدہ تلاوت کے مسائل کا بیان)

فصل فی المریض والمسافر

(مریض اور مسافر کی نماز کا بیان)

﴿فصل فی الجمعة والعیدین﴾

(جمعہ اور عیدین کی نمازوں کا بیان)

﴿باب فی تقدیر الاوزان الشرعیة بالمساحة الجدیدة﴾

(شرعی اوزان کی مقدار کا از سر نو تحقیق کے ساتھ بیان)

﴿فصل فی المسائل المتفرقة المتعلقة بالصلاة﴾

(نماز کے متفرق مسائل کا بیان)

﴿احکام المساجد﴾

﴿کتاب الجنائز والشهيد﴾

(نمازِ جنازہ، تجہیز و تکفین اور شہید سے متعلق مسائل کا بیان)

کتاب الطهارة

(طہارت کا بیان)

﴿فصل فی الوضوء﴾

(وضو کے فرائض، واجبات، سنن، مستحبات، آداب ومکروہات کا بیان)

(۱) مسواک کی مقدار اور برش کے استعمال کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسواک کرنا مسنون ہے، لیکن کیا ہر چھوٹی بڑی شاخ کے استعمال سے مسواک کی سنت ادا ہوجائے گی؟ یا اس کی لمبائی وموٹائی متعین ہے؟ اگر اس میں اس طرح کی تعیین ہو تو تفصیل سے بتلا دیں، اللہ تعالی آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... مسواک کی مقدار متعین ہے یعنی ایک بالشت لمبی اور ہاتھ کی چھوٹی انگلی کی موٹائی کے بقدر موٹی ہونی چاہیے، اسی طرح سب سے افضل مسواک پیلو کے درخت کی ہے اس کے بعد زیتون کے درخت کی۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر درخت کی شاخ کے علاوہ کوئی اور چیز استعمال کی جائے جیسے برش، کپڑا یا انگلی وغیرہ تو اس سے صفائی کی سنت تو ادا ہوجائے گی لیکن مسواک کی سنت ادا نہ ہوگی۔

لما فی الکبیری (ص۱۳۱-۳۲): ثم المستحب ان یکون السواک من شجرة مرة لزیادة ازالة تغیر الفم قالوا ویستاک بکل عود الا الرمان والقصب وافضله الاراک ثم الزیتون وان یکون طول شبر فی غلظ الخنصر......

وفی الهندیة (۱/۷): ومنها السواک وینبغی ان یکون السواک من اشجار مرة لانه یطیب نکهة الفم ویشد الاسنان ویقوی المعدة ولیکن رطبا فی غلظ الخنصر وطول الشبر ولا یقوم الاصبع مقام الخشبة فان لم توجد الخشبة فحینئذ یقوم الاصبع من یمینه مقام الخشبة.

وفی الدر المختار (۱/۱۱۴، ۱۱۵): (و) ندب امساکه (بیمناه) وکونه لینا مستویا بلاعقد فی غلظ الخنصر وطول شبر ......وعند فقده او فقد اسنانه تقوم الخرقة الخشنة او الاصبع مقامه کما یقوم العلک مقامه للمرأة مع القدرة علیه.

(۲) ٹوتھ برش سے مسواک کی سنت کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کے پاس مسواک نہ ہو اور اس کے پاس ٹوتھ برش ہو

تو کیا وہ مسواک کے قائم مقام ہوجاتا ہے اوراس سے مسواک کی سنت ادا ہوجاتی ہے ازراہِ کرم تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... مسواک کا استعمال سنت مؤکدہ ہے شرعی نقطہ نظر سے مسواک کا اطلاق اس لکڑی پر ہوتا ہے جس کو دانتوں کی صفائی کیلئے استعمال کیا جائے اور مستحب یہ ہے کہ مسواک کسی کڑوے درخت مثلاً زیتون، پیلو وغیرہ کی ہو، البتہ اگر مسواک دستیاب نہ ہوتو انگلی سے بھی یہ سنت ادا ہوسکتی ہے اور یہی حکم ٹوتھ پیسٹ کا بھی ہے البتہ مسواک شرعی میں دو مستقل سنتیں ہیں (۱) لکڑی کا استعمال (۲) انقاء (منہ کی صفائی) تو ٹوتھ برش کے استعمال سے صرف انقاء کی سنت ادا ہوجائے گی البتہ لکڑی کی سنت اس سے ادا نہیں ہوگی۔

لما في الهندية (۱/۷): (منها السواک) وينبغي ان يكون السواک من اشجار مرة لانه يطيب نكهة الفم ويشد الاسنان ويقوی المعدة وليكن رطبا في غلظ الخنصر وطول الشبرولا يقوم الاصبع مقام الخشبة فان لم توجد الخشبة فحينئذ يقوم الاصبع من يمينه مقام الخشبة.

وفي المغني (۱/۷۹): ويستحب ان يكون السواک عودا لينا ينقي الفم ولايجرحه ولايضره ولا يتفتت فيه كالاراک والعرجون ولايستاک بعود الرمان ولا الآس ولا الاعواد الذكية......
وان استاک باصبعه او خرقة فقد قيل لايصيب السنة لان الشرع لم يرد به ولا يحصل الانقاء به حصوله بالعود والصحيح انه يصيب بقدر مايحصل من الانقاء ولا يترک القليل من السنة للعجز عن كثيرها.

(۳) ٹوتھ برش یا انگلی کا مسواک کے قائمقام ہونے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے علماء سے سنا ہے کہ ٹوتھ برش سے مسواک کی سنت ادا نہیں ہوتی لیکن میں نے ایک کتاب میں پڑھا ہے کہ اگر کسی کے پاس مسواک نہ ہو تو وہ انگلی کو ہی دانتوں پر مل لے یہ مسواک کے قائم مقام ہوجائے گی۔ آیا یہ صحیح ہے؟ اگر صحیح ہے تو پھر ٹوتھ برش کو مسواک کے قائم مقام کیوں نہیں بنایا جاسکتا؟ حالانکہ اس سے دانتوں کی صفائی وغیرہ انگلی کے مقابلے میں بہرحال زیادہ اچھی ہوتی ہے؟ براہ کرم جواب آسان الفاظ میں لکھ کر عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... مسواک کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جوصورت ثابت ہے وہ یہی ہے کہ لکڑی سے مسواک کی جائے اور لکڑیوں میں بھی پیلو کے درخت کی لکڑی زیادہ پسندیدہ ہے لیکن اگر لکڑی کی مسواک اتفاقاً موجود نہ ہو، تو انگلی وغیرہ سے دانت صاف کرلینا مسواک کے قائم مقام ہوسکتا ہے اور برش کا اصل حکم بھی یہی ہے کہ اگر اتفاقاً مسواک موجود نہ ہوتو اس کا استعمال قائم مقام مسواک کے ہوجائے گا۔ اور لکڑی کی مسواک کی موجودگی میں انگلی اور برش وغیرہ مسواک کے قائم مقام نہیں بنیں گے۔

لمافي سنن النسائي (۱/۳): سمعت عائشةؓ عن النبي ﷺ قال السواک مطهرة للفم مرضاة للرب.

وفي كنز العمال (۹/۳۱۱): الاصابع تجري مجری السواک اذا لم يكن مسواک (ابو نعيم في كتاب السواک عن عمرو بن عوف المزني).

وفی اعلاء السنن(۱/۷۳): ثم اعلم ان الاصابع تقوم مقام السواک عند فقدانه...... الخ.

وفی الفقه علی المذاهب الاربعة(۱/۶۸): ومن السنن المؤکدة السواک ولا یشترط ان یکون من شجر الاراک المعروف بل الافضل ان یکون من اشجار مرة لانه یساعد علی تطییب الفم وله فوائد معروفة فهو یقوی اللثة...... فاذا لم یجد سواکاً فان. الفرشة. تقوم مقامه واذا لم یجدها استاک باصبعه ویقوم مقام السواک العلک. اللبان...... واذا کان لا یطیقه فانه یترکه للضرورة......

وفی المفصل فی احکام المرأة والبیت المسلم(۱/۵۴): یستحب أن یستاک المسلم او المسلمة بعود من اراک فان لم یوجد او وجده واستعمل شیئاً آخر غیره جاز ذالک بشرط ان یکون هذا الشیٔ تحصل به تنقیة فمه وتنظیف أسنانه کالخرقة الخشنة والاشنان وقیاساً علی هذا القول یجوز استعمال فرشة تنظیف الاسنان مع المعجون الخاص للتنظیف...... واذا لم یجد مایستاک به من عود السواک وغیره استعمل اصابعه فی استیاکه للحدیث الذی رواه البیهقی عن رسول الله ﷺ تجزی فی السواک الأصابع.

وفی الشامیة(۲/۱۶۸): (واستیاکه) لانه مندوب الیه فی سائر الصلوات اختیار، ومفاده ان المراد به الاستیاک عند القیام الی الصلوة فانه مستحب کما قدمناه فی سنن الوضوء وکذا عند الاجتماع بالناس وعلیه فیستحب قبل التوجه الیها ایضاً واما السواک فی الوضوء فانه سنة موکدة ولا خصوصیة للعید فیه.

(۴) مسواک سنتِ صلوٰۃ ہے یا سنتِ وضو؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے علماء سے سنا ہے کہ ہر وضو کے وقت مسواک کرنا چاہیے اور بعض کہتے ہیں کہ نماز کے وقت مسواک کرنا مسنون ہے ان میں سے صحیح اور افضل بات کون سی ہے؟ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول کیا تھا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... ہمارے نزدیک وضو کے ساتھ مسواک کرنا مسنون ہے۔ اور جن احادیث میں یہ آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے وقت مسواک فرماتے تھے تو ہمارے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز کے وقت جب وضو فرماتے تھے اس میں مسواک فرمایا کرتے تھے۔ تاہم اگر کوئی شخص اتباع کی نیت سے نماز کے وقت بھی مسواک کرلے تو درست ہے۔ بشرطیکہ اس کے مسوڑھے مضبوط ہوں اور مسواک کی وجہ سے خون وغیرہ نہ نکلے۔

لمافی فتح الملهم (۲/۲۸۸): وقد صرح کثیر من الشافعیة والحنفیة باستحباب السواک عند

الـوضـوء وعـنـد الـقـيـام الـى الـصـلوة كليهما. فمن نقل الخلاف في انه من سنن الوضوء او من سنن الصلوة فـلـعـل مـراده ان الكلام في تعيين الموضع الذى كان قصد النبى ﷺ ايجاب السواک فيه لـولا ان يشق على امته فان ذلک الموضع ينبغى ان يكون محلا لمزيد تاكد الاستياک بالنسبة الى سائر المواضع وهذا البحث انما يدور على الفاظ حديث الباب. ......

.... وقـدصرح العلامة الرضى فى شرح الكافية "ان معنى "عند" القرب حسا او معنى وأما لفظة (مع) فيقال جئنا معاً اى فى زمان واحد وكنامعاً، اى فى مكان واحد على الظرفية

.... فعلى هذا "عند" اعم من "مع" فالمعية تستلزم العندية ولا عكس. فالذى يظهر من مجموع الـروايـات الـمـعـروفة انـه كـان قـصد النبى ايجاب السواک عند كل صلوة اى قريبا منها مشروعا لاجلها كا لوضوء مع كل وضوء متصلا وملتصقا بها واقعا فى زمان يقع فيه الوضوء. واصرح شئ فى هـذا الـمـعـنـى ماروى ابن حبان فى صحيحه من حديث عائشة أن رسول الله ﷺ قال "لولا ان اشق على امتى لامرتهم بالسواک مع الوضوء عند كل صلوة"

وفـى الـبـحـر الـرائـق(۱/۴۳): وامـا مـاورد من افضلية الصلوة التى بسواک على غيرها فيدل على الاستحباب وهو الحق ....

لكن قولهم يستحب عند القيام الى الصلوة ينافى مانقلوه من انه عندنا للوضوء لا للصلاة خلافا للشافعیؒ.

وفـى الشـامية(۱/۱۱۳): ...... يـظهر لى التوفيق بان معنى قولهم هو للوضوء عندنا بيان ماتحصل به الفضيلة الواردة فيما رواه احمد من قوله صلى الله عليه وسلم صلاة بسواک افضل من سبعين صلاة بـغـيـر سـواک اى انهـا تـحـصـل بالاتيان به عند الوضوء وعند الشافعیؒ لاتحصل الابا لاتيان به عند الصلوة فـعـنـدنـا كـل صـلـوة صلاها بذلک الوضوء لها هذه الفضيلة خلافا له ولا يلزم من هذا نفى استحبابه عندنا لكل صلوة.

(۵) کس درخت کی مسواک مسنون ہے؟ نیز مسواک کی لمبائی اور چوڑائی

سوال...... کیافرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کس درخت کی مسواک مسنون ہے؟ نیز مسواک کی لمبائی اور چوڑائی کیا ہونی چاہیے؟ اگر اس بارے میں کوئی حدیث ہوتو حوالہ ضرور دیجئے۔

الجواب حامداًومصلیاً...... ہر نرم لکڑی سے مسواک کرنا سنت ہے۔ البتہ کنز العمال اورالمعجم الاوسط کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بہتر پیلو اور زیتون کی مسواک ہے۔ نیز مسواک کی لمبائی ایک بالشت اور چوڑائی چھوٹی انگلی کی موٹائی کے برابر ہو۔ جیسے روایت سے معلوم ہوتا ہے

کہ زید بن خالد جب مسجد میں تشریف لاتے تو مسواک ان کے کان پر ایسے ہوتی جیسے قلم کاتب کے کان پر ہوتا ہے اور قلم کی لمبائی تقریباً ایک بالشت اور چوڑائی چھوٹی انگلی کی موٹائی کے برابر ہوتی ہے۔

لمافی جامع الترمذی (۱/۱۲): عن زید بن خالد الجهنی قال: سمعت رسول الله ﷺ یقول: لولا ان اشق علی امتی لامرتهم بالسواک عند کل صلوة ولأخرت صلوة العشاء الی ثلث اللیل قال: فکان زید بن خالد یشهد الصلوات فی المسجد وسواکه علی اذنه موضع القلم من أذن الکاتب لا یقوم الی الصلوة الا استن ثم رده الی موضعه.

وفی کنز العمال(۹/۳۲۱): ۲۶۲۲۷. الاسوکة ثلاثة اراک فان لم یکن فعنمٌ أو بطم [فعنم العنمة بفتحتین شجرة لطیفة الاغصان یشبه بها بنات العذاری والجمع عنم (النهایه، ۳/۳۱۳) بطم: البطم الجنة الخضراء]

وفی المعجم الاوسط(۱/۳۹۰): رقم ۶۸۲، عن ابراهیم بن أبی عبلة عن عبدالرحمن بن غنم الاشعری عن معاذ بن جبل رضی الله عنه قال سمت رسول الله ﷺ یقول نعم السواک الزیتون من شجرة مبارکة یطیب الفم ویذهب بالحفر وهو سواکی وسواک الانبیاء من قبلی.

وفی الفقه الاسلامی وادلته(۱/۷-۴۵۹): والافضل ان یکون من اراک ثم من النخل ثم ذوالریح الطیب ثم الیابس المندی بالماء. ویکره ان یزید طول السواک علی شبر، فی البیهقی عن جابر رضی الله عنه قال "کان موضع سواک رسول الله ﷺ موضع القلم من اذن الکاتب"......

(۶) مسوڑھوں پر مسواک پھیرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کے دانت نہ ہوں تو مسوڑھوں پر مسواک کرنا سنت ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اگر کسی کے دانت نہ ہوں، تو اس کو چاہئے کہ مسواک کے بجائے انگلی یا کسی اور نرم چیز کو سنت کی نیت سے اپنے مسوڑھوں پر پھیر لے تاکہ ثواب سے محروم نہ ہو۔

لمافی البحر الرائق (۱/۴۳): وتقوم الاصبع او الخرقة الخشنة مقامه عند فقده اوعدم اسنانه فی تحصیل الثواب الخ.

وفی الدر المختار(۱/۱۱۵): وعند فقده او فقد اسنانه تقوم الخرقة الخشنة او الاصبع مقامه کما یقوم العلک مقامه للمرأة مع القدرة علیه.

(۷) مسواک کو پکڑنے کا طریقہ

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے سنا ہے کہ مسواک کو پکڑنے کا ایک مخصوص طریقہ ہے اسی طریقہ سے مسواک پکڑ کر استعمال کرنا چاہئے اگر کوئی مخصوص طریقہ ہے تو اس کو مدلل بیان فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً.....مسواک کو دائیں ہاتھ میں پکڑنا مستحب ہے اور پکڑنے کا طریقہ فقہاء کرام نے یہ بتایا ہے کہ مسواک کو ہاتھ کی انگلیوں اور انگوٹھے کے پوروں سے اس طرح پکڑا جائے کہ چھوٹی انگلی (چھنگلی) اور انگوٹھا نیچے کی جانب رہے اور بقیہ انگلیاں اُوپر کی طرف ہوں، اور انگوٹھے کو مسواک کے برش والے حصے کی جانب رکھے اور چھنگلی کی پشت کو دوسری جانب کے آخر میں اور دوسری انگلیاں ان کے درمیان میں اُوپر کی جانب رہیں۔

لمافی الهندية (۱/۷): ویندب امساکه بیمینه بأن یجعل الخنصر أسفله والإبهام أسفل رأسه وباقي الأصابع فوقه.

وفي الشامية (۱/۱۱۴): والسنة في كيفية أخذه أن يجعل الخنصر أسفله والإبهام أسفل رأسه وباقي الأصابع فوقه.

(۸) دورانِ وضو اذکار کا ثبوت

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دوران وضو جو مختلف دعائیں پڑھی جاتی ہیں۔کیا یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھنا ثابت ہیں، بحوالہ نقل کریں، میرے ایک دوست کا کہنا ہے کہ یہ دعائیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں بلکہ بعد کے فقہاء نے یہ تجویز کیں ہیں، یہی وجہ ہے کہ فقہاء کی عبارتوں میں تو ان کا ذکر ملتا ہے، احادیث میں نہیں ملتا، کیا یہ بات صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....وضو میں دو طرح کی دعائیں پڑھی جاتی ہیں، اول جو دعائیں دوران وضو پڑھی جاتی ہیں، دوم جو وضو کے بعد پڑھی جاتی ہیں، وضو کے بعد پڑھی جانے والی دعائیں شہادتین وغیرہ تو احادیث کثیرہ صحیحہ سے ثابت ہیں، البتہ جو دعائیں یا اذکار دوران وضو پڑھے جاتے ہیں، یہ روایات سے ثابت تو ہیں لیکن یہ روایات ضعیف ہیں اسی ضعف کی وجہ سے بعض حضرات جیسے علامہ نوویؒ وغیرہ ان کا سرے سے انکار کرتے ہیں کہ ان اذکار کا کوئی ثبوت نہیں ہے، جبکہ شوافع ہی کے دوسرے فقہاء جیسے علامہ رملیؒ وغیرہ اور خاص طور پر فقہاء احناف نے ان کا استحباب نقل کیا ہے، لہٰذا ان اذکار کا پڑھ لینا بہتر ہے۔

لمافی الهندية (۱/۹): وتسمية الله تعالى عند غسل كل عضو وليقل عند المضمضة اللهم اعني على تلاوة القرآن وذكرك وشكرك وحسن عبادتك وعند الاستنشاق اللهم ارحني رائحة

الجنة ولا ترحني رائحة النار وعند غسل الوجه اللهم بيض وجهي يوم تبيض وجوه وتسود وجوه وعند غسل يده اليمنىٰ اللهم اعطني كتابي بيميني وحاسبني حسابا يسيرا وعند غسل اليسرى اللهم لا تعطني كتابي بشمالي ولا من وراء ظهري وعند مسح رأسه اللهم اظلني تحت ظل عرشك يوم لا ظل الا ظل عرشك وعند مسح اذنيه اللهم اجعلني من الذين يستمعون القول فيتبعون احسنه وعند مسح عنقه اللهم اعتق رقبتي من النار وعند غسل رجله اليمنى اللهم ثبت قدمي على الصراط يوم تزل الاقدام وعند غسل رجله اليسرى اللهم اجعل ذنبي مغفورا وسعي مشكورا وتجارتي لن تبور ويصلي على النبي ﷺ بعد غسل كل عضو.

وفي تنوير الأبصار مع الدرالمختار (۱/۱۲۴): (ومن آدابه استقبال القبلة) ......وفي (صـ۱۲۷) (والدعاء بالوارد عنده) اى عند كل عضو وقد رواه ابن حبان وغيره عنه عليه الصلاة والسلام من طرق قال محقق الشافعية الرملي فيعمل به في فضائل الاعمال وان انكره النووي

وفي (صـ۱۲۸) (فائدة) شرط العمل بالحديث الضعيف عدم شدة ضعفه وان يدخل تحت أصل عام وان لا يعتقد سنية ذلک الحديث.

(۹) وضواور غسل کیلئے پانی کی شرعی مقدار

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ وضواور غسل میں کتنا پانی استعمال کرنا چاہئے نیز صاع اور مد کی موجودہ مقدار کتنی بنتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......لوگوں کے احوال اور طبیعتوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے وضواور غسل کیلئے پانی کی کوئی خاص مقدار متعین نہیں کہ جسے معیار بنایا جائے ، البتہ وضواور غسل میں پانی کا استعمال اس قدر ہو کہ نہ تو اتنی کمی کی جائے کہ اعضاءِ وضو سے پانی کا تقاطر ہی نہ ہو، اور نہ ہی اتنی زیادتی کی جائے کہ اسراف لازم آئے جو کہ حرام ہے۔لہٰذا راہِ اعتدال کو اپنانا چاہئے جو کہ شرعاً محمود ومطلوب ہے۔

البتہ روایات میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ منقول ہے کہ آپ وضوایک مد اور غسل ایک صاع پانی سے فرماتے ہیں۔ ایک مد کا وزن آدھ سیر ساڑھے پانچ چھٹانک ہے جو کہ عام طور پر ایک لوٹا پانی کے برابر ہوتا ہے، اور ایک صاع کا وزن تین سیر چھ چھٹانک جو کہ عام طور پر ایک درمیانی بالٹی کے پانی کے برابر ہوتا ہے جو معتدل طبیعت وجسم والے شخص کے وضواور غسل کیلئے آسانی کافی ہو جاتا ہے، اس لئے کہ حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک سنت اعتدال پر مبنی ہے۔ بصورت دیگر زائد پانی بھی استعمال کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ اسراف کی حد تک نہ پہنچے، البتہ پانی کی مذکورہ مقدار سے کمی نہ کرنا اولیٰ ہے۔

لمافي الهندية(۱/۹): ولا ينقص ماء وضوئه عن مد كذا في التبيين.

وفیہ ایضاً(۱/۱٦): ذكر في ظاهر الرواية وادنى مايكفي من الماء للاغتسال صاع وللتوضؤ مد قال بعض مشايخنا رحمهم الله كفاه صاع اذا ترك الوضوء واما اذا جمع بين الوضوء والغسل فانه يتوضأ بالمد من غير الصاع ويغتسل بالصاع وقال عامة مشايخنا رحمهم الله الصاع كاف للغسل والوضوء جميعا وهو الاصح قال مشايخنا هذا بيان مقدار ادنى الكفاية وليس بتقدير لازم بل ان كفاه اقل من ذلك نقص منه وان لم يكفه زاد عليه بقدر مالا اسراف ولا تقتير كذا في محيط السرخسي وكذلك لوتوضأ بدون المد واسبغ وضوءه جاز هكذا في شرح الطحاوي...... وكل هذا غير لازم لاختلاف طباع الناس كذا في شرح المبسوط.

وفي رد المحتار (۱/۱۵۸): (قوله وقيل المقصود) الاصوب حذف قيل لما في الحلية انه نقل غير واحد اجماع المسلمين على ان ما يجزئ في الوضوء والغسل غير مقدر بمقدار وما في ظاهر الرواية من أن أدنى مايكفي في الغسل صاع وفي الوضوء مد للحديث المتفق عليه، كان ﷺ يتوضأ بالمد ويغتسل بالصاع الى خمسة امداد ليس بتقدير لازم بل هو بيان أدنى القدر المسنون اهـ قال في البحر حتى أن من أسبغ بدون ذلك اجزأه وان لم يكفه زاد عليه لان طباع الناس وأحوالهم مختلفة كذا في البدائع اهـ وبه جزم في الامداد وغيره.

وفي الفقه الاسلامي(۱/۱۴۳): وعند ابي حنيفة وفقهاء العراق ثمانية ارطال باعتبار ان المد رطلان، فيكون (۳۸۰۰ غم) وفي تقرير آخر وهو الشائع ان الصاع (۲۷۵۱ غم)

(۱۰) ہاتھ کی انگلیوں کا خلال ہاتھ دھونے سے پہلے ہوگا یا بعد میں؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ وضو میں ہاتھ کی انگلیوں کا خلال سنت ہے یہ کس وقت ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... ہاتھ کی انگلیوں کا خلال وضو کے اندر ہاتھوں کو دھونے کے بعد ہوگا اس لئے کہ ہاتھوں کا دھونا فرض ہے اور تخلیلِ یدین سنت ہے اور سنت تکمیل فرض کے لئے ہوتی ہے اس لئے انگلیوں کا خلال فرض کے بعد ہوگا۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ بہشتی زیور میں تحریر فرماتے ہیں: پھر تین بار داہنا ہاتھ کہنی سمیت دھوئے پھر بایاں ہاتھ کہنی سمیت تین دفعہ دھوئے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر خلال کرے اور انگوٹھے چھلا چوڑی جو کچھ ہاتھ میں پہنے ہوئے ہلا لیوے کہ کہیں سوکھا نہ رہ جاوے۔ پھر ایک مرتبہ سارے سر کا مسح کرے پھر کان کا مسح کرے۔

لمافي البناية(۱/۱۱۳،۱۱۲): (ولأنه) اى ولأن تخليل الأصابع (اكمال الفرض في محله) اى في محل الفرض......وهذا ايضاً فيه نظر لأن في حديث وائل بن حجر رواه البزار في مسنده قال شهدت

النبی ﷺ واتی بماءٍ فاکفأ علی یمینهٖ ثلاثا الحدیث وفیه ثم غسل بیده الیمنیٰ قدمه الیمنی وفصل بین اصابعه أو قال خلل بین اصابعه اهـ.

وفی الشامی(۱/۱۱۷): اقول قدعلمت من الحدیث المار التقیید فی تخلیل اللحیة بأخذ کف من ماء وفی البحر ویقوم مقامه أی تخلیل الأصابع الادخال فی الماء ولو لم یکن جاریا، وفیه عن الظهیریة ان التخلیل انما یکون بعد التثلیث لانه سنة التثلیث. والله اعلم

(۱۱) بیت الخلاء میں وضو کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے مدرسے میں غسل خانے موجود ہیں لیکن نہ ہونے کے برابر کہ لیٹرین اور غسل خانہ ساتھ ہیں ہمارے طلباء اسی میں فراغت حاصل کرتے ہیں اور غسل بھی کرتے ہیں اب بعض طلباء اسی کے اندر جا کر وضو کرتے ہیں تو کیا ان کا وضو صحیح ہو جائے گا یا دوبارہ باہر وضو کرنا پڑے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں وضوء درست ہے دوبارہ وضوء کرنے کی ضرورت نہیں، البتہ چونکہ عام طور پر ایسی جگہوں پر صفائی کا اہتمام نہیں ہوتا لہٰذا وضو کی دعائیں جہراً نہ پڑھی جائیں۔

لمافی بذل المجهود فی حل ابی داؤد(۱/۳): اذا دخل الخلاء أی اذا اراد دخول مکان الخلوة عند قضاء الحاجة الخ إلی ان قال وهذا مذهب الجمهور وقالوا من نسی یستعیذ بقلبه لابلسانه الخ.

وفی الهندیة(۱/۶): ویسمی قبل استنجاء...... ولا یسمی فی حال الانکشاف ولافی محل النجاسة هکذا فی فتح القدیر.

وفی الشامیة(۱/۱۰۹): الظاهر أن المراد أنه یسمی قبل رفع ثیابه إن کان فی غیر المکان المعد لقضاء الحاجة والا فقبل دخوله فلو نسی فیهما سمی بقلبه ولا یحرک لسانه تعظیماً لاسم الله تعالیٰ.

وفی الدر المختار(۱/۱۳۳): ومن منهیاته التوضوء...... فی موضع نجس، لان لماءِ الوضوء حرمة.

(۱۲) آبِ زم زم سے وضو کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص ایسے مقام پر ہو جہاں پانی نہ ہو اور اس کے پاس آبِ زم زم موجود ہو، اور نماز کا وقت ہو جائے تو کیا یہ شخص آبِ زم زم سے وضو کر سکتا ہے یا تیمم کر کے نماز پڑھے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورتِ مسئولہ میں اس شخص کیلئے آبِ زم زم سے ہی وضو کرنا ضروری ہے، تیمم کرنا جائز نہیں البتہ اگر آبِ زم زم کم ہے اور پانی پینے کی بھی شدید ضرورت ہو، تو اس کو پینے کیلئے رکھ لے اور نماز کیلئے تیمم کر لے۔

لمافی الخانية(۱/۲۷): ولو كان فی رحله ماء زمزم و قد رصّص رأس القمقمة يحمله للهدية أوما أشبه ذلک وهو لایخاف على نفسه العطش لايجوز له التيمم.

وفی الدّر المختار (۱/۱۷۹): (يرفع الحدث)مطلقا(بماء مطلق)......(وماء زمزم) بلاكراهة.

(۱۳) آب زم زم سے وضوو غسل کرنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آبِ زم زم کو اگر استنجاء، وضو یا غسل کیلئے استعمال کیا جائے تو کیا یہ جائز ہے؟ کیونکہ ہمارے ہاں ایک صاحب حج کر کے آئے اور اپنے ساتھ آب زم زم بھی لائے، اب جو آبِ زم زم لائے تھے اس کو کنویں میں ڈال دیا تا کہ یہ پانی ہمیشہ کے لئے آبِ زم زم بن جائے، اب استعمال کیلئے یہی کنواں ہے تو کیا اس پانی سے استنجاء کرنا جائز ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں زم زم کے پانی سے وضواور غسل کرنا جائز ہے، البتہ زم زم کے پانی سے استنجاء کرنا مکروہ ہے۔ نیز کنویں میں آب زم زم ڈالنے سے کنویں کا پانی آب زم زم کے حکم میں نہیں ہوگا بلکہ ماء مطلق کے حکم میں ہوگا۔

لمافی الهندية (۱/۳۱): رجل فی البادية معه ماء زمزم فی القمقمة وقد رصص رأسها لا يجوز التيمم كذا فی الخلاصة.

وفی الدرالمختار (۱/۱۷۹، ۱۸۰): (يرفع الحدث)مطلقا(بماء مطلق......وماء زمزم)بلا كراهة.

وفی الشامية (۲/۲۲۵): (قوله يكره الاستنجاء بماء زمزم) وكذا ازالة النجاسة الحقيقية من ثوبه أو بدنه، حتى ذكر بعض العلماء تحريم ذلک.

(۱۴) سبیل وغیرہ کے پانی سے وضو کرنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض جگہوں پر لوگوں کے پینے کیلئے جو پانی رکھا ہوتا ہے، جیسے سبیل وغیرہ کیا اس سے وضواور غسل کرنا درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اگر سبیل وغیرہ میں رکھا ہوا پانی کم ہو تو وضو کرنا درست نہیں ہے، وہ پانی صرف پینے کیلئے ہوتا ہے۔ ہاں اگر پانی زیادہ ہو تو اس سے وضو کرنا بھی درست ہے۔ البتہ ایسے پانی سے غسل کرنا درست نہیں ہے۔

لمافی رد المحتار (۱/۲۵۳) (قوله المسبل) ای الموضوع فی الحباب لأبناء السبيل. (قوله لايمنع التيمم.) لانه لم يوضع للوضوء بل للشرب فلا يجوز الوضوء به وان صح. (قوله مالم يكن كثيرا.) قال فی شرح المنية. الاولیٰ الاعتبار بالعرف لابالكثرة، الا اذا اشتبه،

(۱۵) بارش کے قطرات سے وضو کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص راستے میں جارہا ہو اور وہاں بارش ہونے لگ جائے اور بارش کے پانی سے اس کے اعضائے وضو بھیگ جائیں تو کیا اس سے وضو ہو جائے گا یا نماز کیلئے دوبارہ وضو کرنا پڑے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً......بارش کے قطرات سے اگر اعضائے وضو مکمل بھیگ جائیں تو اس سے وضو ہو جائے گا نماز کیلئے دوبارہ وضو کرنے کی ضرورت نہیں۔

لما فی الدرالمختار (۱/۱۵۶): لومکث فی ماء جار او حوض کبیر او مطر قدر الوضوء والغسل فقد اکمل السنة.

وفی الشامیة تحته: (قوله قدر الوضوء والغسل) انظر هل المراد قدر زمنهالو كان يصيب الماء عليه بنفسه او مقدار مايتحقق فيه جريان الماء على الاعضاء بلحظات يسيرة. يتحقق فيها غسل اعضاء الوضوء مرتبة ثلاثا مع غسل باقي الجسد كذالك؟ لم اره لائمتنا.

(۱۶) بارش میں بھیگنے سے وضو کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک عالم سے سنا ہے کہ اگر کوئی شخص بارش میں بھیگ جائے تو وضو ہو جاتا ہے۔ کیا یہ بات صحیح ہے؟ نیز میرے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ بعض دفعہ گرمی کی شدت میں برف جسم کے مختلف اعضاء پر ملی جاتی ہے تو اگر وضو کے اعضاء پر برف مل لی جائے تو وضو ہو جانا چاہیے، کیا یہ بات صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اگر کوئی شخص بارش میں اس طرح بھیگ جائے کہ اعضاء وضو میں کوئی جگہ خشک نہ رہے تو وضو ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر برف اعضاء وضو پر اس طرح مل لی جائے کہ اعضاء سے پانی کے قطرے ٹپکنے لگیں اور کوئی جگہ خشک بھی نہ رہے تو وضو ہو جائے گا، ورنہ نہیں۔

لمافی الدرالمختار (۱/۱۵۶): وقالوا لو مكث فی ماءٍ جار أوحوض كبير او مطر قدر الوضوء والغسل فقد أكمل السنة.

وفی الهندية (۱/۳): ففی مسئلة الثلج اذا توضأ به ان قطر قطرتان فصاعداً يجوز اجماعا وان كان بخلافه فهو على قول ابی حنيفةؒ ومحمدؒ لايجوز وعلى قول ابی يوسفؒ يجوز كذا فی الذخيرة والصحيح قولهما كذا فی المضمرات.

(۱۷) برف سے وضو کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کبھی کبھی سفر کے دوران بعض ایسے علاقوں میں جانا ہوتا ہے کہ وہاں برف ہی برف ہوتی ہے۔ پانی بالکل نہیں ملتا تو ایسی صورت حال میں وضو کا کیا حکم ہے؟ آیا تیمم کرے یا برف سے وضو کرے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اس صورت میں اگر برف پگھلانے کا آلہ موجود ہو (مثلاً چولہا، برتن وغیرہ) تو اس سے برف کو پگھلا کر وضو کرے اگر یہ سہولت میسر ہو تو تیمم کرنا جائز نہیں، بلکہ اس پانی سے وضو کرنا واجب ہے۔ اور اگر میسر نہ ہو تو تیمم کرنا جائز ہے۔ اور اگر مٹی وغیرہ بھی دستیاب نہ ہو تو پھر تشبہ بالمصلین کرے۔

لمافی الهندية(۱/۲۸): وفی جمد أو ثلج ومعه آلة الذوب لايتيمم وقيل يتيمم والظاهر الاوّل منهما كما لايخفى.

وفی الدر المختار(۱/۲۵۲): (والمحصور فاقد) الماء والتراب (الطهورين) بأن حبس فی مكان نجس لايمكنه اخراج تراب مطهر وكذا العاجز عنهما لمرض(يؤخرها عنده وقالا يتشبّه) بالمصلين وجوبا.

(۱۸) گرم پانی سے اور دھوپ کی شدت سے گرم ہونے والے پانی سے وضو وغسل کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر پانی دھوپ کی شدت کی وجہ سے گرم ہو جائے تو اس سے وضو اور غسل کرنا کیسا ہے؟ نیز آگ سے گرم کئے ہوئے پانی سے غسل اور وضو جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اگر پانی دھوپ کی شدت کی وجہ سے گرم ہو جائے تو اس سے وضو وغسل کرنا کراہت تنزیہی کے ساتھ جائز ہے، البتہ آگ سے گرم کئے ہوئے پانی سے وضو اور غسل بلا کراہت جائز ہے۔

لمافی الشامية(۱/۱۷۹):(قوله مطلقا) ای سواء كان اكبر او اصغر (قوله هو ما يتبادر عند الاطلاق) ای ما يسبق الی الفهم بمطلق قولنا ماء، ولم يقم به خبث ولامعنی يمنع جواز الصلاة فخرج الماء المقيد والماء المتنجس والماء المستعمل ....ولذا قيد بعض العلماء التبادر بقوله بالنسبة للعالم بحاله. وفيه ايضاً(۱/۱۸۰) منها ان لايكون بماء مشمس وبه صرح فی الحلية مستدلا بما صح عن عمر من النهی عنه ولذا صرّح فی الفتح بكراهته ،ومثله فی البحر،وقال فی معراج الدراية وفی القنية ، وتكره الطهارة بالمشمس لقوله ﷺ لعائشة رضی الله عنها حين سخنت الماء بالشمس ((لاتفعلی يا حميراء ، فانه يورث البرص)) وعن عمر مثله......فقد علمت ان المعتمد الكراهة عندنا لصحة الاثر

وأن عدمها رواية، والظاهر انها تنزيهية عندنا أيضا.

(۱۹) بلّی کے جھوٹے پانی سے وضو کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص وضو کیلئے پانی کا لوٹا بھر کر رکھ دے اور بلی آ کر اس سے پی لے تو کیا باقی پانی سے وضو کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر اس پانی کے علاوہ پاک پانی موجود ہو تو پاک پانی سے وضو کرنا بہتر ہے اور اگر اس پانی کے علاوہ دوسرا پانی موجود نہیں تو پھر اس پانی سے وضو کرنا بلا کراہت درست ہے۔

لمافي الهندية(۱/۲۴): فان اكلت فارة وشربت الماء في فورها يتنجس وان مكثت ساعة اوساعتين ثم شربت لايتنجس هو الصحيح كذا في الظهيرية.

وفي الشامية (۱/۲۲۴): (قوله طاهر للضرورة) بيان ذلك ان القياس في الهرة نجاسة سؤرها لانه مختلط بلعابها المتولد من لحمها النجس لكن سقط حكم النجاسة اتفاقاً بعلة الطواف المنصوصة بقوله ﷺ انها ليست بنجسة انها من الطوافين عليكم والطوافات اخرجه اصحاب السنن الاربعة وغيرهم.

(۲۰) پرنالے کے پانی سے وضو کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دن سخت بارش ہو رہی تھی اور ہمارے گھر کا پانی ختم ہو چکا تھا تو نماز کے وقت میں نے پرنالے والے پانی سے وضو کر لیا اب آپ سے معلوم یہ کرنا ہے کہ پرنالے والے پانی سے وضو یا غسل کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر پرنالے سے آنے والے پانی کا رنگ، بو، مزہ کسی نجاست وغیرہ سے بدلا نہ ہو تو اس سے وضو وغسل درست ہے۔

وفي الهندية(۱/۱۷): وفي بعض الفتاویٰ قال مشائخنا المطر مادام يمطر فله حكم الجريان حتى لو أصاب العذرات على السطح ثم أصاب ثوبا لايتنجس الا أن يتغير.

وفي الشامية (۱/۱۸۸، ۱۸۹): وعلى هذا ماء المطر اذا جرى في الميزاب وعلى السطح عذرات فالماء طاهر وان كانت العذرة عند الميزاب أو كان الماء كله أو نصفه أكثره يلاقي العذرة فهو نجس والا فطاهر وعلى مارجحه الكمال قال في الحلية ينبغي أن لايعتبر في مسألة السطح سوى

تغیر أحد الاوصاف اھ۔

(۲۱) حقے کے پانی سے وضواور غسل کرنا

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک دن میں وضوکر رہا تھا کہ پانی ختم ہوگیا اور کوئی پانی نہیں تھا صرف حقے میں پانی موجود تھا تو باقی وضو میں نے اس پانی سے کرلیا تو کیا حقے والے پانی سے وضو یا غسل کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... حقے کے پانی سے وضواور غسل جائز ہے۔ کیونکہ حقے کا پانی ماء مطلق کی طبیعت پر برقرار رہتا ہے۔ اگرچہ حقے کے پانی کے اوصاف دھوئیں کی وجہ سے تبدیل ہوجاتے ہیں، چونکہ دھواں پاک ہے اور پاک چیز کی آمیزش پانی کی طہارت پر اس وقت تک اثر انداز نہیں ہوتی جب تک پانی اپنی طبیعت (رقت اور سیلان) پر باقی ہو۔

لمافی مراقی الفلاح(ص۱۹): (ولا) **یجوز الوضوء (بما زال طبعه) وهو الرقة والسیلان والارواء والانبات** (بالطبخ .....أو بغلبة غیره)..... **(علیه..... والغلبة..... فی مخالطة) الماء لشئ من** (الجامدات) الطاهرات (باخراج الماء عن رقته) **فلا ینعصر عن الثوب (و) إخراجه عن (سیلانه) فلا یسیل علی الأعضاء** سیلان الماء (و) **أما اذا بقی علی رقته وسیلانه فانه (لایضر)...... تغیر أوصافه کلها بجامد) خالطه بدون طبخ (کزعفران وفاکهة وورق شجرة)**.

وفی الفقه الاسلامی(۱/۲۶۷): والخلاصة **ان خالط الماء شئی طاهر ولم یغیر لونه أوطعمه أو ریحه فهو ماء مطلق طهور** وان غیر احد هذه **الاوصاف الثلاثه .....عند الحنفیة طاهر مطهر، مالم یطبخ** أویغلب علی أجزائه.

(۲۲) گنے کے رس سے وضو کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص ایسے مقام پر ہو جہاں پانی کا نام ونشان نہ ہو، اور اسکے پاس گنے کا رس موجود ہو اور نماز کا وقت ہونے پر یہ شخص اس رس سے وضو کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... گنے کے رس سے وضو کرنا جائز نہیں، اس لئے کہ وضو کیلئے ماء مطلق شرط ہے اور یہ ماء مطلق نہیں ہے۔ لہٰذا یہ شخص تیمم کرکے نماز ادا کرے۔

لمافی الهندیة(۱/۲۱): لایجوز التوضؤ **بماء البطیخ والقثاء والقتد ولا بماء الورد ولا بشئ من** الاشربة ولا بغیرها من المائعات نحو الخل.

وفی الدرالمختار(۱/۱۸۰): (و) لا(بعصیر نبات) **أی معتصر من شجر اوثمر لانه مقید**.

(۲۳) گندگی والے جوہڑ اور ڈیم سے وضو کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض دیہاتوں میں بارش کے موسم میں بڑے بڑے ڈیموں یا جوہڑ میں بارش کا پانی جمع ہوجاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کچرا اور گندی چیزیں بھی جمع ہوجاتی ہیں تو کیا اس پانی سے وضو کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اگر جوہڑ اتنے بڑے ہوں جو شرعاً ''غدیرِ عظیم'' کے حکم میں آتے ہوں یعنی دہ دردہ ہوں اور ان میں بارش کا پانی جمع ہوجاتا ہو تو چونکہ یہ پانی ماء جاری کے حکم میں ہے اس لئے ان جوہڑوں اور ڈیموں کے ان اطراف سے وضو کرنا جائز ہے جہاں نجاست اور گندی چیزیں نہیں ہیں بشرطیکہ پانی میں نجاست کا اثر ظاہر نہ ہوا ہو۔

لمافی الهندية (۱/۱۸): الماء الراكد اذا كان كثيرا فهو بمنزلة الجارى لايتنجس جميعه بوقوع النجاسة فى طرف منه الا ان يتغير لونه أو طعمه أو ريحه وعلى هذا اتفق العلماء وبه اخذ عامة المشايخ رحمهم الله كذا فى المحيط.

وفى الدرالمختار (۱/۱۹۰): (وكذا) يجوز (براكد) كثير (كذلك) أى وقع فيه نجس لم ير أثره ولو فى موضع وقوع المرئية، به يفتى بحر.

وفى الشامية (۱/۱۹۱): (قوله به يفتى) أى بعدم الفرق بين المرئية وغيرها.

(۲۴) ناپاک ٹینک سے کئے گئے وضو اور طہارت کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فائزہ ہائیٹس میں ایک پانی کا بہت بڑا ٹینک ہے۔ جو دہ دردہ سے بڑا ہے۔ حالیہ بارشوں میں گٹر اور سڑک کا پانی ٹینک میں چلا گیا۔ جس کے بعد پانی میں بدبو آ گئی اور رنگ بھی بدل گیا پھر تقریباً تین دن تک اسی پانی کی سپلائی کی گئی۔ اور پانی میں حسب معمول بدبو تھی۔ پھر تین دن کے بعد بدبو تو ختم ہوگئی لیکن پانی پھر بھی گدلا ہی آ رہا تھا اور اب کیفیت یہ ہے کہ پانی آہستہ آہستہ صاف ہوتا جا رہا ہے۔ مگر بالکل صاف بھی نہیں اور ٹینک کو اب تک صاف نہیں کیا گیا ہے بعض لوگ اسی پانی کو استعمال کر رہے ہیں اور بعض نہیں استعمال کر رہے ہیں تو جن لوگوں نے اس پانی سے وضو کیا اور کپڑے وغیرہ دھوئے ان کا کیا حکم ہے؟ اور ٹینک کا پانی پاک ہوگیا یا ٹینک کی صفائی کرنی پڑے گی؟ جواب دے کر مشکور فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......جب پانی کے اوصاف ثلثہ (رنگ، بو، ذائقہ) میں سے کوئی ایک کسی نجاست وغیرہ کے گرنے سے متغیر ہوجائے تو یہ پانی ناپاک ہوجاتا ہے۔ خواہ پانی تھوڑا ہو یا زیادہ ہو۔ صورت مسئولہ میں جب گٹر یا سڑک وغیرہ کا پانی ٹینک میں داخل ہوگیا اور پانی میں بدبو وغیرہ پیدا ہوگئی اور اس کا رنگ بھی بدل گیا تو یہ پانی ناپاک ہوگیا ہے۔ اس سے جن حضرات نے وضو وغیرہ کر کے نماز ادا کی وہ

اپنی نمازوں کا اعادہ کریں گے یا اسی طرح اگر کپڑے وغیرہ دھوئے ہوں تو وہ انہیں دوبارہ دھوئیں گے اور جب تک ٹینک کے پانی سے بدبو ختم نہ ہو جائے اور اس کا رنگ صاف نہ ہو، اس وقت تک یہ پانی طہارت کیلئے استعمال کرنا درست نہیں۔ البتہ اگر ٹینک سے پانی نکال کر اسے دھولیا گیا اور خوب صاف کرنے کے باوجود کچھ بدبو وغیرہ باقی ہے یا رنگت متغیر ہے تو وہ طہارت کیلئے مضر نہ ہوگا۔

لما فی الهندية(۱/۱۸): الماء الجاری بعد ما تغير أحد أو صافه وحكم بنجاسته لايحكم بطهارته مالم يزل ذلك التغير بأن يرد عليه ماء طاهر حتى يزيل ذلك التغير.

وفی الدرالمختار(۱/۱۸۵): (وبتغير احد اوصافه) من لون اوطعم او ريح (ينجس) الكثير ولو جارياً اجماعاً.

وفی الفقه الاسلامی(۱/۲۸۸): واتفق الحنفية مع الجمهور على أن الماء الكثير (وهو عشر فی عشر) لا ينجس الابظهور اثر النجاسة فيه.

(۲۵) سیاہ خضاب لگائے ہوئے شخص کے وضو وغسل کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سفید بالوں میں سیاہ خضاب لگانا کیسا ہے؟ اور اگر لگایا تو وضو اور غسل جنابت صحیح ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... سفید بالوں میں سیاہ خضاب لگانا مطلقاً ناجائز ہے۔ اور ہر وہ خضاب جس سے سر کے بالوں کو یا داڑھی کو رنگوایا ہوا گر وہ ذی جسم ہو اور ذی جسم ہونے کی وجہ سے پانی بالوں تک اور بالوں کی جڑوں تک نہ پہنچتا ہو تو وضو اور غسل جنابت صحیح نہیں ہوگا۔ اگر وہ ذی جسم نہ ہو یا ذی جسم تو ہو لیکن پانی بالوں تک اور ان کی جڑوں تک پہنچتا ہو تو وضو اور غسل جنابت دونوں صحیح ہوں گے۔

لمافی الهندية(۵/۳۵۹): واتفق المشايخ ان الخضاب فی حق الرجال بالحمرة سنة وانه من سيماء المسلمين وعلاماتهم وأما الخضاب بالسواد فمن فعل ذلك من الغزاة ليكون أهيب فی عين العدوّ فهو محمود منه اتفق عليه المشايخ ومن فعل ذلك ليزين نفسه للنسآء وليحبب نفسه اليهن فذلك مكروه وعليه عامة المشايخ.

وفی الدر المختار(۶/۷۵۶): (اختضب لاجل التزين للنساء والجواری جاز) فی الأصح ويكره بالسواد.

وفی الهندية (۱/۴): والخضاب اذا تجسد ويبس يمنع تمام الوضوء والغسل كذا فی السراج الوهاج.

(۲۶) ناخن میں خشک آٹے کے ہوتے ہوئے وضو کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کے ناخن میں آٹا لگ کر سوکھ گیا ہو، اور دورانِ وضو آٹے کی نیچے والی جگہ پر پانی نہ پہنچا ہو لیکن اس نے دس پندرہ منٹ کے بعد دیکھا کہ آٹا لگا ہوا ہے جو کہ خشک ہے تو کیا اس صورت میں دوبارہ پورا وضو کرے یا صرف آٹا کھرچ کر اس جگہ تک پانی پہنچائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... وضو کے اندر موالاۃ یعنی (اعضاء کو پے در پے دھونا) اور ترتیب کی رعایت رکھنا سنت ہے اور صورت مسئولہ میں صرف موالاۃ اور ترتیب کی رعایت باقی نہیں رہی لہٰذا آٹا کھرچ کر صرف اس جگہ میں پانی پہنچا دینا کافی ہے۔

لمافی قاضی خان(۱/۱۷): ولو كان على يديه خبز ممضوغ قد جف و يبس واغتسل لايخرج من الجنابة حتى يدلك ذالك الموضع ويجرى الماء تحته لانه لاحرج فيه.

وفی الطحطاوی علی الدرالمختار(۱/۸۷): (قوله حتى ماتحت الدرن) قال فی البحر والدرن اليابس فی الانف كالخبز الممضوغ والعجين يمنع تمام الاغتسال.

(۲۷) ناخنوں کے اندر میل وضو اور غسل میں حائل نہیں ہوتا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ ان کے ناخن بڑے بڑے ہوتے ہیں اور ان کے اندر میل خوب ہوتا ہے بظاہر اس میل کے اندر پانی کا جانا بھی مشکل ہے جب یہ لوگ وضو یا غسل کریں گے تو ان کے وضو اور غسل کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... ناخنوں کے اندر صرف میل کا ہونا وضو اور غسل میں حائل نہیں ہوتا۔ لہٰذا ایسے لوگوں کا وضو وغسل درست ہو جائے گا۔ البتہ بڑے بڑے ناخن رکھنا خلافِ سنت ہے۔

وفی خلاصة الفتاویٰ(۱/۲۲): وما تحت الاظافير من اعضاء الوضوء حتى لو كان فيه عجين يجب ايصال الماء الى ما تحته وفی الوسخ لا، وكذا الطين القروی المصریّ سواء.

وفی التاتارخانية(۱/۱۵۱): وفی الخانية وما يكون على البدن يقال بالفارسية فلماخ (كذا) لا يمنع عن تمام الغسل لانه يتولد من البدن بمنزلة الدرن.

وفی الهندية(۱/۴): وفی الجامع الصغير سئل ابو القاسم عن وافر الظفر الذی يبقى فی اظفاره الدرن او الذی يعمل عمل الطين اوالمرأة التی صبغت اصبعها بالحناء او الصرام او الصباغ قال كل ذلك سواء يجزيهم وضوء هم اذلا يستطاع الامتناع عنه الابحرج والفتوى على الجواز من غير

فصل بین المدنی والقروی.

وفی الشامیة(۱/۱۵۴): (ولا یمنع) الطهارة (ونیم) ای خرء ذباب وبرغوث لم یصل الماء تحته (وحناء) ولو جرمه به یفتی (ودرن ووسخ) عطف تفسیر، وکذا دهن و دسومة (وتراب) وطین ولوفی ظفر مطلقاً) ای قرویاً او مدنیاً فی الاصح بخلاف نحو عجین.

وفی الهندیة (۵/۳۵۷): وقلم الاظفار سنة الا فی دارالحرب فان ترکها مندوب الیه کذا فی محیط السرخسی.

(۲۸) ناخن پالش اور مہندی لگا کر وضو اور غسل کا حکم

سوال ...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ناخنوں پر مہندی یا ناخن پالش لگی ہوئی ہو تو وضو اور غسل کا کیا حکم ہوگا؟ نیز اگر کسی کے سر پر مہندی لگی ہو تو غسل میں اس کو اتارنا ضروری ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً ...... مذکورہ بالا صورت میں اگر ناخنوں پر ناخن پالش لگی ہوئی ہو، یا ان اعضاء پر جن کا دھونا وضو میں فرض ہے کوئی ایسی چیز لگی ہوئی ہو جس کی وجہ سے بدن تک پانی نہیں پہنچتا ہو تو وضو صحیح نہیں ہوگا یا بدن کے کسی حصے پر بھی ایسی چیز لگی ہو تو غسل صحیح نہیں ہوگا۔ اور اگر ہاتھ یا سر پر مہندی لگی ہو اور وہ پانی کو بدن تک پہنچنے سے نہیں روکتی تو وضو اور غسل دونوں صحیح ہوں گے۔

لمافی الطحطاوی علی الدر(۱/۸۸): (قوله ولوجرمه) الحناء لکن لابد ان یصل الماء تحته واما اذا لم یصل لاتصح الطهارة و لذا قال فی البحر ولو الزقت المرأة راسها بالطیب بحیث لایصل الماء الی اصول الشعر وجب علیها ازالته......(قوله بخلاف نحوعجین) من خبز ممضوغ ودرن یابس فی الأنف وجلد سمک کما فی البحر(قوله ولا یمنع ماعلی ظفر صباغ) للضرورة قال فی المضمرات وعلیه الفتویٰ والقول الثانی انه یمنع وبه صدر فی البحر والظاهر ان هذا الخلاف یجری فی الحناء.

وفی الدر المختار(۱/۱۵۴): (ولا یمنع) الطهارة (ونیم) أی خرء ذباب وبر غوث لم یصل الماء تحته (وحناء) ولوجرمه به یفتی (ودرن ووسخ)......وکذا دهن ودسومة (وتراب) وطین ولو(فی الظفر مطلقا) ...... فی الاصح بخلاف نحو عجین (و)لا یمنع (ماعلی ظفر صباغ).

وفی ردالمحتار(۱/۱۵۴): (قوله لم یصل الماء تحته) لان الاحتراز عنه غیر ممکن حلیة،(قوله به یفتی)صرح به فی المنیة عن الذخیرة فی مسئالة الحناء والطین والدرن معللاً بالضرورة قال فی شرحها ولان الماء ینفذه لتخلله وعدم لزوجته وصلابته والمعتبر فی جمیع ذالک نفوذ الماء و وصوله الی البدن .... (قوله وکذادهن) أی کزیت وشیرج بخلاف نحوشحم وسمن جامد...... (قوله بخلاف

نحوعجین) ای کعلک وشمع وقشرسمک وخبز ممضوغ متلبد ......(قوله ان صلباً)...... ای ان کان ممضوغاً مضغاً متأکدا بحیث تداخلت اجزاءہ وصارله لزوجة وعلاکة کالعجین الخ.

(۲۹) ہاتھوں پر رنگ لگ جانے کی صورت میں وضواور غسل کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں رنگ سازی کا کام کرتا ہوں تو میرے ہاتھوں پر رنگ لگ جاتا ہے جب نماز کا وقت آ جاتا ہے تو میں وضو کر کے نماز پڑھ لیتا ہوں تو کیا رنگ کے لگ جانے کی صورت میں وضواور غسل ہو جاتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر رنگ ایسا ہے کہ اعضاء وضوء یا جسم پر اس کی تہہ جم جاتی ہے۔ جیسے گوندھے ہوئے آٹے کی تہہ اور اس کی وجہ سے پانی جلد تک نہیں پہنچ پاتا تو وضواور غسل کی صحت کیلئے ایسے رنگ کا ہر حال میں جسم سے صاف کرنا ضروری ہوگا اور اگر رنگ پانی کے ساتھ مل جاتا ہے اور وہ پانی کو جسم تک پہنچنے میں رکاوٹ پیدا نہیں کرتا تو ایسے رنگ کو اگر صاف نہ بھی کیا جائے تو بھی وضواور غسل درست ہو جائے گا۔ اور اگر رنگ ناخن میں سرایت کر چکا ہے اور اس کو صاف کرنا اذیت سے خالی نہیں اور اچھی طرح صفائی کے باوجود بھی رنگ ناخنوں میں برقرار ہے، تو حرج واذیت کی وجہ سے وضواور غسل درست ہو جائیں گے اور اگر ناخن طویل ہیں تو ان کو لازمی طور پر کاٹ لیا جائے۔

لمافی الهندية(۱/۴): وما تحت الاظافير من اعضاء الوضوء حتی لو کان فیه عجین یجب ایصال الماء الی ماتحته کذا فی الخلاصة واکثر المعتبرات...... سئل ابوالقاسم عن وافر الظفر الذی یبقی فی اظفاره الدرن او الذی یعمل عمل الطین والمرأة التی صبغت اصبعها بالحناء أوالصرام أو الصباغ قال کل ذالک سواء یجزیهم وضوء هم اذ لایستطاع الامتناع عنه الابحرج والفتوی علی الجواز من غیر فصل بین المدنی والقروی کذا فی الذخیره.

وفی الدرالمختار(۱/۱۵۴): (ولایمنع) الطهارة...... (وتراب) وطین ولو(فی ظفر مطلقاً) ای قروياً او مدنيا فی الاصح بخلاف نحوعجین

(وفی الشامية تحته) : (قوله بخلاف نحو عجین)أی کعلک وشمع وقشر وسمک وخبز ممضوغ متلبد جوهرة .... نعم ذکر الخلاف فی شرح المنیه فی العجین واستظهر المنع لان فیه لزوجة وصلابة تمنع نفوذ الماء.

(۳۰) پاؤں کی پھٹن پر دوا لگانے کے بعد وضو کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سردیوں میں عام طور پر پاؤں پھٹ جاتے ہیں اگر ان پر

کوئی کریم یا کوئی اور ایسی چیز لگادی جائے کہ اسکی تہہ جم جائے جسکی وجہ سے پانی بظاہر نیچے نہیں پہنچتا، اب ایسی صورت میں پریشانی یہ ہے کہ ہرنماز کے وقت ایسی کسی بھی چیز کا ہٹانا مشکل ہوتا ہے تو کیا ایسی صورت میں اس کریم لگے رہنے کے ساتھ وضو کرنا جائز ہے یا پھر چند دن تیمم کیا جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں جب پاؤں پر کوئی ایسی دوا لگادی جائے جس کی وجہ سے پانی جلد تک نہیں پہنچ سکے تو حرج کی بناء پر صرف پانی بہادینا کافی ہے، اور اگر دوا ایسی ہے کہ پانی بہانے میں بھی تکلیف ہو تو صرف مسح کرنا کافی ہے، اور اگر مسح کرنے میں بھی تکلیف ہو تو مسح بھی چھوڑ دیا جائے اور صرف آس پاس کی جگہ دھودی جائے، البتہ ایسی صورت میں تیمم کرنا جائز نہیں ہے۔

لمافی الدر المختار (۱/۱۰۲): فی اعضائه شقاق غسله ان قدر والا مسحه والا ترکه.

وفی الشامية (والا ترکه)أی وان لم یمسحه بأن لم یقدر علی المسح ترکه......ولو کان فی رجله فجعل فیه الدواء یکفیه امرار الماء فوقه ولا یکفیه المسح.

(۳۱) ہونٹ بند ہونے کے بعد جو حصہ دکھائی دے، وضو میں اس کے دھونے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہونٹ کا وہ حصہ جو ہونٹ بند ہونے کے بعد دکھائی دیتا ہے کیا اُس کا دھونا بھی فرض ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......ہونٹ کا جو حصہ بند ہونے کے بعد دکھائی دیتا ہے وضو اور غسل میں اس کا دھونا بھی فرض ہے۔

لمافی الهندية (۱/۴): واما الشفة فما یظهر منها عند الانضمام فهو من الوجه وما ینکتم عند الانضمام فهو تبع الفم هو الصحیح کذا فی الخلاصة.

وفی الدر المختار مع ردالمحتار (۱/۹۷): (یجب غسل المیاقی) وما یظهر من الشفة عند انضمامها قال فی الشامية تحت (قوله عند انضمامها) اشار بصیغة الانفعال الی ان المراد ما یظهر عند انضمامها الطبیعی لاعند انضمامها بشدة وتکلف.

(۳۲) دانت پر سونے یا چاندی کا خول چڑھانے یا دوا بھروانے کے بعد وضو وغسل کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص اپنے دانتوں میں دوا وغیرہ بھروالے، یا سونے یا چاندی کا خول چڑھالے تو اس کے وضو یا غسل کی صورت کیا ہوگی؟ اسی طرح سونے یا چاندی کا خول چڑھانا جائز بھی ہے یا نہیں؟ کیونکہ بعض لوگ صرف خوبصورتی کیلئے ایسا کرتے ہیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر دانتوں پر سونے یا چاندی کا خول صرف خوبصورتی کیلئے چڑھایا جارہا ہے تو یہ جائز نہیں

لیکن اگر ضرورت کی بناء پر ہوتو جائز ہے۔

اب اگر دانت میں دواوغیرہ بھری ہے تو اس پر پانی کا گزر جانا کافی ہے اسی سے وضوو غسل میں سنت وفرض ادا ہو جائے گا۔ اور سونے یا چاندی کا خول ہے تو پھر دیکھا جائے گا کہ اس خول کو بلا مشقت نکالا جاسکتا ہے یا نہیں اگر نکالا جاسکتا ہے تو نکالنا ضروری ہوگا بغیر نکالے وضوتو ہو جائے گا لیکن غسل درست نہ ہوگا اور اگر بلا مشقت نہیں نکالا جاسکتا تو پھر نکالنا ضروری نہیں بلکہ اوپر سے پانی کا گزر جانا کافی ہے۔

لـمـافي الهندية (۱/۳۵): ولو انكسر ظفره فجعل عليه دواء او علكا فان كان يضره نزعه مسح عليه وان ضره المسح تركه.

وفيها ايضـاً (۵/۳۳۶): قـال مـحـمد في الجامع الصغير ولا يشد الأسنان بالذهب ويشدها بالفضة يـريـد بـه اذا تـحـركت الاسنان وخيف سقوطها فاراد صاحبها ان يشدها يشدها بالفضة ولا يشدها بالذهب وهذا قول أبي حنيفة وقال محمد يشدها بالذهب ايضا،

وفـي الـدر الـمـختـار (۶/۳۶۱): (ولا يشـد سنـه)المتحرك (بذهب بل بفضة)وجوزهما محمد (ويتخذ انفاً منه)لان الفضة تنتنه.

وفـي الشـامية (لان الفضة تنتنه)الاولى تنتن بلا ضمير واشار الى الفرق للامام بين شد السن واتخاذ الانف فـجوز الانف من الذهب لضرورة نتن الفضة لان المحرم لا يباح الا لضرورة وقد اندفعت في السن بالفضة فلا حاجة الى الاعلى وهو الذهب......

(۳۳) وضو میں زائد انگلیوں کے دھونے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگوں کے ہاتھ میں پانچ سے زائد انگلیاں ہوتی ہیں، اسی طرح بعض لوگوں کے پاؤں کے ساتھ چھوٹے سے پاؤں کی شکل ہوتی ہے، کیا وضو کے فرائض میں ان زائد اعضاء کا دھونا ضروری ہوگا یا نہیں؟ اگر کسی نے ان اعضاء کو نہیں دھویا تو اسکی نماز ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر زائد انگلی یا پیر وغیرہ میں عضو اصلی کی طرح حرکت کرنے یا کسی چیز کو پکڑنے کی قوت موجود ہوتو اس کا دھونا لازمی ہے اور اگر اس میں حرکت کرنے یا کسی چیز کو پکڑنے کی قوت نہ ہوتو یہ زائد عضو شمار ہوگا، اب یہ عضو اگر محل فرض وضو میں نکل آیا تو اس کا دھونا لازمی ہے اور اگر غیر محل فرض وضو میں نکل آیا تو پھر دیکھا جائے گا کہ عضو اصلی کے محاذات میں ہے یا نہیں اگر عضو اصلی کے محاذات میں ہوتو دھونا لازم ہے، اور اگر عضو اصلی کے محاذات میں نہ ہوتو دھونا لازم نہیں البتہ مستحب ضرور ہے۔

لـمـافـي الهـنـدية (۱/۴): ويـجـب غسـل كـل مـاكـان مركبًا على اعضاء الوضو من الاصبع الزائدة والكف الزائدة كذا في السراج الوهاج.

وفی الدرالمختار (۱/۱۰۲): ولو خلق له یدان ورجلان فلو یبطش بهما غسلهما ولو باحداهما فهی الاصلیة فیغسلها وکذا الزائدة إن نبتت من محل الفرض کاصبع وکف زائدین والا فما حاذی منهما محل الفرض غسله ومالا فلا لکن یندب مجتبی.

وفی الشامیة (ولو خلق له) ای من جانب واحد ...... (ولو باحداهما) ای ولو یبطش باحداهما فهی الاصلیة والاخری زائدة لا یجب غسلها وظاهره ولو کانت تامة وفی النهرولم ار حکم مالو کانتا تامتین متصلتین اومنفصلتین والظاهر وجوب غسلهمافی الاول وغسل واحدة فی الثانی فلم یعتبر البطش والظاهر انه یعتبر البطش اولا فان بطش بهما وجب غسلهما والا فان کانتا تامتین متصلتین وجب غسلهما وان کانتا منفصلتین لا یجب الا غسل الاصلیة التی یبطش بها وهو حسن جمعابین العبارتین.

(۳۴) مہندی لگے بالوں کے ساتھ وضواور غسل کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے سر کے بال سفید ہوگئے ہیں میں نے ان پر مہندی لگادی تاکہ زیادہ عمر معلوم نہ ہو، ہمارے ایک عزیز نے دیکھا تو فرمانے لگے اگر جسم پر رنگ وغیرہ لگا ہو تو وضواور غسل صحیح نہیں ہوتا آپ فوراً یہ مہندی کا رنگ اتار دیں، کیا ان کی یہ بات صحیح ہے؟ مہندی کے رنگ کے ہوتے ہوئے غسل صحیح ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً...... سُرخ مہندی کا بالوں پر لگانا مردوں کیلئے سنت ہے۔اس کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم دینا اور صحابہؓ کا عمل کرنا احادیث سے ثابت ہے اس لئے آپ کا یہ عمل درست ہے۔اس کے رنگ کے ہوتے ہوئے وضواور غسل صحیح ہوجائے گا۔کیونکہ اس کا رنگ پانی کو بدن تک پہنچنے سے نہیں روکتا۔البتہ اگر کوئی شخص مہندی لگائے اوراس کا جرم بدن یا بالوں پر جما ہوا ہو،اس حال میں وضو یا غسل کرے تو پانی کا اس جرم سے گزر کر بدن تک پہنچ جانا ضروری ہے۔اگر پانی بدن تک نہ پہنچے اور بال برابر جگہ بھی خشک رہ جائے تو وضو اور غسل صحیح نہیں ہوگا۔

لمافی المسلم (۲/۱۹۹): عن جابر بن عبدالله قال اتی بابی قحافة یوم فتح مکة وراسه ولحیته کالثغامة بیاضا فقال رسول الله ﷺ غیروا هذا بشئ واجتنبوا السواد.

وفی ردالمحتار (۱/۱۵۱،۱۵۲): (وفرض الغسل)...... (غسل) کل (فمه)...... (وانفه) حتی ماتحت الدرن (وبدنه) (الدر المختار).

(قوله حتی ماتحت الدرن) قال فی الفتح والدرن الیابس فی الانف کالخبز الممضوغ والعجین یمنع اهـ وهذا غیر الدرن الآتی متنا، وقید بالیابس لما فی شرح الشیخ اسمعیل ان فی الرطب اختلاف

المشایخ کمافی القنیة عن المحیط. (الشامی، صـ۱۵۲)
(قوله لم یصل الماء تحته) لان الاحتراز عنه غیر ممکن حلیة.
(قوله به یفتی) صرح به فی المنیة عن الذخیرة فی مسألة الحناء والطین والدرن معللا بالضرورة. قال فی شرحها ولان الماء ینفذه لتخلله وعدم لزوجته وصلابته، والمعتبر فی جمیع ذلک نفوذ الماء ووصوله الی البدن اهـ. لکن یرد علیه ان الواجب الغسل وهو اسالة الماء مع التقاطر کمامر فی ارکان الوضوء والظاهر ان هذه الاشیاء تمنع الاسالة فالاظهر التعلیل بالضرورة، ولکن قد یقال ایضاً ان الضرورة فی درن الانف اشد منها فی الحناء والطین لندورهما بالنسبة الیه مع انه تقدم انه یجب غسل ((۱)) ماتحته فینبغی عدم الوجوب فیه ایضا تامل...... الدرن الوسخ، واشار بهذا الی ان المراد بالدرن هنا المتولد من الجسد وهو ما یذهب بالدلک فی الحمام بخلاف الدرن الذی یکون من مخاط الانف فانه لو یابسا یجب ایصال الماء الی ماتحته کمامر...... (قوله بخلاف نحو عجین) ای کعلک وشمع وقشر سمک وخبز ممضوغ متلبد جوهرة، لکن فی النهر ولو فی اظفاره طین او عجین فالفتوی علی انه مغتفر قرویا کان او مدنیا اهـ نعم ذکر الخلاف فی شرح المنیة فی العجین واستظهر المنع لان فیه لزوجة وصلابة تمنع نفوذ الماء (قوله به یفتی) صرح به فی الخلاصة وقال لان الماء شئ لطیف یصل تحته غالبا اهـ ویرد علیه ماقد مناه آنفا ومفاده عدم الجواز اذا علم انه لم یصل الماء تحته، قال فی الحلیة وهو اثبت. (الشامی صـ۱۵۴)
((۱)) (قوله انه یجب غسل الخ) فیه انه لا یقال ذلک مع وجود النص بخلافه وانما یلزم التامل فی وجه الفرق، ویظهر ان علة عدم منع الطهارة فی هده الاشیاء الضرورة مع وجود وصول الماء ولو بغیر التقاطر، بخلاف درن الانف فان الضرورة وجدت فیه الا ان الوصول لم یوجد، وهذا هو الفرق، ویؤیده اکتفاؤهم بتحریک الخاتم الضیق مع انه یمنع الاسالة تامل اهـ.

(۳۵) وضواور غسل میں مصنوعی ٹانگ کے دھونے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں جہاد افغانستان میں شریک ہوا پانچ چھ ماہ لڑائی کے بعد میرے پاؤں میں گولی لگ گئی جس کی وجہ سے کینسر ہوگیا۔ ڈاکٹروں نے میری ٹانگ گھٹنے سے نیچے کاٹ دی، اب میں نے اس کی جگہ مصنوعی ٹانگ لگوالی ہے تو آیا وضواور غسل میں مصنوعی ٹانگ اور پیر کا دھونا ضروری ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... وضواور غسل میں مصنوعی ٹانگ اور پیر کا دھونا ضروری نہیں۔ البتہ غسل میں مصنوعی ٹانگ کو نکال کر باقی بدن کا دھونا

فرض ہے۔

لمافی البحر الرائق (۸۷/۱): الا ما یتعذر ایصال الماء الیه خارج من قضیة النص و کذا ما یتعسر لان المتعسر منفی کالمتعذر کداخل العینین فان فی غسلهما من الحرج مالا یخفی.

وفی الهندیة(۱۳/۱، ۱۴): والصرام والصباغ مافی ظفرهما یمنع تمام الاغتسال وقیل کل ذلک یجزیهم للحرج والضرورة ومواضع الضرورة مستثناة عن قواعد الشرع کذا فی الظهیریة. وجب تحریک القرط والخاتم الضیقین ولو لم یکن قرط فدخل الماء الثقب عند مروره أجزأه والا أدخله ولا یتکلف فی ادخال شئ سوی الماء من خشب ونحو. کذا فی البحر الرائق.

وفی الدر المختار مع ردالمحتار(۱/۱۵۲، ۱۵۳): (لا) یجب (غسل مافیه حرج کعین) وان اکتحل بکحل نجس (وثقب انضم و) لا (داخل قلفة) یندب هو الاصح قاله الکمال وعلله بالحرج فسقط الاشکال.

قال الشامی تحت(قوله وثقب انضم) قال فی شرح المنیة وإن انضم الثقب بعد نزع القرط وصار بحال إن امر علیه الماء یدخله وإن غفل لا فلا بد من امراره ولا یتکلف لغیر الامرار من ادخال عود ونحوه فان الحرج مدفوع (قوله وداخل قلفة...... وفیه ایضاً(قوله فسقط الاشکال) ...... ووجه السقوط أن علة عدم وجوب غسلها الحرج.

(۳۶) ناخنوں پرمہندی لگی ہوتو وضوو غسل کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہاتھ میں اور ناخنوں میں مہندی لگا کر وضوو غسل کرنے سے وضوو غسل ہو جائے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر کسی کے ہاتھ یا ناخنوں پر مہندی لگی ہو تو یہ وضوو غسل کے صحیح ہونے سے مانع نہیں ہوگی۔ مہندی کے ہوتے ہوئے وضو اور غسل ہو جائے گا جبکہ یقین ہو کہ پانی نیچے تک پہنچ گیا ہے۔

لمافی الدر المختار(۱/۱۵۴): (ولا یمنع) الطهارة (ونیم) ای خرء ذباب وبرغوث لم یصل المآء تحته (وحناء) ولو جرمه، وبه یفتی.

وفی الهندیة (۴/۱): اوالمرأة صبغت اصبعها بالحنآء اوالصباغ قال کل ذالک سواء یجزیهم وضؤهم.

(۳۷) ریل کے دوسرے درجے کے مسافر کیلئے پہلے درجے میں جا کر وضو وغسل کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بذریعہ ریل سفر کرتے ہوئے، اکانومی درجے میں سفر کرنے والے مسافر کیلئے اکانومی ڈبے میں پانی ختم ہونے کی صورت میں وضو کرنے کیلئے یا بوقت حاجت غسل کرنے کیلئے، اے سی، لوئر بس، ریل کار وغیرہ میں جا کر وضو یا غسل کرنا شرعاً کیسا ہے؟ واضح رہے کہ (۱)۔اکانومی ڈبے کی ٹکٹ اور دوسرے درجات کی ٹکٹوں میں فرق ہوتا ہے، (۲)۔ایک درجے والا دوسرے درجے میں سفر نہیں کرسکتا۔ نیز اس صورت میں اگر اجازت نہیں ہے تو نماز کیلئے تیمّم کرنا درست ہوگا؟ اس حال میں کہ وقت کے اندر اندر گاڑی رکنے کا امکان نہیں یا پھر اگر رکے تو اسٹیشن پر غسل کا انتظام نہیں اور اگر ہو بھی تو گاڑی رکنے کا وقت اتنا قلیل ہے کہ غسل ممکن نہیں۔اور اندر بھی کسی اکانومی ڈبے میں پانی نہیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر ریلوے انتظامیہ والوں کی طرف سے ہر خاص وعام ڈبے کو برابر طور پر پانی پہنچانا اُن کی ذمہ داری ہو چاہے اکانومی درجے کے ڈبے ہوں یا اے سی کے ڈبے ہوں، اُن کی طرف سے پانی وغیرہ کے استعمال پر کوئی پابندی نہ ہو، اکانومی درجے کے ڈبے میں پانی ختم ہوگیا، تو اس صورت میں اے سی والے ڈبے میں جا کر وہاں وضو بنانا یا وہاں سے پانی لانا یہ جائز ہوگا، تیمّم کرنا جائز نہیں ہوگا۔اگر ہر خاص وعام ڈبے میں انتظامیہ والوں کی طرف سے جانے پر یا پانی کے استعمال پر پابندی ہو، تو اس صورت میں یہ مسافر اکانومی درجے کے ڈبے میں حتی الامکان پانی تلاش کرے، اگرچہ مناسب پیسوں پر کیوں نہ ہو، اگر پانی اکانومی درجے کے ڈبے میں نہ ہو اور گاڑی کے رُکنے کا امکان بھی نہ ہو یا گاڑی اسٹیشن پر رُکتی ہو لیکن وہاں پانی موجود نہ ہو تو یہ شخص تیمّم کرسکتا ہے چاہے وضو کیلئے ہو یا جنابت کیلئے ہو۔اس شخص کیلئے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اے سی یا لوئر بس وغیرہ میں جا کر بغیر اجازت کے وہاں کے پانی سے وضو بنائے یا غسل کرے۔کیونکہ کسی مسلمان کے مال کو بغیر اُس کی رضامندی کے استعمال کرنا یہ غصب میں آتا ہے، اور مغصوبہ چیز کا استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

لمافی الشامية(۱/۲۳۲): (قوله من عجز) العجز علی نوعین: عجز من حیث الصورة والمعنی، وعجز من حیث المعنی فقط، فأشار الی الاول بقوله لبعده، وإلی الثانی بقوله (أو المرض)...... وأیضاً(صـ۲۳۳)(قوله ولو مقیما) لأن الشرط هو العدم فأینما تحقق جاز التیمم، نص علیه فی الأسرار بحر...... وأیضاً فی تنویر الابصار مع شرحه(صـ۲۴۶،۲۴۷)(ویجب) أی یفترض (طلبه) ولو برسوله (قدر غلوة) ثلثمائة ذراع من کل جانب، ذکره الحلبی، وفی البدائع: الأصح طلبه قدر مالایضر بنفسه ورفقته بالانتظار (إن ظن) ظنا قویاً (قربه) دون میل بأمارة أو اخبار عدل (وألا) یغلب علی ظنه قربه (لا) یجب بل یندب إن رجا وإلا لا، ولو صلی بتیمم وثمه من یسأله ثم اخبره بالماء أعاد وإلا لا.

وفی الفقه الاسلامی(۱/۵۹۵) ویلزمه شراء الماء بثمن معتاد لم یحتج له، نقداً أو دیناً فی الذمة، فإن زاد علی الثمن المعتاد، ولو درهماً علی الراجح، فی ذلک المحل وما قاربه، فلا یلزمه الشراء.

(۳۸) غسل سے پہلے یا غسل کے بعد وضو کرنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ جب وہ غسل کرتے ہیں تو غسل کے بعد مکمل وضو کرتے ہیں کیا ان کا یہ طریقہ صحیح ہے یا نہیں؟ اگر کوئی شخص غسل سے پہلے وضو نہ کرے تو اس کیلئے غسل کے بعد وضو کرنا ضروری ہوگا یا غسل ہی کافی ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......غسل سے پہلے وضو کرنا سنت ہے۔ غسل کے بعد وضو کرنا حدیث پاک کی رُو سے مکروہ ہے۔ اگر کوئی غسل سے پہلے وضو نہ کرے تو غسل کے بعد وضو کی ضرورت نہیں ہے۔ غسل کرنا کافی ہوگا۔ البتہ غسل جنابت میں کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا ضروری ہے۔

لمافی فتاویٰ سراجیة(ص-۲): اذا اصاب الرجل المطر اووقع فی نهر جاز وضوءُ وغسله ایضاً ان اصاب جمیع بدنه وعلیه المضمضة والإستنشاق.

وفی التاتارخانیة(۱/۱۵۱): وتقدیم الوضوء علی الإغتسال فی الجنابة سنة ولیس بفرض عند علمائنا رحمهم الله. حتی انّه لولم یتوضأ وافاض الماء علی رأسه وسائر جسده ثلاثا أجزاه اذا کان قد تمضمض وا ستنشق.

وفی الدر المختار(۱/۱۵۸): لو توضأ أوّلاً لا یاتی به ثانیاً لأنّه لا یستحب وضوء ان للغسل اتفاقاً، اما لو توضأ بعد الغسل واختلف المجلس علی مذهبنا الخ.

وقال الشامی رحمه الله تحته: (قوله لانه لا یستحب) .... أخرج الطبرانی فی الأوسط عن ابن عباس رضی الله عنهما قال قال رسول الله ﷺ من توضا بعد الغسل فلیس منا والظاهر أن عدم استحباب لو بقی متوضا الی فراغ الغسل فلو أحدث قبله ینبغی اعادته.

(۳۹) اعضاءِ وضو کٹے ہوئے ہوں تو وضو کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کے دونوں ہاتھ کٹے ہوئے ہوں، جسکی وجہ سے وضو نہ کرسکتا ہو یا ایک ہاتھ کٹا ہوا ہو کہ وضو کرنا مشکل ہو تو ایسی صورت میں وضو ساقط ہوگا یا نہیں، اسی طرح نماز پڑھنی ضروری ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلياً......صورت مسئولہ میں جس شخص کے دونوں ہاتھ کٹے ہوئے ہوں اور وضو پر قادر نہ ہوتو اس صورت میں اگر خادم وغیرہ ہوتو وہی وضو کرائے ، اگر خادم وغیرہ نہ ہوتو کسی کو اجرت پر مزدور رکھ لیں ،لیکن اگر نہ تو خادم وغیرہ ہو،اور نہ ہی مزدور رکھنے کی استطاعت ہوتو ایسے شخص سے وضو ساقط ہو جائے گا ،لہٰذا تیمم کر کے نماز پڑھ لے،اور تیمم کی صورت یہ ہوگی کہ اپنے چہرے اور کٹے ہوئے ہاتھوں سے جو حصہ باقی ہوا سے دیوار سے مل لے۔

اور جس شخص کا ایک ہاتھ کٹا ہوا ہوتو وہ عام طور پر وضو پر قادر ہوتا ہے،لہٰذا اس سے وضو ساقط نہیں ہوگا ،البتہ جو ہاتھ کٹا ہوا ہے اگر وہ کہنی سے اوپر تک کٹا ہوا ہوتو اس ہاتھ کو نہیں دھوئے گا اور اگر وہ کہنی کے نیچے سے کٹا ہوا ہوتو باقی ماندہ ہاتھ کو دھونا لازم ہوگا۔

لمافي الهنديه (۱/۲۸): أو كان لايجد من يوضيه ولايقدر بنفسه فان وجد خادماًاوما يستأجر به اجيراًاو عنده من لواستعان به اعانه فعلى ظاهر المذهب انه لا يتيمم لانه قادر.

وفيها ايضاً(۱/۵): ولو قطعت يده اورجله فلم يبق من المرفق والكعب شئی سقط الغسل ولوبقى وجب وكذا غسل موضع القطع.

وفي ردالمحتار (۱۰۲/۲):وقيل لاصلوٰة عليه اختاره صاحب الدرر في متنه وشرحه فقال قطعت يداه ورجلاه من المرفق والكعب لا صلوة عليه كذافي الكافي وقيل ان وجد من يوضيه يامره ليغسل وجهه وموضع القطع ويمسح راسه والاوضع وجهه ورأسه في الماء اويمسح وجهه وموضع القطع علىٰ جدار فيصلى كذا في التاتارخانية .

(۴۰) وضو میں اکثر شک ہوتو نیا وضو کرے یا نہ کرے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کو اکثر وضو میں شک ہوتا ہوتو کیا وہ ہر نماز کیلئے وضو کرے گا؟

الجواب حامداً ومصلياً......شک کی وجہ سے وضو نہیں ٹوٹتا اس لئے ایسے شخص کو ہر نماز کے لئے نئے سرے سے وضو کرنا ضروری نہیں،اور اگر کسی کو اس طرح کے شک کی عادت ہو جیسا کہ صورت مسئولہ میں ہے تو اس کو چاہئے کہ اس کی طرف بالکل التفات نہ کرے کیونکہ یہ شیطانی وسوسہ ہے اور حدیث شریف میں اس سے بچنے کی تلقین آئی ہے۔

لمافي الهندية(۱/۱۳): في الاصل من شك في بعض وضوئه وهو اول ماشك غسل الموضع الذى شك فيه فان وقع ذلك كثيراً لم يلتفت اليه هذا اذا كان الشك في خلال الوضوء فان كان بعد الفراغ من الوضوء لم يلتفت الى ذلك ومن شك في الحدث فهو على وضوئه ولو كان محدثا فشك في الطهارة فهو على حدثه ولا يعمل بالتحرى كذا في الخلاصة.

وفي الدر المختار (۱/۱۵۰): شک في بعض وضوئه أعادماشک فيه لوفي خلاله ولم يكن الشک عادة له والا لا.

وفي الشامية تحته: (قوله والالا) أي وان لم يكن في خلاله بل كان بعد الفراغ منه وان كان أول ماعرض له الشک أو كان الشک عادة له وان كان في خلاله فلا يعيد شيئا للوسوسة عنه كما في التاتارخانيه.

(۴۱) وضو کے بعد اگر وضو میں شک پڑ گیا تو......

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی گھر سے وضو کر کے مسجد جائے اور وہاں جا کر کسی عضو کے بارے میں شک پڑ جائے کہ یہ بھی دھویا ہے یا نہیں؟ ایسی صورت میں وضو دوبارہ کرے یا کوئی اور صورت اختیار کرے؟ نیز اگر یہی شک نماز کے بعد ہو جائے تو پھر کیا کرے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں وضو سے فراغت کے بعد اگر شک ہو جائے، چاہے یہ شک وضو کے بعد ہو یا نماز کے بعد تو ایسے شک کا کوئی اعتبار نہیں، لہٰذا ایسے وضو سے نماز کی ادائیگی صحیح ہے، دوبارہ وضو کی ضرورت نہیں۔

لمافي الهندية (۱/۱۳): من شک في بعض وضوئه......فان وقع ذلک كثيرا لم يلتفت اليه هذا اذا كان الشک في خلال الوضوء فان كان بعد الفراغ من الوضوء لم يلتفت الى ذلک.

(۴۲) گرمی دانوں کے پانی سے وضو ٹوٹنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کے بدن پر گرمی دانے ہوں اور ان سے پانی نکل آئے تو کیا وضو ٹوٹ جائے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں صرف گرمی دانوں سے پانی نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا البتہ جب پانی نکل کر بہہ جائے تو وضو ٹوٹ جائے گا۔

وفي الهندية (۱/۱۰): مايخرج من غير السبيلين ويسيل الى مايظهر من الدم والقيح والصديد والماء لعلة وحد السيلان أن يعلو فينحدر عن رأس الجرح.

وفي الدر المختار (۱/۱۳۴): (وينقضه خروج) كل خارج (نجس) بالفتح وبكسر (منه) أي من المتوضئ الحي معتادا أولا من السبيلين أولا (إلى مايطهر) بالبناء للمفعول أي يلحقه حكم التطهير ثم المراد بالخروج من السبيلين مجرد الظهور وفي غيرهما عين السيلان ولو بالقوة لماقالوا.

(۴۳) کلّی کرتے وقت دانتوں سے خون آنے کی صورت میں وضو کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں جب کلّی کرتا ہوں تو میرے دانتوں سے تھوڑا بہت خون نکل آتا ہے۔ ایسی صورت میں میرا وضو صحیح ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... دوران وضو کلی کرتے ہوئے اگر منہ سے تھوڑا بہت خون نکلتا ہو، تو اس صورت میں وضو جاری رکھنے میں کوئی حرج نہیں البتہ وضو کر لینے کے بعد یا ویسے ہی کلی کرتے وقت اگر منہ سے خون نکلے اور خون تھوک پر غالب یا مساوی ہو (اس طور پر کہ تھوک میں سرخی آ گئی ہو) تو وضو ٹوٹ جائے گا اور اگر تھوک غالب اور خون مغلوب ہو، اس طور پر کہ تھوک زردی مائل ہے تو پھر وضو نہیں ٹوٹے گا۔

لمافی الهندية (۱/۱۱): ان خرج من نفس الفم تعتبر الغلبة بينه وبين الريق فان تسا ويا انتقض الوضوء ويعتبر ذالک من حيث اللون فان كان احمر انتقض وان كان اصفر لا ينتقض كذا في التبيين المتوضئ اذا عض شيئاً فوجد فيه اثر الدم او استاک بسواک فوجد فيه اثر الدم لاينتقض مالم يعرف السيلان.

وفی الدر المختار (۱/۱۳۸، ۱۳۹): (و)ينقضه (دم) مائع من جوف اوفم (غلب على بزاق) حكماً للغالب (اوساواه) احتياطاً (لا) ينقضه (المغلوب بالبزاق).

وفی الشامية تحته: (قوله غلب على بزاق)........ وعلامة كون الدم غالباً او مساوياً ان يكون البزاق احمر وعلامة كونه مغلوباً ان يكون اصفر.

(۴۴) دوران وضو کوئی ناقض وضو پایا جائے

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کو وضو کرتے ہوئے کوئی ایسی ضرورت پیش آجائے جس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے تو دوبارہ از سر نو وضو کرنا پڑے گا یا جو ہو چکا وہی کافی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اس صورت میں از سر نو وضو کرنا ضروری ہے۔

لمافی الهندية (۱/۲۶): لو ضرب يديه فقبل أن يمسح أحدث لا يجوز المسح بتلك الضربة كمالو أحدث في الوضوء بعد غسل بعض الأعضاء.

(۴۵) اگر دانتوں سے خون آجائے تو وضو کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض دفعہ باوضو ہوتے ہوئے جب دوسری نماز کا وقت

آ جائے تو میں صرف مسواک استعمال کرتا ہوں، اب اس میں بعض دفعہ خون کے اثرات ظاہر ہو جاتے ہیں، کیا منہ سے تھوڑا سا بھی خون نکل آئے تو اس سے وضوٹوٹ جاتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں اگر خون کے بارے میں معلوم ہو کہ کہاں سے نکل رہا ہے تو دیکھا جائے گا، اگر بہہ رہا ہو تو وضو ٹوٹ جائے گا اور اگر نہ بہے تو وضو نہیں ٹوٹے گا۔ اور اگر یہ معلوم نہ ہو کہ کہاں سے نکل رہا ہے تو تھوک کو دیکھیں گے اگر خون کی سرخی تھوک کے برابر ہو یا تھوک سے زیادہ ہو تو وضوٹوٹ جائے گا لیکن اگر خون کی سرخی تھوک سے کم ہو تو وضو نہیں ٹوٹے گا۔

لمافی الهندية (۱/۱۱):المتوضئی اذا عض شيئاًفوجد فيه أثرالدم او استاک بسواک فوجد فيه أثرالدم لا ينتقض مالم يعرف السيلان كذا فی الظهيرية.

وفی الشامية (۱/۱۳۹): (غلب علی البزاق)......علامة كون الدم غالباً او مساوياً ان يكون البزاق احمر وعلامة كونه مغلوباًان يكون اصفر بحر ط.

(احتياطاً)ای لاحتمال السيلان وعدمه فرجح الوجود احتياطا بخلاف ما اذا شک فی الحدث لانه لم يوجد الا مجردالشک ولا عبرة له مع اليقين .

(۴۶) کیا تھوڑا سا خون نکلنا بھی ناقض وضو ہے؟

سوال ......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کے جسم پر پھوڑا نکل آئے اور وہ اسے دبا دے جس سے کچھ خون بھی نکل آئے تو کیا اس طرح تھوڑا سا خون نکلنے سے بھی وضوٹوٹ جاتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں اگر خون اتنا نکلا کہ اپنی جگہ سے آگے نہیں بڑھا تو وضو نہیں ٹوٹا اور اگر اپنی جگہ سے آگے بڑھ گیا یعنی بہنا شروع کر دیا تو وضوٹوٹ جائے گا۔

لمافی الهندية (۱/۱۱):خرج دم من القرحة بالعصر ولولاه ماخرج نقض فی المختار كذا فی الوجيز لكردری.

وفی الدرالمختار (۱/۱۳۵):المراد بالخروج من السبيلين مجرد الظهور وفی غيرهما عين السيلان ولو بالقوة .

وفی الشامية (عين السيلان)اختلف فی تفسيره،ففی المحيط عن ابی يوسف ان يعلو وينحدر،وعن محمد اذا انتفخ علی رأس الجرح وصار اكثر من رأسه نقض،والصحيح لا ينقض .قال فی الفتح بعد نقله ذلک وفی الدراية جعل قول محمد أصح ومختار السرخسی الاول وهوالاولی اقول كذا صححه قاضی خان وغيره.

(۴۷) دودھ پلانے سے وضو کا نہ ٹوٹنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری شادی کو دو سال ہونے والے ہیں اللہ پاک نے اپنے کرم سے ایک بیٹا دیا ہے جو مجھے بہت ہی پیارا ہے ایک دن میں نے نماز کیلئے وضو کیا وضو کے بعد میرا بیٹا رونے لگا تو میں نے اس کو دودھ پلانا شروع کیا اس وقت مجھے شوہر نے منع کیا کہ وضو کے بعد نماز سے پہلے دودھ نہ پلایا کرو بچہ کو دودھ پلانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے کیا میرے شوہر کی بات صحیح ہے؟ یا اس سے وضو پر کوئی اثر نہیں پڑتا؟

الجواب حامداً ومصلیاً......جو چیزیں وضوء کو توڑتی ہیں ان میں یہ بات ہے کہ نجس چیز کا خروج پایا جائے یا اگر کوئی پاک چیز بھی موضع نجاست یعنی سبیلین سے نکلے تو وضوء ٹوٹ جاتا ہے چونکہ دودھ بذات خود پاک ہے اور اس کا خروج بھی موضع نجاست سے نہیں ہے اس لئے وضوء نہیں ٹوٹے گا کیونکہ نجس چیز کے نکلنے سے وضوء ٹوٹتا ہے اور دودھ پاک ہے نجس نہیں ہے، اس لئے آپ کے دودھ پلانے سے وضوء پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

لمافی تبیین الحقائق(۱/۴۵،۴۷،۴۸): (وینقضه خروج نجس منه) ای وینقض الوضوء خروج نجس فدخل تحت هذه الكلمة جميع النواقض الحقيقية وان كان طاهرا فی نفسه كالدودة من الدبر لانها تستصحب شياء من النجاسة وتلک هی الناقضة للوضوء فصدق قوله خروج نجس وهو مجمل فيحتاج فيه الى التفاصيل من بيان المخرج وما يخرج منه اعلم ان المخرج على نوعين سبيلين وغيرهما اما السبيلان فخروج كل شئ منهما ناقض للوضوء...... وأما غيرهما ای غير السبيلين اذا خرج منه شئ ووصل الى موضع يجب تطهيره فی الجنابة ونحوه ينقض الوضوء ...... ولا فرق بين الصديد والدم والقيح والماء خلافا للحسن فی غير الدم هو يجعله كالعرق واللبن والمخاط.

وفی الشامية مع الدر(۱/۱۳۴): (وينقضه خروج) كل خارج (نجس)...... (منه) ای من المتوضیٔ حاصله ان الطهارة ترتفع بضدها وهی النجاسة القائمة بالخارج لان الضد هو المؤثر فی رفع ضده.

وفی الدر مع الشامية(۱/۱۳۵): وخروج غير نجس مثل ريح(قوله مثل ريح) فانها تنقض لانها منبعثة عن محل النجاسة لا لان عينها نجسة لان الصحيح ان عينها طاهرة حتى لو لبس سراويل مبتلة او ابتل من اليتيه الموضع الذی تمربه الريح فخرج الريح لا يتنجس.

وفی الدرالمختار(۱/۱۴۷): (كما) لا ينقض (لو خرج من اذنه) ونحوها كعينه وثديه (قيح) ونحوه كصديد وماء سرة وعين (لابوجع) وان خرج به ای بوجع نقض.

(۴۸) متفرق طور پر تھوڑی تھوڑی قے آنے سے وضو کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ متفرق طور پر تھوڑی تھوڑی مقدار میں اتنی قے کرنا اگر اس کو جمع کیا جائے تو منہ بھر کر ہو، کیا اس سے وضوٹوٹ جاتا ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......اگر متفرق طور پر تھوڑی تھوڑی مقدار میں اتنی قے ہوئی ہو جو منہ بھر کر ہو اور اس کا سبب (متلی وغیرہ) ایک ہی ہو اگرچہ یہ قے وقفہ کے ساتھ مختلف مجالس میں ہو تو اصح قول کے مطابق اس سے وضوٹوٹ جاتا ہے۔

لمافی الهندية (۱/۱۱): وان قاء قليلا قليلا لوجمع يبلغ ملأ الفم قال محمد رحمه الله تعالىٰ ان اتحد السبب جمع والا فلا وهذا اصح.

وفي الدرالمختار (۱/۱۴۰): (ويجمع متفرق القئ) ويجعل كقئ واحد(لاتحاد السبب) وهو الغثيان عند محمد وهو الاصح.

(۴۹) بیٹھے بیٹھے سوجانے سے وضوٹوٹنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری عادت یہ ہے کہ میں فجر کے بعد اشراق تک مسجد میں بیٹھا رہتا ہوں البتہ کبھی کبھی سوجاتا ہوں جس میں، میں نے اپنا سر گھٹنوں پر رکھا ہوتا ہے، اس طرح بعض دفعہ گر بھی جاتا ہوں، کیا اس طرح سونے سے وضوٹوٹ جاتا ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر بیٹھے بیٹھے سو جائیں یا سونے کی وجہ سے گر جائیں اور گرتے ہی فوراً جاگ جائیں تو اس سے وضو نہیں ٹوٹے گا، لیکن اگر گرنے کے بعد فوراً نہ جاگیں بلکہ کچھ دیر بعد جاگیں تو وضوٹوٹ جائے گا۔

لمافي الهندية (۱/۱۲): ولو نام قاعداً فسقط على وجهه أو جنبه ان انتبه قبل سقوطه أو حالة سقوطه أو سقط نائماً وانتبه من ساعته لا ينتقض وان استقر نائماً ثم انتبه ينتقض.

لمافي الدر المختار (۱/۱۴۲): ولو نام قاعداً يتمايل فسقط،ان انتبه حين سقط فلا نقض به يفتىٰ.

وفي الشامية (حين سقط) اى عند اصابة الارض بلا فصل شرح منية،وكذا قبل السقوط او فى حال السقوط ،اما لو استقر ثم انتبه نقض لأنه وجد النوم مضطجعاً حلية.

(۵۰) حالت نماز میں نیند آجانے سے وضوٹوٹنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نماز کی حالت میں تھا کہ اس کو نیند آگئی تو کیا

نماز کی حالت میں سوجانے سے وضوٹوٹ جائے گا یانہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً......نیند کی ہر وہ حالت جو استرخائے مفاصل (اعضاء کے ڈھیلے ہوجانے) کا سبب بنے وہ ناقض وضو ہے خواہ نماز کی حالت میں ہو یا خارج ازصلوۃ ہو۔لہٰذا نماز میں مطلقاً نیند آجانے سے وضونہیں ٹوٹے گا خواہ قیام کی حالت میں ہو یا رکوع وسجود کی حالت میں، چاہے جان بوجھ کرسوجائے۔لیکن اگر سجدہ کو غیر مسنون طریقہ سے ادا کرتے ہوئے سوگیا تو چونکہ اس صورت میں استرخائے مفاصل ہوجاتا ہے اس لئے اس صورت میں وضوٹوٹ جائے گا اور نماز فاسد ہوجائے گی۔

لمافی الهندية(۱/۱۲): (ومنها النوم) ينقضه النوم مضطجعا فی الصلوة وفی غيرها بلاخلاف بين الفقهاء...... ولا ينقض نوم القائم والقاعد ولوفی السرج او المحمل ولا الراكع ولا الساجد مطلقا ان كان فی الصلوة وان كان خارجها فكذالک الافی السجود فانه يشترط ان يكون علی الهيئة المسنونة له بان يكون رافعا بطنه عن فخذيه مجافيا عضديه عن جنبيه و ان سجد علی غير هذه الهيئة انتقض وضوءه.

وفی الدرالمختار(۱/۱۴۱):(و) ينقضه حكما (نوم يزيل مسكته) ای قوته الما سكة بحيث تزول مقعدته من الارض وهو نوم علی احد جنبيه أو وركيه أو قفاه أو وجهه(والا) يزل مسكته (لا)ينقض وان تعمده فی الصلوة أو غيرها علی المختار كالنوم.

وفی الشامية تحته : ظاهر الرواية ان النوم فی الصلوة قائما أو قاعدا او ساجدا لايكون حدثا سواء غلبه النوم أو تعمده.

(۵۱) انجکشن کے ذریعے خون نکالنے سے وضوٹوٹنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص انجکشن کے ذریعے سے خون نکلوائے جیسے کہ کسی ٹیسٹ وغیرہ کیلئے نکالتے ہیں،تو کیا اس سے وضوٹوٹ جائے گا؟

الجواب حامداًومصلیاً......صورت مسئولہ میں انجکشن کے ذریعے خون نکلوانے سے وضوٹوٹ جائے گا۔کیونکہ خون سے وضو کے ٹوٹ جانے کیلئے ''بہنا'' ضروری ہے،وہ اگرچہ یہاں بالفعل نہیں پایا جارہا لیکن بالقوۃ پایا جارہا ہے یعنی اس میں بہنے کی صلاحیت موجود ہے۔لہٰذا اس سے وضوٹوٹ جائے گا۔

لمافی الهندية (۱/۱۱):القراد اذا مص عضو انسان فامتلأ دماً ان كان صغيراً لا ينقض وضوئه كما لو مصت الذباب او البعوض وان كان كبيراً ينقض.

وفی الدرالمختار (۱/۱۳۵):ثم المراد بالخروج من السبيلين مجرد الظهور وفی غيرهما عين

السیلان ولو بالقوة لما قالوالو مسح الدم کلما خرج ولو ترکه لسال نقض والا لا.

وفی الشامية (۱/۱۳۴): فالاحسن ما فی النهر عن بعض المتاخرين من ان المراد السيلان ولو بالقوة ای فان دم الفصد ونحوه سائل الی ما يلحقه حکم التطهير حکما......

(۵۲) انجکشن کے ذریعہ مریض کے پیٹ سے پیشاب نکالنے پر وضوٹوٹنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص بیمار ہے ہسپتال میں پڑا ہوا ہے دونوں راستوں سے پیشاب بند ہے ڈاکٹروں نے اس کا پیشاب انجکشن کے ذریعے پیٹ میں سوراخ کر کے نکال دیا۔ مطلوبہ امر یہ ہے کہ اس مریض کا وضوٹوٹ جائے گا یا نہیں؟ کیونکہ فقہاء نے صرف احد السبلین کی شرط لگائی ہے۔

الجواب حامداًومصلیاً...... صورت مسئولہ میں اگر انجکشن کے ذریعے ڈاکٹروں نے پیشاب نکالا ہے تو مریض کا وضوٹوٹ جائے گا کیونکہ احناف کے ہاں احد السبلین (پیشاب و پاخانہ کے مقام) کے علاوہ سے بھی اگر نجاست نکل آئے تو وضوٹوٹ جاتا ہے نیز اگر چہ یہاں خروج نجس نہیں ہے بلکہ اخراج (نکالنا) ہے لیکن اخراج سے بھی وضوٹوٹ جاتا ہے۔

لمافی البزازية علی هامش الهندية (۴/۱۲): خرج دم من القرحة بالعصر ولولاه ماخرج نقض فی المختار لان فی الاخراج خروجاً،

وفی الدر المختار (۱/۱۳۶،۱۳۷): (والخارج) بنفسه (سيان) فی حکم النقض علی المختار کمافی البزازية: قال لان فی الاخراج خروجاً فصار کالفصد وفی الفتح عن الکافی انه الاصح، واعتمد القهستانی، وفی القنية وجامع الفتاوی إنه الاشبه ومعناه انه الاشبه بالنصوص رواية والراجح دراية فيکون الفتوی عليه.

وفی الشامية تحته: (قوله لان فی الاخراج خروجاً)...... وفيه انه لاتأثير يظهر للاخراج وعدمه بل لکونه خارجاً نجسا وذلک يتحقق مع الاخراج کما يتحقق مع عدمه فصار کالفصد الخ.

(۵۳) کھانسی میں بلغم کے ساتھ خون آئے تو وضوٹوٹنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک دوست ہے بعض اوقات جب اس کو کھانسی آتی ہے تو بلغم کے ساتھ خون بھی نکلتا ہے، تو کیا اس سے وضو پر کچھ فرق پڑتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً...... کھانسی کے ساتھ جو بلغم آئے وہ فی نفسہ پاک ہے۔ لیکن اگر اس بلغم میں خون کی آمیزش ہو جائے تو دیکھا جائے گا کہ خون غالب ہے یا بلغم، اگر خون غالب ہے تو وضوٹوٹ جائیگا اور اگر بلغم غالب ہے تو وضو نہیں ٹوٹے گا البتہ خون اور بلغم کے برابر ہونے

کی صورت میں احتیاط اسی میں ہے کہ دوبارہ وضو کرے۔

لمافی الطحطاوی علی الدر (۱/۸۰): (قوله علی بزاق) هو بالزای والسین والصاد کما فی شرح المنیه. (قوله حکما للغالب) علة للنقض (قوله او ساواه) علامة کون الدم غالبا او مساویاً أن یکون البزاق احمر و علامة کونه مغلوبا أن یکون اصفر(قوله احتیاطاً) علة للنقض حال المساواة وذلک لانه یحتمل أن یکون سیلانه بنفسه او أساله غیره فوجد الحدث من وجه فرجحنا جانب الوجود احتیاطاً ......(قوله لاینقضه المغلوب) لان الغالب البزاق والحکم له فکأن کله بزاق.

وفی الدر المختار (۱/۱۳۸): (و)ینقضه (دم) مائع من جوف اوفم (غلب علی بزاق) حکما للغالب (اوساواه) احتیاطاً (لا) ینقضه (المغلوب بالبزاق) والقیح کالدم والاختلاط بالمخاط کالبزاق.

(۵۴) آنکھوں سے بہنے والے پانی سے وضوٹوٹنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر کسی کی آنکھوں میں تکلیف ہواور اس تکلیف کی بناء پر آنکھوں سے مسلسل پانی بہتا ہوتو کیا اس پانی کے نکلنے سے بھی وضوٹوٹ جائے گا یا اس سے وضونہیں ٹوٹے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر پانی چندھیا، پھنسی یا آشوب چشم کی وجہ سے ہواور اس قدر مسلسل بہتا ہو کہ ایک نماز کے وقت میں صرف فرض کی ادائیگی بھی دشوار ہو(کہ وضو کے بعد پانی بہنے سے پہلے پہلے نماز ادانہ کی جاسکتی ہو)تو وہ معذور ہے، ہرنماز کیلئے وضوکرلیا کرے،اور اگر اس قدر مسلسل نہ ہو بلکہ کبھی کبھار نکل آتا ہوتو چونکہ اس سے وضوٹوٹ جاتا ہےلہٰذا وہ دوبارہ وضو کیا کرےاور یہ پانی کسی بیماری کی وجہ سے نہ ہو بلکہ صرف آنسوں بہہ جائیں تو اس سے وضونہیں ٹوٹتا لہٰذا دوبارہ وضو کی ضرورت نہیں۔

لمافی الهندیة (۱/۱۱):والغرب فی العین بمنزلة الجرح فما یسیل منه ینقض الوضوء کذا فی فتاوی قاضیخان ، ولو کان فی عینیه رمد أو عمش یسیل منهما الدموع قالوا یؤمر بالوضوء لوقت کل صلاة لاحتمال أن یکون صدیداً او قیحاً.

وفی رد المحتار (۱/۱۴۸):وعن محمد اذا کان فی عینیه رمد و تسیل الدموع منها أمره بالوضوء لوقت کل صلاة لانی اخاف أن یکون مایسیل منها صدیداً فیکون صا حب العذر.

(۵۵) سوزشی آنکھوں سے مسلسل پانی بہہ رہا ہوتو وضو ونماز کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کسی آدمی کی آنکھ میں سوزش ہورہی ہو،اور اس کی وجہ سے آنکھ سے پانی نکل رہا ہو، کیا از روئے شرع وضوٹوٹ جائے گا یانہیں؟ اگر ٹوٹ جاتا ہےتو نماز پڑھنے کا کیا طریقہ ہوگا،جبکہ پانی مسلسل

بہہ رہا ہو؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں ذکر کردہ مرض میں مبتلا آدمی کا وضوٹوٹ جاتا ہے اگر ایک وقت نماز کے بقدر بھی پانی بہنے کا سلسلہ منقطع نہ ہوتا ہو تو اس کو شرعاً معذور شمار کیا جاتا ہے جس کے لئے نماز پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہر فرض نماز کیلئے علیحدہ وضو کرے۔ اس سے وہ فرض اور نوافل اسی وقت کے اندر اندر جتنا ہو سکے پڑھتا رہے پھر دوسرے وقت کے فرض کے لئے دوسرا وضو کرے۔

لما في الهندية(۱/۱۱): والغرب في العين بمنزلة الجرح فما يسيل منه ينقض الوضو...... ولو كان في عينه رمد او عمش يسيل منهما الدموع قالوا يؤمر بالوضوء لوقت كل صلاة لاحتمال ان يكون صديدا او قيحا. كذا في التبيين.

وفي الدر المختار(۱/۱۴۸، ۱۴۷): فدمع من بعينه رمد او عمش ناقض فان استمر صار ذا عذر "مجتبى" والناس عنه غافلون.

وفي الدر المختار (۱/۳۰۵):(صاحب عذر من به سلس) بول لايمكنه امساكه...... او بعينه رمد او عمش او غرب وكذا كل مايخرج بوجع ...... (ان استوعب عذره تمام وقت صلاة مفروضة) الى ان قال...... (وحكمه، الوضؤ)...... (لكل فرض) ثم يصلى فيه فرضا ونفلا فاذاخرج الوقت بطل) الخ.

(۵۶) شرمگاہ سے رطوبت خارج ہونے سے وضو وغسل کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کو بیٹھے بیٹھے کسی لڑکی کا خیال آیا، یا اس نے کسی لڑکی کو دیکھا اور اسی وقت شرمگاہ سے رطوبت خارج ہوئی تو اس سے غسل واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... مذکورہ بالا صورت میں جب رطوبت شرمگاہ سے خارج ہوئی تو یہ چار حال سے خالی نہیں ہوگی پیشاب ہوگا، یا مذی ہوگی، یا ودی ہوگی یا منی ہوگی۔ پہلی تین صورتوں میں غسل واجب نہیں ہوتا ہے بلکہ صرف وضو کرے گا اور اگر منی ہو تو اگر دفق یعنی کود کر شہوت کے ساتھ نکلی ہو تو غسل کرنا واجب ہے اور اگر دفق وشہوت کے ساتھ نہ ہو تو غسل واجب نہ ہوگا اور اگر منی کے اپنی جگہ سے جدا ہوتے وقت شہوت موجود تھی اگر چہ شرمگاہ سے نکلتے وقت شہوت نہ ہو پھر بھی غسل کرنا واجب ہے۔ منی......وہ گاڑھا پانی ہے جو شدت شہوت کے وقت کود کر نکلتا ہے اور اس میں چکناہٹ ہوتی ہے اور اس سے بچہ پیدا ہوتا ہے اور اس کے نکلنے کے بعد ذکر منتشر نہیں رہتا ہے اور شہوت ختم ہو جاتی ہے۔ مذی......وہ سفید گاڑھا پانی ہے جو شہوت کے وقت نکلتا ہے اور عام طور پر اپنی بیوی کے ساتھ ملاعبت کے وقت نکلتا ہے۔ ودی......وہ گاڑھا پانی ہے جو دودھ کی طرح سفید ہوتا ہے اور پیشاب کے بعد نکلتا ہے جو ایک طرح سے گاڑھا پیشاب ہوتا ہے۔

لمافي الشامية (۱/۱۶۰):(قوله بشهوة)متعلق بقوله منفصل احترز به عمالو انفصل بضرب اوحمل

ثقيل على ظهره فلا غسل عندنا...... (قوله وشرطه ابويوسف) اى شرط الدفق واثره الخلاف يظهر فيما لو احتلم أو نظر بشهوة فامسک ذکره حتى سكنت شهوته ثم ارسله فانزل وجب عندهما لاعنده ...... (قوله وبقول ابی یوسف نأخذ) ای فی الضيف وغيره...... (قوله قلت الخ) ظاهره الميل الى اختيار مافى النوازل ولكن اكثر الكتب على خلافه حتى البحر والنهر ولاسيما قد ذكروا ان قوله قياس وقولهما استحسان وانه الاحوط. فينبغي الافتاء بقوله فى مواضع الضرورة فقط تأمل......

وفى الدر المختار (۱/۱۶۵): (لا) عند (مذى اوودى) بل الوضوء منه ومن البول جميعاً على الظاهر

وفى رد المحتار (۱/۱۶۵): (قوله لاعند مذى) اى لايفرض الغسل عند خروج مذى...... ماء رقيق ابيض يخرج عند الشهوة لابها وهو فى النساء اغلب ...... (قوله او ودى)...... ماء ثخين ابيض كدر يخرج عقب البول نهر (قوله بل الوضوء منه الخ) اى بل يجب الوضوء منه اى من الودى ومن البول جميعاً. وهذا جواب عما يقال ان الوجوب بالبول السابق...... وبيان الجواب ان وجوبه بالبول لاينافى الوجوب بالودى بعده ......الخ.

(۵۷) خون دینے سے وضو کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص مریض کو خون دے تو کیا خون دینے سے وضوٹوٹ جائے گا؟ جبکہ خون نکالتے وقت سوائے سرنج کے اِدھر اُدھر نہ پھیلے؟

الجواب حامداًومصلیاً......خون دینے سے وضوٹوٹ جاتا ہے اگر چہ خون بدن پر بالکل نہ پھیلے۔

لمافى الهندية (۱/۱۱): القراد إذا مص عضو إنسان فامتلأ دما إن كان صغيرا لا ينقض وضوءه كما لو مصت الذباب أو البعوض، وإن كان كبيرا ينقض وكذا العلقة إذا مصت عضو إنسان حتى امتلأت من دمه انتقض وضوءه.

وفى الدر المختار (۱/۱۳۴): (و ينقضه خروج) كل خارج (نجس)......(إلى مايطهر.

وفى الشامية تحته: والمراد بالتطهير مايعم الغسل والمسح فى الغسل أو فى الوضوء كما ذكره ابن الكمال...... زاد فى "شرح المنية الكبير" بعد قوله "فى الغسل أو فى الوضوء قوله أو فى إزالة النجاسة الحقيقية لئلا يرد مالو افتصد وخرج منه دم كثير ولم يتلطخ رأس الجرح فانه ناقض مع أنه لم يسل إلى ما يلحقه حكم التطهير لأنه سال إلى المكان دون البدن..........

أقول: يرد عليه مالو سال إلى نهر ونحوه ممالا يصلى عليه ومالومص العلق أو القراد الكبير وامتلأ

دما فانه ناقض...... فالأحسن مافی النهر عن بعض المتأخرين من أن المراد السيلان ولو بالقوة، أی فإن دم الفصد ونحوه سائل إلى مايلحقه حكم التطهير حكما. تأمل. والله اعلم بالصواب

(۵۸) ناخن کاٹنے سے وضو نہیں ٹوٹتا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر کسی کے ناخن بڑے ہو جائیں وہ وضو کی حالت میں کاٹ لے تو کیا ناخن کاٹنے سے وضو ٹوٹ جائے گا؟

الجواب حامداً ومصلياً...... ناخنوں کے کاٹنے سے وضو نہیں ٹوٹتا البتہ انگلیوں کے پوروں پر پانی بہادینا بہتر ہے۔

لمافی الهندية (۱/۴) وان امر الماء على شعر الذقن ثم حلقه لايجب عليه غسل الذقن وكذالو حلق الحاجب والشارب اومسح رأسه ثم حلق او قلم اظافيره لاتلزمه الاعادة كذا فی فتاویٰ قاضی خان.

وفی الدر المختار (۱/۱۰۱): (ولا يعاد الوضوء)......(بحلق رأسه ولحيته كما لا يعاد) الغسل للمحل ولا الوضوء (بحلق شاربه وحاجبه وقلم ظفره) وكشط جلده.

(۵۹) ناخن یا بال کاٹنے سے وضو کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ناخن یا بال کاٹنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے کیا واقعی یہ بات درست ہے؟ یا ناخن اور بال کاٹنے سے وضو برقرار رہتا ہے۔

الجواب حامداً ومصلياً...... ناخن یا بال کاٹنے سے وضو نہیں ٹوٹتا بلکہ برقرار رہتا ہے۔

وفی البزازية على الهندية (۴/۱۳): حلق لحيته أو رأسه أوشاربه، أوقلم أظافره بعد الوضوء لايعيد ولا يجب امرار الماء أيضاً.

وفی الدرالمختار (۱/۱۰۱): (ولا يعاد الوضوء) بل ولا بل المحل (بحلق رأسه ولحيته كمالا يعاد) الغسل للمحل ولا الوضوء(بحلق شاربه وحاجبه وقلم ظفره)

(۶۰) اگر ستر کھل جائے یا ناخن کاٹ لے تو دوبارہ وضو کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی باوضو شخص کسی ضرورت سے کپڑے اتار دے اور بالکل برہنہ ہو جائے یا پھر ناخن یا بال کٹوادے تو ان صورتوں میں وضو ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلياً...... باوضو ہونے کی حالت میں کپڑے اتار دینے یا ناخن یا بال کٹوانے سے وضو پر کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ اسی وضو سے

نماز وغیرہ کی ادائیگی صحیح ہے۔

لمافی الدرالمختار (۱/۱۰۱): (ولا يعاد الوضوء)بل ولا بل المحل(بحلق رأسه ولحيته كمالا يعاد) الغسل للمحل ولا الوضوء (بحلق شاربه وحاجبه وقلم ظفره).

(۶۱) مچھر اگر زیادہ مقدار میں خون چوس لے تو وضو کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کبھی کبھار مچھر اس طرح کاٹتا ہے کہ سارا مچھر خون سے بھر جاتا ہے، اور ایسی حالت میں ہوتا ہے کہ اگر اس پر ہاتھ لگ جائے تو وہیں مر جاتا ہے اور اس کا سارا خون جسم پر لگ جاتا ہے، اب بعض دفعہ یہ خون کافی زیادہ ہوتا ہے تو کیا اس سے وضو ٹوٹ جائے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ میں اس طرح مچھر کے کاٹنے سے وضو پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اسی طرح وہ مقدار جو مچھر کے مرنے سے جسم یا کپڑوں پر لگتی ہے، وہ معاف ہے۔

لمافی الحلبی (صـ۱۳۶): (واما الذباب أو البعوض) أو البراغيث ونحوها(فانه اذا مص وامتلأ) دما (لا ينقض) لانه غير سائل .

وفی الدرالمختار (۱/۱۳۹): (والا)..... (لا) ينقض(كبعوض وذباب) كما فی الخانية لعدم الدم المسفوح.

(۶۲) کھانے پینے سے وضو ٹوٹنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ظہر اور عصر کی سنتوں کے بعد کچھ کھانے پینے سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں، اس وضو سے فرائض پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... کچھ کھانے پینے سے وضو نہیں ٹوٹتا، وضو اس وقت ٹوٹتا ہے جب نواقض وضو میں سے کوئی سبب پایا جائے جیسا کہ سبیلین سے کسی چیز کا خارج ہونا یا خون کا نکل کر بہہ جانا وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں ظہر اور عصر کی سنتوں کے بعد یا اسی طرح کسی نماز کے بعد یا پہلے کچھ کھانے پینے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اور ایک وضو سے کئی نمازیں پڑھ سکتے ہیں اگر چہ درمیان میں کچھ کھا پی لیں۔ البتہ مستحب طریقہ یہ ہے کہ اگر کچھ کھا پی لے تو نماز شروع کرنے سے پہلے کلی کر لی جائے۔

لمافی المشکوة(۱/۴۱): عن ابی رافع قال اشهد لقد كنت أشوى لرسول الله ﷺ بطن الشاة ثم صلى ولم يتوضأ، رواه مسلم.

وفی عمدة القاری(۳/۱۰۶): قوله فمضمض)) ای قبل الدخول فی الصلاة.

بیان استنباط الاحکام: الاول ان فیه استحباب المضمضة بعد الطعام...... وقال بعضهم استدل به البخاری علی جواز صلاتین فاکثر بوضوء واحد...... الثانی فیه دلالة علی عدم وجوب الوضوء مما مسته النار.

وفی الدر المختار (۱/۱۳۴): (وینقضه خروج) کل خارج (نجس)...... (منه) أی من المتوضئ الحی معتاداً أولا من السبیلین أولا (إلی ما یطهر)...... أی یلحقه حکم التطهیر (ص۱۳۵-۱۳۶) (وریح او دودة او حصاة من دبر لا)...... (ریح من قبل) غیر مفضاة اما هی فیندب لها الوضوء وقیل یجب (و) (ص۱۳۷-۱۳۸) ینقضه (قئی ملأ فاه) بان یضبط بتکلف (من مرة)...... (او علق)...... (او طعام او ماءٍ) اذا وصل الی معدته وان لم یستقر وهو نجس مغلّظ.

(۶۳) معصیت اور گناہ سے وضو یا تیمّم ٹوٹنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ شان صحابہؓ میں گستاخی کرنا بہت بڑا جرم ہے، اگر کوئی شخص شان صحابہؓ میں گستاخی کرے تو کیا اس سے وضو یا تیمّم ٹوٹ جاتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... شان صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین میں گستاخی کرنا واقعی بہت بڑا جرم ہے، لیکن اس سے وضو یا تیمّم نہیں ٹوٹتا۔

لما فی رد المحتار (۱/۲۵۶): (قوله لاتنقضه ردة) ای فیصلی به اذا أسلم، لان الحاصل بالتیمم صفة الطهارة والکفر لاینافیها کالوضوء والردة تبطل ثواب العمل لازوال الحدث شرح النقایة.

(۶۴) مرتد ہونے کی وجہ سے وضو اور تیمّم کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص (العیاذ باللہ) مرتد ہوجائے تو ارتداد کی وجہ سے اس کا وضو یا تیمّم ٹوٹ جائے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر کوئی شخص نعوذ باللہ مرتد ہوجائے اور اس نے اس سے پہلے وضو کرلیا ہو، پھر اسلام لے آئے تو اس کا وضو بالاتفاق باقی رہے گا لیکن اگر کسی نے پہلے تیمّم کیا ہو پھر ارتداد کے بعد اسلام لے آیا تو ائمہ ثلاثہ (امام اعظم ابوحنیفہ اور صاحبین) کے نزدیک تیمّم باقی رہے گا لیکن امام زفرؒ کے نزدیک اس کا تیمّم باطل ہوجائے گا۔

لما فی رد المحتار (۱/۲۵۶): (قوله لاتنقضه ردّة) أی فیصلی به إذا أسلم، لأن الحاصل بالتیمم صفة الطهارة والکفر لاینافیها کالوضوء.

(۶۵) غیر تحریف شدہ آسمانی کتابوں کو بے وضو چھونے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قرآن مجید کے سوا اور آسمانی کتابیں مثلاً تورات، انجیل اور زبور کو بے وضو چھونا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... قرآن مجید کے سوا بقیہ آسمانی کتابیں مثلاً تورات، انجیل اور زبور کو اگر غیر محرف (یعنی تحریف شدہ نہ) ہوں تو بے وضو چھونا مکروہ ہے۔

وفی حاشية الطحطاوی علی الدر (۱/۱۵۱): یکره مس کتب التفسیر والفقه والسنن لانها لاتخلو عن آیات القرآن وهذا التعلیل یفید کراهة...... مثل القرآن مالم یبدل من التوراة والانجیل والزبور نهر.

وفی الهندیة (۱/۳۸): ویکره للحائض والجنب قراءة التوراة والانجیل والزبور.

(۶۶) بغیر طہارت اخبارات میں لکھی آیات کو ہاتھ لگانے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اخبارات میں بعض دفعہ آیات قرآنیہ اور احادیث مبارکہ لکھی ہوتی ہیں، کیا اخبارات میں ان کا شائع کرنا صحیح ہے؟ جبکہ اس میں بے حرمتی کا شائبہ ہے نیز ایسے اخبار کو بغیر وضو چھونا جائز ہوگا یا نہیں، جس میں آیات لکھی ہوئی ہوں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اس بات میں کوئی شک نہیں کہ الیکٹرانک میڈیا اور پریس کے عام رواج کی بناء پر قرآنی آیات وغیرہ کا احترام باقی نہیں رہا، اور آیات واحادیث لکھے ہوئے اوراق ردی اور کوڑے میں پھینک دیے جاتے ہیں، ایسی صورت میں اخبارات واشتہارات میں آیات واحادیث لکھنا جائز نہیں کیونکہ یہ آیات واحادیث کی بے حرمتی ہے اور اگر یہ مفاسد نہ ہوں بایں طور کہ تعظیم کو ملحوظ رکھا جائے تو پھر جائز ہوگا۔ نیز جہاں اخبارات وغیرہ میں آیات قرآنیہ لکھی ہوئی ہوں بغیر وضو صرف اس جگہ پر ہاتھ لگانا منع ہے اس کے علاوہ اخبار کے باقی حصہ میں ہاتھ لگا سکتے ہیں۔

لمافی الهندیة (۵/۳۲۲): ویکره ان یجعل شیئاً فی کاغذة فیها اسم الله تعالی کانت الکتابة علی ظاهرها او باطنها بخلاف الکیس علیه اسم الله تعالی فانه لایکره......

وفی الدرالمختار (۱/۱۷۶): (والتفسیر کمصحف لا الکتب الشرعیة) فانه رخص مسها بالید لاالتفسیر کما فی الدرر عن مجمع الفتاوی.

وفی الشامیة (والتفسیر کمصحف) ظاهره حرمة المس کما هو مقتضی التشبیه وفیه نظر اذ لا نص

فیه بخلاف المصحف فالمناسب التعبیر بالکراهة......والحاصل انه لا فرق بین التفسیر وغیره من الکتب الشرعیة علی القول بالکراهة وعدمه ولهذا قال فی النهر ولایخفی ان مقتضی ما فی الخلاصة عدم الکراهة مطلقا لان من أثبتها حتی فی التفسیر نظر الی ما فیها من الایات ومن نفاها نظر الی ان الاکثر لیس کذلک وهذا یعم التفسیر ایضا الا ان یقال ان القران فیه اکثر من غیره ای فیکره مسه دون غیره من الکتب الشرعیة......

اقول: الاظهر والاحوط القول الثالث ای کراهته فی التفسیر دون غیره لظهور الفرق فان القران فی التفسیر اکثر منه فی غیره وذکره فیه مقصود استقلالا لاتبعا فشبهه بالمصحف اقرب من شبهه ببقیة الکتب.

(٦٧) اخبار کے قرآنی آیت والے صفحے کو بے وضو چھونے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اخبار کے جس صفحہ پر قرآنی آیت لکھی ہو، اس کو بے وضو چھونا جائز ہے یا ناجائز ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......اخبار کا وہ صفحہ جس پر قرآنی آیات لکھی ہوں اس کو چھونا جائز ہے۔ البتہ قرآنی آیت کو بلا وضو چھونا جائز نہیں۔

لمافی الشامیة (١٧٦/١، ١٧٧): (قوله لا الکتب الشرعیة) قال فی الخلاصة ویکره مس المحدث المصحف کما یکره للجنب وکذا کتب الأحادیث والفقه عندهما والأصح أنه لا یکره عنده اهـ قال فی شرح المنیة: وجه قوله أنه لایسمی ماساللقرآن لأن مافیها منه بمنزلة التابع. ومشی فی الفتح علی الکراهة فقال: قالوا یکره مس کتب التفسیر والفقه والسنن لأنها لا تخلوعن ایات القرآن وهذا التعلیل یمنع من شروح النحو. اهـ. الی ان قال اقول: الأظهر والأحوط القول الثالث أی کراهته فی التفسیر دون غیره لظهور الفرق الخ. هکذا فی حاشیة الطحطاوی علی مراقی الفلاح (صـ٦٢) وفی مجمع الانهر (٤٠/١) وفی حلبی کبیر (صـ٥٩) والله اعلم.

(٦٨) ائمہ اربعہ کے نزدیک قرآن کریم کو بغیر وضو چھونے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا بغیر وضو قرآن کریم کو ہاتھ لگانا ائمہ میں سے کسی کے نزدیک جائز ہے۔ اگر ہے تو کیا وجوہات ہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً......ائمہ اربعہ اور دیگر فقہاء کا اس بات پر اجماع ہے کہ بغیر وضو کے قرآن مجید کو ہاتھ لگانا جائز نہیں ہے۔ البتہ داؤد ظاہری کے ہاں بغیر وضو کے ہاتھ لگانا درست ہے۔

لمافی الهندية (۱/۳۸): لا يجوز لهما وللجنب والمحدث مس المصحف.

وفی الفقه الحنفی وادلته (۱/۱۰۶): لايجوزلمحدث مس المصحف.

وفی الفقه الاسلامی(۱/۴۵۰): واتفق الفقهاء على أن غير المتوضی يجوز له تلاوة القرآن او النظر اليه دون لمسه ....وفی(صـــ۴۵۳) والخلاصة انه وقع الاجماع ماعدا داؤد أنه لايجوز المحدث حدثا اكبر أن يمس المصحف وأما المحدث حدثا اصغر فلم تدل الأدلة قطعا على منعه من مس القرآن لكن اكثر الفقهاء على انه لا يجوز له.

(۶۹) تین انگلیوں سے سر کا مسح کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تین انگلیاں سر پر رکھنے سے سر کا مسح ہوجاتا ہے، کیا یہ بات صحیح ہے؟ نیز اگر تین انگلیوں کے بجائے صرف انگلیوں کے تین پورے رکھے جائیں تو بھی مسح ہوجائے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً......مسئولہ صورتوں کی پہلی صورت میں اگر تین انگلیوں سے چوتھائی سر کا مسح کرلیا تو مسح ہوجائے گا اور تین انگلیوں سے کم سے مسح نہیں ہوگا۔

(۲) انگلیوں کے پوروں سے پانی ٹپک رہا ہو اور پورے سر کے چوتھائی کے بقدر مسح کیا جائے تو مسح ہوجائے گا ورنہ نہیں۔

لمافی الهندية (۱/۵): المفروض فی مسح الرأس مقدار الناصية كذا فی الهداية والمختار فی مقدار الناصية ربع الرأس كذا فی الاختيار شرح المختار الواجب أن يستعمل فيه ثلاث أصابع اليد على الأصح كذافی الكفاية.

وفی الدر المختار (۱/۹۹): ولو مد أصبعًا أو أصبعين لم يجز الا ان يكون مع الكف أو بالابهام والسبابة.

وفی الشامية (۱/۱۰۰): (قوله الا ان يكون مع الكف الخ) لانهما مع الكف او مع مابين الأبهام والسبابة يصيران مقدار ثلاث أصابع او اكثر فاذامدهما وبلغ قدر الربع جاز.

وفی الهندية (۱/۵): اذا مسح رأسه برؤس اصابعه فان كان الماء متقاطرا يجوز وان لم يكن متقاطرًا لا يجوز كذا فی الذخيرة.

وفی رد المحتار(۱/۹۹): لو مسح بأطراف أصابعه والماء متقاطر جاز والا فلا لأنه اذاكان متقاطرا فالماء ينزل من أصابعه الى اطرافها فاذا مده صار كأنه أخذ ماءً جديداً.

(۷۰) سر کے مسح کی ایک صورت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ہاں ایک صاحب ہیں جنہوں نے بڑے بڑے بال رکھے ہوئے ہیں، آجکل سردی کا زمانہ ہے جسمیں وہ گرم ٹوپی پہنتے ہیں جو پیچھے سے کانوں سے ذرا نیچے تک یا کانوں تک ہوتی ہے، اب اگر وہ ٹوپی اتارے بغیر صرف پیچھے کے بالوں پر وضو میں مسح کرلیں تو جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً...... اگر مسح سر پر ہوتو جائز ہے، اور اگر مسح سر پر نہ ہو بلکہ صرف سر سے نیچے کی طرف لٹکے ہوئے بالوں پر ہوتو ناجائز ہے۔

لمافی الدر المختار (۱/۹۹): (ومسح ربع الرأس مرةً) فوق الاذنین ولو باصابة مطر.

وفی الشامیة (فوق الاذنین) فلو مسح علی طرف ذؤابة شدت علی راسه لم یجز.

(۷۱) مسح کیلئے نیا پانی لینے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سر پر صرف مسح کیا جاتا ہے تو کیا اس مسح کیلئے نیا پانی لینا ضروری ہے؟ اگر کوئی شخص نیا پانی نہ لے اور بازو یا داڑھی پر ہاتھ پھیر کر مسح کرلے تو مسح ہوجائے گا یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً...... صورت مسئولہ میں سر پر مسح کیلئے نیا پانی لینا ضروری نہیں ہے بلکہ ہتھیلیوں کی تری سے ہی مسح کر سکتے ہیں۔ رہا یہ معاملہ کہ بازو یا داڑھی کی تری سے مسح کرنا جائز ہے یا نہیں تو اس سے پہلے یہ سمجھئے کہ فقہاء کے ہاں پانی مستعمل کب بنتا ہے (جو پانی ایک مرتبہ استعمال ہوگیا ہو اور اسے دوبارہ استعمال کرنا درست نہ ہو) اکثر فقہاء کے ہاں پانی مستعمل اس وقت بنتا ہے جب استعمال کے بعد پانی بدن سے جدا ہوجائے اور بعض فقہاء کے نزدیک جب بدن سے جدا ہوکر کسی جگہ یا برتن میں جمع ہوجائے اس وقت مستعمل بنے گا،

اب اس کے بعد سمجھئے کہ جن فقہاء کے ہاں پانی بدن سے جدا ہوتے ہی مستعمل ہوجاتا ہے ان کے ہاں داڑھی یا دوسرے اعضاء کی تری پر ہاتھ پھیر کر مسح کرنا درست نہیں ہوگا البتہ اگر ایک ہی عضو میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پانی لے جائیں (مثلاً سر کے مسح میں ہتھیلیوں پر جو تری ہوتی ہے اس کو سر کے آگے والے حصہ سے پیچھے اور پیچھے سے آگے لیکر آنا) درست ہوگا، اور جن فقہاء کرام کے ہاں پانی مستعمل بننے کیلئے کسی جگہ یا برتن میں جمع ہونا ضروری ہے ان کے نزدیک داڑھی کی تری سے سر کا مسح کرنا درست ہوگا۔ احتیاط اکثر حضرات کے قول میں ہے، اور آسانی دوسرے قول میں ہے۔

لمافی الهندیة (۱/۲۲): الماء الذی أزیل به حدث او استعمل علی وجه القربة فالصحیح أنه کما زایل العضو صار مستعملا هکذا فی الهدایة.

وفی ردالمحتار (۱/۹۹): (قوله او بلل باق الخ) هذا اذا لم یاخذه من عضو آخر مقدسی، فلو اخذه من عضو آخر لم یجز مطلقابحر ای سواء کان ذلک العضو مغسولًا او ممسوحاً.

وفيها ايضاً(۱/۲۰۰): (قوله وقيل اذااستقر)اى بشرط ان يستقر فى مكان من ارض او كف او ثوب ويسكن عن التحرك وحذفه لانه اراد بالاستقرار التام منه وهذا قول طائفة من مشايخ بلخ واختاره فخرالاسلام وغيره وفى الـ لاصة وغيرهاانه المختار الا ان العامة على الاول وهو الاصح واثر الخلاف يظهر فيمالو انفصل فسقط على انسان فأجراه عليه صح على الثانى لا الاول نهر. قلت وقد مرّأن اعضاء الغسل كعضو واحد فلوانفصل منه فسقط على عضو آخر من اعضاء المغتسل فأجراه عليه صح على القولين. (قوله ورجح للحرج)لانه لوقيل باستعماله بالانفصال فقط لتنجس ثوب المتوضئى على القول بنجاسة الماء المستعمل وفيه حرج عظيم كما فى غاية البيان.

(۷۲) مصنوعی بالوں پرمسح اورغسل کاحکم

سوال.....کیافرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کافی عرصہ پہلے میرے سر کے بال گر گئے تھے لوگ مجھے گنجا کہتے تھے جس کی وجہ سے مجھے پریشانی ہوتی،تو مجبوراً میں نے مصنوعی بال لگوالئے ہیں جوکافی خوبصورت لگتے ہیں اب ان بالوں کا وضواورغسل میں کیاحکم ہوگا؟

الجواب حامداًومصلیاً.....صورت مسئولہ میں اگرمصنوعی بال وگ کی شکل میں لگائے گئے ہوں،تو وضومیں اس پرمسح کرنااورغسل میں اس کا دھونا جائزنہیں ہوگا۔بلکہ اس وگ کواُتارنا ضروری ہوگا۔اوراگرمصنوعی بال آپریشن کے ذریعے لگائے گئے ہوں تو ایسا کرنا اگرچہ ناجائز اورگناہ ہے۔ایسا کرنے والاتوبہ واستغفارکرے۔البتہ اگرکسی نے لگوالئے تو جسم کا جزء بننے کی وجہ سے اس پرمسح کرنااورغسل میں دھونا کافی ہوگا۔

لمافى الخانية (۳/۴۷۱): ووصل الشعر بشعر الآدمى حرام سواءٌ كان شعرها أو شعر غيرها، ولا بأس للمرأة أن يجعل فى قرونها وذوائبها شيئا من الوبر ويكره ان تصل شعرها غيرها. ولا بأس للتاجر حلق شهر جبهة الغلام لانه يزيد فى الثمن فان كان العبد للخدمة ولا يريد به التجارة لايستحب ان يفعل ذلك.

وفى فتح القدير مع شرح العناية (۱/۱۵۷،۱۵۸): (ويجوز المسح على الجبائر الخ) قال قاضيخان: هذا إذا كان يضره المسح على الجراحة، وأما إذا لم يضره فلا يمسح على الجبائر، والجبائر جمع جبيرة وهى العيدان التى تجبربها العظام، وإنما قال (وإن شدها على غير وضوء) لأنها إنما تربط حالة الضرورة، واشتراط الطهارة فى تلك الحالة يفضى إلى الحرج فلا يعتبر.

وفى المبسوط السرخسى (۱/۲): قال لأن البشرة التى نبت عليها الشعر لايجب ايصال الماء اليها

فما هو أبعد أولیٰ لکن الصحیح من المذهب أنه یجب امرار الماء علی ذلک الموضع لأن الموضع الذی نبت علیه الشعر قد استتر بالشعر فانتقل الفرض منه الی ظاهر الشعر الخ.......... وأیضاً (صـ۴۵) فالحاصل أن امرار الماء علی جمیع البدن فرض لقوله ﷺ تحت کل شعرة جنابة الافبلوا الشعر وأنقوا البشرة.......... وأیضاً(صـ۶۴) لان المسح علی الشعر بمنزلة المسح علی البشرة التی تحته الخ...... وأیضاً (صـ۶۵،۶۶) قال (ثم المسح علی الشعر مثل المسح علی البشرة التی تحته) لا أنه بدل عنه بدلیل أن الاصبع اذا مسح علی الشعر جاز ولا یجوز المصیر الی البدل مع القدرة علی الأصل فکان جز الشعر بعد المسح کتقشیر الجلد عن العضو المغسول بعد الغسل فکما لا یلزمه امرار الماء ثمة فکذلک هنا. ...... وأیضاً(صـ۷۴) فأما اذا سقط عن غیر برء فالمسح علی الجبائر کالغسل لما تحته مادامت العلة باقیة ولهذا لا یتوقف بخلاف المسح بالخف.

(۷۳) دوپٹہ پر مسح کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض دفعہ سفر میں گھر کی خواتین ساتھ ہوتی ہیں اور نماز کے اوقات میں ایک طرف بیٹھ کر وضو کیا جا سکتا ہے لیکن مسح کیلئے دوپٹہ یا چادر اتارنا مشکل ہوتا ہے لہٰذا اگر کوئی عورت دوپٹے کے اوپر سے مسح کرے تو اس ضرورت کی بناء پر جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر کوئی عورت ایسے دوپٹے پر مسح کرے کہ جس سے تری بالوں تک پہنچ جاتی ہو تو ایسے دوپٹے پر مسح کرنا جائز ہے، اور اگر دوپٹے پر مسح کرنے سے تری بالوں تک نہ پہنچتی ہو تو مسح کرنا جائز نہیں بلکہ اس کے نیچے ہاتھ ڈال کر مسح کرنا ضروری ہوگا۔

لمافی الخلاصة (۲۶/۱): ولا یجوز المسح علی القلنسوة والعمامة وکذالو مسحت المرأة علی الخمار الا اذا کان الماء متقاطراً بحیث یصل الی الشعر فحینئذ جاز.

وفی الهندیة(۶/۱): ولا یجوز المسح علی القلنسوة والعمامة وکذا لو مسحت المرأة علی الخمار الا انه اذا کان الماء متقاطراً بحیث یصل الی الشعر فحینئذ یجوز ذلک عن الشعر کذا فی الخلاصة هذا اذا لم یتلون الماء هکذا فی الظهیریة والأفضل أن تمسح تحت الخمار کذا فی فتاوی قاضی خان.

(۷۴) کان کے نیچے لمبے بالوں پر مسح کرنے سے مسح کی ادائیگی کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ وہ لمبے بال جو کان کے نیچے تک ہوتے ہیں اگر ان پر کوئی

شخص کان کے نیچے حصہ پر مسح کرلے تو مسح ادا ہو جائے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں مسح ادا نہ ہوگا۔

لمافی حاشية الطحطاوی علی المراقی(ص۷۴): قال فی الخانية: فلو مسح علی شعره ان وقع علی شعر تحته رأس جاز وان وقع علی شعر تحته جبهة او رقبة لايجوز.

وفی الهندية(۱/۵): ان وقع علی شعر تحته رأس يجوز عن مسح الرأس و ان وقع علی شعر تحته جبهة او رقبة لايجوز.

(۷۵) کنپٹی پر لگے پلاسٹر پر مسح کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے سر میں شدید درد رہتا تھا جس کی وجہ سے مجھے کافی تکلیف محسوس ہوتی تھی ڈاکٹر نے مجھے ایسا پلاسٹر تجویز کیا کہ جس کے لگانے کے بعد مجھے کافی آرام محسوس ہوتا ہے۔اب پوچھنا یہ ہے کہ میں نے پلاسٹر کو پیشانی سے ذرا سائڈ میں لگایا ہوا ہے یعنی کنپٹی پر تو آیا وضو کرتے وقت مجھے اس پلاسٹر کو ہٹانا پڑے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......وضو میں پورے چہرے کا دھونا فرض ہے۔لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر پلاسٹر ایسا ہو کہ اس کے ہٹانے سے تکلیف کے بڑھنے کا خوف ہو یا ہٹانے کے بعد خود لگا نہ سکتا ہو،تو ایسی صورت میں پلاسٹر پر مسح کرنا درست ہے اور اگر تکلیف کے بڑھنے کا خوف نہ ہو،اور ہٹانے کے بعد خود لگا سکتا ہو،تو ایسی صورت میں پلاسٹر پر مسح کرنا درست نہیں۔ بلکہ وضو کرتے وقت اس کو اتارنا ضروری ہوگا۔

لمافی سنن ابن ماجه (۱/۴۸):عن علی بن ابی طالب قال انكسرت احدی زندی فسالت النبی ﷺ فامرنی ان امسح علی الجبائر.

وفی الدر المختار(۱/۲۸۰-۲۸۱): (ويمسح) نحو (مفتصد وجريح علی كل عصابة) مع فرجتها فی الاصح (ان ضره) الماء (او حلها) ومنه أن لا يمكنه ربطها بنفسه ولا يجد من يربطها،

وفی الشامية تحته: (قوله علی كل عصابة) ای علی كل فرد من أفرادها سواء كانت عصابة تحتها جراحة وهی بقدرها او زائدة عليها كعصابة المفتصد، او لم يكن تحتهاجراحة اصلا بل كسر او كی، وهذا معنی قول الكنز كان تحتها جراحة اولا لكن اذا كانت زائدة علی قدر الجراحة فإن ضره الحل والغسل مسح الكل تبعا والافلا. بل يغسل ماحول الجراحة ويمسح عليها لاعلی الخرقة.

وفی الفقه الاسلامی وادلته(۱/۵۰۲):شرائط المسح علی الجبيرة...... ألا يمكن نزع الجبيرة او يخاف من نزعها بسبب الغسل حدوث مرض او زيادته او تأخر البرء.

(۷۶) گردن کے مسح کی شرعی حیثیت

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ گردن کا مسح مسنون ہے یا نہیں؟ ہمارے ہاں ایک غیر مقلد کا کہنا ہے کہ گردن کا مسح احادیث سے ثابت نہیں بلکہ یہ صرف احناف کی من گھڑت سنت ہے، کیا یہ بات صحیح ہے؟ براہ کرم احادیث کا حوالہ ضرور دیں اور یہ بتائیں کہ یہ احادیث کس درجہ کی ہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً.....گردن کا مسح حضراتِ احناف کے ہاں مستحب ہے اور ایسی احادیث اور آثار صحابہ سے ثابت ہے جن کو حسن کا درجہ حاصل ہے، لہٰذا اسے احناف کی من گھڑت سنت کہنا محض تعصب اور عناد ہے، جبکہ بعض دوسرے علماء نے انہی احادیث وآثار کی وجہ سے اسے سنت کہا ہے۔ چنانچہ علامہ رویانیؒ (جواصحاب شوافع میں سے ہیں) نے اپنی کتاب میں صراحت کی ہے کہ گردن کا مسح ہمارے اصحاب کے نزدیک سنت ہے،''علامہ بغویؒ'' (جوائمہ احادیث میں سے ہیں) نے اسکے''استحباب'' کا قول کیا ہے، اسی طرح علامہ شوکانیؒ نے''نیل الاوطار'' (یہ کتاب غیر مقلدین کے ہاں معتبر ہے اور انکے مدارس میں داخلِ درس ہے) میں گردن کے مسح پر کافی وشافی بحث کی ہے، اور ایسے افراد (جنہوں نے گردن کے مسح کو بدعت اور اسکی احادیث کوموضوع کہا ہے) پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ ایسی روایات کی موجودگی میں انہوں نے اس کو کیسے بدعت کہا۔

لما في الصحيح للبخاري (۱/۳۱): حدثنا عبد الله بن يوسف ......ان رجلاً قال لعبد الله بن زيد وهو جد عمرو بن يحيىٰ أتستطيع أن تريني كيف كا ن رسول الله ﷺ يتوضأ فقال عبدالله بن زيد نعم فدعا بماء فأفرغ على يده ...... ثم مسح رأسه بيديه فأقبل بهما وأدبر بدأ بمقدم رأسه حتى ذهب بهما الى قفاه ثم ردهما إلى المكان الذى بدأمنه.

وفي الهندية (۱/۸): الفصل الثالث في المستحبات...والثانى مسح الرقبة هو بظهر اليدين.

وفي الدرالمختار (۱/۴،۱۲۳): (ومستحبه) ...... (مسح الرقبة)...... (لا الحلقوم).

وفي الشامية (قوله مسح الرقبة) هو الصحيح وقيل انه سنة كما في البحر.

وفي نيل الاوطار(۱/۱۹۵): وبجميع هذا تعلم أن قول النووى مسح الرقبة بدعة وأن حديثه موضوع مجازفة، وأعجب من هذا قوله ولم يذكره الشافعي ولا جمهور الأصحاب وإنما قاله ابن القاص وطائفة يسيرة، فإنه قال الروياني من أصحاب الشافعي في كتابه المعروف بالبحر مالفظه: قال أصحابنا هوسنة، وتعقب النووى أيضاً ابن الرفعة بأن البغوى وهو من ائمة الحديث قد قال باستحبابه قال: ولا مأخذ لاستحبابه الاخبر أو أثر لأن هذا لا مجال للقياس فيه. قال الحافظ: ولعل مستند البغوى في استحباب مسح القفا ما رواه أحمد وأبو داؤد وذكر حديث الباب الخ.

(۷۷) داڑھی کے خلال اور گردن کے مسح کی شرعی حیثیت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ (۱)۔ داڑھی کو وضو میں دھونا ضروری ہے یا اسکا خلال کیا جائے گا چاہے داڑھی چھوٹی ہو یا بڑی اور گھنی ہو یا نہ ہو؟ برائے مہربانی تمام صورتیں مفصل بیان کریں۔

(۲)۔ مسح الرقبہ کا ثبوت قرآن وحدیث سے ہے یا نہیں کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یا صحابہ کرامؓ نے مسح الرقبہ کیا ہے یا نہیں؟ بعض علماء اس کا انکار کرتے ہیں کہ مسح الرقبہ کرنا درست نہیں ہے۔ مسح الرقبہ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اگر کوئی نہ کرے تو اس کا وضو ہو جائے گا یا نہیں؟ نیز رقبہ کا اطلاق کہاں تک ہوتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... داڑھی کا وہ حصہ جو کہ چہرے کے ساتھ ملا ہوا ہے، اس کا دھونا وضو میں فرض ہے۔ البتہ اگر داڑھی اتنی گھنی ہو کہ چہرے کی جلد کو بالکل ڈھانپ لیتی ہو تو اس صورت میں بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچانا ضروری نہیں۔ اگر داڑھی گھنی نہیں ہے اور چہرے کی جلد اس میں سے نظر آتی ہے۔ تو اس صورت میں اس کی جڑوں تک پانی پہنچانا ضروری ہے۔ جبکہ داڑھی کا وہ حصہ جو چہرے کی حدود سے باہر ہو۔ اس کا خلال کرنا سنت ہے۔

(۲)۔ اور رہی بات مسح الرقبہ (گردن کے مسح) کی تو یہ مستحب ہے۔ اس کا ثبوت روایات میں موجود ہے۔ اس لئے اس کا انکار کرنا درست نہیں۔ ہاں البتہ گلے کا مسح بدعت ہے۔ اور رقبہ کا اطلاق گردن کے پچھلے حصے (گدی) پر ہوتا ہے۔

لما فی الدر المختار (۱/ ۱۰۰، ۱۰۱): (وغسل جميع اللحية فرض) يعنى عملياً (ايضا) على المذهب الصحيح المفتى به المرجوع اليه، وما عدا هذه الرواية مرجوع عنه كما فى البدائع. ثم لا خلاف أن المسترسل لايجب غسله ولا مسحه بل يسن، وان الخفيفة التى ترى بشرتها يجب غسل ماتحتها كذا فى النهر.

وفيه ايضاً (۱/ ۱۲۴): (ومسح الرقبة) بظهريديه (لاالحلقوم) لانه بدعة.

وفى الشامية تحته: (قوله ومسح الرقبة) هو الصحيح. وقيل انه سنة كما فى البحر وغيره. اعلاء السنن (۱/ ۱۲۱): تحقيق معنى الرقبة والحلقوم...... والذى ظهرلنا من تتبع اللغة والاحاديث. ان مقدم العنق وموخره كلاهما فى جانب الرأس. فمقدمه اى مبتداء هو ما يلى القذال اى موخر الراس...... فجعل مقدم العنق بياناً للقذال وهو موخر الراس كما فى القاموس.

وفى اعلاء السنن (۱/ ۱۲۰): باب استحباب مسح الرقبة. عن فليح بن سليمان عن نافع عن ابن عمر أن النبى ﷺ قال: "من توضأ و مسح بيديه على عنقه وقى الغل يوم القيامة" رواه ابوا لحسن ابن فارس بإسناد وقال: هذا ان شاء الله. حديث صحيح. (التلخيص الحبير ۱/ ۳۴)

(۷۸) اعضاء وضو کو تولیہ یا رومال وغیرہ سے خشک کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ وضو کرنے کے بعد اعضاءِ وضو کو تولیہ یا رومال سے خشک کرنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز اس کا ثبوت قرآن وسنت سے ملتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلياً...... وضو کرنے کے بعد اعضاءِ وضو کو تولیہ یا رومال وغیرہ سے خشک کرنا جائز ہے اور اسکا ثبوت احادیث طیبہ سے ملتا ہے۔

لمافی الترمذی(۱/۱۸): عن عائشة قالت كانت لرسول الله ﷺ خرقة يتنشف بها بعد الوضوء.

وفی الشامية (۱/۱۳۱): (قوله والتمسح بمنديل)...... ففی الخانية: ولا بأس للمتوضئ والمغتسل روى عن رسول الله ﷺ انه كان يفعله.

وفی الفقه الاسلامی (۱/۲۰۷): وقال المالكية المسح بالمنديل جائز لحديث قيس بن سعد قال "زارنا رسول الله ﷺ فی منزلنا فأمرله سعد بغسل فوضع له فاغتسل ثم ناوله ملحفة مصبوغة بزعفران او ورس فاشتمل بها"

(۷۹) وضو کے استعمال شدہ پانی کو کھانے پینے وغیرہ کے استعمال میں لینے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کے پاس صرف تھوڑا سا پانی ہو اور وہ اس امید پر کہ بعد میں پانی مل جائے گا اس سے وضو کرلے اور بعد میں پانی نہ ملے تو کیا اس پانی کو دوبارہ استعمال کرسکتا ہے، جیسے پینے کیلئے یا کھانا پکانے وغیرہ کے لئے؟ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً...... وضو میں استعمال شدہ پانی ضرورت کے موقع پر کھانے یا پینے وغیرہ میں استعمال کرسکتے ہیں لیکن بلاضرورت یہ استعمال کراہت سے خالی نہیں، اس لئے احتیاط بہتر ہے۔

لما فی الدرالمختار (۱/۲۰۰، ۲۰۱): (اذا انفصل عن عضو وان لم يستقر ...... وهو طاهر) ولو من جنب وهو الظاهر لكن يكره شربه والعجن به تنزيهاللاستقذار وعلى رواية نجاسته تحريما.

وفی الشامية (تحريما) قال فی البحر ولا يخفى ان الكراهة على رواية الطهارة أما على رواية النجاسة فحرام لقوله تعالى ويحرم عليهم الخبائث والنجس منها.

(۸۰) اٹیچ باتھ روم میں ادعیۂ وضو پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید ایک ایسی جگہ وضو بناتا ہے جہاں غسل خانے کے

ساتھ بیت الخلاء بھی ہے۔اب زید وضو کے دوران کچھ دعائیں پڑھنا چاہتا ہے تو کیا زید ایسی جگہ میں دورانِ وضودعاؤں کا اہتمام کرسکتا ہے یانہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً......صورت مسئولہ میں چونکہ عام طور پر ایسی جگہوں پر صفائی کا اہتمام نہیں ہوتا۔لہٰذا اللہ کے نام کی تعظیم کی وجہ سے زید ایسی جگہ پر وضو کرتے وقت وضو کی دعائیں جہراًیعنی زبان سے نہ پڑھے بلکہ دل میں پڑھنے کا اہتمام کرے۔

لمافی الهندية(١/٦): ويسمى قبل الاستنجاء وبعده هو الصحيح كذا فى الهداية، ولا يسمى فى حال الانكشاف ولا فى محل النجاسة.

وفى الدر المختار (١/١٠٩): (قبل الاستنجاء وبعده) الاحال انكشاف وفى محل نجاسة فيسمى بقلبه. (الشامية) (قوله الاحال انكشاف الخ) الظاهر ان المراد أنه يسمى قبل رفع ثيابه ان كان فى غير المكان المعدّ لقضاء الحاجة، والافقبل دخوله، فلو نسى فيهما سمى بقلبه، ولا يحرك لسانه تعظيماً لاسم الله تعالىٰ.

(۸۱) عورتوں کا ننگے سر وضو کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض خواتین جب وضو کرتی ہیں تو اپنے سر سے دوپٹہ اتار لیتی ہیں وضو کے بعد پھر پہن لیتی ہیں آیا یہ فعل خواتین کا صحیح ہے یانہیں؟ نیز عورتوں کیلئے ننگے سر وضو کرنا کیسا ہے اور ان کا وضو درست ہوگا یانہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً......عورتوں کا دوران وضو سر سے دوپٹہ اتارنا جائز ہے جبکہ وہاں پر کوئی نامحرم موجود نہ ہو کیونکہ سر کے بالوں کا نامحرم سے چھپانا ضروری ہے۔نیز ننگے سر وضو کرنے سے وضو پر کوئی اثر نہ پڑے گا وضو درست ہوجائے گا۔

لمافى الدرالمختار(٦/٣٦٧): (ومن محرمه) هى لا يحل له نكاحها ابداً بنسب اوسبب ولوبزناً (الى الرأس والوجه والصدر والساق والعضد ان أمن شهوته.

وفى فتاوىٰ اللجنة(٥/٢٣٥): س: عورة الرجل من السرة الى الركبة فما حكم وضوئه عارياً؟ لابساً سرو الاً قصيراً لا يستر ركبته؟

ج: الحمد لله وحده والصلوة والسلام على رسوله وآله وصحبه وبعد يصح وضوءه لان كشف العورة ولبس السروال القصير لايمنعان من صحة الوضوء ولكن يحرم عليه كشف عورته بحضرة غير زوجته او سريته وهى الامة المملوكة له التى يباح له الاستماع بها.

(۸۲) وضو کے بعد شہادتین پڑھنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا وضو کرنے کے بعد شہادتین پڑھنا اور انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کرنا مسنون ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......وضو کے بعد شہادتین پڑھنے کو تمام فقہاء کرام نے سنت وآداب میں سے شمار کیا ہے۔اور انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کرنے کو بعض فقہاء نے ادب قرار دیا ہے۔

لمافی حاشية الطحطاوی علی المراقی (ص۷۷):(والاتيان بالشهادتين بعده) وذكر الغزنوی انه يشير بسبابته حين النظر الی السمآء.

وفی الهندية (۸/۱):وان يقول بعد الفراغ من الوضوء سبحانک اللهم وبحمدک اشهد ان لا اله إلا أنت أستغفرک وأتوب إليک وأشهد أن لا إله الا الله واشهد أن محمداً عبده ورسوله......

﴿فصل فی الغسل﴾

(غسل کے مسائل کا بیان)

(۸۳) کن کن صورتوں میں غسل کرنا فرض ہوجاتا ہے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کن کن صورتوں میں غسل کرنا فرض ہوتا ہے اگر کوئی شخص عورت سے ہمبستری کرے لیکن منی خارج نہ ہو تو کیا اس پر غسل فرض ہوجائے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... مندرجہ ذیل صورتوں میں غسل فرض ہوجاتا ہے۔

(۱)...... جوش کے ساتھ منی کا نکلنا۔ (۲)...... مرد کی سپاری کا اندر چلا جانا چاہے انزال ہو یا نہ ہو۔

(۳)...... حیض کے خون کا بند ہوجانا۔ (۴)...... نفاس کے خون کا بند ہوجانا۔

لمافی الفتاوٰی التاتارخانية (۱/۱۵۲): أسباب الغسل ثلاثة الجنابة والحيض والنفاس.

وفی الهندية (۱/۱۵): الإيلاج فی أحد السبيلين اذا تواترت الحشفة يوجب الغسل على الفاعل والمفعول به أنزل أولم ينزل.

(۸۴) جنّ (ناری مخلوق) کے جماع سے غسل کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت پر جن عاشق ہوگیا ہے اور وہ اس عورت سے جماع بھی کرتا ہے آیا جن کا عورت سے جماع کرنے کی وجہ سے عورت پر غسل فرض ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں اگر جن کے جماع کرنے کی وجہ سے عورت کو انزال ہوجائے تو پھر انزال کی وجہ سے غسل فرض ہوگا ورنہ محض جن کے جماع کرنے سے غسل واجب نہیں ہوگا البتہ اگر جن آدمی کی صورت میں آکر جماع کرتا ہو تو پھر بغیر انزال کے بھی غسل واجب ہوجائے گا۔

لمافی الهندية: (۱/۱۵): لوقالت امرأة معی جنی يأتينی وأجد فی نفسی ماأجد اذا جامعنی زوجی لاغسل عليها.

وفی الدر المختار (۱/۱۶۱): احتراز عن الجنی يعنی اذا لم تنزل واذا لم يظهر لها فی صورة

الآدمی.

وفی الشامیة تحته: ففی المحیط لوقالت معی جنی یأتینی مرارا وأجد ماأجد اذا جامعنی زوجی لاغسل علیها لانعدام سببه وهو الایلاج أوالاحتلام...... أما اذا ظهر فی صورة آدمی وکذ اذا ظهر للرجل جنیة فی صورة آدمیة فوطئها وجب الغسل لوجود المجانسة الصوریة.

(۸۵) جانور کے ساتھ بدفعلی کرنے سے غسل کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مرد نے جانور کے ساتھ بدفعلی کی صرف دخول ہوا، منی خارج نہیں ہوئی تو آیا اس پر غسل فرض ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً...... جانور کے ساتھ بدفعلی کرنا ایک گھناؤنی اور قبیح حرکت ہے، تاہم اگر کوئی شخص اس طرح کی حرکت کرتا ہے اور اس کی منی خارج نہیں ہوئی تو پھر اس پر غسل فرض نہیں۔

لمافی الهندیة: (۱/۱۵):والایلاج فی البهیمة والمیتة والصغیرة التی لایجامع مثلها لایوجب الغسل بدون الانزال.

وفی الدر المختار(۱/۱۶۶): (و) لا عند (وطء بهیمة أومیتة أوصغیرة غیر مشتهاة)......(بلا انزال).

(۸۶) احتلام میں غسل کب واجب ہوگا؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی نیند سے بیدار ہونے پر کپڑوں پر احتلام کے اثرات محسوس کرے، حالانکہ نہ تو اسے احتلام یاد ہے اور نہ ہی خواب یاد ہے کیا ایسی صورت میں غسل واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً...... صورت مسئولہ میں غسل واجب ہوگا۔

لمافی الدرالمختار (۱/۱۶۳):عند(رؤیة مستیقظ) ......(وان لم یتذکر الاحتلام)

وفی الشامیة: ای والحال أنه ان لم یتذکر الاحتلام یجب الغسل ......

(۸۷) احتلام کے بعد خواب یاد نہ ہوتو غسل کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظامِ اس مسئلہ کے بارے میں کہ بندہ کے ساتھ ایک عرصہ سے یہ مسئلہ پیش آرہا ہے کہ جب بھی سوتا ہے تو بے خبری میں احتلام ہوتا ہے۔ خواب وغیرہ کچھ بھی یاد نہیں ہوتا۔ جس کی وجہ سے ہر وقت شلوار دھونا اور غسل کرنا بہت تنگی کا باعث ہے۔ آیا اس کو بیماری شمار کیا جائے گا یا احتلام ہی ہے۔ جو بھی صورت ہو میرے لئے شریعت میں کیا حکم ہے؟ جبکہ ہر وقت

غسل کرنا بعض اوقات بہت مشکل ہوجاتا ہے۔ حکم تحریر فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......اگر سونے کی حالت میں کسی کو احتلام ہوجائے اور جاگنے کے بعد تری دیکھے اور اس کو یقین ہو یا ظن غالب ہو کہ یہ منی ہے تو اس پر غسل واجب ہوگا اگر چہ خواب یاد نہ ہو۔ پس صورت مسئولہ میں اگر یقین یا ظن غالب ہو کہ یہ منی ہے تو غسل واجب ہوگا اگر چہ خواب یاد نہ ہو۔

لمافي الهندية(۱/۱۴،۱۵): وان استيقظ الرجل ووجد على فراشه او فخذه بللا وهو يتذكر احتلاما ان تيقن انه مني أو تيقن أنه مذي أو شك انه مني أو مذي فعليه الغسل وان تيقن انه ودي لاغسل عليه وان رأى بللا الا انه لم يتذكر الاحتلام فان تيقن انه ودي لا يجب الغسل وان تيقن أنه مني يجب الغسل.

وفي الدر المختار مع الشامية(۱/۱۶۳): في الدر المختار(و)عند (رؤية مستيقظ) ...... وإن لم يتذكر الاحتلام وفي الشامية فيجب الغسل اتفاقا في سبع صور منها......(إلى قوله) او علم انه مني مطلقا.

(۸۸) بدفعلی کی وجہ سے غسل کتنی بار کیا جائے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دن میں کہیں سفر پر جارہا تھا تو ایک شخص سے ملاقات ہوئی جو شکل وصورت سے عالم لگ رہا تھا ان سے مختلف باتیں ہوتی رہیں، ایک بات انہوں نے بیان کی جس پر میرا دل مطمئن نہیں ہوا، وہ یہ کہ اگر کوئی شخص کسی لڑکے کے ساتھ بدفعلی کرے تو اس کو ہر نماز کے وقت غسل کرنا ضروری ہوگا بغیر غسل کئے اس کی نماز صحیح نہیں ہوگی کیا یہ بات قرآن وحدیث یا فقہ وغیرہ میں ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......بدفعلی کرنا بہت بڑا گناہ ہے، اس فعل بد کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قوم لوط پر پتھروں کی بارش برسائی اور ان کو نشان عبرت بنادیا اور شریعتِ محمدیہ (علی صاحبہا الصلاۃ والسلام) میں بھی اس فعل سے روکا گیا ہے اگر خوانخواستہ کسی مکلّف سے یہ فعل صادر ہوجائے تو ایک ہی دفعہ غسل کرنے سے پاکی حاصل ہوجائے گی کیونکہ جو حدیثیں بدفعلی کرنے والے کی عدم طہارت کے بارے میں آئی ہیں، ان کو علامہ سخاوی رحمۃ اللہ علیہ نے باطل اور من گھڑت کہا ہے۔

لما في المقاصد الحسنة (/۳۴۵): ۸۸۷ حديث: لو اغتسل اللوطي بماء البحر لم يجئ يوم القيامة الاجنبا اسنده الديلمي عن انس به مرفوعا، وهو عنده ايضا من حديث ابي هريرة رفعه بلفظ: المتلوط لواغتسل بكل قطرة تنزل من السماء على وجه الارض الى ان تقوم الساعة لما طهره الله من نجاسته او يتوب، وكل مافي معناه باطل.

وفی الولوالجية(۱/۵۰):الايلاج فی الآدمی يوجب الغسل علی الفاعل والمفعول انزل اولم ينزل لانه ايلاج فی الفرج.

وفی الدرالمختار(۱/۱۶۲):(فی أحد سبيلی آدمی) حی (يجامع مثله) سيجئ محترزه (عليهما) أی الفاعل والمفعول (لو) كانا (مكلفين) ولو أحد هما مكلفا فعليه فقط دون المراهق.

(۸۹) بدفعلی سے فاعل ومفعول پر غسل کا حکم نیز جس جانور کے ساتھ بدفعلی ہوئی ہواس کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ وطی فی الدبر سے فاعل ومفعول دونوں پر غسل واجب ہوگا یا صرف فاعل پر؟ نیز کیا جانور کے ساتھ وطی سے غسل واجب ہوگا جبکہ انزال نہ ہوا ہو، اور ایسے جانور کا کیا کرنا چاہئے؟

الجواب حامداً ومصلياً.....وطی فی الدبر حرام ہے اور اس فعل خبیث پر قرآن وحدیث میں سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں صورت مسئولہ میں فاعل ومفعول دونوں پر غسل واجب ہو جائے گا خواہ انزال ہوا ہو، یا نہ ہوا ہو۔ جانور کے ساتھ وطی کی صورت میں فاعل پر انزال کی صورت میں غسل واجب ہو جائے گا جبکہ عدم انزال کی صورت میں غسل واجب نہیں ہوگا، پھر اگر جانور اپنا ہے اور غیر ماکول اللحم ہے (ایسا جانور ہے کہ جس کا گوشت نہیں کھایا جاتا ہو) تو اُس کو ذبح کر کے جلا دیا جائے گا اور اگر ماکول اللحم ہے (جس کا گوشت کھایا جاسکتا ہے) تو اس کا گوشت کھانا جائز ہے۔ اگر جانور کسی دوسرے شخص کا ہو تو ایسی صورت میں واطی پر مالک کو اس کی قیمت ادا کرنا مستحب ہے، لازم نہیں لہٰذا اس کو مجبور نہیں کیا جائے گا۔

لمافی الشامية (۱/۱۶۱): (قوله وعند ايلاج) ای ادخال وهذا أعم من التعبير بالتقاء الختانين لشموله الدبر أيضاً(قوله هی مافوق الختان) كذا فی القاموس زاد الزيلعی من رأس الذكر

وفيه ايضاً (۱/۱۶۲) (قوله آدمی) احتراز عن البهيمة كما يأتی وعن الجنية كمامر...... (قوله بالاجماع) لما فی الصحيحين من حديث ابی هريره قال قال رسول الله ﷺ اذا جلس بين شعبها الاربع ثم جهدها فقدوجب الغسل انزل او لم ينزل ......ووجوبه علی المفعول به فی الدبر بالقياس احتياطاً.

وفيه ايضاً(۱/۱۶۶): (قوله ولاعندوطء بهيمة الخ) محترزات قوله فی أحد سبيلی آدمی حی يجامع مثله وفی القنية برمز اجناس الناطفی فرج البهيمة كفيها لاغسل فيه بغير انزال ويعزر وتذبح البهيمة وتحرق علی وجه الاستحباب ولايحرم اكل لحمها به.

وفيه ايضاً(۴/۲۶):(قوله وتذبح ثم تحرق) أی لقطع امتداد التحدث به كلما رؤيت وليس بواجب كما فی الهداية وغيرها وهذا اذا كانت مما لا يؤكل فإن كانت توكل جاز أكلها عنده وقالا: تحرق

أيضاً فان كانت الدابة لغير الواطئ يطالب صاحبها أن يدفعها اليه بالقيمة ثم تذبح هكذا قالوا ولا يعرف ذلک الاسماعاً فيحمل عليه زيلعي ونهر (قوله الظاهر أنه يطالب ندبا الخ) أي قولهم يطالب صاحبها أن يدفعها الى الواطئ ليس على طريق الجبر وعبارة النهر: والظاهر أنه يطالب على وجه الندب ولذا قال في الخانية كان لصاحبها أن يدفعها اليه بالقيمة وعبارة البحر: والظاهر لايجبر على دفعها.

(۹۰) غسل کے دوران ناف میں پانی پہنچانے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ گزشتہ ماہ میرا سہ روزہ کی جماعت میں جانا ہوا، وہاں اتفاق سے مجھے احتلام ہوگیا، چونکہ نماز میں وقت کم تھا اس لئے میں جلد از جلد نہا کر نکل آیا اور نماز پڑھ لی، لیکن نماز کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں نے نہاتے وقت ناف میں انگلی نہیں ڈالی، اور صرف ویسے ہی پورے بدن پر پانی بہا کر باہر آ گیا۔ کیا اب مجھے اس نماز کا اعادہ کرنا ہوگا؟ اور کیا دورانِ غسل ناف میں پانی پہنچانا ضروری ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......غسل میں پورے بدن پر پانی بہانا فرض ہے دورانِ غسل ناف میں انگلی ڈالنا فرض نہیں البتہ ناف میں پانی پہنچانے کا مناسب طریقہ انگلی ڈالنا ہے۔ صورتِ مسئولہ میں اگر یقین ہے کہ ناف میں بھی پانی پہنچ گیا ہے تو غسل ہو جائے گا ورنہ غسل نہیں ہوگا اور نماز واجب الاعادہ ہوگی۔

لمافي التاتارخانية (۱/۱۵۰): ويجب ايصال الماء الى داخل السرة وينبغي ان يدخل اصبعه فيها للمبالغة وفي الخانيه وان علم انه يصل الماء اليه من غير إدخال الاصبع أجزاه.

وفي الهندية (۱/۱۴): ويجب ايصال الماء الى داخل السرة وينبغي أن يدخل اصبعه فيها للمبالغة.

وفي الدر المختار: (۱/۱۵۲): (ويجب) أي يفرض (غسل) كل يمكن من البدن بلا حرج مرة كاذن (وسرة وشارب وحاجب) واثناء (لحية).

(۹۱) غسل میں غرغرہ کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج رات میرے اوپر غسل فرض ہوگیا صبح اٹھ کر میں نے غسل کیا اس میں کلی وغیرہ تو کی لیکن غرغرہ کرنا بھول گیا تو کیا میرا غسل صحیح ہوا یا دوبارہ غسل کرنا پڑے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً......غسل میں مضمضۃ اور استنشاق فرض ہیں اور غرغرہ سنت ہے اور صورت مسئولہ میں چونکہ مضمضہ اور استنشاق ہوا ہے۔ لہٰذا آپ کا غسل صحیح ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

لمافي الفتاوىٰ التاتارخانية (۱/۱۵۱): فالفرض ان يغسل جميع بدنه ...... ويتمضمض ويستنشق

فالمضمضة والاستنشاق فرضان فی الغسل نفلان فی الوضوء.

وفی البزازیة (۱/۱۱): ترک المضمضة فی الغسل ثم شرب الماء عی وجه السنة لا ینوب ولو علی غیر وجهها ینوب لانه مص فی الاول وعب فی الثانی والاحوط ان لا یخرج مالم یمج الماء.

وفی الشامیة(۱/۱۵۱): (وفرض الغسل)...... الفرض بمعنی المفروض......(مایعم العملی) ای لیشمل المضمضة والاستنشاق...... (وغسل کله فمه) عبرعن المضمضة والاستنشاق بالغسل لافادة الاستیعاب او للاختصار.

(۹۲) فِلنگ شدہ (بھرائی کئے ہوئے) دانت کے ساتھ وضواور غسل کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کے دانت میں کیڑا لگ جائے اور وہ اس دانت میں بھرائی کرالے تو وضواور غسل کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... کیڑا لگنے کی وجہ سے دانت کی بھرائی کو دانت کا حصہ تصور کیا جائے گا لہٰذا وضو میں تو کوئی اشکال نہیں کیونکہ وضو میں کلی سنت ہے فرض نہیں۔ البتہ غسل میں کلی فرض تو ہے لیکن بھرائی کے نیچے تک پانی کا پہنچانا ناممکن ہے اوراس میں حرج عظیم لازم آتا ہے لہٰذا صرف کلی کر لینے سے وضوء میں سنت اور غسل میں فرض ادا ہو جائے گا۔

لمافی الهندیة (۱/۵): وفی مجموع النوازل اذا کان برجله شقاق فجعل فیه الشحم وغسل الرجلین ولم یصل الماء الی ماتحته ینظر ان کان یضره ایصال الماء الی ماتحته یجوز وان کان لایضره لایجوز...... اذا کان فی اعضائه شقاق وقد عجز عن غسله سقط عنه فرض الغسل ویلزم امرار الماء علیه فان عجز عن امرار الماء یکفیه المسح فان عجز عن المسح سقط عن المسح ایضاً فیغسل ماحوله ویترک ذالک الموضع.

وفی الدر المختار (۱/۱۵۲):(ویجب) ای یفرض (غسل) کل مایمکن من البدن بلاحرج مرة کأذن و(سرة وشارب وحاجب و) اثناء (لحیة) وشعر الرأس ولو متلبداً......(وفرج خارج)......(لا) یجب (غسل مافیه حرج کعین)وان اکتحل بکحل نجس (وثقب انضم و)لا(داخل قلفة)بل یندب وهو الاصح.

وفی ردالمحتار (۱/۱۵۲):(قوله وثقب انضم) قال فی شرح المنیة:وان انضم الثقب بعد نزع القرط وصار بحال ان امرّ علیه الماء یدخل وان غفل لافلابدمن امراره ولا یتکلف لغیر الامرار من ادخال عود ونحوه فان الحرج مدفوع.

(۹۳) رنگے ہوئے بالوں کے ساتھ غسل وغیرہ کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں سر کے بال مختلف قسم کے رنگ سے رنگنے کا فیشن ہے تو ایسی حالت میں فرض غسل ان کا صحیح ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اگر وہ رنگ جس سے بالوں کو رنگوایا گیا ہے ذی جسم ہو اور پانی بالوں تک نہ پہنچتا ہو تو فرض غسل صحیح نہیں ہوگا اور اگر ذی جسم نہ ہو یا ذی جسم تو ہو لیکن پانی بالوں تک پہنچتا ہو تو فرض غسل صحیح ہوگا۔

لمافی مراقی الفلاح(صـ ۸۱): ولا بدمن زوال مایمنع وصول الماء للجسد کشمع وعجین لاصبغ بظفر صباغ ولامابین الاظفار.

وفی الدرالمختار (۱/۱۵۴): (ولایمنع) الطهارة (ونیم...... وحناء) ولوجرمه وبه یفتی.

وفی الشامیة تحته: (قوله وبه یفتی) صرح به فی المنیة عن الذخیرة فی مسألة الحناء والطین والدرن معللاً بالضرورة. قال فی شرحها ولان الماء ینفذه لتخلله وعدم لزوجته و صلابته. والمعتبر فی جمیع ذالک نفوذ الماء ووصوله الی البدن.

(۹۴) نابالغ پر جماع کے سبب غسل کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نابالغ لڑکا ولڑکی اور مراہق ومراہقہ پر جماع کی وجہ سے غسل کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......نابالغ یا قریب البلوغ لڑکا یا لڑکی پر جماع کی وجہ سے شرعاً غسل واجب نہیں البتہ عادت ڈالنے کیلئے غسل کا حکم دیا جائے گا اور بغیر غسل وطہارت کے نماز سے بھی روکا جائے گا، غفلت کی صورت میں تھوڑی بہت مار پیٹ کی بھی گنجائش ہے۔البتہ اگر نابالغ بہت چھوٹا بچہ یا بچی ہے تو اس پر اس معاملے میں سختی نہیں کی جائے گی۔

لمافی الهندیة (۱/۱۵): غلام ابن عشر سنین جامع امرأة بالغة فعلیها الغسل ولاغسل علی الغلام إلّا أنه یؤمر بالغسل تخلّقا واعتیاداً کما یؤمر بالصلوة تخلّقا واعتیاداً ولو کان الرجل بالغا والمرأة صغیرة یجامع مثلها فعلی الرجل الغسل ولا غسل علیها.

وفی الدر المختار (۱/۱۶۲): أی الفاعل والمفعول(لو) کانا(مکلفین) ولو أحدهما مکلفاً فعلیه فقط دون المراهق لکن یمنع من الصلوة حتی یغتسل ویؤمربه ابن عشرتا دیباً.

وفی الشامیة تحته: (قوله تادیبا) فی الخانیة وغیرها یؤمر به اعتیادا وتخلّقا کما یؤمر بالصلوة

والطهارة وفي القنية: قال محمد وطي صبية يجامع مثلها يستحب لها أن تغتسل كانّه لم يرجبرها وتأديبها على ذلک: وقال أبو علی الرازی: تضرب على الاغتسال وبه نقول وكذا الغلام المراهق يضرب على الصلوة والطهارة.

(۹۵) عورت کیلئے غسل جنابت میں فرج میں انگلی داخل کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا عورت کیلئے غسل جنابت میں فرج میں انگلی داخل کرنا ضروری ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......عورت کیلئے غسل جنابت میں فرج کے ظاہری حصے کا دھونا ضروری ہے اس میں انگلی داخل کرنا ضروری نہیں۔

لمافي الهندية(۱/۱۴): ويجب على المرأة غسل فرجها الخارج في الجنابة والحيض والنفاس...... لاتدخل المرأة اصبعها في فرجها عند الغسل.

وفي الدر المختار مع تنوير الابصار(۱/۱۵۲): (ويجب) اى يفرض(غسل) كل مايمكن من البدن بلا حرج مرة كأذن و(سرة وشارب وحاجب...... وفرج خارج) لانه كالفم لاداخل لأنه باطن. ولاتدخل اصبعها في قبلها به يفتى.

وفي الشامية تحته:(قوله لاداخل) اى لايجب غسل فرج داخل (قوله ولاتدخل اصبعها) اى لايجب ذلک كما في الشرنبلالية...... لايجب ادخالها الأصبع في قبلها وبه يفتى فافهم.

(۹۶) دورانِ غسل عورت کا سر کے بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچانے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عورت کیلئے دورانِ غسل سر کے بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچانا ضروری ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......جی ہاں! عورت کیلئے دورانِ غسل سر کے بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچانا ضروری ہے۔

لمافي الهندية(۱/۱۳): وليس على المرأة ان تنقض ضفائرها في الغسل اذا بلغ الماء اصول الشعر ......ولو الزقت المرأة رأسها بطيب بحيث لايصل الماء الى اصول الشعر وجب عليها ازالته ليصل الماء الى اصوله.

وفي الشامية(۱/۱۵۳): لكن في المبسوط: وانما شرط تبليغ الماء اصول الشعر لحديث حذيفة فانه كان يجلس الى جنب امرأته اذا اغتسلت فيقول ياهذه ابلغي الماء اصول شعرک وشئوون رأسک.

(۹۷) غسل جنابت میں اگر کلی بھول جائیں تو پانی پینے سے ادائیگی فرض کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک صاحب نے صبح غسل جنابت کیا، وہ کلی کرنا بھول گئے، اسی حالت میں نماز پڑھ لی، انہوں نے دوسنتوں کے بعد پانی پیا تھا، ہمارے محلے میں ایک صاحب کا کہنا ہے، اس طرح کلی ہو جاتی ہے کیا یہ بات صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ سے پہلے یہ سمجھئے کہ کلی میں منہ کے تمام اطراف میں پانی پہنچانا ضروری ہے، اگر کوئی ایک حصہ بھی خشک رہ گیا تو اس صورت میں غسل نہیں ہوگا، اب اگر ان صاحب نے فرض کی ادائیگی سے پہلے جو پانی پیا اگر وہ پانی انہوں نے ایک ہی سانس میں غیر مسنون طریقے سے (منہ بھر کر) پیا تو ان کی نماز ہو جائے گی اور اگر مسنون طریقے سے ایک ایک گھونٹ پیا تو غسل نہیں ہوا، لہذا نماز بھی نہیں ہوئی اور وجہ اس کی یہ ہے کہ منہ بھر کر پینے سے پانی منہ کے تمام اطراف میں پہنچ جاتا ہے اور ایک ایک گھونٹ پینے سے پانی منہ کے تمام اطراف میں نہیں پہنچتا۔

لمافي الهندية (۱۳/۱): الجنب اذا شرب الماء ولم يمجه لم يضره ويجزيه عن المضمضة اذا أصاب جميع فمه.

وفی الدرالمختار (۱۵۱/۱): (فرض الغسل)...... (غسل) كل (فمه) ويكفى الشرب عباً.

وفي الشامية: (ويكفى الشرب عبا)...... والمراد به هنا الشرب بجميع الفم وهذا هو المراد بما فى الخلاصة ان شرب على غير وجه السنة يخرج عن الجنابة والا فلا، وبما قيل ان كان جاهلا جاز وان كان عالماً فلا "اى لان الجاهل يعب والعالم يشرب مصاً كما هو السنة".

(۹۸) غسل جنابت سے پہلے پانی میں ہاتھ ڈالنا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کو رات میں احتلام ہو جائے، اب صبح غسل کے وقت یہ دیکھنے کیلئے کہ پانی زیادہ گرم تو نہیں وہ بالٹی میں ہاتھ ڈال دے تو کیا اس سے وہ پانی ناپاک ہو جائے گا جبکہ اس نے وہ ہاتھ ابھی تک دھوئے نہیں تھے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں اگر اس کے پاس پانی نکالنے کیلئے کوئی دوسرا برتن نہیں تھا اور ہاتھ پر کوئی نجاست بھی لگی ہوئی نہیں تھی تو ایسی صورت میں یہ پانی ناپاک نہیں ہوا بلکہ اس سے غسل کرنا بالکل صحیح ہے۔

لمافي الهندية (۲۲/۱): اذا ادخل المحدث او الجنب او الحائض التى طهرت يده فى الماء للاغتراف لا يصير مستعملا.

وفی ردالمحتار (۱/۲۰۰): (لغیر اغتراف)......فلو قصد الاغتراف ونحوه کاستخراج کوز لم یصر مستعملا للضرورة.

(۹۹) غسل کرتے ہوئے جسم کا کچھ حصہ خشک رہ جائے تو غسل کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی پر غسل واجب ہوا جب اس نے غسل کیا تو بدن کا کچھ حصہ پانی کے ختم ہونے کی وجہ سے خشک رہ گیا اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا وہ غسل اس کا پورا سمجھا جائے گا کیونکہ اکثر حصہ دھل چکا ہے یا اس کو کچھ اور کرنا پڑے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً......غسل فرض ہونے کے بعد ضروری ہے کہ تمام بدن کے ہر حصے کو دھویا جائے اگر بال برابر بھی کوئی جگہ خشک رہ گئی تو غسل صحیح نہیں ہوگا۔ ہاں اگر غسل کرتے ہوئے پانی ختم ہوگیا اور پانی تک رسائی بھی ممکن نہیں تو پھر باقی ماندہ غسل کے لئے تیمّم کرلے اور اگر پانی تک رسائی ممکن ہو تو پھر باقی ماندہ اعضاء کو دھولے۔

لمافی الهندية(۱/۲۹): جنبٌ اغتسل وبقی لمعة وفنی ماءه یتیمم لبقاء الجنابة فان أحدث تیمم للحدث فان وجد ماء یکفیهما صرفه الیهما.

وفی الشامية(۱/۲۵۶): (قوله ولمعة و جنابة) أی لواغتسل وبقیت علی بدنه لمعة لم یصبها الماء فتیمم لها.

(۱۰۰) غسل کے بعد منی نکلنے سے غسل کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کے خاص حصے سے کچھ منی نکلی اور اس نے غسل کرلیا، بعد غسل کے دوبارہ کچھ بغیر شہوت کے نکلی تو کیا دوبارہ پھر غسل کرنا فرض ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اگر سونے، پیشاب کرنے اور کچھ قدم چلنے سے پہلے غسل کیا گیا اور پھر منی نکلی ہو تو راجح قول کے مطابق احتیاطاً غسل کرنا ضروری ہے اور اگر سونے یا پیشاب کرنے یا کچھ قدم چلنے کے بعد غسل کیا گیا اور پھر بقایا منی کا خروج ہوا تو بالاتفاق غسل کرنا ضروری نہیں۔

لمافی الهندية(۱/۱۴): ولو خرج بعدما بال أو نام أو مشی لایجب علیه الغسل اتفاقا.

وفی رد المحتار(۱/۱۶۰): وکذا لوخرج منه بقیة المنی بعد الغسل قبل النوم أو البول أو المشی الکثیر نهر أی لابعده لان النوم والبول والمشی یقطع مادة الزائل عن مکانه بشهوة فیکون الثانی زائلا عن مکانه بلا شهوة فلا یجب الغسل اتفاقا.

(۱۰۱) غسل کے بعد اگر منی کے قطرے آجائیں تو غسل کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے وظیفہ زوجیت ادا کیا، صبح غسل کرنے کے بعد چند قطرے منی کے آگئے، کیا ایسی صورت میں دوبارہ غسل واجب ہوتا ہے، جبکہ ان قطروں کے وقت شہوت بالکل نہ تھی؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں اگر مذکورہ شخص ہمبستری سے فارغ ہونے کے بعد سو گیا تھا یا اس نے پیشاب کیا اس کے بعد غسل کیا تھا تو اب جو قطرات بغیر شہوت کے نکل گئے ان سے غسل واجب نہیں ہوتا، اور اگر فراغت کے فوراً بعد غسل کرلیا اور غسل کے بعد چند قطرے آگئے تو اس سے دوبارہ غسل واجب ہو جائے گا۔

لـ مـافي الهندية (۱/۱۴): لو اغتسل من الجنابة قبل أن يبول أو ينام وصلى ثم خرج بقية المنى فعليه أن يغتسل عندهما خلافا لأبى يوسف رحمه الله تعالىٰ...... ولو خرج بعد ما بال أو نام أو مشى لا يجب عليه الغسل اتفاقاً.

وفي ردالمحتار (۱/۱۶۰): لو خرج منه بقية المنى بعد الغسل قبل النوم أو البول أو المشى الكثير نهر اى لا بعده لان النوم والبول والمشى يقطع مادة الزائل عن مكانه بشهوة فيكون الثانى زائلاً عن مكانه بلا شهوة فلا يجب الغسل اتفاقاً......

(۱۰۲) انجکشن کے ذریعے سے مادۂ منویہ رحم میں پہنچانے سے غسل کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل جدید دور ہے ہر کام جدید طریقے سے کیا جاتا ہے۔ جانوروں کو انجکشن کے ذریعے حاملہ کیا جاتا، اسی طرح عورتوں کے رحم میں انجکشن کے ذریعے مادہ منویہ پہنچایا جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جب عورتوں کے رحم میں انجکشن کے ذریعہ مادۂ منویہ پہنچایا گیا تو عورت پر غسل فرض ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... انجکشن کے ذریعے مادہ منویہ پہنچانے سے غسل واجب نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ غسل خروج منی بالدفق سے یا دخول حشفہ سے واجب ہوتا ہے اور یہاں ایک بھی نہیں پایا جاتا۔

لمافي المحيط البرهاني (۱/۲۲۷): وقال محمدؒ في البكر: إذا جو معت فيما دون الفرج فدخل من ماءه فرجها فلا غسل عليها. لأن الغسل إنما يجب بالتقاء الختانين أو بنزول الماء ولم يوجد واحد منهما. حتى لو حبلت يجب الغسل عليها لنزول ماء ها.

وفي الخانية (۱/۲۱): الجنابة تثبت بسببين احدهما انفصال المنى عن شهوة والثانى الايلاج في الأدمى الخ.

(۱۰۳) ''غیر معتاد راستے سے خروج منی'' کے متعلق ایک فتویٰ پر استدراک

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ احتلام کے بعد کسی خرابی کی بنا پر منی مثانے سے ہوکر پیشاب کے ساتھ نکلے تو غسل وغیرہ کا کیا حکم ہوگا؟ اس سے متعلق فتویٰ میرے ایک عزیز نے ایک مفتی صاحب سے لیا تھا، لیکن ان کے جواب سے مجھے کچھ بے اطمینانی ہے۔ براہ کرم آنجناب اس سوال کا مدلل جواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔

نوٹ: وہ فتویٰ مع سوال وجواب کے اس سوالنامے کے ساتھ منسلک ہے۔

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی کو احتلام ہوتا ہے اور بوقت احتلام لذت بھی محسوس کرتا ہے مگر منی باہر نہیں نکلتی اور یہ آپریشن کے بعد ہوا پہلے ایسا نہ تھا اور ڈاکٹر کہتا ہے آپریشن کے دوران گوشت کا ٹکڑا لاپرواہی یا کوتاہی سے کٹ گیا ہے جس کی وجہ سے منی معتاد راستے سے آنے کے بجائے پہلے مثانے میں جاتی ہے پھر پیشاب کے ساتھ نکلتی ہے کیا اس آدمی پر غسل واجب ہے یا نہیں جواب سے نواز کر مشکور فرمائیں۔

سائل: محمد اسماعیل ڈیروی

جواب......صورت مسئولہ میں لذت شہوت کا قرینہ قویہ ہے اور منی کا اپنی جگہ سے شہوت کے ساتھ جدا ہونے کا بھی اور خروج منی شہوت کے ساتھ متحقق اس وجہ سے نہ ہوسکا کہ آپریشن میں غلطی سے گوشت کا ٹکڑا کٹ گیا جس کی وجہ سے منی پہلے مثانے میں چلی جاتی ہے پھر پیشاب کے ساتھ معتاد راستے سے نکلتی ہے اور آپریشن کے باب میں سرجن کا قول معتمد ہے چنانچہ صورت مسئولہ میں اس آدمی پر غسل واجب ہوگا۔ قال فی الھدایة یقال اجنب الرجل اذ اقضیٰ شھوته من المرأته والحدیث (ای الماء من الماء) محمول علی الخروج عن شھوة ثم المعتبر عند ابی حنیفةؒ ومحمدؒ انفصاله عن مکانه علی وجه الشھوة وعند ابی یوسفؒ ظھوره ایضاً اعتبار للخروج بالمزایلة اذاالغسل یتعلق بھما ولھما (ای طرفین) انه متی وجب من وجه فالاحتیاط فی الایجاب، (ج ا ص ۳۱) اور مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب سوال نمبر ۱۱۷ کے جواب میں چند سطور لکھنے کے بعد لکھتے ہیں وجوب غسل کیلئے انفصال بشھوۃ شرط ہے، اگرچہ خروج بشھوۃ نہ ہو مگر مواقع ضرورت میں خروج بشھوۃ پر فتویٰ ہے جو امام ابو یوسفؒ کا قول ہے پس ماسوائے ضرورت کے انفصال بشھوۃ پر فتویٰ ہے کذا فی الدر المختار والشامی وغیرھما۔ فتویٰ دارالعلوم دیوبند جلد اوّل صفحہ ۱۳۹، فصل فی موجبات غسل۔

بندہ نور محمد عفی عنہ

اصل اس مسئلہ کی تین صورتیں ہیں۔ آخری صورت چونکہ نزاعی ہے اور وہ انفصال کے وقت شہوت ہو، اور ظہور کے

وقت نہ ہو۔ تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک غسل واجب نہیں طرفین کے نزدیک واجب ہے، عدم وجوب منی بر قیاس ہے اور وجوب منی بر احتیاط ہے لہٰذا احتیاطاً غسل کرے واجب نہیں ہے۔ معدن الحقائق شرح کنز الدقائق (کتاب الطہارۃ، صفحہ ۱۰۰)

المجیب

حسین عرفان ابن شیخ الحدیث مولانا علاؤالدین صاحب

الجواب حامداً ومصلیاً...... اصحاب المذہب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جب منی اپنے مقر سے شہوت کے ساتھ جدا ہو جائے تو جب تک اس کا خروج وظہور من الذکر نہ ہوگا اس وقت تک اس پر غسل واجب نہیں ہوگا، خروج من الذکر شہوت کے ساتھ ہونا امام ابو یوسفؒ رحمہ اللہ کے نزدیک شرط ہے جبکہ طرفین رحمہما اللہ کے نزدیک شرط نہیں بغیر شہوت کے خروج ہو جائے تب بھی غسل واجب ہوگا اور اسی قول کو اکثر فقہاء نے ترجیح دی ہے، البتہ مہمان کے حق میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول کو لیا ہے۔

واضح رہے کہ مذکورہ شخص پر احتیاطاً غسل واجب ہوگا اور سوالنامے کے ساتھ منسلکہ فتویٰ میں مذکورہ جواب میں جو معدن الحقائق کی عبارت نقل کی گئی ہے اسی عبارت کے آگے یہ عبارت بھی مذکور ہے۔

تنبیہ: فتاویٰ ظہیریہ میں ہے کہ تاج الشریعۃ وغیرہ محققین نے جو طرفین کے مذہب کو متون میں ذکر کیا ہے وہی ظاہر، اصح اور احوط ہے اس بارے میں درمختار کا قول (جو انہوں نے بحوالہ قہستانی وفتاوی تاتارخانیہ، نوازل سے نقل کیا ہے کہ "وبقول ابی یوسف ناخذ لانہ ایسر علی المسلمین" قلت ولا سیما فی الشتاء والسفر) لائق التفات نہیں اور نہ اس پر فتویٰ دینا جائز ہے الا یہ کہ حرج اور ضرورت ہو۔

منسلکہ فتوی کے مجیب سے دو غلطیاں ہوگئی ہیں، پہلی غلطی یہ کہ اردو شرح سے فتویٰ دیا ہے، دوسری غلطی یہ کہ شارح اور فقہاء کی عبارت میں تحریف کر کے ان کی طرف غلط نسبت کی ہے، اصل عبارت چھوڑ دی ہے جس کو وہ احتیاطاً واجب کہہ رہے ہیں یہ اس کو واجب نہیں سمجھتے، شارح جس پر فتویٰ دینے کو ناجائز کہہ رہے ہیں یہ اس کو جائز اور اس پر فتویٰ دے رہے ہیں۔

لمافی البحر الرائق (۱/۱۰۳، ۱۰۴): والاحتیاط واجب وهو العمل بالاقوی من الوجهین فوجب ...... وفی المستصفی یعمل بقول ابی یوسف اذا کان فی بیت انسان واحتلم مثلا ویستحی من اهل البیت او خاف ان یقع فی قلبهم ریبة بان طاف حول اهل بیتهم وفی السراج الوهاج والفتوی علی قول ابی یوسف فی الضیف وعلی قولهما فی غیره.

وفی البنایة (۱/۱۸۸): (فی الایجاب) أی الاحتیاط واجب فی ایجاب الغسل ترجیحا لجانبه وقال الاترازی قال بعض الشارحین الخروج علی وجه الشهوة قد وجد وانما عدم الدفق لا غیر فباعتبار ماوجد یجب الاغتسال وباعتبار ماعدم لا یجب فیرجع حال الوجود احتیاطاً.

وفي بدائع الصنائع(۱/۳۷): (ومنها) ان ينفصل المنى عن شهوة ويخرج لا عن شهوة وانه يوجب الغسل فى قول ابى حنيفة ومحمد وعند ابى يوسف لايوجب فالمعتبر عندهما الانفصال عن شهوة و عنده المعتبر هو الانفصال مع الخروج عن شهوة وفائدته تظهر فى موضعين احدهما اذا احتلم الرجل فانتبه وقبض على عورته حتى سكنت شهوته ثم خرج المنى بلا شهوة والثانى اذا جامع فاغتسل قبل ان يبول ثم خرج منه بقية المنى وجه قول ابى يوسف ان جانب الانفصال يوجب الغسل وجانب الخروج ينفيه فلا يجب مع الشك ولهما انه اذا احتمل الوجوب والعدم فالقول بالوجوب اولى احتياطاً.

وفي الشامية(۱/۱۶۰): (قوله وبقول ابى يوسف ناخذ) أى فى الضيف وغيره وفى الذخيرة ان الفقيه ابا الليث وخلف بن ايوب اخذا بقول ابى يوسف وفى جامع الفتاوى ان الفتوى على قوله اسماعيل: (قوله قلت الخ) ظاهره الميل الى اختيار مافى النوازل ولكن اكثر الكتب على خلافه حتى البحر والنهر ولا سيما قد ذكروا ان قوله قياس وقولهما استحسان وانه الاحوط فينبغى الافتاء بقوله فى مواضع الضرورة فقط تأمل.

وفي الفقه الاسلامى(۱/۵۱۵): واتفق أئمة الحنفية على انه لا يجب الغسل اذا انفصل المنى عن مقره من الصلب بشهوة الا اذا خرج على راس الذكر وهناك خلاف بينهم فى انه هل تشترط مقانة الشهوة للخروج؟ فعندابى حنيفة ومحمد: لاتشترط وعند ابى يوسف تشترط وثمرة الخلاف تظهر فيما لو احتلم فوجد اللذة ولم ينزل حتى توضا وصلى ثم انزل. اغتسل ولا يعيد الصلاة فى رأيهما ولا يغتسل فى رأيه ولو اغتسل بعد الجماع قبل النوم او البول او المشى ثم خرج منه المنى بلا شهوة يجب اعادة الغسل عندهما لا عنده وقولهما احوط لان الجنابة قضاء الشهوة فاذا وجدت مع الانفصال تحقق اسمها.

(۱۰۴) ضرورت کی وجہ سے غسلِ جنابت کو مؤخر کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ غسل جنابت کو ضرورت کی بناپر مؤخر کرنے کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... جنبی کیلئے غسل کرنا فی الفور ضروری نہیں، تاخیر کی گنجائش ہے، البتہ اتنی تاخیر کرنا کہ جس سے نماز کا وقت نکل جائے باعثِ گناہ ہے۔

لمافی الهندية(۱/۱۶): الجنب إذا أخر الاغتسال إلى وقت الصلاة لايأثم كذا فى المحيط قد نقل

الشيخ سراج الدين الهندى الاجماع على انه لايجب الوضوء على المحدث والغسل على الجنب والحائض والنفساء قبل وجوب الصلاة أو ارادة مالا يحل إلابه.

وفى رد المحتار(۱/۱۶۵): قال فى الشرنبلالية: واختلف فى سبب وجوب الغسل. وعند عامة المشايخ ارادة فعل ما لايحل فعله مع الجنابة وقيل وجوب مالا يحل معها، والذى يظهر انه ارادة فعل مالا يحل إلابه عند عدم ضيق الوقت أوعند وجوب مالا يصح معها، وذلك عند ضيق الوقت لما قال فى الكافى ان سبب وجوب الغسل الصلاة أو ارادة مالا يحل فعله مع الجنابة والانزال والالتقاء شرط اهـ.

(۱۰۵) مرتد کا دوبارہ اسلام قبول کرنے کیلئے غسل کرنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص پہلے کافر ہو بعد میں اسلام لائے تو اس کو غسل کرنا چاہیے۔اب معلوم یہ کرنا ہے کہ اگر کوئی شخص نعوذ باللہ مرتد ہو جائے اور بعد میں پھر اسلام لائے تو اس پر غسل کرنا لازم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً......کافر کا اسلام قبول کرنے کیلئے غسل کرنا مستحب ہے بشرطیکہ حالت کفر میں جنابت لاحق نہ ہوئی ہو۔اگر حالت کفر میں جنابت لاحق ہوئی تھی۔اور غسل نہیں کیا تھا۔تو اب غسل کرنا واجب ہوگا۔مرتد کے لیے بھی یہی حکم ہے۔یعنی مرتد کا دوبارہ اسلام لانے کیلئے غسل کرنا مستحب ہے۔لیکن اگر حالت ارتداد میں جنابت لاحق ہوئی تھی اور غسل نہیں کیا تھا تو اب غسل کرنا واجب ہوگا۔

لمافى بدائع الصنائع(۱/۲۷۲): أما المستحب فهو غسل الكافر اذا اسلم لما روى ان رسول الله ﷺ كان يأمر بالغسل من جاءه يريد الاسلام، وادنى درجات الامر الندب والاستحباب، هذا اذا لم يعرف انه جنب فاسلم، فأما اذا علم كونه جنبا فاسلم قبل الاغتسال. اختلف المشايخ فيه قال بعضهم: لا يلزمه الاغتسال أيضا لان الكفار غير مخاطبين بشرائع هى من القربات والغسل يصير قربة بالنية فلا يلزمه وقال بعضهم: يلزمه لان الاسلام لاينافى بقاء الجنابة بدليل انه لا ينافى بقاء الحدث حتى يلزمه الوضوء بعد الاسلام كذا الجنابة، الخ.

وفى المحيط البرهانى(۱/۲۲۸): والكافر اذا أجنب ثم اسلم ففى وجوب الغسل عليه اختلاف المشايخ قال بعضهم يجب، واليه أشار محمد رحمه الله فى السير الكبير.

وفى الهندية(۱/۱۶): الكافر اذا أجنب ثم اسلم يجب عليه الغسل فى ظاهر الرواية(إلى قوله) وواحد مستحب وهو غسل الكافر اذا أسلم ولم يكن جنبا كذا فى محيط السرخسى.

(۱۰۶) غسل خانے میں باتیں کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص غسل کررہا تھا کہ باہر سے دوسرے آدمی نے آواز دی تو وہ غسل خانے میں بولنا شروع ہوگیا جب اس کو کہا گیا کہ غسل خانے میں باتیں کرنا منع ہے تو اس نے کہا بیت الخلاء میں باتیں کرنا منع ہے غسل خانے میں اجازت ہے تو کیا اس کی بات درست ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً...... چونکہ بیت الخلاء میں گندگی اور ستر کے کھلے ہونے کی حالت ہوتی ہے۔اس لئے وہاں پر اللہ تعالی کا ذکر اور دیگر دنیاوی باتیں کرنا مکروہ ہے۔لہٰذا غسل خانے میں بھی اگر دورانِ غسل ستر کھلا ہوا ہوتو باتیں کرنا مکروہ ہوگا، تاہم اگر ستر کھلا ہوا نہیں ہے، تب بھی غیر ضروری باتیں کرنا ادب کے خلاف ہے۔

مافی الهندية(۱/۱۴): ويستحب أن لايتكلم بكلام قط.

وفي الشامية (۱/۱۵۶): قال الشر نبلالي. ويستحب أن لايتكلم بكلام مطلقا أما كلام الناس فلكراهته حال الكشف . وأما الدعاء فلأنه في مصبّ المستعمل ومحل الأقذار والأوحال.

(۱۰۷) غسل مسنون کی اقسام اور جمعہ کے غسل کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کن کن صورتوں میں غسل کرنا سنت ہے؟ اگر کوئی شخص جمعہ کے دن غسل نہ کرے تو کیا وہ گنہگار ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... چار صورتوں میں غسل کرنا مسنون ہے۔ (۱)...... جمعہ کے دن، (۲)......عید الفطر وعید الاضحیٰ کے دن (۳)......حج وعمرہ کا احرام باندھنے سے پہلے، (۴)......عرفہ کے دن زوال کے بعد۔

چونکہ جمعہ کے دن غسل کرنا مسنون ومستحب ہے اس لئے اگر کبھی کسی عذر یا مجبوری کی وجہ سے جمعہ کا غسل نہ کرسکے تو کوئی حرج نہیں لیکن بغیر کسی عذر کے اس کی عادت بنالینے میں گناہ کا اندیشہ ہے۔لہٰذا احتیاط اس میں ہے کہ بغیر عذر کے جمعہ کے دن کا غسل ترک کرنے سے بچنا چاہئے۔

لمافي الهندية (۱/۱۶): واربعة سنة وهي غسل يوم الجمعة ويوم العيدين ويوم عرفة وعند الاحرام.

وفي الدر المختار (۱/۱۶۸): (وسن لصلوٰة جمعة و)لصلوٰة (عيد) هو الصحيح كما في غرر الاذكار وغيره......(و) لاجل (احرام و) وفي جبل (عرفة) بعد الزوال.

وفي الشامية تحته: (قوله وسن الخ) هو من سنن الزوائد، فلا عتاب بتركه كما في القهستاني .

﴿فصل فی التیمم﴾

(تیمّم کے مسائل کا بیان)

(۱۰۸) تیمّم کی حکمت و مصلحت

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مرتبہ ایک خطیب صاحب مسئلہ بیان فرما رہے تھے کہ اگر کسی کو پانی نہ ملے یا کوئی عذر ہو تو وہ تیمّم کر کے نماز ادا کرے نماز معاف نہیں ہے مسئلہ تو میں نے سمجھ لیا لیکن مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ تیمّم کرنے میں کیا مصلحت ہے جبکہ ظاہری کوئی فائدہ بھی نظر نہیں آ رہا، براہ کرم آپ حضرات تیمّم کی مصلحت اور فوائد بیان فرما کر میری الجھن دور فرما دیں؟

الجواب حامداًومصلیاً......حکیم ذات کا کوئی حکم، حکمت اور مصلحت سے خالی نہیں ہوتا چاہے کسی کو بظاہر اس کی حکمت سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔لیکن ہر حکم کی حکمت و مصلحت ڈھونڈنا بندے کیلئے مناسب نہیں کہ حکمت سمجھے بغیر عمل پیرا ہونا کامل اطاعت ہے۔ہاں! کوئی اس درجہ پر پہنچا ہو کہ مصلحت معلوم کرنے سے اطاعت میں مزید اضافہ ہو تو اس وجہ سے اس کیلئے حکمت و مصلحت معلوم کرنا الگ بات ہے۔

تیمّم کی مشروعیت، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان خصوصیات میں سے ہے۔ جو آپ سے پہلے دوسرے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو عطاء نہیں ہوئیں اور اس میں مصلحت لوگوں کے لئے آسانی کا پیدا کرنا اور تنگی کو دفع کرنا ہے کہ جہاں پانی موجود نہ ہو یا پانی موجود ہو لیکن استعمال کرنے میں کوئی عذر ہو تو تیمّم کیا جائے۔اور جس طرح تمام مائعات میں سے پانی کو طہارت کیلئے خاص کیا گیا ہے۔اسی طرح تیمّم کیلئے مٹی کو خاص کیا گیا اور اس میں بنی آدم کی کرامت کا اظہار ہے کہ اس کی تخلیق بھی مٹی اور پانی سے ہوئی ہے۔تو ان دونوں کو اس کی پاکی کیلئے خاص کر دیا گیا۔

لمافی القرآن الکریم (المائدہ:٦): وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ○

وفی التفسیر المنیر(١١١/٦): ثم ذکر تعالیٰ حکمة مشروعیة التیمم وهی التیسیر علی الناس ودفع الحرج عنهم، فابان انه تعالیٰ ما یرید لیجعل علیکم فیما شرعه من احکام الوضوء والغسل والتیمم فی هذه الایة وغیرها حرجا ای ادنی ضیق واقل مشقة، لانه تعالیٰ غنی عنکم، رحیم بکم،

فلا يشرع لكم الاما فيه الخير والنفع لكم، ولكن يريد ليطهركم من الدنس والرجس المادى بازالة الاقذار، والرجس المعنوى بطرد الكسل والفتور الحاصل عقب الجنابة، وبعث النشاط، لتكون النفس صافية مرتاحة فى مناجاة ربها، ويريد ايضا ان يتم نعمته عليكم بالجمع بين طهارة الا بدان وطهارة الارواح، وتبيان طريق العبادة الافضل، لتؤد و الشكر الواجب عليكم، ولتداوموا شكر النعم التى انعمها الله عليكم.

وفى مبسوط السرخسیؒ(۱/۱۰۸): وما شرع التيمم الا لدفع الحرج قال الله تعالىٰ ما يريد الله ليجعل عليكم من حرج......... فكما يختص الوضوء بالماء دون سائر المائعات فكذلك التيمم وفيه اظهار كرامة الادمى فانه مخلوق من التراب والماء فخصا بكونهما طهورا لهذا.

(۱۰۹) کیا ہر وہ چیز جوجلانے سے خاک نہ ہو اس سے تیمّم درست ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک عالم سے پوچھا کہ تیمّم کس کس چیز سے جائز ہے تو وہ کہنے لگے کہ ہر وہ چیز جوجلانے سے خاک میں تبدیل نہ ہو تو اس اعتبار سے کافی چیزیں اس میں داخل ہو جاتی ہیں کیا سب سے تیمّم کرنا جائز ہوگا جیسے نمک، مرچ اور گھر میں دیواروں پر لگا ہوا چونا وغیرہ؟ قرآن وسنت کی روشنی میں تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں یہ جواب مکمل نہیں بلکہ اس کے دو جز ہیں، اول زمین کی جنس میں سے ہر اس چیز سے تیمّم جائز ہے جو جلانے سے نہ جلے، دوم پگھلانے سے نہ پگھلے، لہٰذا دونوں اصولوں کی روشنی میں گھر کی دیواروں کے چونے سے تیمّم درست ہے، اور جہاں تک نمک کا تعلق ہے تو نمک کی دو قسمیں ہوتی ہیں اول سمندری، دوم پہاڑی، اگر نمک سمندری ہے تو اس سے تیمّم درست نہیں کیونکہ یہ جنس ارض میں سے نہیں اور اگر نمک پہاڑی ہے تو اس سے تیمّم درست ہے کیونکہ یہ جنس ارض میں سے ہے۔

اور مرچ چونکہ جلانے سے جل جاتی ہے لہٰذا اس سے بھی تیمّم درست نہیں۔

لمافى الهندية (۱/۲۶): وكل مايحترق فيصير رماداً كالحطب والحشيش ونحوهما أو ماينطبع ويلين كالحديد والصفر ......فليس من جنس الارض وما كان بخلاف ذلك فهو من جنسها ......

وفيها ايضاً (ص۲۷): أماالملح فان كان مائياً فلا يجوز به اتفاقاًوان كان جبلياً ففيه روايتان وصحح كل منهما ولكن الفتوى على الجواز.

وفى رد المحتار (۱/۲۳۹): الفارق بين جنس الارض وغيره أن كل ما يحترق بالنار فيصير رماداًكالشجر والحشيش أو ينطبع ويلين كالحديد والصفر والذهب والزجاج ونحوها فليس من جنس الارض ابن كمال عن التحفة.

(۱۱۰) تیمّم کن کن چیزوں سے جائز ہے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کن کن چیزوں پر تیمّم کرنا صحیح ہے؟ اگر پاک کپڑے پر گرد ہو تو اس پر تیمّم کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... ہر وہ چیز جو پاک ہو اور جنس الارض سے ہو یعنی جلانے سے راکھ نہ ہو، اور پگھلانے سے پگھلتی نہ ہو تو اس پر تیمّم کرنا صحیح ہے۔ مثلاً مٹی، پتھر، چونا اور گچ وغیرہ۔ اگر پاک کپڑے پر گرد وغبار ہو تو اس پر تیمّم کرنا درست ہے۔

لمافی الهندية(۱/۲۶،۲۷): (ومنها الصعيد الطيب) يتيمم بطاهر من جنس الأرض...... فيجوز التيمم بالتراب والرمل و السبخة المنعقدة من الأرض دون الماء والجص والنورة والكحل والزرنيخ والمغرة والكبريت والفيروزج والعقيق والبلخش والزمرد والزبرجد...... وصورة التيمم بالغبار أن يضرب بيديه ثوباً أو لبدا أو وسادة أوما اشبهها من الأعيان الطهارة التى عليها غبار فإذا وقع الغبار على يديه تيمم.

وفى الشامية(۱/۲۳۹): (قوله من جنس الارض) الفارق بين جنس الارض وغيره ان كل ما يحترق بالنار فيصير رماداً كالشجروالحشيش أو ينطبع ويلين كالحديد والصفر والذهب والزجاج ونحوها فليس من جنس الارض.

(۱۱۱) مسجد کے فرش ودیواروں سے تیمّم کرنا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں گرمیوں میں چلہ لگانے گیا تو میری تشکیل ایسی جماعت کے ساتھ ہوئی جس میں تین عالم حضرات تھے رات کے وقت ہم سونے لگے تو ایک عالم صاحب نے کہا اگر کسی کو احتلام ہو جائے تو مسجد کی دیوار یا فرش پر ہاتھ مار کر تیمّم کرلے اس کے بعد مسجد سے باہر جائے دوسرے نے کہا کہ مسجد کی مٹی سے تیمّم کرنا جائز نہیں کافی بحث ومباحثہ ہوا لیکن کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا، میرے دل میں خیال آیا کہ کسی دارالافتاء سے معلوم کیا جائے اب میں آپ حضرات کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ مسجد کی مٹی سے تیمّم کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... مسجد کی حرمت کے پیش نظر عام حالات میں مسجد کے درودیوار سے تیمّم کرنا مکروہ ہے البتہ موجودہ دور میں چونکہ مساجد پختہ ہوتی ہیں اس لئے مسجد کے اندر حالت جنابت میں مسجد کی درودیوار سے تیمّم کرنے کی گنجائش ہے۔ واضح رہے کہ یہ عمل مستحب ہے اس کی وجہ سے بحث ومباحثہ کرنا مناسب نہیں۔

لمافی الولوالجية(۱/۵۳): النائم اذا احتلم وهو فى المسجد ان امكنه ان يخرج من ساعته واغتسل

حتی لا یبقی فی المسجد جنبا وان لم یمکن بان کان فی وسط اللیل ولم یقدر علی الخروج یستحب له التیمم حتی لا یبقی فی المسجد جنبا.

وفی الفقه الاسلامی وادلته(۱/۵۴۶): لو احتلم فی المسجد، وجب علیه الخروج منه الا ان یعجز عن الخروج لإغلاق المسجد ونحوه، أوخاف علی نفسه أو ماله، فان عجز او خاف جاز ان یقیم للضرورة ولا یتیمم بتراب المسجد فیحرم ذالک فان خالف وتیمم صح الخ.

وفی البحر الرائق(۵/۴۱۹): لاحرمة لتراب المسجد اذا جمع وله حرمة اذا بسط.

وفی الشامیة(۱/۲۴۳): لکن لقائل ان یقول: ان مراد المبتغی ان الجنب اذا وجد ماء فی المسجد واراد دخوله للاغتسال یتیمم ویدخل، ولو کان نائما فیه فاحتلم والماء خارجه وخشی من الخروج یتیمم وینام فیه الی ان یمکنه الخروج

قال فی المنیة: وان احتلم فی المسجد تیمم للخروج اذا لم یخف، وان خاف یجلس مع التیمم ولا یصلی ولا یقرأ اهـ.

ویؤید ما قلناه ان نفس النوم من المسجد لیس عبادة حتی یتیمم له وانما هو لأجل مکثه فی المسجد او لأجل مشیه فیه للخروج.

(۱۱۲) تیمّم اور وضو کو ایک ساتھ جمع نہیں کیا جا سکتا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے چہرے سے داڑھی کے بال تھوڑی سی جگہ سے یکدم سے گرنے لگے اور وہ جگہ خالی ہوگئی، ایک ڈاکٹر نے علاج کی حامی بھری ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ تقریباً ایک ہفتہ تک اس جگہ کو پانی نہیں لگنا چاہیے، یہاں تک کہ اس پر مسح بھی نہیں کر سکتے، اب آپ بتائیں کہ میں تیمّم کر کے نماز پڑھ لوں یا باقی اعضاء کو دھولوں اور چہرے کا تیمّم کرلوں؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جو بات ہو آپ مجھے بتلادیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر ڈاکٹر مسلمان اور شریعت کا پابند ہے، تو آپ کیلئے اس کا قول معتبر ہے، لہٰذا آپ کیلئے تیمّم کرنا درست ہے البتہ یہ تیمّم صرف چہرے کا نہیں ہوگا بلکہ پورے اعضاء کا ہوگا اور اس کے ساتھ وضو نہیں ہوگا کیونکہ تیمّم اور وضو دونوں کو جمع نہیں کر سکتے بلکہ دونوں میں سے صرف ایک پر عمل کر سکتے ہیں۔

لمافی الهندیة (۱/۲۸): ویعرف ذلک الخوف اما بغلبة الظن عن امارة او تجربة او اخبار طبیب حاذق مسلم غیر ظاهر الفسق ......یغسل الصحیح ویمسح علی الجریح ان امکنه وان لم یمکنه المسح یمسح علی الجبائر او فوق الخرقة ولا یجمع بین الغسل والتیمم.

وفی الشامية (۱/۲۳۲): (اوقول حاذق مسلم)ای اخبار طبيب حاذق مسلم غير ظاهر الفسق ......
وفی البحر ولا فرق عندنا بين ان يشتد بالتحرک كالمبطون او بالاستعمال كالجدری.

(۱۱۳) وضو کی اجازت نہ ہونے پر تیمّم جائز ہے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص ایسی جگہ ہے جہاں پانی نہیں یا پانی تو ہے لیکن وضو کیلئے جگہ نہیں اور وضو کی اجازت بھی نہیں تو کیا ایسی صورت میں تیمّم کرنا جائز ہے؟ نیز ایسی جگہ اگر تیمّم کیلئے بھی کچھ نہ ملے تو پھر کیا کرے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں اگر پانی نہ ہوتو دیکھا جائے گا کہ ایک میل شرعی (جوکلومیٹر کے حساب سے 1.609 ہوتا ہے) کی مسافت تک پانی ہے یا نہیں اگر ایک میل تک پانی مل سکتا ہوتو پانی حاصل کر کے وضو کرے گا، اور اگر ایک میل تک پانی نہیں یا اسے پانی کا ہونا یا نہ ہونا معلوم نہ ہوتو اگر ظن غالب یہی ہے کہ پانی نہیں ہوگا، تو بھی تیمّم کرنا جائز ہوگا لیکن اگر پانی کے موجود ہونے یا نہ ہونے میں شک ہوتو تلاش کرنا ضروری ہوگا، تلاش کے بعد اگر مل جائے تو ٹھیک ورنہ تیمّم کرلے۔ اور اگر پانی تو ہے لیکن وضو کی جگہ نہیں تو تیمّم جائز نہیں وضو کرنا ہی ضروری ہوگا۔ اور اگر پانی موجود ہے لیکن وضو کی اجازت نہیں تو دیکھا جائے گا کہ اگر وضو کرنے سے شدید مشقت کا اندیشہ ہے مثلاً منع کرنے والا قید میں ڈال دے گا یا قتل کردے گا تو بھی تیمّم کرنا جائز ہوگا، ورنہ نہیں اور ایسے نماز پڑھنے کی صورت میں بعد میں جب یہ عذر ختم ہوجائے تو اس نماز کو دوبارہ پڑھنا لازم ہوگا۔ اور اگر پانی اور تیمّم کیلئے کوئی چیز نہ پائے تو اگر نماز کا وقت فوت ہونے کا اندیشہ ہے تو ایسی صورت میں تشبہ بالمصلین کرے گا یعنی جیسے نماز میں حرکات وسکنات ہوتی ہیں خاموشی (بغیر قراءت کے) کے ساتھ ویسے ہی کرے گا اور بعد میں جب پانی وغیرہ مل جائے تو دوبارہ ان نمازوں کی قضاء کرلے۔

لمافی الهندية (۱/۲۷): يجوز التيمم لمن كان بعيداً من الماء ميلاًهو المختار فی المقدار سواء كان خارج المصر أو فيه وهو الصحيح.

وفی الدر المختار (۱/۲۵۲): (والمحصور فاقد)الماء والتراب(الطهورين)بان حبس فی مكان نجس ولا يمكنه اخراج تراب مطهر ......(يؤخرها عنده :وقالا يتشبه) بالمصلين وجوباً

وفی الشامية تحته (وقالا يتشبه بالمصلين)ای احتراما للوقت. قال ط ولا يقرأ كما فی أبی مسعود سواء كان حدثه أصغر أو أكبر اهـ قلت: وظاهره أنه لاينوی أيضاً لأنه تشبه لاصلاة حقيقية تأمل.

وفی الشامية (۱/۲۳۵): اعلم ان المانع من الوضوء ان كان من قبل العباد كأسير منعه الكفار من الوضوء ومحبوس فی السجن ومن قيل له ان توضأت قتلتک جاز له التيمم ويعيد الصلاةاذا زال المانع.

(۱۱۴) معذوری میں تیمّم کی مشروعیت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص جو سخت بیمار ہے اور بستر پر پڑا ہوا ہے، طہارت وغیرہ کا انتظام مشکل ہے، بستر سے اٹھ بھی نہیں سکتا لہٰذا وضو بھی نہیں کرایا جاسکتا نہ ہی خود کرسکتا ہے کیونکہ سارا پانی بستر پر گرتا ہے، جس کی وجہ سے کافی پریشانی ہوتی ہے، تو کیا ایسی حالت میں نماز معاف نہیں ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں جب مریض خود وضو نہیں کرسکتا اور نہ ہی اسے کرایا جاسکتا ہے تو ایسی صورت میں تیمّم کر کے نماز پڑھے گا، نماز معاف نہیں ہوگی۔

لمافي الدر المختار (۱/۲۳۲، ۲۳۳): (من عجز)...... (عن استعمال الماء)...... (لبعده)...... (او لمرض) يشتد او يمتد بغلبة ظن او قول حاذق مسلم ولو بتحرك، او لم يجد من توضئه فان وجد ولو بأجرة مثل وله ذلک لايتيمم في ظاهر المذهب كما في البحر.

(۱۱۵) نزلے کے مریض کیلئے حالت جنابت میں تیمّم کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ میں نزلے کا مریض ہوں جب سردی آجاتی ہے تو میری حالت مزید خراب ہوجاتی ہے جب غسل کرتا ہوں تو سخت سردی لگتی ہے اور مرض بڑھ جانے کا یقین ہوتا ہے تو اگر مجھے غسل جنابت کی حاجت ہو تو کیا تیمم کر کے میں نماز پڑھ سکتا ہوں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... مریض اس وقت تیمم کرسکتا ہے جب اس کو خود ظن غالب ہو یا کوئی ماہر ڈاکٹر یا طبیب اس کو یہ بتائے کہ پانی کے استعمال سے مرض کے بڑھنے کا خطرہ ہے۔ اور صورت مسئولہ میں اگر گرم پانی کے استعمال پر بھی قدرت نہ ہو یا اس سے بھی مرض بڑھنے کا ظن غالب یا یقین ہو تو ایسی صورت میں تیمم کرنے کی گنجائش ہے۔

لمافي الهندية (۱/۲۸): ولو كان يجد الماء الا انه مريض يخاف ان استعمل الماء إشتد مرضه أو أبطأبرؤه يتيمم ...... ويعرف ذلک الخوف اما بغلبة الظن عن امارة أو تجربة أو اخبار طبيب حاذق مسلم غير ظاهر الفسق.

وفي الدر المختار (۱/۲۳۳): (أولمرض) يشتد أو يمتد بغلبة ظن أوقول حاذق مسلم ولو بتحرک أو لم يجد من توضئه.

(۱۱۶) ٹرین میں پانی نہ ہونے کی صورت میں تیمّم کا حکم نیز کپڑوں پر تیمّم کرنا کیسا ہے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص ٹرین میں سفر کررہا ہو، ٹرین میں پانی نہ ہو،

اور نماز کے وقت میں رکنے کا امکان بھی نہ ہو، یہ شخص ٹرین میں تیمّم کر کے نماز پڑھ سکتا ہے؟ نیز یہ شخص تیمّم کپڑے پر کر سکتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں اگر پانی ایک میل سے زیادہ دور ہو، اور ٹرین میں نہ ہی کسی سے اتنا پانی ملنے کی امید ہو، جس سے وضو ہو سکے تو یہ شخص ٹرین میں تیمّم کر کے نماز پڑھ لے، پھر اگر کھڑے ہو کر پڑھ سکتا ہے تو کھڑے ہو کر پڑھے ورنہ بیٹھ کر پڑھ لے۔ لیکن پانی اگر ایک میل سے کم دور ہو، اور ٹرین کا وہاں پہنچنے تک نماز کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو، تو پھر بھی تیمّم کر کے نماز پڑھ لے۔ البتہ اس صورت میں نماز کی قضاء بھی ضروری ہے۔ نیز کپڑے پر اگر تھوڑا بہت غبار ہو تو اس پر تیمّم کرنا درست ہے۔

لمافی الهندية(۱/۲۷): وصورة التيمم بالغبار ان يضرب بيديه ثوبا أو لبدا او وسادة او ما اشبهها من الاعيان الطاهرة التى عليها غبار فاذا وقع الغبار على يديه تيمم أو ينفض ثوبه حتى يرتفع غباره فيرفع يديه فى الغبار فى الهواء فاذا وقع الغبار على يديه تيمم كذا فى المحيط...... ومنها عدم القدرة على الماء......

وفيه ايضاً(۱/۱۴۳): أما الصلاة فى السفينة فالمستحب أن يخرج من السفينة للفريضة اذا قدر عليه كذا فى المحيط السرخسى.

وفى الدر المختار(۱/۲۴۱): (و) جاز (لخوف فوت صلاة جنازة)...... (أو) فوت (عيد)......

(صـ۲۴۶) (لا) يتيمم (لفوت جمعة ووقت)...... وقيل يتيمم لفوات الوقت قال الحلبى: فالأحوط ان يتيمم ويصلى ثم يعيده.

وفى الشامية تحته: (قوله وجاز لخوف فوت صلاة جنازة) اى ولو كان الماء قريبا.

وتحت(قوله قال الحلبى)...... ثم قال ماحاصله: ولعل هذا من هؤلاء المشايخ اختيار لقول زفر لقوة دليله وهو ان التيمم انما شرع للحاجة الى اداء الصلاة فى الوقت فيتيمم عند خوف فوته......

قلت: وهذا قول متوسط بين القولين، وفيه الخروج عن العهدة بيقين فلذا اقره الشارح......

بل قد علمت من كلام القنية انه رواية عن مشايخنا الثلاثة. ونظير هذا مسألة الضيف الذى خاف ريبة فانهم قالوا يصلى ثم يعيد والله تعالىٰ اعلم.

(۱۱۷) ٹریننگ کے دوران تیمّم کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں پاکستان آرمی میں ہوں، ہماری ٹریننگ بعض دفعہ ایسے صحراؤں میں ہوتی ہے جہاں پانی کا نام ونشان نہیں ہوتا اور ہمیں کئی کئی دن وہاں گزارنے پڑتے ہیں، تھوڑا سا پانی صرف پینے کیلئے ملتا ہے اس کے علاوہ پانی موجود تو ہوتا ہے لیکن افسران بالا کے قبضے میں ہوتا ہے سوائے پینے کے نہیں ملتا، ایسی صورت میں تیمّم کرنا جائز ہے یا

نہیں؟اگر تیمّم جائز نہ ہوتو پھر کیا کیا جائے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں جو پانی آپ کوملتا ہے وہ اتنا کم ہو کہ اگر وضو میں استعمال کیا جائے تو ختم ہو جائے گا اور شدت پیاس کی وجہ سے ہلاکت کا خطرہ ہے تو ایسی صورت میں افسران بالا سے وضو کیلئے پانی مانگنا ضروری ہے، اگر وہ دینے سے انکار کردیں تو پھر تیمّم کرنا جائز ہے۔

لـمـافـی الهـنـدية (۱/۲۸):وكـذا اذا خـاف **العطش على نفسه أو رفيقه المخالط له أو آخر من اهل القافلة**......

وفـی الـدر الـمـختـار (۱/۲۳۲):(مـن **عجز**)...... (**عن استعمال الماء**)...... (**لبعده**) ......صـ۲۳۴(او **خوف عدو**) (**او عطش**) ......صـ۲۳۶(**تيمم**)

وفی الشامية (او عطش)معطوف علی عدو .ای لانه مشغول بحاجته و **المشغول بالحاجة كالمعدوم**.

وفـی الـدرالـمـختـار (۱/۲۵۰): (ويطلبه) وجوبا على الظاهر من رفيقه (**ممن هو معه فان منعه**) **ولو دلالة** بأن إستهلكه (تيمم) لتحقق عجزه.

وفـی الشـامية (صـ۲۵۱):(من رفيقه)......ذكر الرفيق جرى مجرى العادة،**والا فكل من حضر وقت الصلاة فحكمه كذلك رفيقا كان او غيره** .

(۱۱۸) سردی کی وجہ سے تیمّم کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کوغسل کی ضرورت ہے لیکن پانی ٹھنڈا ہونے کی وجہ سے غسل کرنا دشوار ہے جبکہ وہ وضو کرسکتا ہے تو کیا اس کیلئے شرعاً جائز ہے کہ وہ غسل کیلئے تیمّم کرے اور وضو کرکے نماز پڑھ لے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر غسل کی ضرورت کے وقت سخت سردی کی وجہ سے غسل کرنا دشوار ہو بایں معنی کہ بیمار ہو جانے یا سخت نقصان کا خطرہ ہوتو ایسی صورت میں تیمّم کرنا جائز ہے، ورنہ جائز نہیں۔اور جائز ہونے کی صورت میں صرف تیمّم کرے گا بعد میں وضو کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وضو اور تیمّم دونوں جمع نہیں ہوسکتے۔

لـمـافـی خلاصة الفتاوی (۱/۳۸):فی الأصل الجنب والحائض والمحدث فی التيمم سوآء **ويجوز للمريض ان يتيمم فی المصر اذا لم يستطع الوضوء او الغسل للمرض او يخاف على نفسه الهلاک بسبب استعمال الماء او يخاف تلف عضو من اعضائه وان كان لا يخاف الهلاک ولا تلف العضو ولكن يخاف زيادة المرض او ابطاء البرء يجوز التيمم عندنا ولو كان الماء لايضره ولكن لايمكنه استعمال الماء جاز له التيمم عندنا**.

فی الهندية (۲۸/۱): ويجوز التيمم اذا خاف الجنب اذا اغتسل بالماء ان يقتله البرد او يمرضه هذا اذا كان خارج المصر اجماعاًفان كان فی المصر فكذا عند ابی حنيفة خلافاًلهما والخلاف فيما اذا لم يجد ما يدخل به الحمام فان وجد لم يجز اجماعاًوفيما اذا لم يقدر علی تسخين الماء فان قدر لم يجز ......

وفی الدرالمختار (۲۳۲/۱): (من عجز) ...... (عن استعمال الماء) ...... (لبعده) ...... (أو برد) يهلك الجنب أو يمرضه ولو فی المصر اذا لم تكن له اجرة حمام ولا مايدفئه

وفی الشامية (ولا ما يدفئه) ......قال فی البحر: فصار الأصل أنه متی قدر علی الاغتسال بوجه من الوجوه لا يباح له التيمم اجماعا.

(۱۱۹) سخت سردی کی حالت میں تیمّم کا شرعی حکم

سوال ...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایسی سخت سردی ہو جس میں پانی استعمال کرنے سے نقصان کا اندیشہ ہو تو اس میں تیمم کرنے کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً ...... سخت سردی کی حالت میں اگر ہلاکت یا عضو کے تلف ہونے کا، یا بیماری کی زیادتی کا قوی اندیشہ ہو اور گرم پانی یا ایسی کوئی چیز جس سے گرمی حاصل کر سکے بھی نہ ملے، تو تیمّم کرنا جائز ہے۔

لمافی الهندية (۲۸/۱): ويجوز التيمم اذا خاف الجنب اذا اغتسل بالماء ان يقتله البرد أو يمرضه.

وفی الدر المختار (۲۳۴/۱): أوبرد يهلك الجنب اويمرضه ولو فی المصر اذا لم تكن له اجرة حمام ولا مايدفئه.

وفی الشامية (۲۳۴/۱): نعم مفاد التعليل بعدم تحقق الضرر فی الوضوء عادة أنه لو تحقق جاز فيه ايضاً اتفاقاً، ولذا مشی عليه فی الامداد لان الحرج مدفوع بالنص.

(۱۲۰) نمازِ جنازہ کے فوت ہونے کے خوف سے تیمّم کرنے کا حکم

سوال ...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نمازِ جنازہ ہو رہا ہے اگر وضو کرے تو نماز جنازہ نہ ملنے کا اندیشہ ہے اب وضو کرے یا تیمّم؟

الجواب حامداًومصلیاً ...... صورت مسئولہ میں نماز جنازہ نہ ملنے کے خوف سے وہ تیمّم کر سکتا ہے جبکہ امام یا ولی نہ ہو۔

لمافی الهندية (۳۱/۱): ويجوز التيمم اذا حضرته جنازة والولی غيره فخاف ان اشتغل بالطهارة ان

تفوته الصلاة ولا يجوز للولي وهو الصحيح هكذا في الهداية.

وفي الشامية(۱/۲۴۵): قوله بخلاف صلاة جنازة اى فان تيمما تجوزبه سائر الصلوات لكن عند فقد الماء وا ما عند وجوده اذا خاف فوتها فانما تجوزبه الصلاة على جنازة اخرى اذا لم يكن بينهما فاصل كمامر ولا يجوز به غيرها من الصلوات أفاده ح.

(۱۲۱) نماز جنازہ کیلئے تیمّم کرنا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگرایک دم سے جنازہ سامنے آجائے یا کہیں جنازہ کیلئے جانا ہواور وضو کی فرصت نہ ہو یعنی وضو میں مشغولیت کی وجہ سے نماز جنازہ نکل جانے کا اندیشہ ہو، ایسی صورت میں اگر بلا وضو جنازہ پڑھ لیں تو کیسا ہے؟ کیونکہ میں نے سنا ہے کہ بلا وضو اگر کوئی سجدہ کرے تو کافر ہو جاتا ہے جبکہ نماز جنازہ میں سجدہ نہیں ہوتا، یا کوئی اور صورت اختیار کی جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... بغیر وضو نماز جنازہ پڑھنا درست نہیں، جس طرح اور نمازوں کیلئے طہارت شرط ہے اسی طرح نماز جنازہ کیلئے بھی طہارت شرط ہے، البتہ اگر اچانک جنازہ سامنے آجائے یا جنازہ کیلئے جانا ہو اور وضو میں مشغول ہونے سے نماز جنازہ فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو تیمم کر کے نماز جنازہ پڑھ سکتے ہیں، بشرطیکہ تیمم کرنے والا امام یا میت کا ولی نہ ہو کیونکہ ان دونوں کیلئے ہر صورت میں وضو کرنا ہی ضروری ہوگا۔ اور اگر کسی نے بغیر وضو نماز (چاہے پنج وقتی نماز ہو، نفل ہوں یا نماز جنازہ) کی ادائیگی کی تو اگر مسئلے کے معلوم نہ ہونے کی وجہ سے ایسا کیا یا لوگوں سے شرم کی وجہ سے تو ایسا شخص سخت گناہ گار ہوگا جس پر اسے توبہ واستغفار کرنا ضروری ہے اور اگر کسی نے یہ فعل جان بوجھ کر اسے جائز وحلال سمجھتے ہوئے کیا تو ایسا شخص دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔

لمافي الروض الازهر(صـ۴۶۸): وفي الفتاوى الصغرى والجواهر :ومن صلى مع الإمام بجماعة بغير طهارة عمدا كفر ،وفيه ان قيدالجماعة مع الامام لا يظهر وجهه ثم الصلوة بغير طهارة معصية فلا ينبغي ان يقال بكفره الا إذا استحلها......(وفي صـ۴۶۹) وفي التتمة من سجد أو صلى محدثا رياء كفر، فيه أن قيد الرياء يفيد أنه إن صلى حياء لا يكفر واما اذا جمع بين الرياء وترك الطهارة فكانه غلظ المعصية ومع هذا لا يخلوا عن الشبهة لا سيما في السجدة المفردة حيث يتوهم كثيرون أنها تجوز من غير طهارة ......كذا إذا صلى بغير طهارة أو مع الثوب النجس يعني مع القدرة على الثوب الطاهر كفر يعني اذا استحل والا فلا شك انها معصية وانه كأنه ترك تلك الصلوة وبمجرد تركها لا يكفر.

وفي الهندية (۱/۳۱):ويجوز التيمم اذا حضرته جنازة والولي غيره فخاف ان اشتغل بالطهارة أن

تفوته الصلاة ولايجوز للولى هو الصحيح.

وفى الدر المختار (۱/۲۴۱):(و)جاز (لخوف فوت صلاة جنازة)

وفى الشامية تحته ولو كان الماء قريبا.

(۱۲۲) عید کی نماز کیلئے تیمّم کی ایک صورت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک صاحب عید کی نماز پڑھنے عیدگاہ گئے نماز سے ذرا پہلے ان کا وضوٹوٹ گیا، وہاں وضو کا کوئی انتظام نہیں، اب انہیں کیا کرنا چاہیے؟ تیمّم کر کے نماز پڑھ لیں یا وضو کرنے کیلئے گھر جائیں، گھر جانے کی صورت میں نماز نکلنے کا اندیشہ ہے، یا عیدگاہ کے قریب جو گھر ہیں وہاں سے پانی مانگ کر وضو کر لے لیکن اس صورت میں غیر محرم سے بات چیت کرنی پڑتی ہے اور اس سے پانی لینا پڑتا ہے کیونکہ سب لوگ یہاں تک کہ بچے بھی نماز کیلئے عیدگاہ جاتے ہیں اور عیدگاہ میں یہ پوچھنا کہ قریب میں کس کا گھر ہے، جو وضو کیلئے پانی دے دے، یہ مشکل ہے؟ اب ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں تفصیلی جواب عنایت فرمائیں؟۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں جب عیدگاہ میں پانی موجود نہ ہو تو اگر نماز میں اتنا وقت باقی ہو کہ پانی کے انتظام اور وضو سے فراغت تک نماز ملنے کی اُمید ہو تو پانی کے انتظام کی کوشش کرنی ضروری ہے، اور اگر پانی کا انتظام کر کے وضو کرنے میں نماز فوت ہونے یا نہ ملنے کا خوف ہو تو ایسی صورت میں تیمّم کر کے نماز پڑھ لیں۔

لـمـافـى الدر المختار (۱/۲۴۱):(و)جاز (لخوف فوت صلاة الجنازة) ...... (أو) فوت (عيد) بفراغ امام اوزوال شمس (ولو) كان يبنى (بناء) بعد شروعه متوضأ وسبق حدثه (بلا فرق بين كونه اماما اولا) فى الاصح لان المناط خوف الفوت لا الى بدل.

وفى الشامية:(لان المناط)اى الذى تعلق به الحكم المذكورو هوالتيمم لخوف فوت الصلاة بلا بعد عن الماء.

وفى الخيرية(صـ۵):فلا يجوز التيمم له مع وجود الماء الا فى موضع يخشى الفوات لا إلى خلف كصلوٰة الجنازة والعيد.

(۱۲۳) پانی کی موجودگی میں تلاوت کیلئے تیمّم کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پانی کی موجودگی میں قرآن کریم کی تلاوت کیلئے تیمّم کرنے سے متعلق شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... بے وضو ہونے کی حالت میں قرآن کریم کو چھوئے بغیر صرف تلاوت کیلئے تیمم کرنا جائز ہے، اگرچہ پانی موجود ہو کیونکہ قرآن کریم کو ہاتھ لگائے بغیر تلاوت کرنا ان عبادات میں سے ہے کہ جن کیلئے اگر جنابت نہ ہو تو طہارت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ البتہ قرآن کریم کو ہاتھ میں لے کر، چھو کر تلاوت کیلئے باوضو ہونا ضروری ہے۔

لمافی الهندية(۱/۲۶): و لو تيمم لقراءة القرآن عن ظهر القلب أو عن المصحف أو لزيارة القبور أو لدفن الميت أو للأذان أو للإقامة أو لدخول المسجد أو لخروجه بأن دخل المسجد وهو متوضئ ثم أحدث أو لمس المصحف وصلى بذلك التيمم قال عامة العلماء لايجوز.

وفي الدر المختار(۱/۲۴۵): أنه يجوز لكل مالا تشترط الطهارة له ولو مع وجود الماء وأما ماتشترط له فيشترط فقد الماء كتيمم لمس مصحف فلا يجوز لواجد الماء وأما للقراءة فان محدثا فكالأول أوجنبا فكالثاني.

(۱۲۴) ٹرین میں پانی ختم ہو جائے تو تیمّم کر کے نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بسا اوقات دوران سفر ٹرین میں پانی نہیں ہوتا اور نماز کا وقت ختم ہو رہا ہوتا ہے اور اسٹیشن پر بھی بسا اوقات ٹرین بہت کم وقت کیلئے رکتی ہے جس میں پانی حاصل کرنا دشوار ہوتا ہے اور بعض اوقات بڑے اسٹیشن بہت دور ہوتے ہیں اور عام پانی میسر نہیں ہوتا البتہ بوتل والا گھوم رہا ہوتا ہے، تو کیا ایسی حالت میں بوتل (پیپسی وغیرہ) سے وضو کرنا جائز ہوگا یا تیمم کرنا چاہئے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں جب ٹرین کے کسی بھی ڈبے میں بالکل پانی نہ مل رہا ہو اور نماز کا وقت ختم ہو رہا ہو تو تیمّم کر کے نماز ادا کی جائے گی، اسی طرح جب پانی کے ایک میل تک ملنے کی امید نہ ہو تو اس وقت بھی تیمم کر کے نماز ادا کی جائے گی۔ باقی پیپسی وغیرہ جو مشروبات فروخت ہوتے ہیں یہ چونکہ ماء مطلق نہیں ہیں اس لئے ان سے وضو نہیں کیا جائے گا بلکہ تیمم کیا جائے گا ہاں اگر یہ امید ہو کہ مستحب وقت کے اندر اندر کسی اسٹیشن پر پہنچ کر پانی مل جائے تو اس وقت تک تاخیر کر لینا مستحب ہے۔

لما في الدر المختار (۱/۲۳۲): (من عجز) مبتداء خبره تيمم (عن استعمال الماء) المطلق الكافي لطهارته لصلاة تفوت الى خلف (لبعده) ولو مقيما في المصر (ميلاً)...... (أولمرض)

وفي الشامية (۱/۲۴۹): والحاصل انه اذا رجا الماء يؤخر الى آخر الوقت المستحب بحيث لايقع في كراهة وان كان لايرجو الماء يصلي في الوقت المستحب كوقت الاسفار في الفجر والابر اد في ظهر الصيف ونحو ذلك.

(۱۲۵) چلتی ہوئی ریل سے چشمے تالاب وغیرہ دکھائی دینے سے تیمّم نہیں ٹوٹتا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص ریل میں سفر کر رہا ہو، اور اس نے پانی نہ ملنے کی وجہ سے تیمّم کیا ہو اور اثناء راہ میں چلتی ہوئی ریل سے اُسے پانی کا چشمہ یا تالاب وغیرہ دکھائی دیں تو کیا اس کا تیمّم باقی رہے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں چلتی ہوئی ریل سے چشمہ یا تالاب وغیرہ صرف دکھائی دینے سے تیمّم نہیں ٹوٹے گا، جب تک کہ اس پانی کے استعمال پر قدرت حاصل نہ ہو۔

لما في الهندية (۱/ ۳۰): **وان مرعلى الماء وهو في موضع لايستطيع النزول اليه لخوف عدو أوسبع لم ينتقض هكذا** في السراج الوهاج...... **المسافر اذا مرفي الفلاة بماء موضوع في حب أونحوه لا** ينتقض تيممه.

وفي الدر المختار (۱/ ۲۵۶): والحاصل أن **كل مايمنع وجوده التيمم نقض وجوده التيمم (ومالا) يمنع وجوده التيمم في الابتداء (فلا) ينقض وجوده بعد ذلك التيمم**

وفي الشامية تحته: (قوله والحاصل) **اراد به التنبيه على أن ذلك قاعدة كلية تغني عن ذكرقدرة الماء الكافي فافهم.**

(۱۲۶) مقتدیوں کا امام سے بغیر کسی عذر شرعی کے ناراض ہونے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے کا ایک امام ہے جس کی عمر تقریباً پچاس سال ہے وہ اکثر بیمار رہتا ہے اس کی اولاد بھی صحیح نہیں ہے لوگ اس کو کہتے ہیں اپنی اولاد کو سمجھاؤ تو وہ کہتا ہے میرے سے زیادہ ہیں لوگ اس کو امامت سے ہٹانا چاہتے ہیں وہ امامت چھوڑنے کیلئے تیار نہیں ہے اب بعض لوگ اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے آیا ایسے امام کی امامت صحیح ہے؟ اور اس کا روکنے کے باوجود امامت کرانا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... امامت ایک عظیم الشان منصب ہے اس کی رعایت کرتے ہوئے امام کو ہر اس کام سے اجتناب کرنا چاہیے جو فتنہ وفساد اور مقتدیوں کی ناراضگی کا سبب بنے لہٰذا اپنے گھر والوں اور اولاد کی بھی نگرانی رکھے اور ان کی اصلاح کرتا رہے کہیں وہ گناہوں میں مبتلا اور نافرمان نہ ہو جائیں، لقوله تعالىٰ "**قوا انفسكم واهليكم نارا**"، یعنی خود بھی اور اپنے گھر والوں کو بھی جہنم سے بچاؤ، صورت مسئولہ میں امام صاحب کو اپنی اولاد کی فکر کرنی چاہیے اگر وہ سمجھانے کے باوجود نہ سمجھیں تو ان سے قطع تعلق کرنا (بشرطیکہ ان کے اس طرح سدھرنے کی امید ہو) بھی جائز ہے لیکن امام صاحب کا اکثر بیمار رہنا اور ان کی اولاد کا صحیح نہ ہونا، اگر چہ اس سے ان کی ذات میں شرعاً

قباحت لازم نہیں آتی جس کی وجہ سے ان کو امامت سے ہٹایا جائے اگر مقتدی ان افعال کی وجہ سے امام کو ہٹانا چاہتے ہیں تو ایسا کرنا ان کیلئے ناجائز ہے اجتناب کرنا چاہیے البتہ امام کو اس منصب کا لحاظ کرتے ہوئے خود استعفیٰ دیدینا چاہیے کیونکہ وہ اکثر بیمار رہتے ہیں اگر وہ امامت سے استعفیٰ نہ دیں پھر بھی ان کے پیچھے نماز درست ہے۔

لمافی مرقاة المفاتيح (۳/۸۴): (وامام قوم) أى الامامة الكبرىٰ أو امامة الصلاة (وهم له) وفى نسخة لها أى الإمامة (كارهون) أى لمعنى مذموم فى الشرع وإن كرهوا لخلاف ذلك فالعيب عليهم ولا كراهته قال ابن الملك أى كارهون لبدعته أو فسقه أو جهله اما اذا كان بينه وبينهم كراهة وعداوة بسبب أمر دنيوى فلا يكون له هذا الحكم.

وفى التجنيس والمزيد (۲/۷): رجل أمّ قوماً وهم له كارهون فهذا على ثلاثة أوجه اما اذا كانت الكراهية لفساد فيه أو كانوا احق بالامامة منه أو هو احق بالامامة منهم ولا فساد فيه ومع هذا كرهوا فالاول والثانى مكروه هكذا روى الحسن البصرىؒ عن اصحاب رسول الله ﷺ والثالث لا، لأن الجاهل والفاسق يكره العالم والصحيح، وهو الصحيح.

وفى الدر المختار (۱/۵۵۹): (ولو أمّ قوماً وهم له كارهون، إن) الكراهة (لفساد فيه أو لأنهم أحق بالامامة منه كره) له ذلك تحريماً لحديث أبى داؤد "لايقبل الله صلاة من تقدم قوماً وهم له كارهون" (وإن هو أحق لا) والكراهة عليهم.

وفى فتح الملهم (۳/۵۲۸): تأديب الرجل ولده وإن كان كبيراً اذا تكلم بما لا ينبغى له وجواز التأديب بالهجران.

(۱۲۷) غسل خانے کی عدم موجودگی میں تیمّم کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی عورت کو غسل کی حاجت ہو اور وہ ایسے مقام پر ہو جہاں غسل کرنے کیلئے غسل خانے کا انتظام نہ ہو تو کیا وہ تیمّم کر سکتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں مذکورہ خاتون پر غسل واجب رہے گا لہٰذا اس کو چاہئے کہ پردہ لٹکا کر یا انہی کپڑوں میں یا کوئی اور مناسب طریقہ استعمال کرتے ہوئے غسل کرلے اور اگر غسل کرنے کی صورت میں بدن ضروری طور پر دوسرے کے سامنے ظاہر ہوتا ہے اور پردے کا کوئی انتظام نہیں ہوسکتا تو اگر اس خاتون کے اردگرد خواتین ہیں تو غسل کرلے اور اگر اس کے اردگرد صرف مرد یا مرد اور خواتین دونوں ہیں تو مناسب انتظام نہ ہونے تک غسل میں تاخیر کرے۔

نیز غسل نہ کرنے کی صورت میں مناسب یہ ہے کہ تیمّم کر کے نماز ادا کرلے اور غسل کرنے کے بعد احتیاطاً نماز لوٹا لے۔

لما فی سنن النسائی(۱/۴۶): عن یعلی ان رسول الله ﷺ رای رجلا یغتسل بالبراز فصعد المنبر فحمد الله واثنی علیه وقال ان الله عزوجل حلیم حیی ستیر یحب الحیاء والستر فاذا اغتسل احدکم فلیستتر.

وفی الدر المختار(۱/۱۵۵): والمرأة بین رجال أو رجال ونساء تؤخره لا بین نساء فقط...... وینبغی لها أن تتیمم وتصلی لعجزها شرعا عن الماء.

وفی الشامیة (۱/۱۵۵): والأشبه الإعادة تفریعا علی ظاهر المذهب فی الممنوع من إزالة الحدث بصنع العباد إذا تیمم وصلی اهـ.......... واستظهر الرحمتی عدم الإعادة، قال لأن العذر لم یأت من قبل المخلوق، فإن المانع لها الشرع والحیاء وهما من الله تعالی.

فصل فی النجاسات واحکام التطہیر

(نجاسات کے احکام اور پاکی کا طریقہ)

(۱۲۸) چوتھائی کپڑے کے بقدر نجاست کا حکم اور چوتھائی سے مراد کیا ہے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک مفتی صاحب سے سنا ہے کہ اگر کسی جانور کے پیشاب کی چھینٹیں کپڑوں پر لگ جائیں تو اگر وہ نجاست ایک چوتھائی حصہ سے کم ہو تو وہ کپڑا ناپاک نہیں ہوگا اور ان کپڑوں میں پڑھی گئی نماز درست سمجھی جائیگی۔ اب میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ایک چوتھائی کی مقدار کیا ہے؟ اگر جانوروں کے بیچ میں کوئی شخص کھڑا ہو، اس دوران کسی جانور نے پیشاب کیا اور چھینٹیں اس کے پائنچوں پر لگ گئیں تو کیا وہ پاک ہے جبکہ وہ کم بھی ہیں؟ اور اگر وہ پاک ہے تو پھر اس حدیث کا کیا مفہوم ہوگا جس میں جانوروں کے پیشاب سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ((عن ابی ھریرۃؓ ان رسول اللہ ﷺ قال استنزھوا من البول فان عامۃ عذاب القبر منہ)) (دار قطنی ۱۳۶/۱)۔ اللہ تعالیٰ آپ حضرات کو جزاء خیر دے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں جب کسی حلال جانور کے پیشاب کی چھینٹیں چوتھائی کپڑوں سے کم پر لگ جائیں۔ (اور وہ کسی عذر کی بنا پر دھوئی نہ جاسکتی ہوں یا پھر نماز شروع کرنے کے بعد اس پر نظر پڑی ہو اور باجماعت نماز ملنے کی کہیں بھی امید نہ ہو۔ یا اسی طرح نماز کا وقت نکل رہا ہو) تو ان کپڑوں میں نماز ہو جائے گی۔ (اگر مذکورہ صورتوں میں سے کوئی عذر نہ ہو اور مقدار ربع سے کم ہو تو اس کو دھونا افضل ہے۔ چاہے نماز توڑ کر ہی کیوں نہ ہو) (۲) چوتھائی کپڑے سے وہ حصہ مراد ہوگا کہ جہاں پر یہ نجاست لگی ہوئی ہو۔ مثلاً آستین پر اگر لگی ہوگی تو اسی کا چوتھائی مراد ہوگا۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں پائنچے کا چوتھائی مراد ہے۔ (۳) قابل معافی سے مراد پاک ہونا نہیں ہے۔ بلکہ ہے تو یہ نجاست ہی، مگر مذکورہ مسئلے میں نجاست وطہارت دونوں طرح کی احادیث آنے سے اس میں خفت پیدا ہوگئی ہے۔ کیونکہ جیسا کہ سوال مذکور میں اس کی نجاست کی حدیث پیش کی گئی ہے۔ بالکل اسی طرح دوسری جگہ اس کے (حلال جانور کا پیشاب) پینے تک کی اجازت دی گئی ہے۔ لہٰذا فقہائے کرام کے قاعدے کے مطابق جب کسی شئی کی نجاست اور طہارت دونوں پر احادیث وارد ہوں تو پھر اس صورت میں اس شئی کی نجاست میں تخفیف آجاتی ہے، جیسا کہ مذکورہ مسئلے میں ہوا۔

لما فی الصحیح للبخاری (۳۵/۱): (باب ماجاء فی غسل البول وقال النبی ﷺ لصاحب القبر کان لا یستتر من بولہ ولم یذکر سوی بول الناس) ..... عن ابن عباس قال مر النبی ﷺ بقبرین فقال انھما لیعذبان وما یعذبان فی کبیر. اما أحدھما فکان لایستتر من البول.

وفيه ايضاً (۱/۳٦): (باب أبوال الإبل والدواب والغنم ومرابضها، وصلى ابو موسىٰ فى دار البريد والسرقين والبرية إلى جنبه. فقال ههنا وثم سواءٌ)...... عن انسؓ قال قدم اناس من عكل أوعرينة، فاجتوو المدينة، فأمرهم النبى ﷺ بلقاح وان يشربوا من ابوالها والبانها. الخ

وفى البحر الرائق(۱/۳۹٦): ومراده من العفوصحة الصلوة بدون ازالته لاعدم الكراهة..... وإن كانت اقل وقددخل فى الصلوة نظر ان كان فى الوقت سعة فالأفضل ازالتها..... وان كان فى آخر الوقت ..... يمضى على صلاته ولا يقطعها.

وفيه ايضاً(۱/۳۹۸): قال فى الكافى ولا يظهر الاختلاف فى غير الروث والخثى لثبوت الخلاف المذكور مع فقد تعارض النصين ثم على طرد أنه يثبت التخفيف عندهما بالتعارض، كما باختلاف المجتهدين تقع الحاجة الى الاعذار لمحمدؒ عن قوله بطهارة بول الحيوان الماكول، ثم لايخفى أن المراد بإختلاف العلماء المقتضى للتخفيف.

وفيه ايضاً(۱/۳۹۷): وحاصله، انه ان وردنص واحد بنجاسة شئ فهومغلظ. وان تعارض نصان فى طهارته ونجاسته فهو مخفف عنده. وعندهما. ان اتفق العلماء على النجاسة فهو مغلظ، وإن اختلفوا فهو مخفف.

وفى الدرالمختار(۱/۳۲۱):(وعفى دون ربع)جميع بدن و(ثوب) ولوكبيرا هو المختار ذكر الحلبى، ورجحه فى النهر على التقدير بربع المصاب كيد وكم، وان قال فى الحقائق وعليه الفتوىٰ. (من) نجاسة (مخففة كبول مأكول)ومنه الفرس وطهره محمدؒ.

(۱۲۹) نجاست کتنی مقدار میں معاف ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں بھینسوں کے باڑے میں ملازمت کرتا ہوں چونکہ ہمیں ہروقت باڑے میں آنا جانا ہوتا ہے بعض اوقات کوئی بھینس پیشاب کردیتی ہے جس کے چھینٹے میرے کپڑوں پر بھی پڑ جاتے ہیں تو کیا میں انہی کپڑوں کے ساتھ نماز پڑھ سکتا ہوں جبکہ بار بار کپڑے تبدیل کرنے میں دشواری ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......حلال جانوروں کا پیشاب نجاست خفیفہ ہے اور نجاست خفیفہ اگر جسم یا کپڑے کے کسی حصے پر چوتھائی یا اس سے کم مقدار میں لگ جائے تو وہ معاف ہے اگر اس سے بڑھ جائے تو پھر معاف نہیں ہے تو اسی اصول کے تحت صورت مسئولہ میں دیکھا جائیگا کہ اگر چھینٹے کپڑوں کے چوتھائی حصے یا اس سے کم پر ہیں تو پھر گنجائش ہوگی کہ انہی کپڑوں میں نماز پڑھ لیں، لیکن اگر چھینٹے اتنی کثیر مقدار میں ہوں کہ چوتھائی حصے سے بڑھ جائیں تو پھر اس صورت میں ان کپڑوں میں نماز جائز نہیں ہے۔

لمافی السراجية(ص ۱۲): اذا اصابت النجاسة الغليظة الثوب أوالبدن اكثر من قدر الدرهم الذی هو مثل الكف لايجوز وقدر الدرهم لا يضره بول ما يوكل لحمه لايضر مالم يفحش.

وفی الهندية(۱/۴۶):والثانی المخففة وعفی منها مادون ربع الثوب......وبول كبول مايوكل لحمه والفرس وخرء طير لايوكل مخفف هكذا فی الكنز.

وفی الدر المختار(۱/۲۱۰): (وبول ماكول) اللحم (نجس) ای نجاسة مخففة وطهره عند محمد (ولايشرب) بوله (اصلا).

(۱۳۰) سوئے ہوئے آدمی کے لعاب کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سونے کی حالت میں جو لعاب منہ سے نکلتا ہے وہ پاک ہے یا ناپاک؟ اگر وہ لعاب کپڑوں کو لگ جائے تو کیا کپڑے اس سے ناپاک ہو جائیں گے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......سونے کی حالت میں جو منہ سے لعاب نکلتا ہے وہ پاک ہے، اگر وہ لعاب کپڑوں کو لگ جائے تو کپڑے ناپاک نہیں ہوں گے۔

وفی الهندية(۱/۴۶): لعاب النائم طاهر سواء كان من الفم اومنبعثا من الجوف عند أبی حنيفة ومحمد رحمهما الله وعليه الفتوىٰ.

وفی الدرالمختار مع رد المحتار(۱/۱۳۸): كماء فم النائم فانه طاهر مطلقا به يفتی.

وفی الشامية تحته(۱/۱۳۸): (قوله مطلقاً) سواء كان من الرأس او من الجوف أصفرمنتناً أولا.

(۱۳۱) پرندوں کی بیٹ، مکھی اور مچھر کے خون کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پرندے کی بیٹ، مکھی ومچھر کا خون کپڑوں پر لگ جائے تو کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......مکھی اور مچھر اور اس طرح ہر وہ چیز جس میں دم سائل (بہنے والا خون) نہ ہو، اس کا خون پاک ہے اگر کپڑوں پر لگ جائے تو اس سے کپڑے ناپاک نہیں ہوتے، اور وہ پرندے جو ماکول اللحم ہیں ان کی بیٹ پاک ہے سوائے مرغی، بطخ، مرغابی کی بیٹ کے کیونکہ وہ ناپاک ہے اور جو پرندے غیر ماکول اللحم ہیں اصح قول کے مطابق ان کی بیٹ نجاست خفیفہ ہے۔ لہٰذا اگر ربعِ ثوب (چوتھائی کپڑے) سے کم مقدار میں ہو تو معاف ہے اور اگر ربعِ ثوب سے زائد مقدار میں ہو تو اس کا دھونا ضروری ہے۔

وفی الخانية علی هامش الهندية (۱/۱۹): (خرء) مايؤكل لحمه من الطيور طاهر الاماله رائحة

كريهة كخرء الدجاج والبط والاوزفهو نجس نجاسة غليظة.

وفی الهندية(۱/۴۶): وبول مايوكل لحمه والفرس وخرء طير لايوكل مخفف.......... وذرق مايوكل لحمه من الطير طاهر عندنا مثل الحمام والعصافير......ودم البق والبراغيث والقمل والكتان طاهر وان كثر.

وفی الدر المختار(۱/۳۱۹،۳۲۰): ودم سمک وقمل وبرغوث وبق وزادفی السراج وكتان.

(۱۳۲) چمگادڑ کے بول وبراز کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ چمگادڑ کے بول و براز کا کیا حکم ہے؟ ہمارے محلے میں ایک مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ چمگادڑ کا بول وبراز پاک ہے۔

الجواب حامداًومصلیاً......مولوی صاحب کا کہنا صحیح ہے کہ چمگادڑ کا بول وبراز ضرورت کی وجہ سے پاک ہے۔

وفی التاتارخانية(۱/۲۹۰): وبول الخفاش وخرءه ليس بشئی لانه لايستطاع الامتناع عنه.

وفی الدر علی هامش الطحطاوی (۱/۱۵۹): بول الخفاش وخرءه فطاهر.

وفی الشامية(۱/۳۱۸): بول الخفافيش وخرءهاليس بنجس لتعذر صيانة الثوب والاوانی عنها.

(۱۳۳) پرندوں کی بیٹ کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ چند دن قبل میں گلی سے گزر رہا تھا، کہ بجلی کے تار پر بیٹھے کوے نے میرے کپڑوں پر بیٹ کردی جس کا کچھ حصہ میرے سر پر بھی آیا، اب معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا میرے کپڑے اور سر ناپاک ہو گئے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداًومصلیاً......کوے کی بیٹ نجاست خفیفہ میں سے ہے، جس کا حکم یہ ہے کہ اگر چوتھائی کپڑے یا جس عضو پر لگی ہے اس کے چوتھائی سے کم ہو اور اسی حالت میں نماز پڑھ لی جائے تو یہ نماز صحیح ہو جائے گی، اور اگر چوتھائی سے زیادہ ہو تو ان کپڑوں میں نماز پڑھنا صحیح نہیں ہے چونکہ بیٹ وغیرہ عام طور پر ایک چوتھائی سے کم ہی ہوتی ہے لہٰذا اگر آپ نے اسی حالت میں نماز پڑھ لی تو لوٹانے کی ضرورت نہیں، البتہ نماز سے پہلے موقع ملنے کی صورت میں چوتھائی سے کم ہونے کے باوجود دھولینا چاہیے۔

لمافی الهندية (۱/۴۶):(والثانی المخففة)وعفی منها مادون ربع الثوب كذافی اكثر المتون، اختلفوا فی كيفية اعتبار الربع قيل المعتبر ربع طرف اصابته النجاسة كالذيل والكم والدخريص ان كان المصاب ثوباًوربع العضو المصاب كاليد والرجل ان كان بدناًوصححه صاحب التحفة والمحيط والبدائع والمجتبی والسراج الوهاج وفی الحقائق وعليه الفتوی كذا فی البحرالرائق.

وبول مایو کل لحمه والفرس وخرء طير لايو كل مخفف هكذا في الكنز.

(۱۳۴) مکھی نجاست پر بیٹھ کر کپڑوں پر بیٹھے تو کپڑے ناپاک ہوں گے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جب انسان بیت الخلاء جاتا ہے تو وہاں پر موجود مکھیاں غلاظت پر بیٹھ کر انسان پر بیٹھتی ہیں اور میں نے سنا ہے کہ اس غلاظت کی تھوڑی سی مقدار بھی معاف نہیں اب کیا کیا جائے، میں تو اپنے طور پر بہت کوشش کرتا ہوں لیکن پھر بھی کوئی نہ کوئی مکھی بیٹھ ہی جاتی ہے، تو کیا اس سے میرے کپڑے ناپاک ہو جاتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو بچنے کی صورت کیا ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں جس نجاست کا آپ نے ذکر کیا یہ نجاست غلیظہ کہلاتی ہے، اور اس کی تھوڑی سی مقدار جو درہم کے برابر ہو (ہتھیلی کے درمیانی حصہ کے برابر) معاف ہے، اس سے زائد معاف نہیں، اور مکھیوں کے ذریعے جو نجاست انسان کے جسم پر لگتی ہے وہ اس سے کم ہوتی ہے لہٰذا اس سے کپڑے ناپاک نہیں ہوں گے۔

لمافي الهندية (۱/۴۷): ذباب المستراح اذا جلس على ثوب لايفسده الا ان يغلب ويكثر.

(۱۳۵) ناپاک صابن کے استعمال کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل مشہور ہے کہ بعض وہ صابن جو غیر ملکی کمپنیاں بناتی ہیں، ان میں خنزیر کی چربی ملی ہوتی ہے تو کیا ایسے صابن کا استعمال کرنا جائز ہے؟ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں عام استعمال کی اشیاء میں صرف سنی سنائی باتوں پر اعتماد کرنا صحیح نہیں ہے، البتہ اگر واقعی یہ بات تحقیق سے ثابت ہو تو بھی صابن میں انقلاب حقیقت کی بناء پر اس کا استعمال جائز لیکن خلاف اولی ہے لہٰذا اگر کوئی ضرورت شدیدہ نہ ہو تو استعمال سے اجتناب کرنا بہتر ہے۔

وفي الدرالمختار (۱/۳۱۵): (و)يطهر (زيت)تنجس (بجعله صابونا)به يفتى للبلوى كتنور رش بماء نجس لا بأس بالخبز فيه.

وفي الشامية(۱/۳۱۶) :جعل الدهن النجس في صابون يفتى بطهارته لانه تغير والتغير يطهر عند محمد ويفتى به للبلوى.

(۱۳۶) ٹینکی میں مینڈک گرنے سے ٹینکی ناپاک نہیں ہوگی

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ گھروں میں جو ٹینکی وغیرہ بنائی جاتی ہے، اس میں بعض دفعہ

مینڈک وغیرہ گر جاتے ہیں اور اس پانی میں زندہ رہتے ہیں، کیا اس سے پانی ناپاک ہو جاتا ہے؟ اور اگر ناپاک ہو جائے تو پاکی کی صورت کیا ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... ٹینکی میں مینڈک گرنے سے پانی ناپاک نہیں ہوگا۔ بشرطیکہ اس پر کوئی نجاست وغیرہ نہ لگی ہو۔

لما في الهندية (۱/۲۴): وموت مايعيش في الماء فيه لا يفسده كا لسمك والضفدع والسرطان وفي غير الماء قيل غير السمك يفسده وقيل لا وهو الاصح والضفدع البحري والبري سواء كذا في الهداية ...... ولا فرق في الصحيح بين ان يموت في الماء اوخارج الماء ثم يلقى فيه كذا في التبيين ويستوى الجواب بين المتفسخ وغيره الاانه يكره شرب الماء لانه لا يخلو عن اجزائه وهو غير ماكول كذا في محيط السرخسي.

وفي الدرالمختار (۱/۱۸۴، ۱۸۵): (ومائي مولد) ولو كلب الماء وخنزيره (كسمك وسرطان وضفدع الا بريا له دم سائل وهو مالا سترة له بين اصابعه فيفسد في الاصح كحية برية ان لها دم والا لا.

وفي الشامية (فيفسد في الاصح)وعليه فما جزم به في الهداية من عدم الافساد بالضفدع البري وصححه في السراج محمول على ما لادم له سائل كما في البحر والنهر.

(۱۳۷) قربانی کی کھالوں پر لگے خون کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قربانی کے بعد کھالوں پر جو خون لگا ہوا ہوتا ہے اس میں بعض تو گوشت کا خون ہوتا ہے اور بعض دم مسفوح ہوتا ہے ان دونوں کا حکم ایک ہے یا الگ الگ، برتقدیر ثانی وجہ فرق کیا ہے؟ حالانکہ خون تو نجس ہوتا ہے، اور علماء کرام دم مسفوح کے علاوہ مثلاً گوشت کے خون کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اگر کپڑوں کو لگ جائے تو اسی میں نماز ادا کرلو نماز ہو جاتی ہے اور یہ قول بقرعید کے موقع پر فرمایا جاتا ہے اس کی کیا حقیقت ہے؟ لہٰذا جواب مرحمت فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... ان دونوں خونوں کا حکم الگ الگ ہے ہر خون نجس نہیں، نجس خون صرف دم مسفوح ہے جیسا کہ منصوص ہے دما مسفوحا اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو دم مسفوح نہیں وہ نجس نہیں۔ حدیث سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''احلّت لنا ميتتان ودمان الميتتان الحوت والجراد والدمان الكبد والطحال '' کہ ہمارے لئے دو مردہ اور دو خون حلال کئے گئے ہیں، مچھلی اور ٹڈی، جگر اور تلی۔ یہ دونوں خون جامد ہیں، دم مسفوح نہیں ہیں۔ ان کو جائز قرار دیا گیا ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر خون نجس نہیں بلکہ دم مسفوح نجس ہے لہٰذا جو گوشت کا خون ہے یا ذبح کے بعد رگوں میں باقی رہ جاتا ہے وہ نجس نہیں لیکن احتراز اس سے بھی بہتر ہے۔

لما في الكلام المجيد(الانعام: ۱۴۵): قل لا اجد في ما اوحى الى محرما على طاعم يطعمه الا ان

یکون میتة او دما مسفوحا او لحم خنزیر فانه رجس او فسقا اهل لغیر الله به فمن اضطر غیر باغ ولاعاد فان ربک غفور رحیم.

وفی مشکاة المصابیح (ص۳۶۱) : عن ابن عمرؓ قال قال رسول الله ﷺ احلت لنا میتتان ودمان المیتتان، الحوت والجراد والدمان الکبد والطحال.

وفی الهندیة (۱/۴۶): وما یبقی من الدم فی عروق المذکاة بعد الذبح لا یفسد الثوب وان فحش کذا فی فتاوی قاضیخان، وکذا الدم الذی یبقی فی اللحم لانه لیس بمسفوح هکذا فی محیط السرخسی.

وفی الدر المختار (۱/۳۱۹): (ودم) مسفوح من سائر الحیوانات الادم شهید مادام علیه وما بقی فی لحم مهزول وعروق وکبد وطحال وقلب ومالم یسل ودم سمک.

(۱۳۸) کھانے پینے کی چیز میں ناک کا پانی گر جائے تو اس کے استعمال کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل سردی کا زمانہ ہے نزلہ کھانسی معمول بن چکا ہے مجھے بھی تین چار روز سے زکام ہے آج صبح میں ناشتہ کر رہا تھا چائے کا کپ میرے سامنے رکھا ہوا تھا۔ ناک سے پانی بہہ رہا تھا تو ایک قطرہ کپ میں گر گیا، میں نے وہ چائے گرادی تو بھائی نے کہا اس سے چائے ناپاک نہیں ہوتی تو کیا ناک سے نکلنے والا پانی پاک ہے اگر یہ کسی چیز میں شامل ہو جائے تو اس کا پینا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... ناک سے نکلنے والا پانی پاک ہے۔ اگر کسی کھانے یا پینے والی چیز میں گر جائے تو اس سے کھانے یا پینے کی چیز ناپاک نہیں ہوتی۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ کے بھائی کا پاک بتلانا درست ہے۔ البتہ طبعاً ناپسند ہونے کی وجہ سے اس کا نہ پینا علیحدہ بات ہے۔

لمافی الهندیة (۵/۳۳۹): ویجوز اکل مرقة یقع فیها عرق الادمی او نخامته او دمعه وکذا الماء اذا غلب وصار مستقذرا طبعا. کذا فی القنیة.

وفی الشامیة (۱/۳۰۵): (قوله وکذا کل ما یخرج لوجع الخ) ظاهره یعم الانف اذا زکم لکن صرحوا بأن ماء فم النائم طاهر ولو منتنا فتأمل.

(۱۳۹) بلی کا کسی برتن وغیرہ میں پاؤں ڈالنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے گھر میں ایک دن بالٹی میں دودھ رکھا ہوا تھا بلی

نے پینے کی کوشش کی لیکن منہ دودھ تک نہیں پہنچ رہا تھا تو اس نے ایک تدبیر اختیار کی کہ اپنا پاؤں دودھ میں ڈبو کر اس کو چاٹ لیتی پھر دوبارہ داخل کر کے چاٹ لیتی اب اس دودھ کا کیا حکم ہوگا اس کو پینے یا کسی دوسرے استعمال میں لانا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... مذکورہ مسئلہ میں اگر کسی کو یقینی طور پر یہ بات معلوم ہے کہ بلی کے منہ میں یا پاؤں پر ظاہری نجاست لگی ہوئی ہے، اور وہ اپنے پاؤں کو دودھ کی بالٹی میں ڈبو کر پھر اپنے پاؤں کو چاٹتی ہے تو اس سے بالٹی میں موجود دودھ سب نجس اور ناپاک ہوجاتا ہے، اُس کا استعمال کرنا صحیح نہیں ہے۔ اگر کسی کو نجاست کے بارے میں یقینی طور پر معلوم نہیں ہے، بلکہ شک ہو، اگر اس دودھ کے مقابلے میں کوئی اور دودھ موجود ہو، تو اُس کا استعمال نہ کرنا افضل ہے۔ اگر کسی نے استعمال کرلیا تو یہ جائز ہے لیکن کراہت سے خالی نہیں ہے۔

لمافی الفقه الاسلامی وادلته(۱/ ۲۸۲): سور طاهر مكروه تنزيهاً استعماله مع وجود غيره. وهو سؤر الهرة والدجاجة المخلاة الخ. مالم تر النجاسة فی فمها، لأنها تلازم التطواف فی المنازل، أو للضرورة وعدم إمكان الاحتراز منها.

وفيه ايضاً(۱/ ۲۸۵): وسؤر ما يستعمل النجاسة: كالهرة والفأرة، فإن رئی فی أفواهها نجاسة كان كالماء الذی خالطته النجاسة، فإن تحقق طهارة أفواهها، فطاهر.

وإن لم يعلم فيغتفر ما يعسر التحرز عنه، لكنه مكروه، وفی تنجيس مايتحرز منه قولان ارجحهما: القول بالطهارة.

(۱۴۰) وضو کے پانی میں چیونٹی کا مرجانا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دن میں نے وضو کرنے کیلئے لوٹا بھر کر رکھا اسی وقت دروازے پر کسی نے دستک دی میں ادھر چلا گیا واپس آیا تو اس پانی میں چیونٹیاں مری ہوئی تھیں میں نے ان کو نکال کر اسی پانی سے وضو کر لیا بعد میں ایک صاحب سے اس بات کا تذکرہ کیا تو وہ فرمانے لگے جس پانی میں کوئی چیز مرجائے وہ ناپاک ہوجاتا ہے اس سے وضو کرنا جائز نہیں۔ تو کیا ان صاحب کی بات صحیح ہے؟ اور کیا میرا وضو صحیح ہوگیا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... پانی یا دیگر مائعات میں اگر کوئی ایسی چیز گر کر مرجائے جس میں بہنے والا خون نہ ہو تو اس سے پانی ناپاک نہیں ہوتا۔ اس سے وضو وغیرہ کرنا صحیح ہے۔ لہٰذا صورت مسؤلہ میں آپ کا وضو درست ہے۔

لمافی حاشية الطحطاوی علی الدر (۱/ ۱۰۴): اذ ثبت الحكم فی الذباب ثبت فی غيره مما هو بمعناه كاالبق والزنابير...... والنمل.

وفی الدر المختار (۱/ ۱۸۳): (ويجوز) رفع الحدث (بما ذكر وان مات فيه) ای الماء ولو قليلا (غير دموی كزنبور) وعقرب.

وفی الفقه الاسلامی وادلته(۱/ ۲۸۹): لاينجس البئر بموت حيوان لادم له سائل كذباب وصرصور ونحوه.

(۱۴۱) گھی میں مینگنیاں گر جانے سے گھی کی ناپاکی کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک دن گھی کا ڈبہ کمرے میں رکھا لیکن ڈھکن بند کرنا بھول گیا ایک دو دن بعد میں نے دیکھا تو اس میں چوہے کی دو تین مینگنیاں گری ہوئی تھیں۔ میں نے ان کو اسی وقت نکال دیا۔ آیا یہ گھی نجس ہے یا نہیں؟ اس کا کھانا اور دیگر ضروریات کیلئے استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں اگر گھی جامد تھا تو مینگنیاں نکال کر اور اس کے اردگرد موجود گھی نکال لینے کے بعد اس بقیہ گھی کا استعمال درست ہے۔ اور اگر گھی سیال (بہنے والا) تھا تو بہتر یہ ہے کہ اس کو استعمال نہ کیا جائے۔ البتہ بعض اہل فتویٰ نے ضرورت کی بناء پر اس کے استعمال کی اجازت بھی دی ہے۔ بشرطیکہ گھی کا ذائقہ تبدیل نہ ہوا ہو۔

لمافی الدر (۱/ ۳۱۸، ۳۱۹):وبول غير مأكول ولو من صغير لم يطعم إلا بول الخفاش وخرأه فطاهر وكذا بول الفأرة لتعذر التحرز عنه وعليه الفتوىٰ، في الرد: قوله وكذا بول الفأرة: إعلم: أنه ذكر في الخانية أن بول الهرة والفأرة وخرأها نجس في أظهر الروايات يفسد الماء والثوب ولو طحن بعر الفأرة مع الحنطة ولم يظهر أثره يعفى عنه للضرورة. وفي الخلاصة: اذا بالت الهرة في الإناء أو على الثوب تنجس وكذا بول الفأرة، وقال الفقيه أبو جعفر: ينجس الإناء دون الثوب. قال في الفتح وهو حسن لعادة تخمير الأواني وبول الفأرة في رواية لا بأس به، والمشائخ على أنه نجس لخفة الحاجة بخلاف خرأها فان فيه ضرورة في الحنطة: والحاصل : أن ظاهر الرواية نجاسة الكل، لكن الضرورة متحققة في بول الهرة في غير المائعات كالثياب وكذا في خرء الفأرة في نحو الحنطة دون الثياب والمائعات) وأما بول الفأرة فالضرورة فيه غير متحققة الاعلى تلك الرواية المارة التي ذكرها الشارح أن عليها الفتوى، لكن عبارة التاتارخانية بول الفأرة وخرءها نجس وقيل بولها معفو عنه وعليه الفتوى. وفي الحجة الصحيح أنه نجس، ولفظ الفتوى وإن كان آكد من لفظ الصحيح إلا ان القول الثاني هنا تأيد بكونه ظاهر الرواية فافهم، ولكن تقدم في فصل البئر ان الاصح أنه لا ينجسه.

وفيه ايضاً(صـ ۲۲۰) في فصل البئر:في الدر: ولا نزح في بول الفأرة في الاصح فيض، في الرد: قوله في بول الفأرة في الاصح وسيذكر في الانجاس أن عليه الفتوى، وأن خرأها لا يفسد

مالم يظهر أثره...... أقول وفي الخانية أن بول الهرة والفأرة وخرأهما نجس في أظهر الروايات يفسد الماء والثوب ولعلهم رجحوا القول بالعفو للضرورة.

(۱۴۲) خنزیر کی چربی سے بنے ہوئے صابن کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جو صابن یورپ سے آتے ہیں تو ان میں خنزیر کی چربی ملی ہوئی ہوتی ہے تو ایسے صابن سے غسل کرنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... ایسے صابن جن میں خنزیر کی چربی ملی ہوئی ہو، ان کا استعمال غسل میں جائز ہے، کیونکہ جب ایک چیز کی حقیقت بدل جائے تو اُس کا حکم بھی بدل جاتا ہے۔ تاہم ایسے صابن جن میں خنزیر کی چربی ملی ہوئی ہو، استعمال نہ کرنا بہتر ہے۔

وفي رد المحتار (۳۱۶/۱): جعل الدهن النجس في الصابون يفتى بطهارته لانه تغير والتغير يطهر عند محمدؒ ويفتى به للبلوى. وظاهره أن دهن الميتة كذلك...... ثم اعلم ان العلة عند محمدؒ هي التغير وانقلاب الحقيقة وأنه يفتى به للبلوى.

وفي الدر المختار (۳۲۶/۱): (و) لا (ملح كان حمارا) أو خنزيرا ولا قذر وقع في بئر فصار حمأة لانقلاب العين، به يفتى.

وفي الشامية تحته: (قوله لانقلاب العين) علة للكل وهذا قول محمد...... وكثير من المشايخ اختاروه، وهو المختار لأن الشرع رتب وصف النجاسة على تلك الحقيقة وتنتفي الحقيقة بانتفاء بعض أجزاء مفهومها فكيف بالكل؟ فان الملح غير العظم واللحم، فاذا صار ملحا ترتب حكم الملح، ونظيره في الشرع النطفة نجسة وتصير علقة وهي نجسة وتصير مضغة فتطهر، والعصير طاهر، فيصير خمراً فينجس ويصير خلا فيطهر، فعرفنا أن استحالة العين تستتبع زوال الوصف المرتب عليها.

(۱۴۳) نجاست کے اوپر پڑی گرد وغبار اگر کپڑوں پر لگ جائے

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نجاست کے اوپر جو گرد وغبار ہے اگر وہ بدن یا کپڑے پر لگ جائے تو کیا اس سے بدن اور کپڑے ناپاک ہوتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں اگر اس گرد وغبار کے کپڑوں پر لگنے سے کپڑوں میں اس نجاست کا اثر وغیرہ ظاہر ہو جائے تو پھر کپڑے ناپاک ہوں گے ورنہ نہیں۔

لمافی قاضی خان(۱۳/۱): السرقین الجاف أو التراب النجس إذا هبت به الريح فأصاب ثوبا لايتنجس مالم ير فيه أثر النجاسة ولو مرّ الريح على النجاسات وثمه ثوب مبلول معلق يصيبه الرّيح قيل بأنه يتنجس.

وفي الهندية(۱/۴۷): السرقين الجاف أو التراب النجس إذا هبت به الريح فأصاب ثوبا لايتنجس مالم يرفيه اثر النجاسة هكذا في فتاویٰ قاضی خان: إذا مرت الريح بالعذرات وأصابت الثوب المبلول يتنجس إن وجدت رائحة النجاسة وما يصيب الثوب من بخارات النجاسات لايتنجس بها وهو الصحيح.

(۱۴۴) غلہ گاہتے وقت بیلوں کے پیشاب کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ غلہ گاہنے کے وقت یعنی جب اس پر بیلوں کو چلاتے ہیں اگر بیل غلہ پر پیشاب کردے تو کیا وہ معاف ہے یعنی غلہ اس سے ناپاک ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......دیکھا جائے گا کہ اگر گندم کو تقسیم کرلیا گیا یا گندم کسی کو ہبہ کردی گئی یا گندم کی بیع کردی گئی یا اس کو کھالیا گیا ہو، ان تمام صورتوں میں گندم کی پاکی کا حکم لگایا جائے گا اور اگر گندم کے بعض حصہ کو اندازے سے دھولیا گیا تو بھی کل گندم کی طہارت کا حکم لگایا جائے گا ضرورت اور رفع حاجت کو ملحوظ رکھتے ہوئے البتہ احوط یہ ہے کہ اگر ممکن ہو تو تمام گندم کو دھولیا جائے یا معین جگہ پر پیشاب نظر آئے تو اس کو دھولیا جائے۔

وفي التاتارخانية(۱/۳۲۱،۳۲۲): ونقل عن الشيخ المعروف بخواهرزاده اذا غسل موضعا بلا تحری يطهر وفي الخلاصة والنصاب هو المختار وفي الذخيره ونظير هذه المسئلة الحنطة التي تداس بالحمر فتبول وتروث ويصب بعض الحنطة ويختلط مااصيب منها بغيرها. قالوا: لوعزل بعضها وغسل ثم خلط الكل ابيح تناولها وكذالک لوعزل بعضها ووهبها من انسان اوتصدق به حل له تناول البقية.

وفي الدر المختار(۱/۳۲۸):(كمالوبال حمر)خصها لتغليظ بولها اتفاقا(على)نحو (حنطة تدوسهافقسم وغسل بعضه) او ذهب بهبة اواكل اوبيع (حيث يطهرالباقي وكذا الذاهب لاحتمال وقوع النجاسةفي كل طرف.

(۱۴۵) ناپاک چیز پانی میں گرنے کے بعد اس پانی کی چھینٹوں کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ناپاک چیز پانی میں گرے اور اس کے گرنے سے

چھینٹیں اُڑ کر کسی پر جا پڑیں تو کیا وہ پاک ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر نجاست کا اثر چھینٹوں میں ظاہر ہو جائے، تو وہ ناپاک ہو جائیں گی ورنہ پاک رہیں گی۔

لمافي الهندية(۱/۴۷): حمار بال في الماء فأصاب من ذلك الرشاش ثوب انسان لا يمنع جواز الصلاة وان كثر حتىٰ يستيقن انه بول وكذا لو رميت العذرة في الماء فخرج منها رشاش فأصاب ثوبا ان ظهر أثرها فيه يتنجس والا فلا هذا هو المختار وبه أخذ الفقيه ابو الليث سواء كان الماء جاريا أو راكداً.

وفي ردالمحتار(۱/۳۲۵): وفي الخانية ماء الطابق نجس قياساً لا استحسانا: وصورته: اذا أحرقت العذرة في بيت فأصاب ماء الطابق ثوب انسان لا يفسده استحسانا مالم يظهر أثر النجاسة فيه.

(۱۴۶) راستوں کی کیچڑ اور ناپاک پانی کی چھینٹوں کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ راستوں کی کیچڑ اور ناپاک پانی کی چھینٹوں کا کپڑے اور بدن پر لگنے سے بدن اور کپڑے ناپاک ہوتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......راستوں میں چلتے ہوئے عموماً جو ناپاک پانی کے چھینٹے اور کیچڑ وغیرہ کپڑوں یا بدن پر لگ جاتے ہیں اس میں بوجہ عموم بلوی اور دفع حرج کے حضرات فقہاء کرام نے گنجائش لکھی ہے کہ ان سے کپڑے ناپاک نہیں ہوتے البتہ اگر کوئی ایسی نجاست لگ جائے جو نظر آ رہی ہو یا ظن غالب ہو کہ اس کو نجاست لگی ہے تو ایسی صورت میں دھونا ضروری ہوگا۔ نیز یاد رہے کہ یہ جواز کی صورت اس وقت ہے جب ضرورت شدیدہ ہو ورنہ عدم ضرورت شدیدہ کے وقت ایسا نہ کرنا چاہئے بلکہ احتیاط کرنی چاہئے۔

لمافي التاتارخانية(۱/۲۸۸): روى المعلى عن محمد رحمه الله انه قال الروث لايمنع جواز الصلوٰة وان كان كثيرا فاحشا قيل هذا آخر أقواله ورجع الى هذا القول حين جاء مع الخليفة الى الري ورأى اسواقهم وسككهم مملوءة من الأوراث فرجع الى هذا القول دفعا للبلوى قال مشايخنا على قياس هذه الرواية طين بخارا لايمنع جواز الصلوٰة وان كان كثيرا فاحشا مع أن التراب مخلوطا بالعذرات دفعا للبلوى وفي الفتاوىٰ العتابيه مالم يرعين النجاسة.

وفي الشامية(۱/۳۲۴) (قوله وطين شارع) مبتدأخبره قوله عفو والشارع الطريق ط وفي الفيض: طين الشوارع عفو وان ملأ الثوب للضرورة ولو مختلطا بالعذرات وتجوز الصلاة معه وقدمنا ان هذا قاسه المشايخ على قول محمد آخر بطهارة الروث والخثي ومقتضاه انه طاهر لكن لم يقبله الامام الحلواني كما في الخلاصة، قال في الحلية اى لايقبل كونه طاهراً وهومتجه بل اشبه المنع

بالقدر الفاحش منه الالمن ابتلی به بحیث یجیئ ویذهب فی ایام الأوحال فی بلادنا الشامیة لعدم انفکاک طرقها من النجاسة غالبا مع عسر الاحتراز بخلاف من لایمربها اصلا فی هذه الحالة فلا یعفی فی حقه حتی ان هذا لایصلی فی ثوب ذاک اهـ أقول والعفو مقید بما اذا لم یظهر فیه أثر النجاسة کما نقله فی الفتح عن التجنیس ...... (والحاصل ان الذی ینبغی انه حیث کان العفو للضرورة وعدم امکان الاحتراز ان یقال بالعفووان غلبت فیها النجاسة مالم یرعینها لواصابها بلا قصد وکان من یذهب ویجیئ والافلاضرورة) وقد حکی فی القنیة ایضا قولین فیما لوابتلت قدماه ممارش فی الاسواق الغالبة النجاسة ثم نقل انه لوأصاب توبه طین السوق أو السکة ثم وقع الثوب فی الماء تنجس.

(۱۴۷) شیر خوار بچے کی قے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ چھوٹے شیر خوار بچے کی قے پاک ہے یا ناپاک؟ اگر ناپاک ہے تو غلیظہ ہے یا خفیفہ؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر شیر خوار بچہ قے منہ بھر کر کرے تو وہ ناپاک ہوگی اور نجاست غلیظہ ہوگی اور اگر منہ بھر کر نہ ہو تو ناپاک نہیں ہوگی۔

وفی الهندیة (۱/۴۵): الصبی اذا قاء علی ثدی الام ثم مص الثدی مراراً یطهر.

وفی تنویر الابصار مع الدر (۱/۱۳۷): (و) ینقضه (قیء ملأ فاه) ...... (من مرة أو علق أو طعام أو ماء) اذا وصل الی معدته وإن لم یستقر وهو نجس مغلظ ولو من صبی ساعة ارتضاعه هو الصحیح لمخالطة النجاسة. ذکره الحلبی.

(۱۴۸) نجس گوشت کو پاک کرنے کا طریقہ

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک کلو گوشت لے کر آیا کہ رات کے وقت پکا کر کھائیں گے میں نے اس کو چارپائی کے نیچے رکھ دیا تا کہ خراب نہ ہو جائے، ہوا لگتی رہے چارپائی کے اوپر میرا ایک چھوٹا بچہ سو رہا تھا اس نے پیشاب کر دیا وہ نیچے گوشت میں گرا جس کی وجہ سے گوشت نجس ہو گیا اب اس گوشت کو پاک کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اگر پاک ہو سکتا ہے تو پاک کرنے کا طریقہ بیان فرمادیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... نجاست جو خشک ہونے کے بعد نظر نہ آتی ہو، جیسے پیشاب وغیرہ وہ نجاست غیر مرئی کہلاتی ہے اس کو پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو دھویا جائے یہاں تک کہ دھونے والے کا دل مطمئن ہو جائے اور یہ عموماً تین مرتبہ دھونے سے حاصل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا

صورت مسئولہ میں گوشت کو تین مرتبہ دھولیا جائے اور ہر مرتبہ اس بات کوملحوظ رکھا جائے کہ گوشت سے پانی کے قطرات ٹپکنا بند ہوجائیں تو گوشت پاک ہوجائے گا۔

لمافی الفتاویٰ الولوالجية(١/٤٣): رجل علی يده نجاسة رطبة فجعل يضع يده علی عروة القمقمة كلماصبت الماء علی اليد فاذا غسل ثلاث مرات طهرت العروة مع طهارة اليد لان نجاستها بنجاسة اليد فطهارتها بطهارة اليد.

وفی التاتارخانية(١/٣٠٦): (وان كانت غير مرئية) كالبول والخمر ذكر فی الاصل وقال: يغسلها ثلاث مرات ويعصر فی كل مرة فقد شرط الغسل ثلاث مرات وشرط العصر فی كل مرة...... وفی القدوری ومالم يكن مرئية فالطهارة موكولة الی غلبة الظن وقدرنا بالثلاث ...... الا قوله ثم التقدير ليس بلازم عندنا بالثلاث بل هو مفوض الی اجتهاده ان كان غالب ظنه انها تزول بما دون الثلاث يحكم بطهارته.

وفی الدر المختار(١/٣٣٤): ويطهر لبن وعسل ودبس ودهن يغلی ثلاثا ولحم طبخ بخمر يغلی وتبريد ثلاثا.

(قوله ولحم طبخ الخ) فی الظهيرية ولو صبت الخمرة فی قدر فيها لحم ان كان قبل الغليان يطهر اللحم بالغسل ثلاثا وان بعده فلا.

(١٤٩) بچوں کے پیشاب کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک دوست ہے وہ کہتا ہے کہ چھوٹے بچوں کا پیشاب پاک ہے اگر کپڑوں کو لگ جائے تو کپڑے ناپاک نہیں ہوتے انہی کپڑوں کے ساتھ نماز پڑھنا جائز ہے تو کیا ان کی یہ بات درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... پیشاب علی الاطلاق نجاست مغلظہ میں سے ہے، چاہے بچوں کا ہو یا بڑوں کا ہو اور اس کا حکم یہ ہے کہ بقدر ایک درھم (ہتھیلی کی گہرائی کے بقدر) یا اس سے کم کپڑوں پر لگ جائے اور اس کے ساتھ نماز پڑھ لی جائے تو نماز ہوجائے گی البتہ معلوم ہوجانے پر اس کو بھی دھو کر نماز پڑھی جائے اور بقدر ایک درہم سے زیادہ کپڑوں پر لگ جائے تو اس کے ساتھ نماز پڑھ لینے سے نماز ہی درست نہ ہوگی۔

لمافی الهندية (١/٤٦): كل مايخرج من بدن الانسان مما يوجب خروجه الوضوء أو الغسل فهو مغلظ كالغائط والبول والمنی والمذی والودی والقيح والصديد والقی اذا ملأ الفم كذا فی البحر

الرائق ......وكذلك بول الصغير والصغيرة أكلا أولا كذا في الاختيار.

وفي المراقي الفلاح مع حاشية الطحطاوي(۱/۱۲۳): (قوله وبول مالا يؤكل لحمه) شمل بول الحية فانه مغلظ...... (قوله ولو رضيعا)ولو رضيعاً لم يطعم سواء كان ذكراً أو انثى.

(۱۵۰) ٹینکی میں چھپکلی گر جائے تو پانی کا کیا حکم ہوگا؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر گھر کی ٹینکی میں چھپکلی گر جائے تو کیا پانی ناپاک ہو جائے گا؟ نیز اگر گر کر مر بھی جائے تو پھر صفائی کی صورت کیا ہوگی؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں چھپکلی کے ٹینکی میں گرنے سے پانی ناپاک نہیں ہوگا۔ یہی حکم مرنے کی صورت میں بھی ہے۔

لمافي الهندية (۱/۲۴): وموت ما ليس له نفس سائلة في الماء لا ينجسه كالبق والذباب والزنابير والعقارب ونحوها.

وفي الدرالمختار (۱/۱۸۳): (ويجوز) رفع الحدث (بما ذكر وان مات فيه) اى الماء ولو قليلا (غير دموى كزنبور) وعقرب وبق

وفي الشامية (غير دموى)المراد مالا دم له سائل لما في القهستاني ان المعتبر عدم السيلان لا عدم اصله حتى لو وجد حيوان له دم جامد لا ينجس.

(۱۵۱) اچار میں چوہیا مر جانے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم لوگ گھروں میں اچار بناتے ہیں میرے گھر میں اچار کا ایک ڈبہ رکھا ہوا تھا اس میں کسی طرح چوہیا چلی گئی وہ اس ڈبے کے اندر مر چکی ہے اب اس اچار کا کیا حکم ہوگا؟ جبکہ ہم نے اس پر کافی خرچہ کیا ہوا ہے اور محنت بھی خوب کی ہے اس کے کھانے کی گنجائش ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... سیال چیز میں اگر کوئی نجاست گر جائے تو وہ پورا کا پورا نجس ہو جاتا ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں اچار بھی سیال چیز ہے اور اس میں چوہیا گر جانے کی صورت میں سارا اچار نجس ہو جائے گا۔

لمافي فتح القدير مع شرح العناية (۱/۸۴): (ولانه لادم فيها) اى فى هذه الحيوانات اذا لدموى لا يسكن الماء والدم هو المنجس) واذا مات(في غير الماء) كالخل والعصير والحليب ونحوها.

وفي فتح القدير (۱/۸۳): وموت ماليس له نفس سائلة في الماء لا ينجسه كالبق الخ ولان المنجس هو اختلاط الدم المسفوح باجزائه عند الموت الخ، كل طعام وشراب وقعت فيه دابة ليس لهادم

فماتت فيه فهو حلال اكله وشربه ووضوءه.

وفي الهندية (۱/۲۵): في جامع الجوامع اذا تنجس الماء القليل بوقوع النجاسة فيه ان تغيرت اوصافه لا ينتفع به من كل وجه.

وفي الدر المختار (۱/۱۸۵): (وينجس) الماء القليل (بموت مائي معاش بري مولد) في الاصح (كبط واوز) الخ.

(۱۵۲) گھی میں چوہا گر جائے تو گھی کی ناپاکی کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گھر میں گھی کا ڈبہ پڑا ہوا تھا کہ رات کو کہیں سے چوہا آکر اس میں گر گیا اور چوہا بھی خاصا بڑا ہے اور گرنے کے بعد صبح کے وقت اس میں مرا ہوا تھا، اس نے اپنے طور پر نکلنے کی کوشش کی ہوگی جس کی وجہ سے وہ زخمی بھی ہوا لہٰذا کچھ خون بھی گھی پر لگا ہوا ہے، کیا یہ سارا گھی ناپاک ہو گیا؟ اگر یہ ناپاک ہو گیا ہو تو اس کو کہاں استعمال کر سکتے ہیں؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں اگر گھی جامد ہو تو چوہے کے اردگرد اور جہاں خون لگا ہوا ہو، اسے ہٹا کر باقی گھی کا استعمال جائز ہے، ہاں اگر گھی مائع (پگھلا ہوا) ہو تو پھر سارا گھی ناپاک ہو گیا، اور ایسے گھی کو کھانے کے علاوہ دیگر استعمالات میں لا سکتے ہیں جیسے چراغ جلانے کے لئے وغیرہ وغیرہ، الغرض کھانے کے علاوہ دیگر استعمالات جائز ہیں۔

لمافي الهندية (۱/۴۵): الفارة لو ماتت في السمن ان كان جامدا قور ماحوله ورمي به والباقي طاهر يوكل وان كان مائعا لم يوكل وينتفع به من غير جهة الاكل مثل الاستصباح ودبغ الجلد ......

(۱۵۳) حلال جانوروں کے پیشاب کی کتنی مقدار معفو عنہ ہے

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حلال جانور کا پیشاب کپڑوں پر لگ جائے تو کتنی مقدار سے کپڑے ناپاک شمار ہونگے؟ نیز اسی صورت میں حرام جانوروں کے پیشاب کا حکم بھی بیان فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... حلال جانوروں کا پیشاب (نجاست خفیفہ) کپڑوں پر لگ جائے تو اگر نجاست کی مقدار کپڑے کے چوتھائی حصہ سے کم ہو تو کپڑا ناپاک شمار نہیں ہوگا اور اس سے زیادہ ہو تو کپڑا ناپاک شمار ہوگا، اور اگر حرام جانوروں کا پیشاب (نجاست غلیظہ) کپڑے پر لگ جائے تو اگر درہم کی مقدار (ہتھیلی کے درمیانی حصہ کے برابر مقدار) سے کم ہو تو کپڑا ناپاک شمار نہیں ہوگا اور اگر اس سے زیادہ ہو تو کپڑا ناپاک ہو جائے گا۔ نیز سوئی کے سرے (ناکے) کے برابر چھوٹی چھوٹی چھینٹیں کپڑے پر لگ جائیں تو اس سے کپڑا ناپاک نہیں ہو گا چاہے وہ چھینٹیں حرام جانور کے پیشاب کی ہوں یا حلال جانور کے پیشاب کی۔

لمافی الهندية (۱/۴۵، ۴۶): الاول المغلظة وعفی منها قدر الدرهم ...... وكذلک الخمر والدم المسفوح ولحم الميتة وبول مالا يؤكل والروث...... نجاسة غليظة ...... (والثانی المخففة) وعفی منها مادون ربع الثوب ...... وفی الحقائق وعليه الفتوی...... وبول ما يؤكل لحمه والفرس وخرء طير لا يوكل مخفف.

وفی الدر المختار (۱/۳۱۶، ۳۱۸): (وعفا) الشارع (عن قدر درهم)...... (وهو مثقال)...... (فی) ...... (كثيف) له جرم (وعرض مقعر الكف)...... (فی رقيق من مغلظة كعذرة)...... (وبول غير ماكول ولو من صغير لم يطعم) الا بول خفاش وخرأه.

(۱۵۴) دورانِ غسل پانی کی چھینٹیں بالٹی میں گر جائیں تو پانی کا کیا حکم ہوگا؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض دفعہ غسل کرتے ہوئے پانی کی چھینٹیں بالٹی میں گر جاتی ہیں، اب اگر یہ غسل جنابت ہو تو کیا ایسی صورت میں یہ پانی ناپاک ہوجائے گا؟ اگر مقدار کے اعتبار سے کوئی فرق پڑتا ہو تو وہ بھی بیان فرمادیں، اللہ تعالی آپ حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں بالٹی میں صرف چھینٹیں گرنے سے بالٹی کا پانی ناپاک نہیں ہوگا۔

لما فی اعلاء السنن (۱/۲۵۲): ان ابن عمر والبراء بن عازب ادخل يده فی الطهور ولم يغسلها ثم توضأ ولم ير ابن عباس بأسابما ينتضح من غسل الجنابة.

وفيها ايضاً (ص۲۵۳): عن ابن عباس فی الرجل يغتسل من الجنابة فينتضح فی انائه من غسله فقال لا بأس به اخرجه ابن ابی شيبة فی المصنف.

وفی الهندية (۱/۲۳): جنب اغتسل فانتضح من غسله شیء فی انائه لم يفسد عليه الماء اما اذا كان يسيل منه سيلانا افسده وكذا حوض الحمام علی قول محمد لايفسده مالم يغلب عليه يعنی لا يخرجه من الطهورية كذا فی الخلاصة.

(۱۵۵) چائے یا پانی وغیرہ میں مکھی گرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر چائے کے کپ میں مکھی گر جائے تو اس چائے کا پینا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ بعض لوگوں سے سنا ہے کہ مکھی کو غوطہ دے کر نکال دے اور چائے پی لے تو کیا ان لوگوں کی بات درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر چائے میں مکھی گر جائے اور اسے نکال کر پھینک دیا جائے تو چائے کا پینا درست ہے کیونکہ اس سے چائے

ناپاک نہیں ہوتی اس لئے کہ اس کے اندر دم مسفوح (بہنے والا خون) نہیں ہوتا اور جن اشیاء میں دم مسفوح نہیں ہو وہ ناپاک نہیں تو دوسری چیزوں میں گرنے سے ان کو ناپاک نہیں کرتیں، البتہ مکھی کو چائے، سالن، پانی وغیرہ کے اندر ڈبو کر نکالنا یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمر ارشادی ہے، اُمر وجوبی نہیں یعنی بطور ترحم کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس لئے کہ کسی غریب آدمی کو دودھ ہر وقت میسر نہیں ہوتا کہیں وہ حرج میں مبتلا نہ ہو جائے، لیکن اگر کسی کی طبیعت متنفر ہو رہی ہو تو وہ نہ پیئے اس لئے کہ یہ اُمر وجوبی نہیں اور نہ پینے سے وہ گنہگار نہ ہوگا اور یہی حکم تمام مشروبات کا ہے۔

وفی الهندية(۱/۲۴): وموت ماليس له نفس سائلة فی الماء لاينجسه كالبق والذباب والزنابير والعقارب ونحوها.

وفی رد المحتار (۱/۲۲۲): (قوله ومثله ماء لادم له) ای سائل سواء كان يعيش فی الماء أو فی غيره عن البحر: (قوله قيد للكل) أی للأدمی ومأكول اللحم ولادم له (قوله طاهر) أی فی ذاته طهور أی مطهر لغيره من الأحداث والأخباث.

وفی أصول الشاشی(ص۲۷): وعلیٰ هذا قلنا فی قوله عليه السلام اذا وقع الذباب فی طعام أحدكم فامقلوه ثم انقلوه فان فی احدی جناحيه داءً وفی الأخری دواءً وإنه ليقدم الداء علی الدواء دل سياق الكلام علی أن المقل لدفع الأذی عنا، لاللأمر تعبدی حقا للشرع فلايكون للإيجاب.

(۱۵۶) ناپاک فرش کو خشک ہونے کے بعد پانی سے دھونا ضروری ہے؟ پکے فرش کو پاک کرنے کا طریقہ

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر پکے فرش کے اوپر نجاست گر جائے تو کیا خشک ہونے سے وہ پاک ہو جائے گا یا پانی سے دھونا ضروری ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اگر پکے فرش کے اوپر نجاست گر جائے تو اس کو پاک کرنے کے تین طریقے ہیں۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ خشک ہونے سے وہ پاک ہو جائے گا۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس پر پانی ڈال کر ملیں اور کپڑے سے خشک کیا جائے اس طرح تین مرتبہ کرنے سے وہ پاک ہو جائے گا، تیسرا طریقہ یہ ہے کہ بہت زیادہ پانی ڈال کر چھوڑ دیں یہاں تک کہ نجاست کی بو اور رنگ باقی نہ رہے پانی خشک ہو جائے تو زمین پاک ہو جائے گی۔

البتہ پہلے طریقے میں اس پر نماز پڑھنا تو جائز ہے لیکن تیمّم کرنا جائز نہیں، اور خشک ہونے کے بعد اس پر دوبارہ پانی آنے کی صورت میں بھی نجاست لوٹ کر نہیں آئے گی۔

وفی الهندية(۱/۴۳) : الارض اذا تنجست ببول واحتاج الناس الى غسلها فان كانت رخوة يصب الماء عليها ثلاثا فتطهر وان كانت صلبة قالوا يصب الماء عليها وتدلک ثم تنشف بصوف أو خرقة يفعل كذالک ثلاث مرات فتطهر وان صب عليها ماء كثير حتى تفرقت النجاسة ولم يبق ريحها ولا لونها وتركت حتى جفت تطهر كذا فی فتاویٰ قاضی خان.

وفی الشامية (۱/۳۱۱) : (قوله وله الطهورية) لأن الصعيد علم قبل التنجس طاهراً وطهوراً وبالتنجس علم زوال الوصفين ثم ثبت بالجفاف شرعاً أحدهما أعنى التطهير فيبقى الآخر على ماعلم من زواله واذا لم يكن طهوراً لا يتيمم به اهـ

وفی الدرالمختار(۱/۳۱۱) : (وحكم آجر) ونحوه كلبن (مفروش وخص) بالخاء تحجيرة سطح (وشجر وكلاء قائمين فی أرض كذلک). أی كأرض فيطهر بجفاف وكذا كل ما كان ثابتا فيها لأخذه حكمها باتصاله بها فالمنفصل يغسل لاغير الاحجراً خشنا كرحی فكأرض.

وفی الشامية (۱/۳۱۱): (قوله بيبسها) لما فی سنن أبی داؤد باب طهور الارض اذا يبست وساق بسنده عن ابن عمرؓ " قال كنت أبيت فی المسجد فی عهد رسول الله ﷺ وكنت شابا عزبا وكانت الكلاب تبول وتقبل وتدبر فی المسجد ولم يكونوا يرشون شيئا من ذلک" ولو أريد تطهيرها عاجلا يصب عليها الماء ثلاث مرات وتجفف فی كل مرة بخرقة طاهرة وكذا لوصب عليها الماء بكثرة حتى لا يظهر أثر النجاسة...... يفهم من قول البحر صب عليها الماء كثيراً ثم تركها حتى نشفت طهرت أنه نجس.

وفی الدر المختار(۱/۳۱۴):ثم هل يعود نجسا ببله بعد فركه؟ المعتمد لا، وكذا كل ما حكم بطهارته بغير مائع.

وقال الشامی رحمه الله تحته: (قوله بغير مائع) ای كالدلک فی الخف، والجفاف فی الارض...... ...... ومقتضاه أن الخف لو وقع فی ماء قليل لا ينجسه...... وقدمنا أن الآجرة اذا تنجست فجفت ثم قلعت فالمختار عدم العود.

(۱۵۷) کھیتوں میں قضاءِ حاجت کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم لوگ دیہاتوں میں رہتے ہیں ہمارے گھروں میں بیت الخلاء نہیں ہوتے اور گھروں کے اردگرد فصلیں ہوتی ہیں ہم ان میں جا کر پیشاب کرتے ہیں ایک دن ایک مولانا صاحب ہمارے

ہاں تشریف لائے تو انہوں نے فرمایا کہ کھیتوں میں پیشاب کرنا جائز نہیں ہے۔ تو اب پوچھنا یہ ہے کہ کھیتوں میں پیشاب کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... قضاء حاجت کیلئے ایسی جگہ تلاش کرنی چاہئے جس میں ستر کا مکمل اہتمام ہو، اور کسی کی ایذا رسانی نہ ہوتی ہو، اور نہ ہی کسی محترم چیز کی بے حرمتی ہو، کھیتوں میں قضاء حاجت کرنے کو فقہاء کرام نے مکروہ لکھا ہے، لیکن اگر کھیتوں میں کسی ایسی جگہ پر قضاء حاجت کی جائے جس میں ستر کا اہتمام ہو، اور فصل کی تلویث کا اندیشہ نہ ہو، اور نہ ہی کسی کی ایذا رسانی کا سبب بنے تو اس صورت میں کھیتوں میں قضاء حاجت کرنے کی گنجائش ہے۔

لمافی الهندية (۱/۵۰): ويكره على طرف نهر أو بئر أو حوض أو عين أو تحت شجرة مثمرة أو في ذرع.

وفي الدر المختار (۱/۳۴۳): وعلى طرف نهر أو بئر أو حوض أو عين او تحت شجرة مثمرة أو في ذرع.

(۱۵۸) استعمال شدہ کمبل، کپڑے وغیرہ کو بغیر دھوئے استعمال کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل لائٹ ہاؤس وغیرہ پر گرم کمبل سوئیٹر، جرسیاں وغیرہ جو ملتی ہیں انہیں بغیر دھوئے استعمال کرنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... استعمال شدہ اشیاء (مثلاً گرم کمبل، سوئیٹر، جرسیاں اور کپڑے وغیرہ) جو مختلف جگہوں پر سستے داموں ملتی ہیں اگر یہ کفار کی استعمال کردہ ہوں تو جب تک ان کے ناپاک ہونے کا یقین یا ظن غالب نہ ہو، انہیں بغیر دھوئے استعمال کرنا درست ہے تاہم دھو کر استعمال کرنا بہر حال اولیٰ اور بہتر ہے۔

لمافي الولوالجية (۱/۴۶): لابأس بلبس ثياب اهل الذمّة والصلوٰة فيها واما الازار والسراويل فانها تكره الصلوٰة فيهما مالم يغسلا في قول ابی حنيفة و محّمد وقال ابو يوسف اجزاه بلاكراهة امّا الجواز في الكل فلان الطهارة في الثياب اصل وليس في حالة الكفر ما يوهم نجاسة ثيابهم فلهذه العلة لم يكره ابو يوسف في الازار والسراويل وهما كرها.

وفي الدر المختار (۱/۳۵۰): ثياب الفسقة واهل الذمة طاهرة

(وفي الشامية تحته): الاصح انه لايكره لانه لم يكره من ثياب اهل الذمة الاالسراويل مع استحلالهم الخمر، فهذا اولیٰ اهـ.

(۱۵۹) نجاست سے کپڑے کو پاک کرنے کے بعد اگر داغ رہ جائے تو کپڑے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کو احتلام ہوا صبح اٹھ کر اس نے غسل کیا اور شلوار

کوتین بار دھویا لیکن اس سے منی کے داغ نہیں اترے آیا یہ شلوار پاک ہوگی؟ اس کے ساتھ نماز پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... کپڑوں پر اگر نجاست لگ جائے اور وہ نجاست ٹھوس ہو تو دھونے سے اگر اس کی عین زائل ہو جائے کپڑے پاک ہوں گے اگر چہ اس کا اثر (بو، رنگ) باقی رہ جائے جس کے دور کرنے میں مشقت ہو، اور بغیر صابن یا گرم پانی کے دور نہ ہو سکتا ہو۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں کپڑوں سے منی دھونے کے بعد اگر اس کا کوئی داغ یا اثر رہ جائے تو بھی کپڑے پاک ہوں گے اور اس میں نماز پڑھنا درست ہے۔

لما فی البحر الرائق(۱/۴۱۰): والمراد بالأثر اللون والريح فان شق إزالتهما سقطت وتفسير المشقة أن يحتاج فی إزالته إلى استعمال غير الماء كالصابون والأشنان أو الماء المغلی بالنار كذا فی السراج.

وفی الدر المختار(۱/۳۱۲): (ويطهر منی) أی محله (يابس بفرک) ولا يضر بقاء اثره...... (والا) يكن يابسا ...... (فيغسل)

وفی الشامية تحته: (قوله ولا يضر بقاء اثره) أی كبقائه بعد الغسل بحر.

(۱۶۰) ناپاک کپڑوں کو بالٹی وغیرہ میں ڈال کر ٹونٹی سے پانی جاری کر دینے سے کپڑوں کی پاکی کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بندہ اکثر اوقات گھر سے باہر سفر میں ہوتا ہے جس کی وجہ سے کپڑے وغیرہ بندے کو خود دھونے پڑتے ہیں۔ تو ایک دن میں کپڑے دھو رہا تھا میری عادت یہ ہے کہ جو کپڑے ناپاک ہوں تو میں ان کو تین مرتبہ دھوتا ہوں اور ہر مرتبہ اچھی طرح نچوڑتا ہوں، میرا ایک طالبعلم ساتھی میرے پاس آیا، تو اس نے مجھ سے کہا کہ آپ خواہ مخواہ میں تین مرتبہ کپڑے دھونے میں اور ہر مرتبہ کپڑے نچوڑنے میں اپنے کو تھکاتے ہیں، ایسا کریں کہ کپڑے بالٹی میں ڈال کر اس پر ٹونٹی کھول دیا کریں۔ جب بالٹی بھر جائے اور پانی اس سے چھلکنے لگ جائے اور کچھ نہ کچھ پانی بہہ جائے تو کپڑے پاک ہو جائیں گے۔ مجھے ان کی یہ تجویز اچھی لگی۔ لیکن میں نے کہا اگر چہ میرا یہ ساتھی دین پڑھ رہا ہے لیکن ہے تو طالبعلم کوئی عالم مفتی تو نہیں، کیوں نہ میں تھوڑی تکلیف اٹھا کر مفتی صاحب سے معلوم کرلوں، تا کہ اطمینان حاصل ہو جائے۔ تو مفتی صاحب آپ بتائیں کہ واقعتاً جب پانی تھوڑا سا بالٹی کے سائیڈوں (اطراف) سے گرنے لگ جائے تو کپڑے پاک ہو جائیں گے یا جو بھی صحیح صورتحال ہو اس کو واضح بیان فرمائیں، آپ کو اللہ تعالیٰ اس کا بدلہ عطا فرمائیں گے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... کپڑوں کو نجاست سے پاک کرنے کا طریقہ شرعاً یہ ہے کہ اگر نجاست مرئیہ ہو یعنی نظر آنے والی اور ذی جرم

ہو(جس کا ٹھوس وجود ہو) تو اس عین نجاست کو زائل کرنے سے کپڑے پاک ہوجاتے ہیں۔خواہ ایک مرتبہ پانی بہانے سے زائل ہوجائے۔کیونکہ پاکی سے مراد نجاست کو دور کرنا ہوتا ہے اور اس صورت میں یہ پایا جاتا ہے،اور اگر نجاست غیر مرئیہ ہو یعنی نظر نہ آنے والی ہو جیسے مائعات کی نجاستیں تو اس کے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اگر کپڑوں کو کسی برتن میں دھویا جائے تو یہ ضروری ہے کہ تین مرتبہ دھویا جائے اور نچوڑا جائے۔البتہ اگر کپڑوں کو ماء جاری جیسے نہر وغیرہ کے پانی میں یا وہ پانی جو ماء جاری کے حکم میں ہو میں دھویا جائے جیسا کہ صورت مسئولہ میں ہے کہ بالٹی یا کسی اور برتن میں کپڑوں کو ڈال دیا جائے اور پھر یہاں تک پانی ڈالا جائے اور اتنا پانی بہہ جائے کہ دھونے والے کو غالب گمان ہو کہ اب نجاست نکل چکی ہے۔اس صورت میں یہ پانی ماء جاری کے حکم میں ہوجائے گا۔اور کپڑوں کو نچوڑنا بھی ضروری نہ ہوگا۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ کے طالبعلم ساتھی کا یہ کہنا تو درست ہے کہ جب بالٹی وغیرہ سے پانی بہنے لگ جائے تو کپڑے پاک ہوجائیں گے اور نچوڑنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی،لیکن یہ ضروری ہے کہ اتنا پانی بہہ جائے کہ نجاست نکل جانے کا ظن غالب ہوجائے۔

لما في مراقي الفلاح(ص۱۲۹): (ويطهر) محل النجاسة (غير المرئية بغسلها ثلاثا) وجوبا وسبعاً مع التتريب ندباً في نجاسة الكلب خروجاً من الخلاف (والعصر كل مرة) تقديراً لغلبة الظن في استخراجها في ظاهر الرواية وفي رواية يكتفي بالعصر مرة وهو أوفق ووضعه في الماء الجاري يغني عن التثليث والعصر كالاناء اذا وضعه فيه فامتلأ وخرج منه طهر.

وفي حاشية الطحطاوي على مراقي الفلاح: قوله ووضعه في الماء الجاري الخ يعني اشتراط الغسل والعصر ثلاثا انما هو اذا غمسه في إجانة، اما اذا غمسه في ماء جار حتى جرى عليه الماء او صب عليه ماء كثيراً بحيث يخرج ما أصابه من الماء ويخلفه غيره ثلاثا فقد طهر مطلقاً بلا اشتراط عصر وتجفيف، وتكرار غمس هو المختار والمعتبر فيه غلبة الظن هو الصحيح.

وفي الشامية(۱/۳۳۳): تحت قوله اما لو غسل الخ. أن المعتبر في تطهير النجاسة المرئية زوال عينها ولو بغسلة واحدة ولو في اجانة كمامر فلا يشترط فيها تثليث غسل ولا عصر، وأن المعتبر غلبة الظن في تطهير غير المرئية بلا عدد على المفتىٰ به...... ولا شك ان الغسل بالماء الجاري وما في حكمه من الغدير أو الصب الكثير الذي يذهب بالنجاسة اصلاً ويخلفه غيره مراراً بالجريات اقوى من الغسل في الاجانة التي على خلاف القياس، لأن النجاسة فيها تلاقي الماء وتسري معه في جميع اجزاء الثوب فيبعد كل البعد التسوية بينهما في اشتراط التثليث.

(قوله في غدير) اي ماء كثير له حكم الجاري (قوله أو صب عليه ماء كثير) اي بحيث يخرج الماء ويخلفه غيره ثلاثاً لان الجريان بمنزلة التكرار والعصر، هو الصحيح.

(۱۶۱) نجس کپڑے کو پاک کرنے کا طریقہ نیز نجس کپڑے کو دھوپ سے خشک کرنے کے بعد پاکی کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کپڑے پر نجاست لگ جائے تو اس کو پاک کرنے کا کیا طریقہ ہوگا، نیز اگر نجس کپڑے کو دھوپ میں سکھا دیا جائے تو کیا وہ پاک ہو جائے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... کپڑے کو نجاست سے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ کپڑے کو تین مرتبہ دھویا جائے اور ہر مرتبہ نچوڑا جائے اس طور پر کہ پانی کے قطرات ٹپکنا بند ہو جائیں نجس کپڑا دھوئے بغیر محض دھوپ میں سکھانے سے پاک نہیں ہوگا۔

لمافی البدائع الصنائع(۱/۲۳۹): واما سائر النجاسات اذا اصابت الثوب أو البدن و نحوهما فانها لا تزول الا بالغسل سواء كانت رطبة اويابسة وسواء كانت سائلة او لهاجرم.

وفي الهندية(۱/۴۲): ان غسل ثلاثا فعصر في كل مرة ثم تقاطرت منه قطرة فأصابت شيأ ان عصره في المرة الثالثة وبالغ فيه بحيث لوعصره لايسيل منه الماء فالثوب واليد وما تقاطر طاهر والا فالكل نجس.

(۱۶۲) ناپاک جوتا پاک کرنے کا طریقہ

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر راستے میں چلتے ہوئے کسی کے جوتے پر نجاست لگ جائے تو اس کو پاک کرنے کیلئے دھونا ضروری ہے یا کپڑے سے صاف کر دینا کافی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... جوتے پر لگنے والی نجاست خواہ جسم رکھنے والی ہو (مثلاً پاخانہ، خون، لید وغیرہ) یا جسم رکھنے والی نہ ہو (مثلاً شراب، پیشاب وغیرہ) اگر اسے زمین سے رگڑ دیا جائے یا کسی کپڑے وغیرہ سے صاف کرلیا جائے اس طرح کہ نجاست کا اثر اور بدبو باقی نہ رہے تو وہ جوتا اصح قول کے مطابق پاک ہو جائے گا پھر اسے دھونا ضروری نہیں۔

لمافي الهندية(۱/۴۴): الخف إذا أصابته النجاسة إن كانت متجسدة ......إذا مسحه على وجه المبالغة بحيث لايبقى لها أثر يطهر وعليه الفتوىٰ لعموم البلوىٰ كذا في فتاوى قاضيخان وإن لم تكن النجاسة متجسدة ...... إذا التصق بها مثل التراب أو ألقى عليها فمسحها يطهر وهو الصحيح هكذا في التبيين وعليه الفتوىٰ للضرورة كذا في معراج الدراية.

وفي الدر المختار(۱/۳۰۹،۳۱۰): (ويطهر خف ونحوه) كنعل (تنجس بذى جرم) هو كل مايرى بعد الجفاف ولو من غيرها كخمر وبول أصابه تراب به يفتى بدلك يزول به أثرها.

(۱۶۳) اسٹیل یا پلاسٹک کے نجس برتن پاک کرنے کا طریقہ

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل گھروں میں عام طور پر اسٹیل یا پلاسٹک کے برتن استعمال ہوتے ہیں بسا اوقات ان پر کوئی نجاست لگ جاتی ہے اور یہ ناپاک ہوجاتے ہیں تو ان کو پاک کرنے کا کیا طریقہ ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اسٹیل اور پلاسٹک کے برتن اگر چکنے ہوں اور کھردرے نہ ہوں ان پر نجاست لگ جائے تو وہ پانی، مٹی یا صاف کپڑے سے پونچھنے سے بھی پاک ہوجائیں گے جبکہ نجاست زائل ہوجائے اگر وہ برتن کھردرے یا اُبھرے ہوئے ہوں تو پانی سے دھوئے بغیر وہ پاک نہ ہوں گے۔

لمافي البحر الرائق(۱/۳۹۰،۳۹۱): (ونحو السيف بالمسح) اى يطهر كل جسم صقيل لامسام له بالمسح جديد اكان أو غيره فخرج الجديد إذا كان عليه صدأ أو منقوشا فانه لا يطهر الا بالغسل ...... وزاد في السراج الوهاج العظم والآبنوس وصفائح الذهب والفضة اذا لم تكن منقوشة......الخ.

وفي الهندية(۱/۴۳): (ومنها المسح) اذا وقع على الحديد الصقيل الغير الخشن كالسيف والسكين والمرآة ونحوها نجاسة من غير أن يموه بها فكما يطهر بالغسل يطهر بالمسح بخرقة طاهرة...... ولا فرق بين الرطب واليابس ولا بين ماله جرم وما لا جرم له ...... الخ.

وفي الدر المختار(۱/۳۱۰): ويطهر (صقيل) لامسام له (كمرآة) وظفر وعظم وزجاج وآنية مدهونة أو خرّاطي وصفائح فضة غير منقوشة بمسح يزول به اثرها مطلقا وبه يفتي.

(۱۶۴) کتاب کو پاک کرنے کا طریقہ

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک دن گھر میں مطالعہ کررہا تھا اچانک کسی کام کیلئے جانا ہوا تو کتاب تپائی پر چھوڑ کر چلا گیا ادھر کہیں سے گھومتا پھرتا میرا بیٹا اس کمرے میں آپہنچا اس نے کتاب اٹھالی اس سے کھیلتا رہا آخر میں اس پر پیشاب کردیا اب اس کتاب کو کس طرح پاک کریں گے جبکہ دھونے کی صورت میں کتاب کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں چونکہ پانی سے دھونے سے کتاب کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے اس لئے کسی اور ایسی پاک مائع چیز سے دھولیں جو نجاست کو دور کردے اور اس سے کتاب خراب نہ ہو، جیسے پیٹرول وغیرہ۔

وفي اعلاء السنن(طبع ادارة القرآن والعلوم)(۱/۴۰۶): كانت إحدانا تغسل دم الحيضة بريقها تقرضه بظفرها

وفي اعلاء السنن (۱/۴۰۵): قوله عن عائشة رضي الله عنها قلت يستنبط منه جواز ازالة النجاسة

بغير الماء فان الدم نجس وهو اجماع المسلمين ويستنبط منه أن إزالة النجاسة لا يشترط فيها العدد بل المراد الإنقاء قاله العينى......

وأصرح منه مافى رواية عبدالرزاق.......... جعلت رضى الله عنها ذالك غسلاً.

وفى المختصر المقدورى(صـ٢٦): يجوز تطهير النجاسة بالماء وبكل مائع طاهر يمكن ازالتها به كالخل وماء الورد.

وفى ملتقى الابحر(۱/۴۶): يطهر بدن المصلى...... وبكل مائع طاهر مزيل كالخل وماء الورد......

وقال فى الحاشية المسماة بالتعليق الميسر ومثله البنزين والكازلا نهما مزيلان الخ.

وفى الشامية(۱/۳۰۹): وبكل مائع) أى سائل فخرج الجامد الخ (قوله طاهر) فبول ما يوكل لا يطهر الخ قالع) أى مزيل الخ (قوله ينعصر بالعصر) تفسير لقالع الخ.

(۱۶۵) ناپاک روئی کو پاک کرنے کا طریقہ

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے گھر میں روئی رکھی ہوئی تھی کہ اس کے اوپر میرے بچے نے پیشاب کر دیا تو اب روئی کو کس طرح پاک کیا جائے جبکہ دھونے سے وہ خراب ہو جائے گی؟

الجواب حامداًومصلیاً......نجس چیزوں کو پاک کرنے کا افضل طریقہ تو یہ ہے کہ ان کو پانی سے دھویا جائے، اور دھونے سے خراب ہونے کا اندیشہ ہو، تو فقہاء کرام نے جو متبادل طریقے بتائے ہیں ان میں سے کوئی طریقہ اختیار کیا جائے، جیسا کہ روئی کے پاک کرنے میں فقہاء کرام نے متبادل طریقہ بتایا ہے کہ اس کو دھنوایا جائے۔ البتہ روئی کی اگر کل مقدار کا نصف یا نصف سے زیادہ حصہ ناپاک ہو جائے تو دھننے سے پاک نہیں ہوگا، اور اگر نصف سے کم حصہ ناپاک ہے تو دھننے سے پاک ہو جائے گا۔

لمافى الهندية(۱/۴۵): المحلوج النجس اذا ندف ان كان الكل او النصف نجسالا يطهر وان كان يسيرا بحيث يحتمل ان يذهب بهذا الفعل يحكم بطهارة كالكدس اذا تنجس فقسم بين الدهقان والعامل يحكم بطهارته.

وفى الشامية (۱/۳۱۴): وانما يجوز الانتفاع لو قوع الشك فى بقاء النجاسة فى الموجود، وكذا الندف ومن عده شرط كون النجس مقدارا قليلا يذهب بالندف والا فلا يطهر.

(۱۶۶) روئی کے دھنوانے سے پاک ہونے کی علت

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک عالم صاحب سے سنا ہے کہ روئی دھنوانے

سے پاک ہوجاتی ہے؟ مجھے آپ سے یہ معلوم کرنا ہے کہ آیا اس میں کچھ شرائط بھی ہیں یا بس مطلق دھنوانے سے پاک ہوجائے گی۔ اصل میں ہمارے گھر میں بھی کچھ روئی لحاف بنوانے کیلئے رکھی ہوئی تھی، اس پر میرے بھتیجے نے پیشاب کردیا ہے۔ اب ہم پریشان ہیں کیا کریں؟ نیز ایک بات اپنی معلومات میں اضافے کیلئے پوچھنا ہے کہ آخر روئی کے دھنوانے سے پاک ہونے کی کیا علت ہے؟ براہ کرم مدلل و مفصل جواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... ناپاک روئی کا حصہ اگر کل روئی کا آدھا یا اس سے زیادہ ہے تو دھنوانے سے پاک نہیں ہوگا البتہ اگر آدھے سے کم ہے اور یہ احتمال ہے کہ دھنوانے سے ناپاک حصہ اڑ جائے گا تو وہ روئی دھنوانے سے پاک ہوجائے گی لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ کے بھتیجے کے پیشاب کی وجہ سے روئی اگر آدھی سے کم ناپاک ہوئی ہے تو وہ دھنوانے سے پاک ہوجائے گی۔

فقہاء کرامؒ نے صراحتاً اس کی کوئی علت بیان نہیں فرمائی کہ روئی دھنوانے سے پاک کیوں ہوتی ہے البتہ ان کے اس قول کہ "اگر نجاست تھوڑی ہو، اور دھنوانے سے اس کے چلے جانے کا احتمال ہو، تو پاکی کا حکم لگایا جائے گا" سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ روئی کو جب دھنوایا جائے گا تو اس کا کچھ حصہ اڑ جائے گا اور جو حصہ اڑا ہے احتمال ہے کہ اس میں نجاست ہو اور بقیہ روئی پاک ہو اسی احتمال کی بناپر پاکی کا حکم لگایا جائے گا آجکل بھی روئی والوں سے معلوم کرنے پر یہ بات علم میں آئی کہ روئی دھنوانے سے اس کا کچھ حصہ اڑ جاتا ہے اور اس کو دھوکر پاک کرنے کی بھی صورت نہیں کیونکہ یہ دھونے سے خراب ہوجاتی ہے اس کی نظیر فقہاء کرامؒ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ اگر گندم کا ڈھیر نجس ہوجائے اور اس کو زمیندار اور کسان میں تقسیم کردیا جائے تو سارے ڈھیر پر پاکی کا حکم لگایا جائے گا کیونکہ تقسیم کی بناپر ہر حصہ میں یہ احتمال ہے کہ نجاست اس حصہ میں نہ ہو بلکہ دوسرے حصہ میں ہو، اسی احتمال کی وجہ سے ہر حصہ کی طہارت میں شک واقع ہوگیا لیکن چونکہ اشیاء میں اصل طہارت ہے اس لئے سارے ڈھیر پر طہارت کا حکم لگایا جائے گا۔ اسی طرح ناپاک روئی کو جب دھنوایا گیا تو بعض روئی کے اڑ جانے کی وجہ سے یہ احتمال واقع ہوگیا کہ بقیہ روئی پاک ہے یا نہیں کیونکہ احتمال ہے کہ ناپاک روئی اڑی ہو، اور یہ بھی احتمال ہے کہ پاک روئی اڑی ہو، اسی احتمال کی وجہ سے بقیہ روئی کی طہارت میں شک واقع ہوگیا لیکن چونکہ اکثر روئی پاک ہے اس لئے بقیہ روئی پر بھی پاکی کا حکم لگایا جائے گا۔

لمافی النهر الفائق(۱/۱۴۶): وأما القسمة وما بعدها فلأن النجاسة باقية ايضاً وانما جاز الانتفاع لوقوع الشك فی الموجود ابقيت النجاسة فيه أم لا ألا ترى أن الذاهب لو عاد عادت النجاسة وعلى هذا فلا ينبغي عد الندف ايضا ومن عده شرط ان يكون النجس مقداراً قليلاً يذهب بالندف أما لو كان كالنصف ونحوه فلا يطهر به.

وفی خلاصة الفتاوی(۱/۴۳): المحلوج النجس اذا ندف ان كان الكل او النصف نجساً لا يطهر اما اذا كان النجس شيأ يسيراً بحيث يحتمل ان يذهب بهذا الفعل يحكم بطهارته كالكدس اذا تنجس فقسم بين الدهاقين والعامل يحكم بطهارته.

وفی الهندية(۱/۴۵): المحلوج النجس اذا ندف ان كان الكل او النصف نجساً لا يطهر وإن كان

یسیراً بحیث یحتمل ان یذهب بهذا الفعل یحکم بطهارته کالکدس اذا تنجس فقسم بین الدهقان والعامل یحکم بطهارته کذا فی الخلاصة.

(۱۶۷) ڈبلیوسی کے اندر گھڑی گرنے کی صورت میں پاک کرنے کا طریقہ

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری گھڑی بیت الخلاء کے ڈبلیوسی میں گر گئی تھی جسے میں نے تھیلی پہن کر نکال لیا ہے، اب میں اسے استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے پاک کرنے کی کیا صورت ہوگی؟ برائے کرم جلد از جلد رہنمائی فرماویں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... ڈبلیوسی کے اندر عام طور پر ناپاک پانی ہوتا ہے اسلئے چین والی گھڑی یا چمڑے کے پٹے والی گھڑی اس میں گرنے کی صورت میں صرف نجاست اور اس کے اثر کو دور کرنا کافی ہوگا اگر گھڑی ایسے پٹے والی ہے کہ جس میں نجاست کے اثرات بیٹھ جاتے ہیں تو اسے تین مرتبہ دھونا ضروری ہوگا اور دونوں صورتوں میں اگر دھونے کی وجہ سے گھڑی کے خراب ہونے یا زنگ وغیرہ لگ جانے کا احتمال ہو تو کسی ایسی پاک مائع چیز جو نجاست کے اثر کو دور کردے اور اس سے یہ خرابی پیدا نہ ہو، مثلاً پٹرول وغیرہ سے بھی دھولینا کافی ہوگا۔

وفی الهندیة (۱/۴۱): یجوز تطهیر النجاسة بالماء وبکل مائع طاهر یمکن ازالتها به.......... وان کانت مرئیة بازالة عینها وأثرها ان کانت شیأ یزول اثره ولا یعتبر فیه العدد کذا فی المحیط فلو زالت عینها بمرة اکتفی بها. (وفی صـ۴۲): وإن کانت غیر مرئیة یغسلها ثلاث مرات.

وفی الشامیة (۱/۳۰۹): (قوله وبه یفتی) أی خلافا لمحمدؒ لانه لایجیز ازالة النجاسة الحقیقیة الابالماء المطلق. بحر

(۱۶۸) روئی اور فوم کے ناپاک گدے پاک کرنے کا طریقہ

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل اکثر گھروں میں لوگ روئی یا فوم والے گدے استعمال کرتے ہیں ہر گھر میں بچے بھی موجود ہوتے ہیں وہ ان کے اوپر پیشاب وغیرہ کرتے رہتے ہیں اگر یہ گدے ناپاک ہوجائیں تو ان کو پاک کرنے کا کیا طریقہ ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... جن چیزوں میں نجاست جذب ہوجاتی ہے ان کی دو صورتیں ہیں، ان کو نچوڑا جاسکتا ہوگا یا نہیں، اگر نچوڑا جاسکتا ہے تو اس کو پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو تین مرتبہ دھویا جائے اور ہر مرتبہ اچھی طرح نچوڑا جائے اور جن چیزوں کو نچوڑا نہیں جاسکتا ان کو پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کو بھی تین مرتبہ دھویا جائے اور ہر مرتبہ دھونے کے بعد ڈال دیا جائے یہاں تک کہ اس سے قطرے ٹپکنا بند ہوجائیں، مذکورہ دونوں صورتوں میں اگر وہ چیز جس پر نجاست لگی ہوئی ہے، اگر اس کو بہتے ہوئے پانی میں ڈال دیا جائے یہاں

تک کہ غالب گمان اس کے پاک ہونے کا ہوجائے تو اس سے بھی وہ چیز پاک ہوجاتی ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں روئی اور فوم کے گدوں کا نچوڑنا اگر ممکن نہیں تو ان کو تین مرتبہ دھویا جائے اور ہر مرتبہ دھونے کے بعد ڈال دیا جائے یہاں تک کہ قطرے ٹپکنا بند ہوجائیں یا پائپ وغیرہ سے ان پر اتنا پانی بہادیا جائے کہ پاک ہونے کا غالب گمان حاصل ہوجائے تو پاک ہوجائیں گے۔

لمافی البحر الرائق(۱/۴۱۳): قوله (وبتثليث الجفاف فيما لا ينعصر) اى مالا ينعصر فطهارته غسله ثلاثا وتجفيفه فى كل مرة لان للتجفيف اثرا فى استخراج النجاسة وهو ان يتركه حتى ينقطع التقاطر ولا يشترطُ فيه اليبس.

وفى الشامية(۱/۳۳۲): حاصله كما فى البدائع ان المتنجس اما ان لا يتشرب فيه اجزاء النجاسة اصلا...... او يتشرب فيه قليلا...... او يتشرب كثيرا ففى الاول طهارته بزوال عين النجاسة المرئية او بالعدد على ما مرو فى الثانى كذالك...... واما فى الثالث، فان كان مما يمكن عصره كالثياب فطهارته بالغسل والعصر الى زوال المرئية رفى غيرها بتثليثها وان كان ممالا ينعصر كالحصير المتخذ من البردى ونحوه ان علم أنه لم يتشرب فيه بل اصاب ظاهره يطهر بازالة العين او بالغسل ثلاثا بلا عصروان علم تشربه...... فعند محمد لا يطهر ابدا وعند ابى يوسف ينقع فى الماء ثلاثا ويجفف كل مرة والاول اقيس والثانى اوسع اهـ وبه يفتى درر.

وفى الفقه الاسلامى وادلته(۱/۳۳۵): واما ان كان مما لايعصر كالحصير والسجاد والخشب: فينقع فى الماء ثلاث مرات ويجفف فى كل مرة وهو قول ابى يوسف وهو الرأى الراجح وقال محمد لا يطهر ابداً.

وفيه ايضاً(۱/۳۳۷): وقد اتفق الحنفية مع غيرهم على ان المتنجس اذا غسل فى ماء جار او غدير (اى ماء كثير له حكم الجارى) او صب عليه ماء كثير او جرى عليه الماء طهر مطلقا بلا شرط عصر وتجفيف وتكرار غمس لان الجريان بمنزلة التكرار والعصر.

(۱۶۹) ناپاک قالین کو پاک کرنے کا طریقہ

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کو سلسل بول کی بیماری ہے ایک روز وہ مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا کہ قالین پر پیشاب کے قطرات گر گئے تو اس نے اس پر گیلا کپڑا لگا کر صاف کردیا تو کیا اس طرح کرنے سے قالین پاک ہوگیا یا دھونا ضروری ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... قالین چونکہ ایسی چیز ہے جو کہ نجاست کے اثرات کو جذب کرلیتی ہے اور اس کو عام طور پر نچوڑنا بھی ممکن نہیں ہوتا

اس لئے یہ گیلا کپڑا پھیر دینے سے پاک نہ ہوگا بلکہ اس کے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اتنے وقفے وقفے سے تین مرتبہ اسے اس طرح دھویا جائے گا کہ ہر مرتبہ اس سے قطرے گرنا بند ہو جائیں اور جب تین مرتبہ مذکورہ طریقے سے دھولیا جائے گا تو پھر وہ پاک ہو جائے گا۔

وفی الهندية(۱/۴۲): مالاينعصر يطهر بالغسل ثلاث مرات والتجفيف فی كل مرة لان للتجفيف أثرا فی استخراج النجاسة.

وفی الدرالمختار (۱/۳۳۱): (غيرها) أی غير مرئية(بغلبة ظن غاسل)...... (طهارة محلها)بلا عدد به يفتیٰ (وقدر)...... (بغسل وعصر ثلاثاً)أو سبعا(فيما ينعصر)..... (و) قدر (بتثليث جفاف) أی انقطاع تقاطر(فی غيره) ای غير منعصر.

(۱۷۰) دریائی مینڈک کے کنویں میں گرنے سے کنویں کی طہارت کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر دریائی مینڈک کنویں میں گر جائے تو طہارت کا کیا حکم ہے؟ کیا دریائی مینڈک کنویں میں گرنے سے کنواں ناپاک ہو جاتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... دریائی مینڈک کے کنویں میں گرنے سے کنواں ناپاک نہیں ہوتا بشرطیکہ اس پر ظاہری نجاست نہ لگی ہو، اور اگر اس پر نجاست لگی ہو تو کنواں ناپاک ہو جائے گا اور سارے پانی کا نکالنا ضروری ہوگا اور کنویں کے چشمہ دار ہونے کی صورت میں جب سارا پانی نکالنا ناممکن ہو، تو تین سو ڈول نکال لیے جائیں تو وہ کنواں پاک ہو جائے گا۔

لمافی الهندية (۱/۱۹): واذا وجب نزح جميع الماء ولم يمكن فراغها لكونها معينا ينزح مائتا دلو كذا فی التبيين وهذا أيسر كذا فی الاختيار شرح المختار والأصح أن يؤخذ بقول رجلين لهما بصارة فی أمر الماء فای مقدار قالا انه فی البئر ينزح ذلک القدر وهو أشبه بالفقه.

وفی الدر المختار(۱/۲۱۱): (اذا وقعت نجاسة)ليست بحيوان ولو مخففة أو قطرة بول اودم ....(ينزح كل مائها).

وفی الدر المختار(۱/۲۱۴): (وان تعذر) نزح كلها لكونها معينا (فبقدر مافيها) وقت ابتداء النزح قاله الحلبی (يؤخذ ذلک بقول رجلين عدلين لهما بصارة بالماء) به يفتی. وقيل يفتی بمائة الی ثلاث مائة وهذا أيسر وذاک أحوط.

(۱۷۱) دھوبی کے دھلے ہوئے کپڑوں کی پاکی کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں دھوبی سے کپڑے دھلواتا ہوں، کیا دھوبی کے دھلے

ہوئے کپڑے پاک ہوتے ہیں؟اوراگر کپڑے گھر میں دھوئے جائیں توان میں سے بعض پاک اور بعض ناپاک ہوتے ہیں اب جب انہیں ایک ساتھ دھویا جائے گا تو دھونے کے بعد ہر کپڑے کو تین دفعہ دھونا ضروری ہے؟ اگر تین دفعہ دھونا ضروری ہوتو جب ایک کپڑے کو پانی میں ڈال دیا تو اسے نکالنے کے بعد دوسرے کپڑے کو اسی پانی میں دھوسکتے ہیں یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... کپڑے دھونے کی دوصورتیں ہیں، پہلی یہ کہ کپڑے کسی بڑے حوض یا بہتے ہوئے پانی میں دھوئے جائیں یا ان کے اوپر سے پانی بہایا جائے تو ایسی صورت میں اگر نجاست دکھائی دینے والی ہے تو نجاست کے زائل ہونے سے کپڑا پاک ہوجائے گا چاہے ایک مرتبہ دھونے سے ہو یا ایک سے زیادہ مرتبہ دھونے سے،اوراگرنجاست دکھائی دینے والی نہیں ہے تو تین دفعہ دھونے سے کپڑا پاک ہوجائے گا، ہاں اگر تین دفعہ سے پہلے پاکی کا ظن غالب ہوجائے تو بھی کپڑا پاک ہوجائے گا۔دوسری صورت یہ ہے کہ کپڑے بالٹی ،ٹب یا واشنگ مشین وغیرہ میں دھوئے جائیں تو اس میں پاک کرنے کی صورت یہ ہوگی کہ ایک دفعہ نکال کرانہیں نچوڑ لیا جائے اور جو پانی بالٹی یا مشین وغیرہ میں ہو وہ گرادیا جائے اور مشین وغیرہ کو کھنگال لیا جائے ،اسی طرح دوسری اور تیسری مرتبہ یہ عمل کیا جائے یا مشین وغیرہ سے نکال کرصاف پانی میں تین دفعہ ڈال کر نچوڑ لیے جائیں تو کپڑے پاک ہوجائیں گے۔

یادرہے کہ جب پاک اور ناپاک کپڑوں کو ایک ساتھ پانی میں ڈال دیا تو اب کپڑوں کو پاک کرنے کیلئے سب کو تین دفعہ دھونا پڑے گا کیونکہ ایک ساتھ دھونے سے سب ہی ناپاک ہوگئے۔ دھوبی اگر مذکورہ صورتوں میں سے کوئی صورت اختیار کرتا ہے تو کپڑے پاک ہوں گے ورنہ نہیں۔ نیز مذکورہ بالا تفصیل سے یہ معلوم ہوگیا کہ اگر ناپاک کپڑے کسی بالٹی وغیرہ میں ڈالے جائیں گے تو وہ پانی بھی ناپاک ہوجائے گا لہٰذا دوسرے کپڑے اس میں نہیں ڈال سکتے البتہ اگر تین دفعہ دھونے کے بعد ڈالے جائیں تو کپڑے پاک ہونے کی وجہ سے پانی ناپاک نہیں ہوگا لہٰذا اس میں دوسرے کپڑے ڈال سکتے ہیں۔

لمافی الدرالمختار (۱/۳۲۸):(وكذايطهر محل نجاسة ......مرئية) بعد جفاف كدم (بقلعها)اى بزوال عينها واثرها ولو بمرة او بما فوق ثلاث فى الاصح.

وفى الشامية(۱/۳۲۸): (ولو بمرة) يعنى ان زال عين النجاسة بمرة واحدة تطهر سواء كانت تلك الغسلةالواحدة فى ماء جار او راكد كثير او بالصب او فى اجانة اما الثلاثة الاول فظاهر واما الاجانة فقد نص عليها فى الدرر حيث قال غسل المرئية عن الثوب فى اجانة حتى زالت طهر.

(۱۷۲) ٹوائلٹ پیپر کے استعمال کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل جو ٹوائلٹ پیپر استعمال ہوتے ہیں انہیں استعمال کرنا کیسا ہے؟ کیا یہ پانی کے قائم مقام ہوں گے کہ اگر کوئی یہ استعمال کرلے تو پانی استعمال کیے بغیر اس کی نماز درست ہوجائے گی؟ نیز عذر اور غیر عذر کی صورت میں کوئی فرق ہوگا یا دونوں صورتیں برابر ہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً......صورت مسئولہ میں پیپر کا استعمال جائز ہے،اگرنجاست اپنے مخرج سے تجاوز نہ کرے تو یہ پانی کے قائم مقام ہوں گے لہٰذا اگر پانی نہ بھی استعمال کیا جائے تو بھی نماز صحیح ہوجائے گی،البتہ اگرنجاست اپنے مخرج سے تجاوز کرگئی ہوتو پانی کا استعمال ضروری ہوگا صرف پیپر کا استعمال کافی نہ ہوگا۔ نیز عذراور غیر عذر میں کوئی فرق نہیں ہوگا،بلکہ دونوں صورتیں برابر ہیں۔

لمافی الهندية (۴۸/۱):يجوز الاستنجاء بنحو حجر منق كالمدر والتراب والعود والخرقة والجلد ومـاأشبهها......ثم الاستنجاء بالاحجار انما يجوز اذا اقتصرت النجاسة على موضع الحدث فاما اذا تعدت موضعها بان جاوزت الشرج اجمعوا على ان ما جاوز موضع الشرج من النجاسة اذاكانت اكثر من قدرالدرهم يفترض غسلها بالماء.

وفى الدرالمختار (۱/۳۳۸،۳۴۰):(ويجب) اى يفرض غسله (ان جاوز المخرج نجس) مائع ويعتبر القدرالمانع لصلاة (فيما وراء موضع الاستنجاء ......وكره) تحريما (بعظم وطعام وروث ......و) شئى محترم......

(۱۷۳) مردہ جانور کی کھال کے استعمال کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کسی مردہ جانور کی کھال اتار کر فروخت کرنا کیسا ہے کیونکہ گوشت وغیرہ تو استعمال نہیں کرسکتے،لیکن میں نے سنا ہے کہ کھال استعمال کرسکتے ہیں کیا یہ بات صحیح ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......مردہ جانور کی کھال کو دباغت (دھوپ،مٹی یا نمک وغیرہ سے بدبو اور خون وغیرہ دور کرنا) کے بعد فروخت کرسکتے ہیں اور استعمال بھی کرسکتے ہیں البتہ دباغت سے پہلے فروخت نہیں کرسکتے۔

لمافى الهندية (۳/۱۱۵):واما جلود السباع والحمر والبغال فما كانت مذبوحة او مدبوغة جاز بيعها ومالا فلا وهذا بناء على ان الجلود كلها تطهر بالذكاة او بالدباغ الا جلد الانسان والخنزير واذاطهرت بالذكاة جاز الانتفاع بها فتكون محلا للبيع.

وفى الدرالمختار (۱/۲۰۳): (وكل اهاب)...... (دبغ) ولو بشمس ......(طهر).

وفيها ايضاً (۵/۷۳):(وجلد الميتة قبل الدبغ) لو بالعرض ولو بالثمن فباطل ......(وبعده)اى الدبغ (يباع)الا جلد الانسان وخنزير وحية (وينتفع به)لطهارته حينئذ.

(۱۷۴) اُکھڑے ہوئے بالوں کی طہارت کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید اور بکر کا اس بات میں اختلاف ہوا کہ داڑھی کے وہ

بال پاک ہیں یا نہیں جو داڑھی سے الگ ہو جائیں؟ زید کا کہنا ہے کہ بال کا وہ سرا جو گال سے ملا ہوتا ہے وہ ناپاک ہے اس لئے کہ انسان کا جسم اور گوشت ناپاک ہے۔ لہٰذا بال کا وہ حصہ جو گال سے ملا ہوتا ہے ناپاک ہے۔ جبکہ بکر کا کہنا اس کے خلاف ہے کہ بال پاک ہیں اگر یہ مسجد میں گر جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ درست مدلل جواب عنایت فرما کر دونوں کے اختلاف کو ختم فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حجۃ الوداع کے موقع پر حلق فرما کر اپنے بال مبارک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں تقسیم فرمانا بالوں کے پاک ہونے کی صریح دلیل ہے۔ اسی طرح فقہاء کرام کی تصریحات کے مطابق ہر وہ عضوِ حیوانی جس میں خون نہ ہو پاک ہے، بالوں میں بھی خون نہیں ہوتا اس لئے یہ بھی پاک ہیں البتہ وہ بال جن کو اکھیڑا جائے اور ان کے سروں پر جسم کی رطوبت پائی جائے تو ان بالوں کے سرے رطوبت کی وجہ سے ناپاک ہوں گے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں داڑھی کے وہ بال جن کو اکھیڑا گیا ہو، اور ان کے ساتھ جسم کی رطوبت بھی موجود ہو تو ان کے رطوبت والے سرے ناپاک ہوں گے اور ان کو مسجد میں گرنے سے بچایا جائے اگر گر جائیں تو ان کو اٹھا کر کسی محترم جگہ ڈال دیا جائے تا کہ انسان کے بالوں کی بے احترامی لازم نہ آئے۔

لمافي ابی داؤد(۱/۲۷۲): عن انس بن مالکؓ قال ان رسول الله ﷺ رمى جمرة العقبة يوم النحر ثم رجع الى منزله بمنى فدعا بذبح فذبح ثم دعا بالحلاق فأخذ بشق رأسه الايمن فحلقه فجعل يقسم بين من يليه الشعرة والشعرتين ثم أخذ بشق رأسه الأيسر فحلقه ثم قال ههنا ابو طلحة فدفعه إلى أبی طلحة.

وفی الهداية(۱/۴۰): وشعر الإنسان وعظمه طاهر وقال الشافعیؒ نجس لأنه لا ينتفع به ولا يجوز بيعه ولنا أن عدم الانتفاع والبيع لكرامته فلا يدل على نجاسته.

وفی قاضی خان(۱/۳۲):وان كان فی المسجد عش خطاف لا بأس بأن يرمی بها تنزيهاً للمسجد.

وفی الشامية(۱/۲۰۷):(قوله وشعر الانسان) المراد به ما أبين منه حياً والإفطهارة ما على الانسان مستغنية عن البيان...... والأولىٰ اسقاط حياً وعن محمد فی نجاسة شعر الأدمی وظفره وعظمه روايتان والصحيح الطهارة سراج (قوله غير المنتوف) أما المنتوف فنجس بحر والمراد رؤوسه التی فيها الدسومة. اقول وعليه فما يقی بين اسنان المشط ينجس الماء القليل اذا بل فيه وقت التسريح لكن يؤخذ من المسألة الاتية كما قال ط ان ماخرج من الجلدمع الشعر ان لم يبلغ مقدار الظفر لايفسد الماء تأمل.

(۱۷۵) بالوں کے ساتھ نکلنے والی دسومت کے ناپاک ہونے کی علت اور مقدار ظفر کی تعیین

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فقہاء کل ما ليس بحدث ليس بنجس کا قاعدہ

ذکر کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اس قاعدہ کی رُو سے وہ خون جو بدن سے نکلا تو ہو لیکن اس میں سیلان نہ ہو، وہ پاک ہے۔ لہٰذا اس قاعدہ کے تحت بدن سے بال اکھیڑنے کی صورت میں جو دسومت بال کیساتھ نکلتی ہے اس کو بھی پاک ہونا چاہیے حالانکہ فقہاء کرام نے اس کو ناپاک قرار دیا ہے۔ اوراس کے ذریعہ سے پانی کو ناپاک قرار دینے کیلئے مقدار ظفر بیان فرماتے ہیں۔ مہربانی فرما کر دسومت کے ناپاک ہونے کی علت اور مقدار ظفر کی تعین کی وجہ عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... بالوں کے ساتھ نکلی ہوئی دسومت بھی اس قاعدہ ''کل ما لیس بحدث لیس بنجس '' کے تحت داخل ہے کیونکہ اس قاعدہ کی رُو سے جس طرح خون کے نجس ہونے کیلئے سیلان ضروری ہے اسی طرح دسومت کے نجس ہونے کیلئے ضروری ہے کہ وہ حد سیلان کو پہنچ جائے۔ اوراس دسومت سے پانی نجس ہونے کیلئے فقہاء کرام رحمۃ اللہ علیہم نے مقدار ظفر بیان فرمائی ہے کیونکہ جب یہ مقدار ظفر کے برابر ہوگی تو اس میں کثیر ہونے کی وجہ سے سیلان بھی متحقق ہوجائے گا اور جب یہ سیلان کی صورت میں پانی میں گرے گی تو پانی نجس کردے گی۔ نیز فقہاء کرامؒ نے اس مسئلہ میں مقدار ظفر کو کثیر کا معیار قرار دیا ہے یہ معیار صرف اس مسئلہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ اگر کھال اور گوشت بھی مقدار ظفر کے برابر پانی میں گر جائیں تو بھی پانی ناپاک ہوجائے گا۔

لما في الشامية (١/٢٠٧): (قوله وشعر الانسان) المراد به ما أبين منه حياً والا فطهارة ماعلى الانسان مستغنية عن البيان...... والأولیٰ اسقاط حياً وعن محمدٌ فی نجاسة شعر الآدمی وظفره وعظمه روايتان والصحيح الطهارة سراج (قوله غير المنتوف) أما المنتوف فنجس بحر والمراد رؤوسه التی فيها الدسومة...... قال ط أن ما خرج من الجلد مع الشعر إن لم يبلغ مقدار الظفر لايفسد الماء.

وفی تقريرات الرافعی (١/٢٦): (قوله وظاهره أنه لو كان فيه دسومة الخ) وقال السندی نقلا عن الرحمتی ولم يحترز عن رطوبة فی الظفر لأنها اذا لم تبلغ حد السيلان فليس بنجس علی الأصح، ويظهر أن ما افسد الماء من الشعر المنتوف ونحوه لابد أن يكون ما فيه من النجاسة يبلغ حد السيلان ولذا قالوا إن الذی مع الشعر المنتوف إن لم يبلغ قدر الظفر لا يفسد الماء تأمل.

وفی طحطاوی علی الدر (١/١١٤): (قوله بوقوع قدر الظفر من جلده) أی قشره ويعدّ كثيراً لأن الجلد والقشر من جملة لحم الآدمی ويفهم منه أن الذی خرج من الجلد مع الشعر المنتوف منه إن لم يبلغ مقدار الظفر لايفسد الماء.

(١٧٦) برساتی پانی کی چھینٹوں کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بارش کی وجہ سے سڑکوں پر جو کیچڑ ہوتی ہے اگر وہ کپڑوں کو لگ جائے اوراسی کے ساتھ نماز ادا کرلی جائے تو اس نماز کا کیا حکم ہوگا؟ کیچڑ کے مرئی اور غیر مرئی ہونے میں فرق ہے یا دونوں مساوی

حکم رکھتی ہیں؟ لہٰذا جواب مرحمت فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداًو مصلیاً...... بارش وغیرہ کے پانی کی وجہ سے سڑکوں پر جو کیچڑ پیدا ہو جاتی ہے اگر نجاست کا اثر اس میں محسوس نہ ہو تو ضرورت اور عموم بلوی کی وجہ سے پاک ہے، لہٰذا ایسے کپڑوں کے ساتھ پڑھی گئی نماز درست ہے، البتہ احتیاطاً ایسے کپڑوں کو دھوکر نماز پڑھنا چاہئے۔

لمافی الطحطاوی علی الدر (۱/۱۶۱): وطین شارع...... لو اصاب الثوب ما سئل من الكنيف فالاحب ان يغسله ولا يجب مالم يكن اكبر رايه انه نجس (الى ان قال) والطين المسرقن والردغة فى الطريق فيها نجاسة طاهرة الا اذا راى عين النجاسة. بحر.

(۱۷۷) خروج ریح سے کپڑے ناپاک نہ ہونے کی وجہ

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ احناف کے ہاں جو چیز ناقض وضو ہو وہ نجس بھی ہوتی ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ خروج ریح سے وضو تو ٹوٹ جاتا ہے لیکن شلوار وغیرہ کے پاک کرنے کا حکم نہیں دیا جاتا، اس فرق کی کیا وجہ ہے؟ وضاحت سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداًو مصلیاً...... صورت مسئولہ سے پہلے یہ سمجھئے کہ یہ ضابطہ کہ جو چیز ناقض وضو ہے وہ نجس بھی ہے سبیلین کے علاوہ میں ہے اور سبیلین میں عموم ہے چاہے خارج نجس ہو یا پاک ہر صورت میں خروج ناقض وضو ہے، لہٰذا ریح کے خارج ہونے میں اصل علت خروج نجس نہیں ہے بلکہ ریح فی نفسہ پاک ہے، لیکن خروج چونکہ سبیلین سے پایا جارہا ہے اس لئے ناقض وضو ہے، اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ اگر سبیلین سے کنکری کا خروج ہو تو یہ ناقض وضو ہے حالانکہ یہ نجس نہیں ہے ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ اس کا مرور نجاست سے ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس نجاست کے کچھ نہ کچھ اثرات پائے جاتے ہیں لیکن ان اثرات کا اعتبار اگر کپڑے کی طہارت وعدم طہارت کے اعتبار سے کیا جائے تو اس میں حرج بھی ہے لہٰذا ان اثرات کا اعتبار نقض وضو اور عدم نقض وضو میں تو کیا جاتا ہے لیکن کپڑوں کی طہارت وعدم طہارت میں نہیں کیا جاتا۔ اسی وجہ سے خروج ریح اگرچہ ناقض وضو ہے لیکن اس کی وجہ سے کپڑوں کی پاکی کا حکم نہیں دیا جاتا۔

لمافی التاتارخانية (۱/۱۱۴): وكذلک الريح الخارجة من الدبر واختلف المشايخ رحمهم الله أن عين الريح نجسة أوهى طاهرة الا انها تتنجس بمرورها على النجاسة قالوا: وفائدة هذاالخلاف فيما اذا خرج منه الريح وعليه سراويل مبتلة هل يتنجس سراويله؟ فمن قال عينها نجسة يقول يتنجس و من قال عينها ليست بنجسة يقول لايتنجس.

وفى الدر المختار (۱/۱۴۰): (و) كل (ماليس بحدث) أصلا بقرينة زيادة الباء كقئ قليل ودم لو ترک لم يسل (ليس بنجس)

وقال الشامى رحمه الله تعالىٰ تحته: (قوله ليس بنجس) أى لا يعرض له وصف النجاسة بسبب

خروجه بخلاف القليل من قئ عين الخمر أو البول فإنه وان لم يكن حدثاً لقلته لكنه نجس بالإصالة لا بالخروج هذا ما ظهر لی تأمل.

وفی الشامية (١/١٣٥): (مثل ريح)فانها تنقض لانها منبعثة عن محل النجاسة لا لأن عينها نجسة لأن الصحيح أن عينها طاهرة حتى لو لبس سراويل مبتلة أو ابتل من أليتيه الموضع الذی تمر به الريح فخرج الريح لايتنجس وهو قول العامة وما نقل عن الحلوانی من أنه كان لا يصلی بسراويله فورع منه بحر.

﴿فصل فی الحکام الماء﴾

(پانی اور کنویں وغیرہ سے متعلق احکام کا بیان)

(۱۷۸) مروجہ ٹینکیوں کا پانی ماء جاری شمار ہوگا؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے جامعہ کے پانی کی ٹینکی جبکہ اس میں پانی ایک طرف سے آ رہا ہوتا ہے اور دوسری طرف سے نکل رہا ہوتا ہے۔ نجاست گرنے کی صورت میں اس کا حکم ماء جاری کا ہوگا یا نہیں؟ جبکہ فتاویٰ عثمانی میں ٹینکی کو ماء جاری میں شمار کیا گیا ہے۔ کیا وہ اس طرح کی ٹینکی ہوگی جو ہمارے جامعہ کی ہے یا کسی اور نوعیت کی ٹینکی مراد ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... پانی کی ٹینکی ایسی ہو کہ ایک طرف سے پانی کی آمد اور دوسری طرف سے نکاسی کا سلسلہ ہو تو یہ ماء جاری کے حکم میں ہے نجاست گرنے کی صورت میں رنگ، بو اور مزہ میں تغیر نہ آئے تو ہر طرح اس کا استعمال درست ہے۔ اگر ٹینکی ایسی نہ ہو بلکہ ایک طرف سے بند ہو، صرف پانی کی آمد یا صرف نکاسی کا سلسلہ ہو تو اس صورت میں اگر وہ ''دہ در دہ'' ہے یا عرض میں تو ''دہ در دہ'' نہیں ہے لیکن طول (لمبائی) اتنی ہے کہ اگر اس کے پانی کو پھیلایا جائے تو وہ دہ در دہ ہو سکتا ہے تو یہ ماء کثیر ہے، نجاست گرنے کی صورت میں اس کا اثر ظاہر نہ ہو تو پاک ہے، اگر نجاست کا اثر ظاہر ہو جائے تو ناپاک۔ **ولـه طول لا عرض لكنه يبلغ عشرا في عشر، جاز تيسيرا (الدر المختار، ۱/۱۹۳)**

اگر ٹینکی مقدار میں چھوٹی ہو اور پانی کی آمد ورفت کا تسلسل بھی نہ ہو اور لمبائی بھی اتنی نہیں ہے کہ اگر اس کے پانی کو پھیلایا جائے تو دہ در دہ ہو سکے تو تھوڑی سی نجاست گرنے سے بھی ناپاک ہو جائے گی۔

نظیر ان ساری صورتوں کی حوض صغیر اور حوض الحمام ہے، حوض صغیر کے بارے میں فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ حوض صغیر میں پانی ایک طرف سے آ رہا ہو اور دوسری طرف سے نکل رہا ہو تو اس میں ہر طرف سے وضو جائز ہے۔ **اذا كان الحوض صغيراً يدخل فيه الماء من جانب. ويخرج من جانب آخر يجوز الوضوء في جميع جوانبه وعليه الفتوىٰ. من غير تفصيل بين ان يكون اربعاً في اربع او اقل يجوز او اكثر فلا يجوز. (شرح الوقاية اولين ص ۷۸)**

حوض کا پانی ساکن ہو پائپ وغیرہ کے ذریعے داخل نہ ہو رہا ہے نہ کوئی آدمی چلو بھر رہا ہے اس میں کوئی شخص اپنا ہاتھ ڈالے جبکہ ہاتھوں میں نجاست لگی ہو، تو وہ پانی ناپاک ہو جائے گا۔

فان ادخل رجل يده في الحوض وعليها نجاسة وان كان الماء ساكنا لايدخل فيه شئى من انبوبه ولايغترف منه

انسان بالقصعة يتنجس. (هنديه ١/١٨)

اگرلوگ چلوبھربھرکرلے رہے ہوں لیکن پائپ وغیرہ کے ذریعے پانی داخل نہیں ہورہاہو یااس کاعکس ہوکہ پائپ وغیرہ کے ذریعے پانی داخل ہورہاہے لیکن لوگ چلوبھربھرکرنہیں لے رہے ہیں تواس صورت میں اکثرفقہاء کے نزدیک نجس ہاتھ ڈالنے سے ناپاک ہوجائے گا۔

وان كان الناس يغترفون من الحوض بقصاعهم ولايدخل من الانبوب ماء اوعلى العكس فاكثرهم على انه يتنجس. (هندية ١/١٨)

اگرلوگ چلوبھربھرکرلے رہے ہوں اور پائپ وغیرہ کے ذریعے پانی بھی داخل ہورہاہے تواس صورت میں اکثرفقہاء کے نزدیک نجس ہاتھ ڈالنے سے پانی ناپاک نہ ہوگا۔

وان كان الناس يغترفون من الحوض بقصاعهم ويدخل الماء من الانبوب فاكثرهم على انه لايتنجس هكذا فی فتاویٰ قاضی خان و عليه الفتویٰ. (هنديه ١/١٨)

حمام کے حوض کے بارے میں بعض متاخرین احناف فرماتے ہیں کہ ماءحمام امام ابویوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہرحال میں ماءجاری کی طرح ہے چاہے لوگ چلوبھربھرکرلے رہے ہوں یانہ لے رہے ہوں جبکہ پائپ وغیرہ کے ذریعے پانی داخل ہورہاہو۔

(ومنهم) ای من المتاخرين (من قال هو) ای ماء الحمام (عنده) أی عند ابی يوسف (بمنزلة الماء الجاری على كل حال تدارك) الاغتراف مع دخول الماء من الانبوب (اولا لاجل الضرورة). (كبيری ص ١٠٠)

مذکورہ عبارات کی روسے اگرآپ کے جامعہ کی ٹینکی ایسی ہوجیساکہ سوال میں مذکورہے یعنی ایک طرف سے پانی کی آمداوردوسری طرف نکاسی کاتسلسل ہوتوماءجاری کے حکم میں ہے، اگرنکاسی کاسلسلہ نہیں ہے تودیکھیں گے کہ وہ دہ دردہ یااس کے حکم میں ہے یانہیں، اگرہےتو بھی ماءکثیرشمارہوگانجاست گرنے کی صورت میں ناپاک نہ ہوگابشرطیکہ نجاست کااثرظاہرنہ ہو، اگردہ دردہ نہیں تونجاست گرنے سے ناپاک ہوجائے گاکیونکہ وہ ماءقلیل ہوگا۔

لمافی الهندية (١/١٧): اذا كان الحوض صغيراً يدخل فيه الماء من جانب ويخرج من جانب يجوز فيه الوضؤ من جميع جوانبه وعليه الفتوى من غير تفصيل.

وفی الدر المختار (١/١٨٧): (و)يجوز (بجار وقعت فيه نجاسة و) الجاری (هومايعد جارياً) عرفا وقيل مايذهب بتبنة والاول اظهر والثانی اشهر،

وفی الشامية تحته : العرف الان انه متى كان الماء داخلاً من جانب وخارجاً من جانب آخر يسمى جاريا وان قل الداخل.

وفيه ايضاً (١/١٩٠): والحقوا بالجاری حوض الحمام لوالماء نازلاً والغرف متدارك كحوض صغيريد خله الماء من جانب ويخرج من آخر يجوز التوضی من كل الجوانب مطلقاً به يفتی.

وفی الشامیة تحت : (قوله والحقوا بالجاری حوض الحمام) ای فی انه لاینجس الابطهور اثر النجاسة، أقول: وكذا حوض غير الحمام لانه فی الظهيرية ذكر هذا الحكم فی حوض اقل من عشر فی عشر ثم قال وكذالک حوض الحمام...... (قوله ويخرج من آخر) أی بنفسه او بغيره لما فی التاتارخانية لوكان يدخله الماء ولايخرج منه لكن فيه انسان يغتسل ويخرج الماء باغتساله من الجانب الاخر متداركاً لاينجس.

وفی الدر المختار (۱/۱۹۵): ثم المختار طهارة المتنجس بمجرد جريانه وكذا البئر وحوض الحمام

وفی الشامية تحت : (قوله بمجرد جريانه) ای بأن يدخل من جانب ويخرج من آخر حال دخوله وان قل الخارج، بحر. قال ابن الشحنة لانه صار جارياً حقيقةً وبخروج بعضه رفع الشک فی بقاء النجاسة فلا تبقى مع الشک.

وفی الشامية(۱/۱۹۳): لم يذكر مقدار العمق إشارة إلى أنه لاتقدير فيه فی ظاهرا الرواية وهو الصحيح بدائع وصحح فی الهداية أن يكون بحال لا ينحسر بالاغتراف أی لا ينكشف وعليه الفتوى.

(۱۷۹) مخصوص وقت میں ٹینک میں پانی ایک جانب سے آکر دوسری طرف جاتا ہو تواس کے ماءجاری ہونے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک ٹینک جس میں نل وغیرہ کے ذریعے سے پانی آتا ہے۔اور پھرآگے سپلائی بھی ہوتا ہےلیکن ہر وقت ایسانہیں ہوتا کہ پانی ایک طرف سے آرہاہو،اوردوسری طرف سے جارہاہو، بلکہ مخصوص وقت میں پانی آتا ہے۔اورمخصوص وقت کیلئے ہی پانی کی آگے سپلائی بھی کی جاتی ہے۔دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا یہ پانی ماءجاری کے حکم میں ہوگایانہیں؟ نیزاگردہ دردہ ٹینک میں نجاست وغیرہ گرجائے اوراوصاف ثلثہ میں سے کوئی ایک متغیر ہوجائے تواس ٹینک کی صفائی کا کیاطریقہ ہوگا؟

الجواب حامداًومصلیاً......جس وقت ٹینک میں پانی داخل ہورہاہےاگراسی وقت آگے سپلائی بھی ہورہاہے پھرتو یہ ماءجاری کے حکم میں ہے لیکن اگر پانی ایک خاص وقت میں ٹینک میں داخل ہوتا ہے پھربعد میں کسی وقت پانی آگے سپلائی ہوتا ہےجیسا کہ اوپرسوال میں مذکور ہے پھر یہ ماءجاری کے حکم میں نہیں ہے۔دہ دردہ ٹینک میں نجاست گرنے سے پانی کےاوصاف ثلاثہ میں سے کوئی وصف متغیر ہوجائے تو پانی

نجس ہوجاتا ہے۔اوراس کے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اُس ٹینک کے تمام پانی کونکال دیا جائے لہٰذا تمام پانی نکالنے کے بعد ٹینک پاک ہوجائے گا۔

لما فی الشامية(۱/۱۸۹): واذا وصل إلى الحياض فى البيوت متغيرا ونزل فى حوض صغير أو كبير فهو نجس وإن زال تغيره بنفسه لان الماء النجس لا يطهر بتغيره بنفسه إلا اذا جرى بعد ذالک بماء صاف فانه حينئذ يطهر.

وفی الدرالمختار (۱/۱۹۵): ثم المختار طهارة المتنجس بمجرد جريانه وكذا البئر وحوض الحمام.

وفی الشامية تحته: (قوله بمجرد جريانه) اى بأن يدخل من جانب ويخرج من اٰخر حال دخوله وان قل الخارج بحر: قال ابن الشحنة: لانه صار جاريا حقيقةً، وبخروج بعضه رفع الشک فی بقاء النجاسة فلاتبقى مع الشک اهـ وقيل لايطهر حتى يخرج قدر مافيه، وقيل ثلاثة أمثاله بحر، فلو خرج بلا دخول كأن ثقب منه ثقب فليس بجارٍ.

وفی الشامية (۱/۲۱٦): (قوله بخلاف نحو صهريج وحب الخ) الصهريج الحوض الكبير يجتمع فيه الماء قاموس...... واراد بذالک الرد على من أفتى بنزح عشرين فی فأرة وقعت فی صهريج...... إن الفأرة لووقعت فی الحب يهراق الماء كله، قال: ووجهه أن الاكتفاء بنزح البعض فی الابار على خلاف القياس باالاثار فلا يلحق بها غيرها.

(۱۸۰) چھوٹی ٹینکی میں چڑیا کے گرنے سے پانی نجس ہوجاتا ہے

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گھر میں ایک ٹینکی ہے جس کی لمبائی چھ فٹ، چوڑائی وگہرائی چارفٹ ہے، اس کے اندر ایک چڑیا گر کر مرگئی ہے معلوم نہیں کہ کب سے گری ہے تو اب اس پانی کا کیا حکم ہے اور ہماری نمازوں کے بارے میں شرعاً کیا حکم ہوگا نیز اس ٹینکی کو پاک کرنے کا کیا طریقہ ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً...... صورت مسئولہ میں مذکورہ ٹینکی کا پانی نجس ہوگیا ہے چڑیا کے مرنے کی وجہ سے۔اور اگر یہ چڑیا پھول گئی یا پھٹ گئی ہے تو تین دن وتین راتوں کی نمازوں کو لوٹانا بھی ضروری ہوگا۔اور اگر چڑیا پھولی یا پھٹی نہیں ہے تو صرف ایک دن وایک رات کی نمازیں لوٹانا ضروری ہوں گی۔ٹینکی کو پاک کرنے کا طریقہ یہ ہوگا کہ اس کو تین مرتبہ دھویا جائے اور ہر مرتبہ اس کے پانی کو نکالا جائے گا۔

لما فی نور الایضاح(صـ۲۸ـ۳۰): الرابع. ماء نجس وهو الذى حلت فيه نجاسة وكان راكداً قليلا والقليل مادون عشر فی عشر. فينجس ووجود حيوان ميت فيها ينجسها من يوم وليلة ومنتفخ من

ثلاثة ايام ولياليها ان لم يعلم وقت وقوعه.

وفي البحر الرائق(۲۱۴/۱): وفي الكافي، والمستصفى، والبدائع ان الفارة اذا وقعت في الحب بالحاء المهملة، يهراق الماء كله ولم يعلل له، ووجهه ان الاكتفاء بنزح البعض مخصوص بالآبار ثبت بالآثار على خلاف القياس فلا يلحق به غيره فعلى هذا اذا وقعت الفارة في الصهريج او في الفسقية ولم يكونا عشراً في عشر فان الماء كله يهراق كمالا يخفى.

وفي الشامية(۲۱۶/۱): (قوله بخلاف نحو الصهريج وحب الخ) الصهريج الحوض الكبير يجتمع فيه الماء قاموس...... واراد بذالک الردّ على من افتى بنزح عشرين في فأرة وقعت في صهريج ...... ان الفارة لووقعت في الحب يهراق الماء كله قال ووجهه ان الاكتفاء بنزح البعض في الابار على خلاف القياس بالاثار فلا يلحق بها غيرها. انتهى قوله.

(قوله يهراق الماء كله) اقول وهل يطهر بمجرد ذالک ام لابد من غسله بعده ثلاثا والظاهر الثاني ثم رايتهٗ في التاتارخانية قال مانصه وفي فتاوى الحجة سئل عبدالله بن المبارک عن الحب المركب في الارض تنجس قال يغسل ثلاثا ويخرج الماء منه كل مرة فيطهر.

(۱۸۱) کیا ٹینک میں جوتا گرنے سے پانی نجس ہوجاتا ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گھر میں ایک زمین دوز ٹینک ہے جس کی لمبائی چھ فٹ، چوڑائی چار فٹ اور گہرائی آٹھ فٹ ہے ایک دن بچے کھیل رہے تھے تو ایک نے دوسرے کو جوتا مارا اور وہ جوتا ٹینکی میں گر گیا اب اس پانی کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداًومصلیاً......صورت مسئولہ میں جوتا اگر پاک ہے تو پانی نجس نہیں ہوگا اور اگر جوتا ناپاک ہے تو اس صورت میں پانی ناپاک ہوجائے گا اور اگر جوتے کا پتہ نہیں پاک ہے یا ناپاک تو باقاعدہ الأصل في الأشياء الاباحة کے تحت اس کو پاک سمجھا جائے گا اور پانی پاک ہوگا۔

لما في بدائع الصنائع(۲۰۴،۵،۱۰/۱): وقال عامة العلماء: ان كان الماء قليلا ينجس وان كان كثيراً لا ينجس لكنهم اختلفوا في الحد الفاصل بين القليل والكثير...... وقال اصحابنا ان كان بحال يخلص بعضه الى بعض فهو قليل وان كان لا يخلص فهو كثير...... فاتفقت الروايات عن اصحابنا انه يعتبر الخلوص بالتحريک وهو انه ان كان بحال لو حرک طرف منه يتحرک الطرف الاخر فهو مما يخلص وان كان لا يتحرک فهو ممالا يخلص ...... وروى عن محمدؒ انه قدره بمسجده فكان

مسجده ثمانياً فی ثمان وبه اخذ محمد بن سلمة وقيل كان مسجده عشراً فی عشر: وقيل مسح مسجده فوجد داخله ثمانياً فی ثمان وخارجه عشرا فی عشر.

وفی الدرالمختار (۱/۱۹۲): وانت خبير بأن اعتبار العشر اضبط ولا سيما فی حق من لا رأی له من العوام فلذا افتی به المتاخرون الأعلام.

وفی الدر المختار مع الشامية (۱/۱۰۵): (قاعده) الأصل فی الأشياء الإباحة.

(۱۸۲) کنویں میں اگر گمراہ عقائد رکھنے والا شخص اتر جائے تو پانی کا کیا حکم ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کنویں کے کنارے بچے کھیل رہے تھے ایک بچے نے قیمتی گھڑی پہنی ہوئی تھی اس نے اتار کر رکھ دی تا کہ کھیل میں خراب نہ ہو جائے دوسرے بچے نے اٹھا کر گھڑی کنویں میں ڈال دی، گھڑی نکالنے کیلئے کوئی شخص کنویں میں نہیں اتر رہا تھا اتنے میں ایک شخص آ گیا جو اہل تشیع میں سے تھا اس نے کنویں میں جا کر گھڑی نکال لی اب بعض لوگ کہہ رہے ہیں چونکہ شیعہ بدترین کافر ہیں ان کا پانی میں جانا خنزیر کے جانے کے برابر ہے یہ سارا پانی نجس ہے جب تک نکالا نہ جائے کنواں پاک نہیں ہوگا۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ واقعی شیعہ عقائد والے شخص کے پانی میں داخل ہونے سے پانی ناپاک ہو جائے گا؟ اب اس کنویں کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلياً......نجاست کی دو قسمیں ہیں: ۱۔نجاست حقیقیہ (جیسے پیشاب پائخانہ خون وغیرہ)، ۲۔نجاست حکمیہ (جیسے بے وضو ہونا یا حالت جنابت میں ہونا)۔ نجاست حقیقیہ کے گرنے سے کنواں ناپاک ہو جاتا ہے، نجاست حکمیہ سے کنواں ناپاک نہیں ہوتا۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں کنویں میں اترنے والے شخص کے بدن یا کپڑوں پر اگر نجاست لگی ہوئی تھی تو کنویں کا پانی نجس ہو گیا ہے، اگر اس کے بدن یا کپڑوں میں نجاست لگی ہوئی نہ تھی تو کنویں کا پانی پاک ہے البتہ احتیاطاً بیس ڈول پانی نکال دیا جائے۔

لمافی البحرالرائق(۱/۱۷۷): ثم رأيت بعد هذا العلامة ابن امير حاج فی شرح منية المصلی صرح بما ذكرته وقال: الماء المستعمل هو الماء الذی لاقی الرجل الذی زال حدثه فيجب نزح جميع الماء علی رواية نجاسة الماء المستعمل ولا يجب نزح شئی منها علی رواية طهارته بل هو باق علی طهوريته، وقد عرفت ان رواية الطهارة هی المختارة اهـ. فعلی هذا قولهم صار الماء مستعملا معناه صار الماء الملاقی للبدن مستعملا لا أن جميع ماء البئر صار مستعملا.

وفی الشامية(۱/۲۱۳): (قوله كآدمی محدث) ای انه ينزح فيه أربعون كما عزاه فی التتارخانية إلی فتاوی الحجة ...... وفی شرح الوهبانية: والتحقيق النزح للجميع عند الامام والثانی علی القول بنجاسة الماء المستعمل، وقيل أربعون عنده، ومذهب محمد أنه يسلبه الطهورية، وهو الصحيح

عند الشيخين فينزح منه عشرون ليصير طهوراً وتمامه فيه، والمراد بالمحدث مايشمل الجنب.

وفيه ايضاً(۱/۲۱۴): واستشكل في البدائع نزح العشرين بأن الماء المستعمل طاهر فلم يضر مالم يغلب على المطلق كسائر المائعات، ثم قال: ويحتمل ان يقال طهارته غير مقطوع بها للخلاف فيها، بخلاف سائر المائعات، فينزح أدنى ماورد به الشرع وذالک عشرون احتياطاً.

(۱۸۳) کبوتر وغیرہ کے کنویں میں گرنے کے بعد نہ ملنے پر کنویں کی پاکی کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارا ایک کنواں ہے جس سے ہم پانی لیتے رہتے ہیں اس کنویں میں دو کبوتر گر گئے باوجود تلاش کرنے کے وہ نہیں ملے تو اس کنویں سے پانی پینا جائز ہے یا نہیں؟ نیز اس کنویں کو کس طرح پاک کریں گے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......کنویں میں اگر حیوان گر کر پھول جائے یا پھٹ جائے خواہ حیوان چھوٹا ہو یا بڑا، اس کے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ گری پڑی نجس چیز کو پہلے نکال لیا جائے پھر اس کے بعد کنویں میں موجود سارا پانی نکال لیا جائے اور اگر کنواں چشمے دار ہو تو دو سو ڈول وجوباً اور تین سو ڈول استحباباً نکال لئے جائیں اب مذکورہ بالا صورت میں یہ بات تو ظاہر ہے کہ کبوتر پھول و پھٹ گئے ہوں گے لیکن چونکہ تلاش کرنے کے بعد نہیں ملے جبکہ پاکی کیلئے نجس چیز کا پہلے، نکالنا ضروری ہے اس لئے فی الحال اس کنویں کو چھوڑ دیا جائے حتیٰ کہ اس بات کا یقین ہو جائے کہ وہ پانی میں حلول کر کے کیچڑ بن گئے ہوں گے بعض فقہاء کرام نے اس مدت کا اندازہ چھ ماہ سے لگایا ہے لہٰذا اتنی مدت گزر جانے کے بعد اس کنویں کا سارا پانی اور اگر کنواں چشمے دار ہو تو تین سو ڈول نکال لئے جائیں تو وہ کنواں پاک ہو جائے گا اس سے قبل اس کنویں سے پانی پینا جائز نہیں ہے۔

لمافي الشامية (۱/۲۱۲): أنه لابد من إخراج عين النجاسة كلحم ميتة وخنزير اهـ ح قلت فلو تعذر ايضاً ففي القهستاني عن الجواهر. لووقع عصفور فيها فعجزوا عن اخراجه فما دام فيها فنجسة فتترک البئر مدة يعلم انه استحال وصار حمأة وقبل مدة ستة اشهر.

وفي الفقه الاسلامي(۱/۲۹۱): وينزح مابين اربعين دلواً الى ستين دلواً اذا كان الحيوان ذا حجم متوسط مثل الحمامة والدجاجة ......وفي الاثنين من هذه الحيوانات ينزح الماء كله.

وفي الدر المختار(۱/۲۱۴،۲۱۵): (وان تعذر) نزح كلها لكونها معينا (فبقدر ما فيها) وقت ابتداء النزح قاله الحلبي (يؤخذ ذلک بقول رجلين عدلين لهما بصارة بالماء) به يفتي وقيل يفتي بمائة إلى ثلثمائة وهذا ايسرو ذاک احوط.

(۱۸۴) جوتے کنویں میں گرنے سے کنویں کی ناپاکی کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کے جوتے کنویں میں گر گئے جن کے پاک یا ناپاک ہونے کے بارے میں معلوم نہیں، تو ایسی صورت میں یہ کنواں ناپاک ہو گیا یا نہیں؟ کیا اس سے وضو وغیرہ کیلئے پانی لے سکتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورتِ مسئولہ میں اگر جوتوں کے بارے میں ناپاک ہونے کا یقین یا ظن غالب ہو تو کنواں ناپاک شمار ہوگا، اور اگر ان کے پاک ہونے کا یقین یا ظن غالب ہو تو کنواں پاک شمار ہوگا، اور اگر دونوں جانب کسی بارے میں یقین یا ظن غالب نہ ہو تو یہ کنواں پاک شمار ہوگا اس کا پانی استعمال کرنا صحیح ہے۔

لمافی الهندية (١/٢٥): **ويجوز للرجل ان يتوضأ من الحوض الذی يخاف ان يكون فيه قذر ولا يتقين به وليس عليه ان يسأل عنه ولا يدع التوضؤمنه حتى يتقين ان فيه قذراً للاثر.**

وفی ردالمحتار (١/١٥١): **فی التاتارخانية من شک فی انائه او ثوبه او بدنه اصابته نجاسة اولا فهو طاهر مالم يستيقن، وكذا الآبار والحياض والحباب الموضوعة فی الطرقات ويستقی منها الصغار والكبار والمسلمون والكفار.**

(۱۸۵) کنویں میں نجاست گرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گھر کے قریب ایک کنواں ہے جس سے گاؤں کے لوگ پانی لیتے ہیں ایک دن اس کنویں میں ایک بکری گر گئی اس کو تو ہم نے زندہ نکال لیا لیکن نکالتے وقت اس نے کنویں میں پیشاب کر دیا اب لوگ اس سے پانی نہیں لیتے اور دوسری جگہ سے پانی لانے میں دشواری بہت ہے سارے لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ مفتی صاحب سے مسئلہ معلوم کر لیں جیسے وہ فرمائیں گے ویسے عمل کریں آپ بتائیں کہ یہ کنواں ناپاک ہوا ہے یا نہیں؟ اگر ناپاک ہے تو پاک کرنے کا کیا طریقہ ہوگا جبکہ پانی نکالنا بہت ہی مشکل ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......(۱)۔بکری کا پیشاب نجس ہے، کنویں میں نجاست گرنے سے سارا پانی ناپاک ہوگا لہٰذا صورت مسئولہ میں کنواں ناپاک ہو چکا ہے پاک کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کا سارا پانی نکالا جائے۔

(۲)۔اگر سارا پانی نہ نکل سکے تو پھر دو عادل آدمی جو پانی کے معاملے میں مہارت رکھتے ہوں، ان کو بلایا جائے، وہ جتنا اندازہ لگائیں اسی مقدار میں پانی نکالا جائے۔

(۳)۔البتہ اگر اس پر بھی عمل درآمد مشکل ہے مثلاً ماہرین ملتے نہیں یا ان کے قول پر عمل کرنے سے پانی نکلوانے پر زرِ کثیر لازم آئے گا تو ایسی صورت میں تین سو ڈول تک نکالنے سے کنواں پاک ہوگا۔لیکن احتیاط بہرحال دو ماہر عادل آدمیوں کے قول پر عمل کرنے کی صورت

میں ہے۔

لمافي البحر الرائق(۱/۱۰۲): قوله (وبول مايوكل نجس) انما ذكرها هنا وان كان محلها باب الانجاس لبيان أنه اذا وقع في البئر نجس ماء ها، وهذا عند ابي حنيفة وابي يوسف، و قال محمدٌ طاهر، فلا ينزح الماء من وقوعه الا اذا غلب على الماء فيخرج من أن يكون طهوراً.

وفيه ايضاً (۱/۲۱٦):وقوله (ومائتان لولم يمكن نزحها)............... وعن أبي نصر أنه يوتى برجلين لهما بصارة بأمر الماء فاذا قدراه بشئ وجب نزح ذالک القدر وهو الاصح والاشبه بالفقه...... والافتاء بما عن محمد اسهل على الناس والعمل بما عن أبي نصر أحوط.

وفي الدرالمختار(۱/۲۱۱): اذا وقعت نجاسة..... ولو مخففة او قطرة بول..... ينزح كل مائها.

وفي الشامية تحته:(قوله او قطرة بول) أى ولو بول مأكول اللحم.

وفي الدرالمختار(۱/۲۱۴): (وان تعذر) نزح كلها لكونها معيناً (فيقدر ما فيها) وقت النزح قاله الحلبي (يؤخذ ذالک بقول رجلين عدلين لهما بصارة بالماء) به يفتي وقيل يفتي بمائة الىٰ ثلثمائة وهذا أيسر وذاک احوط:

وفي الشامية تحته: (قوله به يفتي) وهو الاصح، كافي ودرر. وهو الصحيح، وعليه الفتوى. ابن كمال: وهو المختار: معراج. وهو الاشبه بالفقه: هداية:

..........علىٰ انهم قالوا ان محمداً أفتي بما شاهد في آبار بغداد فانها كثيرة الماء وكذا ماروى عن الامام من نزح مائة في مثل آبار الكوفة لقلة مائها فيرجع الى القول الأول لأنه تقدير ممن له بصارة وخبرة بالماء في تلک النواحي لالكون ذالک لازماً في آبار كل جهة.

(۱۸٦) پاکی حاصل کرنے سے جھیل ناپاک نہیں ہوتی

سوال.....کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ہاں ایک بڑی سی جھیل ہے جس میں ہم لوگ گرمیوں میں ظہر سے پہلے غسل کرتے ہیں اور پھر نماز پڑھتے ہیں، چند دن پہلے ایک صاحب ہمارے علاقے میں آئے اور ہمیں دیکھ کر کہنے لگے کہ آپ لوگوں کا اس طرح غسل کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ آپ لوگ مٹی سے استنجاء کرتے ہیں جس کے بعد جھیل پر جا کر غسل کرتے ہیں جس سے سارا پانی ناپاک ہوجاتا ہے لہٰذا آپ لوگوں کی نماز بھی نہیں ہوتی، کیا یہ بات صحیح ہے اگر صحیح ہے تو ہمیں کافی عرصہ ہوگیا اسی طرح نمازیں پڑھتے ہوئے، ہماری پہلی نمازوں کا کیا بنے گا؟ کیا انہیں دوبارہ ادا کرنا چاہیے؟ جلد از جلد جواب دے کر ہماری اس پریشانی کو دور فرمائیں اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں مٹی سے استنجاء کرنے کے بعد اگر دہ دردہ سے کم مقدار پانی میں غسل کیا جائے تو وہ پانی ناپاک ہوجاتا ہے لیکن اگر پانی کی مقدار دہ دردہ سے زیادہ ہو جیسا کہ آپ کے سوال سے ظاہر ہورہا ہے تو ایسا پانی ناپاک نہیں ہوتا۔جھیل میں غسل کرنے کے بعد آپ لوگوں کی نماز کی ادائیگی صحیح ہے لہٰذا نمازوں کے دوبارہ لوٹانے کی بھی ضرورت نہیں۔

لمافی الهندية (۱/۴۸): ثم الاستنجاء بالاحجار انما يجوز اذا اقتصرت النجاسة على موضع الحدث فاما اذا تعدت موضعها بان جاوزت الشرج اجمعوا على ان ماجاوز موضع الشرج من النجاسة اذاكانت اكثر من قدرالدرهم يفترض غسلها.

وفی ردالمحتار (۱/۳۳۷): السنة هو الاستنجاء بالاشياء الطاهرة من الاحجار والامداد والتراب والخرق البوالی...... قال فی السراج ولم يرد به حقيقة الانقاء بل تقليل النجاسة اهـ ولذا يتنجس الماء القليل اذا دخله المستنجی.

(۱۸۷) تالاب کا گندا پانی صاف کرنے کے بعد بھی ناپاک رہے گا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں کے قریب ایک بڑا تالاب ہے جس میں پورے گاؤں کا گندا پانی جمع ہوتا ہے۔اب حکومت نے اس پر مشینیں لگائی ہیں جو پانی کو صاف کرتی ہیں۔پھر اس پانی کو ٹینکروں کے ذریعے دوسرے مقامات پر منتقل کیا جاتا ہے وہاں کے لوگ اس پانی کو استعمال کرتے ہیں آیا یہ پانی پاک ہے یا ناپاک اس کا استعمال کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... نجاست کی ماہیت اگر تبدیل ہوجائے تو انقلاب ماہیت کی وجہ سے وہ پاک ہوجاتی ہے انقلاب ماہیت کا مطلب یہ ہے کہ پہلی والی حقیقت معدوم ہوکر نئی حقیقت بن جائے، نہ پہلی حقیقت و ماہیت باقی رہے نہ اس کا نام باقی رہے نہ اس کی صورت وکیفیت اور نہ اس کے خواص وآثار باقی رہیں بلکہ سب چیزیں نئی ہوجائیں۔جیسے گدھا وغیرہ نمک کی کان میں گر کر نمک بن جائے، اور شراب سے سرکہ بنالیا جائے۔

صورت مسئولہ میں چونکہ انقلاب ماہیت کی کوئی صورت نہیں ہے بلکہ گندے پانی کے متعفن اور ضرر رساں اجزاء کو نکال کر پانی کو صاف کیا گیا ہے اور جو اجزاء بچے ہیں وہ اسی پانی کے اجزاء ہیں لہٰذا وہ بھی نجس اور ناپاک رہیں گے۔

لمافی الشامية (۱/۳۱۵): (و) يطهر (زيت) تنجس (بجعله صابونا) به يفتى للبلوى الخ الدر المختار وقال الشامی تحته: (قوله ويطهر زيت الخ) قد ذكر هذه المسئلة العلامة قاسم فی فتاواه ...... ثم هذه المسئلة قد فرعوها على قول محمد بالطهارة بانقلاب العين الذی عليه الفتوى واختاره اكثر المشائخ خلافا لابی يوسف كمافی شرح المنية والفتح وغيرهما. وعبارة المجتبى: جعل الدهن النجس فی

صابون يفتى بطهارته لانه تغير والتغير يطهر عند محمد، ويفتى به للبلوى اهـ وظاهره ان دهن الميتة كذلك لتعبيره بالنجس دون المتنجس الا ان يقال هو خاص بالنجس لان العادة فى الصابون وضع الزيت دون بقية الادهان تأمل ثم رايت فى شرح المنية مايؤيد الاول حيث قال: وعليه يتفرع مالو وقع انسان او كلب فى قدر الصابون فصار صابونا يكون طاهرا لتبدل الحقيقة اهـ.

ثم اعلم ان العلة عند محمد هى التغير وانقلاب الحقيقة وانه يفتى به للبلوى كماعلم ممامرّ، ومقتضاه عدم اختصاص ذلك الحكم بالصابون، فيدخل فيه كل ما كان فيه تغير وانقلاب حقيقة وكان فيه بلوى عامة ....

قلت: لكن قد يقال: ان الدبس ليس فيه انقلاب حقيقة لانه عصير جمد بالطبخ، وكذا السمسم اذا درس واختلط دهنه باجزائه ففيه تغير وصف فقط، كلبن صار جبنا، وبر صار طحينا، وطحين صار خبزا، بخلاف نحو خمر صار خلا، وحمار وقع فى مملحة فصار ملحا، وكذا دردى خمر صار طرطيرا، وعذرة صارت رمادا او حمأة، فان ذلك كله انقلاب حقيقة الى حقيقة اخرى لامجرد انقلاب وصف كما سياتى، والله اعلم.

وايضا فى الدر المختار(۱/۳۲۶): (لا) يكون نجسا (رما دقذر) والالزم نجاسة الخبز فى سائر الامصار (و) لا(ملح كان حمارا) او خنزيرا ولا قذر وقع فى بئر فصار حمأة لانقلاب العين، به يفتى.

وقال ابن عابدين الشامى رحمه الله تحته: (قوله كان حمارا او خنزيرا) افاد ان الحمار مثال لا قيداحترازى، واشار باطلاقه الى انه لا يلزم وقوعه وهو حى، فانه لو وقع فى المملحة بعد موته فهو كذلك كمافى شرح المنية الخ.

وفى الدر المختار(۱/۱۸۰): (و) يرفع (بماء ينعقد به ملح لابماء) حاصل بذوبان (ملح) لبقاء الاول على طبيعته الاصلية، وانقلاب الثانى الى طبيعة الملحية. وقال الشامى رحمه الله تحته (قوله لبقاء الاول الخ)...... وقال الزيلعى : ولا يجوز بماء الملح، وهو ما يجمد فى الصيف ويذوب فى الشتاء عكس الماء، و اقره صاحب البحر والعلامة المقدسى، ومقتضاه انه لا يجوز بماء الملح مطلقا: اى سواء انعقد ملحا ثم ذاب ام لا؟ وهو الصواب عندى اهـ ملخصا.

(۱۸۸) نالے کے ذریعے نہر سے آنے والے صاف پانی کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں کے قریب ایک نالہ ہے جس میں شہر کا

گندہ پانی آ تا رہتا ہے اب کبھی کبھی اس کے ذریعے لوگ نہر کا پانی اپنے کھیتوں تک لے جاتے ہیں جب نہر والا پانی اس نالے میں آ جاتا ہے تو یہ پانی بالکل صاف ہوتا ہے حالانکہ اس میں گٹروں والا پانی بھی مل رہا ہوتا ہے تو بعض لوگ اس پانی کو پیتے اور وضو کرتے ہیں تو کیا ایسے پانی سے وضو کرنا اور اس کو پینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں جس پانی کا ذکر ہے وہ پانی ماء جاری کے حکم میں ہے ماء جاری کے متعلق مسئلہ یہ ہے کہ جب تک اس کے اوصاف ثلثہ یعنی رنگ، بو اور مزہ میں سے کوئی ایک تبدیل نہ ہو جائے تو وہ پاک ہے۔اس سے وضو کرنا اور اس کو استعمال میں لانا جائز ہے۔جیسا کہ عالمگیری میں اس کی صراحت ہے "**ماء النهر او القناة اذا احتمل عذرة فاغترف انسان بقرب العذرة جاز والماء طاهر مالم يتغير طعمه أو لونه أو ريحه**"(عالمگیری، ۱/۱۷)

لمافی مجمع الانهر (۱/۴۸): فأمّا أن يكون الماء جارياً أو راكداً فان كان جارياً إن كانت النجاسة غير مرئية فإنه لا يتنجس مالم يتغير طعمه الخ.

وفي قاضيخان (۱/۳): (ماء النهر أو القناة) **اذا احتمل عذرةً فاغترف انسان بقرب العذرة جاز والماء طاهر مالم يتغير طعمه أو لونه أو ريحه بالنجاسة.**

وفي عالمگيرى (۱/۱۷): وفي النصاب والفتوىٰ في الماء الجارى أنه **لا يتنجس مالم يتغير طعمه أو لونه أو ريحه** من النجاسة.

وإن كانت العذرة على السطح في مواضع متفرقة ولم تكن على رأس الميزاب لا يكون نجسا وحكمه حكم الماء الجارى......

ماء النهر أو القناة اذا احتمل عذرة فاغترف انسان بقرب العذرة جاز والماء طاهر مالم يتغير طعمه أو لونه او ريحه......

(۱۸۹) ایسے تالاب سے وضو کرنا جس میں گندگی کے اثرات ظاہر ہوں

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ہاں ایک تالاب ہے جس میں لوگ جانوروں کو پانی پلاتے ہیں، پانی پیتے وقت جانور اس میں پیشاب وغیرہ بھی کرتے ہیں لیکن یہ سب ایک طرف ہوتا ہے دوسری طرف سے کوئی جانور نہ تو پانی پیتا ہے اور نہ پیشاب وغیرہ کرتا ہے البتہ اس طرف بھی گندگی کے اثرات پائے جاتے ہیں مثلاً پانی میں بدبو وغیرہ کیا ایسے تالاب سے وضو کرنا جائز ہے؟اس تالاب کی لمبائی تقریباً چالیس فٹ اور چوڑائی بیس فٹ ہے۔قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر پانی کے تین اوصاف (رنگ، بو، ذائقہ) میں سے کوئی ایک وصف نجاست کی وجہ سے تبدیل ہو جائے تو وہ پانی ناپاک شمار ہوتا ہے اگر چہ اس کی مقدار کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو،لہٰذا مذکورہ تالاب کا پانی ناپاک ہے اس سے وضو

کرنا جائز نہیں ہے۔

لمافی الهندية (١/١٨): الماء الراكد اذا كان كثيرا فهو بمنزلة الجارى لا يتنجس جميعه بوقوع النجاسة فى طرف منه الا ان يتغير لونه او طعمه اوريحه و على هذا اتفق العلماء وبه اخذ عامة المشائخ كذا فى المحيط.

وفى الدرالمختار (١/١٨٥): (وبتغير احد اوصافه) من لون اوطعم اوريح (ينجس) الكثيرولو جارياً اجماعاً، اما القليل فينجس وان لم يتغير.

(١٩٠) اگر لائن کے پانی میں سخت بدبو آ رہی ہو، تو کیا حکم ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ گزشتہ روز ہمارے گھر جو لائن کا پانی آیا وہ دیکھنے میں تو صاف ہے لیکن اس میں سے گٹر کے پانی کی سخت بو آ رہی ہے، ہمارے گھر گزشتہ ایک ہفتہ سے میٹھا پانی بالکل نہیں ہے، آیا اب ہم اس پانی کو کسی اور استعمال میں لا سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اگر اس پانی کے بارے میں آپ کا غالب گمان یہ ہے کہ اس پانی میں گٹر کا پانی مل گیا ہے، جبکہ گٹر کے پانی کا پینے کے پانی کی لائن کے ساتھ مل جانا ممکن بھی ہو اور اس طرح کے واقعات ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں تو پھر یہ پانی ناپاک ہے اس کا استعمال درست نہیں ہے، اور اگر اس پانی کے ساتھ گٹر کے پانی کے مل جانے کا غالب گمان نہیں ہے محض شک ہے تو پھر یہ پانی پاک ہے اور اس پانی کا استعمال کرنا ہر طرح سے درست ہے اور اس شک کا کوئی اعتبار نہیں ہے کیونکہ پانی میں اصل طہارت ہے لہٰذا جب تک اس کے ناپاک ہونے کا یقین یا غالب گمان نہ ہو اسے ناپاک نہیں کہا جائے گا اور اس پانی کے بارے میں مزید تحقیق وجستجو کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

لمافى الولوالجية (١/٣٩): الماء اذا انتن وهو كثير ان علم بوقوع النجاسة او جيفة فيه يتنجس الماء

وفى ردالمحتار (١/١٨٦): (قوله لالو تغير الخ) أى لاينجس لو تغير فهو عطف على قوله وينجس لاعلى قوله بموت فتامل ممعنا. (قوله فلو علم الخ) صرح به لزيادة التوضيح والافهو داخل تحت قول المصنف وبتغير احد اوصافه بنجس. (قوله ولو شك الخ) اى ولايلزم السوال بحر، وفيه عن المبتغى بالغين وبرؤية آثار اقدام الوحوش عند الماء القليل لايتوضاء به ولو مرسبع بالركية وغلب على ظنه شربه منها تنجس والافلا اهـ، وينبغى حمل الاول على ما اذا غلب على ظنه ان الوحوش شربت منه بدليل الفرع الثانى والافمجرد الشك لايمنع لما فيه الاصل انه يتوضأ من الحوض الذى يخاف قذرا ولا يتيقنه وينبغى حمل التيقن المذكور على غلبة الظن و الخوف على الشك أو الوهم كما لا يخفى اهـ.

فصل فی احکام الجنب والمعذور

(جنبی اور معذور سے متعلق مسائل کا بیان)

(۱۹۱) حالت جنابت میں کھانے پینے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کو غسل جنابت کی حاجت ہو اور وہ غسل کو مؤخر کر کے اسی حالت میں کھاتا پیتا رہے تو کیا ایسی حالت میں کھانا پینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......جنابت کی حالت میں کھانا پینا جائز ہے۔البتہ مستحب یہ ہے کہ پہلے ہاتھ دھوئے اور کلی کر لے۔

لمافی الهندية (۱/۱۶): وان أراد أن يأكل اويشرب فينبغي أن يتمضمض ويغسل يديه.

وفی رد المحتار (۱/۱۷۵):(قوله بعد غسل يد وفم) اما قبله فلا ينبغي لانه يصير شاربا للماء المستعمل وهو مكروه تنزيها ويده لاتخلو عن النجاسة فينبغي غسلها ثم يأكل.بدائع وفی الخزانة وان ترک لايضره.

(۱۹۲) حالت جنابت یا ہمبستری میں بچے کو دودھ پلانا

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص عورت سے ہمبستری کر رہا تھا کہ اچانک بچے نے رونا شروع کر دیا عورت نے اسی حالت میں بچے کو دودھ پلانا شروع کر دیا، تو کیا شرعاً جماع کی حالت میں بچے کو دودھ پلانا درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......درست ہے۔

لمافی المبسوط للسرخسی(۱/۷۰): (واذا عرق الجنب أوالحائض فی ثوب لم يضره)...... لانه ليس على بدن الانسان الجنب والحائض نجاسة عينية فهوواعضاء المحدث سواءٌ.

وفی ردالمحتار (۱/۲۹۲): ولايكره طبخها ولااستعمال مامسته من عجين أوماء أونحوهما.

(۱۹۳) جنبی کیلئے بال اور ناخن کاٹنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اکثر لوگوں میں یہ مشہور ہے کہ جس کے اوپر غسل فرض

ہو، اس کو حالت جنابت میں ناخن اور بال نہیں کاٹنے چاہئیں، کیا یہ بات صحیح ہے یا اس حالت میں ناخن بال کاٹنے کی گنجائش ہے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب دے کر مشکور ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... جس آدمی پر غسل واجب ہو اس کیلئے ناخن اور بال کاٹنا جائز ہے، البتہ اولیٰ اور بہتر یہ ہے کہ طہارت کی حالت میں ان امور سے فارغ ہو جانا چاہیے۔

لمافی البخاری (۱/۴۲): قال عطاء: یحتجم الجنب ویقلم أظفاره ویحلق رأسه و ان لم یتوضأ

وفی الهندیة (۵/۳۵۸): حلق الشعر حالة الجنابة مکروه وکذا قص الاظافیر کذا فی الغرائب.

وفی معارف السنن (۱/۴۰۰): ویجوز للجنب جمیع المعاملات اللتی یفعلها الطاهر الغیر الجنب ...... ماعدا دخول المسجد و الطواف وقرأة القرآن.

(۱۹۴) ناپاکی کی حالت میں دعا وتسبیح کرنا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کو احتلام ہو جائے تو ناپاکی کی حالت میں نیند سے بیدار ہونے کی دعا، بیت الخلاء میں داخل ہونے اور نکلنے کی دعا پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... حالت جنابت (خواہ وہ احتلام کی وجہ سے ہو یا کسی اور وجہ سے) میں ہر طرح کی دعا پڑھنا، ذکر کرنا تسبیح پڑھنا جائز ہے، البتہ باوضوء ہو کر ذکر وتسبیح کرنا افضل ہے خواہ حالت جنابت ہو یا نہ ہو۔

لمافی الطحطاوی علی الدر (۱/۱۵۰): قال فی البحر وأما الاذکار فالمنقول اباحتها مطلقا ویدخل فیها اللهم اهدنا واللهم انا نستعینک علی ماعلیه الفتوی وفی الهدایة وغیرها استحباب الوضوء لذکر الله تعالیٰ وترکه خلاف الاولی وهو مرجع کراهة التنزیه.

وفی الدر المختار (۱/۲۹۳): (ولاباس) لحائض وجنب (بقراءة ادعیة و مسها وحملها وذکر الله تعالیٰ و تسبیح).

(۱۹۵) ناپاکی کی حالت میں قرآن مجید کو چھونا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مرتبہ ایک امام صاحب سے ناپاکی کی حالت میں قرآن مجید کو ہاتھ لگانے کے متعلق مسئلہ دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ ناپاکی کی حالت میں قرآن پاک کے الفاظ کو ہاتھ لگانا جائز نہیں لیکن خالی جگہ اور جلد کو ہاتھ لگا سکتے ہیں۔ کیا امام صاحب کی بات صحیح ہے؟ بصورت دیگر صحیح مسئلہ بتا کر میری رہنمائی فرمائیں میں کافی الجھن میں مبتلا ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......ناپاکی کی حالت میں، چاہے انسان حالت جنابت میں ہو یا حالت حدث اصغر میں یا حالت حیض میں ہو، ناپاکی کی ان تمام صورتوں میں مصحفِ قرآن کو یعنی قرآن مجید کے نسخے کو ہاتھ لگانا جائز نہیں ہے چاہے اس کے الفاظ ہوں یا اس کی جلد یا وہ حصہ جہاں کچھ نہیں لکھا ہے ہاں اگر قرآن کی آیات کسی دوسری چیز پر لکھی ہوئی ہیں مثلاً کاغذ وغیرہ پر، تو اس صورت میں الفاظ قرآن کو ہاتھ لگانا منع ہے باقی کاغذ وغیرہ کا وہ حصہ جہاں کچھ نہیں لکھا ہوا ہے۔ وہاں ہاتھ لگا سکتے ہیں اور ناپاکی کی حالت میں مصحف قرآن کو بھی غلاف یا کسی کپڑے سے ہاتھ لگانا جائز ہے مگر غلاف یا کپڑا ایسا ہونا چاہیے جو کہ اس قرآن سے بالکل جدا ہو، اگر کوئی کپڑا وغیرہ قرآن کے ساتھ لگا ہوا ہے اور وہ جدا نہیں ہوتا تو اس کو بھی ہاتھ لگانا جائز نہیں جہاں تک رہی اس مسئلہ میں آپ کے امام صاحب کی بات تو ممکن ہے ان کی مراد مصحف قرآن نہ ہو بلکہ کاغذ وغیرہ پر لکھا ہوا مراد ہو، اور اگر ان کی مراد مصحف قرآن ہے تو ان کی بات ٹھیک نہیں ہے۔

لما فی فتح القدیر (۱/۱۶۹): (قوله وغلافه ما یکون متجافیا عنه) ای منفصلا وهو الخریطة خلافا لمن قال هو الجلد او الکم لان الجلد الملصق تابع له حتی یدخل فی بیعه بغیر شرط فلمسه حکم مسه.

وفی الهندیة(۱/۳۸،۳۹): (ومنها) حرمة مس المصحف لا یجوز لهما وللجنب والمحدث مس المصحف الا بغلافٍ متجاف عنه کالخریطة والجلد الغیر المشرز لا بما هو متصل به هو الصحیح هکذا فی الهدایة وعلیه الفتوی کذا فی الجوهرة النیرة والصحیح منع مس حواشی المصحف والبیاض الذی لا کتابة علیه هکذا فی التبیین.

وفی الشامیة مع الدر (۱/۲۹۳): (ومسه) ولو مکتوبا بالفارسیة فی الاصح(الا بغلافه) المنفصل کمامر (قوله ومسه) أی القران ولو فی لوح او درهم او حائط لکن لا یمنع الامن مس المکتوب، بخلاف المصحف فلا یجوز مس الجلد وموضع البیاض منه وقال بعضهم یجوز وهذا اقرب الی القیاس، والمنع اقرب الی التعظیم کما فی البحر أی والصحیح المنع کما نذکره.......... (قوله الا بغلافه) المنفصل ای کالجراب والخریطة دون المتصل کالجلد المشرز هو الصحیح وعلیه الفتوی، لان الجلد تبع له سراج، وقدمنا ان الخریطة الکیس.

(۱۹۶) جنبی میت کو غسل کتنی بار دیا جائے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت اگر جنبی ہو تو اس کو دو مرتبہ غسل دیا جائے گا یا ایک ہی غسل کافی ہے عام میت کی طرح۔ براہ مہربانی قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......زندگی کی تمام عبادات ومعاملات موت کے آنے پر ساقط ہو جاتے ہیں۔ اور میت اپنی بقاء والی زندگی کے ابتدائی مرحلہ میں داخل ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے میت کو تکریم وتعظیم دینے کیلئے غسل اور صاف لباس دیا جاتا ہے۔ لہٰذا مذکورہ مسئلہ میں جنبی میت

سے وجوب کا حکم ساقط ہوکر ایک یعنی میت والا غسل دیا جائے گا۔

لما في المحيط البرهاني (۵۵/۳): هما يقولان: الغسل الواجب بالجنابة سقط بالموت، لأن الغسل كان واجب عليه. فسقط بالموت لعجزه.

وفي الدر المختار (۱۹۷/۲): (وان زاد عليها أو نقص جاز) اذ الواجب مرة (ولايعاد غسله ولا وضوءه بالخارج منه) لأن غسله ماوجب لرفع الحدث لبقائه بالموت بل لتنجسه بالموت كسائر الحيوانات الدموية الا ان المسلم يطهر بالغسل كرامة.

وفي الشامية تحته: (قوله وان زاد) أي عند الحاجة لكن ينبغي ان يكون وتراً. ذكره في شرح مختصر...... (قوله جاز) أي صح و كره بلاحاجة لانه اسراف او تقتير.

(۱۹۷) طہارت وغیرہ سے معذور شخص کے وضو اور نماز کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ایک جاننے والے بہت زیادہ بیمار ہیں انہیں ہر وقت پیمپر لگا ہوا ہوتا ہے اور پیشاب کیلئے تھیلی لگی ہوئی ہوتی ہے۔ کئی بیٹے ہیں جو کہ مالی لحاظ سے بہت بہتر ہیں، مگر خاص خیال نہیں رکھتے انہیں نماز پڑھنے میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ براہ کرم اس حالت میں ان کیلئے نماز پڑھنے کا طریقہ بتلا دیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......صورتِ مسئولہ میں دو شقیں ہیں:

پہلی شق معذور شخص کی نماز پڑھنے کے بیان میں ہے...... ایسا شخص جسے پیشاب کے قطرے تسلسل کے ساتھ آتے ہوں کہ فرض نماز کا پورا وقت اس میں گزر جائے یا جس کا پیٹ جاری ہو جائے یا کوئی اور زخم جو مستقل رستا رہے۔ شریعت کی اصطلاح میں معذور کہلاتا ہے۔ اور صورت مسئولہ میں مریض شخص جسے پیشاب کی تھیلی لگی ہوئی ہے۔ شرعاً یہ بھی معذور ہی کے حکم میں ہے اور اس قسم کے معذور کا حکم یہ ہے کہ ہر وقت کی نماز کیلئے ابتداء دخول وقت میں وضو کرا دیا جائے اور اسی حالت میں نماز پڑھ لیں۔ کپڑے وغیرہ دھونے کی کوئی ضرورت نہیں، اسی طرح اگر پیمپر دور کرنے میں مشقت زیادہ ہو تو اسی حالت میں نماز پڑھ لے۔

دوسری شق نماز پڑھنے کے طریقے کے بیان میں ہے...... اگر مریض وضو کرنے پر قادر ہو یا کوئی اور شخص معاونت کرنے والا موجود ہو جیسے خادم اور اس کی اولاد وغیرہ تو یہ لوگ مریض کو وضو کرائیں اور پھر مریض قبلہ رُخ بیٹھ کر کہ اس کے پاؤں قبلہ رُخ ہوں سر کے اشارے سے نماز پڑھ لے۔ اگر بیٹھنا ممکن نہ ہو تو کم از کم تکیہ رکھ کر تھوڑا سا اونچا کر دیں۔ اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو دائیں کروٹ پر لیٹ کر کہ چہرہ قبلہ کی طرف ہو نماز پڑھ لے۔ اور اگر زیادتی مرض کی وجہ سے مریض وضو پر قادر نہ ہو تو تیمم کرا کے نماز اسی مذکورہ بالا طریقے پر پڑھ لے۔ اور تیمم کی نیت مریض پر لازم ہوگی۔

لمافي الهندية (۱۳۶/۱): وان تعذر القعود أومأ بالركوع والسجود مستلقيا على ظهره وجعل رجليه

الی القبلة، وینبغی ان یوضع تحت راسه وسادة حتی یکون شبیه القاعد لیتمکن من الایماء بالرکوع والسجود، وان اضطجع علی جنبه ووجهه الی القبلة وأو مأ جاز والأول اولیٰ.

وفی الشامیة مع الدر (۱/۲۳۳): من عجز عن استعمال الماء..... او لمرض یشتد او یمتد بغلبة ظن او قول حاذق مسلم ولو بتحرک اولم یجد من توضئه فان وجد ولو بأجرة مثل وله ذلک لایتیمم فی ظاهر المذهب کمافی البحر.

وفی الشامیه قوله ولو بتحرک الخ..... ولا فرق عندنا بین ان یشتد بالتحرک کالمبطون او بالاستعمال کالجدری قوله او لم یجد الخ ای او کان لا یخاف الاشتداد ولا الامتداد لکنه لا یقدر بنفسه ولم یجد من یوضئه قوله کمافی البحر حاصل مافیه انه ان وجد خادماً ای من تلزمه طاعته کعبده وولده واجیره لایتیمم اتفاقاً، وان وجد غیره ممن لو استعان به اعانه ولو زوجته فظاهر المذهب انه لا یتیمم ایضاً بلا خلاف الخ.

وفی الهندیة (۱/۴۱): المستحاضة ومن به سلس البول او استطلاق البطن او انفلات الریح او رعاف دائم او جرح لا یرقأ یتوضأون لوقت کل صلاة ویصلون بذلک الوضوء فی الوقت ما شاؤوا من الفرائض والنوافل..... ویبطل الوضوء عندخروج وقت المفروضة بالحدث السابق هکذافی الهدایة وهو الصحیح.

(۱۹۸) آپریشن کے بعد پیشاب کے قطرات کا آنا

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا پیشاب رک گیا تھا لہٰذا اس کا آپریشن کروایا ہے، آپریشن کو تقریباً پانچ چھ دن ہوگئے ہیں، اب میری حالت یہ ہے کہ پیشاب سے فارغ ہونے کے بعد بستر پر بیٹھتا ہوں یا پھر لیٹتا ہوں تو ایک دو قطرے نکل جاتے ہیں یا پھر سونے کی حالت میں نکل جاتے ہیں جس کا مجھے احساس نہیں ہوتا ابھی غبارہ بھی استعمال نہیں کر سکتا کیونکہ ابھی زخم ہیں، لہٰذا آنجناب سے عرض ہے کہ بیٹھ کر نماز ادا کرنے اور کپڑوں کے بارے میں کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ سے پہلے یہ سمجھئے کہ آپ معذور کب شمار ہوسکتے ہیں تو اس کیلئے ایک نماز کا مکمل وقت اس طرح گزر جائے کہ آپ کو وضو سے فراغت کے بعد پیشاب کے قطرات آنے کی وجہ سے اس قدر موقع نہ ملے کہ آپ فرض نماز پڑھ سکیں تو آپ معذور سمجھے جائیں گے، اور اس وقت تک معذور شمار کیے جائیں گے جب تک ایک نماز کے مکمل وقت میں ایک دفعہ بھی آپ کا عذر پایا جائے۔ اس صورت حال کے پیش نظر آپ فی الحال معذور کے حکم میں نہیں ہیں، لہٰذا ان کپڑوں میں نماز کی ادائیگی صحیح نہیں بلکہ پاک کپڑے پہن کر نماز پڑھنا ضروری ہے، البتہ اگر کھڑے ہونے سے قطرات آتے ہوں یا کسی اور وجہ سے کھڑے نہ ہوسکتے ہوں تو بیٹھ کر

نماز پڑھنا جائز ہے۔

لمافي الدر المختار (۱/۳۰۶): (وان سال على ثوبه) فوق الدرهم (جاز له ان لا يغسله ان كان لو غسله تنجس قبل الفراغ منها) أى الصلاة (وإلا) يتنجس قبل فراغه (فلا) يجوز ترك غسله هو المختار للفتوى.

وفي الدر المختار (۱/۳۰۵): (ان استوعب عذره تمام وقت صلوة مفروضة) ...... (ولو حكما) لأن الانقطاع اليسير ملحق بالعدم (وهذا شرط) العذر (في حق الإبتداء وفي) حق (البقاء كفى وجوده في جزء من الوقت) ولو مرة (وفي) حق الزوال يشترط (إستيعاب الانقطاع) تمام الوقت (حقيقة) لأنه الانقطاع الكامل......

وفي الدر المختار (۱/۳۰۷،۳۰۸): يجب رد عذره او تقليله بقدر قدرته ولو بصلاته موميا وبرده لا يبقى ذاعذر.

(۱۹۹) سجدہ کرنے سے اگر خون نکلے تو کیا ایسا شخص معذور ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کے گھٹنے میں پھوڑا ہے وہ جب بھی سجدے کیلئے گھٹنہ نیچے لگاتا ہے اس پھوڑے سے خون نکلنا شروع ہو جاتا ہے ایسی حالت میں نماز پڑھنا مشکل ہو جاتا ہے، کیا ایسا شخص معذور کے حکم میں داخل ہے کہ ایک وضو سے مکمل نماز پڑھ لے ورنہ تو نماز پڑھنا بہت مشکل ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......جیسا کہ سوال سے معلوم ہو رہا ہے کہ خون صرف سجدے میں گھٹنا ٹیکنے سے نکلتا ہے ایسا شخص معذور کے حکم میں داخل نہیں ہوتا بلکہ آپ بیٹھ کر اشارے سے نماز پڑھیں اور اگر دوران نماز کسی وجہ سے خون جاری ہو گیا تو دوبارہ نئے سرے سے وضو کرنا ہوگا۔

لمافي الدر المختار (۱/۳۰۷،۳۰۸): يجب رد عذره او تقليله بقدر قدرته ولو بصلاته موميا وبرده لا يبقى ذاعذر.

(۲۰۰) سلس البول (پیشاب کے قطرے) والے مریض کیلئے طہارت کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے کافی عرصے سے پیشاب کرنے کے بعد وقفے وقفے سے قطرے آتے ہیں کیا میں ہر مرتبہ وضو کیا کروں اور کپڑوں کو پاک کروں یا شریعت کی طرف سے اس میں کچھ چھوٹ ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اگر آپ کو یہ قطرے اس تسلسل سے آ رہے ہیں کہ درمیان میں اتنا وقفہ بھی نہیں ملتا کہ ایک وقت کی فرض نماز ادا کر سکیں۔ تو اس صورت میں آپ معذورین میں شامل ہیں۔ جن کا حکم یہ ہے کہ ہر فرض نماز کے وقت وضو کر لیا کریں۔ اور پھر اس وضو سے

اس ایک وقت میں جتنے چاہیں فرائض اورنوافل ادا کریں اور تلاوت قرآن کریم کرلیں۔ (اس ایک وقت کے درمیان میں جتنے بھی قطرے آجائیں آپ پاک ہی رہیں گے۔ بشرطیکہ کوئی اور سبب وضوکوتوڑنے کا نہ پایا جائے) یہاں تک کہ وقت ختم ہوجائے، یعنی جیسے ہی اس فرض نماز کا وقت ختم ہوگا تو آپ کا وضو بھی ختم ہوجائے گا۔ اور پھر اگلی نماز کیلئے دوبارہ وضو کرنا ہوگا۔

اور اگر یہ قطرے کپڑوں پر گرے ہوئے ہوں تو اس صورت میں یہ دیکھا جائے گا کہ وہ کس تسلسل سے نکل رہے ہیں۔ اگر اتنا بھی وقت نہ ملے کہ، اگر بالفرض نماز شروع کرنے سے پہلے کپڑے کو دھویا۔ مگر دورانِ نماز، وہ قطرے اسی طرح کپڑوں میں نکل آئیں۔ تو اس صورت میں آپ پر ان قطروں کا دھونا واجب نہ ہوگا، اگر چہ یہ قطرے مقدارِ درہم سے تجاوز ہی کیوں نہ کر جائیں۔ اور اگر آپ کو یہ گمان ہے کہ ان قطروں کو دھونے کے بعد، یہ دورانِ نماز مزید نہ نکلیں گے۔ تو اس صورت میں ان کا دھونا واجب ہے۔ اور اگر ان قطروں میں مقدارِ نماز کے برابر تسلسل نہیں ہے تو آپ معذورین میں شامل نہیں ہیں۔ اس لئے آپ کا وضو اِن قطروں سے ٹوٹ جائے گا۔ اور کپڑے بھی ناپاک ہوجائیں گے اور ان کا دھونا (جبکہ وہ مقدار درہم سے تجاوز کرجائیں) واجب ہوگا۔

وفی تنویر الابصار مع الدر (۱/۳۰۵): (وصاحب عذر من به سلس البول)بول لایمکنه امساکه ....(وان استوعب عذره تمام وقت صلاة مفروضة)بأن لایجد فی جمیع وقتها زمنا یتوضأ ویصلی فیه خالیا عن الحدث (ولوحکماً) لان الانقطاع الیسیر ملحق بالعدم........(وحکمه الوضوء)لاغسل ثوبه ونحوه (لکل فرض)اللام للوقت کمافی لدلوک الشمس (ثم یصلی)به (فیه فرضا ونفلا) فدخل الواجب بالأولیٰ (فاذاخرج الوقت بطل) أی ظهر حدثه السابق .... (وان سال علی ثوبه) فوق الدرهم (جازله أن لایغسله ان کان لوغسله تنجس قبل الفراغ منها) أی الصلاة (والا) یتنجس قبل فراغه (فلا) یجوز ترک غسله هو المختار للفتویٰ .

وفی الهندیة (۱/۴۱): المستحاضة ومن به سلس البول...... یتوضؤن لوقت کل صلاة، ویصلون بذالک الوضوء فی الوقت ماشاؤا من الفرائض و النوافل...... ویبطل الوضوء عند خروج وقت المفروضة بالحدث السابق......إذا کان به جرح سائل وقد شد علیه خرقة فأصا بها الدم أکثر من قدر الدرهم أو أصاب ثوبه ان کان بحال لوغسله یتنجس ثانیاً قبل الفراغ من الصلاة، جاز أن لا یغسله وصلی قبل أن یغسله وإلا فلا هذا هو المختار.

(۲۰۱) پیشاب کرنے کے آدھے گھنٹے بعد تک قطرے آنے والے مریض کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کو پیشاب کے بعد آدھا پونا گھنٹہ قطرے آتے ہیں بسا اوقات نماز جماعت سے نکل جاتی ہے اور بسا اوقات نماز کا وقت بھی نکل جاتا ہے اس کیلئے کیا حکم ہے؟

(۲)......اسی طرح ایک دوسرے شخص کو ہر وقت پیشاب کے قطرے آتے ہیں جس کی وجہ سے شلوار وغیرہ خراب رہتی ہے اس کیلئے کیا حکم ہے؟ تفصیل سے جواب عنایت فرما کر مشکور فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......(۱)......اگر پیشاب کے قطرے اتنے وقفے سے آتے رہتے ہیں کہ آدمی کو اتنا وقت نہیں ملتا کہ وضو کر کے فرض نماز پڑھ لے تو پھر یہ شخص معذور ہے، اور معذور ہر فرض نماز کے وقت نیا وضو کرے گا اور وقت نکلتے ہی اس کا وضو ٹوٹ جائے گا۔ اور بعد میں ہر فرض نماز کے وقت میں ایک دفعہ عذر کا پایا جانا ضروری ہے اگر مکمل وقت بغیر عذر کے گزر گیا تو پھر اس کا عذر بھی ختم ہوگیا۔ صورت مسئولہ میں یہ شخص آخری وقت تک انتظار کرے اگر پھر بھی قطرے ختم نہیں ہوئے تو وقت نکلنے سے پہلے وضو کرے اور نماز پڑھے اگر دوسرا پورا وقت بغیر عذر کے گزر گیا یعنی اس کو دوسرے پورے وقت میں قطرے نہیں آئے تو یہ شخص پڑھی ہوئی نماز اور وضو کا اعادہ کرے گا اور اگر دوسرے وقت میں بھی اس کو قطرے آ گئے تو نماز صحیح ہوگئی اعادہ لازم نہیں۔

(۲)......اگر کسی شخص نے پیشاب کے قطروں سے ناپاک شلوار وغیرہ اس لئے نہیں دھوئی کہ نماز سے فارغ ہونے سے پہلے دوبارہ ناپاک ہوجائے گی تو اگر اسی کپڑے/شلوار وغیرہ میں نماز پڑھ لی تو نماز صحیح ہوگی۔ اور اگر شلوار وغیرہ نماز سے فارغ ہونے سے پہلے دوبارہ ناپاک نہ ہوتی ہو تو اس کو ہر نماز کیلئے دھونا ضروری ہے اور اگر نہیں دھوئی اور اسی ناپاک کپڑے میں نماز پڑھ لی تو نماز صحیح نہیں ہوگی، بشرطیکہ نجاست درہم کی مقدار سے زیادہ ہو۔

وفی الدر المختار (۱/۳۰۵،۳۰۶): (وصاحب عذر من به سلس) بول لایمکنه امساکه...... (ان استوعب عذره تمام وقت صلاة مفروضة) بأن لایجد فی جمیع وقتها زمنا یتوضأ ویصلی فیه خالیا عن الحدث ...... (وهذا شرط) العذر (فی حق الابتداء وفی) حق (البقاء کفی وجوده فی جزء من الوقت) ولومرة (وفی) حق الزوال یشترط (استیعاب الانقطاع) تمام الوقت (حقیقة) لانه الانقطاع الکامل. (وحکمه الوضوء) لاغسل ثوبه ونحوه (لکل فرض)...... (ثم یصلی) به(فیه فرضا و نفلا) ...... (فاذا خرج الوقت بطل) ای ظهر حدثه السابق، حتی لوتوضأ علی الانقطاع ودام الی خروجه لم یبطل بالخروج مالم یطرأ حدث آخر اویسیل (وان سال علی ثوبه) فوق الدرهم (جاز له ان لایغسله ان کان لوغسله تنجس قبل الفراغ منها) ای الصلاة (والا) یتنجس قبل فراغه(فلا) یجوز ترک غسله، هو المختار.

وفی الشامیة (۱/۳۰۵): (قوله فی حق الابتداء) ای فی حق ثبوته ابتداء (قوله فی جزء من الوقت) ای من کل وقت بعد ذالک الاستیعاب...... (قوله وفی حق الزوال) أی زوال العذر وخروج صاحبه عن کونه معذوراً (قوله تمام الوقت حقیقة) ای بأن لایوجد العذر فی جزء منه اصلا فیسقط العذر من اول الانقطاع، حتی لو انقطع فی اثناء الوضوء او الصلاة ودام الانقطاع الی آخر الوقت الثانی یعید، ولو عرض بعد دخول وقت فرض انتظر الی آخره. فان لم ینقطع یتوضأ ویصلی ثم ان انقطع فی اثناء

الوقت الثاني يعيد تلك الصلاة، وان استوعب الوقت الثاني لايعيد لثبوت العذر حينئذ من وقت العروض اهـ...... وذكر في البحر عن السراج انه لوانقطع بعد الفراغ من الصلاة او بعد القعود قدر التشهد لايعيد لزوال العذر بعد الفراغ.

(۲۰۲) پیشاب کے بعد کچھ دیر تک قطرے آنے سے معذور شمار نہیں ہوتا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھ کو پیشاب کے بعد قطرے آتے ہیں تقریباً آدھا گھنٹہ اُٹھوں یا بیٹھوں تو قطرے خارج ہوجاتے ہیں، علاج بھی کرایا ایک سال لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔لہٰذا شریعت میں میرے لئے اب کیا حکم ہے؟ یا کوئی وظیفہ وغیرہ بتادیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......جس شخص کو پیشاب کے قطرے آتے ہوں چاہے پیشاب کرنے سے پہلے ہوں یا پیشاب کے بعد ہوں، یہ پیشاب کی بیماری تصور کی جاتی ہے۔لیکن یہ شخص شرعاً معذور اس وقت شمار ہوگا جبکہ ایک مرتبہ فرض نماز پڑھنے کا وقت بھی اس عذر کے بغیر نہ گزرے۔اورصورت مسئولہ میں چونکہ آپ کوتقریباً پیشاب کے بعد آدھا گھنٹے تک پیشاب کے قطرے آتے ہیں، اس کے بعد بند ہوجاتے ہیں، لہٰذا آپ شرعاً معذور نہیں ہیں۔آپ نماز سے تقریباً آدھا گھنٹہ پہلے پیشاب کے قطروں کے خارج ہونے تک انتظار کریں، جب قطرے بند ہوجائیں اور آپ کواطمینان حاصل ہوجائے تو پھراس کے بعد وضو کر کے نماز ادا کریں۔

لمافي الهندية(۱/۴۰):شرط ثبوت العذر ابتداء ان يستوعب استمراره وقت الصلوة كاملا وهو الاظهر كالانقطاع لايثبت مالم يستوعب الوقت كله.

وفيه ايضاً(۱/۴۱): السمتحاضة ومن به سلس البول او استطلاق البطن او انفلات الريح او رعاف دائم او جرح لايرقاء يتوضئون لوقت كل صلوة ويصلون بذالك الوضوء في الوقت ماشاؤا من الفرائض والنوافل هكذا في البحر الرائق.

وإن توضا على السيلان وصلى على الانقطاع وتم الانقطاع باستيعاب الوقت الثاني اعاد كذا في شرح منية المصلي لابراهيم الحلبي وكذا اذا انقطع في خلال الصلوة وتم الانقطاع هكذا في المضمرات.

ويبطل الوضوء عند خروج وقت المفروضة بالحدث السابق هكذا في الهداية وهو الصحيح هكذا في المحيط في نواقض الوضوء...... متى قدر المعذور على ردّ السيلان برباط أو حشوأو كان لو جلس لا يسيل ولو قام سال وجب رده ويخرج برده عن ان يكون صاحب العذر بخلاف الحائض اذا منعت الدرور فانها حائض كا في البحر الرائق.

﴿فصل فی الحیض و النفاس﴾

(حیض ونفاس سے متعلق مسائل کا بیان)

(۲۰۳) عادت سے پہلے ماہواری آنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری عادت ہے کہ مجھے ہر ماہ چھ دن خون آتا ہے جو بارہ تاریخ سے شروع ہوکر اٹھارہ تاریخ تک عام طور پر رہتا ہے لیکن اس مرتبہ آٹھ تاریخ سے شروع ہوگیا ہے تو کیا یہ ماہواری خون ہوگا اور ان دنوں میں نماز وغیرہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... یہ ماہواری خون ہی شمار کیا جائے گا بشرطیکہ وہ تین دن سے کم نہ ہو، کیونکہ ان دونوں ماہواری کے درمیان پندرہ دن سے زائد کا فاصلہ ہے، اور پاکی کی اقل مدت پندرہ دن ہے تو آٹھ تاریخ سے شروع ہونے والا خون بھی حیض کا خون ہی شمار کیا جائے گا ان دنوں میں نماز وغیرہ ذمہ سے ساقط ہوجائے گی۔

لما فی الهندية (۱/۳۷): اذا كان الطهر خمسة عشر يوماً أو أكثر يعتبر فاصلا فيجعل كل واحد من الدمين او احدهما بانفراده حيضا حسب ما امكن من ذلك. (ص۳۸): (منها) ان يسقط عن الحائض والنفساء الصلوة فلا تقضى هكذا فى الكفاية ...... ومنها ان يحرم عليهما الصوم فتقضيانه هكذا فى الكفاية.

وفى الدر المختار (۱/۲۸۵): (واقل الطهر) بين الحيضتين أوالنفاس والحيض (خمسة عشر يوماً) وليا ليها اجماعا. (ص ۲۸۴): فبه تترك الصلوة ولو مبتدأة فى الأصح، لان الاصل الصحة والحيض دم صحة شمنى.

وفى الشامية (۱/۲۸۴): (قوله فبه) اى فبا لبروز تترك الصلوة وتثبت بقية الأحكام، ولكن هذا مادام مستمرا لما سيأتى من انه لو انقطع لدون أقله تتوضأ وتصلى.

(۲۰۴) ’’بلوغت کے بعد صرف ڈیڑھ دن خون آیا‘‘ ایسی خاتون کی ماہواری کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے ابھی تک صرف ایک دو دفعہ ایک ڈیڑھ دن تک کیلئے

ماہواری کا خون آیا ہے جبکہ میری عمر تیس سال ہے، میرے لئے ماہواری کا کیا حکم ہے؟ اور جو دو دفعہ خون آیا تھا وہ ماہواری شمار ہوگا یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......اگر ماہواری کا خون تین دن سے کم ہو تو وہ حیض شمار نہیں ہوتا، لہٰذا آپ کو جو ایک دو دفعہ خون آیا ہے وہ تین دن سے کم ہے وہ حیض شمار نہیں ہوگا، اور جب تک خون نہ آئے آپ پاک ہیں اور پاکی کی حالت کے جو احکامات ہیں وہی سب آپ کے لئے ہوں گے۔

وفی ردالمحتار (۱/۲۸۵): **الأولى ان تبلغ بالسن وتبقى بلا دم طول عمرها فتصوم وتصلي وياتيها** زوجها وغير ذلک ابداً......الثانية ان ترى الدم عند **البلوغ او بعده أقل من ثلاثة ايام ثم يستمر** إنقطاعه وحكمها كالأولى.

(۲۰۵) تین دن سے کم خون آنا حیض شمار نہیں ہوگا بلکہ وہ استحاضہ ہے

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت جسکی عمر تقریباً پینتیس (۳۵) سال ہے اور اسے ہر ماہ صرف دو دِن خون آتا ہے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا یہ خون حیض شمار ہوگا یا نہیں؟ اور جن دنوں میں یہ خون آتا ہو، ان دنوں میں عورت کیلئے نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ اسی طرح دیگر احکامات مثلاً تلاوت وغیرہ کرنا، قرآن پاک چھونا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......شریعت میں حیض کی کم سے کم مدت تین دن تین رات اور زیادہ سے زیادہ مدت دس دن دس رات ہے جو خون تین دن تین رات سے کم یا دس دن دس رات سے زیادہ آئے تو وہ خون حیض کا شمار نہیں ہوگا وہ استحاضہ کا خون ہے اور استحاضہ کا حکم پاکی کا ہے لہٰذا صورت مسئولہ میں وہ عورت جس کو ہر ماہ صرف دو دن خون آتا ہے یہ خون حیض کا شمار نہیں ہوگا لہٰذا یہ عورت جس طرح پاکی کے ایام میں فرائض (نماز، روزہ وغیرہ) ادا کرتی ہے اسی طرح ان دنوں میں بھی فرائض ادا کرے گی اور قرآن کریم کی تلاوت کرنا یا باوضو اسے چھونا سب اس کے لیے جائز ہوگا۔ البتہ اس پر معذور کے احکامات آئیں گے۔

لمافي بدائع الصنائع(۱/۲۸۸): **ولنا ماروى ابو امامة الباهلي. رضي الله عنه. عن النبي** ﷺ **انه قال** "اقل ما يكون الحيض للجارية الثيب والبكر **جميعا ثلاثة ايام، واكثر واما يكون من الحيض عشرة** **ايام وما زاد على العشرة فهو استحاضة" وهذا حديث مشهور، وروى عن جماعة من الصحابة رضي** **الله عنهم**...... **واما الثاني فذكر ظاهر الرواية ان اقل الحيض ثلاثة ايام ولياليها.**

وفي الدر المختار(۱/۲۸۴): و(اقله ثلاثة ايام ولياليها) **الثلاث، فالاضافة لبيان العدد المقدر** بالساعات الفلكية **لا للاختصاص، فلا يلزم كونها ليالي تلك الايام وكذا قوله(واكثره عشرة)** بعشر ليال كذا رواه الدار قطني وغيره.

(۲۰۶) ماہواری کے دنوں میں خون رکنے کا حکم اور اس وقت میں اعمال کرنا کیسا ہے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے اٹھارہ تاریخ سے خون شروع ہوکر پچیس تاریخ تک جاری رہتا ہے لیکن درمیان میں کبھی ایک گھنٹے کیلئے کبھی دو گھنٹے اور کبھی ایک آدھ دن کیلئے رک کر پھر جاری ہوجاتا ہے جس وقت خون بند ہوجاتا ہے اتنا وقت پاک شمار کیا جائے گا یا نہیں؟ اس وقت نماز پڑھنا اور تلاوت کرنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... ایام ماہواری کے جن اوقات میں خون آنا رک جاتا ہے وہ ایام ماہواری ہی کے شمار ہوتے ہیں اس لئے آپ کا ماہواری کے دنوں میں ان اوقات میں بھی نماز پڑھنا تلاوت کرنا درست نہیں۔

لما فی البحر الرائق (۱/۳۵۸): وقال محمد رحمه الله: **الطهر المتخلل ان نقص عن ثلاثة ايام ولو بساعة لا يفصل اعتباراً بالحيض فان كان ثلاثة فصاعداً فان كان مثل الدمين أو أقل فكذلك تغليباً للمحرمات لان اعتبار الدم يوجب حرمتها واعتبار الطهر يوجب حلها فغلب الحرام الحلال وان كان اكثر فصل ثم ينظر ان كان فى احد الجانبين مايمكن أن يجعل حيضا فهو حيض والاخر استحاضة وان لم يكن فالكل استحاضة......**

وفی الشامیة (۱/۲۸۹): **ثم اعلم ان الطهر المتخلل بين الدمين اذا كان خمسة عشر يوماً فأكثر يكون فاصلا بين الدمين فى الحيض اتفاقا فما بلغ من كل من الدمين نصابا جعل حيضا.**

وانه اذا كان أقل من ثلاثة أيام لايكون فاصلاً وان كان اكثر من الدمين اتفاقا.

فلو رأت مبتدأة يوما دماً ويومين طهرا ويوما دما فالأربعة حيض لان الطهر المتخلل دون ثلاث وهو لا يفصل اتفاقا.

(۲۰۷) تین دن ماہواری آکر دس دن کے بعد پھر آنے والے خون کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت کو رمضان المبارک میں حیض تین دن تک رہا پھر وہ پاک ہوگئی پھر اس نے دس روزے رکھے پھر حیض شروع ہوگیا اور ایک دن رہا۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ یہ حیض ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو ایک مہینے میں دو مرتبہ حیض کس طرح آیا؟ اگر استحاضہ ہے تو پھر جو روزے رکھے ہیں وہ ہوگئے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... مذکورہ عورت کو جب مکمل تین دن ورات خون (حیض) آیا پھر وہ پاک ہوگئی تو اس کا حیض ختم ہوگیا۔ دس روزے رکھنے کے بعد جو خون آیا وہ حیض نہیں بلکہ استحاضہ ہے اور جو دس روزے اس نے رکھے ہیں وہ بھی ہوگئے ہیں لہٰذا عورت نے اگر استحاضہ کے دوران نمازیں نہیں پڑھیں تو روزہ کی قضا کے ساتھ ساتھ نمازوں کی قضا بھی کرے۔

لمافی خلاصة الفتاویٰ(۱/۲۳۳):الفاصل بین الدمین الطهر اذا کان اقل من خمسة عشر یوما لا یعتبر ولا یصیر فاصلا بین الدمین ویصیر کالدم المتوالی عند ابی یوسفؒ واذا کان خمسة عشر یوما او اکثر یعتبر فاصلا.

وفی الهندیة(۱/۳۶): اقل الحیض ثلاثة ایام وثلاث لیال فی ظاهر الروایة هکذا فی التبیین واکثره عشرة ایام و لیالیها کذا فی الخلاصة.....(۱/۳۷)روی ابو یوسف عن ابی حنیفة ان الطهر المتخلل بین الدمین اذا کان اقل من خمسة عشر یوما لم یفصل و کثیر من المتاخرین أفتوا بهذه الروایة لانها اسهل علی المفتی والمستفتی..... والاخذ بهذا ایسر کذا فی الهدایة وعلیه استقر رأی الصدر الشهید حسام الدین وبه یفتی کذا فی المحیط.

وفی الدر المختار(۱/۲۸۴ــ۲۸۵): والحیض دم صحة شمنی و(اقله ثلاثة ایام بلیالیها)...... (واکثره عشرة) بعشر لیال ..... (والناقص) عن اقله (والزائد) علی اکثره..... (استحاضة واقل الطهر) بین الحیضتین او النفاس والحیض (خمسة عشر یوما) ولیالیها اجماعا (ولا حدلاکثره).

وفی کتاب الفقه(۱/۱۲۹): فلو حاضت المرأة ثم انقطع حیضها بعد ثلاثة ایام مثلا واستمر منقطعا الی اربعة عشر یوما او اقل ثم رأت الدم لا یکون حیضا.

وفیه ایضاً(۱/۱۳۰): وحکم الاستحاضة انها لا تمنع شیئاً من الاشیاء التی یمنعها الحیض والنفاس الخ.

(۲۰۸) ماہواری کے بعد سفیدی کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک خاتون کو جب ماہواری آتی ہے تو سات دن سرخ کالے رنگ کا خون آتا ہے اس کے بعد سفیدی آتی ہے، آیا یہ سفیدی حیض شمار ہوگی اس کے ہوتے ہوئے نماز روزے کا کیا حکم ہوگا۔ نیز اگر یہ سفیدی کپڑوں پر لگ جائے یا بدن پر لگ جائے تو کپڑے یا بدن نجس ہوں گے یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً..... سات دن جو سرخ کالے رنگ کا خون آتا ہے یہ حیض ہے اس کے بعد جو سفیدی آتی ہے یہ حیض شمار نہیں ہوگی بلکہ یہ حیض ختم ہونے کی علامت ہے اس کے اندر نماز روزہ لازم ہے۔ البتہ اس سفیدی کے کپڑوں یا بدن پر لگ جانے سے کپڑے یا بدن ناپاک ہوجاتے ہیں ان کا دھونا ضروری ہے۔

لمافی المحیط البرهانی(۱/۴۰۱): واذا وضعت الکرسف فی اول اللیل وهی حائض، ونامت فنظرت الی الکرسف حین اصبحت، فرأت البیاض الخالص فعلیها قضاء العشاء للتیقن بطهرها من حیث وضعت الکرسف ......

وفی الفقه الاسلامیة وادلته(۱/۶۱۳،۶۱۸): ورأی الحنفیة: ان الوان دم الحیض ستة: السواد، والحمرة والصفرة، والکدرة، والخضرة، والتربیة(ای علی لون التراب) علی الأصح: فکل ما یری فی ایام الحیض من هذه الدماء فهو حیض، حتی تری البیاض الخالص: وهو شیئ یشبه المخاط یخرج عند انتهاء الحیض أوهو القطن الذی تختبر به المرأة نفسها، اذا خرج أبیض، فقد طهرت

وفیه ایضاً(۱/۶۱۸): والمراد بالطهر: هو زمان نقاء المرأة من دم الحیض والنفاس وللطهر علامتان: جفاف الدم أو جفوفه والقصة البیضاء: هی ماء ابیض رقیق یأتی فی آخر الحیض.

(۲۰۹) کافی عرصہ کے بعد خون کا قطرہ دیکھنے پر ماہواری کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج سے چند سال پہلے میرے یہاں ایک بچے کی ولادت ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے مجھے ماہواری آنا بند ہوگئی۔ میں نے اس کا علاج کروایا تو مجھے ایک روز خون کا قطرہ دکھائی دیا، آیا یہ میری ماہواری شمار ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... حیض کی کم سے کم مدت تین دن ہے اگر تین دن سے کم خون نظر آئے تو یہ حیض کا خون نہیں ہوتا بلکہ یہ استحاضہ کا خون ہوتا ہے لہٰذا جو آپ کو ایک روز خون کا قطرہ نظر آیا ہے یہ آپ کی ماہواری یعنی حیض کا خون نہیں ہے بلکہ استحاضہ کا خون ہے پس اس بناء پر اگر آپ نے فرض نماز چھوڑ دی ہے تو آپ پر اس کی قضاء لازم ہوگی۔

لمافی سنن الدار قطنی (۱/۲۱۷): عن أنس رضی الله عنه قال "أدنی الحیض ثلاثة واقصاه عشرة، قال وکیع: ((الحیض ثلاث إلی عشر فما زاد فهی مستحاضة))."

وفی سنن الدار قطنی (۱/۲۱۷): عن سفیان رضی الله عنه قال: ((اقل الحیض ثلاث واکثره عشرة)).

وفی الفقه الاسلامی وادلته(۱/۶۱۵):..... ان اقل الحیض: ثلاثة ایام ولیالیها وما نقص عن ذالک فلیس بحیض وانما هو استحاضة.

(۲۱۰) طہر متخلل کا مسئلہ

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے ہر ماہ دس تاریخ سے سولہ تک ماہواری کا لگاتار خون آتا ہے لیکن اس مرتبہ دس گیارہ کو خون آیا پھر چار دن نہیں آیا اس کے بعد مسلسل چار دن خون آیا تو یہ درمیان میں جو دن گزرے ہیں ان میں نمازوں کا کیا حکم ہوگا اور بعد میں جو چار دن خون آیا ہے یہ حیض کا شمار ہوگا یا استحاضہ ہوگا۔ اس مسئلے میں میری رہنمائی فرمائیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... آپ کی ذکر کردہ تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ معتادہ ہیں آپ کو ہر ماہ چھ دن خون آتا ہے لیکن اس مرتبہ جو دو دن خون آیا اور چار دن نہیں آیا اور پھر چار دن خون آیا تو یہ تمام دن حیض کے شمار ہوں گے کیونکہ جو چار دن بیچ میں خون نہیں آیا یہ طہر متخلل ہے اور جب طہر متخلل پندرہ دن سے کم ہو تو وہ دم جاری کے حکم میں ہوتا ہے لہٰذا یہ تمام دس دن حیض کے شمار ہوں گے جن میں نماز معاف ہے۔

لما فی الهندية(۱/۳۶-۳۷): الطهر المتخلل بين الدمين والدماء فی مدة الحيض يكون حيضاً......
وروى ابو يوسف عن ابی حنيفة ان الطهر المتخلل بين الدمين اذا كان اقل من خمسة عشر يوماً لم يفصل وكثير من المتأخرين أفتوا بهذه الرواية لانها اسهل على المفتی والمستفتی.

وفی الهندية(۱/۳۷): فان لم يجاوز العشرة فالطهر والدم كلاهما حيض سواء كانت مبتدأة او معتادة وان جاوز العشرة ففی المبتدأة حيضها عشرة ايام وفی المعتادة معروفتها فی الحيض حيض والطهر طهر.

وفی الهندية(۱/۳۸): (الاحكام التی يشترك فيها الحيض والنفاس ثمانية) (منها) ان يسقط عن الحائض والنفساء الصلاة فلا تقضی.

وفی الشامية(۱/۲۸۵): اما المعتادة فما زاد على عادتها ويجاوز العشرة فی الحيض والاربعين فی النفاس يكون استحاضة كما اشار اليه بقوله او على العادة الخ. اما اذا لم يتجاوز الأكثر فيهما فهو انتقال للعادة فيهما فيكون حيضا ونفاسا.

(۲۱۱) دورانِ حمل آنے والے خون کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے پانچ سال کے بعد دوبارہ حمل ٹھہرا ہے ایک بیٹی ہے چار سال کی، رسولی بھی ہے اور خون کی شکایت بھی ہو جاتی ہے، درد بھی ہوتا ہے، تو میں ایسی صورت میں نماز اور قرآن پڑھ سکتی ہوں؟ اور کوئی دعا یا کچھ پڑھنے کو بتا دیں، اللہ تعالیٰ سے یہ دعا ہے کہ میرے بچے کے اعضاء پورے بنائے اور نیک بیٹا عطا کرے آپ بھی دعا کروا دیں۔ کسی حضرت نے بتایا ہے کہ دن میں کسی بھی وقت پانچ تسبیحات ''لاحول ولاقوۃ'' کی آدھے گلاس پانی پر دم کر کے پیو رسولی وہیں ٹھہر جائے گی۔ آپ بھی کچھ وظائف بتا دیں اور دعاؤں میں بھی یاد رکھئے۔ اور مجھے چلنے پھرنے سے خون کی شکایت ہو جاتی ہے؟ کوئی دعا بتائیں تا کہ یہ بند ہو جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... حمل کی حالت میں نکلنے والا خون استحاضہ یعنی بیماری کا خون کہلاتا ہے لہٰذا آپ کو خون حمل ٹھہرنے کے بعد آ رہا ہے اس لئے یہ استحاضہ ہے استحاضہ والی عورت پاک ہوتی ہے لہٰذا آپ وضو کر کے اور خون سے صفائی حاصل کر کے نماز بھی پڑھ سکتی ہیں

اور تلاوت بھی کرسکتی ہیں، لیکن اگر وضو کے بعد دوبارہ خون نکل آیا تو وضوٹوٹ جائے گا اس لئے اس سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ وضو کرکے آپ زیادہ نہ چلیں اور اگر کھڑے ہوکر نماز پڑھنے کی وجہ سے بھی خون جاری ہوجاتا ہےتو پھر بیٹھ کرنماز پڑھیں۔

سات مرتبہ سورۃ الفاتحہ، اس کے اوّل وآخر سات سات مرتبہ درودشریف پڑھ کر پانی پر دم کرکے پئیں اور شفایابی کا یقین اللہ تعالیٰ کی ذات پر رکھیں، انشاءاللہ تعالیٰ جلد صحت یابی عطافرمائیں گے، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کونیک صالح نرینہ اولاد عطافرمائے، آمین۔

لمافی مشکوۃ المصابیح(۱/۵۷): عن النبی ﷺ أنه قال فی المستحاضة تدع الصلوۃ أيام اقرائها التی کانت تحیض فیها ثم تغتسل وتتوضأ عند کل صلوۃ وتصوم وتصلی.

وفی ترمذی(۲/۲۶): عن ابی سعیدؓ قال بعثنا رسول الله ﷺ فی سریة فنزلنا بقوم فسالناهم القری فلم یقرونا فلدغ سیدهم فاتونا فقالوا هل فیکم من یرقی من العقرب قلت نعم انا ولکن لا ارقیه حتی تعطونا غنماً قالوا فانا نعطیکم ثلاثین شاة فقبلنا فقرأت علیه الحمد سبع مرات فبرأ وقبضنا الغنم قال فعرض فی انفسنا منها شئ فقلنا لا تعجلوا حتی تاتوا رسول الله ﷺ قال فلما قدمنا علیه ذکرت له الذی صنعت قال وما علمت أنها رقیة اقبضوا الغنم واضربوا لی معکم بسهم.

وفی الفتاوی الهندیة(۱/۳۷۔۳۸): لو رأت الدم بعد اکثر الحیض والنفاس فی أقل مدة الطهر فما رأت بعد الاکثر إن کانت مبتداة وبعد العادة ان کانت معتادة استحاضة...... وکذا ما تراه الحامل ابتداءً أو حال ولادتها قبل خروج الولد کذا فی الهدایة...... (صـ۳۹) (ودم الاستحاضة) کالرعاف الدائم لایمنع الصلاة ولا الصوم ولا الوطئ.

وفی الشامیة(۱/۲۹۸): (قوله وقتاً کاملاً) ظرف لقوله دائم، الأولی عدم ذکر هذا القید: أی قید الدوام لأنه فی حکمه فی الدوام وعدمه (قوله لا یمنع صوماً الخ) أی ولا قراءة ومس مصحف ودخول مسجد، وکذا لا تمنع عن الطواف اذا امنت من اللوث.

(۲۱۲) دوران حمل آنے والے خون اور اس حالت میں پڑھی جانے والی نمازوں کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ڈیڑھ ماہ کا حمل ساقط ہوگیا ہے۔ بچے کے عضونہیں بنے تھے، بس گوشت ہی گوشت تھا۔اب چالیس دن تک یا اس سے کم جوخون آئے گا اس میں نماز اور قرآن کی تلاوت کا کیا حکم ہے، اس مسئلے کا جواب لکھ دیں۔اور جب میرا حمل ساقط نہیں ہوا تھا لیکن خون آرہا تھا تو اس میں نماز اور قرآن کی تلاوت کا کیا حکم ہے، دونوں کے جواب الگ الگ لکھ دیں، جب میرا حمل ساقط نہیں ہوا تھا لیکن خون آنے لگا تھا تو میں نے لیٹے لیٹے نمازیں ادا کیں تھیں میری وہ نمازیں ہوئیں یا نہیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......(۱)۔صورت مسئولہ میں اگر خون ماہواری کی مقدار تک آیا ہو تو یہ ماہواری کا خون شمار ہوگا، اس دوران نمازیں پڑھنا، روزے رکھنا اور قرآن کی تلاوت وغیرہ کرنا جائز نہیں ہے، اور اگر خون مقدار حیض سے کم یا زیادہ آنے لگے، اسی طرح دوران حمل جو خون آتا رہا تو یہ سب خون استحاضہ کے حکم میں ہے، یعنی اس دوران آپ کو نمازیں پڑھنا اور روزے رکھنا ضروری ہے اور قرآن کی تلاوت وغیرہ اعمال بھی آپ کرسکتی ہیں۔

(۲)۔ جو نمازیں آپ نے لیٹے لیٹے ادا کیں ہیں اگر آپ کھڑے ہو کر اور بیٹھ کر پڑھنے پر قادر نہیں تھیں تو وہ نمازیں ہوگئیں، ورنہ ان کا اعادہ کرنا آپ پر لازم ہے۔

لما فی الهداية (۱/۶۷): (والدم الذی تراه الحامل ابتداء اوحال ولادتها قبل خروج الولد استحاضة) وان كان ممتدا.

وفی الهندية (۱/۳۷): والسقط ان ظهر بعض خلقه من اصبع أو ظفر او شعر ولد فتصير به نفساء هكذا فی التبيين، وان لم يظهر شئ من خلقه فلا نفاس لها فان أمكن جعل المرئی حيضا يجعل حيضا وإلا فهو استحاضة.

وفی الشامية (۲/۹۷): لوقدر على بعض القيام دون تمامه أو كان يقدر على القيام لبعض القراءة دون تمامها يؤمر بان يكبر قائما ويقرأ ماقدر عليه ثم يقعد إن عجز وهو مذهب الصحيح لايروى خلافه عن أصحابنا، ولو ترك هذا خفت ان لاتجوز صلاته.

(۲۱۳) تین ماہ کا حمل ضائع ہونے کے بعد آنے والے خون کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی خاتون کا حمل تین مہینے کے بعد ضائع ہو جائے یا ضائع کر دیا جائے تو آیا اس کے بعد آنے والا خون حیض سے شمار ہوگا یا نفاس سے شمار کیا جائے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اگر کسی عورت کا حمل تین ماہ کے بعد ضائع ہو جائے یا ضائع کر دیا جائے تو اگر اس حمل کے اعضاء (مثلاً ہاتھ، پیر وغیرہ) ظاہر ہو گئے ہوں تو پھر اس کے بعد آنے والا خون نفاس شمار ہوگا اور اگر اس حمل کے اعضاء وغیرہ کچھ ظاہر نہ ہوئے ہوں تو پھر اس کے بعد آنے والا خون اگر کم از کم تین روز تک آیا ہو، اور اس سے پہلے ایک طہر تام (پندرہ دن کا دورانیہ) گزرا ہو تو پھر یہ حیض (ماہواری) ہے اور اگر یہ صورت بھی نہ ہو تو پھر یہ خون نہ نفاس ہے اور نہ حیض بلکہ استحاضہ (بیماری) کا خون ہوگا۔

لمافی الهندية(۱/۳۷): والسقط ان ظهر بعض خلقه من اصبع أو ظفر أو شعر ولد فتصيربه نفساء هكذا فی التبيين.

و فی الدرالمختار (۱/۳۰۲): (وسقط) مثلث السين أی مسقوط (ظهر بعض خلقه كيد أورجل) أو

أصبع أوظفر أو شعر ولا يستبين خلقه الابعد مائة وعشرين يوما(ولد) حكما (فتصير) المرأة (به نفساء والامة ام ولد ويحنث به) في تعليقه وتنقضي به العدة فان لم يظهرله شئ فليس بشئ والمرئى حيض ان دام ثلا ثا وتقدمه طهر تام والا استحاضة.

وفي الفقه الاسلامي (۱/۲۲۱): ويعد الدم عند هؤلاء دم النفاس بخروج اكثر الولد ولو متقطعاً عضواً عضواً ولو سقطاً استبان فيه بعض خلقة الانسان كاصبع أوظفر...... فان رأت دما بعد القاء نطفة او علقة فليس بنفاس.

(۲۱۴) ماہواری میں تعلیم قرآن کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عورت اپنی ماہواری کے ایام میں قرآن کریم کی تلاوت کر سکتی ہے یا نہیں؟ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں بچوں کو قرآن پڑھاتی ہوں اگر میں ماہواری کے ایام کی چھٹی کرتی ہوں تو بچوں کے سبق کا حرج ہوتا ہے اور اگر چھٹی نہ کروں تو دوران ماہواری تلاوت کا مسئلہ ہے ایسی صورت میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں اس کا حل بتائیں۔

الجواب حامداً ومصلياً...... عورت کا ماہواری کے ایام میں تلاوت کرنا ناجائز ہے، البتہ معلّمہ ہونے کی صورت میں اس قدر گنجائش ہے کہ ہر آیت کے کلمات کو علیحدہ علیحدہ کر کے پڑھائے، مثلاً ''الحمدللہ'' میں ''الحمد'' کو علیحدہ اور ''للہ'' کو علیحدہ پڑھائے تو پھر جائز ہے۔ البتہ قرآن مجید کو یاد رکھنے کے لئے دوسرے سے سننا جائز ہے۔

وفي الدرالمختار (۱/۱۷۲، ۱۷۳):(و) يحرم به (تلاوة قرآن) ولو دون آية على المختار (بقصده) فلو قصد الدعاء أو الثناء أو إفتتاح أمر أو التعليم ولقن كلمة كلمة حل في الأصح.

(۲۱۵) ماہواری میں خواتین کیلئے تلاوت قرآن کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری چھوٹی بیٹی ماشاءاللہ اب سن بلوغ کو پہنچ چکی ہے۔ وہ پہلے آپ کے مدرسہ میں ہی حفظ کر رہی تھی، اب گھر کے قریب ایک مدرسہ میں پڑھ رہی ہے۔ اس کے متعلق مسئلہ یہ دریافت کرنا تھا کہ ماہواری کے دنوں میں وہ قرآن کریم کی تلاوت اور اسباق کی پابندی کیسے کرے گی؟ نیز کیا ان دنوں میں خواتین دل ہی دل میں قرآن پاک کی تلاوت کر سکتی ہیں؟

الجواب حامداً ومصلياً...... عورتوں کا حالت حیض میں قرآن کریم کو چھونا اور زبان سے اس کی تلاوت کرنا جائز نہیں۔ اور حدیث شریف میں حائضہ عورتوں کے لیے جو ممانعت وارد ہوئی ہے وہ قرآن کریم کی تلاوت کے متعلق ہے کہ حائضہ عورت قرآن کریم نہ پڑھے اور چونکہ

پڑھنے کا تعلق زبان سے ہے۔اس لئے اگر کوئی دل کے اندر پڑھنے کا تصور کرے تو اس کو تلاوت نہیں کہا جائے گا لہٰذا اگر کوئی عورت ماہواری کے دنوں میں قرآن کریم کی تلاوت کا دل ہی دل میں تصور کرے تو جائز ہے۔ نیز اشدضرورت کی بناء پر فقہاء کرام نے جواز کی یہ صورت بیان کی ہے کہ کلمات کوتوڑ توڑ کر پڑھ سکتی ہے۔ پوری آیت نہ پڑھے جیسا کہ معلّمہ وغیرہ۔

لہٰذا آپ کی بیٹی کے لیے ماہواری کے ایام میں قرآن کریم کی تلاوت زبان سے جائز نہیں ہے البتہ اسباق کی پابندی اس طور پر کرے کہ کلمات کوتوڑ توڑ کر پڑھے یا کسی دوسرے سے سن لے۔ یا پھر دل ہی دل میں تلاوت کا خیال کرلیا کرے۔

لمافی جامع الترمذی(۱/۳۴): عن ابن عمر عن النبی ﷺ قال لا تقرأ الحائض ولا الجنب شيئا من القرآن.

وفی بدائع الصنائع(۱/۶۸۵): أن القراءة فعل اللسان وذلک بتحصيل الحروف ونظمها على وجه مخصوص.

وفی الهداية(۱/۳۵۲، جزء اوّل)مکتبة ادارة القرآن: وقال الكرخی أدنى الجهر ان يسمع نفسه وأدنى المخافتة تصحيح الحروف لان القراءة فعل اللسان.

وفی الدر المختار (۱/۱۷۲): (و)يحرم به (تلاوة القرآن) ولو دون آية على المختار (بقصده) فلو قصد الدعاء أو الثناء أو افتتاح أمر او التعليم ولقن كلمة كلمة حل فی الأصح.

وفی الشامية تحته: (قوله او التعليم) فرق بعضهم بين الحائض والجنب بأن الحائض مضطرة لأنها لا تقدر على رفع حدثها بخلاف الجنب والمختار انه لا فرق (قوله ولقن كلمة كلمة) هو المراد بقول المنية حرفا حرفا كما فسره به فی شرحها، والمراد مع القطع بين كل كلمتين.

(۲۱۶) حالت حیض میں وطی کرنے سے صرف توبہ واستغفار لازم ہے کوئی کفارہ واجب نہیں

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں کراچی کے ایک مدرسے میں پڑھتا ہوں ہمارے مہتمم صاحب چھٹی کے معاملے میں بہت سخت ہیں سوائے عید کے ایام کے باقی ایام میں چھٹی کو گناہ کبیرہ تصور کرتے ہیں میری نئی نئی شادی ہوئی ہے بیوی کے بغیر چارہ نہیں ہوتا میں نے مشکل سے مہتمم صاحب سے ششماہی امتحان کے موقعہ پر ایک ہفتہ چھٹی لی، جب گھر آیا تو بیوی کے حیض کے ایام چل رہے تھے میرے سے برداشت نہ ہوسکا میں حیض کی حالت میں ہمبستری کرتا رہا چونکہ مجھے معلوم تھا کہ بعد میں چھٹی نہیں ملے گی۔ یہ موقع بھی غنیمت ہے جب واپس آیا تو میں کافی پریشان رہا کہ میں نے حالت حیض میں ہمبستری کر کے غلط کام کیا ہے اب آپ حضرات میری رہنمائی کریں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور میرے اوپر کیا کفارہ ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلياً...... حالت حیض میں وطی کرنا حرام اور گناہ کبیرہ ہے اگر کسی سے غلطی سے یہ فعل سرزد ہوجائے تو اس پر توبہ واستغفار لازم ہے اس کے علاوہ کوئی کفارہ واجب نہیں۔ جب آپ سے یہ غلطی ہوگئی ہے تو اللہ کے حضور توبہ واستغفار کریں اور آئندہ نہ کرنے کا

عزم کریں اللہ بخشنے والا مہربان ہے البتہ مستحب یہ ہے کہ اگر شروع ایام میں وطی کی ہو تو ایک دینار اور آخر ایام میں کی ہو تو نصف دینار کی بقدر قیمت صدقہ بھی کر دیں۔

لمافی الدرالمختار مع الشامية (١/٢٩٧،٢٩٨): (و)طؤها (يكفر مستحله) كما جزم به غير واحد وكذا مستحل وطء الدبر عندالجمهور (وقيل لا يكفر) في المسألتين وهو الصحيح خلاصة (وعليه المعول) لانه حرام لغيره (قوله ووطؤها) اى الحائض قال في الشرنبلالية ولم ارحكم وطء النفساء من حيث التكفير اما الحرمة فمصرح بها...... ثم هو كبيرة لو عامداً مختاراً عالماً بالحرمة لاجاهلاً او مكرهاً او ناسياً فتلزمه التوبة. ويندب تصدقه بدينار او نصفه، ومصرفه كزكاة وهل على المرأة تصدق قال في الضياء: الظاهر لا. (قوله ثم هو) اى وطء الحائض (قوله لا جاهلاً الخ) هو على سبيل اللف والنشر...... والظاهر ان الجهل انما ينفي كونه كبيرة لا اصل الحرمة اذ لا عذر بالجهل بالأحكام في دارالاسلام ......(قوله ويندب الخ) لما رواه احمد وابو داؤد والترمذي والنسائي عن ابن عباس مرفوعاً، في الذي ياتي امراته وهي حائض قال: يتصدق بدينار او نصف دينار" ثم قيل ان كان الوطء في اول الحيض فبدينار أو اخره فبنصفه.

وفي سنن النسائي(١/٤٣): عن ابن عباس عن النبي صلى الله عليه وسلم في الرجل ياتي امراته وهي حائض يتصدق بدينار او بنصف دينار.

(٢١٧) ماہواری کے دوران فضائل اعمال پڑھنا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عورت اپنے مخصوص ایام میں فضائل اعمال ہاتھ میں لیکر پڑھ سکتی ہے جبکہ اس میں بعض اوقات قرآن کی آیات یا ان کا ترجمہ اور عام طور پر احادیث مقدسہ ہوتی ہیں، ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں عورت کا ماہواری کے ایام میں فضائل اعمال یا اس جیسی دوسری ایسی کتابوں کا ہاتھ میں لینا یا پڑھنا جائز ہے جن میں دوسرے کلام کے ساتھ قرآن کی آیات بھی ملی ہوئی ہوں، بشرطیکہ قرآن کی آیات پر ہاتھ نہ لگایا جائے۔

لمافی الدرالمختار (١/٢٩١):(و)يمنع حل(دخول مسجد)......(١/٢٩٣) (وقراءة قرآن) بقصده (ومسه)ولومكتوبا بالفارسية في الأصح (الا بغلافه) المنفصل.

وفي الشامية (١/٢٩٣): (ومسه)اى القران ولو في لوح أو درهم أو حائط لكن لايمنع الامن مس المكتوب بخلاف المصحف فلا يجوز مس الجلد وموضع البياض منه.

(۲۱۸) گولیاں کھا کر ماہواری کا خون بند کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری بیوی کو ہر ماہ آٹھ تاریخ سے سترہ (۱۷) تاریخ تک خون آتا ہے اور میں گھر سے پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک اسکول میں ملازم ہوں ہفتے کے بعد گھر آتا ہوں دوراتیں ٹھہر کر واپس چلا جاتا ہوں اس مرتبہ جب آیا تو بیوی کو ماہواری کا خون آرہا تھا میں نے کہا چلو اگلے ہفتے ہمبستری کریں گے اس نے کہا معمول کو ترک کرنا اچھا نہیں ہے خواہ مخواہ یہ جمعرات بددعا دے گی میں ابھی بندوبست کر لیتی ہوں اس نے گولیاں کھالیں جن سے خون بند ہو گیا اب حیض کے ایام میں خون کو گولیوں کے ذریعے بند کر کے ہمبستری کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... خون بند کرنے والی گولیاں اگر حیض شروع ہونے سے پہلے کھائی جائیں اور پھر مقررہ ایام میں خون جاری نہ ہو تو عورت کیلئے مقررہ ایام پاکی کے شمار ہوں گے اور اگر حیض ہونے کے بعد کھائی جائیں تو اگر تین دن سے پہلے پہلے خون بند ہو گیا ہے اور اس کے بعد دس دن تک دوبارہ خون نہیں آیا تو پاکی کے احکام جاری ہوں گے اور جماع کرنا بھی جائز ہوگا اور اگر تین دن کے بعد خون بند ہوا ہے تو عورت کی جو عادت ہوگی اس وقت تک جماع کرنا جائز نہیں ہوگا اور عادت کے بعد بھی اس وقت جائز ہوگا جب عورت غسل کر لے۔ بس صورت مسئولہ میں عورت نے حیض شروع ہونے کے بعد گولیاں کھائی تھیں پھر اگر تین دن خون جاری رہنے کے بعد کھائی تھیں تو اس پر خون بند ہونے کے باوجود پاکی کے احکام جاری نہیں ہوئے تھے اور جماع کرنا بھی جائز نہیں تھا لہٰذا آپ دونوں نے جماع کر کے گناہ کا ارتکاب کیا، توبہ واستغفار لازم ہے۔

لمافی فتاوی اللجنة الدائمة(۵/۴۰۰): یجوز أن تستعمل المرأة أدویة فی رمضان لمنع الحیض اذا قرر أهل الخبرة الأمناء من الدکاترة ومن فی حکمهم أن ذلک لا یضرها ولا یؤثر علی جهاز حملها وخیرلها أن تکف عن ذلک وقد جعل الله لها رخصة فی الفطر اذا جاء ها الحیض فی رمضان.

وفی اعلاء السنن(طبع بیروت)(۱/۳۴۰): وفی الثالث: وهو ما اذا انقطع لدون العادة لا یقربها وان اغتسلت مالم تمض عادتها...... وفی الثالثة لا یجوز قربانها قبل الغسل وبعده مالم تمض عادتها وهذا باجماع.

وفی عالمگیری(۱/۳۹): لو انقطع دمها دون عادتها یکره قربانها وإن اغتسلت حتی تمضی عادتها وعلیها أن تصلی وتصوم للاحتیاط هکذا فی التبیین.

(۲۱۹) اسقاطِ حمل کے بعد آنے والے خون کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں مفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری ایک عزیزہ کا پانچ ماہ کا حمل خود بخود ساقط ہو گیا، ڈاکٹر نے

حمل ساقط ہونے کے بعد صفائی وغیرہ کی اس کے بعد صرف دو دن خون آیا، اب یہ دو دن آنے والا خون نفاس شمار ہوگا؟ اور اس کی نماز معاف ہوگی یا نہیں؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں یہ خون نفاس کا ہے لہٰذا آپ کی عزیزہ پر ان دنوں کی نماز معاف ہے۔

وفی الدرالمختار (۱/۳۰۲): (وسقط) مثلث السين اى مسقوط (ظهر بعض خلقه كيد او رجل) او إصبع او ظفر او شعر ولا يستبين خلقه الا بعد مائة وعشرين يوماً (ولد) حكماً (فتصير) المرأة (به نفساء والأمة ام ولد)

(۲۲۰) بذریعہ آپریشن ولادت ہوتو بعد میں آنے والے خون کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر آپریشن کے ذریعے بچہ پیدا ہوتو بعد میں آنے والے خون کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں آپریشن کے بعد آنے والا خون، اگر زخم سے نہ رس رہا ہو۔ بلکہ رحم سے آرہا ہوتو نفاس کا ہوگا، ورنہ نہیں۔

وفی الهندية (۱/۳۷): ولو ولدت من قبل سرتها بأن كان ببطنها جرح فانشقت وخرج الولد منها، تكون صاحبة جرح سائل لانفساء هكذا فى الظهيرية والتبيين: إلا إذا خرج من الفرج دم عقيب خروج الولد من السرة فانه حينئذ يكون نفاساً هكذا فى التبيين.

وفى الدرالمختار (۱/۲۹۹): فلو ولدته من سرتها، إن سال الدم من الرحم فنفساء، والا فذات جرح، وإن ثبت له احكام الولد...... وحكمه، كالحيض فى كل شيئ الافى سبعة ذكرتها فى الخزائن.

وفى اللجنة الدائمة (۵/۴۱۹): سوال: بعض النسوة تعسر عليهن الولادة فيضطر إلى توليدهن بطريقة العملية، الجراحية، ولربما يحصل من جراء ذالک خروج الولد عن طريق غير الفرج. فما حكم أمثال هولاء النسوة فى الشرع من ناحية دم النفاس؟ وما حكم غسلهن شرعاً؟

جواب: حكمها. حكم النفساء، ان رأت دماً جلست حتى تطهر، وإن لم تر دماً فانها تصوم وتصلى كسائر الطاهرات.

(۲۲۱) معتادہ کا خون نفاس میں عادت سے تجاوز کر جائے تو کیا حکم ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی عورت کی عادت ہو کہ اس کو نفاس کا خون پانچ دن

آتا ہے لیکن اب اس کو بیس دن تک خون جاری رہا تو کیا یہ سارا خون نفاس کا شمار ہوگا یا پانچ دن نفاس کا شمار ہوگا اور باقی استحاضہ کا خون سمجھا جائے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اگر عورت معتادہ (جس کی عادت مقرر) ہو اس کا خون عادت (مثلاً پانچ دن) سے تجاوز کر کے چالیس دن کے اندر (مثلاً بیس دن پر) بند ہو جائے تو وہ نفاس کا خون شمار ہوگا اور سمجھا جائے گا کہ اس کی عادت بدل گئی ہے پہلے پانچ دن تھی اور اب بیس دن ہوگئی ہے۔ اور اگر چالیس دن سے بھی تجاوز کر جائے تو اس کی عادت برقرار رہے گی اور اس کی عادت کے بعد جو خون آئے گا وہ استحاضہ کا شمار ہوگا۔ یعنی پہلے پانچ دن صرف نفاس اور باقی دن استحاضہ کے ہوں گے۔

وفی التاتارخانية(۱/۳۹۱): ولو كانت المرأة لها عادة معروفة فی النفاس وهی التی ولدت غير مرة فكلما رأت من الدم ولم يجاوز الأربعين فذلک كله نفاس بالإجماع.

وفی الهندية(۱/۴۰): وكذا النفاس فان رأت لاعلی العادة ولم يجاوز الاربعين انتقلت.هكذا فی المحيط.

وفی الشامية(۱/۳۰۱): فان جاوز الدم الأربعين فالعادة باقية تردّ اليها والباقی استحاضة وان لم يجاوز انتقلت العادة الی مارأته والكل نفاس.

(۲۲۲) جس عورت کے چھ مہینے سے کم مدت میں دو بچے پیدا ہوئے اس کے نفاس کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زبیدہ خاتون کے پیٹ میں دو بچے تھے اس نے ایک کو جنم دیا ہے دوسرا پیٹ میں موجود ہے ڈاکٹر کے پاس لے گئے تو انہوں نے کہا کہ یہ ایک ماہ بعد پیدا ہوگا اب معلوم یہ کرنا ہے کہ اس کا نفاس کب سے سمجھا جائے گا؟ اگر پہلے بچے سے شروع ہے تو دوسرے بچے کے بعد آنے والا خون نفاس ہوگا یا استحاضہ؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اگر کسی عورت کو چھ مہینے سے کم مدت میں دو بچے پیدا ہوں تو شیخین رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس عورت کا نفاس پہلے بچے کے پیدا ہونے کے بعد شمار ہوگا۔ یہی قول راجح ہے پس اگر دوسرا بچہ چالیس دن کے اندر مثلاً تیس دن بعد ہوا تو اس کے بعد دس دن تو نفاس کے شمار ہوں گے تاکہ نفاس کی مدت چالیس دن پوری ہو جائے اور اگر دوسرا بچہ چالیس دن کے بعد پیدا ہوا تو اس کے بعد آنے والا خون استحاضہ کا ہوگا۔ لہٰذا زبیدہ خاتون کا نفاس پہلے بچے سے شروع ہوگیا ہے اگر دوسرا بچہ ایک ماہ بعد پیدا ہوا تو اس کے بعد دس دن تو نفاس کے شمار ہوں گے اور اس کے بعد والا خون استحاضہ ہوگا۔ فقط، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

لمافی الطحطاوی علی الدر(۱/۱۵۳،۱۵۴): قوله من الاوّل لانه بالولد الاول ظهر انفتاح الرحم فكان المرئ عقبه نفاساً وهو المعتمد وافاد المصنف ان ماتراه عقب الثانی ان كان قبل الاربعين فهو نفاس للاول لتمامها واستحاضة بعد تمامها فتغتسل وتصلی كما وضعت الثانی وهو الصحيح كذا فی البحر.

وفی الدر المختار مع شرحہ (۱/۳۰۱): (والنفاس لام توأمین من الاول) هما ولد ان بینهما دون نصف حول وکذا الثلاثة ولو بین الاول والثالث اکثر منه فی الاصح (و) انقضاء (العدة من الاخیر وفاقاً) لتعلقه بالفراغ......

وفی الشامیة تحته: قوله من الاول والمرئی عقیب الثانی ان کان فی الاربعین فمن نفاس الاول والا فاستحاضة وقیل اذا کان بینهما اربعون یجب علیها نفاس من الثانی والصحیح هو الاول عنایة وبحر ثم ما ذکره المصنف قولهما وعند محمد وزفر النفاس من الثانی قوله لتعلقه بالفراغ ای لتعلق انقضاء العدة بفراغ الرحم وهو لا یفرغ الابخروج کل مافیه......

(۲۲۳) نفاس کے بعد کب تک نماز معاف ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بچہ پیدا ہونے کے بعد جوخون آتا ہے اس میں کتنے دن تک نماز نہیں پڑھنی چاہیے؟ ہمارے ہاں مشہور ہے کہ چالیس دن تک نماز نہیں پڑھنی چاہیے، کیا یہ بات صحیح ہے؟ نیز اگر خون چالیس دن کے بعد بھی بند نہ ہو تو پھر کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر خون چالیس دن تک بند نہ ہو تو چالیس دن تک نماز کی ادائیگی معاف ہے اور اگر چالیس دن سے پہلے بند ہو جائے، تو اسی دن سے نماز پڑھنی لازم ہو جاتی ہے چالیس دن کا انتظار نہیں کیا جائے گا، مثلاً پندرہ دن کے بعد ظہر کی ابتداء میں خون بند ہو گیا تو ظہر کے آخر وقت تک انتظار کریں اگر خون نہ آئے تو غسل کر کے نماز پڑھنی واجب ہوگی۔ اور اگر خون چالیس دن کے بعد بھی جاری رہے تو اس میں دو صورتیں ہیں، اول اس عورت کی پہلے سے کوئی عادت ہے یا نہیں اگر پہلے سے کوئی عادت ہے تو وہی نفاس ہوگا باقی استحاضہ (استحاضہ کے معنی یہ ہیں کہ یہ خون کسی بیماری کی وجہ سے ہے، اس حالت کے سارے احکام ایسے ہوں گے جیسے پاکی کے ہوتے ہیں) شمار ہوگا، اور اگر پہلے سے کوئی عادت نہیں ہے تو چالیس روز تک نفاس ہوگا باقی استحاضہ شمار ہوگا۔

لمافی الدرالمختار (۱/ ۳۰۰،۳۰۱): (واکثره اربعون یوما) ...... (والزائد) علی أکثره (استحاضة) لو مبتدأة أما المعتادة فترد لعادتها وکذا الحیض فان انقطع علی اکثرهماأو قبله فالکل نفاس.

(۲۲۴) حیض ونفاس سے پاکی کب شمار ہوتی ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ حیض ونفاس سے عورتیں کب پاک ہوتی ہیں، وہ کب سے نماز روزہ اور حقوق زوجیت کے قابل ہوتی ہیں؟ خاص طور پر وہ عورتیں جن کے ہاں بچے کی ولادت ہوتی ہے، وہ کب سے نماز روزہ شروع کریں گی؟ عام رواج کے اعتبار سے چالیس دن تک ایسی عورتیں ناپاک شمار ہوتی ہیں۔ نیز ان ایام کے روزے اور نمازیں

قضاء ہوں گی، یا معاف ہیں؟ قرآن وسنت کی روشنی میں مطلع فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں حیض کا حکم یہ ہے کہ جب عورت کی ماہواری رک جائے، یا دس دن پورے ہو جائیں تو عورت پاک ہو جاتی ہے، اور اس پر نماز و روزہ کی ادائیگی فرض ہو جاتی ہے۔ اور حقوق زوجیت کے قابل ہونے کیلئے دیکھا جائے گا کہ اگر ماہواری دس دن سے پہلے ختم ہوگئی تھی تو عورت غسل کرلے یا ایک نماز کا وقت گزر جائے، اور اگر ماہواری دس دن تک رہے تو خون کے بند ہوتے ہی حقوق زوجیت ادا کرسکتی ہے، البتہ بہتر یہ ہے کہ پہلے غسل کرلیا جائے۔

اور نفاس کا حکم یہ ہے کہ جب اس کا خون عادت پر بند ہو جائے، یا چالیس دن پورے ہو جائیں تو عورت پاک ہو جائے گی اس پر تمام حقوق وفرائض لازم ہوں گے، یاد رہے کہ نفاس میں چالیس دن پورے کرنا لازم نہیں بلکہ اگر چالیس دن سے پہلے خون بند ہو جائے تو بھی اسی دن سے وہ پاک ہو جائے گی اس پر فرائض کی ادائیگی لازم ہوگی، ہاں اگر چالیس دن یا چالیس دن کے بعد بھی جاری ہو تو پھر چالیس دن کے بعد سے فرائض کی ادائیگی لازم ہوگی، ہمارے ہاں جو مشہور ہے کہ نفاس سے پاکی چالیس دن کے بعد ہوتی ہے چاہے خون پہلے ہی کیوں نہ بند ہو جائے یہ صحیح نہیں ہے۔

اور نفاس کے بعد حقوق زوجیت کی ادائیگی کیلئے دیکھا جائے گا کہ نفاس کا خون اس کی عادت کے موافق اور چالیس دنوں سے پہلے بند ہوا ہے یعنی عام طور پر جتنے دنوں میں خون بند ہوتا ہے اتنے ہی دنوں میں بند ہوا ہے، تو غسل کے بعد یا ایک نماز کا وقت گزر جانے کے بعد حقوق زوجیت کی ادائیگی صحیح ہوگی، اور اگر اس کی عادت سے پہلے خون بند ہو جائے تو جب تک عادت کے دن پورے نہ ہو جائیں اس وقت تک حقوق زوجیت کی ادائیگی صحیح نہیں، اور اگر خون چالیس دن پورے ہونے کے بعد بند ہوا ہے تو پھر بغیر غسل کے حقوق زوجیت کی ادائیگی صحیح ہے البتہ غسل کرلینا بہتر ہے۔

وفی الهندية (۱/۳۸): (منها) ...... **ان يسقط عن الحائض والنفساء الصلاة فلاتقضى هكذا فى** الكفاية ...... (ومنها) **ان يحرم عليهما الصوم فتقضيانه هكذا فى الكفاية.**

وفی الدرالمختار (۱/۲۹۴،۲۹۵): **(ويحل وطؤها اذاانقطع حيضها لأكثره) بلا غسل وجوباً بل** ندباً (وان)انقطع لدون اقله تتوضأ وتصلى فى آخر الوقت وان **(لأقله) فان لدون عادتها لم يحل،** وتغتسل وتصلى وتصوم احتياطا وان لعادتها فان كتابية حل فى الحال والا **(لا)يحل (حتى تغتسل)** ......(أو يمضى عليها زمن يسع الغسل)ولبس الثياب(والتحريمة)يعنى من آخر وقت الصلاة وفى الشامية(صـ۲۹۴) :**(اذا انقطع حيضها لأكثره) مثله النفاس.**

(۲۲۵) مستحاضہ کے کپڑوں اور بدن کی پاکی کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری ماہواری کے ایام سات ہیں جونو (۹) تاریخ سے

شروع ہوکر سولہ(۱۶) تاریخ تک رہتے ہیں اب میرے ساتھ یہ مسئلہ ہوگیا ہے کہ عام ایام میں بھی آگے کے راستہ سے پانی کی طرح ایک رطوبت بہتی رہتی ہے، اس رطوبت کا کیا حکم ہوگا اگر یہ کپڑے یا جسم پر لگ جائے تو ان کو دھونا لازم ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً...... ہر وہ عورت جس کو ایام مخصوصہ کے علاوہ بھی جریان اور سیلان الدم اور رطوبت کا سلسلہ لاحق ہو۔ وہ عورت مستحاضہ کہلاتی ہے اور مستحاضہ معذور کے حکم میں ہوتی ہے اور معذور کا حکم یہ ہے کہ ہر نماز کیلئے وضوء کرے گا اور جب نماز کا وقت نکل جائے تو خروج وقت سے خود بخود اس کا وضوٹوٹ جائے گا البتہ اس کے بدن اور کپڑوں کی طہارت کے بارے میں حکم یہ ہے کہ اگر وہ زخم اس طرح ہے کہ اگر اس کی نجاست کو دھولیا جائے اور پوری نماز طہارت کے ساتھ پڑھی جاسکتی ہو، تو اس صورت میں اس خون اور رطوبت کو دھونا ضروری ہے اور اگر پوری نماز طہارت کے ساتھ نہ پڑھی جاسکتی ہو(یعنی دورانِ نماز دوبارہ وہ خون وغیرہ کپڑوں اور بدن کو لگے گا) تو اس صورت میں اس نجاست کو دھونا ضروری نہیں لہٰذا آپ مستحاضہ ہیں۔اور نماز آپ کے اوپر فرض ہے البتہ بہنے والی رطوبت کو کسی روئی یا کپڑے کے ذریعے روک دیں تاکہ دوران نماز آپ کے بدن اور کپڑے پاک رہیں اور اگر علاج اور تدبیر کے باوجود بھی رطوبت کپڑوں یا بدن کو لگ جائے تو پھر اس کا دھونا ضروری نہیں۔

لمافی فتاویٰ الولوالجیة(۱/۴۲): کل ما یخرج من بدن الحیوان(الانسان) فهو نجس.

وفی الشامیة(۱/۲۹۸): بان رطوبة الفرج نجسة

وفیه ایضاًمع الدر(۱/۳۰۵): (وحکمه الوضوء) لاغسل ثوبه ونحوه (لکل فرض) اللام للوقت...... (الی ان قال) (وان سال علی ثوبه) فوق الدرهم (جازله ان لایغسله ان کان لو غسله تنجس قبل الفراغ منها) ای الصلاة (والا) یتنجس قبل فراغه (فلا) یجوز ترک غسله، هو المختار للفتوی، (قوله وحکمه) ای العذرا وصاحبه (قوله الوضوء) ای مع القدرة علیه والافالتیمم (قوله لاغسل ثوبه) ای ان لم یفد کما یاتی متنا (قوله ونحوه) کالبدن والمکان ط...... (الی ان قال) (قوله هو المختار للفتوی) وقیل لایجب غسله اصلا، وقیل ان کان مقیدا بان لا یصیبه مرة اخری یجب، وان کان یصیبه المرة بعد الاخری فلا واختاره السرخسی بحر

قلت بل فی البدائع انه اختیار مشائخنا وهو الصحیح اهـ فان لم یمکن التوفیق بحمله علی مافی المتن فهو اوسع علی المعذورین ویؤید التوفیق مافی الحلیة عن الزاهدی عن البقالی لو علمت المستحاضة انها لو غسلته یبقی طاهراً الی ان تصلی یجب بالاجماع وان علمت انه یعود نجساً غسلته عند ابی یوسف دون محمد ...... (الی ان قال) لکن هذا قول ابن مقاتل الرازی فانه یقول یجب غسله فی وقت کل صلاة قیاسا علی الوضوء.

﴿فصل فی المسح الخفین و الجبیرۃ﴾

(موزوں اور پٹی وغیرہ پر مسح سے متعلق مسائل کا بیان)

(۲۲۶) موزے پہننے کی حالت میں دونوں پیروں میں سے ہر ایک پر کم از کم مسح کی مقدار کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص مسح علی الخفین میں دائیں پیر پر دو انگلیوں کے بقدر اور بائیں پر پانچ انگلیوں کے بقدر مسح کرے۔ کیا اس طرح مسح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... مسح علی الخفین میں ہر پیر پر کم از کم تین انگلیوں کے بقدر مسح کرنا ضروری ہے اگر کوئی شخص مسح علی الخفین میں دائیں پیر پر دو انگلیوں کے بقدر اور بائیں پیر پر پانچ انگلیوں کے بقدر مسح کرے جیسا کہ صورت مسئولہ میں ہے تو اسکا مسح درست نہ ہوگا۔

لمافی الهندية(١/٣٢): ولو مسح على رجل قدر أصبعين وعلى أخرى قدر خمسة لم يجز.

وفي الدر المختار(١/٢٧٢): (وفرضه) عملا(قدر ثلاث أصابع اليد) أصغرها طولاً وعرضاً من كل رجل.

وفي الشامية تحته: (قوله من كل رجل) أى فرضه هذا القدر كائنا من كل رجل على حدة قال في الدرر: حتى لو مسح على احدى رجليه مقدار أصبعين وعلى الاخرى مقدار خمس أصابع لم يجز.

(۲۲۷) عذر شرعی کی صورت میں موزوں پر مسح کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں اللہ تعالیٰ کے دین کی تبلیغ کے سلسلے میں ایک سال کیلئے نکلا ہوں۔ ہماری جماعت میں ایک بوڑھا شخص ہے جس کی ہر وقت ہوا خارج ہوتی رہتی ہے اور وہ موزوں پر مسح کرنا چاہتا ہے حالانکہ موزوں پر مسح کرنے کیلئے شرط یہ ہے کہ وہ کامل وضو پر پہنے ہوئے ہوں، لیکن یہ شخص اس شرط کو پورا نہیں کر سکتا کیونکہ چند سیکنڈ کے بعد فوراً ہوا خارج ہوتی ہے۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ یہ شخص ایسی حالت میں موزوں پر مسح کر سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... بصحت واقعہ یہ بوڑھا شخص نمازوں کے اوقات کے اندر تو موزوں پر مسح کر سکتا ہے وقت کے نکلنے کے بعد مسح نہیں کر سکتا۔ مثلاً ظہر کی نماز کیلئے وضو کر کے موزے پہن لیے، اب ظہر کے وقت کے اندر اس کو حدث (اس حدث کے علاوہ جس میں یہ مبتلا ہے) لاحق ہوتا ہے تو یہ وضو کرتے وقت موزوں پر مسح کر سکتا ہے، ظہر کے وقت کے نکلنے کے بعد مسح نہیں کر سکتا چنانچہ عصر کی نماز کیلئے وضو

کرتے وقت پاؤں دھوئے گا۔

لمافی الهندية (۱/۳۴): المعذور اذا كان عذره غير موجود وقت الوضوء ولبس الخفين يجوز له المسح الى المدّة كالاصحاء بخلاف ما اذا وجد العذر مقارنا للوضوء اوللبس احدهما يجوز المسح في الوقت لاخارجه هكذا في البحر الرائق.

وفى الشامية(۱/۲۷۱): ثم انه لا يخلوا اما ان يكون العذر منقطعاً وقت الوضوء واللبس معاً او موجوداً فيهما، او منقطعاً وقت الوضوء موجوداً وقت اللبس او بالعكس فهى رباعية، ففى الاوّل حكمه كالاصحاء لوجود اللبس على طهارة كاملة فمنع سراية الحدث للقدمين، وفى الثلاثة الباقية يمسح فى الوقت فقط، فاذا خرج نزع وغسل كمافى البحر.

(۲۲۸) جوتوں اور نائیلون کے موزوں پر مسح کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل موزہ زیادہ تر نائیلون کا ہوتا ہے کیا اس پر مسح جائز ہے؟ نیز کیا جوتے کے اوپر سے بھی مسح ہوسکتا ہے اگر اجازت ہے تو کن شرائط کے ساتھ؟

الجواب حامداً ومصلیاً......شریعت مطہرہ میں جن موزوں پر مسح کرنا جائز ہے اُن میں مندرجہ ذیل شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔ ٹخنوں سمیت پاؤں کو ڈھانپنے والے ہوں۔ اُن میں مسلسل چلا جاسکے، بغیر رکاوٹ کے پاؤں پر رُکے رہیں۔ اور اُن میں سے پاؤں تک پانی نہ پہنچے۔ لہٰذا مروجہ نائیلون کے موزوں پر ان شرائط کے نہ پائے جانے کی وجہ سے مسح کرنا درست نہیں۔ نیز جوتوں میں بھی اگر یہ شرائط پائی جائیں تو ان پر بھی مسح کرنا جائز ہوگا ورنہ نہیں۔

لمافى المحيط البرهانى(۱/۳۴۳): واما المسح على الجوارب فلا يخلو: إما ان كان الجوارب رقيقا غير منعل، وفى هذا الوجه لا يجوز المسح بلا خلاف، واما ان كان ثخينا منعلاً ففى هذا الوجه يجوز المسح بلا خلاف، لانه يمكن قطع السفر، وتتابع المشى عليه، فكان بمعنى الخف. والمراد من الثخين: أن يستمسک على الساق من غير أن يشد بشئ، ولا يسقط، فأما اذا كان لا يستمسک ويسترخى، فهذا ليس بثخين، ولا يجوز المسح عليه.

وفى الشامية (۱/۲۶۱): (قوله شرط مسحه) اى مسح الخف المفهوم من الخفين، وأل فيه للجنس الصادق بالواحد والاثنين، ولم يقل مسحهما لانه قد يكون واحد الذى رجل واحدة (قوله ثلاثه امور الخ) زاد الشر نبلالى: لبسهما على طهارة، وخلو كل منهما عن الخرق المانع، واستمساكهما على الرجلين من غيرشد، ومنعهما وصول الماء الى الرجل، وأن يبقى من القدم قدر ثلاثة أصابع.

(۲۲۹) کون سی جراب پر مسح کرنا جائز ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے پاس بہت موٹی جرابیں ہیں جن میں ٹھنڈک بالکل محسوس نہیں ہوتی، تو کیا میں ان جرابوں پر مسح کرسکتا ہوں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر جرابیں ایسی ہوں کہ بغیر کسی چیز کے سہارے پنڈلی پر ٹھہری رہیں اور ان کو پہن کر لگاتار چلا جاسکتا ہو اور وہ اتنی موٹی ہوں کہ پانی قدم تک تجاوز نہ کرسکتا ہو تو ان جرابوں پر مسح کرنا درست ہے ورنہ نہیں۔

لمافی الهندية(۱/۳۲): ويمسح على الجورب المجلد وهو الذى وضع الجلد على اعلاه واسفله هكذا فى الكافى والمنعل وهو الذى وضح الجلد على اسفله كالنعل للقدم هكذا فى السراج الوهاج. والشخين الذى ليس مجلدا ولامنعلا بشرط أن يستمسک على الساق بلاربط ولايرى ماتحته وعليه الفتوى كذا فى النهر الفائق.

وفى الشامية (۱/۲۶۹): (قوله على الثخينين) أى اللذين ليسامجلدين ولا منعلين نهر وهذا التقييد مستفاد من عطف ما بعده عليه وبه يعلم أنه نعت للجوربين فقط كما هو صريح عبارة الكنز......(قوله بحيث يمشى فرسخا) أى فأكثر كمامر وفاعل يمشى ضمير يعود على الجورب والاسناد اليه مجازى......(قوله بنفسه)أى من غير شدط (قوله ولا يشف) من شف الثوب رق ....(قوله الا ان ينفذ) أى من البلل.

(۲۳۰) گرم موسم میں موزوں پر مسح کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ موزوں پر مسح کرنا پہلے زمانے میں سخت حالات کی وجہ سے جائز تھا کہ سردی کے موسم میں گرم پانی نہیں ملتا تھا، وغیرہ وغیرہ لیکن آجکل یہ مشکلات ختم ہوگئی ہیں تو کیا آجکل بھی موزوں پر مسح کرنا جائز ہے؟ نیز اگر کوئی شخص کسی بیماری یا کسی اور وجہ سے گرم موسم میں بھی موزے استعمال کرے تو کیا اس وقت بھی اس کے لیے مسح کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اللہ تعالیٰ نے اس دین کو قیامت تک کیلئے ضابطہ حیات بنا کر بھیجا ہے، لہٰذا احکامات بھی ایسے نازل کیے جو قیامت تک کیلئے نافذ العمل اور قابل عمل ہوں، صرف اس زمانے کے مخصوص حالات کے پیش نظر احکامات نازل نہیں کیے جو تھوڑے بہت ایسے احکامات نازل بھی ہوئے وہ بعد میں منسوخ کردیے گئے، اسی طرح مسح بھی انہی احکامات میں سے ہے جن کی مشروعیت قیامت تک کیلئے ہے لہٰذا موزوں پر مسح نہ صرف اس زمانے میں جائز تھا بلکہ اس کا جواز ابھی بھی باقی ہے۔ نیز موزوں پر مسح کرنا مطلقاً جائز ہے چاہے سردی

کا موسم ہو یا گرمی کا، چاہے بیماری کی حالت میں ہو یا عام صحت کی حالت میں۔

لما فی الصحیح للبخاری (۱/۳۳): عن عروة بن المغيرة عن ابيه المغيرة بن شعبة (رضی الله عنه) عن رسول الله ﷺ انه خرج لحاجته فاتبعه المغيرة بإداوة فيها ماء فصب عليه حين فرغ من حاجته فتوضأ ومسح على الخفين.

وفی الهندية (۱/۳۲): المسح علىٰ الخفين رخصة ولو اتى بالعزيمة بعد ما رأى جواز المسح كان اولىٰ.

(۲۳۱) تیمّم کی حالت میں پہنے گئے موزوں پر مسح کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی نے تیمّم کی حالت میں موزے پہنے ہوں بعد میں جب وہ وضو کرے تو کیا اُن موزوں پر مسح کرسکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... جس نے تیمّم کی حالت میں موزے پہنے ہوں بعد میں پانی مل جائے اور پانی کے استعمال پر قدرت بھی ہو، تو اس کیلئے وضو کرتے وقت موزوں پر مسح کرنا جائز نہیں بلکہ پاؤں دھونا ضروری ہے۔

لمافی الخانية على الهندية (۱/۵۰): المحدث اذا تيمم عند عدم الماء ولبس الخف ثم وجد ماء فانه ينزع خفيه ويغسل رجليه لان المتيمم عند وجود الماء يصير محدثا بالحدث السابق.

وفی الدر المختار (۱/۲۷۰): (ملبوسين على طهر) فلو أحدث ومسح بخفيه أولم يمسح فلبس موقه لايمسح عليه (تام) خرج الناقص حقيقة كلمعة ،أومعنى كتيمم ومعذور.

وفی الشامية تحت: (قوله كتيمم) اى أن اللبس لو كان بعد التيمم فوجد بعده الماء لايجوز المسح على الخف بل يجب الغسل.

(۲۳۲) پھٹے ہوئے موزوں اور موٹی جرابوں پر مسح کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے پاس موزے ہیں جو کچھ پھٹے ہوئے ہیں میں ان پر مسح کرسکتا ہوں یا نہیں؟ نیز آج کل جو موٹی جرابیں آتی ہیں ان پر مسح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں اگر موزے پاؤں کی تین چھوٹی انگلیوں کے بقدر پھٹے ہوں تو ایسی صورت میں ان پر مسح کرنا جائز نہیں۔ اگر اس سے کم پھٹے ہوں تو ان پر مسح کرنا جائز ہے۔

نیز یاد رہے کہ یہ مقدار ایک موزے کے اعتبار سے ہے یعنی اگر ایک موزہ اتنی مقدار میں پھٹا ہوا ہو تو مسح جائز نہیں ورنہ ان پر مسح کرنا

جائز ہے۔

آج کل جو موٹی جرابیں آتی ہیں ان پر مسح کرنا جائز نہیں اس لئے کہ ان میں پانی سرایت کر جاتا ہے۔

لمافی التاتارخانية(۱/۲۷۱): واذا كان فی الخف خرق فان كان يسيرا لايمنع جواز المسح، وان كان كثيراً يمنع...... والحدالفاصل بين اليسيرو الكثير أن الخرق اذا كان قدر اصبع او اصبعين فهو يسير وان كان قدر ثلاث أصابع فهو كثير...... ثم على روايات الزيادات اعتبر ثلاث اصابع من اصغر اصابع الرجل وفی الهداية هو الصحيح......(فی صـ۲۷۲) ويجمع الخروق فی خف واحد ولا يجمع فی خفين.

وفی الشامية (۱/۲۶۹): (قوله أوجوربيه) الجورب لفافة الرجل...... (قوله ولو من غزل أوشعر) دخل فيه الجوخ كما حققه فی شرح المنية وقال وخرج عنه ماكان من كرباس بالكسر وهو الثوب من القطن الأبيض ويلحق بالكرباس كل ما كان من نوع الخيط كالكتان والا بريسم ونحوهما وتوقف ح فی وجه عدم جواز المسح عليه اذا وجد فيه الشروط الاربعة التی ذكر ها الشارح...... يدل عليه مافی كافی النسفی حيث علل عدم جواز المسح علی الجورب من كرباس بأنه لايمكن تتابع المشی عليه فإنه يفيد انه لو أمكن جاز ويدل عليه أيضاً مافی ط عن الخانية ان كل ماكان فی معنی الخف فی ادمان المشی عليه وقطع السفر به ولو من لبد رومی يجوز المسح عليه (قوله علی الثخينين) ای اللذين ليسا مجلدين ولامنعلين...... (قوله بنفسه) أی من غير شد (قوله ولايشف)بتشديد الفاء من شف الثوب رق......(قوله الا ان ينفذ) أی من البلل......(وفی صـ۲۷۰) واما الثخين فهوقولهما وعنه انه رجع اليه وعليها الفتویٰ.

وفيه أيضا(صـ۲۷۴): (وتجمع الخروق)...... (قوله لافيهما) ای لو كان فی كل واحد من الخفين خروق غير مانعة لكن اذا جمعتها تكون مثل القدر المانع لا تمنع ويصح المسح.

(۲۳۳) موزوں میں پانی چلے جانے سے مسح ٹوٹنے اور تھوڑی پھٹن سے مسح نہ ٹوٹنے میں فرق

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی موزے کے اندر پانی چلا جائے چاہے کم مقدار میں ہو یا زیادہ مقدار میں ہوتو اس سے مسح ٹوٹ جاتا ہے، اور علماء کرام یہ بھی فرماتے ہیں کہ جن موزوں میں تین انگلیوں کی مقدار سے کم یا دوانگلیوں کی مقدار کے برابر پھٹن ہوتو اس سے مسح نہیں ٹوٹتا ہے، اور اسی طرح اگر کم مقدار میں موزہ پاؤں سے نکل جائے تو اس میں بھی مسح نہیں ٹوٹتا ہے۔ حالانکہ ان دونوں صورتوں میں پانی داخل ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ لہٰذا شریعت کی روشنی میں ان دونوں کے مابین فرق

اور تطبیق کو واضح فرمائیے، کہ موزے کے اندر پانی کے داخل ہونے سے مسح ٹوٹتا ہے چاہے کم مقدار میں ہو یا زیادہ مقدار میں ہو۔ اور موزے میں تین انگلیوں کی مقدار سے کم پھٹن ہو یا موزے کی کم مقدار پاؤں سے نکل جائے تو اس سے مسح نہیں ٹوٹتا ہے۔ حالانکہ ان صورتوں میں بھی پانی داخل ہونے کا امکان ہوتا ہے چاہے کم ہو یا زیادہ۔ لہٰذا واضح فرمائیے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں جو مسئلہ آپ نے ذکر کیا ہے کہ اگر کسی موزے کے اندر پانی چلا جائے چاہے کم مقدار میں ہو یا زیادہ مقدار میں تو اس سے مسح ٹوٹ جاتا ہے یہ بات آپ کی درست نہیں ہے کیونکہ اکثر فقہاء کرام نے اس بات کو صراحتاً ذکر فرمایا ہے کہ اگر موزے میں پانی تین انگلیوں کی مقدار یا اس سے کم مقدار میں چلا جائے تو اس سے مسح نہیں ٹوٹتا۔ جیسا کہ اگر موزوں میں تین انگلیوں کی مقدار سے کم پھٹن ہو تو اس سے مسح نہیں ٹوٹتا اور اسی طرح اگر اکثر قدم سے کم موزہ پاؤں سے نکل جائے تو اس سے بھی مسح نہیں ٹوٹتا۔ پہلی دونوں صورتوں میں کم مقدار کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے البتہ تیسری صورت میں قدم کے اکثر حصے سے کم کا اعتبار کیا گیا ہے یعنی اگر موزہ پاؤں کے اکثر حصے سے کم مقدار میں نکلتا ہے تو اس سے مسح نہیں ٹوٹے گا۔ اب اگر موزے میں تین انگلیوں کی مقدار سے کم پھٹن ہے یا موزہ پاؤں سے کم مقدار میں نکل گیا تو اس میں اگر پانی چلا جائے تو کم مقدار میں ہی جائے گا جو کہ ناقضِ مسح نہیں ہے۔ بلکہ بعض فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ جب تک اتنا پانی موزے میں نہ چلا جائے کہ اس سے ایک پاؤں کا اکثر حصہ تر نہ ہو جائے تب تک مسح نہیں ٹوٹتا۔ لہٰذا تین انگلیوں سے کم مقدار کی پھٹن اور کم مقدار میں موزے کا پاؤں سے نکلنے کی صورت میں اگرچہ پانی کے جانے کا امکان ہے لیکن وہ کم مقدار میں ہی جانے کا امکان ہے اور کم مقدار میں اگر پانی موزوں میں چلا جائے تو اس سے مسح نہیں ٹوٹے گا۔

لمافی الشامیة(۱/۲۷۲): فلو اصاب موضع المسح ماء او مطر قدر ثلاث اصابع جاز، وكذا لو مشى فى حشيش مبتل بالمطر وكذا بالطل فى الأصح......

وفيه ايضاً(۱/۲۷۳): (قوله وهو قدر ثلاث اصابع) يعنى طولا وعرضا، بأن سقطت جلدة مقدار ثلاث اصابع وعرضها كذا فى حاشية يعقوب باشاعلى صدر الشريعة فليحفظ

(قوله اصابع القدم الاصاغر) صححه فى الهداية وغيرها واعتبر الاصاغر للاحتياط...... (قوله بكمالها) هو الصحيح خلافاً لما رجحه السرخسىؒ من المنع بظهور الانامل وحدها. شرح المنية. والانامل: رؤوس الاصابع، وهو صادق بما اذا كانت الاصابع تخرج منه بتمامها لكن لا يبلغ هو قدرها طولا وعرضا...... (قوله اعتبرا لثلاث) اى التى وقعت فى مقابلة الخرق لأن كل اصبع اصل فى موضعها فلا تعتبر بغيرها، حتى لو انكشف الابهام مع جارتها وهما قدر ثلاث اصابع من اصغرها يجوز المسح وان كان مع جارتيها لايجوز.

وفى الشامية(۱/۲۷۶): (وخروج اكثر قدميه) من الخف الشرعى...... (قوله وكذا اخراجه) تصريح بما فهم من الخروج بالاولىٰ، لانّ فى الاخراج خروجا مع زيادة وهى القصد (قوله فى الاصح)

صححه في الهداية وغيرها، وبه جزم في الكنز والمنتقى.

(۲۳۴) کیا عورتوں کیلئے موزوں پر مسح کرنا جائز ہے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مردوں کیلئے تو موزوں پر مسح کرنا جائز ہے لیکن میرے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے کچھ عزیز اسلام آباد اور مری میں رہتے ہیں جہاں ہمیں ابھی جانا ہے اور وہاں آج کل سخت سردی ہے، اگر میری اہلیہ موزے پہن لے تو اس کیلئے موزوں پر مسح جائز ہوگا یا نہیں؟ کیونکہ ہمارے لئے اسلام آباد اور مری کی سردی برداشت کرنا کافی مشکل ہے؟ آپ قرآن وحدیث کی روشنی میں ہماری اس مشکل کو حل فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... جس طرح مردوں کیلئے موزوں پر مسح کرنا جائز ہے اسی طرح عورتوں کیلئے بھی جائز ہے، لہٰذا آپ کی اہلیہ موزوں پر مسح کرسکتی ہیں۔

لمافي الهندية (۱/۳۶): المرأة في المسح على الخفين بمنزلة الرجل لاستوائهما في المعنى المجوّز للمسح.

(۲۳۵) موزوں پر برائے تعلیم مسح کرنے سے مسح کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے وضو کیا اور موزوں پر مسح کیا، بوقت مسح علی الخفین اس کی نیت موزوں پر مسح کی تعلیم دینا مقصود تھی نا کہ طہارت حاصل کرنا، آیا اس طرح مسح علی الخفین درست ہوگیا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں جب وضو کیا اور موزوں پر مسح کرلیا اور نیت تعلیم کی تھی نا کہ طہارت کی تب بھی مسح درست ہوگیا۔

لمافي الهندية(۱/۳۳): فلو توضأ ومسح على الخفين ونوى التعليم دون الطهارة يصح الخ.

وفي الخلاصة الفتاویٰ(۱/۲۸): ولو توضأ ومسح على الخف ونوى به التعليم دون الطهارة يصح بناء على مسئلة النية في الوضوء اهـ.

(۲۳۶) زخم کی پٹی پر مسح کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر جسم کا کوئی حصہ زخمی ہوجائے تو اس پر باندھی جانے والی پٹی عام طور پر زخم سے زائد ہوتی ہے، کیا اس ساری پٹی پر مسح کرنا صحیح ہے، یا پھر پٹی کھول کر زخمی حصہ پر مسح کرنا اور باقی حصہ کو دھونا ضروری ہے؟ نیز یہ مسح غسل کی ضرورت کے وقت بھی کافی ہوگا یا غسل میں پانی پہنچانا ضروری ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر پٹی زخم سے زائد ہو، اور زخم کا دھونا اور پٹی کا کھولنا زخم کیلئے نقصان دہ ہوتو اس صورت میں تمام پٹی پر مسح کرنا جائز ہے، اور اگر پٹی کا کھولنا اور زخم پر مسح کرنا زخم کیلئے نقصان دہ نہ ہوتو ایسی صورت میں پٹی پر مسح کافی نہ ہوگا بلکہ پٹی کھول کر زخم پر مسح کیا جائے گا اور ارد گرد کے حصے کو دھویا جائے گا۔ نیز مسح کے اعتبار سے وضو اور غسل میں کوئی فرق نہیں بلکہ ضرورت کے وقت دونوں صورتوں میں مسح کافی ہوگا۔

لمافی رد المحتار (۱/۲۸۰):اذا كانت زائدة على قدر الجراحة فان ضره الحل والغسل مسح الكل تبعاً والا فلا، بل يغسل ما حول الجراحة ويمسح عليها لا على الخرقة ما لم يضره مسحها فيمسح على الخرقةالتي عليها ويغسل حواليها وما تحت الخرقة الزائدة لان الثابت بالضرورة يتقدربقدرها.

وفي الدرالمختار (۱/۲۸۱):والمحدث والجنب في المسح عليهاوعلى توابعها سواء.

وفي الشامية تحته: (عليها)اى الجبيرة،وعلى توابعها: كخرقة القرحة،وموضع الفصدوالكي.

(۲۳۷) کیا وضوء میں ٹوٹے ہوئے ہاتھ سے پٹی کھولنا ضروری ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ایک دوست کا ہاتھ ٹوٹ گیا ہے جراح نے اس کو مضبوط باندھ کر اس پر پٹی چڑھا دی ہے تو آیا وضو کے وقت اس پٹی کو کھولنا ہوگا یا اوپر سے دھولینا کافی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں وضو کے وقت نہ پٹی کو کھولا جائے اور نہ اوپر سے دھویا جائے بلکہ پٹی پر مسح کر لینا کافی ہے۔ اور پٹی کھولنے اور دھونے کی ضرورت نہیں۔

لمافي التاتارخانية(۱/۲۸٦): واذا انكسر عضو من اعضائه وهو محدث فشد عليه العصابة ثم توضأومسح على العصابة جاز.

وفي الدرالمختار (۱/۲۸۰):(ويجوز) أى يصح مسحها(ولو شدت بلاوضوء)وغسل دفعاً للحرج (ويترك) المسح كالغسل(إن ضروإلا لا).

فصل فی المسائل الجديدة و المتفرقة المتعلقة بالطهارة

(طہارت سے متعلق جدید اور متفرق مسائل کا بیان)

(۲۳۸) بیت الخلاء میں ایسی چیز لے جانا جس پر اللہ پاک کا اسم مبارک یا قرآن مجید لکھا ہو

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بیت الخلاء میں ایسی چیز ساتھ لے جانا جس پر اللہ پاک کا اسم مبارک یا قرآن مجید لکھا ہو۔ جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... بیت الخلاء جاتے وقت افضل یہ ہے کہ ہر وہ چیز جس پر اللہ تعالیٰ یا انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نبی کا نام ہو، یا کوئی قرآنی آیت وغیرہ لکھی ہوئی ہو تو اس کو باہر رکھ کر اندر داخل ہو، تاہم اگر ایسی کوئی چیز کسی کپڑے وغیرہ میں چھپی ہوئی ہو تو اس کے اندر لے جانے میں کوئی حرج نہیں، البتہ اگر کوئی ایسی چیز جس پر اللہ تعالیٰ یا کسی نبی یا قرآنی آیت یا اور کوئی معظم نام جیسے احمد، عزیز وغیرہ لکھا ہو، اور وہ کسی کپڑے وغیرہ میں چھپی ہوئی نہ ہو بلکہ ظاہر ہو تو اس کا بیت الخلاء وغیرہ کے اندر لے جانا مکروہ ہے۔

لمافي الهندية(۱/۵۰): ويكره ان يدخل فی الخلاء ومعه خاتم عليه اسم الله تعالىٰ أو شيئ من القرآن.

وفی رد المحتار (۱/۳۴۵): (تتمه) إذا أراد أن يدخل الخلاء ينبغی أن يقوم قبل ان يغلبه الخارج ولا يصحبه شيئ عليه اسم معظم ولا حاسر الرأس.

(۲۳۹) قضائے حاجت کے وقت دعاء (تعوّذ) کا محل

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بیت الخلاء میں جانے سے پہلے جو تعوذ پڑھا جاتا ہے کیا وہ بیت الخلاء میں داخل ہونے سے پہلے پڑھا جاتا ہے یا بیت الخلاء میں داخل ہونے کے بعد پڑھا جاتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... بیت الخلاء میں جاتے وقت جو دعا (تعوّذ) پڑھی جاتی ہے وہ بیت الخلاء میں داخل ہونے سے پہلے پڑھنی چاہئے اگر صحراء یا کھلے میدان میں آبادی سے باہر قضائے حاجت کر رہا ہے تو ستر (شرمگاہ) کھولنے سے پہلے دعا پڑھے اور بھول جانے کی صورت میں صرف دل میں پڑھے زبان سے نہ کہے۔

وفی حاشية الطحطاوی علی مراقی الفلاح(ص ۴۰): (قبل دخوله) الأولىٰ التفصيل وهو ان كان المكان معدًا لذلک يقول قبل الدّخول وان كان غير معد كالصحراء ففی أو ان الشروع كتشمير

الثیاب مثلاً قبل کشف العورة وان نسی ذلک أتی به فی نفسه لابلسانه.

(۲۴۰) وضو کے بعد انگلی اٹھا کر شہادت پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ وضو کرنے والا جب وضو سے فارغ ہو جاتا ہے تو اپنی انگشت شہادت کو آسمان کی طرف اٹھاتا ہے اور پھر دعا کرتا ہے۔ کیا اس طرح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... وضو سے فارغ ہو کر اس طرح اشارہ کرتے ہوئے دعا پڑھنے کا جواز ثابت ہے۔

لمافی المسلم(۱/۱۲۲): مامنکم من احد یتوضأ فیبلغ او فیسبغ الوضوء ثم یقول اشهد ان لا اله الا الله وان محمد اعبده ورسوله الافتحت له ابواب الجنة الثمانية يدخل من ايهاشاء.

وفی الطحطاوی علی مراقی الفلاح(ص۲۱):ذکر الغزنوی انه یشیر بسبابته حین النظر الی السماء.

(۲۴۱) استنجاء کے پانی کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جب ہم لوگ استنجاء کرتے ہیں تو بعد میں استنجے والا پانی شلوار کو لگ جاتا ہے تو کیا اس سے شلوار ناپاک نہیں ہوتی؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... استنجاء کا پانی شلوار پر لگ گیا۔ تو دیکھا جائے گا، اگر یہ پانی پہلی، دوسری یا تیسری مرتبہ کے دھونے کا ہو (نجاست کے پاک ہونے کا ہے) تو شلوار ناپاک ہوگی۔ اور اگر یہ پانی جو شلوار پر لگا ہے، چوتھی بار دھونے کا ہے، (یعنی پاکی کے بعد کا پانی لگا ہے) تو شلوار نجس نہ ہوگی۔

لمافی التاتارخانية(۱/۲۱۶): والمحدث اذا استنجى فاصاب الماء ذيله او كمه ان اصابه الماء الاول او الثاني او الثالث يتنجس بنجاسة غليظة وان اصابه الماء الرابع يتنجس بنجاسة الماء المستعمل.

(۲۴۲) استنجاء کے وقت ضرورت سے زائد ستر کھولنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱)۔ ایک آدمی لوگوں کے مجمع کی وجہ سے پانی سے استنجاء چھوڑ دیتا ہے صرف ڈھیلہ اور کاغذ (ٹشو پیپر) پر اکتفاء کر لیتا ہے اور پھر وضو کر کے نماز پڑھ لیتا ہے۔ آیا اس کی نماز درست ہوگئی یا نہیں؟

(۲)۔ نیز ایک شخص اپنی شرم گاہ کو بوقت استنجاء بقدر ضرورت سے زائد مقدار کھولتا ہے تو آیا یہ گنہگار ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......(۱)۔صورت مسئولہ میں مذکورہ شخص کی نماز درست ہوگئی۔
(۲)۔کسی عذر کی وجہ سے استنجاء کے وقت اپنی شرم گاہ کو ضرورت سے زائد کھولنے میں کوئی حرج نہیں۔البتہ بغیر عذر کے ایسا کرنا مکروہ ہے۔

وفی الهندية (۱/۴۸): يجوز الاستنجاء بنحو حجر منق كالمدر والتراب والعود والخرقة والجلد وما اشبهها........ والاستنجاء بالماء أفضل إن أمكنه ذلک من غير كشف العورة وان احتاج إلى كشف العورة يستنجي بالحجر ولا يستنجي بالماء كذا في فتاوىٰ قاضيخان.
وفيه ايضاً (۱/۵۰): ويكره ان يبول ..... او متجردا عن ثوبه من غير عذر فان كان بعذر فلا باس به.

(۲۴۳) کشف عورة کا خطرہ ہوتو استنجاء بالماء افضل ہے یا استنجاء بالاحجار

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ استنجاء بالماء افضل ہے یا استنجاء بالحجر افضل ہے، نیز اگر کشف عورة کا خطرہ ہو،تو اس صورت میں کیا کیا جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......کشف عورة کا خطرہ نہ ہوتو استنجاء بالماء افضل ہے اور اگر کشف عورة کا خطرہ ہوتو استنجاء بالحجر کرنا چاہئے۔
لما في الهندية(۱/۴۸): والاستنجاء بالماء أفضل إن أمكنه ذلک من غير كشف العورة وان احتاج إلى كشف العورة يستنجي بالحجر ولا يستنجي بالماء كذا في فتاوىٰ قاضيخان.
وفي الشامية (۱/۳۳۸): ثم إعلم أن الجمع بين الماء والحجر افضل ويليه في الفضل الاقتصار على الماء اهـ.

(۲۴۴) رکعت چھوٹنے کا امکان ہوتو وضو میں مسواک کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص وضو شروع کرے اسی وقت جماعت کھڑی ہوجائے تو اب وہ مسواک کرے یا مسواک کو چھوڑ کر نماز میں داخل ہوجائے اگر تکبیر اولیٰ چھوٹ جانے کا خطرہ ہو یا نماز کی ایک یا دو رکعت چھوٹ جانے کا خوف ہو۔مسئلہ ھٰذا کی مکمل وضاحت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......وضو میں مسواک کرنا سنت ہے اور اس کے استعمال سے نماز کے ثواب میں زیادتی ہوتی ہے اور تکبیر اولیٰ اور رکعت کا حصول اولیٰ یا مستحب ہے اور دونوں میں فی نفسہ فضیلت موجود ہے اور جب دو فضیلتوں کا حصول ممکن ہوتو اس میں جو راجح ہو وہ مقدم ہوگا۔لہٰذا صورت مسئولہ میں مسواک کو ادا کرے گا اگرچہ تکبیر اولیٰ یا رکعت نکل جائے کیونکہ رکعت کے نکلنے سے جماعت کی فضیلت سے محروم نہیں ہوتا کیونکہ وہ قعدہ اخیرہ کے ملنے سے بھی حاصل ہوجاتی ہے اور تکبیر اولیٰ کے ترک سے سنت کا ترک ہونا لازم نہیں آتا۔

البتہ مسواک کے ترک سے مسواک کا ثواب نہیں ملتا اور سنت کا ترک ہونا بھی پایا جاتا ہے۔ اس لئے فعل مسواک کو حصول تکبیر اولی اور رکعت پر مقدم کیا جائے گا البتہ کوشش یہ کرنا چاہئے کہ مسواک کے ساتھ وضوذرا پہلے کرلیا جائے اور مسواک کرنے میں زیادہ دیر نہ لگائی جائے تاکہ دونوں فضیلتوں کا پانے والا ہوجائے۔

لمافی جامع الترمذی(۱/۵۶): عن انس بن مالک قال قال رسول الله ﷺ من صلی لله اربعین یوما فی جماعة یدرک التکبیرة الاولی کتب له براء تان براء ة من النار وبراء ة من النفاق.

وفی اعلاء السنن(۱/۴۴،۴۵،۴۶): عن ابی هریرة رضی الله عنه عن رسول الله ﷺ انه قال "لولا ان اشق علی امّتی لامرتهم بالسواک مع کل وضوء" اخرجه مالک واحمد والنسائی وصححه ابن خزیمة وذکره البخاری تعلیقاً.

قوله عن ابی هریرة الخ، قال المؤلف: دلالته علی تاکید السواک ظاهرة. نعم: لا یدل علی السنة الاصطلاحیة، لانه لیس فیه لفظ دال علی مواظبته ﷺ علی السواک والحدیث الذی بعده صریح فیه فان فیه لفظ"کان" الدال علی المواظبة فصح قول صاحب الهدایة (صـ۵،۶) وسنن الطهارة۔ الی ان قال۔ والسواک، لانه علیه السلام کان یواظب علیه.

وفی الطحطاوی علی الدر (۱/۳۰۰): (قوله وقیل فی التشهد) قال فی الشرنبلالیة الذی تحرر عندی انه یاتی بالسنة اذا کان یدرکه ولو فی التشهد باتفاق بین محمد وشیخیه ولا یتقید بادراک رکعة وتفریع الخلاف هنا علی خلافهم فی مدرک تشهد الجمعة غیر ظاهر لان المدارهنا علی ادراک فضل الجماعة وهو یحصل بادراک التشهد بالاتفاق کما نص علیه الکمال فماظنه بعضهم من انه لم یحرز فضلها عند محمد......غیر ظاهر الخ.

وفی الشامیة(۲/۱۶۸): (قوله واستیاکه) لانه مندوب الیه فی سائر الصلوات اختیار ومفاده ان المراد به الاستیاک عند القیام الی الصلاة فانه مستحب...... واما السواک فی الوضوء فانه سنة مؤکدة...... الخ.

(۲۴۵) وضو میں واجبات کے نہ ہونے کی وجہ

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ''آسان نماز'' کتاب دیکھ رہا تھا اس میں نماز کے واجبات تو لکھے ہیں لیکن وضو کے واجبات ذکر نہیں کیے گئے، اس کی کیا وجہ ہے؟ نیز اگر وضو میں واجبات ہیں تو کتنے ہیں اور کیا کیا ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......وضو کے اندر واجبات نہیں ہیں، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وضو عبادتِ مقصودہ نہیں ہے اگر اس میں بھی واجبات

ہوتے تو پھر تابع اصل کے مساوی ہوجاتا جو کہ نماز ہے۔ نیز کسی چیز کے ثبوت یا وجود پر حکم اس کی دلیل کے اعتبار سے ہوتا ہے اور جو دلیل واجب کو ثابت کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ظنی الثبوت وقطعی الدلالۃ ہو، یا اس کے مرتبے اور قوت میں ہو جیسے وہ اخبار احاد جن کے مفہوم قطعی الدلالۃ ہوں۔ اب وضو کے احکامات میں کوئی چیز ایسی نہیں جو کہ ظنی الثبوت وقطعی الدلالۃ ہو اس لئے وضو میں واجبات نہیں پائے جاتے۔

لمافی حلبی کبیر(ص۱۴): ولیس للغسل ولا للوضوء واجب فلذالم یذکره قیل لانه لو کان لساوی التبع الاصل ای الوضوء او الغسل الصلوة واعترض علیه بعدم لزوم المساواة لثبوت التفاوت بوجه آخر وهو انه لایلزم بالنذر بخلاف الصلاة.

لمافی البحر الرائق (۱/۳۴): انّ الوضوء لاواجب فیه لما ان ثبوت الحکم بقدر دلیله والدلیل المثبت وهو ماکان ظنی الثبوت قطعی الدلالة وما کان بمنزلته کأخبار الأحاد التی مفهومها قطعی الدلالة ولم یوجد فی الوضوء.

(۲۴۶) الفرَق کی موجودہ پیمانوں کے اعتبار سے تحقیق

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ایک دوست نے کسی کتاب میں الـفَـرَق کا لفظ پڑھا اس نے تحقیق کی تو معلوم نہ کرسکا تنگ آ کر میرے پاس آیا میں بھی اس کو موجودہ پیمانوں کے لحاظ سے مطمئن نہ کرسکا اس لئے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں کہ الفرق موجودہ پیمانوں کے لحاظ سے یہ کتنا ہوگا؟

الجواب حامداًومصلیاً...... الفرَق راء کے فتح کے ساتھ اور الفرْق راء کے سکون کے ساتھ دو الگ الگ پیمانوں کے نام ہیں۔ الفرق راء کے فتح کے ساتھ قدیم پیمانوں کے حساب سے اس میں ۱۶ رطل آتے ہیں اور رطل میں ۱۳۰ درہم آتے ہیں اور فی درہم ۳٫۰۶۱۸ گرام کا ہوتا ہے تو اب رطل کا وزن ۱۳۰ درہم کو جب ۳٫۰۶۱۸ گرام سے ضرب دیا گیا تو ۳۹۸٫۰۳۴ گرام جواب آیا پھر ۱۶ رطل کا وزن معلوم کرنے کیلئے ۱۶ کو ۳۹۸٫۰۳۴ سے ضرب دی گئی تو ۶۳۶۸٫۵۴۴ گرام جواب آیا۔ جو ۶ کلوگرام، ۳۶۸ گرام اور ۵۴۴ ملی گرام بنتے ہیں۔

الفرق راء کے سکون کے ساتھ قدیم پیمانوں کے اعتبار سے اس میں ۱۲۰ رطل آتے ہیں۔ مذکورہ بالا طریقہ کے مطابق ۱۲۰ کو ۳۹۸٫۰۳۴ سے ضرب دی گئی تو ۴۷۷۶۴٫۰۸ گرام جواب آیا۔ جن کا ایک من ۷ کلوگرام، ۷۶۴ گرام اور ۰۸ ملی گرام بنتے ہیں۔ لہٰذا الفرق راء کے سکون کے ساتھ جدید پیمانوں کے مطابق ایک من ۷ کلوگرام، ۷۶۴ گرام اور ۰۸ ملی گرام بنتا ہے۔

لمافی الصحیح المسلم(۱/۱۴۸): عن عائشة قالت کان رسول الله ﷺ یغتسل فی القدح وهو الفرق وکنت اغتسل انا وهو فی الاناء الواحد وفی حدیث سفیان من اناء واحد قال قتیبة قال سفیان والفرق ثلاثة آصع.

الفتاوی الهندیة (۱/۳۲۵): اعلم ان الصاع اربعة امداد والمد رطلان والرطل نصف من والمن

بالدراهم مائتان وستون درهما...... ثم اعلم ان الدرهم الشرعی اربعة عشر قیراطا والمتعارف الآن ستة عشر فاذا کان الصاع الفاوار بعین درهما شرعیا یکون بالدراهم المتعارف تسعمائة وعشرة.

وفی مجمع بحار الانوار (۴/۱۳۱): (فرق) فیه: کان یغتسل من الفرق، هو بالحرکة مکیال یسع ستة عشر رطلا وهو اثنا عشر مدا وثلاثة اصع فی الحجاز، وقیل: الفرق خمسة اقساط، والقسط نصف صاع وهو بالسکون: مائة وعشرون رطلا.

(۲۴۷) جس ''فرق'' سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم غسل فرمایا کرتے تھے اس کی تعیین

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کے بارے میں روایت مختلف ہیں۔ بعض میں ہے کہ آپ علیہ السلام صاع سے جو کچھ اوپر تین کلوگرام بنتا ہے غسل فرمایا کرتے تھے اور بعض میں ہے کہ فرق سے غسل فرمایا کرتے تھے پھر فرق کے بارے میں کتابوں میں یہ ملتا ہے کہ فرق ۱۶ رطل کا ہوتا ہے اور یہ بھی ملتا ہے کہ ۱۲۰ رطل کا ہوتا ہے۔ ۱۶ رطل کے اعتبار سے کچھ اوپر ۶ کلوگرام اور ۱۲۰ رطل کے اعتبار سے کچھ اوپر ۴۷ کلوگرام بنتے ہیں۔ تو اس اعتبار سے تو بہت بڑا تفاوت پیدا ہو جاتا ہے اس مسئلہ کا کیا حل ہے فرق سے مراد (جس سے آپ علیہ السلام غسل فرماتے تھے) ۱۶ رطل والا ہے یا ۱۲۰ رطل والا؟ مہربانی فرما کر تفصیلی ومدلل جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... فرق کی دو قسمیں ہیں، ایک فرق بفتح الراء اور دوسرا بسکون الراء۔ اوّل بفتح الراء ۱۶ رطل اور دوسرا بسکون الراء ایک سو بیس رطل کا ہوتا ہے لیکن جس فرق سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا غسل فرماتے تھے وہ محدثین عظام وفقہاء کرام کی تصریحات کے مطابق فرق بفتح الراء ۳ صاع جو ۱۶ رطل کا ہوتا تھا اور اسی پر علامہ ابو عبیدؒ نے اتفاق نقل فرمایا ہے پھر چونکہ جمہور علماء کے نزدیک ایک صاع پانچ رطل اور ثلث رطل اور احنافؒ کے نزدیک ایک صاع آٹھ رطل کا ہوتا ہے اس لئے جمہور کے نزدیک ایک فرق تین صاع کے برابر ہوا اور احنافؒ کے نزدیک ایک فرق ۲ صاع کے برابر ہوا، لہٰذا اس اعتبار سے اس کے مفہوم اور اس حدیث کے مفہوم جس میں فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک صاع سے غسل فرمایا کرتے تھے کوئی تضاد نہیں کیونکہ ایک صاع سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے صاع سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا غسل فرمایا کرتی تھیں۔

اسی طرح امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں صرف ''فرق'' کا ذکر ہے پانی کی مقدار مذکور نہیں کہ وہ بھرا ہوا ہوتا تھا یا کم لہٰذا ہوسکتا ہے کہ کبھی وہ بھرا ہوا ہوتا ہو تو تین صاع پانی ہوتا ہو، اور جب کم ہوتا ہو تو ۲ صاع پانی ہوتا ہو، اور اس دوسری صورت میں ایک صاع سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے صاع سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا غسل فرمایا کرتی ہوں لہٰذا یہ مفہوم اس حدیث کے مفہوم کے موافق ہے جس میں فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک صاع سے غسل فرماتے تھے۔

نیز جس فَرق کو فقہاء کرام نے بیان فرمایا ہے کہ وہ ۳ صاع جو کہ ۱۶ رطل کے برابر ہوتا تھا اس فرق سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت

عائشہ رضی اللہ عنہا عرب میں پانی کی قلت کی وجہ سے عام حالات میں غسل فرمایا کرتے تھے البتہ فرق بسکون الراء جو ۱۲۰ رطل کا ہوتا ہے اور جس کی مقدار ایک بڑے ٹب کے برابر ہوتی ہے اس سے بھی کبھی پانی کی وافر مقدار موجود ہونے کی صورت میں غسل فرماتے ہوں تو کوئی بعید نہیں کیونکہ ایک صاع پانی کی مقدار کی کوئی تحدید نہیں لہٰذا اسراف سے بچتے ہوئے جتنے پانی سے بھی غسل کیا جائے جائز ہے۔

لما في أبي داؤد (۱/۳۱): قال ابو داؤد وروى ابن عيينه نحو حديث مالك قال ابو داؤد سمعت احمد بن حنبل يقول الفرق ستة عشر رطلاً.

وفي بذل المجهود (۱/۱۴۶): قال الطحاوی قالوا فلما ثبت بهذا الحديث الذی روی عن عائشةؓ أن رسول الله ﷺ كان يغتسل هو وهي من الفرق والفرق ثلثة اصع كأنّ مايغتسل به كل واحد منهما صاعاً ونصفاً فإذا كان ذلك ثمانية ارطال كان الصاع ثلثيها وهو خمسة ارطال وثلث رطل وهذا قول اهل المدينة ثم اجاب الطحاوی عن هذا الاستدلال بأن حديث عروة عن عائشة انما فيه ذكر الفرق الذی كان يغتسل منه رسول الله ﷺ وهي لم تذكر مقدار الماء الذی يكون فيه هل هو ملؤه أو اقل من ذلك فقد يجوز أن يكون يغتسل هو وهي بملئه ويجوز أن يكون كان يغتسل هو وهي بأقل من ملئه مما هو صاعان فيكون كل واحد منهما مغتسلاً بصاع من ماء ويكون معنى هذا الحديث موافقاً لمعنى الاحاديث التي رويت عن رسول الله ﷺ أنه كان يغتسل بصاع.

وفي مجمع بحار الانوار (۴/۱۳۱): (فرق) فيه: كان يغتسل من الفرق، هو بالحركة مكيال يسع ستة عشر رطلاً وهو اثنا عشر مداً وثلاثة اصع في الحجاز...... وهو بالسكون: مائة وعشرون رطلاً.

(۲۴۸) ''مکوک'' کی تحقیق

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فقہ کی کتابوں میں ایک لفظ آتا ہے اس کی صحیح مقدار بتادیں وہ لفظ مکوک ہے چونکہ موجودہ دور میں اس نام کا کوئی پیمانہ نہیں ہے تو موجودہ پیمانوں کلو، تولے اور گرام وغیرہ کے لحاظ سے ایک مکوک میں کتنے کلو، کتنے گرام اور کتنے تولے آئیں گے؟ لما في السنن للنسائي (صـ ۱۱): انس بن مالك يقول كان رسول الله ﷺ يتوضا بمكوك ويغتسل بخمسة مكاكي.

الجواب حامداً ومصلياً...... چونکہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک مکوک سے وضو فرماتے تھے۔ اور یہ بات بھی مصرح ہے کہ مکوک سے مراد مد ہے۔ جبکہ ایک مد دو رطل کا ہوتا ہے۔ اور ایک رطل ۱۳۰ درہم کا ہوتا ہے۔ اور ایک درہم ۱۴ قیراط کا ہوتا ہے۔ لہٰذا ایک مکوک میں ۶۱۸ء۹۶۷ گرام، ۸۱۹ ماشے اور ۲۵ء۶۸ تولے ہوتے ہیں۔ جس کی تفصیل یہ ہے:

گرام کی تفصیل ...... ۵ جو = ۲۱۲ء۷ ملی گرام ...... قیراط = ۱ء۸ رتی

درہم = ۱۴ قیراط لہٰذا ۳٫۰۶۱۸ = ۰٫۲۱۸۷ x ۱۴

درہم = ۳٫۰۶۱۸ گرام لہٰذا ۲۶۰ درہم = ۷۹۶٫۰۶۸ = ۳٫۰۶۱۸x۲۶۰

مکوک = ۷۹۶٫۰۶۸ گرام

تولے وماشے کی تفصیل...... ایک قیراط = ۱٫۸ رتی = ۲۵٫۲ = ۱٫۸x۱۴

ایک درہم میں رتی = ۲۵٫۲ = ۳٫۱۵ = ۲۵٫۲÷۸

ایک درہم میں ماشہ = ۳٫۱۵ ۸۱۹ = ۳٫۱۵x۲۶۰

ایک مکوک میں ماشے = ۸۱۹ ۶۸٫۲۵ = ۸۱۹÷۱۲

ایک مکوک میں تولے = ۶۸٫۲۵

لمافی معارف السنن المكتبة البنورية (۱/۲۰۶): اختلف الائمة فی مقدار مایسعه المد والصاع: فذهب ابو حنیفة ومحمد وكذا ابو یوسف فی قوله القدیم المرجوع عنه: إلى ان المدمایسعه الرطلان والصاع: ثمانیة ارطال وهو مذهب فقهاء العراق. وذهب مالک والشافعی واحمد وابو یوسف وفقهاء الحجاز: الى ان المد رطل وثلثه، والصاع: خمسة ارطال وثلث رطل بعد اتفاقهم جمیعا علی ان الصاع اربعة امداد وقال الفیروز آبادی فی القاموس: المد مكیال وهو رطلان او رطل وثلث او ملؤ كفی الانسان المعتدل إذا ملا هما ومد یده بهما وبه سمی مداً اهـ.

وفی فتح القدیر (۲/۲۹۷): ولنا ماروی انه علیه الصلوة والسلام كان یتوضأ بالمدرطلین ویغتسل بالصاع ثمانیة ارطال هكذا وقع مفسرا عن انس وعائشة فی ثلاثة طرق.

وفی الشامیة (۱/۱۵۸): (قوله وهو ثمانیة ارطال) ای بالبغدادی وهی صاع عراقی وهو اربعة امداد كل مد رطلان وبه اخذ ابو حنیفة. والصاع الحجازی خمسة ارطال وثلث، وبه اخذ الصاحبان والائمة الثلاثة فالمد حینئذ رطل وثلث والرطل مائة وثلاثون درهما وقیل مائة وثمانیة وعشرون درهما واربعة اسباع درهم وتمامه فی الحلیة.

قلت والصاع العراقی نحو نصف مد دمشقی فاذا توضأ واغتسل به فقد حصل السنة.

(۲۴۹) ''الباع'' کی تحقیق

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مرتبہ میرے مطالعہ میں ''الباع'' کا لفظ آیا جس کی موجودہ دور کے پیمانوں کے لحاظ سے کچھ تطبیق بھی دی تھی لیکن وہ میرے سے کہیں گم ہوگئی آپ حضرات میری رہنمائی فرمائیں کہ الباع

کس پیانے کا نام ہے؟اس میں کتنے میٹراور کتنے سینٹی میٹر آئیں گے؟

الجواب حامداًومصلیاً...... ایک باع میں چار ذراع ہوتے ہیں اور ایک ذراع میں ۱۸/انچ ہوتے ہیں اور ایک انچ میں ۵ء۲سینٹی میٹر ہوتے ہیں لہٰذا ۱۸/انچ میں ۴۵سینٹی میٹر ہوئے، لہٰذا ایک باع میں ۱۸۰/سینٹی میٹر ہوئے اور چونکہ ایک میٹر میں تقریباً ۵ء۹۷سینٹی میٹر ہوتے ہیں لہٰذا ایک باع میں ۸۴ء۱میٹر ہوئے۔

لمافی فتح القدیر(۱/۱۲۳): إن البرید من الفراسخ أربع — ولفرسخ فثلاث أميال ضعوا
والمیل ألف ای من الباعات قل — والباع أربع أذرع فتتبعوا
ثم الذراع من الاصابع أربع — من بعدها عشرون ثم الاصبع
ست شعيرات فظهر شعيرة — منها الى بطن لاخرى توضع
ثم الشعيرة ست شعرات فقل — من شعر بغل ليس فيها مدفع

وفي الهندية(۱/۱۸): والمعتبر ذراع الكرباس كذا فى الظهيرية وعليه الفتوى كذا فى الهداية وهو ذراع العامة ست قبضات أربع وعشرون اصبعاً.

وفي الشامية(۱/۱۹۶): (قوله والمختار ذراع الكرباس) وفى الهداية أن عليه الفتوى واختاره فى الدرر والظهيرية والخلاصة والخزانة...... (قوله وهو سبع قبضات فقط) اى بلا أصبع قائمة وهذا ما فى الولوالجية وفى البحر أن فى كثير من الكتب انه ست قبضات ليس فوق كل قبضة أصبع قائمة فهو اربع وعشرون أصبعاً بعدد حروف "لا اله الا الله محمد رسول الله" ...... والمراد بالقبضة أربع أصابع مضمومة...... أقول وهو قريب من ذراع اليد لانه ست قبضات وشی وذالک شبران.

(۲۵۰) گرام اور تولے کے اعتبار سے مُد کا وزن

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ روایات میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مد سے وضوفرماتے تھے آجکل مدتو مفقود ہو چکے ہیں تو موجودہ پیمائوں کے لحاظ سے مد میں کتنے کلو کتنے گرام اور کتنے تولے وغیرہ ہوں گے؟

الجواب حامداًومصلیاً...... مد کی مقدار موجودہ پیمانے کے لحاظ سے ۷۹۶ء۰۶۸ گرام ہے اور تولہ کے حساب سے ۶۸ء۲۵ تولہ ہے جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

(گرام)

ایک مد...... دو رطل

ایک رطل...... ۱۳۰درہم

ایک درہم..... ۱۴ قیراط

ایک قیراط..... ۵ جو(۰٫۲۱۸۷ ملی گرام)

(ایک درہم) چودہ قیراط..... ۳٫۰۶۱۸ گرام

۲۶۰ درہم x ۳٫۰۶۱۸= ۷۹۶٫۰۶۸ گرام۔ایک مدکاوزن

(تولہ)

ایک درہم..... چودہ قیراط

ایک قیراط..... ۱٫۸ رتی

۱٫۸ رتی x ۱۴ قیراط= ۲۵٫۲ رتی

۲۵٫۲ x ۲۶۰(درہم)= ۶۵۵۲ رتی(ایک مد)

ایک ماشہ..... ۸ رتی

(رتی) ۶۵۵۲÷۸=۸۱۹ (ماشہ)

ایک تولہ.....۱۲ ماشہ

(ماشہ) ۸۱۹÷۱۲=۶۸٫۲۵ تولہ ایک مدمیں

ایک مد	۲ رطل	۸۱۹ ماشہ	۶۵۵۲ رتی	۶۸٫۲۵ تولہ	۷۹۶٫۰۶۸ گرام

لمافی فتح الملهم(۳/۱۵۴): انّ المدّين الحجازی والعراقی. وكذا الصاعين كانا مستعملين فی عهد النبی ﷺ الا ان الشائع الغالب فی الاستعمال فی عهده ﷺ كان العراقی من الامداد وهو رطلان.

وفی عمدة القاری (۳/۹۴): والمدّ اختلفوا فيه ...... وقيل هو رطلان وبه يقول ابو حنيفة وفقهاء العراق

وفی الشامية(۲/۳۶۵): اعلم ان الصاع اربعة امداد و المدّ رطلان والرطل نصف من والمنّ بالدراهم مائتان وستون درهماً وبالاستار اربعون والاستار بكسر الهمزة بالدراهم ستة ونصف بالمثاقيل قيل اربعة ونصف ...... فالمد والمنّ سواء كلّ منهما ربع صاع مائة و ثلاثون درهماً وفی الزيلعی والفتح اختلف فی الصاع فقال الطرفان ثمانية ارطال بالعراقی وقال الثانی خمسة ارطال وثلث قيل لاخلاف لانّ الثانی قدره برطل المدينة لانه ثلاثون استاراً والعراقی عشرون واذا قابلت ثمانية بالعراقی بخمسة وثلث بالمدينی وجدتهما سواء وهذا هو الاشبه......

ثم اعلم ان الدرهم الشرعی اربعة عشر قيراطاً.

(۲۵۱) ''مرکن'' جوکہ غسل کا برتن ہے یہ کیسا اور کتنا بڑا تھا؟

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بخاری شریف کی ایک روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں اور حضور علیہ الصلاۃ والسلام اکٹھے ایک مرکن سے غسل فرماتے تھے۔ پوچھنا یہ ہے کہ مرکن کسے کہتے ہیں؟ نیز موجودہ دور میں اس کا اطلاق کس برتن و پیمانے پر ہوتا ہے اور اس کی کتنی مقدار ہے؟ یعنی اس میں کتنی مقدار پانی سما جاتا ہے۔ جواب مع حوالہ جات تحریر فرمائیں۔ عین نوازش ہوگی۔

الجواب حامداًومصلیاً.....(۱)۔المعجم الوسیط (صفحہ ۳۷۱) پر اور دیگر شروحات حدیث کی کتابوں میں ''مرکن'' کے معنی یوں لکھے ہیں ''المرکن: وعاء تغسل فیھا الثیاب ''یعنی ''مرکن'' وہ برتن ہے جس میں کپڑے وغیرہ دھوئے جاتے ہیں۔موجودہ دور میں اس کا اطلاق فارسی زبان میں ''لگن'' جبکہ اردو زبان میں ''ٹب'' پر ہوتا ہے۔

(۲)۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب اکیلے غسل فرماتے تھے تو عام عادتِ مبارکہ یہ تھی کہ ایک صاع (یعنی 3.184272 کلوگرام) کی مقدار کے برتن سے غسل فرماتے تھے، اور جب کسی زوجۂ محترمہ کے ساتھ اکٹھے غسل فرماتے تھے تو ایک ''فرق'' یعنی تین صاع (9.52816 کلوگرام) کی مقدار کے برتن سے غسل فرماتے تھے۔

جن احادیث طیبہ میں ''مرکن'' (ٹب) یا ''اناء واحد'' (ایک برتن) سے کسی زوجۂ محترمہ کے ساتھ اکٹھے غسل فرمانا آیا ہے تو ان دونوں برتنوں کی مقدار معلوم اور متعین نہیں ہے۔اب یہ ''مرکن'' یا تو ''فرق'' کے برابر تھا یا ''فرق'' سے بڑا تھا، بظاہر بڑا ہی معلوم ہوتا ہے، اب بڑا ہونے کی صورت میں یہ لازم نہیں آرہا کہ پانی سے بھی بھرا ہوا ہو، بلکہ ہوسکتا ہے کہ پانی ''فرق'' ہی کی مقدار ہوتا ہوگا بوجہ عام عادتِ مبارکہ اور مدینہ طیبہ میں عموماً پانی کی قلت کے، ہاں اگر پانی وافر مقدار میں کبھی دستیاب ہوتا تو کچھ بعید نہیں کہ یہ ''مرکن'' پانی سے بھی بھرا ہوا ہوتا ہوگا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وافر مقدار پانی سے غسل فرمایا کرتے ہوں گے۔اور یہی تفصیل ''اناء واحد'' میں بھی ہے۔

لمافی صحیح البخاری(۲/۱۰۹۰): ان عائشة قالت: قد کان یوضع لی ولرسول اللہ ﷺ ھذا المرکن فنشرع فیه جمیعاً.

وفی المعجم الوسیط(ص ۳۷۱): المرکن: وعاء تغسل فیه الثیاب (ج) مراکن.

وفی فتح الملھم (۳/۱۸۱): قوله "فی مرکن" الخ: ھو الاجانة التی تغسل فیھا الثیاب أی "لکن".

وفی الدیباج علی صحیح مسلم للسیوطی(۱/۳۰۲): مرکن: بکسر المیم وفتح الکاف، الاجانة التی یغسل فیھا الثیاب.

وفی صحیح البخاری(۱/۳۹): عن عائشة قالت کنت اغتسل أنا والنبی ﷺ من اناء واحد من قدح یقال له الفرق

...... سمعت اباسلمة يقول: دخلت أنا واخو عائشة على عائشة فسألها اخوها عن غسل رسول الله ﷺ فدعت بانآء نحو من صاع فاغتسلت وافاضت على رأسها وبيننا وبينها حجاب...... عن شعبة قدر صاع.

وفي فتح الباري (۱/۲۹۲): وادعى بعض الشارحين ان حديث ميمونة هذا لا مناسبة له بالترجمة لانه لم يذكر فيه قدر الاناء والجواب ان ذالك يستفاد من مقدمة اخرى وهي أن اوانيهم كانت صغاراً...... فيدخل هذا الحديث تحت قوله ونحوه اى نحو الصاع. او يحمل المطلق فيه على المقيد في حديث عائشة وهو الفرق لكون كل منهما زوجة له.

وفي فيض الباري (۱/۳۴۸): قوله: "الفرق" اناء يسع ثلاثة اصع فان كان ملآن يصير لكل منهما صاع ونصف والمعروف في عادته في الغسل صاع وقد مرّ انه لا تحديد فيه والامر تقريبي. وان كان خالياً فالامر تحقيقي...... فانه لا يلزم بكون الفرق هذا القدر ان يكون الماء فيه ايضاً كذالك فيمكن أن يكون الماء على قدر عادته.

کتاب الصلوٰۃ

(نماز کا بیان)

﴿فصل فی المواقیت﴾

(اوقاتِ نماز سے متعلق مسائل کا بیان)

(۱) تہجد اور ظہر کا وقت

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے سنا ہے کہ ظہر کی نماز سردیوں میں جلدی اور گرمیوں میں تاخیر سے پڑھنی چاہئے جبکہ آجکل یہاں کراچی میں یہ معمول ہے کہ ظہر کی نماز ڈیڑھ یا پونے دو بجے پڑھی جاتی ہے کیا اسطرح کرنا درست ہے؟ نیز تہجد کا وقت کب شروع ہوتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... ظہر کی نماز کا وقت سورج ڈھلنے سے لے کر ہر چیز کے سایہ اصلی کے علاوہ جب اسکا سایہ دگنا ہو جائے اسوقت تک باقی رہتا ہے یہی احناف کا مشہور اور معمول بہا مذہب ہے۔ اس اعتبار سے اس وقت میں جو بھی نماز ادا کرلے نماز ادا ہو جائیگی اگرچہ مستحب یہ ہے کہ سردیوں میں جلدی اور گرمیوں میں تاخیر سے ادا کی جائے لیکن اگر ایک متعین وقت میں پڑھنے کی وجہ سے جماعت میں زیادہ افراد کی شرکت کا گمان ہو تو ایک وقت میں پڑھنا بھی بہتر ہے۔

نیز تہجد کا وقت عشاء کے بعد سے شروع ہو جاتا ہے البتہ افضل وقت آخری حصہ میں سو کر اٹھنے کے بعد کا ہے۔

لما فی الشامیة (۱/۳۵۹): (قوله وعلیه عمل الناس الیوم) أی فی کثیر من البلاد والاحسن مافی السراج عن شیخ الاسلام ان الاحتیاط ان لایؤخر الظهر الی المثل وان لایصلی العصر حتی یبلغ المثلین لیکون مؤدیا للصلاتین فی وقتهما بالاجماع.

(۲) قرآن پاک سے پانچ وقت کی نمازوں کا ثبوت

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قرآن پاک سے پانچ وقت کی نمازوں کا کوئی ثبوت ہے یا نہیں؟ میرا ایک دوست ہے وہ کہتا ہے کہ کوئی ثبوت نہیں ہے صرف احادیث میں ذکر ملتا ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... قرآن کریم میں بہت سی آیات ایسی ہیں جو پانچوں نمازوں کے ثبوت پر دلالت کرتی ہیں، آپ کے دوست کا یہ کہنا کہ قرآن کریم میں نمازوں کا کوئی ثبوت نہیں ہے، یہ ان کی قرآن کریم سے لاعلمی ہے۔ جیسا کہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(البقرہ: ۴۳): اقیموا الصلاة. (الایة) (ترجمہ) ''اور قائم کرو نماز کو'' (تفسیر طبری ۲:۷۷)

(النساء: ۱۰۳): ان الصلاۃ کانت علی المؤمنین کتابا موقوتاً.

(ترجمہ) ''یقیناً نماز مسلمانوں پر فرض ہے اور وقت کے ساتھ محدود ہے۔''

مذکورہ دونوں آیات کریمہ پانچوں نمازوں کے ثبوت پر اجمالاً دلالت کرتی ہیں۔ (طبری ۱:۱۶۹)

(الروم: ۱۷): فسبحان اللہ حین تمسون وحین تصبحون.

(ترجمہ) ''سوتم اللہ کی تسبیح کیا کرو شام کے وقت اور صبح کے وقت۔''

مذکورہ آیت کریمہ فسبحان اللہ حین تمسون سے مغرب کی نماز اور وحین تصبحون سے فجر کی نماز ثابت ہوتی ہے۔ (تفسیر طبری ۲:۱۷۹)

(الروم: ۱۸): ولہ الحمد فی السموات والارض وعشیاً وحین تظھرون.

(ترجمہ) ''تمام آسمان اور زمین میں اسی کی حمد ہوتی ہے اور بعد زوال اور ظہر کے وقت''۔ مذکورہ آیت کریمہ میں وعشیا سے عصر کی نماز وحین تظھرون سے ظہر کی نماز ثابت ہوتی ہے۔ (تفسیر طبری ۲:۱۷۹)

(الاسراء: ۷۸): اقم الصلاۃ لدلوک الشمس الی غسق الیل وقرآن الفجر

(ترجمہ) ''آفتاب ڈھلنے کے بعد سے رات کے اندھیرے ہونے تک نمازیں ادا کیا کیجئے اور صبح کی نماز بھی۔

مذکورہ آیت کریمہ پانچوں نمازوں کے ثبوت پر تفصیلاً دلالت کرتی ہے۔

لمافی البدائع الصنائع (۱/۴۵۵): أما فرضیتھا فثابتة بالکتاب، والسنة، والاجماع، والمعقول، أما الکتاب فقولہ تعالیٰ فی غیر موضع من القرآن ''اقیموا الصلاۃ'' وقولہ ''ان الصلاۃ کانت علی المؤمنین کتاباً موقوتا......'' وقولہ تعالیٰ ''حافظو علی الصلوات والصلاۃ الوسطی''.

ومطلق اسم الصلاۃ: ینصرف الی الصلوات المعھودۃ وھی التی تؤدی فی کل یوم و لیلة (وقولہ تعالیٰ اقم الصلوۃ طرفی النھار الایة یجمع الصلوات الخمس لان صلاۃ الفجر تؤدی فی احد طرفی النھار، وصلاۃ الظھر والعصر یؤدیان فی الطرف الآخر، اذالنھار قسمان، غداۃ وعشی والغداء اسم لاول النھار الی وقت الزوال، وما بعدہ العشی، حتی إن حلف لایأکل العشی فاکل بعد الزوال یحنث، فدخل فی طرفی النھار ثلاث صلوات ودخل فی قولہ وزلفا من اللیل المغرب والعشاء لانھا یؤدیان فی زلف من اللیل وھی ساعتہ.

وفیہ ایضاً (صـ۴۵۶) وقولہ تعالیٰ ''اقم الصلاۃ لدلوک الشمس........'' قیل دلوک الشمس زوالھا، ''غسق الیل'' اوّل ظلمتہ فیدخل فیہ صلاۃ الظھر والعصر وقولہ تعالیٰ وقرآن الفجر وھو صلاۃ الفجر، فثبتت فرضیة ثلاث صلوات بھذہ الایة وفرضیة صلاۃ المغرب والعشاء ثبتت بدلیل

اخر ...... روی عن ابن عباسؓ انه قال حين تمسون المغرب والعشاء وحين تصبحون الفجر وعشيا العصر، وحين تظهرون الظهر، ذكر التسبيح واراد به الصلاة اى صلوا لله: إما لان التسبيح من لوازم الصلاة: اولانه تنزيه: والصلاة من اولها الى اخرها تنزيه الرب عزوجل لما فيها من اظهار الحاجات اليه، واظهار العجز والضعف وفيه وصف له بالجلال والعظمة والرفعة والتعالى عن الحاجة ...... قوله تعالىٰ وسبح بحمد ربک الخ قيل فى تأويل قوله تعالىٰ فسبح اى فصل قبل طلوع الشمس هو صلاة الصبح، وقبل غروبها هو صلاة الظهر والعصر، ومن آناء الليل صلاة المغرب والعشاء، قوله واطراف النهار على التكرار والاعادة تاكيداً كما فى قوله تعالىٰ حافظوا على الصلوات والصلاة الوسطى الأيه ان ذكر الصلاة الوسطى على التاكيد لدخولها تحت اسم الصلوات كذا ههنا.

وقوله تعالىٰ فى بيوت اذن الله الخ قيل الذكر التسبيح ههناهما الصلاة وقيل الذكر سائر الاذكار والتسبيح الصلاة، وقوله تعالىٰ بالغدو صلاة الغداة وقوله تعالىٰ الأصال صلاة الظهروالعصر والمغرب و العشاء وقيل الآصال هو صلاة العصر ويحتمل العصر والظهر لانهما يؤديان فى الاصيل وهو العشى وفرضية المغرب والعشاء عرفت بدليل أخر.

(۳) صبح کاذب کیا ہے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کہتا ہے کہ صبح کاذب جس کا احادیث میں ذکر ہے بروجی روشنی ہی ہے (جو سال بھر میں صرف دو ماہ وسط اگست سے وسط اکتوبر میں ہی نظر آسکتی ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی میں رمضان المبارک میں آئی ہی نہیں) جبکہ دوسرا شخص اس کی تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ صبح کاذب شامیؒ کے حوالہ کے مطابق وہ روشنی ہے جو صبح صادق شروع ہونے سے تین درجہ پہلے نمودار ہوتی ہے۔ شرعی نقطہ نگاہ سے ان دونوں اقوال میں سے کون سا قول درست ہے یا ان کے علاوہ کوئی اور درست قول ہے تو اس کو بتلا دیا جائے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... واضح رہنا چاہئے کہ شرعی احکامات کا تعلق مشاہدے سے ہے۔ کسی سائنس یا ریاضی کے حسابات سے نہیں ہے۔ اور چونکہ روزے کی ابتداء نماز فجر وغیرہ کے تمام شرعی احکامات کا تعلق صبح صادق سے ہے جو کہ ہر جگہ پورے سال نظر آتی ہے۔ جبکہ صبح کاذب سے کوئی بھی شرعی حکم ثابت نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کی کھوج میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ جس جگہ یہ نظر آجائے، اس کی وجہ سے صبح صادق کا دھوکہ نہ ہو جائے، اس لئے حدیث میں اس کی مخصوص نشانیاں بتلا دی گئی ہیں، مثلاً

(۱)۔ یہ صبح صادق سے کچھ پہلے طلوع ہوتی ہے۔

(۲)۔ اس کی روشنی صبح صادق کی طرح عرضاً نہیں بلکہ عموداً ہوتی ہے۔

(۳)۔اس کی مشابہت بھیڑیئے کی دم کی طرح ہوتی ہے۔
(۴)۔اور اس کے بعد صبح صادق سے قبل دوبارہ اندھیرا چھا جاتا ہے۔
(۵)۔اس کے طلوع ہونے کا وقت علامہ شامیؒ کے مطابق صبحِ صادق سے تین درجے پہلے کا ہے۔

لما فی الشامية (۱/۳۵۹): (قوله من أول طلوع الخ) زاد لفظ أول اختياراً لمادل عليه الحديث كما قدمناه. (قوله. وهو البياض الخ) لحديث مسلم والترمذی. واللفظ له "لايمنعكم من سحوركم اذان بلال ولا الفجر المستطيل ولكن الفجر المستطير" فالمعتبر الفجر الصادق وهو الفجر المستطير فی الافق. أی الذی ينتشر ضوئه فی اطراف السماء، لا الكاذب. وهو المستطيل الذی يبدو طويلاً فی السماء كذنب السرحان. أی الذئب ثم يعقبه ظلمة.

(فائدة)...... ذكر العلامة المرحوم الشيخ خليل الكاملی فی حاشيته علی رسالة الاسطرلاب لشيخ مشايخنا العلامة المحقق علی آفندی الداغستانی، أن التفاوت بين الفجرين و كذا بين الشفقين الأحمر والأبيض، إنما هو بثلاث درج. (قوله إلی قبيل) كذا أقحمه فی النهر، والظاهر أنه مبنی علی دخول الغاية،لكن التحقيق عدمه لكونها غاية مد كما سبق.

وفی المعجم الوسيط(ص۶۷۵):(الفجر) انكشاف ظلمة الليل عن نور الصبح وهما فجران، أحدهما المستطيل، وهو الكاذب ،والآخر، المستطير المنتشر فی الافق.

(۴) طلوع آفتاب کے بعد اشراق کا صحیح وقت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ طلوع آفتاب سے کتنے منٹ بعد اشراق کا وقت شروع ہوتا ہے اور کتنے منٹ بعد پڑھنا افضل ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً...... طلوع آفتاب کے وقت نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔ یہاں تک کہ آفتاب ایک نیزہ کے برابر اوپر آجائے۔تو نماز پڑھنا جائز ہے جس کی مقدار 10 سے 20 منٹ ہیں۔لہٰذا صورت مسئولہ میں اشراق کے نفل پڑھنے کا وقت طلوع آفتاب کے 10 منٹ بعد سے شروع ہوتا ہے اور افضل یہ ہے کہ 20 منٹ بعد ادا کی جائے۔

لمافی البحر الرائق(۱/۴۴۳): وذكر فی الأصل مالم ترتفع الشمس قدر رمح فهی فی حكم الطلوع واختار الفضلیؒ ان الانسان مادام يقدر علی النظر الی قرص الشمس فی الطلوع فلا تحل الصلوة فاذا عجز عن النظر حلت.

وفی الشامية(۱/۳۷۱): (قوله مع شروق) ومادامت العين لاتحار فيها فهی فی حكم الشروق كما

تقدم في الغروب انه الأصح كمافي البحر، أقول ينبغي تصحيح ما نقلوه عن الأصل للامام محمد من انه مالم ترتفع الشمس قدر رمح فهي في حكم الطلوع لان اصحاب المتون مشوا عليه في صلوة العيد حيث جعلوا أول وقتها من الارتفاع ولذا جزم به هنا في الفيض ونور الايضاح.

وفي الفقه الاسلامي وادلته(۱/۶۷۷): فالاوقات الخمسة هي مايأتي، (۱) مابعد صلوة الصبح حتى ترتفع الشمس كرمح في رأى العين (۲) ووقت طلوع الشمس حتى ترتفع قدر رمح اى بعد طلوعها بمقدار ثلث ساعة.

(۵) وہ اوقات جن میں نفل پڑھنا مکروہ ہے

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک بزرگ نے مجھے صبح کی نماز کے وقت دو رکعت نفل پڑھنے کیلئے بتائے ہیں وہ میں دوسال سے برابر پڑھ رہا ہوں۔ پچھلے رمضان میں تبلیغ کیلئے عشرہ پر گیا چنانچہ وہاں جب میں نے معمول کے مطابق فجر کی سنتوں سے پہلے دو رکعت نفل پڑھی تو امیر صاحب نے بتایا کہ فجر میں دو رکعت سنت کے علاوہ نفل پڑھنا جائز نہیں۔ کیا امیر صاحب کی یہ بات درست ہے نیز کونسے اوقات میں نفل جائز نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں امیر صاحب کی بات درست ہے کہ طلوع فجر کے بعد سے لے کر سورج بلند ہونے تک فجر کی چار رکعتوں کے علاوہ کوئی دوسری نماز پڑھنا مکروہ ہے باقی جن اوقات میں نفل پڑھنا مکروہ ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱)۔طلوع فجر یعنی فجر کا وقت داخل ہونے کے بعد سورج نکلنے تک۔ (۲)۔زوال کے وقت (۳)۔عصر کی نماز کے بعد سے لے کر مغرب کی نماز تک۔ (۴)۔اور جب فرض نماز کھڑی ہوجائے یا فرض نماز کا وقت تنگ ہو۔ (۵)۔اور جب امام جمعہ کا خطبہ دینے کیلئے کھڑا ہو۔ (۶)۔عید کی نماز سے پہلے مطلقاً یعنی گھر میں بھی اور مسجد میں بھی اور عید کی نماز کے بعد مسجد میں نفل پڑھنا مکروہ ہے نہ کہ گھر میں۔

لمافي الهندية(۱/۵۲): تسعة أوقات يكره فيها النوافل وما في معناها لا الفرائض هكذا في النهاية والكفاية...... منها ما بعد طلوع الفجر قبل صلاة الفجر كذا في النهاية والكفاية، يكره فيه التطوع بأكثر من سنة الفجر...... ومنها مابعد صلاة الفجر قبل طلوع الشمس هكذا في النهاية والكفاية ومنها ما بعد صلاة العصر قبل التغير...... ومنها ما بعد غروب الشمس قبل صلاة المغرب وعند الاقامة يوم الجمعة وعند خطبة الجمعة والعيدين والكسوف والاستسقاء...... ويكره التنفل عند خطبة الحج وخطبة النكاح...... ويكره التطوع اذا خرج الامام للخطبة يوم الجمعة...... ويكره التنفل اذا أقيمت الصلاة الا سنة الفجر ان لم يخف فوت الجماعة وقبل صلاة العيد مطلقا وبعدها في

المسجد لافی البیت وبین صلاته الجمع بعرفة ومزدلفة.....ویکره جمیع الصلوة سوی الوقتیة اذا ضاق وقت المکتوبة..... ویکره الصلاة وقت مدافعة البول أو الغائط ووقت حضور الطعام اذا کانت النفس تائقة الیه والوقت الذی یوجد فیه ما یشغل البال من افعال الصلاة ویخل بالخشوع کائنا ما کان الشاغل ویکره اداء العشاء ما بعد نصف اللیل هکذا فی البحر الرائق.

وفی الدر المختار (۱/۳۷۵): وکذا الحکم من کراهة نفل..... بعد طلوع فجر سوی سنته.

(۶) اوقاتِ مکروہہ میں تحیۃ المسجد ادا کرنا

سوال..... کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جن اوقات میں نماز پڑھنا مکروہ ہے ان اوقات میں اگر کوئی مسجد میں آ جائے تو تحیۃ المسجد پڑھ سکتا ہے کہ نہیں؟ ہمارے ہاں بعض حضرات کا کہنا ہے کہ پڑھ سکتا ہے اور یہ حضرات دلیل میں یہ روایت پیش کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا مفہوم ہے کہ جب تم میں سے کوئی شخص مسجد میں آئے تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعات پڑھے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کونسی بات صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....اوقاتِ مکروہہ (طلوع، غروب اور زوالِ آفتاب) میں نماز پڑھنا چاہے فرض ہو یا واجب، سنت ہو یا نفل ممنوع ہے۔ اسی طرح صبح صادق سے طلوعِ آفتاب تک اور عصر کی فرض نماز کے بعد سے مغرب تک صرف نوافل مکروہ ہیں فرائض ادا کئے جاسکتے ہیں۔ اب ان پانچ اوقات میں مسجد میں آنیوالوں کیلئے تحیۃ المسجد جو نوافل کے قبیل سے ہے پڑھنا مکروہ ہے۔ سوال میں ذکر کردہ روایت صحیح وثابت ہے چنانچہ بخاری، مسلم اور ابوداؤد وغیرہ میں معمولی اختلاف کیساتھ موجود ہے اور اسی روایت سے استدلال کرتے ہوئے حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ہر وقت تحیۃ المسجد کے نفل پڑھے جاسکتے ہیں جبکہ دوسری روایات سے استدلال کرتے ہوئے احناف فرماتے ہیں کہ یہ روایات ان اوقات کیساتھ خاص ہیں جن میں نوافل پڑھنا جائز ہے۔ نیز احناف کے مذہب پر عمل کرنے میں احتیاط بھی زیادہ ہے کیونکہ تحیۃ المسجد پڑھنا زیادہ سے زیادہ مستحب ہے جبکہ ان اوقاتِ مکروہہ میں نماز پڑھنا مکروہِ تحریمی ہے۔

لمافی الشامیة (۱/۳۷۵): (قوله ولو تحیة المسجد) اشاربه الی انه لافرق بین ماله سبب اولا کمافی البحر خلافاللشافعی فیماله سبب کالرواتب وتحیة المسجد.

(۷) مغرب اور عشاء کی نماز کے درمیان کتنی دیر کا وقفہ ضروری ہے؟

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں صوبہ سرحد ضلع چترال کا رہنے والا ہوں، چترال شہر میں نمازوں کے اوقات کے لئے اور رمضان میں افطاری کے اوقات کی تعیین کے لئے کراچی سے ایک چارٹ بن کر آ گیا ہے اس میں مغرب اور عشاء کے درمیان کم از کم ڈیڑھ گھنٹہ بتایا ہے اس ڈیڑھ گھنٹے کے مطابق عمل کرتے ہوئے ہم لوگ نمازیں پڑھتے ہیں اور ہم

چونکہ دیہات میں رہتے ہیں وہاں غروب آفتاب جلدی ہوتا ہے، غروب آفتاب کے بعد اذان دے کر ہم مغرب کی نماز پڑھ لیتے ہیں۔ لیکن جون جولائی کے مہینے میں مغرب کے بعد عشاء کے لئے ڈیڑھ گھنٹے کا اعتبار کرنے سے پونے دو گھنٹہ یعنی ایک گھنٹہ ۴۷ منٹ تک انتظار کرنا پڑتا ہے اور اس طرح ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرنے سے کافی رات گزر جاتی ہے اور لوگ حرج میں مبتلا ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ چارٹ شہر کے لئے ہے دیہات والوں کے لئے یہ نہیں ہے۔

(۱)۔اب پوچھنا یہی ہے کہ کیا ہم جون جولائی کے مہینے میں بھی دوسرے مہینوں کی طرح ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کر کے نماز عشاء ادا کریں گے یا مغرب کی نماز کے بعد سے حساب کر کے جیسے ہی ڈیڑھ گھنٹہ ہو جائے عشاء کی نماز ادا کریں گے۔

(۲)۔مغرب اور عشاء کے درمیان کتنی دیر وقفہ کرنا ضروری ہے۔

(۳)۔آیا اس شہر والے نقشہ کی اتباع کرنا ہمارے لئے ضروری ہے یا دیہات کیلئے کوئی الگ حکم ہے۔

اس بارے میں ہمارے علاقے کے لوگوں میں بہت اختلافات پیدا ہو چکے ہیں اس کشیدگی کی وجہ سے اکثر لوگ گھروں میں نمازیں پڑھ رہے ہیں۔ براہ کرم شریعت مطہرہ کی روشنی میں مفصل اور تسلی بخش جواب دے کر لوگوں میں اس نزاع کو ختم فرما کر عنداللہ اجر عظیم کا مستحق ہو جائے۔

الجواب حامداً ومصلیاً......عشاء کی نماز کا ابتدائی وقت شفقِ ابیض کے غروب سے شروع ہوتا ہے یعنی جب افق پر موجود سرخی ختم ہو جائے اور پھر اس کے بعد پھیلنے والی سفیدی بھی ختم ہو جائے تو عشاء کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔صورت مسئولہ میں جس چارٹ کا حوالہ دیا گیا ہے اس میں عشاء کا ذکر کردہ وقت اگر غروب شفق ابیض کے موافق ہے تو دیہات میں بھی اس چارٹ کا لحاظ کرنا ضروری ہے کیونکہ شہر کے مضافات میں بھی شہر کے اوقات کا اعتبار ہوتا ہے چونکہ عشاء کی نماز میں معیار غروب شفقِ ابیض ہے اور اس کی مقدار اہل تجربہ ڈیڑھ گھنٹہ بتاتے ہیں اور یہ مقدار بعض موسموں میں ۴،۵ منٹ زیادہ یا کم ہوتی رہتی ہے۔لہٰذا مغرب اور عشاء کے درمیان ڈیڑھ گھنٹہ سے کم فاصلہ نہیں کرنا چاہئے بلکہ احتیاطاً پونے دو گھنٹہ کا فاصلہ کرنا چاہئے اور آپ کے مقامی علماء کرام کو چاہئے کہ نمازی حضرات کو سمجھائیں کہ وقت ہونے پر ہی نماز ادا کریں تاکہ سب حضرات مسجد میں باجماعت نماز ادا کریں۔

لمافی البحر الرائق(۱/۴۲۷): قوله(وهو البياض) اى الشفق هو البياض عند الامام...... وعندهما وهو رواية عنه هو الحمرة ...... وصرح فى المجمع بان عليها الفتوى ورده المحقق فى فتح القدير ...... ورجحه ايضاً تلميذه قاسم فى تصحيح القدورى۔ وقال فى آخره: فثبت ان قول الامام هو الاصح اهـ وبهذا ظهر انه لايفتى ويعمل الا بقول الامام الاعظم ولا يعدل عنه الى قولهما أو قول احدهما أو غيرهما الالضرورة ...... وفى السراج الوهاج: فقولهما او سع للناس وقول ابى حنيفة احوط.

وفى الهندية(۱/۵۱): ووقت المغرب منه الى غيبوبة الشفق وهو الحمرة عندهما وبه يفتى هكذا فى شرح الوقاية وعند ابى حنيفة الشفق هو البياض الذى يلى الحمرة هكذا فى القدورى وقولهما

اوسع للناس وقول ابی حنیفة رحمه الله احوط لان الاصل فی باب الصلاة ان لایثبت فیها رکن ولا شرط الا بما فیه یقین کذا فی النهایة ناقلاً عن الاسرار .ومبسوط شیخ الاسلام.

وفی الدرالمختار مع الشامیة(۱/۳۶۱): ووقت المغرب منه الی غروب الشفق وهو الحمرة عندهما وبه قالت الثلاثة والیه رجع الامام کما فی شروح المجمع وغیرها فکان هو المذهب وقال العلامة الشامی علیه الرحمة: قال العلامة قاسم: فثبت ان قول الامام هو الاصح ومشی علیه فی البحر مؤیداً له بما قدمناه عنه...... لکن تعامل الناس الیوم فی عامة البلاد علی قولهما وقد ایده فی النهر تبعاً للنقایة والوقایة والدرر والاصلاح ودرر البحار والامداد والمواهب وشرحه البرهان وغیرهم مصرحین بان علیه الفتوی وفی السراج: قولهما اوسع وقوله احوط.

(۸) مغرب اورعشاء کا درمیانی وقفہ

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک دوست ہے جس نے تبلیغ میں بھی وقت لگایا ہے،فرماتے ہیں کہ مغرب اورعشاء کے درمیان ڈیڑھ گھنٹے کا وقت ہوتا ہے،تواس کی یہ بات درست ہے یانہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... مغرب اورعشاء کے درمیان کا وقت ہمیشہ یکساں نہیں رہتا ماہ بماہ کچھ کچھ دنوں میں گھٹتا بڑھتا رہتا ہے لیکن یہ فاصلہ زیادہ سے زیادہ ہمارے شہری (مجوزہ نقشوں کے مطابق) ایک گھنٹہ انتیس منٹ ہوتا ہے (جولائی کے بعض دنوں میں) اورکم سے کم ایک گھنٹہ اکیس منٹ ہوتا ہے (نومبر کے بعض دنوں میں)،اس لئے آپ کے دوست کا مطلق یہ کہہ دینا مغرب وعشاء کے درمیان کا وقت ڈیڑھ گھنٹہ ہوتا ہے درست نہیں، باقی ایام میں اس وقفہ کومعلوم کرنے کیلئے مساجد میں لگے مجوزہ نقشوں کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

لمافی الدر المختار مع الشامیة (۱/۳۶۱): (و) وقت (المغرب منه الی) غروب (الشفق وهو الحمرة) عندهما وبه قالت الثلاثة والیه رجع الامام کما فی شروح المجمع وغیرها......

واذا تعارضت الأخبار والاثار فلا یخرج وقت المغرب بالشک کمافی الهدایة وغیرها ...... لکن تعامل الناس الیوم فی عامة البلاد علی قولهما...... (تنبیه) قدمنا قریباً أن التفاوت بین الشفقین بثلاث درج کما بین الفجرین فلیحفظ.

(۹) چھ ماہ دن، چھ ماہ رات رہنے والے ممالک میں ادائیگی نماز کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ظہر کی نماز دلوک شمس کے بعد واجب ہوتی ہے تو جہاں چھ مہینے دن اور چھ مہینے رات ہو، وہاں ظہر کی نماز کا کیا حکم ہے جبکہ دلوک شمس تو نہیں پایا گیا؟

الجواب حامداًومصلیاً......جن ممالک میں چھ مہینے دن اور چھ مہینے رات رہتی ہو، وہاں کے لوگ اپنے قریبی معتدل ممالک کی نمازوں کے اوقات کے مطابق اندازاً اپنی نمازوں کے اوقات مقرر کر کے پڑھیں گے۔

لما فی الدر المختار (۱/۳۶۲،۳۶۳): (وفاقد وقتهما) کبلغار فان فیها یطلع الفجر قبل غروب الشفق فی اربعینیة الشتاء، (مکلف بهما فیقدر لهما) ولاینوی القضاء لفقد وقت الأداء، به أفتی البرهان الکبیر واختاره الکمال وتبعه ابن الشحنة فی الغازه فصححه فزعم المصنف انه المذهب،

وفی الشامية تحته: (قوله فیقدر لهما) هذا موجود فی نسخ المتن المجردة ساقط من المنح ولم أرمن سبقه الیه سوی صاحب الفیض حیث قال ولو کانوا فی بلدة یطلع فیها الفجر قبل غیبوبة الشفق لایجب علیهم صلاة العشاء لعدم السبب وقیل یجب ویقدرا لوقت، بقی الکلام فی معنی التقدیر والذی یظهر من عبارة الفیض ان المراد انه یجب قضاء العشاء بأن یقدر أن الوقت أعنی سبب الوجوب قد وجد کما یقدر وجوده فی ایام الدجال علی مایاتی لانه لایجب بدون السبب فیکون قوله ویقدر الوقت جواباً عن قوله فی الاول لعدم السبب وحاصله انا لانسلم لزوم وجود السبب حقیقة بل یکفی تقدیره کما فی ایام الدجال، ویحتمل ان المراد بالتقدیر المذکور هوما قاله الشافعیة من انه یکون وقت العشاء فی حقهم بقدر مایغیب فیه الشفق فی اقرب البلاد الیهم.

(۱۰) ضرورت کے وقت نمازِ عصر کو وقت سے پہلے پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فوج اگر محاذ جنگ میں عصر کی نماز وقت سے پہلے پڑھے، تو کیا اس طرح ان کی نماز درست ہوگی؟

الجواب حامداًومصلیاً......ظاہر الروایہ اور مفتی بہ قول کے مطابق عصر کی نماز کو سایۂ اصلی کے علاوہ مثلین تک انتظار کر کے پڑھنا چاہئے۔ اس سے پہلے عام حالات میں نماز عصر پڑھنا درست نہیں تاہم اگر کسی ضرورت شدیدہ کی وجہ سے جیسا کہ صورت مسئولہ میں ہے مثلین تک انتظار کرنے کی بجائے اوّل وقت یعنی ایک مثل کے بعد پڑھ لے تو اختلاف فقہاء کی وجہ سے گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

لمافی التاتارخانية(۱/۴۰۳): واوّل وقت العصر عند أبی یوسف ومحمدؒ اذا صار الظل قامة وزاد علیها وذکر أبو سلیمان عن أبی یوسف أنه یعتبر الزیادة قال أبو الحسن الخلاف فی آخر وقت الظهر هو خلاف فی اقل وقت العصر وفی الغیاثية واوّل وقت العصر اذا صارظل کل شئی مثلیه. وهو المختار.

وفی الدر المختار مع الشامية (۱/۳۵۹): وعنه مثله وهو قولهما وزفر والائمة الثلاثة قال الامام

الطحاوی وبه نأخذ وفی غرر الاذکار وهو المأخوذ به وفی البرهان وهو الاظهر لبیان جبریل وهو نص فی الباب وفی الفیض وعلیه عمل الناس الیوم وبه یفتی (سوی فیئی).

(قوله الی بلوغ الظل مثلیه) هذا ظاهر الروایة عن الامام نهایة وهو الصحیح بدائع ومحیط وینابیع وهو المختار غیاثیة واختاره الامام المحبوبی وعول علیه النسفی وصدر الشریعة تصحیح قاسم واختاره اصحاب المتون وارتضاه الشارحون فقول الطحاوی وبقولهما ناخذ لا یدل علی أنه المذهب وما فی الفیض من أنه یفتی بقولهما فی العصر والعشاء مسلم فی العشاء فقط علی مافیه وتمامه فی البحر...... (قوله وعلیه عمل الناس الیوم) أی فی کثیر من البلاد والا حسن مافی السراج عن شیخ الاسلام أن الاحتیاط أن لا یؤخر الظهر الی المثل وان لا یصلی العصر حتی یبلغ المثلین لیکون مؤدیا للصلاتین فی وقتهما بالاجماع وانظر هل اذا لزم من تأخیره العصر الی المثلین فوت الجماعة یکون الاولی التاخیر ام لا والظاهر الأول بل یلزم لمن اعتقد رجحان قول الامام تامل.

(۱۱) نمازِ مغرب کو وقتِ عشاء سے پندرہ منٹ قبل ادا کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک مرتبہ کلفٹن اپنے گھر جارہا تھا کہ راستے میں مغرب کی نماز میں نے ادا نہیں کی۔ جب مقام پر پہنچا تو ابھی عشاء کا وقت (بمطابق کلینڈر) داخل ہونے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ میں نماز مغرب ادا کرنے لگا تو میرے ساتھی نے کہا کہ مغرب کا وقت ختم ہو چکا ہے، اب آپ قضاء نماز ادا کریں۔ تو کیا یہ نمازِ مغرب قضاء وقت میں شمار ہوگی یا اداوقت میں؟ سنا ہے کہ مغرب کا وقت بہت مختصر ہوتا ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... نماز مغرب کا وقت غروب آفتاب کے بعد شروع ہو جاتا ہے اور انتہاء وقتِ مغرب ''شفق ابیض'' (یعنی غروب آفتاب کے بعد مغربی جانب آسمان پر پھیلی ہوئی سفیدی) کے غائب ہونے پر ہے، اور نمازِ مغرب کے مجموعی وقت کا گھٹنا اور بڑھنا دنوں کے گھٹنے اور بڑھنے پر موقوف ہے۔ لہٰذا گرمی کے موسم میں نمازِ مغرب کا مجموعی وقت تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ اور سردی کے موسم میں سوا گھنٹہ ہے، لوگوں پر آسانی کے پیش نظر اسی پر فتویٰ ہے۔ ہماری مساجد میں عام طور پر آویزاں نمازوں کے نظام الاوقات کا دائمی نقشہ بھی مذکورہ وقت کے حساب سے مرتب ہے، اسی نقشہ کے نظام الاوقات کو ملحوظ رکھتے ہوئے نمازوں کی ادائیگی کریں۔ آپ کی تحریر کردہ صورت کے مطابق کہ نماز عشاء کے وقت کے داخل ہونے میں پندرہ منٹ باقی تھے، تو ایسی صورت میں آپ کی نماز ادا ہی شمار ہوگی، لیکن نمازِ مغرب کو بلا کسی عذر کے مؤخر کرنا مکروہ ہے۔

لمافی الصحیح لمسلم (۱/۲۲۳): عن عبدالله بن عمرو ان رسول الله ﷺ قال وقت الظهر اذا زالت الشمس وکان ظل الرجل کطوله مالم تحضر العصر ووقت العصر مالم تصفر الشمس

ووقت صلوة المغرب مالم يغب الشفق ووقت صلوة العشاء الى نصف الليل الاوسط ووقت صلوة الصبح من طلوع الفجر مالم تطلع الشمس فاذا طلعت الشمس فامسک عن الصلوة فانها تطلع بين قرنى الشيطان.

وفى الهداية(۱/۷۸): وأول وقت المغرب اذا غربت الشمس وآخر وقتها مالم يغب الشفق ...... ثم االشفق هو البياض الذى فى الأفق بعد الحمرة عند أبى حنيفة وعندهما هو الحمرة.

وفى الشامية (۱/۳۶۱): (قوله واليه رجع الامام) اى الى قولهما الذى هو رواية عنه ايضا وصرح فى المجمع بأن عليها الفتوى، ورده المحقق فى الفتح بانه لايساعده رواية ولادراية الخ وقال تلميذه العلامة قاسم فى تصحيح القدورى، ان رجوعه لم يثبت، لما نقله الكافة من لدن الأئمة الثلاثة الى اليوم من حكاية القولين ودعوى عمل عامة الصحابة بخلافه خلاف المنقول قال فى الاختيار: الشفق البياض، وهو مذهب الصديق ومعاذ بن جبل و عائشة رضى الله عنهم قلت: ورواه عبدالرزاق عن ابى هريرة وعن عمر بن عبدالعزيز ولم يروالبيهقى الشفق الاحمر الاعن ابن عمر ...... وتمامه فيه واذا تعارضت الأخبار والآثار فلا يخرج وقت المغرب بالشک كما فى الهداية وغيرها قال العلامة قاسم: فثبت ان قول الامام هو الاصح، ومشى عليه فى البحر مؤيد اله بما قدمناه عنه، من انه لايعدل عن قول الامام الالضرورة من ضعف دليل اوتعامل......تنبيه قدمنا قريبا ان التفاوت بين الشفقين بثلاث درج كما بين الفجرين فليحفظ.

(۱۲) سفر کی نمازوں کو پیشگی قصر کرنے کا حکم نیز کسی عذر کی وجہ سے دو وقتوں کی نمازوں کو ایک وقت میں جمع کرنا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگ سفر پر جانے سے پہلے ان وقتوں کی نمازوں کی قصر پیشگی گھر پرادا کر لیتے ہیں جن کے بارے میں انہیں اندیشہ ہے کہ وہ سفر میں ادانہیں کر سکیں گے، مثلاً اگر سفر ظہر سے پہلے شروع کیا اور رات گئے اپنی منزل پر پہنچنے کا امکان ہے تو یہ لوگ ظہر، عصر، مغرب کی نماز قصر پیشگی ادا کر لیتے ہیں، کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا تھا؟ ائمہ اربعہ کا اس بارے میں مسلک ضرور بیان فرمائیں۔

(۲)...... عرب ممالک میں بارش آندھی وغیرہ کے دن اکثر دووقتوں کی نماز ایک ساتھ جمع کر لی جاتی ہے اس بارے میں شرعاً کیا حکم ہے؟ یوم عرفات میں مسجد میں ظہر اور عصر کی نماز جمع کی جاتی ہے سوال یہ ہے کہ اگر ایک شخص مسجد نہ جاسکا تو پھر وہ خیمہ میں نماز پڑھتا ہے چاہے

تنہا یا مختصر جماعت کے ساتھ تو وہ نماز جمع کرے گا یا پھر دونوں نمازوں کو اپنے اپنے وقت پر پوری پڑھے گا یا قصر پڑھے گا حج میں لوگ قصر ہی پڑھتے ہیں؟ تفصیلی جواب عنایت فرما کر مشکور فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......(۱)۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے شریعتِ مطہرہ کو آسان بنایا ہے، اسلئے لوگوں کی آسانی کیلئے مختلف حالتوں میں مختلف احکام دیئے ہیں انہی احکام میں سے حالتِ سفر میں نمازوں کی قصر کا حکم ہے۔ البتہ نمازوں کی قصر کیلئے ضروری ہے کہ سفر کی حالت ہو، لہٰذا جب تک سفر شروع نہ ہوا ہو، ائمہ اربعہؒ میں سے کسی کے نزدیک قصر جائز نہیں ہے۔ لہٰذا جو لوگ سفر شروع کرنے سے پہلے گھروں ہی میں سفر میں آنے والی نمازوں کو قصر کرتے ہیں یہ کسی کے نزدیک جائز نہیں ہے۔

(۲)......اور رہا مسئلہ حالتِ سفر میں نمازوں کو جمع کرنے کا تو ائمہ اربعہؒ کا اس بارے میں اختلاف ہے، احنافؒ کے نزدیک سفر کی وجہ سے نمازوں کو جمع کرنا جائز نہیں ہے۔ جبکہ ائمہ ثلاثہ امام مالک، امام شافعی، امام احمد رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک سفر کی وجہ سے نمازوں کو جمع کرنا جائز ہے۔ لیکن یہ اختلاف جمع بین الصلاتین میں ہے یعنی دو نمازوں کو جمع کرنے کے بارے میں ہے اور وہ دو نمازیں یا تو ظہر وعصر کی نمازیں ہیں یا مغرب وعشاء کی تقدیماً یا تاخیراً۔ لیکن یہ کسی کے نزدیک جائز نہیں ہے کہ سب نمازوں کو ایک ہی وقت میں پڑھا جائے پس صورت مسئولہ میں اگر سفر شروع کرنے سے پہلے نمازوں کو جمع کرتے ہیں تو یہ کسی کے نزدیک جائز نہیں ہے اور اگر سفر شروع کرنے کے بعد جمع کرتے ہیں پھر اگر ساری ہی نمازیں اکٹھی پڑھتے ہیں تو یہ بھی کسی کے نزدیک جائز نہیں ہے اور اگر دو نمازوں کو یعنی ظہر وعصر کو یا مغرب وعشاء کو جمع کرتے ہیں تو ائمہ ثلاثہؒ کے نزدیک چند شرطوں کے ساتھ جائز ہے لیکن احنافؒ کے نزدیک جائز نہیں ہے۔

(۳)......عرب ممالک میں چونکہ اکثر ائمہ ثلاثہؒ کے مقلدین رہتے ہیں اور ائمہ ثلاثہؒ کے نزدیک بارش وآندھی وغیرہ کی وجہ سے جمع بین الصلاتین جائز ہے اس لئے وہ حضرات بارش وغیرہ کی وجہ سے جمع بین الصلاتین کرتے ہیں۔ لیکن احنافؒ کے نزدیک یہ جائز نہیں ہے۔

(۴)...... یوم عرفات میں جمع بین الصلوتین کیلئے احنافؒ کے نزدیک صحیح قول کے مطابق یہ شرط ہے کہ خلیفۂ وقت یا اس کے نائب کے پیچھے نماز باجماعت پڑھی جائے، لہٰذا اگر کوئی شخص اکیلے نماز پڑھ رہا ہو یا کسی اور امام کے پیچھے پڑھ رہا ہو تو اُس کیلئے جمع بین الصلاتین جائز نہیں ہوگی بلکہ عصر کو اپنے وقت میں ہی پڑھے گا۔ اور لوگ عموماً حج میں مکہ مکرمہ میں اقامت کی نیت کر لیتے ہیں تو مکہ مکرمہ میں نمازیں پوری پڑھی جائیں گی البتہ عرفات میں چونکہ تھوڑے وقت کیلئے آتے ہیں اور وہاں مسافر ہوتے ہیں اس لئے قصر کرنا لازم ہوگا۔

لمافی قوله تعالیٰ (النساء: ۱۰۳): ان الصلوٰة كانت على المؤمنين كتاباً موقوتاً.

وفی الدر المختار (۲/۵۰۴): (صلى بهم الظهر والعصر باذان واقامتين) وقراءة سرية ولم يصل بينهما شيئاً على المذهب ولا بعداداء العصر فی وقت الظهر (وشرط) لصحة هذا الجمع الامام الاعظم أو نائبه والا صلوا وحداناه.

وفی الشامية تحته. (قوله والاصلوا وحدانا) يوهم جواز صلوة العصر فی وقت الظهر وعدم جواز الجماعة لوصليت العصر فی وقتها وليس بمراد فالاصوب قول الزيلعیؒ صلوا كل واحدة منهما فی

وقتها افاده ح اهـ.

وفی الفقه الاسلامی (۱۳۷۲/۲): یجوز عند الجمهور غیر الحنفیة الجمع بین الظهر والعصر تقدیما فی وقت الأولیٰ وتأخیراً فی وقت الثانیة، والجمعة کالظهر الخ......

وفی (صـ۱۳۷۴): اتفق مجیزو الجمع تقدیما وتأخیراً علی جوازه فی احوال ثلاثة هی السفر، والمطر ونحوه.

(۱۳) رمضان میں افطاری کی خاطر نماز مغرب کو کچھ تاخیر سے پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ رمضان میں افطاری کے لئے نماز مغرب میں کچھ تاخیر کر سکتے ہیں یا نہیں؟ کتب فقہ کی روشنی میں جواب دیجئے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... افطار کیلئے جماعت مغرب میں پانچ دس منٹ تاخیر کی گنجائش ہے۔

لمافی مراقی الفلاح(صـ۱۴۷): فکان تأخیرها مکروه الافی یوم غیم والا من عذر سفر او مرض وحضور مائدة والتاخیر قلیلا لا یکره؟

وفی الشامیة(۳۷۰/۱): ای المذکور فی المبتغی بقوله یکره تاخیر المغرب فی روایة و فی اخری لامالم یغب الشفق والاصح الاول الالعذر اهـ.

(۱۴) عذر کی بناپر نماز کو وقت سے پہلے پڑھنا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک اکیڈمی میں آٹھویں کلاس میں پڑھتا ہوں پڑھائی کا وقت تین سے سات تک ہے مسلسل اسباق ہوتے ہیں درمیان میں کوئی وقفہ نہیں ہوتا حتیٰ کہ نماز کا وقفہ بھی نہیں ہے اس وجہ سے میری نماز رہ جاتی ہے جس کی وجہ سے کافی پریشانی ہوتی ہے کیا تعلیم کی وجہ سے نماز چھوڑنا جائز ہے؟ نیز اس صورت کے پیش نظر میں عصر کی نماز وقت سے پہلے پڑھ سکتا ہوں یا نہیں؟ اب میرے لیے شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... نماز کی فرضیت اوقات مقررہ میں ہر عاقل بالغ مسلمان مرد وعورت پر ہے اور اس کا ثبوت آیاتِ قرآنیہ اور احادیث مشہورہ سے ہے اور بلا کسی عذر شرعی کے اس کا چھوڑنا جائز نہیں۔ لہٰذا اپنی تعلیمی مصروفیات میں سے نماز کا وقت نکال کر ادا کرنا ضروری ہے۔ اور کسی بھی نماز کو اپنے وقت سے پہلے پڑھنا جائز نہیں۔ اگر پڑھ بھی لی تو فرض ادا نہ ہوگا اور قضاء لازم ہوگی۔

لمافی ردالمحتار علی الدر المختار(۳۷۰/۱): یشترط لصحة الصلاة دخول الوقت واعتماد دخوله کمافی نور الایضاح وغیره، فلو شک فی دخول وقت العبادة فاتی بها فبان انه فعلها فی

الوقت لم یجزہ.

وفی الدر المختار (۱/۳۵۲): سببها ترادف النعم ثم الخطاب ثم الوقت الخ.

وفی الشامیة: (قوله سببها ترادف النعم الخ) یعنی ان سبب الصلوة الحقیقی هو ترادف النعم علی العبد،...... ولما کانت النعم واقعة فی الوقت جعل الوقت سببا بجعل الله تعالیٰ وخطابه حیث جعله سببا للوجوب لقوله تعالیٰ اقم الصلوة لدلوک الشمس فکان الوقت هو السبب المتاخر......

وفی الشامیة أیضاً(ص۳۵۷): وفی البحر عن الخلاصة غلام صلی العشاء ثم احتلم ولم ینتبه حتی طلع الفجر علیه اعادة العشاء هو المختار...... الی ان قال (قوله وانه الاصل) (قوله حتی یلزمهم)ای المجنون ومن ذکر بعده وکذا غیرهم ممن خرج علیه الوقت ولم یصل فیه قوله هو الصحیح.

﴿فصل فی الاذان﴾

(اذان واقامت سے متعلق مسائل کا بیان)

(۱۵) اذان واقامت کے شرائط وآداب

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اذان واقامت کے شرائط کیا ہیں؟ اسی طرح انکے آداب بھی بیان فرمادیں تاکہ ہم انکی رعایت کرسکیں. نیز نابالغ بچہ یا عورت اذان دے سکتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... کچھ شرائط مؤذن کیلئے ہیں اور کچھ اذان واقامت کیلئے، لہٰذا دونوں کو علیحدہ علیحدہ بیان کیا جاتا ہے۔

مؤذن کی شرائط...... اول مسلمان ہونا، دوم مرد ہونا، سوم عاقل ہونا۔

اذان واقامت کی شرائط...... وقت میں ہونا، عربی زبان میں ہونا، کلمات میں ترتیب کا پایا جانا، پے درپے ہونا یعنی درمیان میں بات چیت نہ کرنا۔

آداب...... بآواز بلند ہونا، مؤذن کا نیک وصالح ہونا، اذان کے وقت کانوں میں انگلیاں رکھنا، اذان کے کلمات ٹھہر ٹھہر کر جبکہ اقامت قدرِ عجلت سے ادا کرنا، قبلہ کی طرف منہ کرنا، حی علی الصلاۃ میں دائیں جانب اور حی علی الفلاح میں بائیں جانب منہ پھیرنا، اذان واقامت کہنے والے کا ایک ہونا۔

نیز عورت اور ناسمجھ بچے کی اذان درست نہیں لہٰذا اگر دونوں میں سے کسی نے بھی اذان دیدی تو اسکا اعادہ ضروری ہوگا البتہ اگر بچہ اتنا بڑا ہے کہ اسکو سمجھ بوجھ حاصل ہو تو اسکی اذان درست تو ہوجائیگی مگر بہتر یہ ہے کہ کوئی بالغ سمجھدار آدمی اذان دے۔

لمافی الشامیة (۱/۳۸۴): (قوله للرجال) امالنساء فیکره لهن الاذان وکذاالاقامة لماروی عن انس وابن عمر (رضی الله عنهما) من کراهتهمالهن ولأن مبنی حالهن علی السترورفع صوتهن حرام، امداد. ثم الظاهر انه یسن للصبی اذا اراد الصلاة کمایسن للبالغ وان کان فی کراهة اذانه لغیره کلام.

وفی (صـ۳۸۹): (قوله اعادماقدم فقط) کمالوقدم الفلاح علی الصلاة یعیده فقط ای ولایستأنف الاذان من اوله ......(قوله ولوردسلام) اوتشمیت عاطس اونحوهمالافی نفسه ولابعدالفراغ علی الصحیح. (وفی صـ۳۹۳) (قوله وجزم المصنف) أی حیث قال فیمامرقیدنابالمراهق لأن اذان

الصبی الذی لایعقل غیر صحیح کالمجنون والمعتوہ اھ فافھم وھذا ذکرہ فی البحر بحثا فترجح عندالمصنف فجزم بہ ویؤیدہ مافی شرح المنیۃ من انہ یجب اعادۃ اذان السکران والمجنون والصبی غیر العاقل لعدم حصول المقصود،لعدم الاعتماد علی قولھم.

(۱۶) حدودِ مسجد میں اذان نہ دینے کی وجہ کا بیان

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک مولوی صاحب سے سنا کہ مسجد میں اذان نہیں دینی چاہئے آپ سے معلوم یہ کرنا ہے کہ مولوی صاحب کا کہنا صحیح ہے یا نہیں؟ صحیح ہونے کی صورت میں اذان نہ دینے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے حالانکہ اذان میں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام اور نماز کی طرف دعوت ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ معلوم کرنی ہے ایک قاری صاحب فرمارہے تھے کہ مسجد میں ہوں تو **حی علی الصلاۃ** اور **حی علی الفلاح** کے جواب میں لاحول ولاقوۃ الا باللہ نہیں کہنا چاہیے مسجد سے باہر کہنا چاہیے، آیا ان کا یہ کہنا صحیح ہے یا نہیں؟ جواب عنایت فرمائیں اللہ تعالیٰ آپ کا حامی وناصر ہو۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... اذان بلند آواز سے بلند جگہ پر دی جائے تاکہ زیادہ دور تک آواز پہنچے جہاں تک مؤذن کی آواز پہنچے گی وہاں تک کی ہر چیز مؤذن کے حق میں گواہی دے گی مسجد کے اندر اذان نہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ وہاں سے آواز دور تک نہیں پہنچتی جس سے اذان کا اصل مقصد پوری طرح حاصل نہیں ہوتا، اس لئے بلند جگہ اذان دینا مستحب ہے تاکہ آواز دور تک پہنچ جائے البتہ اگر مسجد کے اندر بھی ایسا انتظام ہو جس سے آواز دور تک پہنچے (جیسے لاؤڈ اسپیکر وغیرہ) تو اس وقت مسجد کے اندر بھی اذان دے سکتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اذان کا جواب دینا مستحب ہے بعض علماء اذان کے جواب کو واجب کہتے ہیں مگر زیادہ معتمد یہی ہے کہ اجابت فعلی (اذان سن کر مسجد کی طرف جانا) واجب ہے اور اجابت قولی (اذان سن کر زبان سے جواب دینا) مستحب ہے حاضرین مسجد کیلئے ایک ہی صورت ہے کہ وہ زبان سے جواب دیں۔ چنانچہ قاری صاحب کا یہ کہنا کہ ''مسجد کے اندر''**حی علی الصلاۃ**''اور''**حی علی الفلاح**'' کے جواب میں ''**لاحول ولا قوۃ الا باللہ**''، ''نہیں کہنا چاہیے'' صحیح نہیں اس لئے کہ حدیث میں اذان کے جواب دینے کے بارے میں مطلق آیا ہے اس میں مسجد کے اندر ہونے اور نہ ہونے میں کوئی فرق نہیں کیا گیا ہے۔

لمافی البخاری (۱/۸۶): عن ابی سعید الخدری ان رسول اللہ ﷺ قال اذا سمعتم النداء فقولوا مثل مایقول الموذن...... قال یحیی وحدثنی بعض اخواننا انہ قال لما قال حی الصلاۃ قال لاحول ولاقوۃ الا باللہ وقال ھکذا سمعنا نبیکم ﷺ یقول

وفیہ أیضاً (۱/۸۶): ان ابا سعید الخدری قال لہ انی اراک تحب الغنم والبادیۃ فاذا کنت فی غنمک او بادیتک فاذنت للصلوۃ فارفع صوتک بالنداء فانہ لا یسمع مدی صوت المؤذن جن ولا انس ولا شیٔ الاشھد لہ یوم القیمۃ قال ابو سعید سمعتہ من رسول اللہ ﷺ.

وفی اعلاء السنن(۲/۱۴۰): .... فالذی یظهر ان المقصود هو رفع الصوت والا علام التام اینما حصل فلا تعارض بینهما فان رفع الصوت قد حصل فی الموضعین لعدم المانع فیهما بخلاف صحن المسجد.

وفی الطحطاوی علی الدر(۱/۱۸۸): (قوله ولو کان بمسجد لا) فیه ان اجابة اللسان مندوبة عنده فالمانع من تحصیلها فی المسجد.

وفی الدر المختار(۱/۳۹۸): (فیقطع قراءة القرآن لو) کان یقرأ (بمنزله، ویجیب) لو أذان مسجد کما یاتی (ولو بمسجد لا) لانه اجاب بالحضور وهذا متفرع علی قول الحلوانی، وأما عندنا فیقطع ویجیب بلسانه مطلقا والظاهر وجوبها باللسان لظاهر الامر فی حدیث اذا سمعتم الموذن فقولوا مثل مایقول.

وفی الفقه الاسلامی وادلته(۱/۷۰۴): اما رفع الصوت فلیکون ابلغ فی اعلامه واعظم لثوابه کما ذکر حدیث ابی سعید اذا کنت فی غنمک ولما رواه الخمسة الا الترمذی عن ابی هریرة ان النبی ﷺ قال المؤذن یغفر له مدّ صوته ویشهد له کل رطب ویابس الخ.

وفی فتاویٰ اللجنة الدائمة للبحوث العلمیة والافتاء(۶/۶۵): ج: الاذان بمکبرات الصوت لتبلیغ من بعد وغیره لاحرج فیه لمافی ذلک من المصلحة العامة.

(۱۷) ایک مسجد کی اذان دوسری مسجد کیلئے کافی نہیں

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دوقریبی مساجد ہیں کیا دونوں میں اذان دینا ضروری ہے یانہیں؟ اگر کسی مسجد میں اذان نہیں دی گئی تو کیا وہ گناہگار ہوں گے یانہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً......اذان شعائرِ اسلام میں سے ہے۔اور ہروہ مسجد جس میں جماعت ہوتی ہے اس میں اذان مسنون ہےلہٰذا کہیں دو قریبی مسجدیں ہوں تو ہر مسجد میں اذان دیناضروری ہے۔ایک مسجد کی اذان دوسری مسجد کیلئے کافی نہیں۔اگر کسی مسجد میں اذان نہ دی گئی تو وہ گنہگار رہوں گے۔

لمافی الهندیة(۱/۵۴): ویکره اداء المکتوبة بالجماعة فی المسجد بغیر اذان وإقامة.

وفی الدر المختار(۱/۳۹۴،۳۹۵): (وکره ترکهما) معا (لمسافر) ولو منفرداً (وکذا ترکها) لاترکه لحضور الرفقة (بخلاف مصل) ولو بجماعة (فی بیته بمصر) اوقریة لها مسجد

وفی الشامیة تحته:(قوله ولو بجماعة) وعن ابی حنیفة: لو اکتفوا بأذان الناس اجزاءهم وقد أساءوا

ففرق بین الواحد والجماعة فی هذه الروایة بحر

(۱۸) مختلف جگہوں پر اذان پوری کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مؤذن کا مختلف جگہوں پر کھڑے ہوکر اذان پوری کرنا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اذان میں سنت یہ ہے کہ ایسی جگہ پر کھڑے ہوکر دی جائے کہ چاروں طرف بآسانی آواز پہنچ جائے اور بہتر یہ ہے کہ حیعلتین پر بھی دائیں بائیں طرف منہ کرتے وقت قدم ایک ہی جگہ پر رہیں، تاہم ضرورت کی بنا پر تھوڑا بہت دائیں بائیں ہونے کی بھی گنجائش ہے جیسے منارہ پر بغیر آلۂ مکبر الصوت کے اذان دی جائے لیکن آج کل چونکہ آلہ مکبر الصوت پر دی جاتی ہے اس میں ایک ہی جگہ پر کھڑے ہوکر اذان پوری کرنا ضروری ہے۔ اور ایک ہی اذان کا مختلف جگہوں پر اس طور پر دینا کہ اس میں ٹھہراؤ نہ ہو اور چلنے کی سی صورت پیدا ہوجائے تو یہ سنت سے ثابت نہیں ہے۔

لمافی الهندیة (۱/۵۶): وان استدار فی صومعته عند اتساعها فحسن هكذا فی البدائع فیستدیر المؤذن فی المأذنة عند الحیعلتین ویخرج رأسه من الكوة الیمنی ویقول حیّ علی الصلوة مرّتین ثم من الكوّة الیسریٰ ویقول حیّ علی الفلاح مرّتین، وهذا اذا لم یتم الإعلام مع بقاء المؤذن فی مقامه.

وفی اللجنة الدائمة(۵۸/۶): یشرع للمؤذن الذی یؤذن فی غیر مكرفون أن یلتفت یمینا وشمالا عند الحیعلة مع ثبوت قدمه لان ذالک ثبت من فصل مؤذن رسول الله ﷺ بحضرته ولأنه ابلغ فی اسماع النداء للصلواة لمن بعد عن المسجد.

(۱۹) لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے اذان دینے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بذریعہ لاؤڈ اسپیکر اذان دینا کیسا ہے جبکہ مسجد کے آس پاس تھوڑے سے گھر ہوں اور لاؤڈ اسپیکر کے بغیر آواز ان گھروں تک پہنچ سکتی ہو؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اذان سے مقصود اعلام ہوتا ہے لہٰذا اذان جتنی بلند آواز سے دی جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ صورت مسئولہ میں اگرچہ بغیر لاؤڈ اسپیکر کے بستی والوں تک اذان کی آواز پہنچتی ہے لیکن اگر لاؤڈ اسپیکر میں اذان دی جائے تو اذان کی آواز علی وجہ الکمال پہنچے گی۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جہاں تک اذان کی آواز جائے گی تو وہاں تک کی ہر ہر چیز قیامت کے دن گواہی دے گی۔ اس لئے لاؤڈ اسپیکر میں اذان دینا بہتر ہے۔

لمافی الهندیة(۱/۵۵): والسنة ان یؤذن فی موضع عال یكون اسمع لجیرانه ویرفع صوته ولا یجهد

نفسه ......

وفيه ايضاً(صـ٥٦): ويجعل اصبعيه فى اذنيه وان لم يفعل فحسن لانه ليس بسنة اصلية وانما شرع لاجل المبالغة فى الاعلام.

وفى الشامية(١/٣٨٨): (ويجعل اصبعيه الخ) لقوله ﷺ لبلال رضى الله عنه اجعل اصبعيك فى اذنيك فانه ارفع لصوتك وان جعل يديه على اذنيه فحسن لان أبا محذورةؓ ضم اصابعه الاربعة ووضعها على اذنيه...... (قوله فاذانه الخ) تفريع على قوله ندبا قال فى البحر والامر اى فى الحديث المذكور للندب بقرينة التعليل فلذا لولم يفعل كان حسنا فان قيل: ترك السنة كيف يكون حسنا؟ قلنا ان الاذان معه احسن فاذا تركه بقى الاذان حسنا كذا فى الكافى.

وفى اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والافتاء(٢/٦٥): الاذان بمكبرات الصوت لتبليغ من بعد وغيره لاحرج فيه لما فى ذلك من المصلحة العامة.

(۲۰) اذان میں اللہ اکبر اللہ اکبر پڑھنے کے طریقے

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اذان میں اللہ اکبر اللہ اکبر میں دوسرے لفظ اللہ کا ہمزہ ساقط ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً......اذان میں اللہ اکبر اللہ اکبر کو پڑھنے کے صحیح طریقے دو (۲) ہیں۔

(۱)...... پہلے اللہ اکبر کی راء کو ساکن پڑھیں اس صورت میں دوسرے لفظ اللہ کا ہمزہ ساقط نہ ہوگا۔

(۲)...... پہلے اللہ اکبر کی راء کو فتحہ دے کر دوسرے لفظ اللہ سے ملا کر (بنیت وقف) پڑھیں اس صورت میں دوسرے لفظ اللہ کا ہمزہ ساقط ہوگا۔ نیز پہلے اللہ اکبر کی راء کو ضمہ دے کر دوسرے لفظ اللہ سے ملا کر (ہمزہ ساقط کر کے) پڑھنا خلاف سنت ہے۔

لمافى الشامية (١/٣٨٦): والاصل فى اكبر تسكين الراء فحولت حركة الف اسم الله الى الراء كما فى ـآلم الله ـ وفى المغنى حركة الراء فتحة وان وصل بنية الوقف ثم قيل هى حركة الساكنين ولم يكسر حفظا لتفخيم الله وقيل نقلت حركة الهمزة وكل هذا خروج عن الظاهر والصواب ان حركة الراء ضمة اعراب وليس لهمزة الوصل ثبوت فى الدرج فتنقل حركتها و بالجملة الفرق بين الاذان وبين ـآلم الله ـ ظاهر فانه ليس لـ ـ آلم الله ـ حركة اعراب اصلا وقد كانت لكلمات الاذان اعرابا الا انه سمعت موقوفة......

وحاصلها ان السنة ان يسكن الراء من الله اكبر الاول اويصلها بالله اكبر الثانية فان سكنها كفى وان

وصلها نوی السکون فحرک الراء بالفتحة فان ضمها خالف السنة لان طلب الوقف علی اکبر الاول صیره کالساکن اصالة فحرک بالفتح.

(۲۱) اذانِ فجر میں الصلوٰۃ خیرٌ من النوم کا اضافہ

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فجر کی اذان میں الصلوٰۃ خیر من النوم کا اضافہ کب ہوا؟

الجواب حامداً ومصلیاً......احادیث مبارکہ کے تتبع سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ الصلوٰۃ خیر من النوم کا اضافہ ہجرت کے پہلے سال اذان کی مشروعیت کے کچھ دنوں بعد ہوا ہے اس لئے کہ جن صحابی (حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ) کو اذان کا الہام کیا گیا ہے انہیں سے الصلوٰۃ خیر من النوم کے اضافے سے متعلق ایک حدیث مروی ہے جس میں انہوں نے اذان کی مشروعیت کا واقعہ یوں بیان کیا ہے فرماتے ہیں کہ جب میں نے اپنا خواب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ سچا خواب ہے پھر اذان کہنے کا حکم دیا چنانچہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اذان کہا کرتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کیلئے بلانے آیا کرتے تھے ایک دفعہ صبح کی نماز کیلئے بلانے آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما رہے تھے حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے بآوازِ بلند الصلوٰۃ خیر من النوم کہا۔ اس حدیث کے راوی حضرت سعید بن مسیبؒ فرماتے ہیں کہ یہ کلمات اس وقت سے صبح کی اذان میں داخل کئے گئے ہیں۔ پس حدیث مذکور سے معلوم ہوا کہ الصلوٰۃ خیر من النوم کا اضافہ اذان کی مشروعیت کے کچھ ہی دنوں بعد ہوا ہے جبکہ اذان کی مشروعیت ہجرت کے پہلے سال ہوئی ہے۔

لما فی المسند الجامع(۳۰۳/۸): عن سعید بن المسیب عن عبداللہ بن زید بن عبدربه قال لما اجمع رسول الله ﷺ ان یضرب بالناقوس یجمع للصلاة الناس وهو له کاره لموافقته النصاری طاف بی من اللیل طائف وانا نائم رجل علیه ثوبان اخضران وفی یده ناقوس یحمله قال فقلت له یا عبدالله اتبیع الناقوس؟ قال وما تصنع به؟ قلت ندعوبه الی الصلوٰۃ قال افلا ادلک علی خیر من ذالک؟ قال قلت بلی قال تقول الله اکبر الله اکبر...... (الی ان قال) فاخبرته بما رأیت قال فقال رسول الله ﷺ ان هذه لرؤیاحق ان شاء الله ثم امر بالتاذین فکان بلال "رضی الله عنه" مولیٰ ابی بکر یوذن بذالک ویدعو رسول الله ﷺ الی الصلوٰۃ قال فجاء ہ فدعاہ ذات غد الی الفجر فقیل له ان رسول الله ﷺ نائم قال فصرخ بلال باعلیٰ صوته الصلاة خیر من النوم قال سعید بن المسیب فادخلت هذه الکلمة فی التاذین الی صلاة الفجر"

وفی الدر المختار(۳۸۳/۱): (سببه ابتداء اذان جبرئیل) لیلة الاسراء وإقامته حین امامته علیه الصلوة والسلام ثم رؤیا عبدالله بن زیدؓ اذان الملک النازل من السماء فی السنة الاولیٰ من الهجرة.

(۲۲) فجر کی اذان میں ''الصلوٰۃ خیر من النوم'' رہ جائے تو کیا حکم ہوگا؟

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اذانِ فجر میں اگر ''الصلوۃ خیر من النوم'' چھوٹ جائے تو کیا اذان کو دوبارہ لوٹانا ضروری ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً..... فجر کی اذان میں ''الصلوۃ خیر من النوم'' کہنا مستحب ہے۔ لہٰذا اگر ''الصلوۃ خیر من النوم'' چھوٹ جائے تو اذان کو دوبارہ لوٹانے کی ضرورت نہیں۔

لمافی الدرالمختار (۱/۳۸۷): (ویقول) ندبا (بعد فلاح اذان الفجر الصلوة خير من النوم مرتين) لانه وقت نوم وفی الشامية تحته : (قوله بعد فلاح الخ) فيه رد على من يقول ان محله بعد الاذان بتمامه.

وفی الفقه على المذاهب الاربعة (۱/۳۱۲): ثم يختم بقول لا اله الا الله الا فی صلوة الصبح فانه يندب ان يقول بعد حی علی الفلاح "الصلوة خير من النوم" مرتين واذا تركهما صح الاذان مع الكراهة.

(۲۳) بلاعذر بیٹھ کر اذان دینے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ اذان کیلئے کھڑا ہونا ضروری ہے یا بیٹھ کر بھی اذان دی جاسکتی ہے؟ اگر بغیر عذر کے کسی نے بیٹھ کر اذان دیدی تو کیا اعادہ واجب ہوگا؟

الجواب حامداًومصلیاً..... اذان کے الفاظ کھڑے ہوکر ادا کرنا سنت ہے اور بلاعذر بیٹھ کر اذان دینا مکروہ ہے البتہ اگر کسی نے بیٹھ کر اذان دیدی تو دوبارہ دینا ضروری نہیں۔ البتہ ایک صورت میں بیٹھ کر اذان دینا بلاکراہت درست ہے وہ یہ کہ جب کوئی شخص تنہا نماز پڑھے۔

وفی الهندية (۱/۵۴): ويكره الاذان قاعداوان اذن لنفسه قاعدافلابأس به.

(۲۴) کیا مؤذن گواہ کے حکم میں ہے؟

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مؤذن اذان میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی گواہی دیتا ہے تو کیا اس کا یہ اذان دینا گواہی دینے کے حکم میں ہوگا؟ اور کیا مؤذن میں بھی ان شرائط کا پایا جانا ضروری ہے جو گواہ بننے کیلئے ہوتی ہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً..... اذان دینے سے مقصود اوقات صلاۃ کیلئے اعلان کرنا ہوتا ہے، لہٰذا اذان دینا گواہی کے حکم میں نہیں اور نہ شرائط

گواہی اذان دینے کیلئے ضروری ہیں۔ البتہ مستحب یہ ہے کہ اذان دینے والا عادل، نیک وصالح ہو۔

لمافی الهندية(۱/۵۴):ویکره اذان الفاسق ولایعاد.

(۲۵) بچے کی اذان کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ ہماری مسجد میں ایک مرتبہ بارہ سال کے بچے نے اذان دیدی تو ایک آدمی نے اذان کا اعادہ کیا یہ کہتے ہوئے کہ بچے کی اذان درست نہیں ہے، کیا اس آدمی کی بات درست ہے؟ بچے کی اذان پر اعادہ لازم ہے کہ نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... بارہ سال کا بچہ کیونکہ عاقل ہے اسلئے اسکی اذان درست ہے اسکا اعادہ نہیں کیا جائیگا البتہ افضل یہ ہے کہ بالغ مکلف شخص اذان دیا کرے۔

لمافی الشامية (۱/۳۹۴): واما من حیث اقامة الشعار النافية للاثم عن اهل البلدة فيصح اذان الكل سوى الصبی الذی لایعقل لان من سمعه لایعلم انه مؤذن بل یظنه یلعب بخلاف الصبی العاقل لانه قریب من الرجال ولذاعبرعنه الشارح بالمراهق.

(۲۶) کئی سالوں کی قضاء نمازں کیلئے اذان واقامت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ ایک شخص کی کئی سال کی نمازیں قضاء ہوچکی ہیں اور اب وہ مستحبات بھی نہیں چھوڑنا چاہتا اگر یہ شخص ظہر کی نماز پڑھنے سے پہلے یا بعد میں قضاء نماز پڑھے تو آیا اذان کہے یا نہیں جبکہ اذان ہوچکی ہو نیز ایسے شخص کیلئے اپنی نمازوں کی قضاء بہتر ہے یا نوافل اور سنت مؤکدہ پڑھنا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں ایسے شخص کی کیونکہ کئی سال کی نمازیں فوت ہوچکی ہیں لہٰذا اسکو اختیار ہے کہ چاہے پہلے وقتی نماز پڑھے یا قضا پڑھے البتہ اگر وقت میں اتنی گنجائش ہے کہ چندفوت شدہ نمازیں ادا سے پہلے پڑھ سکتا ہے تو پہلے قضا نمازیں پڑھ لے۔ اور اس وقت میں جتنی قضا نمازیں پڑھیگا تو پہلی قضا کیلئے اذان واقامت دونوں کہے گا، باقی میں اسکو اختیار ہے چاہے تو اذان واقامت دونوں کہے یا صرف اقامت پر اکتفا کرے۔

نیز عام نوافل میں مشغول ہونے سے بہتر ہے کہ پہلے قضا نمازیں پڑھے البتہ سنن مؤکدہ وغیر مؤکدہ پڑھ لینی چاہئیں۔

لمافی مجمع الانهر (۱/۱۱۴): (وکذا) یؤذن ویقیم (لاولی الفوائت وخیر فيه للبواقی) ان شاء اذن واقام وان شاء اقام فقط ،هذااذاكان فی مجلس واحدواما اذا كان فی مجالس فانه یشترط کلاهما کمافی المستصفی.

وفی التاتارخانیة (۱/۴۷۷): وفی الحجة الاشتغال بقضاء الفوائت اولی واھم من النوافل الا السنن المعروفة وصلاۃ الضحی وصلاۃ التسبیح والصلوات التی رویت فی الاخبار.

(۲۷) قضاء نماز پڑھتے وقت اذان واقامت کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قضا نماز پڑھتے وقت اذان اور اقامت کہنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... قضاء شدہ نماز اگر ایک ہے تو اس کو پڑھتے وقت اذان واقامت پوری کہنا مسنون ہے چاہے باجماعت پڑھی جائے یا اکیلے پڑھی جائے، اگر ایک سے زائد ہیں تو سب سے پہلی نماز کیلئے اذان واقامت دونوں کا کہنا مسنون ہے اور بقیہ میں اختیار ہے چاہے تو اذان واقامت دونوں کہے یا صرف اقامت پر اکتفا کرے یہ اس وقت ہے جب ایک ہی مجلس میں ایک سے زائد نمازیں ادا کی جائیں البتہ اگر ہر ایک نماز الگ مجلس میں ادا کرے تو پھر ہر ایک کیلئے اذان واقامت کہنا مسنون ہے۔

لمافی الهندية (۱/۵۵): ومن فاتته صلاۃ فی وقتها فقضاها أذن لها وأقام واحدا کان او جماعة هکذا فی المحیط وإن فاتته صلوات أذن للاولی وأقام وکان مخیرا فی الباقی إن شاء أذن وأقام وإن شاء اقتصر علی الاقامة کذا فی الهداية وإن أذن وأقام لکل صلاۃ فحسن...... والتخییر فی البوا قی إنما هو إذا قضاها فی مجلس واحد اما إذا قضاها فی مجالس فیشترط کلاهما.

وفی الدرالمختار (۱/۳۹۰): (و) یسن أن (یؤذن ویقیم لفائتة)...... (وکذا) یسنان (لاولی الفوائت) لا لفاسدة (ویخیر فیه للباقی) لوفی مجلس وفعله اولی ویقیم للکل.

(۲۸) میت کو قبر میں اتارتے وقت اذان کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت کو قبر میں اتارتے وقت اذان دینا شرعاً کیسا ہے؟ جائز ہے یا بدعت؟ اگر بدعت ہے تو پھر نماز کے علاوہ اور مواقع میں کیوں جواز نقل کیا جاتا ہے ان میں وجہ فرق کیا ہے؟ تفصیل سے جواب مرحمت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... میت کو قبر میں اتارتے وقت اذان دینا شرعاً درست نہیں، فقہاء نے اسے بدعت لکھا ہے۔ اور دیگر مقامات پر نماز کے علاوہ جواز اذان کا جواز فقہاء نے نقل کیا ہے (مثلاً آندھی کے وقت، زلزلہ کے وقت، آگ لگ جانے کے وقت، جنات کی سرکشی کے وقت، کسی انسان یا جانور کی بدخلقی کے وقت، غمگین کے کان میں، مرگی کی بیماری کے وقت، غصہ کے وقت، نومولود بچہ کے کان میں) ان مقامات میں بعض تو منصوص ہیں مثلاً حزن کے وقت اور بچے کے کان میں اور جو غیر منصوص مقام ہیں ان میں بعض مقامات پر اذان دینے

سے دفع مضرت مقصود ہوتی ہے اور بعض میں جلب منفعت اور ان مواقع پر اذان دینے کو عبادت بھی نہیں سمجھا جاتا، اس کے برخلاف قبر پر اذان کو عام طور پر عبادت سمجھا جاتا ہے اور عبادت کے ثبوت کیلئے دلیل خاص کا ہونا ضروری ہے اور یہاں دلیل معدوم ہے اس لئے فقہاء نے اسے بدعت لکھا ہے۔

تنبیه...... میت کو قبر میں اتارتے وقت احادیث مبارکہ میں یہ دعا منقول ہے: ''**بسم الله وعلى ملّة رسول الله**'' لہٰذا اس دعاء کو پڑھنے کا اہتمام کرنا چاہئے۔

لمافي الشامية(۲/۲۳۵): **لا يسن الأذان عند إدخال الميت في قبره كما هو المعتاد الآن وقد صرّح ابن حجر في فتاويه بأنه بدعة وقال. ومن ظنّ أنّه سنة قياسا على ندبهما للمولود إلحاقا لخاتمة الأمر بابتدائه فلم يصب.**

وفي اللجنة الدائمة(۹/۷۲): **لايجوز الأذان ولا الاقامة عند القبر بعد دفن الميت ولا في القبر قبل دفنه لأن ذلك بدعة محدثة.**

(۲۹) شیعوں کا اذان میں ''علی ولی اللہ'' کا اضافہ کرنا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ شیعوں کا اذان میں ''علی ولی اللہ'' وغیرہ کا اضافہ کرنے کا شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... شیعوں کا اذان میں ''عَلِي وَلِيُّ اللهِ'' وغیرہ کا اضافہ کرنا بدعت ہے کیونکہ احادیث مبارکہ، اقوال صحابہ اور ائمہ مجتہدین میں کسی سے بھی ان کلمات کا اضافہ کرنا ثابت نہیں اور خود فقہاء شیعہ نے بھی اسکے عدم ثبوت کی صراحت اپنی کتابوں میں نقل کی ہے۔ لہٰذا اس سے بچنا شرعاً لازم ہے۔ واللہ اعلم

لمافي اللجنة الدائمة (۶/۹۲): س: **كيف يضع بعض المسلمين اسم علي بن ابي طالب رضي الله عنه في الاذان والاقامة وهل فعل ذلك رسول الله ﷺ واصحابه؟**

ج: **الاذان من العبادات والعبادات كلها توقيفية ولم يكن فيه ولا في الاقامة على عهد رسول الله ﷺ ولا على عهد خلفائه الراشدين ذكر اسم علي رضي الله عنه ولم يشرع ذلك. وانما ابتدعه الرافضة كما هو شانهم في الابتداع واهل السنة لايرون ذلك بل ينكرونه على فاعليه صيانة للتشريع الاسلامي عن البدع وحفظاله منها.**

وفي الحدائق الناضرة(۷/۴۰۳): (تاليف: شيخ يوسف البحراني): **قال: شيخنا الصدوق في الفقيه بعد نقل خبر ابي بكر الحضرمي وكليب الاسدي: قال: مصنف هذا الكتاب هذا هو الاذان**

الصحیح لایزاد فیہ ولا ینقص منہ والمفوضۃ (لعنھم اللہ) قدوضعوا اخباراً وزادوا فی الاذان "محمد وال محمد خیر البریۃ" مرتین وفی بعض روایاتھم بعد "أشھد ان محمدا رسول اللہ" "اشھد ان علیا ولی اللہ" مرتین ومنھم من روی بدل ذلک "اشھد ان علیا امیر المؤمنین حقا" مرتین ولاشک فی ان علیا ولی اللہ وأنہ امیر المؤمنین حقا وأن محمدا وال محمد (صلوٰت اللہ علیھم) خیر البریۃ و لکن لیس ذلک فی اصل الاذان وانما ذکرت ذلک لیعرف بھذہ الزیادۃ المتھمون بالتفویض المدلسون انفسھم فی جملتنا.

(۳۰) تہجد کی اذان کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عرب ممالک میں عام طور سے تہجد کی اذان ہوتی ہے فجر سے تقریباً آدھا گھنٹہ پہلے یہ کب سے شروع ہوئی یہ خلفائے راشدین کے وقت میں رائج تھی یا نہیں اگر یہ بعد میں شروع ہوئی تو کیا بدعت میں شمار ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... تہجد کیلئے اذان احناف کے ہاں ثابت نہیں یہ اذان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں شروع ہوئی تھی جو بعد میں نہیں رہی اور خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانے میں بھی نہیں تھی جیسا کہ طحاوی میں حضرت علقمہؒ کے اثر سے معلوم ہوتا ہے البتہ اگر کوئی تہجد کیلئے اذان دے تو یہ بدعت نہیں ہوگی کیونکہ اس کی اصل موجود ہے لیکن دینی نہیں چاہیے۔

لمافی الطحاوی (۱/۱۰۵): فھذا ابن عمر رضی اللہ عنھما یروی عن النبی ﷺ ماذکرنا، وھو ممن قدروی عن رسول اللہ ﷺ أنہ قال ان بلا لا ینادی بلیل فکلوا واشربوا حتی ینادی ابن ام مکتوم فثبت بذلک أن ماکان من ندائہ قبل طلوع الفجر مما کان مباحالہ، ھو لغیر الصلوۃ وأن ماأنکرہ علیہ اذ فعلہ قبل الفجر کان للصلوۃ..... (صـ ۱۴۱) وقدروی عن علقمۃ من ھذاشیء:..... عن ابراھیم قال شیعنا علقمۃ الی مکۃ فخرج بلیل فسمع مؤذنا یؤذن بلیل فقال أما ھذا فقد خالف سنۃ أصحاب رسول اللہ ﷺ لوکان نائما لکان خیرا لہ فإذا طلع الفجر أذن، فأخبر علقمۃ أن التأذین قبل طلوع الفجر خلاف لسنۃ أصحاب رسول اللہ ﷺ.

وفی الشامیۃ (۱/۳۸۵): (قولہ کعید) أی ووتر وجنازۃ وکسوف واستسقاء وتراویح وسنن رواتب لأنھا أتباع للفرائض والوتر وإن کان واجبا عندہ لکنہ یؤدی فی وقت العشاء فاکتفی بأذانہ لالکون الأذان لھما علی الصحیح کما ذکرہ الزیلعی بحر فافھم لکن فی التعلیل قصور لاقتضائہ سنیۃ الأذان لما لیس تبعا للفرائض کالعید ونحوہ فالمناسب التعلیل بعدم ورودہ فی السنۃ تأمل.

(۳۱) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اَذان دینے کا ثبوت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی خود بھی اذان دی ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... جی ہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سفر کے موقع پر خود بھی اَذان دینا ثابت ہے۔

لمافی الدرالمختار (۱/۴۰۱): **الافضل کون الامام هو المؤذن وفی الضیاء انه علیه الصلاة والسلام اذن فی سفر بنفسه واقام وصلی الظهر وقدحققناه فی الخزائن.**

وفی الشامیة تحت: **(قوله الافضل الخ) أی لقول عمر رضی الله عنه لولا الخلیفی لأذنت مع الامامة کما قدمناه وفی السراج ان اباحنیفة کان یباشر الاذان والاقامة بنفسه.(قوله وقد حققناه فی الخزائن) حیث قال بعد ماهنا هذا وفی شرح البخاری لابن حجر ومما یکثر السئوال عنه هل باشر النبی ﷺ الاذان بنفسه وقد اخرج الترمذی انه علیه السلام اذن فی سفر وصلی باصحابه وجزم به النووی وقواه ولکن وجد فی مسند احمد من هذا الوجه فامر بلالاً فاذن فعلم ان فی روایة الترمذی اختصاراً وان معنی قوله اذن امربلالاً کما یقال اعطی الخلیفة العالم الفلانی کذا وانما باشر العطاء غیره.**

وفی تقریرات الرافعی(ص۴۷): **قوله (ولکن وجد فی مسند احمد من هذا الوجه الخ) ذکر السندی مانصه وفی السراج روی عقبة بن عامر قال کنت مع رسول الله ﷺ فی سفر فلما زالت الشمس اذن بنفسه واقام وصلی الظهر وقال السیوطی ظفرت بحدیث آخر مرسل اخرجه سعید بن منصور فی سننه قال اذن رسول الله ﷺ مرة فقال حیی علی الصلاة وهذه روایة لاتقبل التاویل.**

(۳۲) ''اذان کا جواب'' دینے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماءِ کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ میں کہ کیا اذان کا جواب دینا واجب ہے؟ اگر واجب ہو تو کیا جس مسجد کی بھی اذان ہو اُن سب کا جواب دینا لازم ہوگا یا صرف اپنی مسجد کی اذان کا جواب دینا لازم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اذان کا جواب بالقول مستحب ہے اور بالفعل واجب ہے یعنی جب اذان کی آواز سنائی دے تو زبان سے جواب دینا مستحب ہے اور بالفعل کا مطلب یہ ہے کہ اذان سن کر نماز کیلئے جانا واجب ہے۔ پھر زبان سے جواب میں یہ تفصیل ہے کہ اگر متعدد اذانیں ہوں تو پہلی اذان کا جواب دیگا چاہے محلے کی مسجد میں ہو یا کہیں اور البتہ تمام اذانوں کا جواب دینا افضل ہے۔

وفي الشامية (۱/۳۹۶): (قوله قال الحلواني ندبا الخ) اى قال الحلوانى ان الاجابة باللسان مندوبة والواجبة هى الاجابة بالقدم......

وفيه ايضاً(۱/۳۹۷): (قوله ولوتكرر)أى بان اذن واحدبعدواحد،امالوسمعهم فى آنٍ واحدمن جهات فسيأتى (قوله اجاب الاول) سواء كان مؤذن مسجده اوغيره......اذا كان فى المسجد أكثرمن مؤذن أذنوا واحدا بعد واحد فالحرمة للاول.

(۳۳) جمعہ کی اذان ثانی کا جواب

سوال......کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جمعہ کی اذان جوخطبہ کے وقت ہوتی ہے اسکا جواب دیناچاہئے یاخاموش رہناچاہئے؟اسی طرح اس اذان کے بعد دعاپڑھی جائیگی یانہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً......جمعہ کی دوسری اذان کاجواب زبان سےنہیں دیناچاہیے بلکہ دل ہی میں دیدیناکافی ہےاسی طرح اس اذان کے بعدکی دعاکاترک افضل ہے۔

لمافى التاتارخانية (۲/۲۷):وفى الاوزجندى: اذا قال الخطيب؛ يايهاالذين آمنوا صلوا عليه (الاية) فى الخطبة فالأصح السكوت وفى الحجة ولوسكت فهوافضل تحقيقا للانصات والذى عليه عامة مشايخنا ان على القوم ان يستمعوا للخطبة من اولها الى آخرهاوقال ابوحنيفة ومحمد: واذا ذكر الله والرسول فى الخطبة يجب عليهم ان يستمعوا ولم يذكر الله تعالىٰ بالثناء عليه ولم يصلوا على النبى ﷺ.

وفى الدرالمختار(۱/۳۹۹):وينبغى ان لايجيب بلسانه اتفاقافى الاذان بين يدى الخطيب وان يجيب بقدمه اتفاقافى الاذان الاول يوم الجمعة لوجوب السعى بالنص.

(۳۴) چلتے ہوئے رک کراذان کاجواب دینابہتر ہے

سوال......کیافرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پیدل چلتے وقت اگراذان سنےتو چلتا ہواجواب دے یا ٹھہر کر؟

الجواب حامداًومصلیاً......اگر پیدل چلتے وقت اذان سنائی دےتواولیٰ وبہتر یہ ہے کہ ٹھہر کر جواب دے تاہم اگرکسی ضرورت کی بناپر چلتے چلتے جواب دیدےتوبھی کچھ حرج نہیں۔

لمافى الهندية(۱/۵۷): سمع الاذان وهو يمشى فالاولى أن يقف ساعة ويجيب.

وفی الشامیة(۱/۳۹۷): (قوله بزازیة) کذا نقله فی النهر ولم أره فیها فلتراجع نسخة أخری نعم رأیت فیها سمع وهو یمشی فالافضل أن یقف للاجابة لیکون فی مکان واحد.

(۳۵) دورانِ وعظ یا تقریر اذان کا جواب دینے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر دوران وعظ یا تقریر اذان شروع ہوجائے تو کیا جواب دینالازم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر دوران وعظ یا تقریر اذان شروع ہوجائے تو جواب دینالازم نہیں ہوگا کیونکہ وعظ اور تقریر کا مقصد مسلمانوں کو دین کی اہمیت اور دین کے احکامات سکھانا ہے۔لیکن بہتر یہ ہے کہ وعظ اور تقریر بند کر کے اذان کا جواب دیا جائے۔

لمافی الهندیة (۱/۵۷): یجب علی السامعین عند الاذان الاجابة......... ولا ینبغی ان یتکلم السامع فی خلال الاذان والاقامة ولا یشتغل بقراءة القرآن ولا بشئی من الاعمال سوی الاجابة.

وفی الشامیة (۱/۳۹۶): (قوله وتعلیم علم) ای شرعی فیما یظهر ولذا عبر فی الجوهرة بقراءة الفقه (قوله بخلاف قرآن) لانه لایفوت...... بخلاف التعلم فعلی هذا لویقرأ تعلما او تعلیما لایقطع.

(۳۶) اذان کے پورا ہوجانے کے بعد جواب دینا کیسا ہے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اذان پوری ہوجانے کے بعد اذان کا جواب دینا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... مستحب یہ ہے کہ اذان کا جواب اذان کے ساتھ ساتھ دیا جائے اور اگر کوئی شخص اذان کے ساتھ اذان کا جواب نہ دے سکا ہو تو اذان کے بعد جواب دے دے بشرطیکہ زیادہ وقت نہ گزرا ہو، اور اگر اذان کے بعد وقت زیادہ ہوگیا ہو تو جواب دینا شرعاً مستحب نہ ہوگا۔

لمافی حاشیة الطحطاوی علی الدر (۱/۲۰۱): قال فی النهر لم أره ثم اذا لم یجب حتی فرغ من تدارکه ان قصر الفصل.

وفی الدرالمختار (۱/۳۹۸): ولو لم یجبه حتی فرغ لم أره وینبغی تدارکه ان قصر الفصل.

وفی الشامیة تحته: فلوسکت حتی فرغ کل الاذان ثم اجاب قبل فاصل طویل کما فی اصل سنة الاجابة کما هو ظاهر.

(۳۷) ریڈیواورٹی وی کی اذان کاجواب دیناضروری نہیں

سوال......کیافرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عام طور پر ریڈیواورٹی وی میں نماز کے وقت اذان نشر کی جاتی ہے اگر کوئی شخص یہ اذان سن لےتو اس پر اذان کا جواب دیناضروری ہوگایانہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً......اس اذان کا جواب دیناضروری ہے جوسنت کے مطابق ہو،سنت کے مطابق وہ اذان ہے جس میں اعلام ہو،اور دینے والاسمجھ دارہو،چنانچہ اگر ناسمجھ بچہ اذان دیتاہےتو اس کی اذان کا جواب دیناضروری نہیں کیونکہ یہ سنت کے مطابق نہیں اور نہ لوگ اس کے کلام کااعتبارکریں گےاس کی اذان کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص پرندہ کواذان یاسجدہ تلاوت کی آیت سکھادےاوروہ پڑھے تواس صورت میں نہ جواب دیناضروری ہوگااور نہ سجدہ تلاوت واجب ہوگااسی طرح جوآوازٹکراکرواپس آتی ہےاس سےبھی وجوب ثابت نہیں ہوتاکیونکہ اس میں فقط اعلام ہےیہی حال ریڈیواورٹی وی کی اذان کاہےکہ ان میں فقط اعلام ہےاوراس لیےاگران پراذان آتی ہےتواس کاجواب دیناضروری نہیں۔

لمافی نور الایضاح(ص۶۷):واذا سمع المسنون منه امسک وقال مثله وحوقل فی الحیعلتین (حاشیه۔۱) وقید بالمسنون من الاذان فافاد انه اذا کان علی غیر وجه السنة کاذان المرأة وغیره لاتندب له المتابعة.

وفی الشامیة(۱/۳۹۴): وروی عن الامام انه تستحب اعادة اذان المرأة وعلی هذه الروایة مشی الزیلعی وذکر فی البدائع ایضاً أن أذان الصبی الذی لا یعقل لایجزی ویعاد لان ما یصدر لاعن عقل لایعتد به کصوت الطیور.

وفی الهندیة(۱/۱۳۲):ولا تجب اذا سمعها من طیر، هو المختار.

(۳۸) مرغ کی اذان پرنمازفجرپڑھناصحیح نہیں

سوال......کیافرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر قریب میں کوئی مسجد نہ ہوتو مرغ کی اذان پرنماز پڑھناشرعاً کیساہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......مرغ کی آوازکواذان سمجھنااورصرف اسی پراعتمادکر کےنمازفجر پڑھناصحیح نہیں،اولاًاس لئے کہ مرغ کی آواز عرف میں اذان کہہ دیتے ہیں ورنہ حقیقت میں یہ اذان نہیں ہے۔ثانیاًیہ بےوقت بانگ دے دیتاہےاس کووقت کی تعیین نہیں،ہاں اگر نماز کاوقت ہوجانے کادوسرے قرائن سےبھی علم ہوجائےتونماز پڑھناصحیح ہے۔

اوراذان شرعی تووہ مخصوص کلمات ہیں جواذان کےوقت میں کہے جاتے ہیں اوران کی ادائیگی کیلئےضروری ہے کہ اذان کوئی ایساعاقل مر

آدمی دے کہ جس پرلوگ بھروسہ کرتے ہوں تاکہ اذان کا مقصد "اعلام" صحیح طور پر حاصل ہوسکے۔ اور اگر مذکورہ صورت میں مسجد قریب نہیں ہے تو وقت ہوجانے پر خود اذان دے کر نماز پڑھنا چاہئے۔

لمافي الهندية (۱/۵۳): واهلية الاذان تعتمد بمعرفة القبلة والعلم بمواقيت الصلٰوة، كذا في فتاوىٰ قاضي خان. وينبغي ان يكون المؤذن رجلاعاقلا. صالحا تقياعالمابالسنة كذا في النهاية.

وفيه ايضاً (۱/۵۴): واذان الصبي الذي لايعقل لايجوز ويعاد وكذا المجنون هكذا في النهاية.

وفي الشامية (۱/۳۹۴): وذكر في البدائع ايضاً أن اذان الصبي الذي لايعقل لايجزى ويعاد، لان مايصدر لاعن عقل لايعتد به كصوت الطيور.

(۳۹) دینی کتب کا مطالعہ کرتے وقت اذان کا جواب دینے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دینی کتب کے مطالعے کے دوران اگر اذان کی آواز سنے تو کیا اذان کا جواب دے یا مطالعہ جاری رکھے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ میں بہتر یہ ہے کہ مطالعہ چھوڑ دے اور اذان کا جواب دے۔

لمافي الهندية (۱/۵۷): ولاينبغي ان يتكلم السامع في خلال الاذان والاقامة ولايشتغل قراءة القرآن ولا بشئ من الاعمال سوىٰ الاجابة ولوكان في القراءة ينبغي ان يقطع ويشتغل بالاستماع والاجابة.

وفي الدر المختار (۱/۳۹۶ تا ۳۹۸): (يجيب) وجوبا وقال الحلواني ندباً والواجب الاجابة بالقدم (من سمع الاذان) ولوجنبا لا حائضا ونفساء وسامع خطبة وفي صلاة جنازة وجماع ومستراح واكل وتعليم علم وتعلمه بخلاف القرآن (بأن يقول) بلسانه (كمقالة) ان سمع المسنون منه وهو ماعربيا..... (ولوكان في المسجد حين سمعه ليس عليه الاجابة ولوكان خارجه اجاب) بالمشي اليه (بالقدم ولواجاب باللسان لابه لايكون مجيباً)..... (فيقطع قرأة القرآن لو) كان يقرأ (بمنزله ويجيب).

(۴۰) اذان میں اللہ اکبر کے جواب میں صرف جل جلالہ کہنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اذان کے اندر اللہ اکبر کے جواب میں صرف "جل جلالہ" کہنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اَذان کے اندر اللہ اکبر کے جواب میں صرف جل جلالہ کہنا خلاف سنت ہے، اذان کے جواب میں اذان ہی کے کلمات دہرانے چاہئیں البتہ "حی علی الصلاۃ، حی علی الفلاح" کے جواب میں "لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم" اور "الصلوٰۃ خیر من النوم" کے جواب میں "صدقت و بررت وبالحق نطقت" کہنا چاہئے۔

لمافی الهندية (۱/۵۸): ويجب على السامعين عند الاذان الاجابة وهى ان يقول مثل ما قال المؤذن الا فى قوله حى على الصلوة حى على الفلاح فانه يقول مكان حى على الصلوة لاحول ولا قوة الا بالله العلى العظيم .... وكذا فى قول المؤذن الصلاة خير من النوم لا يقول السامع مثله ولكن يقول صدقت وبررت.

وفى الطحطاوى(۱/۱۸۸): (قوله ويجيب وجوبا) على المعتمد للأمر به فى قوله عليه السلام فقولوا مثل مايقول (قوله ندباً) اى إجابة اللسان مندوبة (قوله والواجب).. (قوله ولوجنبا) لأنه ثنآء لا أذان.

وفى الشامية (۱/۳۹۶): (قوله من سمع الأذان) يفهم منه أنه لولم يسمع لصمم أو لبعد أنه لايجيب وهو ظاهر الحديث الآتى، إذا سمعتم الأذان" حيث علق على السماع وقد صرح بعض الشافعية بأنه الظاهر وبأنه يجيب فى جميعه إذا لم يسمع الا بعضه.

(۴۱) اقامت میں "اشهد ان محمدا رسول الله" کے جواب میں "ﷺ" کہنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اقامت میں اشهد ان محمدا رسول الله کے جواب میں صرف "صلی اللہ علیہ وسلم" کہنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اذان واقامت میں اشهد ان محمدا رسول الله کے جواب میں اشهد ان محمدا رسول الله ہی کہنا چاہئے۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ جیسے مؤذن کہے تم بھی ویسے کہو (بخاری شریف،۱/۸۶) اور حیعلتین کے جواب میں (لاحول ولاقوۃ الا باللہ) اور اقامت میں قدقامت الصلاۃ کے جواب میں (اقامها الله وادامها) کہو، لہٰذا اشهد ان محمدا رسول الله کے جواب میں صرف صلی اللہ علیہ وسلم کہنا صحیح نہیں۔ ہاں یوں کرسکتا ہے کہ جواب میں اشهد ان محمدا رسول الله کہہ کرتھوڑا سا توقف کرے اور پھر صلی اللہ علیہ وسلم بھی کہہ لے۔

لمافى البخارى (۱/۸۶): عن أبى سعيد الخدرى ان رسول الله ﷺ قال اذ اسمعتم النداء فقولوا مثل ما يقول المؤذن.

لمافى الهندية (۱/۵۷): ويجب على السامعين عند الاذان الاجابة وهى ان يقول مثل ما قال المؤذن

الا فی قولہ حی علی الصلوۃ حی علی الفلاح فانہ یقول مکان حی علی الصلوۃ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم

وفی الدر المختار (۱/۴۰۰): (ویجیب الاقامۃ) ندبا اجماعا (کالاذان) ویقول عند: قدقامت الصلاۃ اقامھا اللہ وادامھا۔

(۴۲) اذانِ مغرب کے بعد مروجہ وقفے کی شرعی حیثیت اور اس دوران نفل پڑھنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱)۔اذانِ مغرب کے بعد دو رکعت نماز نفل پڑھنے کی عندالاحناف شرعی حیثیت کیا ہے؟

(۲)۔آج کل بہت سی مساجد میں اذانِ مغرب کے بعد دو یا تین منٹ کا وقفہ دیا جاتا ہے شرعاً اس کی اجازت کیسی ہے؟ جبکہ اس سے قبل حنفی المسلک مساجد میں یہ ترتیب نہیں تھی۔ شرعی جواب عنایت فرمائیں، اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... نصوص میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مغرب سے پہلے دو رکعت پڑھنے کا معمول بنانا مکروہ ہے اور اس کی علت بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ نوافل پڑھنے کی وجہ سے مغرب کی نماز میں تأخیر لازم آتی ہے۔ حالانکہ نبی علیہ السلام نے مغرب میں تعجیل کا حکم فرمایا ہے" عن مرثد بن عبداللہ قال لما قدم ابو ایوب غازیاً وعقبۃ بن عامر یومئذ علی مصر فأخر المغرب فقام الیہ ابو ایوب فقال ماھذہ الصلوۃ یا عقبۃ قال شغلنا قال أما سمعت رسول اللہ ﷺ یقول لا یزال امتی بخیر أو قال علی الفطرۃ مالم یؤخروا المغرب إلی ان تشتبک النجوم" (ابوداؤد،۱/۶۰)،(ترجمہ): حضرت عقبہ بن عامر (رضی اللہ عنہ) نے ایک مرتبہ مغرب کی نماز میں تاخیر کی تو حضرت ابوایوب (رضی اللہ عنہ) کھڑے ہوگئے اور فرمایا یہ کونسی نماز ہے اے عقبہ۔حضرت عقبہ نے فرمایا ہم مشغول کردیئے گئے۔حضرت ابوایوب نے فرمایا کیا آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنا ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ ہمیشہ رہے گی میری امت خیر پر یا آپ نے فرمایا فطرت پر، جب تک مغرب کی نماز میں تأخیر نہیں کرے گی یہاں تک کہ ستارے پھیل جائیں۔

اب اگر لوگ اذانِ مغرب کے بعد نوافل پڑھنا شروع کریں تو امام لازماً ان لوگوں کا انتظار کرے گا، جس سے مغرب کی نماز میں تأخیر لازم آئے گی اور تأخیرِ مغرب مکروہ ہے اور اگر امام ان لوگوں کا انتظار نہیں کرتا، تو بوقت اقامت صلوٰۃ مغرب ان لوگوں کا نوافل پڑھنا لازم آئے گا یہ بھی مکروہ ہے، بظاہر اس وجہ سے نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے، صلوا قبل المغرب ثم قال فی الثالثۃ لمن شاء کراھیۃ أن یتخذھا الناس سنۃ،(بخاری،۱/۱۵۷،وابو داؤد،۱/۱۸۲) (ترجمہ: آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ مغرب کے فرض سے پہلے نماز پڑھا کرو تیسری مرتبہ آپ نے فرمایا جس کا جی چاہے کیونکہ آپ کو یہ بات پسند نہ تھی کہ لوگ اسے ضروری (سنت) سمجھ بیٹھیں)۔

اسی طرح ابوداؤد(۱۸۲/۱) میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے"عن طاؤس قال سئل عبداللہ بن عمر عن الرکعتین قبل المغرب فقال ما رأیت احداً فی عھد رسول اللہ ﷺ یصلیھما"

(ترجمہ: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مغرب سے پہلے دو رکعتوں کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ نبی علیہ السلام کے عہد مبارک میں، میں نے کسی کو نہیں دیکھا کہ وہ یہ دو رکعت پڑھتے)

فتح القدیر(۴۴۶/۱) میں علامہ ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ طبرانی نے مسند الشامیین میں نقل کیا ہے حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے ازواج مطہرات سے سوال کیا، کہ کیا آپ نے نبی علیہ السلام کو مغرب سے پہلے رکعتین پڑھتے ہوئے دیکھا ہے، سب نے کہا نہیں، صرف حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ آپ علیہ السلام نے ایک مرتبہ میرے ہاں دو رکعت پڑھ لی، میں نے کہا یہ کونسی نماز ہے؟ آپ نے فرمایا: نسیت رکعتین قبل العصر صلیتھما الان، (ترجمہ: عصر سے پہلے میں دو رکعت پڑھنا بھول گیا تھا وہ دو رکعت میں نے ابھی پڑھ لیں)۔

فتح الباری (۸۶/۲) میں حافظ صاحبؒ نے ابراہیم نخعی کے طریق سے نقل کیا ہے کہ خلفاء اربعہ مغرب سے پہلے دو رکعت نہیں پڑھتے تھے۔ حافظ صاحب نے اگرچہ اس طریق کو منقطع قرار دے کر اس کا اعتبار نہیں کیا لیکن مراسیل ابراہیم نخعی محدثین کے نزدیک قابل حجت ہیں، اسی طرح مسند بزار کی ایک روایت ہے"بین کل اذانین صلوۃ الا المغرب"(ترجمہ: ہر دو اذانوں (یعنی اذان و اقامت) کے درمیان نماز ہے مغرب کے علاوہ) یعنی مغرب کی اذان اور اقامت کے درمیان نماز نہیں ہے، اس حدیث کی تخریج دارقطنی (۲۷۲/۱) نے بھی کی ہے، ان تمام نصوص، خلفاء اربعہ کے عمل اور صحابہ کرام کا ازواج مطہرات سے پوچھنا اور ان کے جوابات سے معلوم ہوتا ہے کہ مغرب سے پہلے رکعتیں پڑھنا مندوب نہیں بلکہ ان کو سنت سمجھنا کراہت سے خالی نہ ہوگا، اس لئے کہ نوافل پڑھنے کی وجہ سے مغرب کی نماز میں بلا ضرورت تاخیر لازم آتی ہے جو کہ مکروہ ہے۔

(۲)۔ مغرب کی اذان اور اقامت کے درمیان اتنا وقفہ کرنا جس میں ایک آیت طویلہ کی تلاوت ہو سکے یا اس قدر جلسہ خفیفہ کرنا جو خطیب دو خطبوں کے درمیان کرتا ہے جائز ہے۔ لہٰذا اگر کسی عذر شرعی (لوگوں کی اکثریت کو مسبوق ہونے سے بچانے کیلئے) کی وجہ سے انتظامی اعتبار سے ایک دو منٹ کا وقفہ اذان مغرب اور اقامت کے درمیان رکھ دیا جائے تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی۔

لمافی خلاصة الفتاوی(۴۹/۱): ویقعد المؤذن بین الأذان والاقامة فی جمیع الصلوات الافی المغرب فان وصل الاقامة بالاذان ولم یفصل بینهما یکره واجمع الفقهاء رحمهم الله ان المؤذن لا یفصل بین الاذان والاقامة فی المغرب بالصلوة ولکن یقوم ساکتا ساعة یسیرة ولا یجلس وعندهما یجلس جلسة خفیفة قدر ما یجلس الخطیب بین الخطبتین ویسکت عند أبی حنیفة قدر آیة طویلة او ثلث ایات قصار لوفعل کما قالا لا یکره عنده ولو فعل کما قال لا یکره عندهما.

وفی الدر المختار (۳۸۹/۱): (ویجلس بینهما) بقدر ما یحضر الملازمون مراعیاً لوقت الندب (الا

فی المغرب) فیسکت قائما قدر ثلاث ایات قصار ویکرہ الوصل اجماعاً.

وفی الشامیة تحته: (قوله فیسکت قائماً) هذا عنده وعندهما یفصل بجلسة کجلسة الخطیب والخلاف فی الافضلیة فلو جلس لایکرہ عنده ویستحب التحول للاقامة إلی غیر موضع الاذان. وهو متفق علیه. وتمامه فی البحر.

(۴۳) اذان کے بعد دعا کیلئے ہاتھ اٹھانے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دعا بعد الاذان میں ہاتھ اٹھانے کا شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... اذان کے بعد دعا میں ہاتھ اٹھانا ثابت نہیں۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ اذان کے بعد دعا میں ہاتھ نہ اٹھائے جائیں۔

وفی فیض الباری (۱۶۷/۲): باب الدعاء عند النداء: والمسنون فی هذا الدعاء الا ترفع الایدی لانه لم یثبت عن النبی ﷺ رفعها. والتشبث فیه بالعمومات بعد ماورد فیه خصوص فعله ﷺ لغو.

(۴۴) اذان کے بعد کی دعا کا لاؤڈ اسپیکر پر پڑھنا

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض مساجد میں اذان کے بعد کی دعا لاؤڈ اسپیکر پر پڑھی جاتی ہے اس کے بارے میں کیا حکم ہے بعض لوگ اسے بدعت کہتے ہیں؟

(۲)..... نماز کیلئے وضو لازم ہے کیا نماز جنازہ کیلئے بھی وضو شرط ہے؟ تفصیلی جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... (۱)۔ اذان کے بعد کی دعا احادیث مبارکہ سے ثابت ہے اور اس کا پڑھنا مستحب ہے۔ البتہ اس کو لاؤڈ اسپیکر پر پڑھنا کئی وجوہات سے درست نہیں ہے۔ ۱)۔ ضرورت نہ ہونے کی بنا پر ۲)۔ لوگوں کا اس کو اذان کا جز سمجھنے کے اندیشے کی بنا پر ۳)۔ اس پر التزام کر کے دین کا جز سمجھنے کی بنا پر وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا اذان کے بعد کی دعا کو لاؤڈ اسپیکر پر پڑھنے سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ نیز اگر لاؤڈ اسپیکر پر دعا پڑھنے کو مستحب اور ثواب سمجھا جائے تو پھر یہ بدعت کے زمرہ میں آئے گا۔

(۲)..... جس طرح نماز کیلئے وضو شرط ہے اسی طرح نماز جنازہ کیلئے بھی وضو شرط ہے۔ ہاں اگر نماز جنازہ فوت ہونے کا خوف ہو، تو پھر امام اور ولی کے علاوہ دوسروں کیلئے تیمم کے ذریعے نماز جنازہ ادا کرنا درست ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

لمافی صحیح البخاری (۸۶/۱): باب الدعاء عند النداء: عن جابر بن عبدالله ان رسول الله ﷺ قال: من قال حین یسمع النداء اللهم رب هذه الدعوة التامة والصلوة القائمة ات محمدا ن الوسیلة والفضیلة وابعثه مقاما محمودا الذی وعدته، حلت له شفاعتی یوم القیامة.

وفی المشکوۃ المصابیح(صـ۲۷): باب الإعتصام بالکتاب والسنة: عن عائشة: قالت: قال رسول الله ﷺ: "من أحدث فی أمرنا هذا ما لیس منه فهو ردّ" متفق علیه. وعن جابر رضی الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ أمّا بعد فإن خیر الحدیث کتاب الله وخیر الهدی هدی محمد وشر الأمور محدثاتها وکل بدعة ضلالة.

وفی البحر الرائق(۱/۲۷۴): وصحح فی التجنیس فی الإمام عدم الجواز إن کانوا ینتظرونه والآجاز

وفی الشامیة(۲/۲۰۷): (مطلب فی صلاة الجنازة) ...... وأما الشروط التی ترجع إلی المصلی فهی شروط بقیة الصلوات من الطهارة الحقیقة بدناً وثوباً ومکاناً والحکمیة. وستر العورة والإستقبال والنیة سوی الوقت.

وفی الشامیة(۱/۲۴۱): (قوله: وجاز لخوف فوت صلاة جنازة) أی ولو کان الماء قریباً. ثم اعلم أنه اختلف فیمن له حق التقدم فیها: فروی الحسن عن أبی حنیفة أنه لایجوز للولی لأنه ینتظر ولو صلّوا له حق الإعادة، وصححه فی الهدایة والخانیة وکافی النسفی. وفی ظاهر الروایة: یجوز للولیّ أیضاً، لأنّ الإنتظار فیها مکروه، وصححه شمس الأئمة الحلوانی: أی سواء انتظروه اولا، قال فی البرهان: إن روایة الحسن هنا أحسن لأن مجرّد الکراهة لایقتضی العجز المقتضی لجواز التیمم، لأنها لیست أقویٰ من فوات الجمعة والوقتیة مع عدم جوازه لهما، وتبعه شیخ مشایخنا المقدّسی فی شرح نظم الکنز لإبن الفصیح اهـ ملخصاً من حاشیة نوح أفندی.

(۴۵) دعاءِ وسیلہ میں "والدرجة الرفیعة" پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگ اذان کے بعد یہ دعا پڑھتے ہیں "اللهم رب هذه الدعوة التامة والصلوٰة القائمة ات محمدا ن الوسیلة والفضیلة والدرجة الرفیعة وابعثه مقاما محمود ن الذی وعدته وارزقنا شفاعته یوم القیامة انک لا تخلف المیعاد" آیا یہ دعا کہیں سے ثابت ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کتابوں کے حوالہ جات کے ساتھ تحریر کریں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... اذان کے بعد جو دعاء وسیلہ پڑھی جاتی ہے، وہ صحیح بخاری وغیرہ میں ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے۔

"اللهم رب هذه الدعوة التامة والصلواة القائمة ات محمدا ن الوسیلة والفضیلة وابعثه مقاما محمود ن الذی وعدته"

اور''انک لا تخلف المیعاد'' کی زیادتی ''السنن الکبری للبیہقی''میں سندقوی سے ثابت ہے۔البتہ''والدرجة الرفیعة''
''وارزقنا شفاعته یوم القیامة'' کے الفاظ جوعوام الناس کے ہاں اس دعاءِ وسیلہ میں مشہور ہیں۔حضرات محدثین کرام کے نزدیک ان الفاظ کی کوئی اصل نہیں۔لیکن دعاء وسیلہ کے آخر میں اگرکوئی ان الفاظ کی زیادتی کرے،تو اس کی گنجائش ہے،کیونکہ دیگر روایات سے ان الفاظ کے معانی کا ثبوت ملتا ہے۔لیکن ان الفاظ کواس دعاء وسیلہ کا جزء نہ قرار دے۔

لما فی الصحیح للبخاری(۸۶/۱): حدثنا علی بن عیاش قال حدثنا شعیب بن ابی حمزة عن محمد بن المنکدر عن جابر بن عبدالله ان رسول الله ﷺ قال من قال حین یسمع النداء ''اللهم رب هذه الدعوة التامة والصلوة القائمة ات محمدا الوسیلة والفضیلة وابعثه مقاما محمودا الذی وعدته حلت له شفاعتی یوم القیامة.

وفی الموضوعات الکبری(ص۱۲۲): حدیث ''الدرجة الرفیعة'' فیما یقال بعد الاذان من الدعاء قال السخاوی لم أره فی شیٔ من الروایات.

وفی عمدة القاری(۱۲۳/۵): وفی روایة البیهقی (الذی وعدته انک لاتخلف المیعاد)

وفی الشامیة (۳۹۸/۱): وروی البخاری وغیره من قال حین یسمع النداء ''اللهم رب هذه الدعوة التامة والصلوة القائمة آت محمدا الوسیلة والفضیلة وابعثه مقاما محمودا الذی وعدته حلت له شفاعتی یوم القیامة'' وزاد البیهقی فی آخره ''انک لا تخلف المیعاد'' وتمامه فی الامداد والفتح، قال ابن حجر فی شرح المنهاج وزیادة والدرجة الرفیعة وختمه بیا ارحم الراحمین لاأصل لهما.

(۴۶) اذان کے کچھ کلمات ہوجانے کے بعداذان کا جواب کہاں سے دے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اذان کا جواب دینا فرض ہے یا سنت؟اگر آدھی اذان ہوچکی ہو،اور آدھی اذان باقی ہو،اورکوئی اس کا جواب دینا چاہے تو کیا وہ شخص ازسرنو اذان کا جواب دیگا یا جہاں تک اذان ہوئی ہے وہیں سے اذان کا جواب شروع کردے۔میں اکثر ازسرنو جلدی جلدی پڑھ کرموذن کی اذان تک کا جواب ایک ساتھ دے کر پھرموذن کے الفاظ کا جواب دیتا ہوں۔کیا میرا یہ عمل درست ہے؟مدلل جواب عنایت فرماکرممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......اذان کا جواب زبان سے دینا مستحب ہے اوراذان سننے کے بعدنماز کی تیاری میں لگنا اورمسجد کی طرف جانا واجب ہے،کلماتِ اذان کومکمل سنا جائے یا بعض کلماتِ اذان کو،بہردوصورت مکمل اذان کا جواب دیا جائیگا ہاں اگردور ہونے کی بناپراذان کو نہ سن سکے تو اس صورت میں جواب دینا مسنون نہیں،پس صورت مسئولہ میں آپ کا عمل درست ہے،مگر بہتر طریقہ یہ ہے کہ جب اذان شروع ہوتو مؤذن کے ساتھ اذان کا جواب دیا جائے۔

لمافی الدر المختار (۱/۳۹۶): (ویجیب) وجوبا وقال الحلوانی ندبا والواجب الاجابة بالقدم (من سمع الاذان) وفی الشامیة (قوله وقال الحلوانی ندبا الخ) ای قال الحلوانی ان الاجابة باللسان مندوبة والواجبة هی الاجابة بالقدم.....(ص۳۹۷) (قوله کمقالته) ای مثلها فی القول.....(ص۳۹۸) (قوله لم ار الخ) البحث لصاحب البحر، وصرح به ابن حجر فی شرح المنهاج حیث قال. فلو سکت حتی فرغ کل الاذان ثم اجاب قبل فاصل طویل کفی فی اصل سنة الاجابة کما هو ظاهر واستفید من هذا ان المجیب لا یسبق المؤذن بل یعقب کل جملة منه بجملة منه.

وفی الفقه الاسلامی وادلته (۱/۲/۷۰۱): والدلیل علی الاجابة: ماروی ابو سعید ان رسول الله ﷺ قال اذا سمعتم النداء فقولوا مثل یقول المؤذن لکن قال المالکیة المتبادر من قوله سمعتم ولو البعض خصوصاً وقد قال فقولوا مثل ما یقول ولم یقل مثل ما قال وهذا فی تقدیری تعسف واضح فی التاویل والظاهر کما قال بعض المالکیة ان یحکی الاذان کله.....(ص۷۰۳) ویجیب المؤذن سواء سمع الاذان کله ام بعضه فان لم یسمع لبعد او صمم لا تسن له الاجابة.

(۴۷) شہادتین کے وقت انگوٹھے چومنے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ جب مؤذن اذان میں ''اشهد ان محمدا رسول الله'' کہتا ہے تو یہ لوگ انگوٹھے چومتے ہیں اب پوچھنا یہ ہے کہ شہادتین کے وقت انگوٹھے چومنا شرعاً کیسا ہے؟ اس کا ثبوت کسی حدیث سے ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....اذان میں مؤذن کے شہادتین کہتے وقت ہاتھوں کے انگوٹھے چومنا اور آنکھوں پر لگانا نہ کسی روایت صحیحہ سے ثابت ہے اور نہ کسی معتبر کتاب میں ہے۔ لہٰذا اس کو عبادت سمجھ کر کرنا بدعت ہے۔

لمافی فیض الباری (۲/۱۶۶): وکذالک لا اصل لتقبیل الابهامین عند الشهادتین کما شرع فی بلادنا الا اثر اخرجه القاری عن ابی بکر رضی الله عنه فی الموضوعات لکنه ضعیف یقرب المنکر.

وفی المقاصد الحسنة للسخاوی (ص۳۸۴): وکذاما اورده ابو العباس احمد بن ابی بکر الرداد الیمانی المتصوف فی کتابه ''موجبات الرحمة وعزا ئم المغفرة'' بسند فیه مجاهیل مع انقطاعه عن الخضر علیه السلام انه ممن قال حین سمع المؤذن یقول اشهد ان محمدا رسول الله، مرحبا بحبیبی وقرة عینی محمد بن عبدالله ﷺ ثم یقبل ابهامیه ویجعلهما علی عینیه لم یرمد ابداً.

وفی الشامیة (۱/۳۹۸): یستحب ان یقال عند سماع الأولی من الشهادة: صلی الله علیک یا

رسول الله وعند الثانية منها قرت عيني بل يارسول الله اللهم متضى بالسمع والبصر بعد وضع ظفرى الابهامين على العينين فانه عليه السلام يكون قائدا له الى الجنة ...... كذا فى كنز العباد اهـ قسهتانى ونحوه فى الفتاوىٰ الصوفية وفى كتاب الفردوس "من قبل ظفرى إبهامه عند سماع أشهد أن محمدا رسول الله فى الاذن أنا قائده ومدخله فى صفوف الجنة وتمامه فى حواشى البحر للرملى عن المقاصد الحسنة للسخاوى وذكر ذلك الجراحى وأطال ثم قال: ولم يصح فى المرفوع من كل هذا شئ.

(۴۸) اذان نہ دینے سے چوہے زیادہ ہوجانا، بےاصل بات ہے

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے کے لوگوں میں مشہور ہے کہ اذان نہ دینے سے چوہے زیادہ ہوجاتے ہیں کیا یہ بات صحیح ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......اذان شعائرِ اسلام میں سے ہے۔ پانچوں نمازوں اور جمعہ کی نماز کیلئے اذان دینا سنت مؤکدہ ہے۔ نماز کے علاوہ بعض مواقع ایسے ہیں جن سے سلف صالحین سے اذان دینا عملاً چلا آرہا ہے۔ مثلاً جہاد کے دوران غم اور پریشانی کے وقت، غصہ کے وقت، جب مسافر راستہ بھول جائے، مرگی کے دورہ پڑجانے کے وقت، جانور یا انسان کی بدخلقی کے وقت وغیرہ ایسے مواقع پر اذان دینا جائز ہے، تاہم یہ بات کہ اذان دینے سے چوہے بھاگ جاتے ہیں اور اذان نہ دینے سے چوہے زیادہ ہوجاتے ہیں، بےاصل بات ہے۔

لمافى المبسوط للسرخسى (۱/۱۳۰): ماروى ان النبى ﷺ قال اذا اذن المؤذن ادبر الشيطان وله حصاص كحصاص الحمار فاذا فرغ رجع فاذا ثوب أدبر فاذا فرغ رجع فاذا أقام أدبر فاذا فرغ رجع وجعل يوسوس الى المصلى انه كم صلى.

وفى الشامية (۱/۳۸۵): (قوله لايسن لغيرها) اى من الصلوات والا فيندب للمولود وفى حاشية البحر للخير الرملى: رأيت فى كتب الشافعية انه قديسن الآذان لغير الصلوة كما فى أذن المولود والمهموم والمصروع والغضبان ومن ساء خلقه من انسان اوبهيمة وعند مزدحم الجيش وعند الحريق.

(۴۹) اذان واقامت میں فصل کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اذان اور جماعت میں کتنا فصل ہونا چاہئے؟ نیز اگر کوئی

بغیر فصل کے نماز پڑھ لے تو کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً......نمازِ مغرب کے علاوہ اذان اور اقامت کے درمیان اتنا فصل کرنا مسنون ہے کہ کھانے والا کھانے سے فارغ ہوجائے اور وضو کرنے والا اپنی حاجت سے فارغ ہوجائے یا اتنا فصل کریں جس میں چار رکعت نماز اس طریقہ پرادا ہوسکتی ہوں کہ ہر رکعت میں دس آیات پڑھ لی جائیں اور مغرب میں صرف تین چھوٹی آیات پڑھنے کی بقدر فصل کرنا مسنون ہے اور اذان واقامت میں فصل کئے بغیر نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

وفی الهندیة (۱/۵٦): ویفصل بین الاذان والاقامة مقدار رکعتین او اربع یقرء فی کل رکعة نحوا من عشر آیات کذا فی الزاهدی، والوصل بین الاذان والاقامة مکروه بالاتفاق...... والاولی للمؤذن فی الصلوٰة التی قبلها تطوع مسنون او مستحب ان یتطوع بین الاذان و الاقامة...... فان لم یصل یجلس بینهما واما اذا کان فی المغرب فالمستحب ان یفصل بینهما بسکتة یسکت قائماً مقدار مایتمکن من قرآة ثلاث ایات قصار.

وفی الدر المختار (۱/۳۸۹): (ویجلس بینهما) بقدر مایحضر الملازمون مراعیاً لوقت الندب الا فی المغرب فیسکت قائماً قدر ثلاث ایات قصار ویکره الوصل اجماعاً.

(۵۰) مؤذن کی بغیر اجازت کسی اور کا اقامت کہنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری مسجد میں بعض بزرگ نمازی ایسے ہیں کہ امام کے مصلّٰی پر پہنچتے ہی مؤذن کی اجازت کے بغیر اسکی جگہ پر پہنچ کر اقامت شروع کردیتے ہیں اور بعض دفعہ مؤذن کی طرف صرف اشارہ کر دیتے ہیں کہ اقامت میں کہوں گا، مؤذن اگرچہ دل سے اجازت نہیں دیتا لیکن مروتاً خاموش رہتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ مؤذن کی اجازت کے بغیر یا صرف اشارۃً اجازت لے کر اقامت کہنا کیسا ہے، نیز اقامت کہنا کس کا حق ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......مؤذن کی موجودگی میں اگر کوئی شخص اقامت کہے اور مؤذن کو یہ ناگوار گزرے تو دوسرے شخص کا اقامت کہنا مکروہ ہے چاہے اشارۃً بغیر رضامندی کے اجازت دیدے یا مروتاً خاموش رہے، ہاں اگر مؤذن کو یہ ناگوار نہ گزرے یا وہ رضامندی سے اجازت دیدے تو پھر کراہت بھی نہ رہے گی۔ نیز افضل یہ ہے کہ جو شخص اذان کہے وہی اقامت بھی کہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادگرامی بھی ہے کہ جو شخص اذان کہے وہ اقامت بھی کہے۔

لمافی ابی داود (۱/۷٦): حدثناعبدالله بن مسلمة......انه سمع زیادابن الحارث الصدائی (حدیث طویل فیه) فارادبلال ان یقیم فقال له النبی ﷺ ان اخاصداء هواذن ومن اذن فهویقیم قال فأقمت.

وفی الهندیة (۱/۵۴): والافضل ان یکون المؤذن هوالمقیم کذافی الکافی، وان اذن رجل واقام

اخران غاب الاول جازمن غیر کراهة وان کان حاضرا ویلحقه الوحشةباقامة غیره یکره وان رضی به لایکره عندنا کذافی المحیط.

(۵۱) امام سے دور کھڑے ہوکر اقامت کہنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے کی مسجد میں مؤذن اقامت کے وقت امام کے پیچھے سے بالکل دور کھڑے ہوکر اقامت کہتا ہے کیا اس طرح کرنا درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اقامت کہنے کیلئے کوئی جگہ متعین نہیں ہے جہاں مناسب ہو اقامت کہی جاسکتی ہے، البتہ چونکہ بعض اوقات امام کی نماز کسی وجہ سے فاسد ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے نائب امام مقرر کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے اور عام طور پر چونکہ مسجد کا مؤذن ہی نائب امام ہوتا ہے، تو اس کیلئے بہتر یہ ہے کہ امام کے پیچھے صف اول میں اقامت کہے تاکہ فسادِ نماز کے وقت بناء کر سکے یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حضرات کو جو اہل علم ہوں، امام کے قریب کھڑے ہونے کا حکم فرمایا۔ بہر حال صورت مسئولہ میں امام سے دور کھڑے ہوکر اقامت کہنا درست ہے۔ واللہ اعلم

لمافی فتح الملهم(۳/۳/۱۵): قال النووی: وفی هذا الحدیث تقدیم الافضل فالافضل الی الامام لانه اولی بالاکرام، ولانه ربما احتاج الامام الی استخلاف فیکون هو اولی ولانه یتفطن لتنبیه الامام علی السهو لمالا یتفطن له غیره ولیضبطوا صفة الصلاة ویحفظوها وینقلوها ویعلموها الناس ولیقتدی بافعالهم من ورائهم.

وفی الهندیة(۱/۸۹): وینبغی ان یکون بحذاء الامام من هو افضل کذا فی شرح الطحاوی.

(۵۲) میاں بیوی کی جماعت میں اذان واقامت کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میاں بیوی دونوں مل کر جماعت کررہے ہیں، اس صورت میں آیا اذان واقامت ہوگی؟ اور جماعت کیلئے اقامت شوہر کہے گا یا بیوی بھی کہہ سکتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... عورت کیلئے اذان واقامت کہنا مکروہ تحریمی ہے۔ اور اگر کبھی کسی ضرورت کی بناء پر گھر میں میاں بیوی جماعت سے نماز پڑھیں۔ تو محلہ کی مسجد میں کہی گئی اذان پر اکتفاء کرلینا جائز ہے۔ البتہ اگر اذان واقامت یا صرف اقامت کہنا چاہے تو صرف شوہر ہی کہے، بیوی کیلئے اذان واقامت کہنا جائز نہیں۔

لمافی معارف السنن(۲/۲۸۷): ثم من فاتته الجماعة فی مسجده له أن یصلّی فی مسجد حیه منفرداً أو یأتی بیته فیجمع بأهله ویصلی بهم.

وفی الشامیة(۱/۳۹۳،۳۹۴): ثم اعلم انه ذکر فی الحاوی القدسی من سنن المؤذن کونه رجلا عاقلا، صالحاً عالما بالسنن والأوقات...... وأنه یکره أذان المرأة والصبی العاقل ویجزی حتی لا یعاد لحصول المقصود وهو الاعلام وروی عن الامام انه تستحب اعادة أذان المرأة اهـ.

وفی خلاصة الفتاویٰ(۱/۴۸): ولیس علی النساء أذان ولا إقامة...... وللرجال یکره اداء المکتوبة بالجماعة فی المسجد بغیر اذان واقامة ولا یکره فی البیوت والکروم والضیاع فإن ترکوا الاذان والإقامة جاز.

(۵۳) امام کا خود ہی اقامت کہنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ امام کا خود ہی اقامت کہنا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... امام کا خود ہی اقامت کہنا شرعاً درست ہے لہٰذا امام خود بھی اقامت کہہ سکتا ہے۔

وفی الهندیة (۱/۵۷): وان کان المؤذن والامام واحد فان اقام فی المسجد فالقوم لایقومون مالم یفرغ من الاقامة.

(۵۴) امام اقامت کے وقت اپنا رُخ کس طرف رکھے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک مسجد میں امام ہوں۔ ایک صاحب جو کہ کافی معمر ہیں وہ بھی میرے پیچھے نماز پڑھتے ہیں۔ ایک دفعہ انہوں نے مجھ سے کہا کہ جب اقامت کہی جاتی ہے تو آپ قبلہ کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ میں نے ایک بڑے عالم کو دیکھا ہے کہ جب اقامت ختم ہونے لگتی ہے وہ تب اپنا رخ قبلہ کی طرف کرتے ہیں۔ اور وجہ یہ بتائی کہ لوگوں کی طرف بلاضرورت پیٹھ کرنا درست نہیں۔ آنجناب سے گزارش تھی کہ اس مسئلے کو مدلل انداز میں براہِ کرم تحریری صورت میں دیدیں تا کہ جو بھی صحیح صورت ہو میں اسے اپنالوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں مذکورہ بزرگ کی بات بالکل غلط ہے کیونکہ خود ان کی پیٹھ پچھلی صف والوں کی طرف ہے تو ان کو بھی چاہئے کہ پچھلی صف والوں کی طرف رُخ کر کے کھڑے ہوں۔ لہٰذا یہ بات بے بنیاد و من گھڑت ہے۔ لہٰذا امام کو چاہئے کہ اقامت شروع ہوتے ہی قبلہ رُو کھڑا ہو جائے البتہ اگر صفوں کی درستگی کیلئے مقتدیوں کی طرف رُخ کرلے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

لمافی الفقه الاسلامی وادلته(۱/۷۲۰): یستحب للامام تسویة الصفوف یلتفت عن یمینه وشماله.

وفی الموسوعة الفقهیة (۲/۲۱۲): یسن ان یامر بتسویة الصفوف فیلتفت عن یمینه وشماله قائلا "اعتدلوا وسووا صفوفکم...... فقال ان النبی ﷺ کان اذا قام الی الصلوة اخذه بیمینه فقال: اعتدلوا......

ثم اخذه بيساره وقال: اعتدلوا...... وفی رواية اعتدلوا فی صفوفكم وتراصوا فانی اراكم من وراء ظهری.

وفی الصحيح البخاری(۱/۱۰۰): حدثنا انس قال اقيمت الصلاة فاقبل علينا رسول الله ﷺ بوجهه فقال اقيموا صفوفكم وتراصوا فانی أراكم من وراء ظهری.

﴿فصل فی شروط الصلاۃ وارکانها واجباتها وسننها وآدابها﴾

(نماز کی شرائط، فرائض، ارکان، واجبات، سنن اور آداب کا بیان)

(۵۵) نجاست غلیظہ والے کپڑوں کے ساتھ نماز کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کو رات کے وقت احتلام ہوگیا بیدار ہونے کے بعد اس نے غسل کیا اور شلوار کو دھولیا پھر نمازیں وغیرہ پڑھتا رہا دوسرے دن ظہر کی نماز سے کچھ دیر پہلے اس نے دیکھا کہ شلوار کے کونے میں منی لگی ہوئی ہے تو کیا جتنی اس نے نمازیں ادا کی ہیں وہ صحیح ہوگئیں یا دوبارہ لوٹانا ضروری ہے؟ اگر لوٹانا ضروری ہے تو کیا صرف فرائض وواجبات لوٹائے جائیں گے یا سنت ونوافل بھی لوٹانا ضروری ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... کپڑے پر نجاست غلیظہ اگر مقدار درہم سے زیادہ لگی ہو تو نماز نہیں ہوتی ہے اور اگر ایک درہم سے کم یا ایک درہم کے برابر لگی ہو تو اتنی مقدار معاف ہے۔ نماز ہو جاتی ہے مگر پھر بھی نجاست کا دھونا ضروری ہے پس صورت مسئولہ میں اگر درہم کی مقدار سے کم یا درہم کے برابر منی لگی ہوئی تھی تو نماز ہوگئی اعادے کی ضرورت نہیں اور اگر ایک درہم سے زیادہ لگی ہوئی تھی تو نماز نہیں ہوئی کیونکہ کپڑوں کا پاک ہونا نماز کی شرائط میں سے ہے اور مذکورہ بالا صورت میں فرائض وواجبات کا لوٹانا ضروری ہے سنت ونوافل کا لوٹانا ضروری نہیں۔

لمافی الشامیة(۱/۳۱۴): نجاسة المنی عندنا مغلظة.

وفی الدر المختار مع الشامیة(۱/۳۱۶): (وعفا) الشارع (عن قدر درهم) وان کره تحریما فیجب غسله وما دونه تنزیها فیسن وفوقه مبطل

وفی الشامیة تحته: (قوله وان کره تحریما) اشار الی ان العفو عنه بالنسبة الی صحة الصلاۃ به فلا ینافی الاثم کما استنبطه فی البحر من عبارة السراج.

وفی الهندیة(۱/۴۳): فلو صلی مع هذا الثوب صلوات ثم ظهر ان النجاسة فی الطرف الاخر یجب علیه اعادة الصلوات التی صلی مع هذا الثوب کذا فی الخلاصة.

(۵۶) جن کپڑوں کو کیچڑ لگ جائے ان میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بارش کے دنوں میں جب ہم چلتے ہیں تو کپڑوں کو مٹی،

کیچڑ وغیرہ لگ جاتی ہے تو کیا انہی کپڑوں کے ساتھ نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر کپڑوں کو مٹی وغیرہ لگ جائے تو بوجہ عموم بلوی اور ضرورتِ شدیدہ کے حضرات فقہاء کرام نے اس کے اندر گنجائش لکھی ہے، کہ ان ہی کپڑوں کے ساتھ نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ البتہ اگر کپڑوں کو کوئی ایسی نجاست لگی ہو جو نظر آ رہی ہو یا ظن غالب ہو کہ اس کو نجاست لگی ہے تو ایسی صورت میں دھونا واجب ہوگا۔ نیز یاد رہے کہ یہ اجازتِ جواز اُس صورت میں ہے کہ جس وقت ضرورت شدید ہو ورنہ عدم ضرورت کے وقت ایسا نہ کرنا چاہئے بلکہ احتیاط کرنی چاہئے۔

وفی الطحطاوی علی الدر(۱/۱۶۱): والطین المسرقن والردغة فی الطریق فیها نجاسة طاهرة إلا إذارأی عین النجاسة بحروفیه دخان النجاسة......وفی البحر ماء المطر اذا مرّعلی العذرات لاینجس إلا أن تكون العذرة أكثرمن الأرض الطاهرة أوتكون العذرة عند الميزاب.

وفی الشامية(۱/۳۲۴،۳۲۵): والحاصل : أن الذی ینبغی أنه حیث كان العفو للضرورة وعدم إمكان الإحتراز أن يقال بالعفوو إن غلبت النجاسة مالم يرعينها لوأصابه بلا قصد وكان ممن يذهب ويجيئ والا فلا ضرورة، وقد حكى فی القنية أيضاً قولين فيما لوابتلت قد ماه ممارش فی الأسواق الغالبة النجاسة ثم نقل أنه لوأصاب ثوبه، طين السوق أو السكة ثم وقع الثوب فی الماء تنجس.

(۵۷) ناپاک گھاس پر نماز پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں ایسی گھاس یا چمن میں نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے جہاں گائے یا کتے نے پیشاب کیا ہو؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر پیشاب خشک ہو جائے اور اسکے اثرات وہاں سے زائل ہو جائیں تو نماز پڑھنا جائز ہے ورنہ نہیں۔ البتہ یہ بات یاد رہے کہ یہ حکم گھاس میں اس وقت ہے جب گھاس زمین پر اُگی ہوئی ہو، اگر گھاس کاٹ دی گئی اور بعد میں ناپاک ہوگئی تو اسے پاک کرنے کیلئے دھونے کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں۔

لمافی الهندية (۱/۴۴): ومنها الجفاف وزوال الاثرالارض تطهرباليبس وذهاب الاثرللصلاة لالـلتيمم...... ولافرق بين الجفاف بالشمس والناروالريح والظل......ويشارك الارض فی حكمها كل ماكان ثابتا فيها كالحيطان والاشجاروالكلاء والقصب مادام قائماعليهافاذاقطع الحشيش والخشب والقصب واصابته النجاسةلايطهرالابالغسل.

(۵۸) بھینسوں کے باڑے پر نماز کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک بھینسوں کا باڑہ ہے ہم نے اس کے اندر اوپر پھٹے لگا دیے ہیں تاکہ ان پر نماز پڑھیں گے، اب معلوم یہ کرنا ہے کہ بھینس کے باڑے کے اوپر نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً...... صورت مسئولہ میں آپ بھینس کے باڑے کے اوپر نماز پڑھ سکتے ہیں بشرطیکہ جگہ پاک ہو۔

لمافی الصحیح للإمام البخاری (۱/۶۱): عن انس بن مالک قال کان النبی ﷺ یصلی فی مرابض الغنم ثم سمعته بعد یقول کان یصلی فی مرابض الغنم قبل ان یبنی المسجد.

وفی عمدة القاری (۴/۱۸۲): (فان قلت) مرابد البقرهل تلحق بمرابض الغنم ام بمرابد الابل (قلت) ذکر ابوبکر بن المنذر انها ملحقة بمرابد الغنم فلا تکره الصلاة فیها. (فان قلت) فی حدیث عبدالله بن عمرو من مسند احمد الحاقها بالابل کما تقدم (قلت) فی اسناده عبدالله بن لهیعة والکلام فیه مشهور.

وفی الدر المختار (۱/۴۰۲،۴۰۳): ثم الشرط لغة العلامة اللازمة، وشرعا مایتوقف علیه الشئ ولا یدخل فیه (هی) ستة (طهارة بدنه) الخ...... (ومکانه) ای موضع قدمیه او احداهما ان رفع الاخری وموضع سجوده اتفاقا فی الاصح لا موضع یدیه ورکبتیه علی الظاهر الا اذا سجد علی کفه کما سیجئ (من الثانی) ای الخبث، لقوله تعالی. وثیابک فطهر. فبدنه ومکانه اولیٰ.

(۵۹) باریک دوپٹہ میں نماز کی ادائیگی کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی عورت باریک دوپٹہ میں نماز پڑھے جس سے سر کے بال نظر آتے ہوں تو ایسے دوپٹہ کے استعمال کا کیا حکم ہے؟ اس میں نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً...... صورت مسئولہ میں ایسے باریک دوپٹہ میں نماز درست نہیں ہے البتہ نماز کے علاوہ ایسا دوپٹہ استعمال کرنے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر تنہائی میں یا محارم اور مسلمان خواتین کے سامنے اوڑھے تو جائز ہے اسکے علاوہ جائز نہیں۔

لمافی الهندیة (۱/۵۸): والثوب الرقیق الذی یصف ماتحته لاتجوز الصلاة فیه کذافی التبیین.

وفی الشامیة (۱/۴۰۴): ثم ان الظاهر أن المرادبمایجب ستره فی الخلوة خارج الصلاة هومابین السرة والرکبة فقط حتی ان المرأة لایجب علیهاسترماعداذالک وان کان عورة. یدل علیه مافی باب الکراهیة من القنیة حیث قال: وفی غریب الروایة یرخص للمرأة کشف الرأس فی

منزلها وحدها فأولى لها لبس خمار رقيق يصف ما تحته عند محارمها.

(۶۰) سگریٹ اور نسوار کو جیب میں رکھ کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کافی لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ جب وہ نماز کیلئے آتے ہیں تو سگریٹ کی ڈبی (پیکٹ) جیب سے نکال کر باہر رکھ دیتے ہیں، پوچھنے پر بتاتے ہیں کہ نشہ والی اشیاء جیب میں ہوں تو نماز صحیح نہیں ہوتی۔ کیا ان لوگوں کی بات درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... احادیث کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ ایسی بو والی چیز جو کسی بھی مخلوق کیلئے ایذاء رسانی کا سبب بنے اگرچہ وہ فی نفسہ مباح ہی ہو، اس کا استعمال کر کے اجتماع گاہوں میں آنا جائز نہیں ہے اس پر سخت وعیدیں مذکور ہیں اس لئے بہتر یہ ہے کہ ان اشیاء کا استعمال ترک کر دیا جائے یا کم از کم نماز سے قبل ان کے استعمال سے گریز کیا جائے، چاہے اور لوگ پاس نہ بھی ہوں فرشتے تو ہر انسان کے ساتھ ہوتے ہیں تاکہ ان کو بھی تکلیف نہ ہو، البتہ اگر ان اشیاء کو جیب میں رکھ کر نماز ادا کر لی جائے تو فقہاء کرام نے اس میں گنجائش رکھی ہے کہ نماز درست ہو جائے گی، لہٰذا صورت مسئولہ میں یہ خیال کرنا کہ ان اشیاء کو جیب میں رکھ کر نماز پڑھنے سے نماز نہیں ہوتی یہ خیال غلط ہے۔

لما في الدر المختار (۲/۴۶۰): (الاصل الاباحة أو التوقف)...... قلت فيفهم منه حكم النباتات الذی شاع فی زماننا المسمی بالتتن فتنبه وقد كرهه شيخنا العمادی فی هدیته الحاقاله بالثوم والبصل بالاولی فتدبر.

وفی الشامية تحته: فقول الشارح الحاقاله بالثوم والبصل فيه نظر اذ لايناسب كلام العمادی نعم الحاقه بما ذكر هو الانصاف قال ابو السعود فتكون الكراهة تنزيهة والمكروه تنزيها يجامع الاباحة وقال ط. ويوخذ منه كراهة التحريم فی المسجد للنهی الوارد فی الثوم والبصل و هو ملحق بهما.

(۶۱) وقت کے اندر تاخیر سے پڑھنے سے نماز کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض دیہاتوں میں فجر کی نماز اتنی تاخیر سے پڑھاتے ہیں کہ جیسے ہی امام سلام پھیر لیتا ہے اس کے چند منٹ بعد ہی سورج طلوع ہوتا ہے۔ کیا اتنی تاخیر سے نماز پڑھانا جائز ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... نماز فجر کا وقت صبح صادق سے لے کر سورج طلوع ہونے تک ہوتا ہے اس لئے صورت مسئولہ میں اتنی تاخیر سے پڑھی ہوئی نماز درست ہو جائے گی اور ہمارے نزدیک نماز فجر اتنی تاخیر سے پڑھنا افضل ہے کہ اگر نماز پڑھنے کے بعد کسی وجہ سے نماز کو لوٹانا پڑے تو اسے مسنون قرأت (چالیس سے ساٹھ آیات پڑھنے) کے ساتھ لوٹا سکے تاہم اتنی تاخیر کرنا مناسب نہیں کہ دوران نماز

سورج کے نکل آنے کا گمان ہو۔

لمافی التاتارخانية(۱/۴۰۴): قال اصحابنا رحمهم الله الاسفار بالفجر افضل فی الازمنة كلها الاصبيحة يوم النحر للحاج بمزدلفة فان هناک التغليس افضل الاانه لاينبغی ان يؤخر تاخيراً يقع الشک فی طلوع الشمس لانه حينئذ يقع الشک فی فساد صلوته وفی الغياثية والمختار انه لايؤخر تاخيرا لايمكن للمسبوق قضاء مافاته.

وفی الهندية (۱/۵۱): وقت الفجرمن الصبح الصادق وهو البياض المنتشر فی الافق الی طلوع الشمس .... يستحب تاخير الفجر ولا يؤخرها بحيث يقع الشک فی طلوع الشمس بل يسفربها بحيث لو ظهر فساد صلوته يمكنه ان يعيدها فی الوقت بقراءة مستحبة.

وفی تنوير الابصار مع الدر (۱/۳۶۶): (والمستحب) للرجل (الابتداء) فی الفجر (باسفار والختم به) هو المختار بحيث يرتل اربعين آية ثم يعيده بطهارة لوفسد وقيل يؤخر جدا لان الفساد موهوم.

(۶۲) حطیم کے اندر نماز پڑھنے والا کس طرف رخ کرے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص حطیم کے اندر نماز پڑھ رہا ہو، تو اس کیلئے کعبہ کی طرف منہ کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً...... حطیم کے اندر نماز پڑھنے والے کیلئے ضروری ہے کہ عین کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے۔

لمافی الهندية(۱/۶۳): ولو صلی مستقبلاً بوجهه الی الحطيم لايجوز.

وفی الدر المختار(۲/۴۹۵): فلوطاف من الفرجة لم يجز كاستقباله احتياطاً.

وفی الشامية تحته(صـ۴۹۶): (قوله كاستقباله) ای فانه اذا استقبله المصلی لم تصح صلاته لان فرضية استقبال الكعبة ثبتت بالنص القطعی وكون الحطيم من الكعبة ثبتت بالاحاد فصار كانه من الكعبة من وجه دون وجه فكان الاحتياط فی وجوب الطواف ورانه وفی عدم صحة استقباله.

(۶۳) چاند پر بھی نماز کے وقت جہت قبلہ کی تعیین کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آئندہ زمانے میں لوگ خلائی سفر پر کثرت سے جانا شروع ہو جائیں گے۔ جو مسلمان چاند پر پہنچ جائے تو وہ وہاں کس سمت منہ کر کے نماز پڑھے گا؟

الجواب حامداًومصلیاً...... واضح رہے کہ قبلہ کعبہ شریف کی چاردیواری کا نام نہیں ہے۔ بلکہ قبلہ تحت الثراء سے لے کر عرش معلیٰ تک کعبہ کے

محاذات میں بننے والے خلا کا نام ہے۔لہٰذا انسان جہاں کہیں بھی ہو،سمت قبلہ معلوم ہونے کے بعد استقبال قبلہ نماز میں ضروری ہے ورنہ تحری کر کے کسی جہت کو متعین کر کے نماز ادا کرے،لہٰذا چاند پر پہنچنے والے مسلمان کیلئے اولاً تو نماز کیلئے تعیین قبلہ ضروری ہے اور اگر باوجود سعی وکوشش کے قبلہ مشتبہ رہے تو تحری سے کسی جہت کو متعین کر کے نماز ادا کرے۔

وفی الهندية (۱/۶۳): لايجوز لاحد اداء فريضة ولا نافلة ولا سجدة تلاوة ولا صلاة جنازة الا متوجها الى القبلة كذا في السراج والوهاج، اتفقوا على ان القبلة في حق من كان بمكة عين الكعبة فيلزمه التوجه الى عينها كذا في فتاوىٰ قاضي خان...... ومن كان خارجا عن مكة فقبلته جهة الكعبة وهو قول عامة المشايخ هو الصحيح هكذا في التبيين وجهة الكعبة تعرف بالدليل والدليل في الامصار والقرى المحاريب التي نصبها الصحابة والتابعون فعلينا اتباعهم فان لم تكن فالسوال من اهل ذالک الموضع. واما في البحار والمفاوز فدليل القبلة النجوم هكذا في فتاوى قاضي خان......

وفی الشامية(۱/۴۳۲): (قوله والمعتبر في القبلة الخ) اى ان الذى يجب استقباله او استقبال جهته هو العرصة......(قوله لاالبناء) اى ليس المراد بالقبلة الكعبة التي هي البنآء المرتفع على الارض...... (قوله فهي من الارض السابعة الى العرش) صرح بذلک في الفتاوى الصوفية معزيا للحجة، ثم قال: فلو صلى في الجبال العالية والآبار العميقة السافلة جاز كما جاز على سطحها وفي جوفها فتال، فلو كان المعتبر البنآء لا العرصة لم يجز ذلک، فالتفريع صحيح فافهم.

(۶۴) ہوائی جہاز میں بوقت نماز سمت قبلہ کی تعیین کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص ہوائی جہاز پر سفر کر رہا ہو،اور نماز کا وقت آجائے تو نماز کس طرح ادا کرے کیونکہ جہاز میں سمت قبلہ کا تعین صحیح طور پر نہیں ہوتا۔نماز پڑھنے کے دوران ہی جہاز کا رخ کسی اور طرف ہوتا ہے تو ایسی صورت میں وہ کیا کرے؟

الجواب حامداًومصلیاً......سفر کے دوران ہوائی جہاز میں جب نماز کا وقت ہوجائے تو اگر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے پر قدرت ہو تو کھڑے ہو کر ورنہ بیٹھ کر ادا کرے۔ ہوائی جہاز میں بھی استقبال قبلہ ضروری ہے۔اگر قبلہ کے رُخ کا علم نہ ہو اور کوئی بتلانے والا بھی نہ ہو تو تحری (خوب سوچ بچار) کر کے نماز ادا کرے۔اگر بالفرض بعد میں اندازہ غلط بھی معلوم ہو تو نماز صحیح ہوگی اعادہ کی ضرورت نہیں۔نیز دوران نماز اگر جہاز کا رخ بدل جائے تو اسے بھی چاہئے کہ اپنا رخ قبلہ کی طرف پھیرلے۔

لمافی الهندية(۱/۱۴۴): اجمعوا أنه لو كان بحال يدور رأسه لو قام تجوز الصلاة فيها قاعداً. كذا في الخلاصة. ويلزمه التوجه إلى القبلة عند افتتاح الصلاة. كذا في الكافي في باب صلاة المريض.

وكلما دارت السفينة يحول وجهه إليها ولو ترك تحويل وجهه إلى القبلة وهو قادر عليه لايجزيه.

وفي الدر المختار(١٠١/٢): (صلى الفرض في فلك) جار (قاعداً بلا عذر صحّ) لغلبة العجز (وأساء) وقالا: لايصح الا بعذر وهو الأظهر، برهان......(صـ١٠٢) ويلزم استقبال القبلة عند الافتتاح وكلما دارت.

وفي الشامية (١٠٢/٢): (قوله ويلزم استقبال القبلة ـالخ) أى في قولهم جميعاً، بحر، وإن عجز عنه يمسك عن الصلاة، إمداد عن مجمع الروايات ولعله يمسك مالم يخف خروج الوقت لما تقرر من أن قبلة العاجز جهة قدرته، وهذا كذلك والا فما الفرق فليتأمل. وإنما لزمه الاستقبال لأنها في حقه كالبيت حتى لايتطوع فيها مومئا مع القدرة على الركوع والسجود بخلاف راكب الدابة. كذا في الكافي شرح المنية.

(٦٥) بیت اللہ سے کس قدر انحراف جائز ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز کی حالت میں قبلہ سے کتنے انحراف کی گنجائش ہے؟اسی طرح اگر کوئی شخص سعودی عرب میں نماز پڑھنا چاہے تو کعبہ کے بالکل مقابل میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا ضروری ہے یا اگر تھوڑا بہت انحراف ہو جائے تو بھی نماز ہو جائیگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر بیت اللہ بالکل سامنے ہو تو اسوقت کعبہ کی سمت منہ کرنا لازمی ہے اور اگر بالکل سامنے نہ ہو تو اسمیں ۴۵ درجے انحراف کی گنجائش ہے اگر اتنی مقدار کعبہ سے منحرف ہو کر نماز پڑھ لی تو نماز درست ہوگی۔

لمافي معارف السنن(٣٧٩/٣): ثم انه قدرتلك السعة في الجهة بقدرربع الدائرة وصرحوا بفساد صلاة من خرج عن مقدارالربع واذن يتحمل الانحراف في الجهة عن الكعبة نفسهانحوخمس واربعين درجة كماحققه الغزالي وغيره من المحققين.

(٦٦) مسجد سے متصل مکان کی چھت پر نماز میں امام کی اقتداء کرنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کا مکان مسجد سے متصل ہے اس کی سطح مسجد کے برابر متصل ہے وہ وہاں سے چھت پر کھڑے ہو کر امام کی اقتداء کرتے ہیں امام کی حرکات ان پر مشتبہ بھی نہیں ہوتی تو کیا یہ اقتداء درست ہے کہ نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مذکورہ میں اس شخص کی اقتداء صحیح نہیں کیونکہ چھت اگر چہ مسجد کے ساتھ متصل ہے لیکن مکان مختلف ہے اور مکان مختلف ہونے کی صورت میں اقتداء صحیح نہیں ہوتی۔

لمافی الهندیة(۱/۸۸): وإن قام علی سطح داره المتصل بالمسجد لایصح اقتداء ه وان کان لا یشتبه علیه حال الامام.

وفی الدرالمختار(۱/۵۸۶): ولو اقتدی من سطح داره المتصلة بالمسجد لم یجز لاختلاف المکان.

(۶۷) ایسے شخص کی نماز کا حکم جو بعض حروف کی ادائیگی پر قادر نہ ہو

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص بعض حروف کے پڑھنے پر قادر نہ ہو اور الرحیم کی جگہ الہیم پڑھے، کیا ایسے شخص کی نماز درست ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... جو شخص بعض حروف کے پڑھنے پر قادر نہ ہو تو اس کے نماز پڑھنے کی دو صورتیں ہیں، یا تو وہ شخص امام ہوگا یا منفرد، اگر امام ہے تو وہ اپنے جیسے لوگوں کی تو امامت کر سکتا ہے لیکن ان لوگوں کی امامت نہیں کر سکتا جو الفاظ درست طریقے سے پڑھنے پر قادر ہوں، اور اگر وہ تنہا نماز پڑھتا ہے تو جبتک وہ الفاظ درست طریقے سے ادا کرنے پر قادر نہیں تو ایسی صورت میں اس کا اپنی نماز اسی طرح پڑھنا جائز ہے۔

لمافی الهندیة(۱/۷۹): ان ذکر حرفا مکان حرف ولم یغیر المعنی بان قرأ ان المسلون ان الظالمون وما اشبه ذلک لم تفسد صلاته وان غیر المعنی فان أمکن الفصل بین الحرفین من غیر مشقة کالطاء مع الصاد فقرا الطالحات مکان الصالحات تفسد صلاته عند الکل وان کان لایمکن الفصل بین الحرفین الا بمشقة کالظاء مع الضاد والصاد مع السین والطاء مع التاء اختلف المشایخ قال أکثرهم لاتفسد.

وفی الشامیه(۱/۲۳۳):(قوله أو بدله باخر) هذا اما ان یکون عجزا کالالثغ وقدمناحکمه فی باب الامامة، واما ان یکون خطأ، وحینئذ فاذا لم یغیر المعنی فان کان مثله فی القران نحوان المسلمون لا یفسد، والا نحو قیامین بالقسط، وکمثال الشارح لاتفسد عندهما وتفسد عند ابی یوسف، وان غیر فسدت عندهما.......(قوله الامایشق الخ) قال فی الخانیة والخلاصة الاصل فیما اذا ذکر حرفا مکان حرف وغیر المعنی ان امکن الفصل بینهما بلا مشقة تفسد والایمکن الابمشقة کالظاء مع الضاد المعجمتین والصاد مع السین المهملتین والطاء مع التاء قال أکثرهم لاتفسدوفی خزانة الاکمل قال القاضی ابو عاصم: ان تعمد ذلک تفسد وان جری علی لسانه اولا یعرف التمییز لاتفسد وهو المختار.

(۶۸) رکوع اور سجدہ پر قدرت کے باوجود اشارہ سے رکوع اور سجدہ کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی کمر کی شدید بیماری میں مبتلا ہے اور یہ آدمی نماز اس طریقے سے پڑھتا ہے کہ کسی تکیہ وغیرہ کو ٹیک لگا کر اشارہ کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں حالانکہ رکوع اور سجدہ کرنے میں تکلیف زیادہ نہیں ہوتی تو کیا رکوع اور سجدے پر قدرت کے باوجود اشارہ سے رکوع اور سجدہ کرنا جائز ہے اگر جائز ہے تو بیٹھ کر نماز پڑھنے والا رکوع اور سجدہ کس طرح ادا کرے گا؟ جو بھی طریقہ شرعاً جائز ہو، مدلل بیان فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... اشارہ سے رکوع اور سجدہ کرنے کے جواز کیلئے ضروری ہے کہ مریض کسی بھی طرح سے کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر رکوع اور سجدہ کرنے پر قادر نہ ہو اگر وہ رکوع اور سجدہ کرنے پر قادر ہو تو اشارہ کے ساتھ رکوع اور سجدہ کرنا اس کیلئے جائز نہیں البتہ اگر رکوع اور سجدہ کرنے سے اس کی تکلیف کی زیادتی یا مرض کے بڑھ جانے کا خدشہ ہو تو اس صورت میں اشارہ سے رکوع اور سجدہ کر سکتا ہے البتہ سجدہ میں بنسبت رکوع کے زیادہ جھکے گا۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں چونکہ مذکورہ شخص کی تکلیف اتنی زیادہ نہیں ہے کہ وہ رکوع اور سجدہ نہ کر سکے۔ اس لئے اس کیلئے اشارہ سے رکوع اور سجدہ کرنا جائز نہیں۔

لمافی المحیط البرهانی(۲۶/۳): الأصل فی هذا الفصل: أن المریض اذا قدر علی الصلاة قائما برکوع وسجود فانه یصلّی المکتوبة قائماً برکوع وسجود ولا یجزئه غیر ذلک، لانه لما قدر علی القیام والرکوع والسجود کان بمنزلة الصحیح، والصحیح لا یجزئه أن یصلی المکتوبة الا قائما برکوع وسجود کذلک هذا، وان عجز عن القیام وقدر علی القعود فانه یصلی المکتوبة قاعدا برکوع وسجود ولا یجزئه غیر ذلک لانه عجز عن نصف القیام وقدر علی النصف فما قدر علیه لزمه وما عجز عنه سقط.

وفی الهندیة (۱۳۶/۱): وان عجز عن القیام والرکوع والسجود وقدر علی القعود یصلی قاعدا بایماء ویجعل السجود اخفض من الرکوع کذا فی فتاویٰ قاضیخان.

وفی الشامیة(۹۷/۲): لو قدر علی بعض القیام دون تمامه أو کان یقدر علی القیام لبعض القراءة دون تمامها یؤمر بأن یکبر قائما ویقرأ ما قدر علیه ثم یقعد إن عجز وهو المذهب الصحیح لایروی خلافه عن اصحابنا، ولو ترک هذا خفت أن لا تجوز صلاته، وفی شرح القاضی فان عجز عن القیام مستویا قالوا یقوم متکئاً لایجزئه الا ذلک وکذا لو عجز عن القعود مستویا قالوا یقعد متکئاً لا یجزئه الا ذلک.

(۶۹) دورانِ سفر بیٹھ کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ میں کہ ایک مرتبہ ہم سفر میں تھے ایک ساتھی نے گاڑی میں سیٹ پر بیٹھے ہوئے نیت باندھ لی اور اشارہ کے ساتھ نماز پڑھتا رہا، بعد میں جب میں نے ان سے دریافت کیا کہ کیا اسطرح نماز پڑھنا جائز ہے تو انہوں نے کہا کہ نوافل پڑھ سکتے ہیں۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ نوافل کا حکم صرف سفر کے ساتھ خاص ہے یا گاؤں، شہر کے اندر بھی اگر کہیں جانا ہو تو گاڑی میں اس طرح نوافل پڑھ سکتے ہیں؟ نیز اسی طرح چاہے سفر ہو یا حضر گاڑی میں نوافل کے علاوہ سنتوں وغیرہ کی نیت باندھی جاسکتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... جب کوئی شخص شہر کی حدود سے باہر نکلے (مقیم ہو یا مسافر) تو اسکے لئے دورانِ سفر بس کی سیٹ پر بیٹھ کر فجر کی سنتوں کے علاوہ بقیہ سنن اور نوافل پڑھنا درست ہے۔

وفی الشامیة(۲/۳۸): (قوله ویتنفل المقیم راکبا الخ) ای بلاعذر. اطلق النفل فشمل السنن المؤکدة الاسنة الفجر.

(۷۰) بحری جہاز میں بیٹھ کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص بحری جہاز میں سفر کررہا ہو تو ایسے شخص کی نماز کی کیا صورت ہوگی کیونکہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنا فرض ہے تو کیا ہر صورت میں کھڑا ہونا ضروری ہے اگر نہ ہو سکے تو کیا کرے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر بحری جہاز میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا مشکل ومتعذر ہو تو بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز ہے۔

لمافی الشامیة(۲/۱۰۱): (قوله وهوالاظهر) وفی الحلیة بعدسوق الأدلة: والاظهران قولهماأشبه فلاجرم ان فی الحاوی القدسی وبه ناخذ.... (قوله والافکالواقفة) ای ان لم تحر کهاالریح شدیدابل یسیرافحکمهاکالواقفة فلاتجوز الصلاة فیهاقاعدامع القدرة علی القیام کمافی الامداد.

(۷۱) چارپائی اور گدے پر نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ چارپائی پر بلاعذر نماز پڑھنا کیسا ہے، نیز جو چیز اپنی جگہ پر نہ ٹہرتی ہو مثلاً فوم کا گدا وغیرہ اس پر نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... چارپائی پر نماز پڑھنا بلاکراہت جائز ہے بشرطیکہ وہ ٹھوس ہو، نیز ادائیگی سجدہ کے لئے ضروری ہے کہ جس

چیز پر سجدہ کیا جارہا ہے وہ کم از کم ایسی ہو کہ جس میں کچھ نہ کچھ سختی اور حجم ہو، اس طور پر کہ نمازی اگر سجدہ کرنے میں مبالغہ کرے تو وہ چیز اس گہرائی اور اترائی سے مزید آگے نہ بڑھے اور نہ دبے، لہٰذا صورت مسئولہ میں اس موٹے فوم میں اگر یہ مذکورہ بالا صفات پائی جاتی ہوں تو اس پر نماز پڑھنا درست ہے ورنہ نہیں۔

لما فی الشامیة (۱/۵۰۰): (قوله وان یجدحجم الارض) تفسیره ان الساجدلوبالغ لایتسفل رأسه ابلغ من ذالک فصح علی طنسفة وحصیر وحنطة و شعیر وسریر وعجلة ان کانت علی الارض لاعلی ظهر حیوان کبساط مشدود بین الاشجار ولاعلی ارزاو ذرة ...... اوحشیش الاان وجدحجمه ومن هنایعلم الجوازعلی الطراحةالقطن فان وجدالحجم جازوالافلا.

(۷۲) سر کے بال بوقت سجدہ پیشانی کے نیچے آجائیں تو نماز کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر انسان کے بال لمبے ہوں اور سجدے کے وقت وہ پیشانی کے نیچے آجائیں تو کیا اس شخص کی نماز ہوجاتی ہے؟ جبکہ ہمارے ہاں ایک مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ اس صورت میں نماز نہیں ہوتی۔

الجواب حامداًومصلیاً...... سجدہ کی ادائیگی کی صحت میں اصل بات یہ ہے کہ پیشانی اور ناک سجدہ کرنے کی حالت میں زمین پر یا جو چیز زمین پر ہے اچھی طرح قرار پالیں، ایسا نہ ہو کہ اگر نمازی اپنے سر کو زور دے، تو سر مزید نیچے جاسکے۔ جو بال سجدے کی حالت میں پیشانی پر آجاتے ہیں تو ان بالوں کے ہوتے ہوئے پیشانی اور ناک ظاہر ہے کہ اچھی طرح قرار پالیتے ہیں۔ لہٰذا اس شخص کی نماز درست ہے۔

لما فی الدرالمختار (۱/۵۰۰): (کما یکره تنزیها بکورعمامته) الا بعذر (وان صح عندنا (بشرط کونه علی جبهته) کلها او بعضها کمامر. (واما اذا کان) الکور (علی رأسه فقط وسجد علیه مقتصراً) ای ولم تصب الارض جبهته ولا انفه علی القول به (لا) یصح لعدم السجود علی محله، وبشرط طهارة المکان وان یجدحجم الارض، والناس عنه غافلون.

قال فی الشامی: (قوله وأن یجدحجم الارض) تفسیره ان الساجد لوبالغ لا یتسفل راسه ابلغ من ذالک، فصح علی طنفسة و حصیر وحنطة وشعیر وسریر ...... ولا علی أرز اوذرة الافی جوالق او ثلج ان لم یلبده وکان یغیب فیه وجهه ولا یجد حجمه، او حشیش الا ان وجدحجمه، ومن هنا یعلم الجواز علی الطراحة القطن، فإن وجد الحجم جاز والا فلا، بحر (قوله والناس عنه غافلون) ای عن اشتراط وجود الحجم فی السجود علی نحو الکور والطراحة کما یغفلون عن اشتراط السجود علی الجبهة فی کور العمامة.

(۷۳) مقتدی کا امام سے پہلے رکوع سے اٹھنا اور پھر امام کے ساتھ دوبارہ رکوع میں شامل ہونا

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص امام سے پہلے رکوع میں چلا گیا، اب اس کیلئے حکم یہ ہے کہ وہ رکوع ہی کی حالت میں رہے، یہاں تک کہ امام بھی رکوع کر لے، لیکن اگر وہ شخص امام کے رکوع کرنے سے پہلے رکوع سے کھڑا ہو گیا اور امام کے ساتھ قیام میں رہا پھر امام کے ساتھ رکوع ادا کیا، تو کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... نماز کے فرائض میں مقتدی کا امام کی اقتداء کرنا فرض ہے بایں معنی کہ مقتدی امام کے ساتھ رکن میں شریک ہو جائے اب صورت مسئولہ میں چونکہ مقتدی امام کے ساتھ اس رکوع کا اعادہ کر لیتا ہے لہٰذا وہ امام کے تابع اور شریک ہے اور جس عمل میں اس نے امام سے انفرادا ختیار کر لیا ہے وہ ایک رکعت سے کم ہے جو کہ مفسد نماز نہیں لہٰذا اس کی یہ نماز صحیح ہے۔

لما في الهندية (۱/۱۰۴،۱۰۵): اذا زاد في صلاته ركوعا أو سجودا ذكر في ظاهر الرواية انها لاتفسد ...... ولو زاد فيها ركعة تامة قبل اتمام صلاته فسدت صلاته لوركع الامام وسجد سجدة ورفع رأسه عنها فجاء رجل ودخل معه وركع وسجد سجدتين فانها تفسد صلاته لانه أدخل زيادة ركعة وهو الركوع والسجود وانها تفسد الصلاة هكذا في المحيط.

وفي الشامية (۱/۴۷۱): نعم تكون المتابعة فرضاً بمعنى أن يأتي بالفرض مع امامه أوبعده كما لوركع امامه فركع معه مقارنا أومعاقبا وشاركه فيه أو بعد مارفع منه فلولم يركع اصلا أو ركع ورفع قبل ان يركع امامه ولم يعده معه اوبعده بطلت صلاته.

والحاصل ان المتابعة في ذاتها ثلاثة انواع مقارنة لفعل الامام مثل ان يقارن احرامه لاحرام امامه وركوعه لركوعه وسلامه لسلامه ويدخل فيها مالوركع قبل امامه ودام حتى ادركه امامه فيه ومعاقبة لابتداء فعل امامه مع المشاركة في باقيه ومتراخية عنه.

(۷۴) تعدادِ رکعات میں نیت کی غلطی

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے ظہر کی سنتیں پڑھنے کی نیت کی لیکن بجائے چار کے دو رکعات کی نیت کر لی اب وہ کتنی رکعتیں پڑھے نیز ظہر کی سنتوں کا اعادہ کرے یا نہیں؟ اسی طرح اگر سنتوں کی نیت ہی نہیں کی بلکہ صرف نماز کی نیت کی اور تکبیر کہہ دی اور پھر چار رکعات پڑھ لیں تو آیا اسطرح ظہر کی سنتیں ادا ہو جائینگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ کو سمجھنے سے پہلے یہ سمجھیں کہ سنن رواتب کو مطلق نیت صلاۃ سے ادا کرنا جائز ہے، اسی طرح اگر زبان سے دل کے ارادہ کیخلاف اور الفاظ نکل جائیں تو اسکا کوئی اعتبار نہیں۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں جب نماز پڑھتے وقت اسکی نیت

چار رکعات کی تھی اور غلطی سے دو رکعات کے الفاظ نکل گئے تو اس صورت میں چار رکعات سنتیں ہی ادا ہونگی، ہاں اگر شروع کرتے وقت دل ہی سے دو رکعات کی نیت کی تھی تو پھر دو ہی سنتیں پڑھیگا۔ اور چار رکعات دوبارہ پڑھیگا، اسی طرح اگر سنت کی نیت ہی نہ کی بلکہ صرف نماز کی نیت کی اور چار رکعات پڑھ لیں تو بھی ظہر کی سنتیں ادا ہو جائینگی۔

لمافی الدرالمختار(۱/۴۱۴): (و)الخامس (النية) بالاجماع (وهي الارادة) المرجحة لاحدالمتساويين اى ارادة الصلاة لله تعالى على الخلوص، وفى (ص۴۱۵) فلاعبرة للذكر باللسان ان خالف القلب لانه كلام لانية،

وفى الشامية تحته: (قوله ان خالف القلب) فلو قصدالظهر وتلفظ بالعصر سهوا اجزأه.

وفى الدرالمختار (۱/۴۱۷): (وكفى مطلق نية الصلاة)وان لم يقل لله(لنفل وسنة) راتبة (وتراويح) على المعتمد.

(۷۵) واجباتِ نماز کی تعداد، اور قومہ اور جلسہ کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم چھوٹی کتابوں (نماز حنفی، تعلیم الاسلام وغیرہ) میں پڑھتے چلے آرہے ہیں کہ واجبات نماز چودہ ہیں جن کے اندر انہوں نے قومہ اور جلسہ بھی شمار کیا ہے اب ہم کنز الدقائق پر پہنچے تو اس میں واجبات بارہ لکھے، قومہ اور جلسہ کو سنن صلوۃ میں شمار کیا، عبارت یہ ہے: وسننها رفع اليدين للتحريمة...... والقومة والجلسة آپ حضرات سے معلوم یہ کرنا ہے واجبات نماز کتنے ہیں، اور قومہ، جلسہ واجب ہے یا مسنون؟ اور صاحب کنز نے ان کو سنن کے اندر کس لئے ذکر کردیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... عام طور پر فقہ کی کتابوں میں واجبات کی تعداد ۱۴ بتائی جاتی ہے اور یہ وہ واجبات ہیں جن کو بنیادی حیثیت حاصل ہے ورنہ واجبات اس کے علاوہ اور بھی ہیں۔ قومہ اور جلسہ کے بارے میں مذہب مشہور تو یہ ہے کہ یہ دونوں مسنون ہیں۔ لیکن متاخرین فقہاء کرام (جیسا کہ علامہ ابن ہمام اور ان کے شاگرد ابن امیر حاج، علامہ طحطاوی، علامہ حصکفی اور علامہ شامی وغیرہم رحمہم اللہ تعالیٰ) کے نزدیک وجوب راجح ہے۔ صاحب کنز نے بناء بر مذہب مشہور کے ان (یعنی قومہ اور جلسہ) کو سنن میں ذکر کیا ہے۔

لمافی البحر الرائق(۱/۵۲۳): قيد بالطمأنينة فى الاركان اى الركوع والسجود لان الطمأنينة فى القومة والجلسة سنة عند ابى حنيفة ومحمد بالاتفاق وعند ابى يوسف فرض كما تقدم وفى شرح الزاهدى مايدل على وجوبها عندهما كوجوبها فى الاركان فانه قال: وذكر صدر القضاة واتمام الركوع واكمال كل ركن واجب عند ابى حنيفة ومحمد وعند ابى يوسف والشافعى فرض وكذا رفع الراس من الركوع والانتصاب والقيام والطمأنينة فيه فيجب ان يكمل الركوع حتى يطمئن كل

عضو منه ويرفع راسه من الركوع حتى ينتصب قائما ويطمئن كل عضو منه وكذا فى السجود ولو ترك شيأ من ذالك ناسيا يلزمه سجدتا السهو ولو تركها عمدا يكره أشد الكراهة ويلزمه ان يعيد الصلوة اهـ وهو يدل على وجوب القومة والجلسة وسياتى التصريح بسنيهما ومقتضى الدليل وجوب الطمأنينة فى الاربعة ووجوب نفس الرفع من الركوع والجلوس بين السجدتين للمواظبة على ذالك كله وللامر فى حديث المسيئ صلاته. وفى فتاوىٰ قاضى خان فى فصل مايوجب السهو قال: المصلى إذا ركع ولم يرفع راسه من الركوع حتى خرساجدا ساهيا تجوز صلاته فى قول ابى حنيفة ومحمد وعليه السهو اهـ وفى المحيط: لو ترك تعديل الاركان او القومة التى بين الركوع والسجود ساهيا لزمه سجود السهو فيكون حكم الجلسة بين السجدتين كذالك لان الكلام فيهما واحد والقول بوجوب الكل هو مختار المحقق ابن الهمام وتلميذه ابن امير حاج حتى قال، انه الصواب والله الموفق للصواب.

وفى فتح القدير (۱/ ۳۰۱، ۳۰۲): (قوله ثم القومة والجلسة) اى بين السجدتين سنة عندهما: اى باتفاق المشايخ بخلاف الطمانينة على ما سمعت من الخلاف وعند ابى يوسف هذه الفرائض للمواظبة الواقعة بيانا وانت علمت حال الطمانينة، وينبغى ان تكون القومة والجلسة واجبتين للمواظبة. .... وانت علمت ان مقتضى الدليل فى كل من الطمأنينة والقومة والجلسة الوجوب.

وفى التاتارخانية (۱/ ۵۱۰): واما واجبات الصلوة فالمذكور فى شروح المشائخ انها ستة، احداها: تعديل الاركان عند ابى حنيفة رحهما الله وفى المغرب، والمراد بتعديل اركان الصلاة تسكين الجوارح فى الركوع والسجود والقومة بينهما والقعدة بين السجدتين .... وهاهنا اشياء اخرهى من جملة الواجبات.

وفى الطحطاوى على الدر (۱/ ۲۰۷): قال الطحطاوى تحت قول الدر (وهى) على ماذكره اربعة عشر، قوله على ما ذكره) اى لابالنظر للواقع لانها كثيرة جدا.

(۷۶) نماز میں دونوں پیروں کے درمیان فاصلہ

سوال...... کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز کے قیام میں دونوں پیروں کے درمیان فاصلہ کتنا ہونا چاہئے اور کیا یہ فاصلہ واجب ہے، سنت ہے، یا مستحب ہے؟ نیز پاؤں رکھنے کا صحیح طریقہ بھی بتادیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں نماز کے قیام میں دونوں پیروں کے درمیان ہاتھ کی چار انگلیوں کے برابر فاصلہ رکھنا مستحب

ہے لیکن اگر کسی شخص کو اس میں حرج ہو تو جتنی مقدار میں نماز میں خشوع وخضوع باقی رہے اسکے لئے وہی مستحب ہے بشرطیکہ پاؤں بالکل کھلے نہ ہوں اور نہ بالکل جڑے ہوں۔

نیز پاؤں رکھنے کا صحیح اور مسنون طریقہ یہ ہے کہ پاؤں کی انگلیاں قبلہ رخ ہوں ورنہ مکروہ ہے۔

لمافی الشامية(۱/۴۴۴):وينبغي ان يكون بينهما مقدار اربع اصابع اليد لانه اقرب الى الخشوع. هكذا روى عن ابى نصر الدبوسى انه كان يفعله كذافى الكبرى.

وفى الدرالمختار (۱/۵۰۳):(ويستقبل باطراف اصابعه رجليه القبلةويكره ان لم يفعل) ذالک.

وفى الشامية تحته: (قوله ويكره ان لم يفعل ذالک)......وقال الرملى فى حاشية البحر ظاهره انه سنة وبه صرح فى زاد الفقير.

(۷۷) حالت نماز میں نگاہ کہاں رکھی جائے

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل اکثر لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ جب وہ نماز پڑھتے ہیں تو نماز میں نظر ایک جگہ نہیں رکھتے ادھر ادھر گھماتے رہتے ہیں، کیا ان لوگوں کی نماز صحیح ہوجائے گی نیز نماز کی حالت میں نگاہ کہاں رکھنی چاہیے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......حالت قیام میں نگاہ سجدہ گاہ میں رکھنا اور حالت رکوع میں اپنے پاؤں پر رکھنا، اور حالت سجدہ میں اپنے ناک پر رکھنا اور حالت قعود میں اپنی گود میں رکھنا اور پہلے سلام کے وقت دائیں کندھے پر اور دوسرے سلام میں بائیں کندھے پر رکھنا مستحب ہے......خلاصہ یہ ہے کہ نماز کی حالت میں خشوع اور خضوع مستحب ہے اگر نماز میں خشوع اور خضوع نہ ہو، اور آدمی ادھر ادھر دیکھے تو اس کو حدیث میں اختلاس شیطان سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی شیطان کا نماز میں سے چوری کرنا قرار دیا گیا ہے اور اگر نماز میں التفات ہو، اور خشوع اور خضوع میں خلل نہ ہو تو یہ خلاف اولیٰ ہے۔

لمافى البخارى (۱/۱۰۴): حدثنا مسدّد قال حدثنا ابو الاحوص قال حدثنا اشعث بن سليم عن ابيه عن مسروق عن عائشة قالت سالت رسول الله ﷺ عن الالتفات فى الصلوة فقال هو اختلاس يختلسه الشيطان من صلوة العبد.

وفى بدائع الصنائع (۲/۷۳): فقال يرمى ببصره الى موضع سجوده فى حالة القيام، وفى حالة الركوع الى رؤس اصابع رجليه وفى حالت السجود الى ارنبة انفه، وفى حالة القعدة الى حجره لان هذا كله تعظيم وخشوع.

وفى الهندية(۱/۷۲): (وادابها) نظره ان موضع سجوده حال القيام والى ظهر قدميه حالة الركوع

والی ارنبته حالة السجود والی حجره حالة القعود وعند التسلیمة الاولی الی منکبة الایمن وعند الثانیة منکبه الایسر.

وفی الدرالمختار (۱/۴۷۷): (ولها آداب) ترکه لایوجب اساءة ولا عتاباً کترک سنة الزوائد لکن فعله افضل (نظره الی موضع سجوده حال قیامه والی ظهر قدمیه حال رکوعه والی ارنبة أنفه حال سجوده والی حجره حال قعوده والی منکبه الایمن والایسر عند التسلیمة الأولی والثانیة.

وفی الفقه الاسلامی وادلته (۲/۹۶۴): قال الحنفیة: یکره تنزیها الالتفات بالعنق فقط ای بالوجه کله، او ببعضه، وببصره.

(۷۸) نمازی کے سامنے سے گزرنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ الحمدللہ میں پنج وقتہ نمازوں کو باجماعت ادا کرنے کا حتی الوسع اہتمام کرتا ہوں۔ اکثر ظہر کے وقت چونکہ لنچ ٹائم ہوتا ہے اور وقت بھی کم ہوتا ہے، ہمیں یہ دشواری پیش آتی ہے کہ اگلی صفوں میں نماز پڑھیں تو پچھلی صفوں میں بعد میں آنے والے نمازی چونکہ دیر تک نماز پڑھتے ہیں اس وجہ سے ہمیں بیٹھا رہنا پڑتا ہے، میں نے ایک صاحب سے سنا ہے کہ ایسی مجبوری کی صورت میں کچھ فاصلے سے گزرنا صحیح ہے۔ براہ کرم آپ مجھے تفصیل سے یہ بتادیں کہ نماز پڑھنے والے کے سامنے سے کتنے گز کے فاصلے پر آدمی کو شرعاً گزرنے کی اجازت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... اگر نمازی چھوٹی مسجد یا چھوٹے کمرے میں ہو تو اس کے سامنے سے گزرنے کی اجازت نہیں (چھوٹی مسجد سے مراد وہ مسجد ہے جو کہ چالیس گز شرعی یعنی ساٹھ فٹ انگریزی سے کم ہو) البتہ اگر نمازی بڑی مسجد، صحرا یا کسی میدان میں ہو اور اس کے آگے کوئی سترہ یا آڑ نہ ہو تو اصح قول کے مطابق دو صفوں کے بقدر فاصلہ چھوڑ کر آگے سے گزرنے کی گنجائش ہے۔

لمافی الهندیة (۱/۱۰۴): والاصح انه موضع صلاته من قدمه الی موضع سجوده کذا فی التبیین قال مشایخنا اذا صلی رامیا بصره الی موضع سجوده فلم یقع بصره علیه لم یکره وهو الصحیح.

وفی الدر المختار (۱/۶۳۴): (ومرورمارفی الصحراء أوفی مسجد کبیر بموضع سجوده) فی الاصح أو مروره (بین یدیه) الی حائط القبلة (فی) بیت و (مسجد) صغیر فانه کبقعة واحدة (مطلقا).

وفی الشامیة تحته: (قوله ومسجد صغیر) هو اقل من ستین زراعاً وقیل من اربعین وهو المختار کما اشار الیه فی الجواهر قهستانی (قوله فانه کبقعة واحدة) ای من حیث انه لم یجعل الفاصل فیه بقدر صفین مانعا من الاقتداء تنزیلا له منزلة مکان واحد بخلاف المسجد الکبیر فانه جعل فیه

مانعافکذاھنا یجعل جمیع مابین یدی المصلی الی حائط القبلة مکانا واحداً بخلاف المسجد الکبیر والصحراء فانه لوجعل کذلک لزم الحرج علی المارة فاقتصرعلی موضع السجود.

(۷۹) نمازی کے ایک جانب سلام پھیرنے کے بعد سامنے سے گزرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نماز پڑھ رہا تھا۔ایک طرف سلام پھیرا تو اس کے سامنے سے بکر گزر گیا۔اب معلوم یہ کرنا ہے کہ نمازی کے سامنے سے گزرنے کی جو وعید ہے اس میں بکر آئے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں زید کا ایک طرف سلام پھیرنے کے بعد اس کے سامنے سے گزرنے سے بکر وعید مذکور میں نہیں آئے گا۔ کیونکہ پہلا سلام تحلیل اور خروج عن الصلاۃ کیلئے ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ امام جب ایک طرف سلام پھیر لیتا ہے اس کے بعد اس کے پیچھے اقتداء صحیح نہیں ہوتی۔

لمافی التاتارخانیة(۱/۵۵۲): وعن محمدؒ ان التسلیمة الثانیة تحیة للحاضرین و التسلیمة الاولی للتحیة والخروج لان من تحرم فقد غاب عن الناس ولا یکلمهم ولا یکلمونه وعند التحلیل کانه یرجع الیهم فیسلم.

وفی الدر المختار(۱/۴۶۸): وتنقضی قدوة بالاول قبل علیکم علی المشهور عندنا (وفی الشامی) (قوله وتنقضی قدوة بالاول) ای بالسلام الاول قال فی التجنیس الامام اذا فرغ من صلاته فلما قال السلام جاء رجل واقتدیٰ به قبل ان یقول علیکم لایصیر داخلا فی صلاته لان هذا سلام.

(۸۰) نماز میں تکبیرات کی حیثیت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک دوست ہے اور اکثر اوقات امام کے ساتھ تکبیرات نہیں کہتا اور کہتا ہے کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ،تو کیا اس کا ایسا کہنا درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... تکبیرات نماز میں سے تکبیر تحریمہ فرض ہے اور اس کو ترک کرنے سے نماز نہیں ہوتی۔اور تکبیر تحریمہ کے علاوہ باقی تکبیریں سنت ہیں،ان کے ترک سے نہ نماز فاسد ہوتی ہے اور نہ سجدہ سہو لازم ہوتا ہے۔البتہ ان کے ترک کی عادت بنانا برا اور باعث گناہ ہے،لہٰذا آپ کے دوست کا یہ کہنا کہ تکبیرات کی ضرورت نہیں بالکل غلط ہے۔

لمافی الهندیة (۱/۶۸):(منها التحریمة) وهی شرط عندنا.

وفیه ایضا(۱/۷۲): (سننها) رفع الیدین ... وتکبیر الرکوع ... وتکبیر السجود الخ.

وفی الدرالمختار(۱/۴۴۲): (من فرائضها) التی لاتصح بدونها (التحریمة) قائما (وهی شرط) فی

غير جنازة على القادر به يفتي.

وفي الشامية تحته : (قوله التي لاتصح بدونها) صفة كاشفة اذ لاشئ من الفروض ما تصح الصلاة بدونه بلا عذر (قوله التحريمة)...... سميت بها لتحريمها الاشياء المباحة قبل الشروع بخلاف سائر التكبيرات.

وفي الدر المختار(۱/۴۷۳،۴۷۴) : (وسننها) ترک السنة لايوجب فساداً ولا سهواً بل إساءة لوعامداً غير مستخف.

وفي حاشية الطحطاوى على المراقى(۱/۲۵۶): ترک السنة لايوجب فساداً ولا سهواً بل إساءة لوعامداً غير مستخف...... ويلام على تركها مع لحوق إثم يسير اهـ.

(۸۱) تکبیرِ تحریمہ کے وقت ''اللہ اکبر'' کہنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تکبیرِ تحریمہ کے وقت ''اللہ اکبر'' کہنا واجب ہے یا سنت، میرے ایک دوست کہتے ہیں کہ سنت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......تکبیرِ تحریمہ کے وقت ''اللہ اکبر'' کہنا واجب ہے لہٰذا ''اللہ اکبر'' کے علاوہ کسی ایسے لفظ سے اگر تکبیر کہی گئی جس سے تحریمہ صحیح ہوتی ہو، جیسے ''اللہ اجل'' وغیرہ تو یہ مکروہ تحریمی ہے۔

لمافي الهندية(۱/۷۲): والذكر إن كان وجب للصلاة فانه يجهر به كتكبيرة الافتتاح.

وفي حاشية الطحطاوى على مراقى الفلاح(صـ۲۰۴): (قوله ويكره الشروع بغيره) أى تحريماً لأنه لترک الواجب.

(۸۲) قومہ وجلسہ اور اس میں طمانینت کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگ جب نماز پڑھتے ہیں تو وہ رکوع کے بعد سیدھے کھڑے نہیں ہوتے، جلدی سے سجدے میں چلے جاتے ہیں یعنی قومہ صحیح نہیں کرتے۔ اسی طرح ایک سجدہ کرنے کے بعد سیدھے نہیں ہو پاتے اس سے پہلے دوسرے سجدے میں چلے جاتے ہیں یعنی جلسہ بھی صحیح نہیں کرتے۔ اب معلوم یہ کرنا ہے کہ قومہ اور جلسہ کا کیا حکم ہے ان میں طمانینت ضروری ہے یا نہیں؟ جو لوگ اس کا خیال نہیں کرتے ان کی نمازوں کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً......نماز کے تمام ارکان رکوع وسجدہ وغیرہ کی تعدیل تو واجب ہے، قومہ اور جلسہ نماز کے رکن نہیں ہیں، اس لئے مشہور تو مذہب میں یہی ہے کہ یہ سنت ہیں، لیکن علامہ شامی اور طحطاویؒ کی تصریح کے مطابق نفس قومہ اور جلسہ کے وجوب کے ساتھ ساتھ طمانینت

قومہ وجلسہ بھی واجب ہے، علامہ ابن الہمام نے بھی نفس قومہ اور جلسہ کے وجوب کے ساتھ ساتھ طمانینت قومہ وجلسہ کے وجوب کو اختیار کیا ہے۔ طمانینت وتعدیل یہ ہے کہ مصلی ایک مرتبہ تسبیح کہنے کی مقدار کھڑا ہوجائے اور تمام اعضاء اپنی جگہ پر ٹھہر جائیں۔ لہٰذا نفس قومہ اور جلسہ کے وجوب کے ساتھ ایک مرتبہ تسبیح کہنے کی مقدار طمانینت بھی قومہ اور جلسہ میں ضروری ہے اگر کسی سے بھول کر چھوٹ جائے تو سجدہ سہو واجب ہوگا، اور سجدہ سہو کرنے کے بعد نماز درست ہوجائے گی اور جو لوگ جان بوجھ کر قومہ اور جلسہ نہیں کرتے وہ سخت گناہ گار اور مکروہ تحریمی کے مرتکب ہیں ان کی اس طرح پڑھی گئی تمام نمازیں واجب الاعادہ ہیں۔

لمافی الدر المختار مع الشامية(۱/۴۶۴): وتعديل الاركان اى تسكين الجوارح قدر تسبيحة فى الركوع والسجود وكذا فى الرفع منهما على ما اختاره الكمال لكن المشهور ان مكمل الفرض واجب ومكمل الواجب سنة، قال ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ تحت قوله وتعديل الاركان هو سنة عندهما فى تخريج الجرجانى وفى تخريج الكرخى واجب حتى تجب سجدتا السهو بتركه كذا فى الهداية، وجزم بالثانى فى الكنز، والوقاية والملتقى وهو مقتضى الادلة كما يأتى قال فى البحر: وبهذا يضعف قول الجرجانى (قوله وكذا فى الرفع منهما) اى يجب التعديل ايضا فى القومة من الركوع والجلسة بين السجدتين، وتضمن كلامه وجوب نفس القومة والجلسة ايضاً لانه يلزم من وجوب التعديل فيهما وجوبهما، (قوله على ما اختاره الكمال) قال فى البحر: ومقتضى الدليل وجوب الطمانينة فى الاربعة اى فى الركوع والسجود وفى القومة والجلسة، ووجوب نفس الرفع من الركوع والجلوس بين السجدتين للمواظبة على ذالک كله وللامر فى حديث المسئ صلاته، ولما ذكره قاضى خان من لزوم سجود السهو بترک الرفع من الركوع ساهياً وكذا فى المحيط فيكون حكم الجلسة بين السجدتين كذالک لان الكلام فيهما واحد، والقول بوجوب الكل هو مختار المحقق ابن الهمام وتلميذه ابن امير حاج حتى قال انه الصواب...... وقال فى شرح المنية ولا ينبغى ان يعدل عن الدراية اى الدليل اذا وافقتها رواية على ما تقدم عن فتاوى قاضى خان، ومثله ما ذكر فى القنية من قوله: وقد شدد القاضى الصدر فى شرحه فى تعديل الاركان جميعها تشديداً بليغاً فقال: واكمال كل ركن واجب عند ابى حنيفةؒ و محمدؒ وعند ابى يوسف والشافعى (رحمهما الله) فريضة، فيمكث فى الركوع والسجود وفى القومة بينهما حتى يطمئنّ كل عضو منه، هذا هو الواجب عند ابى حنيفة ومحمد رحمه الله حتى لو تركها أو شيئاً منها ساهياً يلزمه السهو ولو عمداً يكره اشد الكراهة، ويلزمه ان يعيد الصلوة وتكون معتبرة فى حق سقوط الترتيب ونحوه كمن طاف جنباً تلزمه الاعادة، والمعتبر هو الاول كذا هذا، والحاصل ان الاصح روايةً ودرايةً وجوب تعديل

الارکان، وامّا القومة والجلسة وتعديلهما فالمشهور في المذهب السنية، وروى وجوبهما، وهو الموافق للادلة، وعليه الكمال ومن بعده من المتاخرين وقد علمت قول تلميذه إنه الصواب.

(۸۳) دورانِ برف باری جوتوں میں ادائیگی نماز کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ برف باری کے دوران جوتوں کے ساتھ نماز پڑھنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں اگر جوتے پاک ہیں اور سجدہ کرتے وقت جوتوں کے ساتھ پاؤں کی انگلیاں بھی زمین سے لگ جاتی ہیں تو ایسے جوتوں کے ساتھ نماز پڑھنا درست ہے۔

لمافي جامع الترمذي(۱/۹۱): حدثنا علي بن حجر نا اسماعيل بن ابراهيم عن سعيد بن يزيد ابي سلمة قال قلت لانس بن مالك اكان رسول الله ﷺ يصلي في نعليه قال نعم. قال ابو عيسى حديث انس حديث حسن صحيح والعمل على هذا عند اهل العلم.

وفي فتح الملهم(۴/۱۲۹): قوله: "قال: نعم" الخ: فيه جواز الصلوة في النعال والخفاف، اى اذا تحقق طهارتها، ويتمكن معها من تمام السجود، بأن يسجد على جميع اصابع رجليه، كما قاله الخطابي.

وفي الدر المختار(۱/۴۴۷): (ومنها السجود) بجبهة وقدميه، ووضع اصبع واحدة منهما شرط.

وفي الشامية(۱/۴۴۷): (قوله وقدميه) يجب اسقاطه لان وضع اصبع واحدة منهما يكفي كما ذكره بعدح وأفاد انه لو لم يضع شيأ من القدمين لم يصح السجود.

(۸۴) اگر ایک سلام پھیر لینے کے بعد کوئی شخص امام کی اقتداء کرے تو کیسا ہے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ امام نے دائیں طرف سلام پھیرا اور ابھی بائیں طرف سلام نہیں پھیرا تھا کہ کسی نے آکر اقتداء کر لی تو کیا اس کی اقتداء کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں اقتداء درست نہیں ہے کیونکہ امام کی نماز پوری ہو چکی ہے۔

لمافي بدائع الصنائع(۱/۱۹۴، ۱۹۵): واما صفته فاصابة لفظة السلام ليست بفرض عندنا ولكنها واجبة ومن المشايخ من اطلق اسم السنة عليها وانها لاتنا في الوجوب الى أن قال أماحكمه فهو الخروج من الصلوة ثم الخروج يتعلق باحدى التسليمتين عند عامة العلماء وروى عن محمد انه

قال التسليمة الاولىٰ للخروج والتحية والتسليمة الثانية للتحية خاصة.

وفي الشامية(۱/۴٦۸): قال في التجنيس الامام اذا فرغ من صلوته فلما قال السلام جاء رجل واقتدى به قبل ان يقول عليكم لايصير داخلا في صلوته لان هذا سلام الا ترى انه لواراد ان يسلم على أحد في صلوته ساهياً فقال السلام ثم علم فسكت تفسد صلوته.

(۸۵) نماز کی سنتیں اور احادیث طیبہ سے ان کا ثبوت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے الحمدللہ اب ہر وقت اس کی فکر رہتی ہے کہ یہ کام سنت اور حدیث کے مطابق ہو رہا ہے یا نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ سنتیں تحریری طور پر بھی میرے پاس رہیں اس کے لئے میں نے کچھ سوالات بنا کر آپ کو بھیجے ہیں براہ کرم اس دفعہ آپ مجھے اتنا بتادیں کہ نماز میں کتنی چیزیں مسنون ہیں؟ اور احادیث میں ان کا ثبوت ہے یا نہیں، اگر ہے تو وہ حدیث ذکر فرمادیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... سنن صلوۃ درج ذیل ہیں:

(۱)...... تکبیر تحریمہ کہتے وقت مردوں کو دونوں ہاتھ کندھوں تک اور عورتوں کو سینے تک اٹھانا۔ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی روایت بحوالہ ابوداؤد، حماد، عبدربہ اور عاصم الاحول کی روایات بحوالہ مصنف ابن ابی شیبہ (۱/۲۱٦)۔

(۲)...... مردوں کو ناف کے نیچے اور عورتوں کو سینے پر ہاتھ باندھنا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت بحوالہ مسند احمد، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت بحوالہ اعلاء السنن (۳/۳۳)۔

(۳)...... ثنا یعنی سبحانک اللھم آخر تک پڑھنا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت بحوالہ جامع ترمذی (۱/۵۷)، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت بحوالہ سنن دارقطنی (۱/۲۹۹)۔

(۴)...... تعوذ یعنی اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم پڑھنا۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت بحوالہ مصنف عبدالرزاق (۲/۸٦)۔

(۵)...... تسمیہ یعنی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنا۔ حضرت ابراہیم رحمہ اللہ کی روایت بحوالہ مصنف عبدالرزاق (۲/۸۷)۔

(٦)...... ایک رکن سے دوسرے رکن منتقل ہوتے وقت تکبیر کہنا۔ حضرت عکرمہ اور حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہما کی روایت بحوالہ بخاری شریف (۱/۱۰۸)۔

(۷)...... رکوع سے اٹھتے وقت سمع اللہ لمن حمدہ اور ربنا لک الحمد کہنا۔ حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کی روایت بحوالہ بخاری شریف (۱/۱۰۹)

(۸)...... رکوع میں سبحان ربی العظیم کم از کم تین مرتبہ کہنا اور اسی طرح سجدہ میں سبحان ربی الاعلیٰ کم سے کم تین مرتبہ کہنا۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت بحوالہ جامع ترمذی (۱/٦۰)۔

(۹)...... جلسہ (یعنی دونوں سجدوں کے درمیان) اور قعدہ یعنی التحیات میں مردوں کا دایاں پاؤں کھڑا کر کے بائیں پاؤں پر بیٹھنا، عورتوں

کا دونوں پاؤں دائیں طرف نکال کر کولھوں پر بیٹھنا۔ حضرت عبداللہ بن عبداللہ کی روایت بحوالہ بخاری شریف (۱/۱۱۴)، حضرت وائل بن حجر اور حضرت عباس بن سہل رضی اللہ عنہما کی روایت بحوالہ جامع ترمذی (۱/۶۵)، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت بحوالہ ابو داؤد (۱/۱۱۴)، حضرت خالد بن اللجلاج کی روایت بحوالہ مصنف ابن ابی شیبہ (۱/۲۴۲)۔

(۱۰)...... درود شریف پڑھنا۔ حضرت کعب بن عجرۃ رضی اللہ عنہ کی روایت بحوالہ بخاری شریف (۱/۴۷۷)۔

(۱۱)...... درود شریف کے بعد دعا پڑھنا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت بحوالہ بخاری شریف (۱/۱۱۵)۔

(۱۲)...... سلام پھیرتے وقت دائیں بائیں والوں کی نیت کرنا۔ حضرت جابر بن سمرہ اور سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہما کی روایات بحوالہ اعلاء السنن (۱/۱۸۲)۔

(۱۳)...... سلام کے وقت دائیں بائیں رخ پھیرنا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت بحوالہ جامع ترمذی (۱/۶۰)۔

نوٹ: حضرات فقہائے کرام نے کتب فقہ میں مزید سنتیں بھی ذکر کی ہیں جو احادیث سے ثابت ہیں۔

(۸۶) آستین چڑھا کر یا صرف ناف سے گھٹنوں تک بدن چھپا کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ آستین چڑھا کر نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں؟ اسی طرح بغیر عذر صرف ناف سے لیکر گھٹنوں تک بدن چھپا کر نماز پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں آستین کہنیوں سے اوپر چڑھا کر یا بغیر عذر صرف ناف سے لیکر گھٹنوں تک بدن کو چھپا کر نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے اگر چہ نماز ہو جائیگی۔

وفی الهندية (۱/۱۰۶): ولو صلى مع السراويل والقميص عنده يكره كذافي الخلاصة وفي الفتاوى العتابية وتكره الصلاة مع البرنس ولايكره لبسه في الحرب كذافي التاتارخانية ولو صلى رافعا كميه الى المرفقين كره كذافي فتاوى قاضي خان.

(۸۷) تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھانے کا طریقہ

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس بارے میں کہ تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ تکبیر کہتے وقت اٹھائے جائینگے یا تکبیر کے بعد یا پہلے؟ نیز بعض لوگ اپنی ہتھیلیوں کا رخ چہرے کی طرف رکھتے ہیں آیا اسطرح کرنا درست ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھانے کے تینوں طریقے درست ہیں البتہ تکبیر سے پہلے ہاتھ اٹھانا مستحب ہے اور مرد ہاتھوں کو اتنا اٹھائے کہ انگوٹھوں کے پورے کانوں کی لو کے برابر ہو جائیں جبکہ عورت اپنے ہاتھوں کو کندھوں تک اٹھائے کیونکہ اسمیں ستر زیادہ ہے، نیز ہتھیلیوں کا رخ چہرہ کی طرف کرنا بھی جائز ہے لیکن بہتر اور مستحب یہ ہے کہ ہتھیلیوں کا رخ قبلہ کی طرف

ہونا چاہئے۔

لمافی الهندية(۱/۷۳): قال الفقيه ابو جعفر يستقبل ببطون كفيه القبلة وينشر اصابعه و يرفعهما فاذا استقرتا في موضع محاذاة الابهامين شحمتي الاذنين يكبر قال شمس الائمة السرخسي عليه عامة المشائخ كذافي المحيط والرفع قبل التكبير هو الاصح. والله اعلم بالصواب.

(۸۸) تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ کی انگلیوں کی حالت

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین میں انگلیاں کس حالت میں رہنی چاہئیں، کھلی رکھے یا ملا کر؟

الجواب حامداًومصلیاً..... تکبیر تحریمہ کے وقت انگلیوں کو نہ ہی کھولنے کی کوشش کرے نہ ملانے کی۔ بلکہ اصل حالت پر رکھ کر انگوٹھوں کو کانوں کی لو سے لگائے اور ہتھیلیوں کو قبلہ رخ کرے۔

لمافي البحر الرائق(۱/۳۰۲): قوله ونشر اصابعه وكيفيته ان لا يضم كل الضم ولا يفرج كل التفريج بل يتركها على حالها منشورة كذا ذكره الشارح والظاهر أن المراد بالنشر عدم الطى بمعنى انه ليس له ان يرفعهما منصوبتين لا مضمومتين حتى تكون الاصابع مع الكف مستقبلة القبلة ومن السنن ان لا يطاطئ رأسه عند التكبير كمافي المبسوط.

وفي الدر المختار(۱/۴۷۴): (رفع اليدين للتحريمة) في الخلاصة ان اعتاد تركه اثم (ونشر الاصابع) اى تركها بحالها.

قال الشامي رحمه الله تحته: (قوله اى تركها بحالها) قال في الحلية ظن بعضهم انه اراد بالنشر تفريج الا صابع وهو غلط بل أراد به النشر عن الطى يعنى برفعها منصوبتين لا مضمومتين حتى تكون الاصابع مع الكشف مستقبلة للقبلة ثم لا يخفى انه لا تتوقف السنة على ضم الاصابع اولا بل لو كانت منشورة غير متفرجة كل التفريج ولا مضمومة كل الضم ثم رفعها كذلك مستقبلا بهما القبلة فقد اتى بالسنة.

(۸۹) تکبیر تحریمہ کے بعد ہاتھ باندھنے کا طریقہ

سوال..... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نیت کرتے وقت ہاتھ کہاں تک اٹھانا مسنون ہے؟ اور کہاں باندھنا مسنون ہے؟ نیز اقامت کے دوران یا رکوع کے بعد ہاتھ باندھنا یا کسی بڑے کے سامنے ہاتھ باندھنا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھانے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ ہاتھوں کو دونوں کانوں تک اسطرح اٹھائیں کہ دونوں انگوٹھے کانوں کی لو کے برابر ہو جائیں اسکے بعد دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ہاتھ کی پشت پر رکھ کر ناف کے نیچے ہاتھ باندھ لیں۔ نیز دورانِ اقامت اور رکوع کے بعد ہاتھ باندھنا ثابت نہیں ہے، جبکہ کسی بڑے کے سامنے ہاتھ تعظیماً باندھ کر کھڑا ہونا کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے اسلئے کہ تعظیماً ہاتھ باندھنا عبادت کیلئے ہوتا ہے جیسے نماز میں، اور غیر اللہ کی اس طور پر تعظیم جائز نہیں۔

لـمافي الهندية (۱/۷۳): و كيفيتها اذا ارادالدخول في الصلاة كبرو رفع يديه حذاء اذنيه حتى يحاذي بـابهـاميـه شـحـمتي اذنيـه وبرؤس الاصابع فروع اذنيه.... (ووضع يده اليمنى على اليسرى تحت السـرة) كمافرغ من التكبير..... وكل قيام ليس فيه ذكر مسنون كمافي تكبيرات العيدين فالسنة فيه الارسـال كـذا فـي الـنهاية وهـو الـصـحيح، كذا في الهداية..... ويرسل اتفاقا في قومة الركوع اذا لذكر سنة الانتقال لاالقومة...

وفيـه ايضـاً (۳۶۸/۵): والتـواضـع لغير الله حرام...تجوز الخدمة لغير الله تعالى بالقيام واخذاليدين والانـحـنـاء..... ان قبـل يـد عـالـم اوسـلـطـان عادل لعلمه وعدله لابأس به..... وان قبل يد غير عالم وغيـر السـلـطـان العادل إن ارادبه تعظيم المسلم واكرامه فلابأس به وان ارادبه عبادة له اولينال منه شيئامن عرض الدنيافهومكروه.

(۹۰) تکبیر تحریمہ کہکر ہاتھ باندھے بغیر فوراً رکوع میں چلے جانے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کل میں نے ایک صاحب کو دیکھا جو کہ پنج وقتہ نمازی ہیں نیز کہ جب وہ نماز کیلئے مسجد میں آئے تو امام صاحب رکوع میں تھے، ان صاحب نے دونوں ہاتھ کانوں تک اٹھائے اور بغیر باندھے رکوع میں چلے گئے کیا ان کا یہ عمل درست ہے؟ اور شرعاً ایسی صورت میں کیا کرنا بہتر ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ میں مذکورہ شخص نے تکبیر تحریمہ قیام کی حالت میں کہی ہے اس لئے اس کی نماز درست ہے تکبیر تحریمہ کا قیام یا قیام کے قریب حالت میں کہنا فرض ہے نیز تکبیر تحریمہ کے بعد ہاتھ باندھنا مسنون ہے البتہ اگر نمازی کو تکبیر تحریمہ کے بعد ہاتھ باندھ کر اور ثناء پڑھ کر امام کے ساتھ شامل ہونے کی صورت میں رکعت فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں ہاتھ باندھے بغیر اور ثناء کو چھوڑ کر امام کے ساتھ شریک ہوسکتا ہے تاہم بہتر یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ کے بعد ہاتھ باندھ کر امام کے ساتھ نماز میں شریک ہوجائے۔

لـمـافـي الهندية (۱/۹۱): وان أدرك الامام في الركوع أو السجود يتحرى ان كان أكبر رأيه أنه لو أتى به أدركه في شي من الركوع أو السجود يأتي به قائماً والايتابع الامام ولا يأتي به واذا لم يدرك الامـام فـي الـركـوع او الـسـجـود لايـاتـي بهـمـا وان ادرك الامام في القعدة لايأتي بالثناء بل يكبر

للافتتاح ثم للانحطاط ثم يقعد.

وفی الدر المختار (۱/۴۸۰): ويشترط كونه (قائماً) فلووجد الامام راكعا فكبر منحنياً ان الى القيام أقرب صح.

(۹۱) تکبیر اولیٰ کی فضیلت کب تک حاصل ہوسکتی ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تکبیر اولیٰ کا ثواب کب تک رہتا ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......تکبیر اولیٰ کا ثواب راجح قول کے مطابق پہلی رکعت کے حاصل ہونے تک رہتا ہے۔

لمافی الهندية (۱/۶۹): أما فضيلة تكبيرة الإفتتاح فتكلموا فی وقت إدراكها والصحيح أن من ادرک الركعة الأولى فقد أدرک فضيلة تكبيرة الافتتاح.

وفی الشامية (۱/۵۲۶): وتظهرفائدة الخلاف فی وقت إدراک فضيلة تكبيرة الإفتتاح فعنده بالمقارنة، وعندهما إذاكبر فی وقت الثناء وقيل بالشروع قبل قراءة ثلاث آيات لوكان المقتدی حاضراً وقيل سبع، لوغائبا وقيل بادراک الركعة الأولى، وهذا أوسع وهو الصحيح اهـ وقيل بادراک الفاتحة، وهو المختار. خلاصة.

(۹۲) ناف سے نیچے ہاتھ باندھنے اور عدم رفع یدین کے ثبوت پر ایک تفصیلی فتویٰ

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا ثابت ہے؟ اور کیا کسی حدیث میں عدم رفع یدین ثابت ہے؟ احادیث سے مسئلہ کو واضح فرمائیں۔

الجواب حامداًومصلیاً......جی ہاں احادیث مبارکہ میں ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا ثابت ہے۔ چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہ (۳/۳۲۰، طبع ادارۃ القرآن) میں ہے: عن علقمة بن وائل بن حجر عن أبيه قال رأيت رسول الله ﷺ وضع يمينه على شماله فی الصلوة تحت السرة.

(ترجمہ): حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا آپ نے نماز میں اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر ناف کے نیچے رکھا ہوا تھا۔

اسی طرح مسند امام احمد (۱/۱۷۷) میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی حدیث موجود ہے جو دارقطنی (۱/۲۸۹) اور بیہقی (۲/۳۱) اور ابوداؤد مع بذل المجہود (۲/۲۳)، المنہل العذب المورود شرح ابوداؤد (۳/۱۲۳، حصہ ۵)، وابوداؤد طبع دار ابن حزم (۱/۲۳۸)، شرح العینی لابی داؤد (۳/۳۳۷) اور مصنف لابن ابی شیبۃ (۳/۲۲۴)، اسی طرح حضرت ابوہریرۃ کی روایت، ابوداؤد مع البذل (۲/۲۳)، المنہل العذب

المورود (۳/۱۶۳، حصہ ۵) وابوداؤد طبع دار ابن حزم (۱/ ۲۳۸) میں موجود ہے جس کو ابن حزم نے محلی بالآ ثار (۳/ ۳۰) میں بھی نقل فرمایا ہے۔اور مغنی لابن قدامۃ (۱/ ۵۱۵) اور المجموع للنووی (۳/ ۲۵۹) میں بھی ہے اور امام اعظم، سفیان ثوری، ابومجلز، ابراہیم نخعی، اسحاق بن راہویہ، ابواسحاق مروزی شافعی، سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا مسلک بھی یہی ہے کہ نماز میں ناف کے نیچے ہاتھ باندھے جائیں۔

(۲)۔باقی رہا عدمِ رفع یدین تو خوب سمجھ لیا جائے کہ احناف عدم رفع یدین کے قائل نہیں بلکہ ترک رفع یدین کے قائل ہیں یعنی پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رفع یدین، رکوع اور سجود میں جاتے وقت اور رکوع اور سجود سے اٹھتے وقت فرماتے تھے پھر رکوع اور سجود کے وقت رفع یدین کو ترک کردیا صرف تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کرتے اس کے بعد رکوع اور سجود کے وقت نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بالکل واضح ہے: **عن ابن مسعود الا اصلی بکم صلاۃ رسول اللہ ﷺ فصلی فلم یرفع یدیه الامرة، ترمذی (۱/ ۵۹) وفی النسائی (۲/ ۱۸۲) فرفع یدیه اول مرة ثم لم یعد، وفی ابی داؤد (۱/ ۱۰۹)، مسند احمد (۱/ ۱۴۴)** یعنی ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں تم کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم والی نماز نہ پڑھاؤں؟ تو آپ نے نماز پڑھائی اور صرف پہلی مرتبہ ہاتھ اٹھائے پھر نہیں اٹھائے۔

اسی طرح حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی حدیث ابوداؤد (۱/ ۱۰۹) میں ہے، جس کو امام طحاوی نے شرح معانی الآثار (۱/ ۱۶۳) اور مصنف ابن ابی شیبہ (۱/ ۴۱۴) اور مصنف عبدالرزاق (۲/ ۷۲) اور دارقطنی (۱/ ۲۹۵) نے نقل کیا ہے۔

قال: کان النبی ﷺ اذا کبر لا فتتاح الصلوة رفع یدیه..... ثم لا یعود ۔حضرت براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب تکبیر تحریمہ کہتے تو ہاتھ اٹھاتے تھے پھر نہیں اٹھاتے تھے، اسی طرح سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث دارقطنی نے (۱/ ۲۹۵) اور بیہقی نے نقل فرمائی۔**عن عبداللہ قال صلیت مع النبی ﷺ ومع ابی بکر ومع عمر رضی اللہ عنهما فلم یرفعوا ایدیهم الا عند التکبیرة الاولیٰ فی افتتاح الصلوة.** یعنی حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ نماز پڑھی وہ حضرات صرف تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھاتے تھے۔اسی طرح سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا عمل منقول ہے چنانچہ شرح معانی الآثار (۱/ ۱۶۳) اور مشکل الآثار (۱۵/ ۵۰) مصنف ابن ابی شیبہ (۲/ ۴۱۸) میں ہے: **عن الاسود قال رأیت عمر بن الخطاب یرفع یدیه فی اول تکبیرة ثم لا یعود** یعنی میں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا تکبیر تحریمہ میں ہاتھ اٹھائے پھر نہیں اٹھائے۔

اسی طرح سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مؤطا میں امام محمد نے نقل کیا جس کو طحاوی نے شرح معانی الآثار (۱/ ۱۶۳) اور مصنف ابن ابی شیبہ (۲/ ۴۱۶) نے نقل کیا اور مسند الامام زید میں بھی (صفحہ ۸۹) میں مذکور ہے: **واللفظ له حدثنی زید بن علی عن أبیه عن جده عن علی رضی اللہ عنه انه کان یرفع یدیه فی التکبیرة الاولی الی فروع اذنیه ثم لا یرفعهما حتی یقضی صلاته** یعنی سیدنا زید رحمہ اللہ اپنے والد علی بن حسین وہ اپنے والد حسین رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں وہ اپنے والد سیدنا علی رضی اللہ عنہ

کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھاتے تھے پھر نماز کے اختتام تک نہیں اٹھاتے تھے۔

اسی طرح عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا عمل موطا (صفحہ۹۳) پر منقول ہے: عن عبدالعزیز بن حکیم قال رأیت ابن عمر رضی اللہ عنہ یرفع یدیہ حذاء اذنیہ فی اول تکبیرۃ افتتاح الصلوۃ ولم یرفعھما فیما سوی ذلک یعنی عبدالعزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کو دیکھا آپ فقط تکبیر تحریمہ میں ہاتھ اٹھاتے تھے اس کے علاوہ کہیں بھی نہیں اٹھاتے تھے۔ اس کو امام طحاوی نے مجاہد رحمہ اللہ سے بھی نقل کیا (۱/۱۶۳) اور یہ مصنف ابن ابی شیبہ (۲/۴۱۷) میں بھی مذکور ہے۔

یہ بطور نمونہ کے چند صحابہ سے احادیث نقل کر دیں، اس کے علاوہ تابعین و تبع تابعین اور فقہاء و محدثین میں جماعت کثیرہ کا یہی مسلک ہے جو احناف کا ہے یعنی رفع یدین صرف تکبیر تحریمہ کے وقت ہے، اس کے علاوہ نہیں۔ چنانچہ علامہ عینی نے عمدۃ القاری (۲۷۲/۳، حصہ ۵) میں چند کبار تابعین اور محدثین کے اسماء گرامی ذکر کیے مثلاً

سفیان ثوری، ابراہیم نخعی، ابن ابی لیلی، علقمہ بن قیس اور اسود بن یزید، عامر شعبی، ابواسحاق سبیعی، مغیرہ، وکیع، عاصم بن کلیب اور زفر رحمہم اللہ وغیرہم حضرات۔

جن میں اکثر کا ذکر شرح معانی الآثار (۱/۱۶۴)، مصنف ابن ابی شیبہ (۲/۴۱۷) ومصنف عبدالرزاق (۲/۷۱)، وبیہقی میں ہے۔ اس کے علاوہ مصنف ابن ابی شیبہ (۲/۴۱۶) میں مذکور ہے کہ عن ابی اسحاق قال: کان أصحاب عبداللہؓ و اصحاب علیؓ لا یرفعون ایدیھم الا فی افتتاح الصلوۃ قال وکیع ثم لا یعودون. یعنی سیدنا عبداللہ بن مسعود اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھی اور تلامذہ صرف تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھاتے تھے پھر نہیں اٹھاتے تھے۔ شیخ الاسلام ابوبکر بن عیاش (جو کہ امام ابوداؤد اور احمد بن حنبل کے استاذ ہیں) فرماتے ہیں میں نے کسی فقیہ کو تکبیر تحریمہ کے علاوہ رفع یدین کرتے نہیں دیکھا، شرح معانی الآثار (۱/۱۶۵)۔

یہ حضرات صحابہ کرام جن میں خلفاء راشدین بھی شامل ہیں اور محدثین اور تابعین کی جماعت جو رفع یدین رکوع اور سجود کے وقت ترک کر رہے ہیں یقیناً ان کے ہاں نسخ ثابت ہو چکا ہے ورنہ کیسے ممکن ہے کہ نبی علیہ السلام کو تو انہوں نے رفع یدین عندالرکوع کرتے دیکھا ہو لیکن خود عمل اس کے خلاف کریں، صحابہ کرام کے بارے میں اس طرح کا گمان محال ہے۔

نیز اصول حدیث کا مسلمہ ضابطہ ہے کہ راوی جب اپنی روایت کی ہوئی حدیث کے خلاف عمل کرے تو اس کی روایت کو منسوخ مانا جائے گا (حسامی صفحہ ۷۶، توضیح، ۲/۴۸۶) پس عبداللہ بن عمر اور سیدنا علی رضی اللہ عنہم جو رفع یدین بوقت رکوع نقل کرتے ہیں اور ان حضرات کا عمل اس کے خلاف ہے تو رفع یدین بوقت رکوع کا منسوخ ہونا اس اصول کی روشنی میں ثابت ہو گیا۔

نیز امام نسائی رحمہ اللہ کے صنیع سے بھی رفع یدین عندالرکوع کا نسخ ثابت ہوتا ہے چنانچہ امام نسائی رحمہ اللہ نے اولاً باب رفع الیدین للرکوع قائم کیا اس کے بعد عنوان قائم کیا "ترک ذلک" یعنی رفع الیدین بوقت رکوع ثابت ہے لیکن اس کا ترک بھی ثابت ہے۔ نسخ کی ایک اور دلیل جس کو امام ابوداؤد نے (۱/۱۰۸) میں نقل فرمایا: عن میمون المکی انہ رأی عبداللہ بن الزبیر وصلی بھم یشیر بکفیہ حین یقوم وحین ینھض للقیام فیقوم فیشیر بیدیہ فانطلقت الی ابن عباس فقلت انی رأیت ابن الزبیر

صلی صلاۃ لم أر أحداً یصلیھا فوصفت له الاشارۃ فقال: ان احببت ان تنظر الی صلاۃ رسول اللہ ﷺ فاقتد بصلاۃ عبداللہ. یعنی حضرت میمون مکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے عبداللہ بن زبیر ؓ کو دیکھا کہ وہ رکوع کے وقت بھی رفع یدین فرما رہے تھے تو وہ ابن عباس ؓ کے پاس گئے اور عرض کیا کہ میں نے ابن زبیر کو ایسی نماز پڑھتے دیکھا کہ کسی کو بھی ایسی نماز پڑھتے نہیں دیکھا تو ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر تجھے یہ پسند ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز دیکھے تو ان کی نماز کی اقتداء کر۔ حضرت میمون مکی کا یہ فرمانا کہ ''میں نے کسی کو ایسی نماز پڑھتے نہیں دیکھا'' دلیل ہے اس بات کی کہ صحابہ کرام کا عام معمول رفع یدین بوقت رکوع نہ تھا باقی ابن عباس رضی اللہ عنہ کا اس کو صلاۃ الرسول فرمانا اس وجہ سے تھا کہ یہ ان سے ثابت ہے اور میمون مکی کا اس سے متوحش ہونا صحیح نہ تھا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ

ترک رفع یدین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اسی طرح خلفاء راشدین، کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین اور فقہاء ومحدثین سے بھی ثابت ہے اور اسی پر ان کا عمل ہے لہٰذا اس کا انکار غلط ہے اور خلفاء راشدین، صحابہ کرام، فقہاء عظام، ائمہ مجتہدین اور محدثین پر بہتان ہے۔ اللہ تعالیٰ حق قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

(۹۳) امام کے قرأت شروع کرنے کے بعد شریک ہونے والے کا ثناء پڑھنا

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مدرک اور مسبوق نماز میں امام کی قرأت شروع ہونے کے بعد شریک ہو تو اس کو ثناء پڑھنی جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورت مسئولہ میں آیات واحادیث اور اقوال فقہاء کرام سے معلوم ہوتا ہے کہ امام کے قرأت شروع کرنے کے بعد مقتدی اور مسبوق وغیرہ کیلئے قرأت یا ثناء یا تعوذ وغیرہ پڑھنا ناجائز ہے خاموشی اختیار کر کے قرآن کا سننا اس کے لئے لازم ہے۔

لمافی قوله تعالیٰ: واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلكم ترحمون. (الاعراف: ۲۰۴)

وفی قاضیخان (۱/۵۱): المسبوق اذا ادرک الامام فی القراءۃ التی فیھا یجھر فیھا لا یأتی بالثناء فاذا قام الی قضاء ماسبق یاتی بالثناء ویتعوذ للقراءۃ الخ.

وفی التاتارخانیة (۱/۵۵۷): اذا انتھی الی الامام وقد سبقه الامام بشیٔ من صلوته ھل یأتی بالثناء؟ فھذا علی وجوه: الاول اذا ادرک فی حال القیام فی الرکعة الاولیٰ اوفی الثانیة وفی ھذا الوجه کان القاضی الامام ابو علی النسفی یحکی عن استاذہ: لا یأتی بالثناء وقال غیرہ من اصحابنا یاتی وذکر الشیخ الاسلام المعروف بخواھرزادہ ان کانت الصلوۃ صلاۃ یخافت فیھا بالقراءۃ یأتی بالثناء لامحالة وفی النصاب وعلیه الفتوی: وأما اذا کانت صلوۃ یجھر فیھا بالقراءۃ ان ادرک الامام فی الرکعتین الاخریین فکذلک الجواب یشتغل بالثناء واذا کان فی الرکعتین الاولیین فقد اختلف

المشايخ: منهم من يقول يشتغل بالثناء ومنهم من يقول لا يشتغل بالثناء الخ.

وفی الشامية (۱/۵۴۶): وفی شرح المنية: والاصل ان الاستماع للقران فرض كفاية لانه لاقامة حقه بان يكون ملتفتا اليه غير مضيع وذلک يحصل بانصات البعض

وفی الدر المختار (۱/۵۴۶): يجب الاستماع للقراءة مطلقا لان العبرة لعموم اللفظ الخ.

(۹۴) ظہر اور عصر میں مسبوق ثنا کب پڑھے گا؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ظہر اور عصر کی نماز میں تلاوت زور سے نہیں ہوتی اگر کسی کی ایک رکعت نکل گئی ہو، اور وہ اس نماز میں شامل ہو جائے تو ثناء کب پڑھی جائے گی؟

الجواب حامداً ومصلياً...... مذکورہ صورت میں نیت باندھتے ہی تو ثناء نہیں پڑھ سکتے البتہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد جو رکعت ادا کی جائے گی وہ پہلی رکعت ہوگی اس میں ہر نماز کی پہلی رکعت کی طرح ابتدأ ثناء پھر اعوذ باللہ پھر بسم اللہ...... اس طرح آخر تک پڑھیں گے۔

لمافی الهندية (۱/۹۱): فاذا قام الی قضاء ماسبق يأتی بالثناء ويتعوذ للقرآءة كذا فی فتاوی قاضيخان والخلاصة والظهيرية...... ومنها انه يصلی اولاً ما ادرک مع الامام ثم يقضی ما سبق كذا فی محيط السرخسی ......

(۹۵) رکوع وغیرہ میں ترک رفع یدین افضل ہے

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے کی مسجد میں اکثر رفع یدین کے متعلق لوگوں کے درمیان جھگڑا رہتا ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ رفع یدین مسنون ہے رکوع وغیرہ میں، اور بعض کہتے ہیں کہ ترک رفع یدین مسنون ہے۔ شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلياً...... خیر القرون سے لے کر دور حاضر تک رکوع وغیرہ میں رفع یدین اور ترک رفع یدین کے متعلق اختلاف چلا آ رہا ہے دونوں طریقے مسنون ہیں لہٰذا جس فریق کے نزدیک جو راجح طریقہ ہے اس کو سنت سمجھ کر اختیار کرے، رفع یدین کو شرارت اور جھگڑے کا ذریعہ نہ بنائے کہ رفع یدین کو اختیار کر کے دوسرے فریق کی نمازوں کو فاسد بتائے۔ تاہم علمائے احناف کے نزدیک قرآن و حدیث کی نصوص سے ترک رفع یدین کا افضل ہونا ثابت ہوتا ہے۔

لمافی الهندية (۱/۷۳): والرفع قبل التكبير هو الاصح هكذا فی الهداية وهكذا تكبيرات القنوت وصلوة العيدين ولا يرفعهما فی تكبيرة سواها كذا فی الاختيار شرح المختار فلو رفع عندنا لاتفسد صلوته علی الصحيح.

وفی الشامیة(۱/۵۶۳): واما الاقتداء بالمخالف فی الفروع کالشافعی فیجوز مالم یعلم منه مایفسد الصلاة علی اعتقاد المقتدی علیه الاجماع...... ذهب عامة مشایخنا الی الجواز اذا کان یحتاط فی موضع الخلاف والا فلا والمعنی انه یجوز فی المراعی بلا کراهة وفی غیره معهاثم المواضع المهملة للمراعاة ان یتوضأ من الفصد والحجامة والقیئ والرعاف ونحو ذلک لافیما هو سنة عنده مکروه عندنا کرفع الیدین فی الانتقالات وجهر البسملة واخفائها.

(۹۶) حالت رکوع میں ''الصاق کعبین'' کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک مسئلہ کے بارے میں متردد ہوں وہ یہ ہے کہ رکوع اور سجدہ کی حالت میں الصاق الکعبین یعنی پاؤں کے ملا کر رکھنے کا کیا حکم ہے اب اس کے متعلق فتاویٰ شامیہ میں میں نے یہ عبارت پڑھی ہے:

(تنبیه) تقدم فی الرکوع انه یسن الصاق الکعبین ولم یذکروا ذلک فی السجود وقدمنا انه ربما یفهم منه ان السجود کذالک اذا لم یذکروا تفریجهما بعد الرکوع فالأصل بقاؤهما هنا کذلک تأمل. شامی(۱/۵۰۴)

اسی طرح طحطاوی میں ہے''ویسن الصاق الکعبین فی الرکوع والسجود''(طحطاوی علی الدر۱/۲۲۰)

اب مذکورہ بالا عبارت سے رکوع اور سجدہ میں الصاق الکعبین یعنی پاؤں کا ملا کر رکھنا مسنون ہونا معلوم ہوتا ہے، جبکہ آج تک کسی معتبر عالم دین سے یہ مسئلہ نہیں سنا تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ الصاق الکعبین سنت ہے یا نہیں ہے مذکورہ بالا عبارات کے مطابق فتویٰ دیا جائے گا یا نہیں؟ براہِ مہربانی میرے اشکال کو حل فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں ذکر کی گئی عبارت سے اگر چہ رکوع وسجود میں الصاق الکعبین یعنی پاؤں کا ملا کر رکھنا مسنون معلوم ہوتا ہے لیکن درج ذیل وجوہ کی بنا پر اس عبارت کے مطابق فتویٰ نہیں دیا جائے گا لہٰذا راجح اور صحیح قول یہی ہے، کہ رکوع وسجود میں الصاق کعبین مسنون نہیں ہے۔

(۱)......پہلی وجہ الصاق الکعبین کے مسنون نہ ہونے کی یہ ہے کہ جمہور فقہاء کرام نے اس کے مسنون ہونے کا ذکر نہیں کیا کیونکہ متون وشروح کی معتبر کتب جیسے قدوری، کنز، ہدایہ، بنایہ، فتح القدیر وغیرہ اسی طرح دیگر کتبِ معتبرہ میں اس کے مسنون ہونے کا ذکر نہیں ملتا۔

(۲)......صرف متاخرین کی چند کتب میں اس کے مسنون ہونے کا ذکر ملتا ہے ان کے بارے میں بھی یہ صراحت ملتی ہے کہ انہوں نے صاحب مجتبیٰ کی اتباع میں لکھا ہے اور اس مسئلے کو فقہاء نے صاحب مجتبیٰ کے اوہام میں سے قرار دیا ہے۔

(۳)......متاخرین کی کتب میں اعلاء السنن (۳/۱۰،۴۳) میں رکوع وسجود دونوں میں الصاق الکعبین کے مسنون ہونے کا قول کیا گیا

ہے جبکہ خود مصنفؒ نے امداد الاحکام (۱/۴۷۷) میں فتویٰ اس کے برعکس دیا ہے یعنی الصاق الکعبین کے مسنون ہونے کا انکار کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس مسئلے پر کوئی صحیح وصریح روایت دال نہیں ہے۔ لہٰذا جب مصنف کا اپنا فتویٰ روایت کے مخالف ہے تو ان کی اعلاء السنن والی عبارت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

(۴)...... امام طحاویؒ نے شرح معانی الآثار (صفحہ ۱۶۶) میں بذریعہ نظر کے الصاق الکعبین کے مسنون ہونے کی تردید کی ہے۔

(۵)...... جب تطبیق وتخنید بالاتفاق منسوخ ہوگئے تو اب الصاق الکعبین کو مسنون قرار دینا بظاہر بہت مشکل ہے اور خشوع کے خلاف ہے اسی بات کی طرف طحطاوی علی الدر میں اشارہ کیا گیا ہے اس عبارت میں قوله والصاق كعبيه) حالة الركوع هذا ان تيسر له والاكيف تيسير لهٗ على الظاهر. (طحطاوی ۱/۲۱۳) الغرض مذکورہ بالا وجوہ کی بناء پر راجح یہی ہے کہ الصاق الکعبین رکوع و سجود میں مسنون نہیں ہے۔

لمافي الصحيح للبخارى (۱/۱۰۹): عن ابى يعفور قال سمعت مصعب بن سعد صليت الى جنب أبى فطبقت بين كفى ثم وضعتهما بين فخذى فنهانى ابى وقال كنا نفعلهٗ فنهينا عنه وامرنا ان نضع ايدينا على الركب.

وفى مصنف ابن أبى شيبة (۲/۱۱۰): عن ابى عبيدة قال: خرج عبدالله من داره الى المسجد واذا رجل يصلى صافاً بين قدميه فقال عبدالله اماهذا فقد اخطأ السنة ولو راوح بين قدميه كان احبّ إلى.

وفى تقريرات الرافعى (۱/۶۱): (قول الشارح ويسن ان يلصق كعبيه) قال الشيخ ابو الحسن السندى الصغير فى تعليقته على الدر هذه السنة انما ذكرها من ذكرها من المتأخرين تبعاً للمجتبىٰ وليس لها ذكر فى الكتب المتقدمة كالهداية وشروحها و كان بعض مشايخنا يرى أنها من اوهام صاحب المجتبىٰ ولم ترد فى السنة على ماوقفنا عليه وكأنهم توهموا ذالک مما ورد أن الصحابة كانوا يهتمون بسدّ الخلل فى الصفوف حتى يضمون الكعاب والمناكب ولا يخفى ان المرادهنا الصاق كعبه بكعب صاحبه لا كعبه مع كعبه الاخر.

قلت ولعل الشيخ أبا الحسن لحظ الى الآثار الواردة فى ان التراوح بين القدمين فى الصلٰوة مطلقا افضل من الصاقهما اهـ.

(۹۷) اگر امام جہراً تکبیر کہنا بھول جائے تو پھر کیا کرے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی امام رکوع میں جاتے وقت یا سجدہ سے اٹھتے وقت جہراً تکبیر کہنا بھول جائے تو اب وہ مقتدیوں کو کس طرح متنبہ کرے گا آیا دوبارہ تکبیر کہے گا یا کوئی اور طریقہ اپنائے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں امام صاحب کو چاہئے کہ جب بھولی ہوئی تکبیر یاد آ جائے تو مقتدیوں کو متنبہ کرنے کیلئے دوبارہ جہراً تکبیر کہہ دے۔

لمافی التاتارخانیة(۱/۲۰۷): ولوترک تکبیرات الرکوع والسجود وتسبیحاتهما فلا سهو فیهما.

وفی الهندیة(۱/۱۲۶): ولا یجب بترک التعوذ والبسملة فی الاولی والثناء وتکبیرات الانتقالات.

وفی رد المحتار(۲/۱۲): (قوله وتکبیر انتقال) أی الی رکوع أوسجود او رفع منه (قوله وتسمیع) أی اذا ترکه الامام لایترک المؤتم التحمید.

(۹۸) ''سمع الله لمن حمده ربنا لک الحمد'' کے ساتھ کچھ کلمات بڑھا کر پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک امام مسجد فرض نماز میں رکوع کے بعد قیام میں سمع الله لمن حمده ربنا لک الحمد کے بعد حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیه پڑھتا ہے تو ایک مولوی صاحب نے بتایا کہ یہ صحیح نہیں ہے اس طرح کرنے سے ایک رکن کی زیادتی ہوتی ہے اور اس پر سجدہ سہو لازم ہے۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ مولوی صاحب کا یہ کہنا درست ہے یا نہیں اور اس امام کا اس طرح کرنے سے نماز میں کوئی اثر تو واقع نہیں ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً......سوال میں مذکورہ کلمات حدیث سے ثابت ہیں۔ احناف کے ہاں یہ منفرد کیلئے ہیں۔ لہٰذا امام کو چاہیے کہ مقتدیوں کی رعایت کرتے ہوئے یہ کلمات نہ پڑھے۔ البتہ اگر یہ کلمات پڑھ لے تو سجدہ سہو لازم نہیں ہوگا۔

لمافی شرح الکبیر(صـ۳۱۸): (وان کان المصلی مقتدیا) فانه (یأتی بالتحمید) بان یقول اللّٰهم ربنا ولک الحمد او اللّٰهم ربنا لک الحمد او ربنا ولک الحمد او ربنا لک الحمد وافضلیتها علی ترتیبها کذا فی الکافی.

وفیه ایضاً(صـ۳۱۶): (ولا ینبغی للامام ان یطیل التسبیح) أو غیره (علی وجه یمل به القوم) اذا اتی بقدر السنة (لانه) ای التطویل المذکور (سبب التنفیر) عن الجماعة (وانه) ای التنفیر عن الجماعة (مکروه) لانه مؤد الی حرمان المسلمین الثواب الموعود علی الصلوة بالجماعة.

وفی الدر المختار(۱/۵۶۴): یکره تحریما(تطویل الصلاة) علی القوم زائدا علی قدر السنة فی قراءة وأذکار رضی القوم أو لا لإطلاق الأمر بالتخفیف نهر وفی الشرنبلالیة ظاهر حدیث معاذ أنه لایزید علی صلاة أضعفهم مطلقا ولذا قال الکمال إلا لضرورة..... اهـ

(۹۹) رکوع سجدہ میں تسبیح پڑھنے کی مسنون مقدار نیز نماز میں درودِ ابراہیمی کی جگہ کوئی دوسرا مختصر درود پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز کے رکوع اور سجود میں عام طور پر کم از کم تین بار سبحان ربی العظیم اور سبحان ربی الاعلیٰ پڑھا جاتا ہے اگر کوئی شخص جلدی میں ہو تو کیا وہ صرف ایک بار یہ تسبیح پڑھ سکتا ہے، کیا اس کی نماز ہو جائے گی نماز میں زیادہ سے زیادہ کتنی بار تسبیح پڑھی جائے گی؟ نماز کی آخری رکعت میں نمازی سلام پھیرنے سے پہلے تین دعائیں پڑھتا ہے پہلے التحیات پھر درود ابراہیمی اور آخر میں ایک دعا،

(i) کیا آخر میں جو دعا پڑھتا ہے وہ مخصوص ہے یا علماء نے جو چند بتائی ہیں ان میں سے کوئی ایک پڑھ سکتا ہے؟

(ii) اگر ایک شخص جلدی میں ہے تو نماز مختصر کرنے کی نیت سے وہ آخری دعا نہیں پڑھتا اور درود ابراہیمی کے بعد سلام پھیر لیتا ہے کیا اس کی نماز درست ہے؟

(iii) اگر کوئی شخص جلدی کی وجہ سے پورا درود ابراہیمی کے بجائے صرف **اللھم صلّ علیٰ محمد وبارک وسلّم** پڑھ لے تو اس کی نماز ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... رکوع اور سجدے میں تین تین دفعہ تسبیح پڑھنے سے سنت کی ادائیگی ہو جاتی ہے جبکہ منفرد کیلئے کمالِ سنت یہ ہے کہ رکوع اور سجدے میں تسبیح سات یا نو دفعہ پڑھے، البتہ امام تین تین دفعہ تسبیح پڑھنے پر اکتفا کرے اگر مقتدیوں کے اُکتا جانے کا اندیشہ ہو، نیز رکوع یا سجدے میں اگر کوئی شخص ایک ہی دفعہ تسبیح پڑھتا ہے تو ایسا کرنا مکروہ ہے لیکن نماز ہو جائے گی۔

(i) آخری قعدہ میں درود شریف پڑھنے کے بعد ہر ایسی دعا پڑھ سکتے ہیں جو کہ قرآن وحدیث سے ثابت ہو، کوئی خاص دعا متعین نہیں البتہ وہ دعا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو تعلیم فرمائی جو کہ صحیح بخاری شریف (۱/۱۱۵) میں بھی موجود ہے اس کے پڑھنے کا معمول بنالینا بہتر ہے وہ دعا یہ ہے: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ ظُلْماً کَثِیْراً وَلَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ فَاغْفِرْلِیْ مَغْفِرَۃً مِنْ عِنْدِکَ وَارْحَمْنِیْ اِنَّکَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ.

(ii) آخری قعدہ میں تشہد کا پڑھنا واجب ہے جبکہ درود شریف اور اس کے بعد دعا کا پڑھنا مسنون ہے، آخر میں دعا کا ترک کر دینا مکروہ ہے، لیکن نماز ہو جائے گی تاہم اگر کوئی عذر ہو جیسا کہ بیماری وغیرہ تو پھر کوئی حرج نہیں۔

(iii) مذکورہ درود شریف پڑھ لے تو بھی نماز ہو جائے گی البتہ درود ابراہیمی پڑھنا بہتر ہے جو کہ صحیح بخاری ومسلم وغیرہ کی احادیث سے ثابت ہے۔

لمافی الشامیة (۱/۴۹۴): (قوله کره تنزیها) أی بناء علی أن الامر بالتسبیح للاستحباب بحر......

والحاصل أن فی تثلیث التسبیح فی الرکوع والسجود ثلاثة اقوال عندنا، ارجحها من حیث الدلیل الوجوب تخریجا علی القواعد المذهبیة، فینبغی اعتماده کما اعتمد ابن الهمام ومن تبعه روایة وجوب القومة والجلسة والطمانینة فیهما کمامر وأما من حیث الروایة فالأرجح السنیة لأنها المصرح بها فی مشاهیر الکتب وصرحوا بأنه یکره أن ینقص عن الثلاث وان الزیادة مستحبة بعد أن یختم علی وتر خمس أو سبع أو تسع مالم یکن اماما فلا یطول وقد منا فی سنن الصلاة عن أصول أبی الیسر أن حکم السنة أن یندب الی تحصیلها ویلام علی ترکها مع حصول اثم یسیر، وهذا یفید أن کراهة ترکها فوق التنزیه وتحت المکروه تحریما، وبهذا یضعف قول البحر ان الکراهة هنا للتنزیه لانه مستحب وان تبعه الشارح وغیره فتدبر.

وفی الهدایة(۱/۱۱۵): ودعا بما یشبه الفاظ القرآن والادعیة المأثورة لما روینا من حدیث ابن مسعودؓ.

وفی الهندیة (۱/۷۶): ومن الادعیة المأثورة ماروی عن أبی بکر رضی الله عنه انه قال لرسول الله ﷺ علمنی دعاء أدعو به فی صلاتی فقال قل اللهم انی ظلمت نفسی ظلما کثیرا وانه لا یغفر الذنوب الا أنت فأغفرلی مغفرة من عندک وارحمنی انک أنت الغفور الرحیم.

وفی الشامیة(۱/۴۵۳):(قوله وترک کل سنة ومستحب) السنة قسمان: سنة هدی وهی المؤکدة. وسنة زوائد. والمستحب غیره وهو المندوب، اوهما قسمان وقد یطلق علیه سنة، وقدمنا تحقیق ذلک کله فی سنن الوضوء. قال فی البحر عند قوله وعلی بساط فیه تصاویر: الحاصل أن السنة ان کانت مؤکدة قویة لایبعد کون ترکها مکروها تحریما، وان کانت غیر مؤکدة فترکها مکروه تنزیها، وأما المستحب او المندوب فینبغی أن یکره ترکه أصلا...... الخ.

وفی الشامیة (۱/۵۱۲): (قوله وصل علی النبی ﷺ) قال فی شرح المنیة: والمختار فی صفتها مافی الکفایة والقنیة والمجتبی قال: سئل محمد عن الصلاة علی النبی ﷺ فقال یقول: اللهم صل علی محمد وعلی آل محمد کما صلیت علی ابراهیم وعلی آل ابراهیم انک حمید مجید، وبارک علی محمد وعلی آل محمد کما بارکت علی ابراهیم وعلی آل ابراهیم انک حمید مجید وهی الموافقة لمافی الصحیحین وغیرهما الخ.

(۱۰۰) سجدہ میں زمین پر پاؤں رکھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ سجدہ میں سات

اعضاء کا زمین پر لگنا ضروری ہے جن میں پاؤں بھی شامل ہیں۔ آجکل بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ سجدہ کی حالت میں ان کے دونوں پاؤں زمین سے اوپر اٹھے ہوتے ہیں، کیا ان لوگوں کی نماز صحیح ہوجائے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... جن حضرات کے حالتِ سجدہ میں دونوں پاؤں زمین سے اوپر اٹھے ہوتے ہیں ان کی نماز درست نہیں ہوتی اس لئے کہ وضع القدمین واجب ہے البتہ دونوں پاؤں میں سے کسی ایک کا کوئی جز بقدر تسبیح واحدہ رکھنا صحت صلاۃ کیلئے کافی ہے، پس اگر پورے سجدہ میں بقدر ایک تسبیح کے دونوں پاؤں میں سے کسی کا کوئی جز زمین پر رکھ لیا تو واجب ادا ہوجائے گا اگر اتنی مقدار بھی نہیں رکھا تو ترک واجب کی وجہ سے نماز واجب الاعادہ ہوگی۔ واضح رہے کہ صرف ایک قدم کو زمین پر بغیر عذر رکھنا مکروہ ہے۔

لمافی شرح العینی (۱/۳۰): الخامس السجود لقوله تعالیٰ ارکعوا واسجدوا وفی حاشیة العینی (السجود بجبهته وقدمیه ووضع اصبع واحدة شرط.

الخامس تعدیل الارکان وهو تسکین الجوارح فی الرکوع والسجود حتیٰ تطمئن مفاصله وادناه مقدار تسبیحة وفی حاشیة العینی ای تسکین الجوارح فی الرکوع والسجود بقدر تسبیحة.

وفی فتح القدیر (۱/۳۰۵): وأما افتراض وضع القدم فلأن السجود مع رفعهما بالتلاعب أشبه منه بالتعظیم والاجلال، ویکفیه وضع أصبع واحدة وفی الوجیز وضع القدمین فرض فإن وضع إحداهما دون الاخری جاز ویکره.

وفی الشامیة (۱/۴۴۷): لو لم یضع شیئاً من القدمین لم یصح السجود.

وفی الدرالمختار (۱/۴۶۴) (وتعدیل الارکان) أی تسکین الجوارح قدر تسبیحة فی الرکوع والسجود وکذا فی الرفع منهما.

وفی الشامیة (۱/۵۰۴): وان ابن امیرحاج رجح فی الحلیة الثانیة وصرح هنا بأن توجیه الاصابع نحو القبلة سنة فثبت ماقدمناه من ان الخلاف السابق فی اصل الوضع لافی التوجیه وأن التوجیه سنة عندنا قولا واحداً...... ویؤید ماقلناه أن المحقق ابن الهمام قال فی زاد الفقیر ومنها: ای من سنن الصلاة توجیه اصابع رجلیه الی القبلة الخ.

(۱۰۱) مقتدی نے ابھی رکوع یا سجدہ کی تسبیحات ختم نہیں کیں کہ امام نے سر اٹھالیا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مقتدی نے ابھی تین تسبیحات پوری نہیں پڑھی تھیں کہ امام نے رکوع سے یا سجدے سے سر اٹھالیا۔ تو مقتدی ساتھ ہی سر اٹھائے یا تین تسبیحات پوری کرنے کے بعد اُٹھائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں مقتدی پر تین تسبیحات پوری کرنی ضروری نہیں بلکہ امام کی متابعت ضروری ہے اس لئے کہ امام

کی متابعت فرض ہے۔

لمافی قاضیخان(۱/۴۷): ولو رفع الامام رأسه من الركوع او السجود قبل ان يسبح المقتدى ثلاثا تكلموا فيه والصحيح انه يتابع الامام لأن متابعة الامام فرض فلا يتركها بالسنة.....الخ.

وفى الهندية(۱/۹۰): ولو رفع الامام رأسه من الركوع أو السجود قبل ان يسبح المقتدى ثلاثاً الصحيح انه يتابع الامام.....الخ.

(۱۰۲) فرض نماز کی آخری دو رکعتوں میں سورت ملانے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر نمازی فرض میں تیسری یا چوتھی رَکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد اگر کوئی سورۃ ملالے تو آیا اس صورت میں سجدۂ سہو واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....فرض نماز کی تیسری یا چوتھی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ سورۃ ملانے کی وجہ سے سجدۂ سہو واجب نہیں ہوگا۔

لمافى الهندية(۱/۱۲۶): ولو قرأ فى الأخريين الفاتحة والسورة لايلزمه السهو وهو الأصح.

وفى الدر المختار(۱/۵۱۱): (واكتفى) المفترض (فيما بعد الأوليين بالفاتحة) فإنها سنة على الظاهر ولوزاد لابأس به.

وفى الشامية تحته: (قوله ولو زاد لابأس) أى لو ضمّ اليها سورة لابأس به لأن القراءة فى الأخريين مشروعة من غير تقدير.

(۱۰۳) قعدہ اولیٰ کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قعدہ اولیٰ میں بیٹھنا واجب ہے یا نہیں؟ میرا ایک دوست ہے جس نے تبلیغی جماعت میں بھی وقت لگایا ہے وہ کہتا ہے کہ سنت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....قعدہ اولیٰ واجب ہے۔ آپ کے دوست کو مغالطہ ہوا ہے۔ اور اس طرح بلاتحقیق شرعی احکام کو بیان نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ اس سے معاشرے میں دینی مفاسد پیدا ہوتے ہیں۔

وفى الهندية(۱/۷۱): وتجب القعدة الاولىٰ قدر التشهد اذا رفع راسه من السجدة الثانية فى الركعة الثانية فى ذوات الاربع والثلاث هو الاصح هكذا فى الظهيرية.

وفى الدر المختار (۱/۴۶۵): (والقعود الاوّل) ولوفى نفل فى الأصح وكذا ترك الزيادة فيه على التشهد وأراد بالأول غير الاخير.

(۱۰۴) تشہد میں اشارہ بالسّبابہ کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تشہد میں انگشت شہادت سے اشارہ کا کیا حکم ہے؟ ہمارے محلے میں ایک امام صاحب ہیں وہ فرماتے ہیں کہ تشہد میں انگشت شہادت سے اشارہ کرنا بدعت ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً...... نماز کے اندر تشہد میں انگشت شہادت سے اشارہ کرنا بدعت نہیں ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور صحیح احادیث سے ثابت ہے۔

لمافی سنن أبی داؤد(۱/۱۴۲): عن عبدالله بن الزبیر انه ذکر ان النبی ﷺ کان یشیر باصبعه اذا دعا ولایحرکها.

وفی الدر المختار(۱/۵۰۸،۵۰۹): وشیخ الاسلام الجد وغیرهم انه یشیر لفعله علیه الصلاة والسلام ونسبوه لمحمد والامام بل فی متن درر البحار وشرحه غرر الاذکار المفتی به عندنا انه یشیر باسطا اصابعه کلها وفی الشرنبلالیة عن البرهان الصحیح انه یشیر بمسبحته وحدها یرفعها عند النفی ویضعها عند الاثبات واحترز بالصحیح عما قیل لایشیر لانه خلاف الدرایة والروایة وبقولنا بالمسبحة عماقیل یقعد عند الاشارة وفی العینی عن التحفة الاصح انها مستحبة.

وفی الشامیة (۱/۵۰۹): وفی القهستانی: وعن اصحابنا جمیعاً انه سنة فیحلق ابهام الیمنی ووسطها ملصقا رأسهابرأسها ویشیر بالسبابة فهذہ النقول کلهاصریحة بان الاشارة المسنونة انما هی علی کیفیة خاصة الخ.

(۱۰۵) ”اشارہ بالسبابہ فی الصلوٰۃ“ عندالاحناف مکروہ ہے یا سنت؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ احادیث مبارکہ سے نماز کے اندر تشہد کی حالت میں انگلی سے اشارہ کرنے کا جواز بلکہ سنیت واضح طور پر ثابت ہے اور احناف رحمہم اللہ بھی اس کے قائل ہیں لیکن احناف پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ ”خلاصۂ کیدانی“ والے نے اس کو مکروہ لکھا ہے، پھر جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اس کتاب کے مصنف معلوم نہیں لہٰذا اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ فتاویٰ سراجیہ نے بھی ”اشارہ بالسابہ“ کو مکروہ لکھا ہے، چنانچہ لکھا ہے (صفحہ:۱۱): **ویکرہ ان یشیر بالسبابة فی الصلواة عند قوله ”اشهد ان لا إله الا الله“ وهو المختار.**

اب تحقیق طلب امر یہ ہے کہ کیا احناف کی دیگر کتابوں میں بھی اس طرح حوالہ ملتا ہے یا نہیں، اگر ہے جیسا کہ فتاویٰ سراجیہ میں ہے تو احناف کی دیگر کتابوں نے اس کا کوئی جواب یا رد لکھا ہے یا نہیں؟ فقط وفقکم اللہ تعالیٰ

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں فتاویٰ سراجیہ کے علاوہ احناف کی دیگر کتابوں میں بھی نماز کے اندر حالت تشہد میں انگلی سے اشارہ کرنے کی کراہت کا قول موجود ہے۔ لیکن ائمہ احناف کے متاخرین حضرات (علامہ عینی، علامہ ابن ہمام، علامہ سید احمد طحطاوی، علامہ شامی رحمہم اللہ) اس کے رد میں فرماتے ہیں کہ کراہت کا قول روایت اور درایت دونوں کے خلاف ہے۔ ہمارے ہاں مفتی بہ قول جواز اور سنت کا ہے۔

لما فی حاشیة الطحطاوی علی المراقی(صـ۲۶۹): (و) تسن (الاشارة فی الصحیح) لانه ﷺ رفع اصبعة السبابة وقد أحناها شیئا ومن قال انه لا یشیر أصلا فهو خلاف الروایة والدرایة.

وقال الطحطاوی رحمه الله تحته: (قوله فهو خلاف الروایة) لانه روی عن عدة اخبار منها ما أخرجه ابن السکن فی صحیحه عن ابن عمر......... (قوله والدرایة) لان الفعل یوافق القول فکما ان القول فیه النفی والاثبات یکون الفعل کذلک

وفی الشامیة(۱/۵۰۹): وعن کثیر من المشائخ لایشیر اصلا وهو خلاف الدرایة والروایة فعن محمد ان ما ذکر فی کیفیة الاشارة قول أبی حنیفة ومثله فی فتح القدیر. وفی القهستانی: وعن اصحابنا جمیعا انه سنة.........وهذا ما اعتمده المتأخرون لثبوته عن النبی ﷺ بالاحادیث الصحیحة ولصحة نقله عن ائمتنا الثلاثة فلذا قال فی الفتح ان الأول خلاف الدرایة والروایة.

وفی الموطا للامام محمد(صـ۱۰۸): عن علی ابن عبدالرحمن المعاوی انه قال رانی عبد الله ابن عمر وانا اعبث بالحصی فی الصلوة فلما انصرفت نهانی وقال اصنع کما کان رسول الله ﷺ یصنع فقلت کیف کان رسول الله ﷺ یصنع قال کان رسول الله ﷺ اذا جلس فی الصلوة وضع کفه الیمنی علی فخذه الیمنی وقبض اصابعه کلها واشار باصبعه التی تلی الابهام ووضع کفه الیسری علی فخذه الیسری قال محمد وبصنیع رسول الله ﷺ ناخذ وهو ا قول ابی حنیفة رحمه الله.

وفی حاشیة للامام الهمام ابی الحسنات محمد عبدالحی اللکنویؒ.

ے ا :(قوله وهو قول ابی حنیفة)...... وقد ذکر ابن الهمام فی فتح القدیر والشمنی فی شرح النقایة وغیرهما انه ذکر ابو یوسف رحمه الله فی الامالی مثل ما ذکر محمد فظهر ان اصحابنا الثلثة اتفقوا علی تجویز الاشارة لثبوتها عن النبی ﷺ واصحابه بروایات متعددة وطرق متکثرة لا سبیل الی انکارها ولا الی ردها وقد قال به غیرهم من العلماء حتی قال ابن عبدالبر انه لا خلاف فی ذلک والی الله المشتکی من صنیع کثیر من اصحابنا من اصحاب الفتاوی کصاحب الخلاصة والبزازیة والکبری و العتابیة والغیاثیة والولوالجیة وعمدة المفتی والظهیریة وغیرها حیث ذکروا ان المختار

هو عدم الاشارة بل ذكر بعضهم انها مكروهة والذى حملهم على ذلك سكوت ايمتنا عن هذه المسالة فى ظاهر الرواية ولم يعلموا انه قد ثبت عنهم بروايات متعددة ولا انه ورد فى احاديث متكثرة فالحذو الحذر من الاعتماد على قولهم فى هذه المسالة مع كونه مخالفا لما ثبت عن النبى ﷺ واصحابه بل وعن ايمتنا ايضاً بل لوثبت عن ايمتنا التصريح بالنفى وثبت عن رسول الله ﷺ واصحابه الاثبات لكان فعل الرسول واصحابه احق والزم بالقبول فكيف وقد قال به ايمتنا ايضاً.

(۱۰۶) تشہد میں انگلی اٹھانے کا مسنون طریقہ

سوال...... کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ میں کہ تشہد میں انگلی اٹھانے کی کیفیت ،طریقہ اور اسکی شرعی حیثیت کیا ہے؟ پھر اسکو ہلاتے رہنا چاہئے یا نہیں؟ نیز کب اٹھانا چاہئے اور کب رکھنا چاہئے؟ آخر میں یہ بھی بتادیں کہ یہ طریقہ کس حدیث شریف میں مذکور ہے؟

الجواب حامداً و مصلیاً...... تشہد میں انگلی اٹھانے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ نمازی کلمہ شہادت پر پہنچتے وقت چھنگلی اور اس سے ملحقہ انگلی بند کرلے اور درمیانی انگلی کا انگوٹھے کے ساتھ حلقہ بنا کر شہادت کی انگلی ''لا الہ'' پر اٹھائے اور ''الا اللہ'' پر چھوڑ دے مگر حلقہ کی ہیئت کو آخر تک باقی رکھے...... مذکورہ بالا طریقہ سنت ہے اور یہ طریقہ ابن ماجہ کی حدیث (ص ۶۵) اور ابوداؤد کی حدیث (۱۴۲/۱) میں مذکور ہے۔ نیز انگلی کو اٹھانے کے بعد ہلاتے رہنا مکروہ ہے، جو کہ نماز کے اندر سکون ووقار کے خلاف ہے جبکہ نماز میں سکون مطلوب ہے۔

لمافى سنن ابى داؤد (۱/ ۱۴۲): عن عبدالله بن الزبير انه ذكر أن النبى ﷺ كان يشير باصبعه اذا دعا ولا يحركها.

وفى اعلاء السنن (۳/ ۱۱۲): قال الطحطاوى فى حاشيته على مراقى الفلاح: قوله، وتسن الاشارة، أى من غير تحريك فانه مكروه عندنا.

وفى رسائل ابن عابدين (۱/ ۱۳۴): والصحيح المختار عند جمهور اصحابنا انه يضع كفيه على فخذيه ثم عند وصوله الى كلمة التوحيد يعقد الخنصر والبنصر ويحلق الوسطى والإبهام ويشير بالمسبحة رافعا لها عند النفى وواضعا لها عند الاثبات ثم يستمر على ذلك الخ.

(۱۰۷) تشہد میں انگلیوں کا حلقہ کب تک بنائے رکھا جائے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حالتِ تشہد میں اشارہ بالسبابہ کے وقت انگلیوں کا جو حلقہ بنایا جاتا ہے یہ کس وقت تک رکھنا چاہئے، اشهد ان محمد عبده ورسوله پر ختم کردینا چاہئے یا آخیر سلام تک رکھنا چاہئے۔ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً……حالتِ تشہد میں اشارہ بالسبابہ کے وقت انگلیوں کا جو حلقہ بنایا جاتا ہے وہ تشہد کے بعد آخیر سلام تک اسی طرح برقرار رکھنا چاہئے۔

لمافی رسائل ابن عابدین(۱/۱۲۷): وروی عن أئمتنا الثلاثة ابی حنیفة وابی یوسف ومحمد انه یشیر عند التشهد وانه یعقد اصابعه علی مامر من اختلاف الکیفیة وظاهر کلامهم انه لا ینشرها بعد العقد بل یبقیها کذلک لان المذکور فی هذه الروایة العقد ولم یذکروا النشر بعده، ورجح المتأخرون هذه الروایة لتأیدها بالمروی عن النبی الله ﷺ.

وفی رسائل ابن عابدین(۱/۱۳۴): والصحیح المختار عند جمهور اصحابنا انه یضع کفیه علی فخذیه ثم عند وصوله الی کلمة التوحید یعقد الخنصر، والبنصر ویحلق الوسطی والابهام ویشیر بالمسبحة رافعا لها عند النفی وواضعاً لها عند الاثبات ثم یستمر علی ذلک لانه ثبت العقد عند الاشارة بلاخلاف ولم یوجدأمربتغییره فالأصل بقاء الشئ علی ماهو علیه وإستصحابه الی اخر أمره.

(۱۰۸) شہادت کی انگلی نہ ہونے کی صورت میں دوسری انگلی سے اشارہ کرنے کا حکم

سوال……کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کسی کی شہادت کی انگلی نہیں ہے تو تشہد میں شہادت کے دوران کونسی انگلی اٹھائے گا یا نہیں اٹھائے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً……اگر کسی کی شہادت کی انگلی نہیں ہے تو وہ تشہد میں شہادت کے وقت کوئی دوسری انگلی نہ اٹھائے۔

لمافی الفقه الاسلامی(۱/۷۱۵): بحیث تکون رؤوس أصابعهما علی الرکبتین ورفع الاصبع السبابة من الیمنی فقط عند الشهادة فی التشهد.

وفی حاشیة الطحطاوی(۱/۲۲۴): (قوله أنه یشیر) بیان لما فی قوله ماصححه.(قوله المفتی به عندنا أنه یشیر) ای بمسبحته ای وحدها.

وفی الدر المختار(۱/۵۰۹): الصحیح أنه یشیر بمسبحته وحدها یرفعها عند النفی ویضعها عند الاثبات.

قال الشامیؒ تحته: (قوله بمسبحته وحدها) فیکره أن یشیر بالمسبحتین کما فی الفتح وغیره.

(۱۰۹) امام مقتدی کے درود شریف پڑھنے سے قبل سلام پھیر دے تو کیا حکم ہے؟

سوال……کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تراویح میں امام کے پیچھے تراویح پڑھی جاتی ہے جب التحیات

پر بیٹھتے ہیں تو پیچھے والے درود تک پڑھتے ہیں اور امام صاحب سلام پھیر دیتے ہیں یہ پورا کرنا چاہئے یا امام کے ساتھ سلام پھیر دینا چاہئے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اس صورت میں آپ کو امام کے ساتھ سلام پھیر دینا چاہئے۔

وفی الهندية (۱/۹۰): ولو سلم الامام قبل ان يفرغ المقتدی من الدعاء الذی يكون بعد التشهد أو قبل أن يصلی علی النبی ﷺ فانه يسلم مع الامام.

(۱۱۰) مقتدی کا التحیات کے شروع میں اور ہر رکن میں بسم اللہ پڑھنا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کل عشاء کی نماز میں میرے برابر ایک معمر نمازی تھے۔ جب امام صاحب نے قعدۂ اولیٰ کیا تو انہوں نے التحیات الخ پڑھنے سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھی، کیا اس طرح کرنے سے نماز میں کچھ حرج تو نہیں ہوتا؟ اور ہر رکن میں اگر بسم اللہ پڑھی جائے تو شرعاً یہ عمل کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... مذکورہ صورت میں معمر شخص کی نماز درست ہے اور اس پر مقتدی ہونے کی وجہ سے سجدہ سہو بھی نہیں، البتہ رکوع، سجود اور تشہد کے شروع وغیرہ میں جو قرأت کا محل نہ ہو، قرأت نہ کرنی چاہئے کیونکہ اس سے تأخیر واجب یا تأخیر رکن لازم آتا ہے جس سے سجدہ سہو لازم آتا ہے۔ بسم اللہ صرف ہر رکعت کے شروع میں سنت ہے اور ہر رکن میں اس کا پڑھنا کہیں بھی ثابت نہیں لہٰذا اس سے اجتناب کرنا چاہئے۔

لمافی الهندية(۱/۱۲۷): وذكر هناك اذا بدأ فی موضع التشهد بالقراءة ثم تشهد فعليه السهو ولو بدأ بالتشهد ثم بالقراء ة فلا سهو عليه.

وفی الشامية(۲/۸۱): (قوله وتأخير قيام الخ) أشار إلى أن وجوب السجود ليس لخصوص الصلاة علی النبی ﷺ بل لترک الواجب وهو تعقيب التشهد للقيام بلا فاصل حتی لوسكت يلزمه السهو كما قدمناه فی فصل اذا أراد الشروع، قال المقدسی وكما لوقرأ القرآن هنا أو فی الركوع يلزمه السهو مع أنه كلام الله تعالیٰ، وكمالو ذكر التشهد فی القيام مع أنه توحيد الله تعالیٰ.

(۱۱۱) نماز کے درود میں لفظِ سیدنا کا اضافہ اور مختلف ارکان میں دعائیں پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز میں پڑھے جانے والے درود شریف میں لفظ محمد سے پہلے سیدنا کا اضافہ کرنا درست ہے؟ نیز ادعیہ ماثورہ جو کہ مختلف ارکان میں پڑھی جاتی ہیں کیا فرضوں میں ان کا پڑھنا درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... نماز میں پڑھے جانے والے درود شریف میں لفظ ''محمد'' اور لفظ ''ابراہیم'' (علیہما الصلاۃ والسلام) سے پہلے سیدنا کا اضافہ کرنا افضل ہے اور ادعیہ ماثورہ فرض نماز کے مختلف ارکان میں امام کو نہ پڑھنا چاہئے اس لئے کہ امام کو تخفیف (ہلکی) نماز

پڑھانے کا حکم دیا گیا ہے البتہ منفرد کیلئے ان ادعیہ ماثورہ کا نماز کے مختلف ارکان میں پڑھنا درست ہے چاہے نماز فرض ہو یا نفل۔

لمافی الهندية (۱/۸۷): وينبغي للإمام أن لايطول بهم الصلاة بعد القدر المسنون وينبغي له أن يراعي حال الجماعة هكذا في الجوهرة النيرة.

وفي الطحطاوي (۱/۲۲۶): (قوله وندب) يحتمل أن يقرأ بصيغة المصدر عطفاً على فاعل صح أو بصيغة المجهول وظاهر الشرح طلبها في نبينا و أبيه الخليل عليهما الصلاة والسلام لاشتراكهما فيها وصيغة الصلاة على هذا"اللهم صل على سيدنا محمد وعلى آل سيدنا محمد كما صليت على سيدنا ابراهيم وعلى آل سيدنا ابراهيم في العالمين انک حميد مجيد وبارک على سيدنا محمد وعلى آل سيدنا محمد كما باركت على سيدنا ابراهيم وعلى آل سيدنا ابراهيم في العالمين انک حميد مجيد وترحم على سيدنا محمد وعلى آل سيدنا محمد كما ترحمت على سيدنا ابراهيم وعلى آل سيدنا ابراهيم في العالمين انک حميد مجيد ولا يخفى أن هذه الزيادة مستحبة حلبي بزيادة (قوله لان زيادة الاخبار) الاولى حذف زيادة (قوله نقله الرملي) فيه أنه ليس من أهل المذهب.

وفي الدر المختار (۱/۵۱۲،۵۱۳): وندب السيادة لأن زيادة الاخبار بالواقع عين سلوک الأدب فهو أفضل من تركه ذكره الرملي الشافعي وغيره ومانقل لا تسودوني في الصلاة فكذب و قولهم لا تسيدوني بالياء لحن أيضا والصواب بالواو.

وفي الشامية تحته: (قوله ذكره الرملي الشافعي) اى في شرحه على منهاج النووي ونصه: والأفضل الإتيان بلفظ السيادة كما قاله ابن ظهيرة وصرح به جمع وبه أفتى الشارح لأن فيه الاتيان بما أمرنا به وزيادة الاخبار بالواقع الذي هو أدب فهو أفضل من تركه وإن تردد في أفضليته الأسنوي، وأما حديث "لاتسيدوني في الصلوة" فباطل لا أصل له كما قاله بعض متأخري الحفاظ وقول الطوسي إنها مبطلة غلط واعترض بأن هذا مخالف لمذهبنا لمامر من قول الإمام من أنه لوزادفي تشهده أو نقص فيه كان مكروهاً قلت فيه نظر فإن الصلاة زائدة على التشهد ليست منه نعم ينبغي على هذا عدم ذكرها في وأشهد أن محمداً عبده ورسوله وأنه يأتي بها مع ابراهيم عليه السلام (قوله لحن أيضاً) اى مع كونه كذباً (قوله والصواب بالواو) لأنه واوي العين من ساديسود.

(۱۱۴) نماز میں سلام پھیرنے کی کیفیت

سوال ...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کہتا ہے کہ نماز میں سلام پھیرتے وقت چہرہ قبلہ کی

جانب ہو، اور دلیل میں "تلقاء وجہہ" والی روایت پیش کرتا ہے۔ آیا زید کا یہ قول درست ہے اگر نہیں تو سلام پھیرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... نماز میں سلام کی ابتداء چونکہ قبلہ رخ ہی ہوتی ہے اور یہی حال دوسرے سلام کا ہے، باقی راوی کا سلام کو تلقاء وجہہ سے تعبیر کرنا بیانِ حال کیلئے ہے کہ عموماً جیسے پہلا سلام کرتے وقت رخ قبلہ جانب ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسرے سلام میں بھی لفظ "السلام علیکم" کے وقت عموماً رخ خود بخود قبلہ جانب ہو جاتا ہے۔ نیز تکلفات میں پڑنا مشکلات کا باعث بن سکتا ہے۔ خصوصاً عوام الناس کیلئے اور یہ ایسا اختلافی مسئلہ بھی نہیں کہ صحت وفساد صلاۃ اس پر موقوف ہوں۔ لہٰذا بحث ومباحثہ سے گریز کرنا بہتر ہے۔

لمافی معارف السنن(۳/۱۱۰): وتاوّل فيه بعض المتاوّلين بان البداءة كان به من تلقاء الوجه ممتداً به إلى اليمين و مثله ذكره فى الكوكب الدرى، ولا ادرى لمن هو؟ ولعله يريد ان المقصود بيان كيفية السلام هكذا لابيان العدد، والكيفية هذه من ابتداء تلقاء الوجه وانتهائه فى جانب اليمين، ذكره فى المجموع والمغنى وهو المعمول به عندنا.

(۱۱۳) دعا کرتے وقت ہاتھ کیسے اور کہاں تک اٹھانے چاہئیں؟

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کہتا ہے کہ مطلقاً دعا کرتے وقت خواہ نماز کے بعد ہو یا تلاوت کے بعد جب بھی کوئی دعا مانگے تو ہاتھ کاندھوں تک سیدھے سامنے رکھے اور دونوں ہتھیلیوں کو آپس میں ملالے، یہی طریقہ مسنون ہے، اس کے برعکس عمر کہتا ہے کہ ہتھیلیوں کو ملائے نہ رکھے بلکہ دونوں ہتھیلیوں کے درمیان تین انگل کا فاصلہ رکھے، کونسا طریقہ صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... بوقت دعا دونوں ہتھیلیوں کے درمیان فاصلہ مستحب اور راجح ہے لیکن دونوں ہاتھ ملا کر بھی دعا کرنے کی اجازت ہے، کیونکہ دونوں طریقے منقول ہیں۔ ہم دونوں طریقوں سے متعلق احادیث ذکر کرتے ہیں۔

حسب ذیل احادیث سے بوقت دعا دونوں ہاتھوں کو ملا کر رکھنے کی تائید ہوتی ہے۔

لمافی مجمع الزوائد(۱۰/۱۶۹): عن انس بن مالك رضى الله عنه قال رفع رسول الله ﷺ يديه بعرفة يدعو فقال اصحاب النبى ﷺ هذا الابتهال ثم حاصت الناقه ففتح احدى يديه فاخذها وهو رافع الاخرى رواه البزار والطبرانى فى الاوسط بنحوه الا انه قال فرفع يديه فسقط زمام الناقه فتناوله ورفع يديه وزاد هذا الابتهال والتفرع ورجال البزار رجال الصحيح غير احمد بن يحيىٰ الصوفى وهو ثقه ولكن لاعمش لم يسمع من انس رضى الله تعالىٰ عنه.

وعن سلمان رضى الله عنه قال قال رسول الله ﷺ مارفع قوم اكفهم الى الله عزوجل يسئلونه شيئاً الا كان حقا على الله ان يضع فى ايديهم ماسألوا قلت له حديث فى السنن غير هذا رواه الطبرانى ورجاله رجال الصحيح.

وفی مرقاۃ المصابیح(۵/۴۷): وقد وردانه ﷺ فی الدعا یوم عرفة جمع بین کفیه وجعلهما مقابل صدره کاستطعام المسکین(قال الحافظ نور الدین رحمه الله علیه فی مجمع الزوائد) "رواه الطبرانی فی الاوسط وفیه الحسین بن عبدالله بن عبید الله وهو ضعیف" قال ملا علی قاری فی مرقاۃ (۵/۴۲) ان الضعیف حجة فی الفضائل اتفاقا.

حسب ذیل عبارات سے فرجہ بین الیدین کے استحباب کی ترجیح ثابت ہوتی ہے۔

لمافی حاشیة الطحطاوی علی المراقی(ص۲۵۷): وفی النهر من فعل کیفیته المستحبة ان یکون بین الکفین فرجة وان قلت الخ. لکن فی شرح الحصن الحصین والظاهر ان من الادب ایضا ضم الیدین وتوجیه اصابعهما نحو القبلة وفی شرح المشکوۃ وردانه ﷺ یوم عرفة جمع بین کفیه فی الدعاء وان ارید بالضم فی الکلام القرب التام لا ینافی وجود الفرجة القلیلة، واما قوله جمع بین کفیه لاینا فیه ایضاً لان المعنی جمع بینهما فی الرفع ولم یفرد احدهما به.

وفی الهندیة(۵/۳۱۸): والافضل فی الدعاء ان یبسط کفیه ویکون بینهما فرجة وان قلت...... والمستحب ان یرفع یدیه عند الدعاء بحذاء صدره کذا فی القنیة.

وفی الشامیة(۱/۵۰۷): (فیبسط یدیه) حذاء صدره (نحو السماء) لانها قبلة الدعاء ویکون بینهما فرجة "وایضاً فی رد المحتار (قوله ویکون بینهما فرجة) أی وان قلت قنیة.

(۱۱۴) مردوں اورعورتوں کی نمازوں میں فرق

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے میں ایک قاری صاحب فرماتے ہیں کہ عورتیں مردوں کے طریقہ نماز کی طرح نماز پڑھ سکتی ہیں۔تو کیا اس قاری صاحب کی بات درست ہے؟ یا عورتوں اور مردوں کے طریقہ نماز میں فرق ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... احادیث مبارکہ اور عبارات فقہ کی رو سے مردوں اور عورتوں کی نمازوں میں مکمل طور پر یکسانیت نہیں ہے۔ بلکہ بعض مواقع پر عورتوں کی نماز مردوں سے مختلف ہے۔ مثلاً (۱)۔تکبیر تحریمہ کے وقت عورتیں کاندھوں تک ہاتھ اٹھائیں گی۔جبکہ مرد کانوں تک اٹھاتے ہیں۔(۲)۔عورتیں سینے پر ہاتھ باندھیں گی، جبکہ مرد زیرِ ناف باندھتے ہیں۔(۳)۔رکوع میں عورتوں کیلئے مکمل جھکنا ضروری نہیں جبکہ مرد خوب جھکتے ہیں۔(۴)۔سجدے میں عورتوں کیلئے رانوں کو پیٹ سے اور ہاتھوں کو بغلوں سے ملانے کا حکم ہے جبکہ مرد جدا رکھتے ہیں۔(۵)۔قعدہ میں عورتیں سرین کے بل بیٹھیں گی جبکہ مرد بائیں پاؤں پر بیٹھتے ہیں۔(۶)۔اسی طرح عورتیں الگ جماعت نہیں کراسکتیں۔اگر کرالیں تو ان کی امام کو صف اول کے بیچ میں ہی کھڑا ہونا ہوگا۔

الحاصل......عورتیں نماز میں وہ طریقہ اختیار کریں گی کہ جو حالت ستر کے زیادہ قریب ہو۔

لمافی الشامية(۱/۵۰۴): (قوله وحررنا فی الخزائن الخ) وذلک حیث قال تنبيه ذکر الزيعلی أنها تخلف الرجل فی عشر وقد زدت اکثر من ضعفها. ترفع يديهاحذاء منکبيها. ولا تخرج يديها من کميها. وتضع الکف علی الکف تحت ثديها. وتنحنی فی الرکوع قليلا ولا تعقد ولا تفرج فيه أصابعها بل تضمها وتضع يديها علی رکبتيها ولا تحنی رکبتيها. وتنضم فی رکوعها وسجودها. وتفترش ذراعيها. وتتورک فی التشهد وتضع فيه يديها تبلغ رؤوس أصابعها رکبتيها. وتضم فيه أصابعها. واذا نابها شیئ فی صلاتها تصفق ولا تسبح. ولا تؤم الرجل وتکره جماعتهن ويقف الامام وسطهن ويکره حضورها الجماعة وتؤخر مع الرجال ولا جمعة عليها. لکن تنعقد بها. ولا عيد ولا تکبير تشريق. ولا يستحب أن تسفربالفجر ولا تجهر فی الجهرية بل لوقيل بالفساد بجهرها لا مکن بناء علی ان صوتها عورة.

(۱۱۵) عورتوں کی نماز کا طریقے کا احادیث سے ثبوت

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ غیر مقلدین کہتے ہیں کہ حنفی عورتیں جس طرح نماز پڑھتی ہیں اس کا ثبوت کسی حدیث سے نہیں کیا یہ بات صحیح ہے؟ اگر اس طریقے کا ثبوت احادیث سے ہے تو ان احادیث کو پیش کریں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......بعض لوگوں کا حنفی عورتوں کی نماز کے طریقے پر اعتراض کرنا کہ یہ طریقہ احادیث سے ثابت نہیں، درست نہیں ہے اس لئے کہ حنفی عورتوں کی نماز کا طریقہ احادیث طیبہ سے ثابت ہے وہ طریقہ یہ ہے کہ عورتیں نماز میں ہاتھ سینے کے برابر اٹھاتی ہیں جیسا کہ مصنف ابن ابی شیبہ (۱/۴۲۱) میں علامہؒ نے روایت ذکر کی ہے: **عن عبد ربه بن زيتون قال رأيت ام الدرداء ترفع يديها حذو منکبيها حين تفتتح الصلوة......الخ** اور اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ اعلاء السنن کی روایت اس پر دلالت کرتی ہے اور صراحتاً اس سے ہاتھوں کا سینے کے برابر اٹھانا ثابت ہو رہا ہے، **عن وائل بن حجر رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ يا ابن حجر اذا صليت فاجعل يديک حذاء اذنيک والمرأة تجعل يديها حذاء ثديها، (اعلاء السنن، ۲/۱۸۱، بحواله مجمع الزوائد للطبرانی)**

اسی طرح عورت کی نماز میں سب سے زیادہ ستر کا خیال رکھا جاتا ہے لہٰذا جو طریقہ سب سے زیادہ ستر کا باعث ہو، اسی کے مطابق پڑھے یہ طریقہ کنز العمال کی روایت سے ثابت ہے **عن ابن عمرؓ مرفوعاً اذا جلست المرأة فی الصلوة وضعت فخذها علی فخذها الاخریٰ فاذا سجدت الصقت بطنها فی فخذيها کاستر مايکون لها، (کنز العمال، ۷/۵۴۹)** یہ روایت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جس طریقہ کے مطابق نماز میں ستر زیادہ ہو عورت اسی طرح سے نماز پڑھے، اس وجہ سے نماز میں ہاتھ باندھتے

وقت بھی اس کا خاص خیال رکھا جائے گا اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ عورت سینے کے اوپر ہاتھ رکھے چنانچہ صاحب اعلاء السنن فرماتے ہیں، فقلنا به في هذه الحالة في حق الرجل بخلاف المرأة فانها تضع على صدرها لانه استر لها فيكون في حقها أولىٰ...... الخ. (اعلاء السنن، ۲/ ۱۹۹) لہٰذا اس صورت میں استر یہ ہے کہ عورت حالت قیام میں ہاتھ سینے کے اوپر رکھے، مذکورہ روایت پر اسی صورت میں عمل کرنا ممکن ہے نیز مذکورہ روایت کی تائید روایت تصفیق سے بھی ہوتی ہے جس میں عورت کو تصفیق کا حکم ہے جیسا کہ جامع الترمذی کی صحیح روایت میں ہے: عن ابی هريرة رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ التسبيح للرجال والتصفيق للنساء......الخ (الجامع الترمذی، ۱/ ۸۵) اس حکم کی علت اور بناء ستر پر ہے کہ عورت ہر حال میں ستر کا لحاظ کرے گی اس لئے فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ حالت رکوع میں بھی اس علت کی وجہ سے عورت زیادہ نہ جھکے گی اس لئے کہ زیادہ جھکنے کی صورت میں ستر کا لحاظ نہیں ہوتا لہٰذا رکوع میں صرف گھٹنوں پر ہاتھ رکھے گی اور انگلیاں مردوں کی طرح کھول کر نہیں رکھے گی۔ قال العلامة ابن عابدينؒ (وإلصاق كعبيه) أي حيث لا عذر (قوله للرجل) اى سنة للرجل فقط وهذا قيد للأخذ والتفريج لأن المرأة تضع يديها على ركبتيها وضعاً ولا تفرج أصابعها (ردالمحتار، ۱/ ۴۷۶، ط ایچ ایم سعید) اس عبارت سے عورت کے رکوع کی کیفیت استر معلوم ہوتی ہے۔ کنز العمال کی روایت میں بھی صراحت کے ساتھ منقول ہے، عن ابن عمرؓ...... اذا سجدت ...... کا ستر مايكون لها اس بناء پر اس کو استر طریقہ سے نماز کی پابندی کا حکم ہے۔

اسی طرح سجدہ بھی اس طریقہ سے کرے گی جس سے زیادہ ستر پوشی ہو مثلاً عورت اپنے پورے جسم کو سمیٹ لے اور جسم کے بعض اعضاء کو دوسرے اعضاء کے ساتھ ملا لے، کہنیوں کو پہلوؤں کے ساتھ اور رانوں کو پیٹ کے ساتھ ملا لے اور مرد کی طرح سجدہ نہ کرے جیسا کہ ابو داؤد کی روایت میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے عن يزيد بن ابی حبيب رضی الله عنه ان النبی ﷺ مرّ على امرأتين تصليان فقال اذا سجدتما فضمّا بعض اللحم الى الأرض فإن المرأة ليست كالرجل (مراسيل أبى داؤد، ص۸) اسی طرح روایت مصنف ابن ابی شیبہ اور اعلاء السنن میں وارد ہے، عن الحارث عن على رضی الله عنه قال اذا سجدت المرأة فلتحتفز ولتضم فخذيها...... (مصنف ابن ابی شيبة، ۲/ ۵۰۴، اعلاء السنن، ۳/ ۳۰) ان روایات سے معلوم ہوا کہ سجدہ کرنے سے پہلے عورت اپنے کو پوری طرح سے سمیٹ لے گی اور پھر سجدہ کرے گی لیکن سجدہ کرنے سے پہلے دائیں ران کو بائیں ران پر رکھ کر پیروں کو ایک طرف نکال کر سجدہ کرے گی جیسا کہ کنز العمال کی روایت میں ابن عمرؓ سے مرفوعاً ثابت ہے اذا جلست المرأة فى الصلوة وضعت فخذها على فخذها الاخرىٰ فاذا سجدت ألصقت بطنها فى فخذيها كاستر مايكون لها (كنز العمال، ۷/ ۵۴۹) اور اس کے مشابہ مضمون امام اعظم رحمہ اللہ سے بھی منقول ہے، ابو حنيفة عن نافع عن ابن عمر رضى الله عنه أنه سئل كيف كن النساء يصلين على عهد رسول الله ﷺ قال كن يتربعن ثم امرن أن يحتفزن (مسند الامام اعظم، ۱/ ۷۳) اس سے ماقبل والے مضمون کی تائید ہوتی ہے کہ عورتیں خوب سمٹ کر پردے کے ساتھ نماز پڑھیں اور پھر حالت تشہد میں عورت کو مرد کی طرح بیٹھنے کا حکم نہیں بلکہ اپنے پاؤں کو دائیں طرف نکال کر بائیں سرین پر بیٹھ جائے سنن کبریٰ کی

روایت میں مذکور ہے: عن أبی سعید الخدری رضی الله عنه صاحب النبی ﷺ عن النبی ﷺ أنه قال...... وكان يأمر الرجال أن يتجافوا فی سجودهم ويأمر النساء يتجفضن فی سجودهن وكان يأمر الرجال أن يفرشوا اليسرى وينصبوا اليمنىٰ فی التشهد ويأمر النساء أن يتربعن ......الخ(السنن الكبرى للامام البيهقی، ۲/۲۲۲) اس روایت میں عورت کو مرد سے مختلف نماز پڑھنے کا حکم ہے اور اسکی ہم معنی روایت مصنف ابن اَبی شیبہ کی ہے عن خالد بن اللجلاج قال كن النساء يؤمرن أن يتربعن اذا جلسن فی الصلاة ولا يجلسن جلوس الرجال علی أو راكهن يتقی ذلک علی المرأة مخافة أن يكون منها الشئ. (مصنف ابن ابی شيبه، ۲/۵۰۶) ان احادیث وروایات سے معلوم ہوا کہ عورت حالت تشہد میں بائیں سرین پر بیٹھے گی اور پیروں کو دائیں طرف نکالے گی یہ تمام روایات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ عورت کی نماز کا فرق جو احناف کرتے ہیں روایات سے ثابت ہے اور ان لوگوں کا یہ کہنا کہ عورت کی نماز کا یہ طریقہ کسی حدیث سے ثابت نہیں غلطی پر مبنی ہے جیسا کہ اوپر کی روایات سے معلوم ہوا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دین کی صحیح سمجھ عطا فرمائے اور قبول حق کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

لمافی اعلاء السنن(۳/۳۰): عن علیؓ قال اذا سجدت المرأة فلتحتفز ولتضم فخذيها......

وقال رحمه الله فی اعلاء السنن فی شرح حديث علی رضی الله عنه والقياس أيضا يقتضی مخالفة هيئة المرأة فی جلوسها وسجودها عن هيئة الرجال لكون مبنی احوالهن علی التستر والاحاديث المذكورة مويدة له ...... الخ.

وفی الهندية(۱/۷۵): والمرأة لا تجافی فی ركوعها وسجودها وتقعد علی رجليها وفی السجدة تفترش بطنها علی فخذيها...... الخ.

وفی الدرالمختار(۱/۵۰۴): (والمرأة تخفض) فلا تبدی عضديها(وتلصق بطنها بفخذيها) لانه استر وحررنا فی الخزائن انها تخالف الرجل فی خمسة وعشرين......

وفی الشامية: وتضع يديها علی ركبتيها ولا تحنی ركبتيها وتنضم فی ركوعها وسجودها وتفترش ذراعيها...... وذكر فی البحر انها لا تنصب اصابع القدمين......الخ.

(۱۱۶) ٹوپی کیسی ہو؟ آپ ﷺ سے ٹوپی پہننے کا ثبوت اور بغیر ٹوپی کے نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز اور غیر نماز میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ٹوپی پہننا ثابت ہے یا نہیں؟ ٹوپی کس قسم کی ہونی چاہئے؟ بغیر ٹوپی کے نماز پڑھنا یعنی ننگے سر نماز پڑھنا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... حضور اقدس جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے نماز اور غیر نماز میں ٹوپی اور عمامہ یعنی پگڑی کا پہننا ثابت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ٹوپیاں تین طرح کی تھیں ایک وہ تھی جو سر کے ساتھ چپکی ہوئی ہوتی تھی دوسری

وہ تھی جو سر سے کسی قدر اونچی ہوتی تھی تیسری بڑی ٹوپی تھی جس میں کان بھی ڈھک جاتے تھے اور بغیر ٹوپی کے ننگے سر نماز پڑھنا خلافِ سنت ہے اس لئے ٹوپی پہننے کا اہتمام کرنا چاہئے۔

لما فی شمائل الترمذی(صـ۸): عن جابر قال دخل النبی ﷺ مکة یوم الفتح علیه عمامة سوداء.

وفی الصحیح للبخاری(۱/۵۶):وقال الحسن کان القوم یسجدون علی العمامة والقلنسوة ویداه فی کمه.

وفی کنز العمال(۷/۱۲۱): کان یلبس قلنسوة بیضاء(طب عن ابن عمر).

کان یلبس القلانس تحت العمائم وبغیر العمائم ویلبس العمائم بغیر القلانسو کان یلبس القلانس الیمانیة وهن ابیض المضرّبة ویلبس ذوات الآذان فی الحرب وکان ربما نزع قلنسوته فجلعها سترة بین یدیه وهو یصلی الخ.

وفی بذل المجهود (۵/۵۲): ولأبی الشیخ عن ابن عباس کان لرسول الله ﷺ ثلث قلانس الحدیث.

(۱۱۷) مسجد میں رکھی ٹوپی پہن کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس مسئلہ میں کہ ٹوپی نہ ہونیکی صورت میں مسجد میں پڑی ہوئی ٹوپی کا استعمال یا چھوٹا رومال سر پر رکھ کر نماز پڑھنا جائز ہے؟ میرے ایک دوست کا کہنا ہے کہ ان دونوں صورتوں سے بہتر ہے کہ ننگے سر نماز پڑھ لی جائے، کیا یہ بات صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......ٹوپی نہ ہونے کی صورت میں مسجد میں رکھی ہوئی ٹوپی کو استعمال کرنا یا چھوٹا رومال سر پر رکھنا درست ہے البتہ اسکی عادت نہ بنائی جائے، اور آپ کے دوست کی بات درست نہیں ہے کیونکہ سر ڈھانپنا نماز کے آداب میں سے ہے۔

لمافی الشامیة(۱/۶۴۱):(قوله ولابأس به للتذلل) قال فی شرح المنیة : فیه اشارة الی أن الاولی ان لایفعله وأن یتذلل ویخشع بقلبه فانهمامن أفعال القلب وتعقبه فی الامداد بمافی التجنیس من أنه یستحب له ذالک لأن مبنی الصلاة علی الخشوع.

(۱۱۸) ننگے سر نماز پڑھنے سے متعلق مکروہ تنزیہی اور تحریمی کی تحقیق

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کچھ لوگ جب نماز کو آتے ہیں تو ٹوپی نہیں پہن کر آتے بلکہ مساجد میں جو پلاسٹک کی ٹوپیاں یا لکڑی کی چھال کی ٹوپی بنی ہوتی ہے وہ پہن لیتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں اور کچھ لوگ تو اپنی جیب سے ناک صاف کرنے والا رومال باندھ لیتے ہیں کیا ایسی صورت میں نماز ہو جاتی ہے کیونکہ میں نے کسی دینی کتاب میں یہ بات پڑھی تھی کہ ان ٹوپیوں میں نماز نہیں ہوتی۔ براہ کرم جلد از جلد قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......سب سے پہلے چند امور قابل ذکر ہیں۔

(۱)۔اکثر فقہاء نے ننگے سر نماز پڑھنے کو مطلق مکروہ کہا ہے۔

(۲)۔جب کبھی مطلق کراہت کا ذکر ہو تو اس سے مراد کراہت تحریمی ہوتی ہے الا یہ کہ کراہت تنزیہی کی کوئی دلیل وہاں موجود ہو جیسا کہ الشامیہ(۱/۲۲۴) پر مذکور ہے کہ''**الکراھة حیث اطلقت فالمراد منھا التحریم**''

(۳)۔بعض فقہاء نے ننگے سر نماز پڑھنے کو ازار واحد میں نماز پڑھنے پر قیاس کیا ہے جیسا کہ البحر الرائق (۲/۴۴) پر مذکور ہے''**وان صلّی فی ازار واحد یجوز ویکرہ...... وکذا مکشوف الرأس للتھاون والتکاسل**''اور ازار واحد میں نماز (باوجود قمیص یا چادر وغیرہ پر قدرت کے) مکروہ تحریمی ہے جیسا کہ حاشیۃ الطحطاوی (صفحہ ۳۴۹) پر مذکور ہے''**وصلاتہ فی السراویل اوفی ازار مع قدرتہ علی لبس القمیص. لما فیہ من التھاون والتکاسل.وفی شرحہ (لما فیہ من التھاون ھذا یفید کراھة التحریم**''لہٰذا مقیس (ننگے سر نماز پڑھنا) بھی مکروہ تحریمی ہوگا۔

(۴)۔علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ نے الشامیہ(۱/۶۵۳) میں فرمایا ہے کہ اگر سنت،سنت مؤکدۃ قویۃ ہو تو اس کا ترک مکروہ تحریمی ہے اور سر ڈھانپ کر نماز پڑھنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مؤکدہ ہے جیسا کہ ملتقی الابحر(۱/۱۰۸۔۱۰۹) پر ملا علی قاری رحمہ اللہ سے نقل کیا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حالت احرام کے علاوہ کبھی بھی ننگے سر نماز ادا نہیں فرمائی لہٰذا اس سے بھی ننگے سر نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہی ثابت ہوتا ہے۔

(۵)۔بعض فقہاء کی عبارات میں اس کی صراحت ہے کہ ننگے سر نماز پڑھنا مکروہ تنزیہی ہے جیسا کہ شرح الوقایۃ (۱/۱۶۸) کے حاشیۃ پر اور الفقہ الاسلامی وادلتہ (۲/۹۷۲) میں مذکور ہے۔لہٰذا عبارات مذکورہ کے پیش نظر اگر کبھی کبھار کسی وجہ سے ننگے سر نماز پڑھی گئی تو مکروہ تنزیہی ہوگی اور اگر ننگے سر نماز پڑھنے کو مستقل عادت بنالیا گیا ہو تو اس صورت میں نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہوگا نیز ٹوپی اچھی اور صاف ہونی چاہئے اور ٹوپی نہ ہو تو مسجد میں رکھی ہوئی ٹوپی پہن کر نماز ادا کرنا درست ہے البتہ رومال وغیرہ سے سر باندھنے میں سر کا درمیانی حصہ چھپانا ضروری ہے ورنہ اس صورت میں بھی نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہوگا۔

لمافی شرح الوقایة (۱/۱۶۸): وصلاتہ حاسرا راسہ للتکاسل او للتھاون بھا. لیس المراد بالتھاون الاھانة بالصلاة فانھا کفر بل المراد قلة رعایتھا ومحافظة حدودھا. و فی حاشیة (صلاتہ حاسرا راسہ) والظاھر ان الکراھة ھھنا تنزیھیة.

وفی فتاوی سراجیة (ص۱۱): اذا صلی حاسرالرأس کرہ.

وفی الشامیة (۱/۱۳۲): اذا ذکروا مکروھاً فلا بد من النظر فی دلیلہ فان کان نھیا ظنیا یحکم بکراھة التحریم الالصارف النھی عن التحریم الی الندب فان لم یکن الدلیل نھیا بل کان مفیداً للترک الغیر الجازم فھی تنزیھیة.

وفی الشامیة (۱/۲۲۴): واعلم ان المکروہ اذا اطلق فی کلامھم فالمراد منہ التحریم الا ان ینص

علی کراهة التنزیه. فقد قال المصنف فی المصفی: لفظ الکراهة عند الاطلاق یراد بها التحریم.

قال ابو یوسف قلت لابی حنیفة: اذا قلت فی شئ اکرهه فما رأیک فیه؟ قال: التحریم.

وفی الشامیة (۱/۶۵۲): (والاعتجار) لنهی النبی ﷺ عنه، وهو شد الرأس او تکویر عمامته علی راسه وترک وسطه مکشوفاً.......... و کراهته تحریمیة.

وفی الشامیة (۱/۶۵۳): ان السنة ان کانت مؤکدة قویة لا یبعد کون ترکها مکروهاً تحریماً وان کانت غیر مؤکدة فترکها مکروه تنزیهاً. واما المستحب او المندوب فینبغی ان یکره ترکه اصلاً.

(۱۱۹) سلام کا کتنا لفظ کہنے سے نماز سے خارج ہو جائے گا؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز سے خروج کے لئے السلام علیکم کہنا واجب ہے تو قابل دریافت امر یہ ہے کہ پورا سلام کہنے سے نماز سے خارج ہوجاتا ہے یا نصف سلام یا اس سے بھی کم الفاظ کہنے سے نماز سے خارج ہوجاتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... دائیں طرف سلام کرتے وقت لفظ ''السلام'' کے میم کے ختم ہوتے ہی نمازی نماز سے خارج ہوجاتا ہے۔

لما فی الطحطاوی علی الدر (۱/۲۱۰): لفظ السلام مرتین فالثانی واجب علی الاصح برهان دون علیکم وتنقضی قدوة بالاول قبل علیکم علی المشهور وعلیه الشافعیة.

وفی الدر المختار (۱/۴۶۸): (ولفظ السلام) مرتین والثانی واجب علی الاصح برهان دون علیکم وتنقضی قدوة بالاول قبل علیکم علی المشهور عندنا وعلیه الشافعیة

قال الشامی تحته: (قوله وتنقضی قدوة بالاول) ای بالسلام الاول قال فی التجنیس الامام اذا فرغ من صلوته فلما قال السلام جاء رجل و اقتدی به قبل ان یقول علیکم لایصیر داخلا فی صلاته.

﴿فصل فی الامامة والجماعة﴾

(امامت اور جماعت سے متعلق مسائل کا بیان)

(۱۲۰) نابالغ کی امامت کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ چھوٹا بچہ بڑوں کی امامت کرسکتا ہے یا نہیں، نیز چھوٹا بچہ اگر چھوٹے بچوں کی امامت کرے تو اسکا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً...... نابالغ بچے کی امامت بڑوں کیلئے مطلقاً ناجائز ہے چاہے فرائض ہوں یا نوافل بڑوں کی نماز ادا نہ ہوگی البتہ اگر بچہ بچوں کی امامت کرنا چاہے تو کرسکتا ہے۔

لمافی الشامیة(۱/۵۵۰): وشروط الامامة للرجال الاصحاء ستة اشياء الاسلام والبلوغ والعقل والذكورة والقراءة والسلامة من الاعذار...... احترزبالرجال الاصحاء...... عن الصبيان فلايشترط فی امامهم البلوغ.

(۱۲۱) نابالغ بچہ کا نابالغ بچوں کی امامت کرنا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض مدارس میں یہ رواج پایا جاتا ہے کہ بچوں کو جب چھٹی ہوتی ہے تو ان میں سے ایک نابالغ بچہ نابالغ بچوں کی جماعت کراتا ہے شرعی طور پر یہ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً...... نابالغ بچہ نابالغ بچوں کی امامت کراسکتا ہے۔

لمافی الدر المختار(۱/۵۷۸): وصح لو توضأ علی الانقطاع وصلی كذلک كاقتداء بمفتصد أمن خروج الدم وكاقتداء امرأة بمثلها وصبی بمثله ومعذور بمثله الخ.

وفی الهندية(۱/۸۵): وامامة الصبی المراهق لصبيان مثله يجوز كذا فی الخلاصه اهـ.

وفی الشامية(۱/۵۷۷): وامّا غير البالغ فان كان ذكراً تصح امامته لمثله من ذكر وأنثی وخنثی اهـ.

(۱۲۲) ۱۶ سالہ لڑکے کی امامت کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک مسجد کا امام ہوں، اور الحمدللہ پانچوں وقت

پابندی سے نماز پڑھاتا ہوں، میرا ایک بیٹا (عبدالحمید) ہے جس کی عمر سولہ، سترہ سال ہے اور وہ حافظ قرآن بھی ہے۔ کبھی کبھی میری عدم موجودگی میں وہ نماز پڑھا دیتا ہے۔ اسی طرح ابھی رمضان میں آخری دنوں میں تراویح بھی اس نے پڑھائی تھی۔ میری مسجد کے بعض نمازی حضرات اس کی امامت پر اعتراض کرتے ہیں کہ ابھی یہ چھوٹا ہے۔ آپ حضرات سے شریعت کی روشنی میں یہ معلوم کرنا ہے کہ آیا میرا یہ بیٹا فرض نمازوں میں، میری عدم موجودگی میں امام بن سکتا ہے یا نہیں؟ اور لوگوں کا اس پر اعتراض درست ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورتِ مسئولہ میں اگر آپ کے بیٹے (عبدالحمید) کو نماز کے ضروری مسائل سے بخوبی واقفیت ہے اور امامت سے متعلق کوئی قابل اعتراض بات اس میں نہیں پائی جاتی تو شرعاً اس کے لئے نماز کی امامت کرانا درست ہے اور نمازیوں کا بلاوجہ اس کی امامت پر اعتراض کرنا شرعاً درست نہیں۔

لمافی الهندية(۱/۸۶۔۸۷): رجل ام قوما وهم له كارهون ان كانت الكراهة لفساد فيه أولانهم أحق بالامامة يكره له ذلک وان كان هو أحق بالامامة لايكره هكذا فی المحيط.

وفی الشامية(۱/۵۶۲):(قوله وكذا تكره خلف أمرد) الظاهر أنها تنزيهية أيضاً والظاهر أيضاً كماقال الرحمتی أن المراد به الصبيح الوجه لأنه محل الفتنة...... سئل العلامة الشيخ عبدالرحمن بن عيسى المرشدی عن شخص بلغ من السن عشرين سنة وتجاوز حد الانبات ولم ينبت عذاره فهل يخرج بذلک عن حد الأمردية وخصوصا قد نبت له شعرات فی ذقنه تؤذن بأنه ليس من مستديری اللحی، فهل حكمه فی الإمامة كالرجال الكاملين أم لا، أجاب: سئل العلامة الشيخ أحمد بن يونس المعروف بابن الشلبی من متأخری علماء الحنفية عن هذه المسألة فأجاب بالجواز من غير كراهة وناهيک به قدوة.

(۱۲۳) غیر شادی شدہ شخص کی امامت کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص ہے جس کا تعلق اونچے خاندان سے ہے اور وہ درجہ سادسہ میں پڑھتے ہیں اور ان کے والد کا تعلق علماء اور مشائخ کے ساتھ ہے اور وہ طالبعلم ایک بڑی جامع مسجد کے امام بھی ہیں لیکن وہ غیر شادی شدہ ہیں جس کی وجہ سے اکثر مقتدی اعتراض کرتے ہیں تو اس صورت میں ان کے لئے نماز پڑھانا جائز ہے یا نہیں؟ اس شخص کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... شریعت میں امامت کیلئے امام کا اعلم بالسنۃ ہونا ضروری ہے (یعنی نماز کے مسائل پر عبور ہو کہ صحت نماز کیلئے کیا کیا چیزیں ضروری ہیں اور کن چیزوں سے نماز فاسد ہو جاتی ہے وغیرہ) اسی طرح امام کا فواحش ظاہرہ سے اجتناب کرنا بھی ضروری ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں جیسا کہ واضح ہے کہ مذکورہ امام وہ درجہ سادسہ کے طالب علم ہیں تو یقیناً نہ صرف نماز کے مسائل پر بلکہ دیگر مسائل پر بھی

انکوعبور حاصل ہوگا اور بظاہر وہ نیک وصالح بھی ہوں گے لہٰذا ایسے شخص کا نمازیں پڑھانا اور امامت کے منصب پر فائز ہونا جائز ہے اور مقتدیوں کا صرف ''غیر شادی شدہ'' ہونے کی بناء پر مذکورہ امام پر اعتراض کرنا صحیح نہیں۔

لمافی جامع الترمذی(۱/۵۵): عن اوس بن ضمعج قال سمعت ابا مسعود الانصاری رضی الله عنه يقول قال رسول الله ﷺ يؤم القوم اقرؤهم لكتاب الله فان كانوا فى القراءة سواء فاعلمهم بالسنة فان كانوا فى السنة سواء فاقدمهم هجرة فان كانوا فى الهجرة سواء فاكثرهم سنا ولا يؤم الرجل فى سلطانه ولا يجلس على تكرمته فى بيته الا باذنه.

وفى الهندية(۱/۸۳): الاولى بالامامة اعلمهم باحكام الصلاة هكذا فى المضمرات وهو الظاهر هكذا فى البحر الرائق هذا اذا علم من القراءة قدرما تقوم به سنة القراءة هكذا فى التبيين ولم يطعن فى دينه كذا فى الكفاية وهكذا فى النهاية ويجتنب الفواحش الظاهرة وان كان غيره اورع منه كذا فى المحيط وهكذا فى الزاهدى وان كان متبحرا فى علم الصلاة لكن لم يكن له حظ فى غيره من العلوم فهوا ولى كذا فى الخلاصة.

وفى الشامية(۱/۵۵۷): (والاحق بالامامة)...... (الاعلم باحكام الصلاة) فقط صحة وفسادا بشرط اجتنابه للفواحش الظاهرة وحفظه قدر فرض(قوله باحكام الصلاة فقط) اى وان كان غير متبحر فى بقية العلوم وهوا ولى من المتبحر كذا فى زاد الفقير عن شرح الارشاد (قوله بشرط اجتنابه الخ) كذا فى الدارية عن المجتبى وعبارة الكافى وغيره: الاعلم بالسنة اولى الا ان يطعن عليه فى دينه لان الناس لا يرغبون فى الاقتداء به...... وفى (ص۵۵۹) (ولو ام قوما وهم له كارهون، ان) الكراهة (لفساد فيه اولانهم احق بالامامة منه كره) له ذلك تحريما لحديث ابى داؤد "لايقبل الله صلاة من تقدم قوما وهم له كارهون (وان هو احق لا) والكراهة عليهم.

(۱۲۴) جس امام کی قرأت صحیح نہ ہو، اس کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے قرآن غلط سلط پڑھ رکھا تھا لیکن اللہ کی توفیق سے چار ماہ لگائے اس میں قرآن بھی سیکھا جب واپس کالونی کی مسجد میں آیا تو اب امام صاحب کا قرآن غور سے سنا تو ان کی قرأت درست نہ تھی مثلاً اللہ اکبر کو (اَللّٰهُوْ اَكْبَرْ) کہتے ہیں اور الحمدلله رب العلمين ٥ الرحمن الرحيم ٥ درمیان میں نہ وقف کرتے ہیں اور نہ ملا کر پڑھتے ہیں بلکہ ایک سانس میں پڑھتے ہیں اور الرحمٰن الف پر زبر کو ظاہر کرتے ہیں اور اَلْعٰلَمِيْنَ کا زبر جو نون پر ہے کھا جاتے ہیں۔ کیا اس سے نماز میں خلل آتا ہے یا نہیں؟ ہم تو ۱۸ سال سے ان کے پیچھے نمازیں پڑھ رہے ہیں گذشتہ نمازوں کا کیا

حکم ہے؟ مہربانی فرمائی جائے کہ بندہ بہت زیادہ پریشان ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً......امام ایسے شخص کو مقرر کرنا چاہیے جو بقدرِ ضرورت تجوید (وقف، وصل، تشدید، تخفیف وغیرہ) کو جانتا ہو، اور قرآن پاک کو صحیح پڑھ سکتا ہو۔ صورت مسئولہ میں جس امام صاحب کے پیچھے اب تک آپ نے نمازیں پڑھی ہیں وہ تو ٹھیک ہیں، ان کی قضاء کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ امام صاحب نے ایسی غلطی نہیں کی ہے جس سے نماز فاسد ہو جائے البتہ آئندہ کیلئے ان امام کے بجائے کسی ایسے امام کو مقرر اور متعین کرنا چاہیے جو بقدرِ ضرورت تجوید سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ قرآن پاک کو بھی صحیح پڑھ سکتا ہو۔

لمافی حاشية الطحطاوی(ص۲۷۹): قوله: (بلا مدّ) الحاصل ان المد فی التكبير إما ان يكون فی لفظ الله او فی لفظ اكبر، فان كان فی لفظ الله فاما ان يكون فی اوله اوفی وسطه او فی آخره......
وان كان فی آخره بان اشبع حركة الهاء فهو خطأ من حيث اللغة ولا تفسد به الصلاة، وكذا تسكينها كذا فی الحلبی.

وفی الهندية (۱/۸۱): (ومنها الوقف والوصل والابتداء فی غير موضعها) اذا وقف فی غير موضع الوقف أو ابتدأ فی غير موضع الابتداء ان لم يتغير به المعنى تغيرا فاحشا...... لا تفسدبا لاجماع بين علمائنا هكذا فی المحيط. وكذا ان وصل فی غير موضع الوصل كمالو لم يقف عند قوله أصحاب النار بل وصل بقوله الذين يحملون العرش لاتفسد......

وفی الدر المختار(۱/۴۸۰): (واذا أراد الشروع فی الصلاة كبر)...... (للافتتاح)...... (بالحذف) اذ مد احد الهمزتين مفسد وتعمده كفر وكذا الباء فی الاصح. وفی الشامية تحته اعلم ان المد ان كان فی الله فاما فی اوله اووسطه او آخره...... وان كان فی آخره فهو خطأ ولا يفسد ايضا، وقياس عدم الفساد فيهما صحة الشروع بهما

وفی الشامية(۱/۶۳۲): تحت (قوله أو بوقف وابتداء) قال فی البزازية الابتداء ان كان لا يغير المعنى تغير افاحشا لايفسد......

وفی الهندية(۱/۸۳): الاولىٰ بالامامة أعلمهم باحكام الصلوة هكذا فی المضمرات وهو الظاهر هكذا فی البحر الرائق، هذا اذا علم من القراءة قدر ما تقوم به سنة القراءة هكذا فی التبيين...... فان تساووا فأقرؤهم ای اعلمهم بعلم القراءة يقف فی موضع الوقف ويصل فی موضع الوصل ونحو ذالک من التشديد والتخفيف وغيرهما كذا فی الكفاية.

(۱۲۵) تعویذ گنڈہ اور جھاڑ پھونک کرنے والے کی امامت کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلّہ میں ایک امام صاحب ہیں جو تعویذ گنڈے

اور جھاڑ پھونک کرتے ہیں ان کے پاس عورتیں تعویذات کیلئے آتی رہتی ہیں اس امام صاحب کی امامت جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ بکثرت روکنے کے باوجود اس کام سے باز نہیں آرہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... جائز طریقہ سے تعویذ، گنڈے اور جھاڑ پھونک کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور جائز طریقہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ تعویذ گنڈہ اور جھاڑ پھونک قرآن وحدیث اور اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے ذریعے یا ایسے کلام کے ذریعے کیا جائے جس میں شرکیہ کلمات نہ ہوں اور وہ عربی زبان میں ہو یا ایسی زبان میں ہو جس کے معنی معلوم ہوں اور اس کو مؤثر بالذات سمجھنے کا اعتقاد نہ ہو بلکہ اسکا اعتقاد یہ ہو کہ مؤثر حقیقی فقط اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور تعویذ گنڈہ دوسرے اسباب کی طرح ایک سبب ہے جو نفع ونقصان دینے میں اللہ تعالیٰ کے حکم کا محتاج ہے۔لہٰذا جو امام صاحب جائز طریقہ سے تعویذ گنڈے کرتے ہوں ان کی امامت درست ہے البتہ نامحرم عورتوں کو پردہ کے اہتمام کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو، براہ راست تعویذ نہ دینا چاہئے، بلکہ ان کے کسی محرم یا خاوند کے ذریعے ان کو تعویذ دینا چاہئے۔

وفی الدر المختار (۳۶۳/۲): (فرع) فی المجتبیٰ: التمیمة المکروهة ما کان بغیر العربیة.

(وفی الشامیة تحته): ولاباس بالمعاذات اذا کتب فیها القرآن او اسماء الله تعالیٰ ویقال رقاه الراقی رقیا ورقیة اذا عوذه ونفث فی عوذته قالوا وانما تکره العوذة اذا کانت بغیر لسان العرب، ولا یدری ما هو ولعله یدخله سحر أو کفر أو غیر ذالک، واما ما کان من القرآن او شی من الدعوات فلا باس به اهـ.

(۱۲۶) بریلویوں کی اقتداء میں نماز کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے میں بریلویوں کی مساجد ہیں، دیوبندیوں کی ذرا دور ہیں، تو کیا ہم بریلویوں کی مساجد میں ان کی اقتداء میں نماز پڑھ سکتے ہیں یا محلے سے دور دیوبندیوں کے پیچھے جا کر نمازیں پڑھیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... ایسا مبتدع امام جس کے عقائد کفریہ ہوں تو اس کی اقتداء میں نماز پڑھنا ناجائز ہے۔اور اگر اس کے عقائد کفریہ نہ ہوں تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ ہے۔صورت مسئولہ میں اگر بریلوی ایسے ہیں کہ ان کے عقائد کفریہ ہیں تو ان کی اقتداء میں نماز نہیں ہوتی اور اگر ان کے عقائد کفریہ نہیں تو ان کی اقتداء میں نماز پڑھنا مکروہ ہے۔لہٰذا بریلویوں کی مساجد کے علاوہ دوسری مساجد دیوبندیوں کی ہیں ان میں جا کر نماز پڑھنا چاہئے۔البتہ اگر آپ (کسی عذر کی وجہ سے) وہاں نہیں جا سکتے تو اکیلے نماز پڑھنے سے (ان بریلویوں کے پیچھے جن کے عقائد کفریہ نہیں) انکے پیچھے نماز پڑھ لینا بہتر ہے۔

لـمـافی خلاصة الفتاویٰ (۱۵۰/۱): والفاسق اذا کان یؤم الجمعة وعجز القوم عن منعه قال بعضهم یقتدی به فی الجمعة ولا یترک الجماعة بامامة وفی غیر الجمعة یستقبل من ان یتحول الی مسجد

آخـر ولا يـاثـم بذلک ولوصلى خلف مبتدع اوفاسق فهو محرز ثواب الجماعة. لكن لاينال مثل ما ينال خلف تقى.

وفـي الهـنـدية(۱/۸٦): الفاسق اذا كان يؤم يوم الجمعة وعجز القوم عن منعه قال بعضهم يقتدى به في الجمعة ولا تترک الجمعة بامامته وفى غير الجمعة يجوز ان يتحول الى مسجد آخر ولايأثم به.

(۱۲۷) غیر مقلد کی امامت کا شرعی حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دن میں سفر پر جارہا تھا تو راستے میں ہم نے ایک مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کی جو غیر مقلدین کی تھی تو کیا ہماری نماز غیر مقلد کے پیچھے صحیح ہوگئی یا دوبارہ اعادہ واجب ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... فقہاء کرام نے مخالف مذہب والے امام کی اقتداء کے بارے میں تمام کتب معتبرہ ومستندہ میں یہ اصول بیان فرمایا ہے کہ اگر مخالف مذہب والا امام (مثلاً غیر مقلد ہو) اگر وہ ان مسائل میں جو ہمارے علماء احناف اور ان کے مابین مختلف فیہا ہوں ان میں ہمارے اصول کی رعایت رکھتا ہو، مثلاً غیر سبیلین سے کسی شے کے خارج ہونے پر وضو کرتا ہو، کپڑوں پر بقدر درہم منی لگ جانے پر دھوتا ہو، خون کے نکلنے پر وضو کرتا ہو، تو اس صورت میں اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے اور اگر رعایت نہ کرتا ہو تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے اور آج کل کے غیر مقلدین کا ان مسائل میں ہمارے اصول کی رعایت نہ کرنا روزِ روشن کی طرح عیاں ہے لہٰذا اب ان کی اقتداء میں نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے اور احتیاطاً واجب الاعادہ ہے۔ لہٰذا آپ نے جو نماز غیر مقلد امام کی اقتداء میں ادا کی ہے احتیاطاً اس نماز کا اعادہ کر لیجئے۔

لـمـافـي الشـامـية(۱/۵٦۳): وأمـا الاقـتـداء بـالـمـخالف فى الفروع كالشافعي فيجوز مالم يعلم منه مايفسد الصلاة على اعتقاد المقتدى عليه الاجماع، انما اختلف فى الكراهة اهـ فقيد بالمفسد دون غيره كـمـا ترى فى رسالة [الاهتداء فى الاقتداء] لملاعلى القارى: ذهب عامة مشايخنا إلى الجواز اذا كان يحتاط فى موضع الخلاف والا فلا. والمعنى أنه يجوز فى المراعى بلا كراهة وفى غيره معها ثـم الـمـواضع المهملة للمراعاة ان يتوضأ من الفصد والحجامة والقئ والرعاف ونحوذالک لافيما هـو سـنـة عـنـده مـكـروه عـنـدنـا كـرفع اليدين فى الانتقالات وجهر البسملة واخفائها فهذا وأمثاله لايمكن فيه الخروج عن عهدة الخلاف فكلهم يتبع مذهبه ولا يمنع مشربه اهـ.

وفى الفتاوىٰ الكبرىٰ لابن تيمية (۲/۲۸۵): يكونون فى وقت يقلدون من يفسده وفى وقت يقلدون من يصححه بحسب الغرض والهوىٰ ومثل هذا لايجوز باتفاق الامة.

(۱۲۸) جو شخص مرغ لڑاتا، نسوار اور سگریٹ استعمال کرتا ہو، اس کی امامت کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نسوار کھاتا ہے اور سگریٹ کثرت سے پیتا ہے اور مرغ لڑاتا ہے تو ایسے شخص کو امام بنانا جائز ہے یا نہیں جبکہ وہ قاری ہے اور منزل بھی یاد ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر کوئی امام نسوار یا سگریٹ استعمال کرتا ہو تو اس کو چاہئے کہ انکا استعمال ترک کردے اور اگر اس کے لئے ان چیزوں کا ترک کرنا مشکل ہو تو پھر جب بھی مسجد آئے تو نسوار اور سگریٹ کی بدبو کو زائل کر کے آئے کیونکہ حدیث میں بدبودار چیز کھا کر مسجد میں آنے سے منع کیا گیا ہے۔ اور اگر امام مرغ لڑاتا ہو تو اس کو اس سے بچنا چاہئے کیونکہ مرغ لڑانا ناجائز ہے اور اسی طرح مرغ لڑانے پر جوا لگانے سے اس فعل کی شناعت اور بڑھ جاتی ہے مرغ لڑانے اور اس پر جوا لگانے سے آدمی فاسق ہو جاتا ہے اور فاسق کی امامت مکروہ ہے۔

لمافی الشامیة(۱/۵۵۹): (ویکره تنزیها الخ) لقوله فی الاصل امامة غیرهم احب الی، بحر عن المجتبیٰ والمعراج ثم قال فیکره لهم التقدم ویکره الاقتداء بهم تنزیها فان امکن الصلوة خلف غیرهم فهو افضل والا فالاقتداء اولی من الانفراد ...... (صـ۵۶۰) (قوله و فاسق) من الفسق وهو الخروج عن الاستقامة ولعل المراد به من یرتکب الکبائر کشارب الخمر، والزانی وآکل الربا ونحوذلک کذا فی البرجندی اسمعیل وفی المعراج قال اصحابنا لاینبغی ان یقتدی بالفاسق الا فی الجمعة لانه فی غیرها یجد اماما غیره اهـ قال فی الفتح وعلیه فیکره فی الجمعة اذا تعددت اقامتها فی المصری علی قول محمد المفتی به لانه بسبیل الی التحول.

(۱۲۹) داڑھی پر سیاہ خضاب لگانے والے کی امامت کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص داڑھی پر سیاہ خصاب لگاتا ہو تو اس کو امام بنانا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... داڑھی پر سیاہ خضاب لگانا مکروہ تحریمی ہے اور اس کا مرتکب فاسق ہے اور فاسق کا امام بنانا مکروہ ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر مذکورہ شخص اپنے اس فعل کو چھوڑ کر توبہ نہیں کرتا تو اس کو امام نہ بنایا جائے بلکہ کسی متقی شخص کو امامت کیلئے منتخب کرنا چاہئے۔

لمافی الهندیه(۵/۳۵۹): أما الخضاب بالسواد فمن فعل ذلک من الغزاة لیکون اهیب فی عین العدوّ فهو محمود منه اتفق علیه المشایخ ومن فعل ذلک لیزین نفسه للنساء ولیحبب نفسه الیهن فذلک مکروه وعلیه عامة المشایخ. وبعضهم جوز ذلک من غیر کراهة. وروی عن أبی یوسف أنه

قال: کما یعجبنی ان تتزین لی یعجبها أن أتزین لها.

وفی الشامیة(۲/۷۵۶): ومذهبنا استحباب خضاب الشیب للرجل والمرأة بصفرة أوحمرة. وتحریم خضابه بالسواد علی الاصح.

وفی التاتارخانیة (۱/۲۰۳): ویکره ان یکون الامام فاسقا...... وفی الکافی: وان تقدم الفاسق جاز...... یجوز الاقتداء بمن کان معروفا بأکل الربا ولکن یکره.

(۱۳۰) مسجد کا مقرر شدہ امام امامت کیلئے حقدار ہے یا دوسرا شخص؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر مسجد میں کوئی بڑا عالم دین اور بزرگ بھی آ جائے تو نماز کون پڑھائے، امامِ مسجد یا مذکورہ بزرگ؟ بعض مقتدیوں کی خواہش ہوتی ہے کہ مذکورہ بزرگ نماز پڑھائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... مسجد کا جو مقرر امام ہے وہی مستحق ہے کہ امامت کرائے اگرچہ آنے والا بزرگ اور بڑا عالم کیوں نہ ہو۔

لمافی الدر المختار والشامیة (۱/۵۵۹): واعلم أن صاحب البیت ومثله امام المسجد الراتب اولیٰ بالإمامة من غیره مطلقا. (قوله مطلقا) ای وإن کان غیره من الحاضرین من هو أعلم وأقرأ منه.

وفی الهندیة(۱/۸۳): دخل المسجد من هو أولیٰ بالإمامة من إمام المحلة فإمام المحلة اولیٰ کذا فی القنیة.

(۱۳۱) امامت میں وراثت کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے میں ایک مسجد ہے جہاں پر ایک امام کے مرنے پر اس کا بیٹا امام بن جاتا ہے، اس کے مرنے پر پھر اس کا بیٹا امام بن جاتا ہے اور اکثر بات لڑائی جھگڑے تک پہنچ جاتی ہے، تو کیا امامت میں اس طرح کی وراثت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... امامت میں وراثت جاری نہیں ہوتی بلکہ بانی مسجد اور محلّہ والے جس کو بھی امام بنائیں وہی امام ہوگا، چاہے وہ امام کا بیٹا ہو یا کوئی اور ہو، بشرطیکہ اس میں امامت کی شرائط اور صلاحیت موجود ہو۔

لمافی الهندیة(۱/۸۳): الاولی بالامامة أعلمهم بأحکام الصلاة هکذا فی لمضمرات وهو الظاهر هکذا فی البحر الرائق هذا اذا علم من القراءة قدرما تقوم به سنة القراءة هکذا فی التبیین ولم یطعن فی دینه کذا فی الکفایة وهکذا فی النهایة ویجتنب الفواحش الظاهرة وان کان غیره اورع منه کذا فی المحیط وهکذا فی الزاهدی وان کان متبحرا فی علم الصلاة لکن لم یکن له حظ فی غیره من

العلوم فهو أولیٰ كذا فی الخلاصة فان تساووا فاقرء هم أی اعلمهم بعلم القراء ة.

وفی تنویر الابصار مع الدر (۱/۵۵۷): (والأحق بالامامة) تقديما بل نصبا مجمع الانهر (الاعلم باحكام الصلاة) فقط صحة وفسادا بشرط اجتنابه للفواحش الظاهرة وحفظه قدر فرض وقيل واجب وقيل سنة (ثم الاحسن تلاوة) وتجويداً (للقراة ثم الاورع) الاكثر اتقاء للشبهات والتقوى اتقاء المحرمات (ثم الاسن) اى الاقدم اسلاما فيقدم شاب على شيخ اسلم وقالوا يقدم الاقدم ورعا وفی النهر عن الزاد وعليه يقاس سائر الخصال فيقال يقدم الدم علما ونحوه وحينئذ فقلما يحتاج للقرعة (ثم الاحسن خلقا) بالضم الفة بالناس (ثم الاحسن وجها).

وفی الدر المختار (۱/۴۰۰): ولاية الاذان والاقامة لبانی المسجد مطلقا وكذا الامامة لو عدلا

وفی الشامية تحته: (قوله مطلقا) ای عدلا أولا. وفی الأشباه: ولد البانی وعشيرته اولیٰ من غيرهم اهـ

(۱۳۲) حضور ﷺ سے وتر کی امامت کا ثبوت اور مسبوق کا اپنی چھوٹی ہوئی رکعت کو پورا کرنے کا ثبوت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ایک شخص نماز میں کچھ تاخیر سے پہنچا اور اس کی کچھ رکعت امام کے پیچھے چھوٹ گئی تو وہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد پوری کر لیتا ہے سوال یہ ہے کہ یہ طریقہ کب سے شروع ہوا کیا یہ طریقہ جو آجکل معمول ہے حدیث میں آیا ہے؟ کہا جاتا ہے کہ حضرت معاذؓ نے اسے مدینہ منورہ میں شروع کیا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پسند فرمایا پھر رائج کیا؟ تفصیلی جواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔

(۲)۔ کیا وتر کی امامت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... مسبوق کی نماز کا طریقہ اصل میں سنت سے ثابت ہے البتہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے اکثر رکعت رہ جاتی تھی ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دیکھا کہ وہ اپنی فوت شدہ نماز پوری کر رہے ہیں تو آپ علیہ السلام نے تاکید کے طور پر فرمایا کہ تم میں سے جب کسی کی رکعت چھوٹ جائے تو تم بھی ایسا ہی کر لیا کرو جیسا کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کر رہے ہیں۔

(۲)...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے وتر کی امامت ثابت نہیں ہے کیونکہ آپ علیہ السلام وتر ہمیشہ گھر میں پڑھا کرتے تھے البتہ صحابہ کرام سے صرف رمضان المبارک میں وتر باجماعت پڑھنا ثابت ہے اس لئے فقہاء کرام نے غیر رمضان میں وتر باجماعت نہ پڑھنے پر امت کا اجماع نقل کیا ہے۔

لما فی مسند امام احمد بن حنبل (۳۲۶/۶): حدثنا عبدالله...... عن معاذ بن جبل قال احيلت الصلوة

ثلاثة احوال...... قال وكانوا يأتون الصلوة وقد سبقهم ببعضها النبی ﷺ قال فكان الرجل يشير الى الرجل ان جاء كم صلى فيقول واحدة أو اثنتين فيصليها ثم يدخل مع القوم فی صلاتهم قال: فجاء معاذ فقال لا اجده على حال أبدا الاكنت عليها ثم قضيت ماسبقنى قال فجاء وقد سبقه النبی ﷺ ببعضها قال فثبت معه فلما قضى رسول الله ﷺ صلاته قام فقضى فقال رسول الله ﷺ انه قد سن لكم معاذ فهكذا فاصنعوا......

وفی اعلاء السنن(٦،٥/٣٣): وروى ابن مسعود مرفوعا قال رسول الله ﷺ وتر الليل ثلاث كوتر النهار صلاة المغرب، واسناده حسن كما سيأتی......(ص ٣٤) ولان عائشةؓ كانت ترى وتره ﷺ اكثر مما يراه ابن عمر لانه ﷺ كان يوتر فی بيته دائما وفی آخر الليل غالبا......

وفيه ايضاً(٦،٥/٣٦): حدثنا ابو النضر...... عن عائشةؓ ان رسول الله ﷺ كان اذا صلى العشاء دخل المنزل ثم صلى ركعتين ثم صلى بعدهما ركعتين اطول منهما ثم اوتربثلاث لايفصل بينهن.

وفی الهداية(١/١٥٨): ولا يصلى الوتر بجماعة فی غير شهر رمضان عليه اجماع المسلمين.

(۱۳۳) فجر اور ظہر کی سنتیں پڑھے بغیر امامت کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری مسجد کے امام صاحب فجر اور ظہر کی نمازیں بسا اوقات تاخیر سے آتے ہیں اور جلدی سے وضو کر کے سنت ادا کئے بغیر نماز پڑھاتے ہیں جبکہ بعض لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ فجر یا ظہر کی سنتیں پڑھنے سے پہلے امام کا جماعت کرانا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......فجر کی سنتیں پڑھے بغیر امامت کرنا مکروہ ہے کیونکہ فرض کے بعد وقت کے اندر ان کی قضاء نہیں ہوسکتی، اس لئے کراہت زیادہ ہے البتہ ظہر کی سنتیں پڑھے بغیر امامت کرنا جائز ہے لیکن بلا عذر ایسا نہیں کرنا چاہئے۔

لمافی الترمذی (١/٩٧): عن عائشة ان النبی ﷺ كان اذا لم يصل اربعا قبل الظهر صلاهن بعدها.

وفی اعلاء السنن(٧/٧):عن عائشة رضی الله عنها قالت لم يكن النبی ﷺ على شی من النوافل اشدتعاهداً منه على ركعتی الفجر. قوله عن عائشة رضی الله عنهاالخ، قال المؤلف دلالته على تاكيدسنة الفجر ظاهرة.

(۱۳۴) فجر کی سنت ادا کئے بغیر امامت کرانے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے امام صاحب کو اگر کبھی فجر کی جماعت کے وقت

پہنچنے میں دیر ہوجاتی ہے تو وہ بغیر سنت پڑھے نماز فجر پڑھا دیتے ہیں۔ میں نے کسی سے سنا ہے کہ فجر کی سنت جس نے نہ پڑھی ہو، اسے فجر کے فرض پڑھانا مکروہ ہے۔ کیا یہ بات درست ہے؟ براہِ کرم صحیح بات سے مجھے جلد از جلد مطلع فرمادیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... فجر کی سنت تمام سنتوں میں مؤکدترین اور اقویٰ سنت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے پڑھنے پر مداومت فرمائی ہے۔ اور سفر وحضر، صحت وبیماری کسی حال میں ترک نہیں فرمایا ہے۔ لہٰذا اس کا ترک کرنا درست نہیں۔ البتہ اگر کسی نے عذر کی بناء پر چھوڑ دی تو اس پر گناہ نہیں۔

صورت مسئولہ میں اگر امام صاحب کو جماعت کے وقت پہنچنے میں تاخیر ہوجاتی ہے اور وہ سنت پڑھے بغیر فجر کی نماز پڑھادیں تو نماز پڑھانا درست ہے۔ البتہ بغیر عذر کے ایسا کرنا خلاف سنت ہے۔

لمافی البخاری(۱/۱۵۶): عن عائشة قالت لم یکن النبی ﷺ علی شیٔ من النوافل اشد تعاهدا منه علی رکعتی الفجر.

وفی الفتاوی التاتارخانیة(۱/۲۴۱): یجب ان یعلم ان التطوع قبل الفجر رکعتان اتفقت الاثار علیهما وانهما من اقوی السنن، وفی المنافع: سنة الفجر اقوی السنن حتی لو انکرها یخشی علیه الکفر، ولا یجوز ان یصلیها قاعدا مع القدرة علی القیام، ولهذا قیل انها قریب من الواجب،

وفیه ایضاً (۱/۶۴۴): وفی النوازل: اذا ترک السنن ان ترکها بعذر فهو معذور، وان ترکها بغیر عذر لایکون معذورا فیها ویسأل الله تعالیٰ یوم القیامة عن ترکها. (وفی الصفحة ۶۴۲) وفی الکافی: وقالوا لو کان العالم مرجعا للفتوی له ترک سائر السنن لحاجة الناس الیه الاسنة الفجر.

(۱۳۵) اقامت کے وقت امام اور مقتدی کب کھڑے ہوں؟ اور امام کب تکبیر تحریمہ کہے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری فقہ کی کتابوں میں موجود ہے کہ جماعت کے وقت امام اور مقتدی حی علی الفلاح کے وقت کھڑے ہوں اور امام قد قامت الصلوٰۃ کے وقت نماز شروع کردے۔ عبارت یہ ہے **والقیام حین قیل حی علی الفلاح وشروع الامام مذقیل قد قامت الصلوٰة کنز الدقائق(۱/۲۴)** آجکل ہماری مساجد میں اس کے خلاف عمل ہورہا ہے کہ امام اور مقتدی اقامت سے پہلے کھڑے ہوجاتے ہیں اور اقامت ختم ہوجانے کے بعد امام نماز شروع کرتا ہے۔ آیا ہماری مساجد میں یہ عمل خلاف سنت ہورہا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو اس عبارت کا کیا مقصد ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا معمول تھا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... امام اور مقتدی کی تین حالتیں ہوسکتی ہیں۔ (۱)۔ کہ مقتدی مسجد میں ہو، اور امام خارج مسجد سے داخل ہورہا ہو۔ اگر امام سامنے محراب کی طرف سے داخل ہورہا ہو۔ تو مقتدی ان کو دیکھتے ہی نماز کیلئے کھڑے ہوجائیں۔ (۲)۔ اگر امام صف کے پیچھے سے آرہا ہو، تو امام جس صف سے گزرتا جائے اس صف والے مقتدی کھڑے ہوتے جائیں۔ (۳)۔ امام اور مقتدی مسجد کے اندر ہوں۔

تو اس بارے میں ہماری کتب میں جو تصریح ہے۔ جیسے کہ کنز الدقائق (۲۴/۱) پر ہے "والقیام حین قد قیل حی علی الفلاح" اس سے مراد یہ ہے کہ اس کے بعد امام اور مقتدی نہ بیٹھے جیسا کہ البحر الرائق (۵۳۱/۱) میں اس کی علت یہ بیان کی ہے "لانہ أمر فیستحب المسارعة الیہ" تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد بیٹھنا مسارعت إلی الطاعت کے خلاف ہے۔ نہ کہ اس سے پہلے کھڑا ہونا بلکہ اس میں مسارعت زیادہ پائی جاتی ہے۔ اور یہ کہ کنز کی اس عبارت سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کا تعامل بھی یہ تھا کہ ابتداء اقامت سے کھڑے ہوتے تھے۔ لہٰذا ہماری مساجد میں ائمہ اور مقتدیوں کا اقامت کی ابتداء سے کھڑا ہونا خلاف سنت نہیں ہے اور امام کے شروع فی الصلوٰۃ کے بارے میں امام ابو یوسفؒ کا قول یہ ہے کہ جب مؤذن اقامت سے فارغ ہو جائے تو امام تکبیر کہے۔ تاکہ مؤذن امام کے ساتھ تکبیر اولیٰ اور امام کے ساتھ نماز شروع کرنے کی فضیلت سے محروم نہ ہو جائے۔

لما فی الصحیح لمسلم (۲۲۰/۱): عن أبی هريرةؓ ان الصلوة كانت تقام لرسول الله ﷺ فيأخذ الناس مصافهم قبل أن يقوم النبی ﷺ مقامه.

وفی فيض الباری (۱۸۷/۲): باب (متى يقوم الناس" ويعلم من بعض الأحاديث أنهم كانوا يقومون لها بعد تمام الإقامة ومن بعضها أنهم كانوا يقومون فی خلالها وهكذا فی كتبنا...... والمسألة فيه أن الامام إن كان خارج المسجد ينبغی للمقتدين أن يقوموا لتسوية الصفوف إذا دخل فی المسجد، وإن كان فی المسجد فالمعتبر قيامه من موضعه وكيف ما كان ليست المسألة من نفس الصلاة بل من الآداب فان قام أحدٌ قبله لا يكون عاصياً.

"فلا تقوموا حتى ترونی" قال العلماء إن بلالاً رضی الله عنه كان يراقب النبی ﷺ فاذا رأه أقام وأما سائر الناس فكانوا لايرونه إلا بعد أن يصل إلی الصف وكان المسجد من بيته بحيث لو خرج قدمه منها وقع فی المسجد فكان بلال رضی الله عنه يقيم إذا خرج فاذا وصل موضع الإقامة وجد الصفوف قد سويت والاقامة قد تمت.

وفی البحر الرائق (۵۳۱/۱): قوله: (والقيام حين قيل حیّ علی الفلاح) لانه أمر به فيستحب المسارعة إليه أطلقه فشمل الإمام والمأموم إن كان الإمام بقرب المحراب وإلا فيقوم كل صف ينتهی اليه الإمام وهو الأظهر...... (وشروع الإمام مذقيل قدقامت الصلاة) عند أبی حنيفةؒ و محمدؒ و قال أبو يوسفؒ: يشرع إذا فرغ من الإقامة محافظة علی فضيلة متابعة المؤذن وإعانة للمؤذن علی الشروع معه ولهما أن المؤذن أمين، وقد أخبر بقيام الصلاة فيشرع عنده صوناً لكلامه عن الكذب وفيه مسارعة إلی المناجات وقد تابع المؤذن فی الأكثر فيقوم مقام الكل علی أنهم قالوا المتابعة فی الأذان دون الاقامة كذا ذكره الشارح وفيه نظر لما نقلناه فی باب الأذان أن اجابة الاقامة مستحبة

وفی الظهيرية: ولو أخر حتى يفرغ المؤذن من الاقامة لا بأس به فی قولهم جميعا والله اعلم.

وفی الهندية(۱/۵۷): وإن كان المؤذن غير الإمام وكان القوم مع الإمام فی المسجد فانه يقوم الإمام والقوم إذا قال المؤذن حیّ على الفلاح عند علمائنا الثلاثة وهو الصحيح ☆ فاما إذا كان الإمام خارج المسجد فان دخل المسجد من قبل الصفوف فكلما جاوز صفا قام ذلک الصف واليه مال شمس الائمة الحلوانی والسرخسی وشيخ الإسلام خواهرزاده وإن كان الإمام دخل المسجد من قدامهم يقومون كما رأ والامام وإن كان المؤذن والإمام واحدا فإن أقام فی المسجد فالقوم لا يقومون مالم يفرغ من الإقامة وإن أقام خارج المسجد فمشائخنا اتفقوا على أنهم لا يقومون مالم يدخل الإمام المسجد.

وفی الدر المختار(۱/۴۷۹): (قوله وشروع الإمام) فی الصلوة (مذقيل قد قامت الصلوة) ولو أخّر حتى اتمها لا بأس به إجماعاً وهو قول الثانی والثلاثة. وهو أعدل المذاهب كمافی شرح المجمع لمصنفه وفی القهستانی معزيا للخلاصة وهو الأصح (وتحته فی الشامية) ......(قوله لا بأس به إجماعاً) أی لأن الخلاف فی الأفضلية فنفی البأس ای الشدة ثابت فی كلا القولين وإن كان الفعل أولى فی أحدهما (قوله وهو) أی التأخير المفهوم من قوله أخر (قوله أنه الأصح) لأنه فيه محافظة على فضيلة متابعة المؤذن وإعانة له على الشروع مع الإمام.

(۱۳۶) امام کامحراب میں کھڑے ہونے کاحکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ امام کومحراب میں کس جگہ کھڑا ہونا چاہئے۔اگرکوئی امام محراب سے بالکل باہر کھڑا ہو،لیکن سجدہ محراب میں ادا کرتا ہو،کیااس طرح کرنا جائز ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......محراب اگراتنی چھوٹی ہوکہ اُس میں امام کے کھڑے ہونے سے اُس کی حالت مقتدیوں پرمشتبہ ہوتی ہوتو مکروہ ہے،البتہ اگراتنی بڑی محراب ہوکہ اُس میں کھڑے ہونے سے امام کی حالت مقتدیوں پرمشتبہ نہ ہوتی ہوتو امام کامحراب میں کھڑا ہونا بلاکراہت جائز ہے۔

لمافی الهندية (۱/۱۰۸): ويكره قيام الامام وحده فی الطاق وهو المحراب ولايكره سجوده فيه اذا كان قائما خارج المحراب هكذا فی التبيين وإذا ضاق المسجد بمن خلف الامام فلابأس بأن يقوم فی الطاق كذا فی الفتاوىٰ البرهانية.

وفی الطحطاوی تحته (قوله لاشتباه الحال على القوم) فان انتفى الاشتباه انتفت الكراهة وهذا

التعليل لجماعة منهم الفقيه أبو جعفر الهندواني.

وفي الشامية (۱/۶۴۵): وحاصله أنه صرح محمد في الجامع الصغير بالكراهة ولم يفصل، فاختلف المشايخ في سببها، فقيل كونه يصير ممتازا عنهم في المكان لأن المحراب في معنى بيت آخر وذلك صنيع أهل الكتاب، واقتصر عليه في الهداية واختاره الامام السرخسيؒ و قال إنه الأوجه، وقيل اشتباه حاله على من في يمينه ويساره فعلى الاول يكره مطلقا وعلى الثاني لايكره عند عدم الاشتباه، وأيد الثاني في الفتح بأن امتياز الامام في المكان مطلوب، وتقدمه واجب وغايته اتفاق الملتين في ذلك، وارتضاه في الحلية وأيده لكن نازعه في البحر بأن مقتضى ظاهر الرواية الكراهة مطلقاً، وبأن امتياز الامام المطلوب حاصل بتقدمه بلاوقوف في مكان آخر ولهذا قال في الولوالجية وغيرها إذا لم يضق المسجد بمن خلف الامام لاينبغي له ذلك لأنه يشبه تباين المكانين............

قلت: اى لأن المحراب إنما بني علامة لمحل قيام الامام ليكون قيامه وسط الصف كما هو السنة، لا لأن يقوم في داخله فهو وإن كان من بقاع المسجد لكن أشبه مكانا آخر فأورث الكراهة.

(۱۳۷) امام اور مقتدیوں میں تعدادِ رکعات میں اختلاف کی صورت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر امام اور مقتدی میں تعدادِ رکعات پر اختلاف ہو جائے تو کس کا قول معتبر ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں جب امام اور مقتدیوں کو تعدادِ رکعات میں اختلاف ہو جائے۔ مثلاً مقتدی کہیں کہ تین رکعات پڑھائی ہیں۔ جبکہ امام کہتا ہو کہ میں نے پوری چار رکعات پڑھائی ہیں۔ تو اس کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں:

(۱)......اگر امام کو اپنی بات کا پورا یقین ہے تو اس صورت میں امام کا قول معتبر ہوگا۔

(۲)......اگر امام کو اپنی بات کا پورا یقین تو نہیں ہے مگر مقتدیوں میں سے کوئی ایک بھی اس کا حامی ہے تو اس صورت میں بھی امام کا قول معتبر ہوگا۔

(۳)......امام کو اپنی بات کا پورا یقین بھی نہیں ہے، اور تمام مقتدی بھی اس کی رائے کے مخالف ہیں تو اس صورت میں مقتدیوں کا قول معتبر ہوگا، اور نماز دوبارہ لوٹائی جائے گی۔

لمافي الهندية (۱/۱۳۱): إذا شک الإمام فأخبره عدلان يأخذ بقولهما رجل صلى وحده أوصلى بقوم. فلما سلّم، أخبره رجل عدل، إنک صليت الظهر ثلاث ركعات. قالوا إن كان عند المصلى أنه صلى أربع ركعات لايلتفت إلى قول المخبر.

وفی الدر المختار (۲/۹۴): ولو إختلف الإمام والقوم فلو الإمام علی یقین لم یعد وإلا أعادبقولهم.

وفی الطحطاوی (۱/۳۱۷): (قوله ولو إختلف الإمام والقوم). أی کل القوم، أما لو إختلف القوم وقال بعضهم صلی ثلاثاً وقال بعضهم صلی أربعا. والإمام مع أحد الفریقین یؤخذ بقول الامام وإن کان معه واحد.

(۱۳۸) گرمی کی وجہ سے مسجد کے ہال کو چھوڑ کر مسجد کی چھت پر جماعت کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ہاں ایک مسجد ہے جس میں رمضان المبارک میں ماشاء اللہ تراویح مع ختم قرآن ہوتی ہے۔ لیکن بعض اوقات موسم گرما میں نماز عشاء اور تراویح وغیرہ مسجد کی چھت پر پڑھی جاتی ہے۔ خصوصاً جب بجلی موجود نہ ہو سخت پریشانی ہوتی ہے۔ تو کیا جماعت خانہ خالی ہوتے ہوئے مسجد کی چھت پر نماز عشاء وتراویح ادا کرنا مکروہ ہے یا جائز؟ حالانکہ مسجد کی چھت تو مسجد ہی کے حکم میں ہوا کرتی ہے۔ جیسے معتکف اگر مسجد کی چھت پر چڑھ جائے تو اس کا اعتکاف باطل نہیں ہوتا۔ سوال یہ ہے کہ مسجد کی چھت پر جماعت خانہ کے خالی ہوتے ہوئے نماز عشاء وتراویح ادا کرنا ازروئے شرع کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... مسجد کے ہال کو چھوڑ کر چھت پر بغیر عذر نمازِ عشاء یا تراویح کی جماعت مکروہ ہے۔ اور فقہاء کرام کی عبارات گرمی کی وجہ سے چھت پر باجماعت نماز کی کراہت پر واضح ہیں۔ لہٰذا گرمی کوئی ایسا عذر نہیں جس کی وجہ سے مسجد کے ہال کو چھوڑ دیا جائے البتہ مسجد کے صحن میں نماز ادا کرنے میں کوئی کراہت نہیں۔

جہاں تک معتکف کی بات ہے، معتکف کے چھت پر چڑھنے کی وجہ سے اعتکاف اس لئے نہیں ٹوٹتا کہ چھت مسجد کے حکم میں ہے اور جماعت اس لئے مکروہ ہے کہ چھت جماعت خانے کے حکم میں نہیں ہے اسلئے اگر کسی مسجد کی دو منزلیں ہیں تو دوسری منزل میں ہال کو چھوڑ کر نماز یا جماعت بلا کراہت جائز ہے کیونکہ وہ جماعت خانے کے حکم میں ہے۔

لمافی کبیری (ص۳۹۲): وفی القنیة امام یصلی التراویح علی سطح المسجد اختلف فی کراهته والاولی ان لایصلی فیه عند العذر فکیف بغیره.

وفی التاتارخانیة (۱/۶۷۰): وکذا اذا غلبه النوم یکره له أن یصلی مع القوم بل ینصرف حتی یستیقظ وکذا لو صلی علی السطح من شدة الحر.

وفی الهندیة (۵/۳۲۲): الصعود علی سطح کل مسجد مکروه لهذا اذا اشتد الحر یکره ان یصلوا بالجماعة فوقه الا اذا ضاق المسجد فحینئذ لا یکره الصعود علی سطحه للضرورة.

وفی الشامیة (۱/۶۵۶): ثم رأیت القهستانی نقل عن المفید کراهة الصعود علی سطح المسجد اهـ ویلزمه کراهة الصلاة ایضاً فوقه. فلیتامل (قوله لانه مسجد) علة لکراهة ماذکر فوقه قال الزیلعی،

ولهذا يصح اقتداء من على سطح المسجد بمن فيه اذا لم يتقدم على الامام ولا يبطل الاعتكاف بالصعود اليه.

(۱۳۹) بیمار کی تیمارداری کیلئے جماعت کی نماز چھوڑنے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر گھر والوں کی طبیعت سخت خراب ہو، ان کے پاس گھر میں کوئی اور ان کی تیمارداری کرنے والا نہ ہو، اور مسجد میں نماز پڑھنے جانے کی صورت میں گھر والوں کو تکلیف ہوتی ہو، تو کیا ایسی صورت میں جماعت کی نماز چھوڑنا درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... اگر بیمار آدمی کے ساتھ تیمارداری کرنے والا کوئی اور نہ ہو، اور مسجد میں چلے جانے کی صورت میں بیمار کو تکلیف ہوتی ہو، تو اس صورت میں جماعت چھوڑنا درست ہے۔

لما في الهندية (۸۳/۱): **تسقط الجماعة بالاعذار حتى لاتجب على المريض ......أن تفوته قافلة أو كان قيما لمريض الخ.**

وفي الشامية (۵۵۶/۱): **(قوله وقيامه بمريض) أى يحصل له بغيبته المشقة والوحشة.**

(۱۴۰) فرض نماز کا ''جماعت سے'' اور ''مسجد میں جا کر'' پڑھنا الگ الگ واجب ہے

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا صرف جماعت سے نماز پڑھنا واجب ہے؟ یا مسجد کی طرف جماعت کی نماز پڑھنے کیلئے جانا بھی واجب ہے؟ جبکہ علامہ طحطاویؒ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف جماعت سے نماز پڑھنا واجب ہے جیسا کہ حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے ''**الأصح أن اقامتها فى البيت كاقامتها فى المسجد وان تفاوتت الفضيلة** (ص ۲۸۶)'' اور اعلاء السنن کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت سے نماز پڑھنے کیلئے مسجد کی طرف جانا بھی واجب ہے ''فثبت ان اتيان المسجد ايضا واجب كوجوب **الجماعة**(اعلاء السنن، ۱۷۳/۴)'' اب ان دونوں قولوں میں سے راجح کون سا ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ مسجد کی طرف جانا جماعت سے نماز پڑھنے کیلئے اگر واجب ہو، تو پنج وقت نماز کیلئے جانا واجب ہے، یا اکثر اوقات، یا بعض اوقات جانا واجب ہے، اور بعض اوقات جانے سے وجوب ساقط ہو جائے گا جیسا کہ علامہ شامی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ''فالواجب الحضور احيانا (الشامية، ۵۵۲/۱)'' کبھی کبھی جانے سے وجوب ساقط ہو جائے گا۔ قول فیصل بیان فرما کر مشکور فرمائیں۔ نیز یہ کہ بعض حضرات سے سنا ہے، کہ اگر کسی شخص نے تین نمازیں باجماعت ادا کیں تو وہ شخص تارک جماعت شمار نہ ہوگا۔ آیا یہ بات درست ہے یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً......فرض نمازوں کا جماعت کے ساتھ ادا کرنا مستقل طور پر واجب ہے اور جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کیلئے مسجد میں آنا یہ الگ واجب ہے۔ اور ہر ایک کے ترک کرنے پر احادیث میں سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ میرا دل چاہتا ہے کہ چند جوانوں سے کہوں کہ بہت سا ایندھن اکٹھا کر کے لائیں پھر میں ان لوگوں کے پاس جاؤں جو بلا عذر گھروں میں نماز پڑھ لیتے ہیں اور جا کر ان کے گھروں کو جلا دوں اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ چاہے کہ کل قیامت کے دن اللہ جل شانہٗ کی بارگاہ میں مسلمان بن کر حاضر ہو وہ ان نمازوں کو ایسی جگہ ادا کرنے کا اہتمام کرے جہاں اذان ہوتی ہے یعنی مسجد میں اس لئے کہ حق تعالیٰ شانہ نے تمہارے نبی علیہ الصلاۃ والسلام کیلئے ایسی سنتیں جاری فرمائی ہیں جو سراسر ہدایت ہیں انہیں میں سے یہ جماعت کی نمازیں بھی ہیں اگر تم لوگ اپنے گھروں میں نماز پڑھنے لگو گے جیسا کہ فلاں شخص پڑھتا ہے تو تم نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی سنت کے چھوڑنے والے ہو گے اور یہ سمجھ لو کہ اگر نبی علیہ الصلاۃ والسلام کی سنت کو چھوڑ دو گے تو گمراہ ہو جاؤ گے اور جو شخص اچھی طرح وضوء کرے اس کے بعد مسجد کی طرف جائے تو ہر ہر قدم پر ایک ایک نیکی لکھی جائے گی اور ایک ایک درجہ بلند ہو گا اور ایک ایک خطا معاف ہو گی اور ہم تو اپنا یہ حال دیکھتے تھے کہ جو شخص کھلم کھلا منافق ہو، وہ تو جماعت سے رہ جاتا تھا ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عام منافقوں کی بھی جماعت چھوڑنے کی ہمت نہ ہوتی تھی یا کوئی سخت بیمار ہو ورنہ جو شخص دو آدمیوں کے سہارے سے گھسٹتا ہوا جا سکتا تھا وہ بھی صف میں کھڑا کر دیا جاتا تھا۔

رہی یہ بات کہ صاحب حاشیۃ الطحطاوی علی المراقی نے صاحب قنیہ کے حوالے سے جو مطلقاً لکھا ہے الاصح ان اقامتها فی البیت کاقامتها فی المسجد وان تفاوتت الفضیلة اس کے متعلق صاحب اعلاء السنن نے تصریح کی ہے کہ یہ صحیح نہیں کیونکہ اصحاب مذہب کی تصریحات اس کے خلاف ہیں اور صاحب قنیہ کی نقل ضعیف ہے اور یہ قول احادیث صحیحہ کے بھی خلاف ہے اور جہاں تک علامہ شامی کا قول ہے "فالواجب الحضور أحیانا" تو یہ اس صورت پر محمول ہو سکتا ہے جب کسی عذر کی وجہ سے مسجد میں جماعت رہ گئی ہو، ورنہ بعض فقہاء نے تو یہاں تک تصریح کی ہے کہ بغیر عذر کے کبھی کبھار بھی گھر میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا بدعت اور مکروہ ہے۔ اور بعض حضرات سے سنی ہوئی بات کہ "اگر کسی شخص نے تین نمازیں باجماعت ادا کیں تو وہ شخص تارک جماعت شمار نہ ہوگا" درست نہیں ہے۔

لمافی اعلاء السنن (۱۸۶/۴): قلت دلالته علی الجزء الاول ظاهرة حیث بولغ فی تهدید من تخلف عنها وحکم علیه بالنفاق ومثل هذا التهدید لا یکون الافی ترک الواجب ولا یخفی ان وجوب الجماعة لو کان مجردا عن حضور المسجد لماهم رسول الله ﷺ باضرام البیوت علی المتخلفین لاحتمال انهم صلوها بالجماعة فی بیوتهم فثبت ان اتیان المسجد ایضا واجب کوجوب الجماعة فمن صلاها بجماعة فی بیته اتی بواجب وترک واجبا اخر.

وفیه ایضاً(۱۸۸/۴): قلت: وهذا صریح فی ان وجوب الجماعة انما یتأدی بجماعة المسجد لا

بجماعة البيوت ونحوها فما ذكره صاحب القنية اختلف العلماء فى اقامتها فى البيت والاصح انها كاقامتها فى المسجد الا فى الفضيلة وهو ظاهر مذهب الشافعي اهـ. كذا فى حاشية البحر لابن عابدين لا يصح مالم ينقل نقلا صريحا عن اصحاب المذهب ويرده ماذكرنا من الاحاديث فى المتن فالصحيح ان الجماعة واجبة مع وجوب اتيانها فى المسجد ومن اقامها فى البيت وهو يسمع النداء فقد أساء وأثم والله سبحانه وتعالىٰ أعلم.

وفى البحر الرائق(١/٦٠٢):وسئل الحلوانى عمن يجمع بأهله أحيانا هل ينال ثواب الجماعة أو لا؟ قال: لا ويكون بدعة ومكروها بلا عذر.

(۱۴۱) نماز باجماعت پڑھنے کی فضیلت

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں مدنی مسجد شب جمعہ کو چلا گیا۔ مغرب میں تھوڑی دیر سے پہنچا۔ مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ہو چکی تھی۔ برآمدے میں دو جگہ جماعت کے ساتھ نماز ہو رہی تھی۔ ایک جماعت میں نمازیوں کی تعداد کافی زیادہ تھی جبکہ دوسری جماعت میں نمازیوں کی تعداد کم تھی۔ معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ جس جماعت میں نمازیوں کی تعداد زیادہ ہے ان کی آخری رکعت ہے۔ اور جس جماعت میں تھوڑے سے حضرات ہیں ان کی پہلی رکعت ہے۔ اب میں سخت متردد ہوا کہ کس جماعت میں شامل ہو جاؤں؟ آخرکار اس جماعت میں شریک ہوا جس کی پہلی رکعت تھی۔ لیکن دل میں ابھی تک یہ تردد ہے کہ کون سی جماعت میں شریک ہو جانا چاہیے تھا؟ اب آپ حضرات رہنمائی فرمائیں کہ اگر ایسا معاملہ پیش آجائے تو کیا کرنا چاہیے؟ آیا ثواب میں کچھ فرق ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... احادیث مبارکہ میں بکثرت نماز باجماعت کا حکم دیا گیا ہے۔ اور باجماعت نماز نہ پڑھنے والوں کیلئے وعیدیں بھی بیان فرمائی گئی ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ نماز ہمیشہ باجماعت ادا کی جائے۔ اور تکبیر اولیٰ کے حصول کی بھی حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے۔ احادیث میں اس کی بھی فضیلت وارد ہوئی ہے۔ نیز اگر کوئی شخص جماعت کی نماز میں ایک رکعت یا چند رکعات ہونے کے بعد شریک ہوتا ہے تو بلاشبہ وہ بھی جماعت کو پانے والا ہے لیکن اس شخص کا ثواب اس آدمی سے کم ہوگا جو شروع سے امام کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہے۔

صورت مسئولہ میں آپ نے جو عمل کیا کہ اس جماعت میں شریک ہوئے جن کی ابھی پہلی رکعت تھی یہ بالکل درست ہے جس سے یقیناً آپ تکبیر اولیٰ اور باجماعت نماز پڑھنے کے ثواب کے مستحق ہوں گے جبکہ دوسری جماعت میں شریک ہونے سے آپ ان فضائل سے محروم ہو جاتے۔ لہٰذا جہاں ایسی صورتحال ہو کہ دو جماعتیں ہو رہی ہوں اور ایک کی پہلی رکعت ہو، اور دوسری جماعت کی اکثر رکعات ہو چکی ہوں تو اس جماعت میں شریک ہونا چاہیے جن کی پہلی رکعت ہو یا کم رکعات ادا ہوئی ہوں، بشرطیکہ دوسری جماعت مسجد کے احاطہ سے باہر ہو رہی ہو۔ اگر مسجد کے احاطے ہی میں دوسری جماعت ہو رہی ہے تو یہ درست نہیں ہر ایک کو انفرادی نماز ادا کرنی چاہیے۔

لمافی ترمذی(۱/۵۲): عن ابن عمر رضی الله عنهما قال قال رسول الله ﷺ صلوة الجماعة تفضل علی صلوة الرجل وحده بسبع وعشرین درجة.

وفی الشامیة(۱/۳۹۶): الراجح عند اهل المذهب وجوب الجماعة وانه یاثم بتفویتها اتفاقاً: وحینئذ یجب السعی بالقدم لا لاجل الاداء فی اول الوقت اوفی المسجد بل لأجل اقامة الجماعة والا لزم فوتها اصلاً او تکرارها فی مسجد ان وجد جماعة اخری وکل منها مکروہ.

(۱۴۲) بار بار وضوٹوٹنے، ٹانگوں میں درد جیسے عذر کی بناپر مسجد میں آ کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک سال پہلے اپنی مقامی مسجد(جامع مسجد گول مارکیٹ) میں وضو کے بعداچانک پیر پھسلنے کے بعد گر پڑااوراس حادثے کے بعد سے مستقل طور پر بیمار آدمی کی زندگی گزارر ہاہوں،اس حادثے کے کچھ عرصے بعد جسم کے بائیں طرف فالج کا حملہ ہوااور حالت مزید خراب ہوگئی۔اب اللہ کے فضل سے بذریعہ علاج کچھ افاقہ ہوا۔میری روٹین کچھ اس طرح ہے کہ میں عصر کی نماز میں باجماعت شریک ہوجاتا ہوں اور پھر تلاوت کر کے مغرب باجماعت پڑھ کرگھر لوٹتا ہوں۔مسلسل گرم دواؤں کے استعمال سے مجھے قبض اور گیس کی شکایت رہتی ہے۔میں عصر کی جماعت کیلئے گرم پانی کا وضو بنا کرگھر سے چلتا ہوں مگر وضو ۱۵ منٹ یا آدھا گھنٹے میں ٹوٹ جاتا ہے اکثر نماز شروع کرنے سے پہلے ہی ٹوٹ جاتا ہے۔جس کی وجہ سے مسجد میں ٹھنڈے یا گرم جو بھی میسر ہو دوبارہ وضو بنانا پڑتا ہے،مسجد میں گرم پانی ہروقت دستیاب نہیں ہوتا،لہٰذا مجبوراً ٹھنڈے پانی سے وضو بنانے پر میری انگلیوں میں اور پیروں میں کھنچاؤ اور تکلیف ہونے لگتی ہے۔ڈاکٹر نے رمضان کے روزے رکھنے اور نماز پڑھنے سے بھی منع کیا ہے۔اب اس مسئلے کے حل کی جتنی بھی شرعی صورتیں ہوسکتی ہیں بیان فرمادیں۔ان میں سے مناسب اور آسان صورت کو اختیار کرلوں گا۔مسجد ۱۰ منٹ کی مسافت پر ہے اور بڑھاپے کی وجہ سے زیادہ نہیں چلا جاتا۔

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر بار بار وضو کرنے سے آپ کو تکلیف ہوتی ہو،اور گھر سے وضو کر کے مسجد تک جاتے جاتے یا نماز شروع ہوتے ہوتے وضو ٹوٹ جاتا ہو،یا بڑھاپے کی وجہ سے مسجد تک چلنے میں تکلیف ہوتی ہو،تو ایسی صورت میں اگر آپ جماعت میں شریک ہونے کی بجائے گھر میں ہی وضو کر کے جلدی جلدی نماز پڑھ لینا چاہتے ہیں تو آپ کیلئے شرعاً اجازت ہے کہ آپ گھر میں ہی پڑھ لیں۔کذا فی نفع المفتی والسائل بحواله فتاوی رحیمیه (۱/۱۹۵)۔کیونکہ بیماری اور ایسے بڑھاپے میں جس کی وجہ سے مسجد تک چلنا مشکل ہوجائے اس سے جماعت ساقط ہوجاتی ہے۔

دوسری صورت آپ کیلئے یہ ہے کہ اگر پانی کے استعمال سے بیماری میں اضافہ ہونے یا بیماری کے طول پکڑنے کا خوف ہو تو ایسی صورت میں آپ تیمم کر کے بھی نماز پڑھ سکتے ہیں لیکن یہ خوف غلبہ ظن یا تجربہ یا کسی مسلمان غیر فاسق حاذق طبیب کی خبر سے معلوم ہوسکتا ہے۔

رہا ڈاکٹر کا روزہ رکھنے سے منع کرنا،تو اگر روزہ رکھنے کی وجہ سے بیماری میں اضافہ ہونے کا یا بیماری کے طول پکڑنے کا خوف ہو،اور کوئی

مسلمان غیر فاسق حاذق طبیب آپ کو روزہ نہ رکھنے کا مشورہ دے تو آپ کو شرعاً روزے فی الحال نہ رکھنے کی اجازت ہے البتہ بعد صحت قضاء کرنا ضروری ہوگا۔

رہا نماز کا مسئلہ، تو اگر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے میں تکلیف ہوتی ہو، اور بیماری میں اضافہ یا بیماری کے طول پکڑنے کا خوف ہو تو بیٹھ کر ہی رکوع وسجدہ کے ساتھ نماز پڑھ لیا کریں۔ اور اگر رکوع وسجدہ میں بھی تکلیف ہوتی ہو تو اشارہ کر کے نماز پڑھ لیا کریں۔ اور اگر بیٹھنے میں بھی تکلیف ہوتی ہو تو لیٹ کر اشارتاً رکوع وسجدہ کرتے ہوئے نماز پڑھ لیا کریں۔ اور اگر بیماری کی شدت کی وجہ سے اشارہ کرنے پر بھی قادر نہ ہوں تو فی الحال نماز کو موخر کر دیں۔

لما فی الهندية (۱/۸۳): وتسقط الجماعة بألاعذار حتى لا تجب على المريض والمقعد والزمن ومقطوع اليد والرجل من خلاف ومقطوع الرجل والمفلوج الذى لا يستطيع المشى والشيخ الكبير العاجز والا عمىٰ عند ابى حنيفة رحمه الله تعالىٰ.

وفى الطحطاوى(صـ۲۹۸): قوله وشيخوخة، مصدر شاخ يشيخ اذا استبان منه السن قاموس. اى اذا صار شيخا كبيرا لايستطيع المشى سقطت عنه الجماعة.

وفى الهندية (۱/۲۸): ولو كان يجد الماء الا انه مريض يخاف ان استعمل الماء اشتد مرضه او ابطأبرء ه يتيمم .... ويعرف ذلک الخوف اما بغلبة الظن عن امارة او تجربة او أخبار طبيب حاذق مسلم غير ظاهر الفسق كذا فى شرح منية المصلى لأبراهيم الحلبى.

(۱۴۳) راستوں وغیرہ کی مسجد میں جماعت ثانیہ کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱)۔ محلّہ کی مسجد میں جماعت ثانی ہیئت اولیٰ کی تبدیلی کے باوجود درست نہیں ہے آیا یہ حکم صرف محلّہ والوں کے لئے ہے یا مسافر بھی اس میں داخل ہیں، مثلاً تبلیغی جماعت والے محلّہ کی مسجد میں اس وقت آئے جبکہ محلّہ والے جماعت سے نماز پڑھ چکے تھے آیا یہ تبلیغی جماعت والے یعنی کوئی بھی مسافر ہیئت اولیٰ بدل کر مسجد میں جماعت ثانی کرواسکتے ہیں یا نہیں؟

(۲)۔ اڈے کی مساجد مثلاً جو بس اسٹاپ پر ریلوے اسٹیشن پر یا سڑک کے کنارے پر بنی ہوئی ہوتی ہیں ان مساجد میں امام ومؤذن متعین ہوں جو پانچ وقت اذان دیتا ہو، اور نماز پڑھاتا ہو تو کیا اس صورت میں اسٹاپ وغیرہ کی مساجد میں جماعت ثانی کروانا درست ہے یا نہیں، درست ہونے کی صورت میں ہیئت اولیٰ بدلنی ہوگی یا نہیں؟ یا اسٹاپ وغیرہ کی مساجد میں اس وقت جماعت ثانی کروانا درست ہوگی جب ان مساجد میں امام ومؤذن متعین نہ ہوں کیا اس صورت میں بھی ہیئت اولیٰ بدلنی ہوگی یا نہیں؟

(۳)۔ تبلیغی جماعت والوں کی تشکیل مثلاً سندھ یا پنجاب کے کسی دیہات میں ایک مہینے کی ہوئی وہاں بستی قریب قریب ہوتی ہیں مثلاً دو یا

تین کلومیٹر کے فاصلے پر۔ دیہاتوں میں ہوتا یوں ہے کہ جس کی زمین ہوتی ہے وہ وہاں گھر بنا کر رہنا شروع کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے ایک ہی علاقے میں کئی بستیاں وجود میں آ جاتی ہیں تو پوچھنا یہ ہے کہ یہ جماعت والے بستیوں کا اعتبار کر کے قصر نماز پڑھیں یا دیہات کا اعتبار کر کے پوری نماز پڑھیں گے؟ جیسے بالفرض جماعت والوں کی تشکیل ایک مہینے کی نوابشاہ کے دیہاتوں میں ہوئی وہ نوابشاہ کے بھی قریب ہیں یعنی شرعی فاصلہ نہیں ہے اور آپس میں بھی دو یا تین کلومیٹر کے فاصلہ پر ہیں تو اس صورت میں جماعت والے نوابشاہ کا اعتبار کر کے پوری نماز پڑھیں گے یا دیہاتوں کا اعتبار کر کے قصر نماز پڑھیں گے؟

(۴)۔ جیسے کراچی کے چار ضلع ہیں جماعت والوں کی تشکیل بیس دن کی ایک ضلع میں ہوئی اب یہ تشکیل کے دوران دوسرے ضلع میں جاتے ہیں تو اس صورت میں جماعت والے کراچی شہر کا اعتبار کر کے پوری نماز پڑھیں گے یا اس کے ضلع کا اعتبار کر کے قصر نماز پڑھیں؟ مہربانی فرما کر جواب عنایت فرمائیں اللہ آپ کو اجر عظیم عطا فرمائے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... (۱،۲)۔ مسجد محلہ جس میں امام ومؤذن مقرر ہوں اس میں جماعت ثانی مکروہ ہے۔ اور یہ حکم صرف محلہ والوں کے لئے نہیں ہے بلکہ جو بھی جماعت ہو جانے کے بعد آئیں وہ سب اس حکم میں شامل ہیں۔ لہٰذا جو بعد میں آئیں اور اگر وہ جماعت ثانی کرانا چاہتے ہیں تو کسی ایسی جگہ میں جو مسجد کی حدود سے خارج ہو وہاں جماعت کرا سکتے ہیں۔ اور اسی طرح ان مساجد میں بھی جماعت ثانی مکروہ ہے جن میں امام ومؤذن اور مقتدی معین ہوں، البتہ وہ مساجد جن میں امام ومؤذن اور مقتدی معین نہ ہوں تو ان میں جماعت ثانی مکروہ نہیں ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں بس اڈے، ریلوے اسٹیشن اور سڑک کے کنارے جو مساجد ہیں اگر ان میں امام ومؤذن اور مقتدی معین ہیں تو ان مساجد میں جماعت ثانی مکروہ ہوگی اور اگر معین نہیں ہیں تو جماعت ثانی جائز ہوگی۔

(۳)۔ اقامت کی نیت کے صحیح ہونے کی شرائط میں سے یہ ہے کہ ایک ہی جگہ میں پندرہ یا اس سے زیادہ دنوں کی اقامت کی نیت کریں اور اسی طرح ایک شرط یہ بھی ہے کہ سفر کو منقطع کریں۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر جماعت والوں کی تشکیل پندرہ یا اس سے زیادہ دنوں کیلئے پنجاب یا نواب شاہ ہوئی، اب اگر انہوں نے وہاں ایک ہی جگہ میں پندرہ دنوں کی اقامت کی نیت کی اب اس کے بعد اگر وہ اڑتالیس میل کے اندر اندر دن کو جاتے ہیں اور رات کو واپس آتے ہیں یا کبھی کبھار رات بھی گزارتے ہیں تو اس صورت میں وہ پوری نماز پڑھیں گے قصر نماز پڑھنا جائز نہیں ہوگا۔ اور اگر جماعت والے ایک جگہ پندرہ دنوں کی اقامت کی نیت نہیں کرتے ہیں بلکہ دو تین دن ایک بستی میں رہتے ہیں، دو تین دن دوسری بستی میں تو اس صورت میں مسافر شمار ہوں گے اور قصر نماز پڑھیں گے۔

(۴)۔ پورے شہر کا حکم ایک ہوتا ہے چاہے کتنا ہی بڑا ہو، لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر جماعت والوں کی تشکیل پندرہ یا اس سے زیادہ دنوں کیلئے کراچی شہر میں ہو جائے، تو وہ پورے کراچی شہر میں چاہے جس ضلع میں جائیں نماز پوری پڑھیں گے۔

لـمافی الدر المختار (۱/۵۵۲): ویکره تکرار الجماعة بأذان وإقامة فی مسجد محلة لافی مسجد طريق او مسجد لا إمام له ولا مؤذن. وفی الشامية تحته (قوله يكره) أی تحريما لقول الكافی لايجوز، والمجمع لايباح، وشرح الجامع الصغير إنه بدعة كمافی رسالة السندی (قوله بأذان و

اقـامة الخ)......يكره تكرار الجماعة في مسجد محلة بأذان وإقامة إلا إذاصلى بهما فيه أولا غير أهله أو أهـلـه لـكـن بـمـخـافتة الأذان، ولو كرر أهله بدونهما أو كان مسجد طريق جاز اجماعا، كمافي مسجد ليس له إمام ولا مؤذن ويصلي الناس فيه فوجا فوجا، فإن الأفضل ان يصلي كل فريق بأذان وإقامة على حدة كـمـافـي امـالـي قـاضيخان ونحوه في الدرر، والمراد بمسجد المحلة ماله إمام وجماعة معلومون كمافي الدرر وغيرها، قال في المنبع: والتقييد بالمسجد المختص بالمحلة احتراز من الشارع، وبالأذان الثاني احتراز عما اذ اصلي في مسجد المحلة جماعة بغير اذان حيث يباح اجماعا، ...... وأما مسجد الشارع فالناس فيه سواء لا اختصاص له بفريق دون فريق.

وفي المحيط البرهاني(۲/۴۰۲): خراساني قدم بغداد وعزم على الإقامة بها خمسة عشر يوما، ومكي قدم الكوفة وعزم على الإقامة بها خمسة عشر يوما، ثم خرج كل واحد منهما من وطنه يريد قصر ابن هبيره، ليتلقى صاحبه بالقصر. فإنهما يصليان أربعا في الطريق وبالقصر لأنهما كانا متوطنين أحدهما ببغداد، والآخر بالكوفة، ولم يقصدا مسيرة مدة السفر، لأن من بغداد إلى الكوفة مسيرة أربع ليال، والقصر هو المنتصف فكان كل واحد منهما قاصداً مسيرة ليلتين، وبهذا لايصير مسافراً.

وفي الشامية(۲/۱۲۶): (قوله كمالو نوى مبيته بأحدهما) فإن دخل أولا الموضع الذي نوى المقام فيه نهارا لا يصير مقيما، وان دخل أولا مانوى المبيت فيه يصير مقيما ثم بالخروج إلى الموضع الآخر لايصير مسافرا لأن موضع إقامة الرجل حيث يبيت به.

(۱۴۴) بدعتیوں کی جماعت کے بعد جماعت ثانی کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مسجد میں جب اہل بدعت میں سے مثلاً بریلوی عقائد کا حامل شخص جماعت کرائے تو کیا اس مسجد میں دوبارہ صحیح العقیدہ شخص جماعت کراسکتا ہے یا نہیں اور یہ تکرارِ جماعت میں داخل ہوگا یا نہیں؟ اور دوسری جماعت کا کیا حکم ہے، آیا وہ درست ہے یا نہیں؟ یا مکروہ ہے۔

علامہ شامی رحمہ اللہ کی عبارت سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ جب ایک مسجد میں جماعت کراہت کے ساتھ کروائی گئی ہو تو دوسری جماعت کرائی جاسکتی ہے۔اور وہ عبارت یہ ہے: لان تكرار الجماعة في مسجد واحد مكروه عندنا على المعتمد الا اذا كانت الجماعة الاولىٰ غير اهل ذلك المسجد او اديت الجماعة على وجه مكروه. (شامية: ۱/۵۶۴) المطلوب: ۱)۔ بریلویوں کی جماعت کا کیا حکم ہے؟

۲)۔ جب ایک دفعہ بریلوی عقائد کا حامل شخص جماعت کروادے تو کیا دوسری جماعت اسی مسجد میں کروائی جاسکتی ہے یا نہیں؟

۳)۔ دوسری جماعت میں کراہت تو نہیں ہوگی؟ وہ درست ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... جب محلے والے اپنی مسجد میں اذان اور اقامت کے ساتھ ایک مرتبہ نماز ادا کرلیں تو وہاں جماعت ثانیہ کروانا شرعاً مکروہ ہے۔ جماعت ثانیہ کا ادا کرنا چونکہ جماعت اولیٰ کی سستی کا سبب ہے اور لوگوں کے دلوں سے فوتِ جماعت کا خوف نکل جانے کا سبب ہے اس لئے جماعت ثانی مکروہ ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں بریلویوں کی جماعت بشرطیکہ ان کے عقائد کفر تک نہ پہنچے ہوں کراہت کے ساتھ جائز ہے اس لئے اگر ایک دفعہ بریلویوں نے جماعت کرالی تو دوسری جماعت اسی مسجد میں کرانا جائز نہیں ہے۔ علامہ شامی رحمہ اللہ کی عبارت سے یہ مراد نہیں کہ جب ایک مسجد میں جماعت کراہت کے ساتھ کروائی گئی ہو تو دوسرے لوگ دوسری جماعت کراسکتے ہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر کسی ایسے فعل میں کراہت ہے جس کا تعلق ماہیت صلوۃ کے ساتھ ہے تو اس جماعت کا اعادہ واجب ہے۔

لما فی الکبیری(ص۔۴۷۶): یکرہ تقدیم المبتدع ایضا لانہ فاسق من حیث الاعتقاد وھو اشد من الفسق من حیث العمل لان الفاسق من حیث العمل یعترف بانہ فاسق ویخاف ویستغفر بخلاف المبتدع والمراد بالمبتدع من یعتقد شیئاً علی خلاف ما یعتقدہ اھل السنۃ والجماعۃ وانما یجوز الاقتداء بہ مع الکراھۃ اذا لم یکن مایعتقدہ یودی الی الکفر عند اھل السنۃ اما لو کان مؤدیا الی الکفر فلا یجوز اصلا.

وفی الشامیۃ(۱/۴۵۷): فیخالف تلک القاعدۃ الا ان یدعی تخصیصھا بان مرادھم بالواجب والسنۃ التی تعادبترکہ ما کان من ماھیۃ الصلاۃ واجزائھا فلا یشمل الجماعۃ لانھا وصف لھا خارج عن ماھیتھا.

وفی اعلاء السنن(۴/۲۳۲): عن عبید اللہ بن عدی بن الخیار انہ دخل علی عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ. وھو محصور، فقال: انک امام عامۃ، ونزل بک ما تری، ویصلی لنا امام فتنۃ، ونتحرج، فقال: الصلاۃ احسن ما یعمل الناس، فاذا احسن الناس فاحسن معھم، واذا اساؤوا فاجتنب اساء تھم اخرجہ البخاری(۱/۹۶)

قولہ عن عبید اللہ بن عدی الخ. دلالتہ علی صحۃ الصلاۃ خلف الفاسق من قول عثمان رضی اللہ عنہ، ظاھرۃ، والمراد بامام الفتنۃ ھو کنانۃ بن بشر البلوی احد رؤوس المصریین، فان سیف بن عمر روی حدیث الباب فی کتاب الفتوح من طریق اخری عن الزھری بسندہ فقال فیہ: دخلت علی عثمان وھو محصور وکنانۃ یصلی بالناس فقال: کیف تری؟ الحدیث.

كذا قال الحافظ في الفتح(۷/۱۵۹): وفيه دليل على كراهة الصلاة خلفه ايضاً لما فيه من قول عبيد الله بن عدى: "ونتحرج" ولما في رواية سيف بن عمر من قول يوسف الانصارى "كره الناس الصلاة خلف الذين حصروا عثمان" ولكن عثمان رضى الله عنه، انما حضهم على الصلاة خلفهم لما علم من عجز القوم عن عزلهم وبذلك تزول الكراهة عمن يقتدى به.

(۱۴۵) اہل حق کی مسجد نہ ہونے کی صورت میں بدعتیوں کے پیچھے نماز کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بندہ کے رشتہ دار کراچی کے ایک علاقہ میں رہتے ہیں وہاں قریب میں کوئی مسجد اہل حق کی نہیں ہے بلکہ تمام مساجد بدعتیوں کی ہیں۔اب نماز کا کیا حکم ہے گھر میں پڑھ لیں یا ان کی اقتداء میں مسجد جا کر پڑھیں نیز بندہ کا وہاں کبھی کبھی جانا ہوتا ہے تو بندہ کیلئے شریعت کا کیا حکم ہے؟ جبکہ بندہ آخری سال کا طالب علم ہے۔تفصیلاً وضاحت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... بہتر یہ ہے کہ اہل حق کی مساجد میں نماز ادا کی جائے اور اگر اہل حق کی مساجد وہاں قریب میں نہیں ہیں تو اس صورت میں اکیلے نماز پڑھنے سے بہتر یہ ہے کہ بدعتیوں کی مساجد میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کریں۔

لمافي كنز العمال(۲/۵۴، ۱۴۸۱۵): صلوا خلف كل بروفاجر.

وفي نصب الراية(۲/۲۸): قال عليه السلام: ((من صلى خلف عالم تقى، فكأنما صلى خلف نبى)).

وفي الدر المختار(۱/۵۶۲): وفي النهر عن المحيط، صلى خلف فاسق او مبتدع نال فضل الجماعة، وفي الشامية(قوله نال فضل الجماعة) أفاد أن الصلاة خلفهما أولى من الانفراد، لكن لا ينال، كما ينال خلف تقى ورع.

(۱۴۶) تبلیغی جماعتوں کا بریلوی ائمہ کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تبلیغی حضرات کی جماعتیں جب سہ روزہ یا چلہ وغیرہ کیلئے نکلتی ہیں تو ہر مسجد میں دن گزارتے ہیں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ یہ جماعتیں بریلوی حضرات کی مسجدوں میں چلی جاتی ہیں تو وہاں پر جماعت کے ساتھ فرض نمازیں ان کے پیچھے باجماعت نماز ادا کرتے ہیں اس وجہ سے کہ جوڑ پیدا ہو اگر علیحدہ اپنی نماز ادا کریں تو توڑ پیدا ہوگا اس مسئلہ کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمانے لگے اگر کسی شخص کو معلوم ہو کہ یہ شرک وبدعات کا ارتکاب کرتے ہیں اس کے باوجود بھی وہ شخص ان کے پیچھے نماز ادا کرے تو اس شخص کو چاہیے کہ دوبارہ کلمہ پڑھے اور اگر شادی شدہ ہے تو تجدید نکاح کرے تو آپ حضرات رہنمائی فرمائیں کہ واقعی ایسا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... بدعتی آدمی کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، جبکہ اس کے عقائد کفر تک نہ پہنچے ہوں اور لوگ اس کے معزول کرنے پر قادر ہوں لیکن اگر لوگ اس کے معزول کرنے پر قادر نہیں اور اس مسجد کے علاوہ کوئی دوسری مسجد بھی گاؤں اور محلے میں نہیں ہے تو پھر ان کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے۔ اگر بدعتی کے عقائد کفر تک پہنچے ہوں تو پھر ان کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں تبلیغی حضرات کی نمازیں بریلوی ائمہ کے پیچھے کراہت کے ساتھ ادا ہو جائیں گی بشرطیکہ اس بریلوی کے عقائد کفر تک نہ پہنچے ہوں لیکن تجدید نکاح اور دوبارہ کلمہ پڑھنے کا قول کرنا درست نہیں۔

لمافی اعلاء السنن(۲۳۲/۴): کره الناس الصلاة خلف الذين حصروا عثمان، ولكن عثمان رضي الله عنه إنما حضهم على الصلاة خلفهم لما علم من عجز القوم عن عزلهم وبذالک تزول الكراهة عمن يقتدى به.

وفى البحر الرائق(۶۱۱/۱): وأطلق المصنف فى المبتدع فشمل كل مبتدع هو من أهل قبلتنا، وقيده فى المحيط والخلاصة والمجتبى وغيرها بان لا تكون بدعته تكفره فان كانت تكفره فالصلاة خلفه لا تجوز.

وفى الدر المختار(۵۶۲/۱): وفى النهر عن المحيط: صلى خلف فاسق او مبتدع نال فضل الجماعة

قال فى الشامية (قوله نال فضل الجماعة) أفاد أن الصلاة خلفهما أولى من الانفراد لكن لا ينال كما ينال خلف تقى ورع، لحديث "من صلى خلف عالم تقى فكانما صلى خلف نبى".

وفى كبيرى(ص۴۷۶): ويكره تقديم المبتدع ايضاً لانه فاسق من حيث الاعتقاد وهو أشد من الفسق من حيث العمل لان الفاسق من حيث العمل يعترف بانه فاسق ويخاف ويستغفر بخلاف المبتدع والمراد بالمبتدع من يعتقد شيئاً على خلاف ما يعتقده أهل السنة والجماعة ....أما لو كان مؤديا الى الكفر فلا يجوز أصلا كالغلاة من الروافض.

(۱۴۷) بدعتی اور فاسق کے پیچھے پڑھی گئی نماز کے بارے میں فقہائے کرام کے اقوال (مکروہ تحریمی اور مکروہ تنزیہی) میں تطبیق

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱)۔ بدعتی، فاسق وفاجر مثلاً شرابی، زانی، ایک مشت سے کم داڑھی رکھنے والے، مماتی، بلاوجہ دوسرے پر لعن طعن کرنے والے، سودخور

الغرض کسی بھی قسم کے گناہ کبیرہ میں مبتلا شخص کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟ مکروہ تحریمی یا تنزیہی؟ جائز ہے یا ناجائز؟ اگر ناجائز یا مکروہ تحریمی ہے تو ذمہ سے فرضیت صلاۃ ساقط ہوگی یا واجب الاعادہ ہے؟ اگر واجب الاعادہ نہیں تو فقہاء کرام کی اس عبارت کا کیا مطلب: وکل صلاۃ ادیت مع کراھۃ التحریم تعاد؟ (الدر المختار، ۲/۶۴) نیز کتب فقہاء کی عبارت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ فساق کے پیچھے نماز مکروہ تنزیہی ہے، جیسا کہ مندرجہ ذیل عبارات میں ہے کہ:

قال (ویجوز امامة الاعمی والاعرابی...... والفاسق، وغیرھم احب الی) (المبسوط السرخسی: ۱/۴۰)

فالحاصل انه یکرہ لھؤلاء التقدم ویکرہ الاقتداء بھم کراھة تنزیھة الخ. (البحر الرائق، ۱/۲۱۱)

(ویکرہ) تنزیھا (امامة عبد) ...... (وفاسق واعمی) الخ. (الدر المختار، ۱/۵۵۹،۵۶۰)

دوسری بات یہ ہے کہ فقہاء احناف نے ان حضرات مذکورہ کے پیچھے نماز پڑھ لینے کو جائز قرار دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ فساق کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی نہیں مثلاً منقول ہے: باب امامة المفتون والمبتدع، وقال الحسن صل، وعلیه بدعته .... عن عبید الله بن عدی بن الخیار انه دخل علی عثمان بن عفان وھو محصور فقال انک امام عامة، ونزل بک ماتری! ویصلی لنا امام فتنة، ونتحرج فقال الصلوة...... الخ. (صحیح البخاری، ۱/۹۶)

ویکرہ تقدیم العبد...... والفاسق...... فان تقدموا جاز. (مختصر القدوری، صـ۳۵)

ویکرہ تقدیم العبد...... والفاسق...... وان تقدموا جاز. (الفقه النافع، ۱/۲۱۵)

حتی تجوز امامة العبد والاعرابی...... والفاسق وھذا قول عامة العلماء. (بدائع الصنائع، ۱/۲۲۶)

قال اما الفاسق فتجوز الصلاة خلفه لقوله علیه السلام "صلوا خلف کل بروفاجر". (المحیط البرھانی، ۲/۱۷۸)

قال المرغینانی: تجوز الصلاة خلف صاحب ھوی وبدعة. (تبیین الحقائق، ۱/۳۴۵)

قوله: (ویکرہ تقدیم العبد والاعرابی)...... قوله (والفاسق)...... (فان تقدموا جاز) لقوله علیه السلام صلوا خلف کل برو فاجر. (الجوھرة النیرة، ۱/۱۵۹)

وفی الفتاوی لو صلی خلف فاسق او مبتدع ینال فضل الجماعة الخ. البحر الرائق(۱/۲۱۰)

الصلاة خلف اھل الھواء والبدعة ان کان ھوی لا یکفر...... وھو من اھل ملّینا یجوز. (الفتاویٰ الولوالجیة، ۱/۱۲۰)

ویصح الاقتداء باھل الھواء الخ. (الخانیة علی ھامش الھندیة، ۱/۹۱)

الاقتداء باھل الھواء جائزة الخ. (خلاصة الفتاویٰ، ۱/۱۴۹)

اذا صلی رجل خلف فاسق او مبتدع ینال فضل الجماعة الخ. (کتاب التجنیس والمزید، ۲/۳)

الصلوة خلف المبتدع تجوز الافی روایة عن ابی حنیفة (الفتاوی السراجیة: صـ۱۵)
والمصلی خلف مبتدع او فاسق ینال ثواب الجماعة. (البزازیة علی هامش الهندیة: ۱/۵۵)
قال المرغینانی تجوز الصلاة خلف صاحب هوی وبدعة. (الهندیة المعروف بالفتاوی العالمگیریة: ۱/۸۴)
ان مذکورہ بالاعبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ فاسق، بدعتی کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے اور جماعت کی فضیلت حاصل ہوجاتی ہے اگر چہ مکروہ ہے، پس اس کراہت کوکراہت تنزیہہ پرمحمول کرنا چاہئے ورنہ اگر مکروہ تحریمی پرمحمول کیا جائے گا تو''کل صلاة ادیت مع کراھة التحریم تعاد'' کے خلاف ہونالازم آئے گا، کیونکہ نماز کا واجب الاعادہ ہونا بظاہر جواز صلاۃ خلف الفاسق کے منافی معلوم ہوتا ہے۔
دوسری بات یہ ہے کہ علامہ عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ نے عمدۃ الرعایۃ علی شرح الوقایۃ حاشیہ نمبر۸ صفحہ نمبر۱۵۲ پر فاسق وبدعتی کے پیچھے نماز پڑھنے کومکروہ تحریمی قراردیا ہے۔ قوله کره: الکراھة فی تقدیم الفاسق تحریمیة، وکذا المبتدع فانه اشد من الفاسق من حیث العمل الخ. (شرح الوقایة مع عمدة الرعایة، ۱/۱۵۲) اورعلامہ طحطاویؒ نے بھی اسی کے موافق لکھا۔
(فتجب إهانته شرعا فلا یعظم بتقدیمه للإمامة) تبع فیه الزیلعی ومفاده کون الکراهة فی الفاسق تحریمیة. (حاشیة الطحطاوی، صـ۳۰۳، طبع قدیمی کتب خانه)
الحاصل: حضرت علامہ عبدالحی لکھنوی وعلامہ طحطاوی رحمہما اللہ کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ فاسق وبدعتی کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، پس اگر اس قول کولیا جائے تو قاعدہ ''وکل صلاة ادیت مع کراهة التحریم تعاد'' کے مطابق نماز واجب الاعادہ ہونی چاہئے، نیز یہ کہ ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا بھی ناجائز ہو، اورفضیلت جماعت بھی حاصل نہ ہو۔
باقی دیگر فقہاء کرام کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ فاسق وبدعتی کے پیچھے نماز مکروہ تنزیہی ہے، بناء بریں ان کے پیچھے نماز پڑھنا جائز بھی ہوگا اور فضیلت جماعت بھی حاصل ہوجائے گی، اب آپ یہ بتائیں کہ ان میں کونسا قول درست ہے؟ اگر نماز مکروہ تحریمی ہے تو واجب الاعادہ ہے یانہیں، اگرنہیں تو مذکورہ قاعدہ ''وکل صلاة ادیت الخ'' کا کیا مطلب ہے؟
(۲)۔فرض کومجازاً واجب، اورواجب کومجازاً فرض کہا جاسکتا ہے یانہیں؟
الجواب حامداً ومصلیاً......فقہاء کرام کی عبارات پرآپ کے پیش کردہ اشکالات بادی النظر میں تو درست معلوم ہوتے ہیں لیکن اگر کچھ غور وفکر کریں اورتمام عبارتوں پرنظر کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ فقہاء کرام کی عبارتوں میں حقیقتاً کوئی تعارض نہیں ہے۔
دفع تعارضِ اوّل:...... جہاں فقہاء کرام نے فاسق وبدعتی کے پیچھے نماز کے مکروہ تحریمی ہونے کا قول کیا ہے وہاں فقہاء کرام نے لفظ ''تقدیم'' استعمال فرمایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے قصد واختیار سے کسی فاسق وبدعتی کو امامت کیلئے آگے کرنا، جس سے معلوم ہوا کہ کراہتِ تحریمی ''تقدیم'' کی صورت میں ہے اور جہاں مکروہ تنزیہی کا قول کیا ہے وہاں لفظ ''اقتداء یا تقدم'' استعمال فرمایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں پہلے سے فاسق وبدعتی امام موجود ہو یا خود ہی آگے بڑھ جائے جس کو ہٹانے میں فتنہ وفساد کا خوف ہو، اور پھر اس کی اقتداء میں نماز پڑھی جائے، جس سے واضح ہوا کہ کراہت تنزیہی محض ''اقتداء'' کی صورت میں ہے تو دونوں صورتیں الگ ہیں جس کی وجہ

سے دونوں کا حکم بھی الگ ہے فلا تعارض بینهما۔

دفع تعارضِ ثانی:......فقہاء کرام نے جس مکروہ تحریمی کی وجہ سے اعادۂ صلوۃ کا حکم دیا ہے اس کے بارے میں علامہ شامی علیہ الرحمہ نے یہ صراحت فرمائی ہے کہ یہ اس صورت میں ہے جب کراہت ماہیتِ صلوۃ میں ہو، اور جماعت ماہیتِ صلوۃ میں داخل نہیں ہے لہٰذا بدعتی کے پیچھے نماز پڑھنے میں جو کراہتِ تحریمی آئی ہے وہ ماہیتِ صلاۃ میں داخل نہیں ہے (دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر کوئی مسجد کی جماعت بلا عذر ترک کر کے انفراداً پڑھے تو مکروہ تحریمی ہے اس کے باوجود فقہاء نے اس کے اعادہ کا حکم نہیں دیا جس سے واضح ہوا کہ جماعت ماہیتِ صلوۃ میں داخل نہیں ہے) لہٰذا فاسق و بدعتی کے پیچھے نماز پڑھنے کی صورت میں اعادہ بھی واجب نہیں ہے اگرچہ مکروہ تحریمی ہے۔ فاندفع الاشکال۔

(۲)۔فرض کو واجب کی جگہ اور واجب کو فرض کی جگہ مجازاً استعمال کیا جاتا ہے۔

لمافی الشامیة (۱/۵۶۰): بل مشی فی شرح المنیة علی أن کراهة تقدیمه کراهة تحریم لما ذکرنا قال: ولذا لم تجز الصلاة خلفه أصلاً عند مالک ورواية عن أحمد.

وفی الشامية (۱/۴۵۷): أقول: وقد ذکر فی الا مداد بحثا ان کون الإعادة بترک الواجب واجبة لا یمنع أن تکون الإعادة مندوبة بترک سنة...... بل قال فی فتح القدیر: والحق التفصیل بین کون تلک الکراهة کراهة تحریم فتجب الإعادة أو تنزیه فتستحب. بقی هنا شئی وهو أن صلاة الجماعة واجبة علی الراجح فی المذهب أو سنة مؤکدة فی حکم الواجب کما فی البحر وصرّحوا بفسق تارکها وتعزیره وأنه یأثم ومقتضی هذا أنه لو صلی منفرداً یؤمر بإعادتها بالجماعة وهو مخالف لما صرّحوا به فی باب ادراک الفریضة من أنه لوصلی ثلاث رکعات من الظهر ثم اقیمت الجماعة یتم ویقتدی متطوعاً، فإنه کالصریح فی أنه لیس له إعادة الظهر بالجماعة مع أن صلاته منفرداً مکروهة تحریماً أو قریبة من التحریم فیخالف تلک القاعدة إلا أن یدعی تخصیصها بأن مرادهم بالواجب والسنة التی تعاد بترکه ما کان من ماهیة الصلاة وأجزائها فلا یشمل الجماعة لأنها وصف لها خارج عن ماهیتها. أو یدعی تقیید قولهم یتم ویقتدی متطوعاً بما إذا کانت صلاته منفرداً لعذر کعدم وجود الجماعة عند شروعه فلا تکون صلاته منفرداً مکروهة. والأقرب الأول ولذا لم یذکروا الجماعة من جملة واجبات الصلاة لأنها واجب مستقل بنفسه خارج عن ماهیة الصلاة و یؤیده أیضاً أنهم قالوا یجب الترتیب فی سور القرآن فلو قرأ منکوساً أثم لکن لا یلزمه سجود السهو لأن ذلک من واجبات القراءة لامن واجبات الصلاة کما ذکره فی البحر فی باب السهو لکن قولهم کلّ صلاة ادیت مع کراهة التحریم یشمل ترک الواجب وغیره، ویؤیده

ماصرّحوا به من وجوب الإعادة بالصلاة فی ثوب فیه صورة بمنزلة من یصلی وهو حامل الضم.

وفی حاشیة الطحطاوی(ص۳۰۳): قوله فتجب إهانته شرعاً فلا یعظم بتقدیمه للإمامة) تبع فیه الزیلعی: ومفاده کون الکراهة فی الفاسق تحریمیة.

وفی البحر الرائق(۱/ ۲۱۱): فالحاصل أنه یکره لهولاء التقدم ویکره الإقتداء بهم کراهة تنزیهة فإن أمکن الصلاة خلف غیرهم فهو أفضل وإلا فالإقتداء أولی من الإنفراد، وینبغی أن یکون محل کراهة الإقتداء بهم عند وجود غیرهم وإلا فلا کراهة کمالا یخفی.

وفی الشامیة (۱/ ۹۵): ثم إن المجتهد قد یقوی عنده الدلیل الظنی حتی یصیر قریبا عنده من القطعی، فماثبت به یسمیه فرضا عملیّا لأنه یعامل معاملة الفرض فی وجوب العمل، ویسمی واجباً نظراً إلی ظنّیة دلیله ...... وفی التلویح أن إستعمال الفرض فیما ثبت بظنی والواجب فیما ثبت بقطعی شائع مستفیض فلفظ الواجب یقع علی ماهو فرض علما وعملاً کصلاة الفجر.

فصل فی المسبوق واللاحق

(مسبوق اور لاحق کے مسائل کا بیان)

(۱۴۸) امام کے رکوع سے سر اُٹھا لینے کے بعد جماعت میں شامل ہونے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱)۔امام جب رکوع سے قیام کی طرف آ جائے اور اب تک تکبیر نہ کہی ہو۔اسی دوران کوئی مقتدی آ کر نماز کی نیت کر کے رکوع بھی امام کے تکبیر کہنے سے قبل ادا کر کے قیام کی طرف آ جائے تو یہ کیسا ہے؟

(۲)۔مقتدی (مسبوق) کے رکوع کا وقت امام کے رکوع سے اٹھنے پر ختم ہوتا ہے یا تکبیر کہنے پر یا دونوں کے جمع ہونے پر؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... مقتدی کے رکوع کا وقت امام کے رکوع سے اٹھنے پر ختم ہو جاتا ہے۔امام جب رکوع سے قیام کی طرف آ جائے اس وقت مقتدی رکوع میں شامل ہوا تو مقتدی کی اس رکعت کو شمار نہیں کیا جائے گا،مقتدی مسبوق کہلائے گا،کیونکہ امام کے ساتھ افعال میں مشارکت ضروری ہے،اور امام کے رکوع سے سر اٹھانے کی وجہ سے مشارکت نہیں پائی گئی۔

لمافی الدر المختار (۲/۲۰): (ولو اقتدى بإمام راكع فوقف حتى رفع الإمام رأسه لم يدرك المؤتم (الركعة) لأن المشاركة في جزء من الركن شرط ولم توجد فيكون مسبوقا فياتي بها بعد فراغ الامام بخلاف مالو أدركه في القيام ولم يركع معه فإنه يصير مدركاً لها فيكون لاحقاً.

(۱۴۹) امام کو آخری رکعت میں پا لینے والے شخص کیلئے بقیہ نماز پڑھنے کا طریقہ

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱)۔اگر کوئی شخص امام کے ساتھ آخری رکعت پالے چار رکعت والی نماز میں،تو نماز پورا کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

(۲)۔اگر کوئی شخص اس کے بعد والی رکعت پر نہ بیٹھے بلکہ دو رکعت کے بعد بیٹھے اور تشہد پڑھ کر آخری رکعت کے لئے اٹھے تو اس کی نماز درست ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......(۱)۔جو شخص چار رکعت والی نماز میں امام کے ساتھ ایک رکعت پائے وہ باقی نماز اس طرح ادا کرے کہ پہلی رکعت میں ثناء،تعوذ،تسمیہ،فاتحہ پڑھے اور ساتھ سورت ملائے اس رکعت میں دوسرے سجدہ کے بعد قعدہ اولیٰ میں بیٹھے اور تشہد پڑھے۔

پھر دوسری رکعت میں تسمیہ پڑھے قرأت کرے پہلی رکعت کی طرح لیکن قعدہ نہ کرے، تیسری رکعت میں صرف فاتحہ پڑھے اور باقی نماز پوری کرے۔

(۲)۔اگر کوئی بعد والی رکعت پر نہ بیٹھے تو اس پر سجدہ سہو واجب ہوگا اگر سجدہ سہو ترک کر دیا تو نماز واجب الاعادہ ہوگی۔

لمافی بدائع الصنائع(۲/۱۶۵): ولو ادرک مع الامام رکعة فی ذوات الأربع، فقام إلى القضاء. قضى ركعةً يقرأ فيها بفاتحة الكتاب وسورة ويتشهد ثم يقوم فيقضي ركعةً أخرى يقرأ فيها بفاتحة الكتاب وسورة،ولوترک القراء ة فی إحداهما تفسد صلاته لما قلنا وفی الثالثة هو بالخيار والقراء ة أفضل لما عرف.

وفی الشامية(۱/۵۹۷): وفی الفيض عن المستصفى: لو أدركه فی ركعة الرباعی يقضی ركعتين بفاتحة وسورة ثم يتشهد ثم يأتی بالثالثة بفاتحة خاصة اهـ عند أبی حنيفة وقالا: ركعة بفاتحة وسورة وتشهد ثم ركعتين اولاهما بفاتحة وسورة و ثانيتهما بفاتحة خاصة اهـ وظاهر كلامهم اعتماد قول محمد.

(قوله وتشهد بينهما): قال فی شرح المنية ولو لم يقعد جاز استحساناً لا قياساً ولم يلزمه سجود السهو لكون الركعة أولى من وجه.

وفی تقريرات الرافعی على الشامية (۱/۷۷): (قوله ولو لم يقعد جاز الخ) المراد بالجواز الصحة بلا اثم نظراً لكون الركعة التی صلاها أولىٰ من وجه لا أصل الصحة اذهی قياس أيضا اذ التشهد واجب ولا الحل بلا كراهة أصلا اذ هی متحققة ثم ظهر أن المراد أنه ترک القعود بينهما اصلا لا التشهد فقط فالقياس الفساد عندهما لأنه هو القعود الأخير.

(۱۵۰) مسبوق کا امام کے سجدہ سہو کرنے کے بعد نماز میں شریک ہونا

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کل رات نماز عشاء میں ہمارے امام صاحب نے کسی غلطی کی بنا پر سجدۂ سہو کیا تو اس وقت ایک آدمی نماز میں شریک ہوا لیکن وہ شخص سجدۂ سہو میں شریک نہیں ہوسکا بلکہ سجدۂ سہو ہو جانے کے بعد نماز میں آکر ملا، آیا اس طرح اس کی نماز ہوگئی؟ اور کیا مسبوق آدمی سجدۂ سہو کے بعد بھی جماعت میں شرکت کرسکتا ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......صورت مسئولہ میں مذکورہ شخص کی نماز ہوجائے گی اور مسبوق آدمی سجدۂ سہو کے بعد بھی جماعت میں شرکت کرسکتا ہے۔

لمافی الهندية(۱/۱۲۸): ولايشترط ان يكون مقتديا به وقت السهو حتى لوأدرک الامام بعدما

سها يلزمه ان يسجد مع الامام تبعاله ولو دخل معه بعدما سجد سجدة السهو يتابعه فى الثانية ولا يقضى الأولىٰ وان دخل معه بعد ما سجدهما لا يقضيهما كذا فى التبيين.

وفى الدر المختار (۸۲/۲): (والمسبوق يسجد مع امامه مطلقا) سواء كان السهو قبل الاقتداء أو بعده (ثم يقضى مافاته).

(وفى الشامية تحته): (قوله سواء كان السهو قبل الاقتداء أو بعده) بيان للاطلاق وشمل أيضا ماإذا سجد الامام واحدة ثم اقتدى به قال فى البحر فانه يتابعه فى الاخرى ولا يقضى قضاء الاولى كما لا يقضيهما ولو اقتدى به بعدما سجدهما.

(۱۵۱) مسبوق کیلئے امام کے ساتھ قعدہ آخیرہ میں درود شریف پڑھنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسبوق درود شریف وغیرہ بھی پڑھے گا یا صرف تشہد پڑھے گا؟

الجواب حامداًومصلیاً..... مسبوق کو قعدہ اخیرہ میں درود شریف اور دعا وغیرہ نہیں پڑھنا چاہئے، بلکہ تشہد کو اس طرح ٹھہر ٹھہر کر پڑھے کہ امام کے سلام تک اس سے فارغ ہو، اگر پہلے فارغ ہوجائے تو کلمۂ شہادت کو مکرر پڑھتا رہے یا پھر خاموش بیٹھا رہے۔

لمافى الهندية(۹۱/۱): ان المسبوق ببعض الركعات يتابع الامام فى التشهد الاخير واذا أتم التشهد لايشتغل بما بعده من الدعوات ثم ماذا يفعل تكلموا فيه ومن ابن شجاع انه يكرر التشهد اى قوله اشهد والصحيح ان المسبوق يترسل فى التشهد حتى يفرغ عند سلام الامام.

وفى الدر المختار(۵۱۱/۱): واما المسبوق فيترسل ليفرغ عند سلام امامه. وقيل يتم، وقيل يكرر كلمة الشهادة.

(وفى الشاميه تحته): (قوله فيترسل) اى يتمهل وهذاماصححه فى الخانية وشرح المنية فى بحث المسبوق من باب السهو وباقى الاقوال مصحح ايضاً. قال فى البحر وينبغى الافتاء بما فى الخانية كما لا يخفى...... و هذا فى قعدة الامام الاخيرة كما هو صريح.قوله: ليفرغ عند سلام امامه واما فيما قبلها من القعدات فحكمه السكوت كما لايخفى.

(۱۵۲) تشہد میں مسبوق کا درود شریف پڑھنا

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسبوق قعدہ میں تشہد پڑھنے کے بعد خاموش رہے یا

درود شریف وغیرہ پڑھے۔ نیز اگر قدیم اور جدید قضاء نمازیں جمع ہوں تو کیا ترتیب ساقط ہوگی۔ مثلاً زید دس سال سے مسلسل نماز پڑھ رہا ہے۔ جبکہ اس سے پہلے اس کے ذمے بہت سی قضاء نمازیں ہیں۔ اب پھر اس سے ایک نماز چھوٹ گئی تو اس پر صاحب ترتیب کے احکام تو لاگو نہیں ہوں گے؟ شریعت اس بارے میں کیا کہتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں مسبوق امام کے ساتھ قعدہ آخیرہ میں تشہد پڑھنے کے بعد درود شریف نہ ملائے بلکہ بہتر یہ ہے کہ تشہد کو اتنا آہستہ پڑھے کہ امام کے سلام پھیرنے تک مکمل کرے اور اگر پڑھ چکا ہے تو شہادتین کو لوٹاتا رہے۔ ایسا شخص جس کی قدیم نمازیں باقی ہوں تو ایسے شخص کو سب سے پہلے اپنی فوت شدہ نمازوں کی فکر کرنی چاہئے۔ جتنا جلد ممکن ہو فوت شدہ نمازوں کو ادا کرلے۔ تاہم ایسا شخص صاحب ترتیب نہیں کہلائے گا۔

لما فی الهندية(۱/۱ ۹):ومنها ان المسبوق ببعض الركعات يتابع الامام في التشهد الاخير و اذا اتم التشهد لا يشتغل بما بعده من الدعوات ثم ما ذا يفعل تكلموا فيه وعن ابن شجاع انه يكرر التشهد اى قوله أشهد ان لا اله الا الله وهو المختار كذا فى الغياثية والصحيح أن المسبوق يترسل فى التشهد حتى يفرغ عند سلام الامام كذا فى الوجيز للكردرى وفتاوىٰ قاضى خان وهكذا فى الخلاصة وفتح القدير.

وفى الشامية(۲/۲۹): (قوله أوقديمة على المعتمد الخ) كما لو ترك صلاة شهر نسقا ثم أقبل على الصلاة ثم ترك فائتة حادثة فان الوقتية جائزة مع تذكر الفائتة الحادثة لانضمامها إلى الفوائت القديمة وهى كثيرة فلم يجب الترتيب وقال بعضهم إن المسقط الفوائت الحديثة لا القديمة ويجعل الماضى كأن لم يكن زجراً له عن التهاون بالصلوات فلا تجوز الوقتية مع تذكرها وصححه الصدر الشهيد. وفى التجنيس وعليه الفتوى وذكر فى المجتبى ان الأول أصح وفى الكافى والمعراج وعليه الفتوىٰ فقد اختلف التصحيح والفتوى كما رأيت والعمل بما وافق إطلاق المتون اولىٰ.

(۱۵۳) ایک یا دو رکعات نکل جانے کی صورت میں تلاوت والی رکعت کس طرح ادا کی جائے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ہم فرض نماز امام کے ساتھ پڑھیں، اور ہماری ایک یا دو رکعت نکل جائے تو اب تلاوت والی رکعت کس طرح ادا کی جائے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں امام کے سلام پھیرنے کے بعد آپ کی بقیہ نماز ''تلاوت'' کے بارے میں شروع کی نماز ہوگی اور ''قعدہ وتشہد'' کے سلسلے میں آخر کی نماز ہوگی یعنی آپ امام کے سلام کے بعد جو رکعت پڑھیں گے اس میں پہلی رکعت کی طرح تلاوت

کریں گے پھر دوسری رکعت میں دوسری رکعت کی طرح تلاوت کریں اور امام کے بعد جو آپ نے دو رکعتیں ادا کیں ہیں اس کے بعد جو قعدہ کریں گے (تشہد پڑھیں گے) وہ آخری ہوگا۔

لمافی الهندية (۱/۹۱): ومنها أنه يقضي أول صلاته في حق القراء ة وآخرها في حق التشهد حتى لوادرك ركعة من المغرب قضى وفصل ركعتين بقعدة فيكون بثلاث قعدات وقرأ في كل فاتحة وسورة.

(۱۵۴) مسبوق اپنی چھوٹی ہوئی رکعات میں قرأت کیوں کرتا ہے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فرض کی آخری دو رکعت میں سورۃ کی قرأت نہیں کی جاتی، لیکن جب کوئی امام کے ساتھ دو رکعت کے بعد شریک ہوتا ہے اور جب وہ اپنی اگلی دو رکعت امام کے سلام پھیرنے کے بعد پڑھتا ہے تو اسے حکم دیا جاتا ہے کہ سورۃ بھی پڑھو، اور اگر کوئی سورۃ پڑھنا بھول جاتا ہے تو اسے سجدۂ سہو کا حکم ہوتا ہے۔ براہ کرم اس کی وجہ ذرا وضاحت کے ساتھ بتادیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ اپنے دین کی خدمت میں لگائے رکھے۔

الجواب حامداًومصلیاً...... اگر کوئی شخص امام کے ساتھ دو رکعت کے بعد شریک ہوتا ہے تو اس کی یہ دو رکعتیں آخری دو رکعتیں شمار ہوتی ہیں اس لئے امام کے سلام کے بعد جو دو رکعت وہ پڑھتا ہے یہ اس کی پہلی دو رکعتیں شمار ہوتی ہیں، اور فرض کی پہلی دو رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورت ملانا واجب ہے اس لئے ان دو رکعتوں میں اس کو سورت پڑھنے کا حکم دیا جاتا ہے اور اگر سورت پڑھنا بھول جائے تو چونکہ ان دو رکعتوں میں سورت فاتحہ کے ساتھ سورت کا ملانا واجب ہے تو اس واجب کو چھوڑنے کی وجہ سے اس کو سجدۂ سہو کا حکم دیا جاتا ہے۔

لمافی الهندية (۱/۷۱): الفصل الثاني في واجبات الصلاة. يجب تعيين الاوليين من الثلاثية والرباعية المكتوبتين للقراء ة المفروضة حتى لوقرأ في الاخريين من الرباعية دون الاوليين اوفي احدى الاوليين واحدى الاخريين ساهياً وجب عليه سجود السهو كذا في البحر الرائق: وتجب قراءة الفاتحة وضم السورة أوما يقوم مقامها من ثلاث آيات قصاراو آية طويلة في الاوليين بعد الفاتحة كذا في النهر الفائق ...... وكذا ما يقضيه المسبوق بعد فراغ الامام أول صلاته عندنا.

وفي الشامية(۱/۴۴۶): (قوله ومنها القراء ة) اى قراء ة آية من القرآن وهي فرض عملي في جميع ركعات النفل والوتر وفي ركعتين من الفرض...... واما تعيين القراء ة في الاوليين من الفرض فهو واجب ...... واما قراء ة الفاتحة والسورة أو ثلاث آيات فهي واجبة ايضاً.

وفي الدرالمختار(۱/۵۹۶): (والمسبوق من سبقه الامام بها أو ببعضها وهو منفرد) حتىٰ يثنى و يتعوذ ويقرأ ...... (فيما يقضيه) اى بعد متابعته لامامه، فلو قبلها فالا ظهر الفساد ويقضي اول صلاته

فی حق قراء ۃ، واخرھا فی حق تشھد،

وفیه ایضاً(۲/۸۳): (ثم یقضی مافاته) ولو سھا فیه سجد ثانیاً.

(قوله ولو سھا فیه) ای فیما یقضیه بعد فراغ الامام یسجد ثانیاً لانه منفرد فیه والمنفرد یسجد لسھوه.

(۱۵۵) مسبوق کو بھی سجدہ سہو میں امام کے ساتھ شریک ہونا ضروری ہے

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص یعنی مسبوق امام کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہے، امام نے جیسے ہی سجدہ سہو کیلئے دائیں طرف سلام پھیر لیا تو وہ فوراً کھڑا ہوگیا، لیکن امام بائیں طرف سلام پھیر کر سجدۂ سہو میں چلا گیا تو کیا یہ مسبوق بھی امام کے ساتھ سجدہ سہو میں چلا جائے؟ اور مسبوق پر اس طرح فعل کرنے سے سجدہ سہو لازم آتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً......صورت مسئولہ میں مسبوق کو بھی سجدہ سہو میں امام کے ساتھ شریک ہونا ضروری ہے۔ البتہ اس کے کھڑے ہونے اور بیٹھنے کی وجہ سے اس پر سجدہ سہو لازم نہیں ہوگا۔

لمافی الهندیة(۱/۱۲۸): ولوسلم الامام فقام المسبوق ثم تذکر الامام ان علیه سهواً فسجد له قبل ان یقید المسبوق الرکعة بسجدة فعلیه ان یرفض ذلک ویعود الی متابعته ثم اذا سلم الامام قام الی القضاء ولا یعتد بما فعل من القیام والقراء ۃ والرکوع ولو لم یعد الی متابعة الامام ومضی علی قضائه فانه تجوز صلوته ویسجد للسھو بعد فراغه استحسانا.

وفی الشامیة (۱/۵۹۸) : والحاصل انه اذا لم یقید ماقام الیه بسجدة لم یصر منفردا ویرتفض فلولم یتابع امامه فسدت صلوته وقد اطلق الفساد هنا فی الفتح وغیره لکن فصل فی الذخیرة فی تذکر التلاویة بانه ان لم یتابع الامام فیها ینظران وجد منه قیام وقراء ۃ بعد فراغ الامام من القعدة الثانیة مقدار ماتجوز به الصلوة جازت صلوته والا فلا.

وفی الدر المختار (۱/۵۹۸) وهذا کله قبل تقیید ماقام الیه بسجدة اما بعده فتفسد فی صلبیة مطلقا وکذا فی تلاویة وسهو ان تابع والا لا.

(۱۵۶) مسبوق اپنی بقیہ رکعات کیلئے کب کھڑا ہو؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک دوست ہے جب وہ کبھی مسبوق ہوتا ہے تو امام کے سلام پھیرتے ہی وہ فوراً کھڑا ہو جاتا ہے تو امام کے سلام کے کتنی دیر بعد مسبوق کو اُٹھنا چاہئے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......آپ کے دوست کو امام کے سلام پھیرتے ہی فوراً کھڑا نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ امام کی فراغت کا انتظار کرے تاکہ امام پر سجدہ سہو ہونے کی صورت میں یہ اس میں شریک ہو سکے۔

لمافی الهندية (۹۱/۱): انه لايقوم الى القضاء بعد التسليمتين بل ينتظر فراغ الامام.

وفي الدرالمختار (۵۹۷/۱): وينبغي أن يصبر حتى يفهم أنه لاسهو على الامام.

وفي الشامية تحته: (قوله وينبغي أن يصبر الخ) أي لايقوم بعد التسليمة أو التسليمتين بل ينتظر فراغ الامام بعدهما كما في الفيض والفتح والبحر: قال الزند ويستى في النظم يمكث حتى يقوم الامام الى تطوعه أويستند الى المحراب ان كان لاتطوع بعدها، قال في الحلية: وليس هذا بلازم بل المقصود مايفهم أن لاسهو على الامام أو يوجد له مايقطع حرمة الصلاة.

(۱۵۷) مسبوق پر امام کی سورتوں کی ترتیب کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی جماعت میں شامل ہوا اس وقت ایک رکعت مکمل ہو چکی تھی، امام نے پہلی رکعت میں سورۃ الشمس اور دوسری میں سورۃ والیل پڑھی ہے یہ شخص امام کے سلام پھیرنے کے بعد اپنی رکعت پوری کرے گا، اب اس مسبوق کیلئے سورتوں کی ترتیب ضروری ہے کہ نہیں یا یہ کوئی بھی سورت مثلاً اخلاص، کافرون وغیرہ پڑھ سکتا ہے؟ ترتیب کو الٹنے سے کراہت آئے گی یا نہیں جبکہ مکمل نماز میں سورتوں کی ترتیب ضروری ہے ورنہ کراہت آتی ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً......مسبوق پر امام کی سورتوں کی ترتیب ضروری نہیں ہے اس لئے کہ مسبوق اپنی بقیہ نماز میں منفرد کے حکم میں ہوتا ہے۔

لمافي المبسوط السرخسي (۱۸۶/۱): لان المسبوق فيما يقضي كالمنفرد حتى تلزمه القراءة وسجود السهو اذا سها.

وفي الدرالمختار (۵۹۶/۱): والمسبوق من سبقه الامام بها او ببعضها وهو منفرد.

(۱۵۸) مسبوق اگر اپنی پہلی رکعت میں سورت نہ ملائے تو اس کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دن میں ظہر کی نماز میں تاخیر سے پہنچا اور جماعت کھڑی تھی، میں جماعت میں شریک ہوا، اور ایک رکعت مل گئی امام صاحب کے سلام پھیرنے کے بعد میں نے بقایا تین رکعات اس طرح پڑھیں کہ پہلی رکعت میں صرف الحمد شریف پڑھی اور قعدہ کر لیا اس کے بعد دو رکعات میں الحمد کے ساتھ سورۃ بھی ملا لی۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا اس طریقے سے میری نماز ادا ہو گئی ہے یا دوبارہ پڑھنا ضروری ہے نیز اس کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں جب آپ امام کے ساتھ آخری رکعت میں شریک ہوئے تو بقیہ نماز ادا کرنے کا صحیح طریقہ یہ تھا کہ آپ امام کے سلام پھیرنے کے بعد پہلی اور دوسری رکعت میں الحمد شریف کے ساتھ دوسری کوئی سورت ملاتے اور اگر پہلی رکعت میں ملانا بھول گئے تو آخر میں سجدہ سہو کرتے لیکن چونکہ آپ نے اس طرح نہیں کیا، لہٰذا آپ پر دوبارہ نماز پڑھنا واجب اور ضروری ہے اگر آپ دوبارہ نماز نہیں لوٹائیں گے تو گناہگار رہوں گے۔

لما فی خلاصة الفتاویٰ(۱/۱۶۵، ۱۶۶): والمسبوق فيما يقضي يقضي اول صلاته فی حق القراءة واخر صلوته فی حق التشهد حتی لو ادرک مع الامام رکعة من المغرب ثم قام الی قضائه بعد تسليم الامام فانه يقضی رکعتين ويقرأ فی رکعة بالفاتحة والسورة ولو ترک القراءه فی احداهما تفسد صلوته وعليه ان يقضی رکعة ويتشهد ثم رکعة اخری ويتشهد ويسلم.

وفی الشامية(۱/۴۵۹): اعلم ان فی محل القراءة المفروضه فی الفرض ثلاثة اقوال الاول ان محلها الرکعتان الاوليان عينا وصححه فی البدائع. الثانی ان محلها رکعتان منها غير عين: ای فيکون تعيينها فی الاولیين واجبا وهو المشهور فی المذهب الثالث ان تعيينها فيهما افضل وعليه مشی فی غاية البيان وهو ضعيف والقولان الاولان اتفقا علی ان لو قرأ فی الاخريين فقط يصح ويلزمه سجود السهو لو ساهيا لکن سببه علی الاول تغيير الفرض عن محله وتکون قراءته قضاء عن قرأته فی الاولیين وسببه علی الثانی ترک الواجب وتکون قراءته فی الاخريين اداء...... والحاصل انه قيل ان محل القراءة رکعتان من الفرض غير عين وکونها فی الاولیين افضل وقيل ان محلها الاوليان منه عينا فيجب کونها فيهما وهو المشهور فی المذهب الذی عليه المتون وهو المصحح وعلمت تأييده بما مرفی عبارة البحر عن البدائع من مسألة المسافر والمسبوق وقال القهستانی: انه الصحيح من مذهب اصحابنا.

وفيه ايضاً(۱/۴۵۶): (ولها واجبات) لا تفسد بترکها وتعاد وجوبا فی العمد والسهو ان لم يسجد له وان لم يعدها يکون فاسقا آثما وکذا کل صلاة اديت مع کراهة التحريم تجب اعادتها.

(۱۵۹) مسبوق امام کے ساتھ سجدۂ سہو کرے گا یا نہیں؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص ایک یا دو رکعات کے بعد امام کیساتھ شریک ہوا امام نے آخری رکعت میں سجدہ سہو کیلئے سلام پھیرا اور سجدہ سہو کیا تو پیچھے اس مسبوق نے بھی امام کیساتھ سلام پھیر دیا اور بعد میں کھڑے ہو کر اپنی نماز پوری کرلی، اب سوال یہ ہے کہ مسبوق کے امام کیساتھ سلام پھیرنے سے مسبوق کی نماز ادا ہوئی یا نہیں؟ اور اس پر سجدۂ سہو

واجب تو نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ مسبوق سجدہ سہو میں تو امام کی متابعت کریگا یعنی سجدہ سہو امام کیساتھ ادا کریگا البتہ سلام میں امام کی متابعت نہیں کریگا یعنی بغیر سلام پھیرے امام کیساتھ سجدہ میں جائیگا، اب صورت مسئولہ کو سمجھئے اگر مسبوق نے امام کیساتھ سلام پھیر لیا تو پھر اگر قصداً سلام پھیرا ہے (یہ بات یاد ہو کہ میری نماز باقی ہے) تو اسکی نماز فاسد ہوگئی اور اگر قصداً سلام نہیں پھیرا تو نماز فاسد نہ ہوگی اور سجدہ سہو بھی لازم نہ ہوگا، اسی طرح جب امام نماز ختم کرنے کیلئے سلام پھیرے تو اس سلام میں بھی مسبوق امام کی متابعت نہ کرے اگر اس آخری سلام میں مسبوق نے امام کیساتھ قصداً سلام پھیر لیا (یہ بات یاد ہو کہ میری نماز باقی ہے) تو اسکی نماز فاسد ہو جائیگی اور اگر سہواً سلام پھیرا تو نماز فاسد نہ ہوگی اور یہ سلام جو مسبوق نے سہواً پھیرا ہے اگر یہ سلام، امام کے سلام سے کچھ پہلے یا متصل واقع ہوا ہو تو مسبوق پر اپنی نماز کے آخر میں سجدہ سہو لازم نہیں ہوگا کیونکہ مسبوق مقتدی کے حکم میں ہے اور امام کے ساتھ مقتدی جب سہو کرلے تو اس پر سجدہ سہو لازم نہیں ہوتا البتہ اگر مسبوق نے امام کے سلام پھیرنے کے بعد سلام پھیرا تو اپنی نماز کے آخر میں اس پر سجدہ سہو لازم ہوگا کیونکہ اب یہ منفرد ہو گیا۔

لمافی الشامیة (۲/۸۲): (قوله، والمسبوق یسجدمع امامه) قیدبالسجود لانه لایتابعه فی السلام بل یسجدمعه ویتشهدفاذاسلم الامام قام الی القضاء فان سلم فان کان عامدافسدت والالاولاسجود علیه ان سلم سهواقبل الامام اومعه وان سلم بعده لزمه لکونه منفردا حینئذ.

(۱۶۰) مسبوق کا اپنی بقیہ رکعات میں قرأت بھول جانے پر سجدۂ سہو نہ کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص ظہر کی نماز میں دو رکعت کے بعد آکر جماعت میں شریک ہوا، اور جب امام نے سلام پھیر دیا تو کھڑے ہو کر اپنی بقیہ دو رکعت پڑھنے لگا، ان دو رکعت میں وہ سورۂ فاتحہ کے بعد سورت پڑھنا بھول گیا۔ لیکن چونکہ اس نے آخری دو رکعت امام کے ساتھ پڑھیں تھیں اس وجہ سے اس نے ان دو رکعتوں میں چھوٹنے والی سورۃ کی وجہ سے سجدۂ سہو نہیں کیا تو آیا اس کی نماز ہوگئی؟ یا اس کا اعادہ کرنا لازم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......مسبوق آدمی (جس کی ابتداءً امام سے کچھ رکعتیں رہ گئی ہوں) وہ بقیہ رکعتوں کی ادائیگی میں منفرد یعنی اکیلے نماز پڑھنے والے کے حکم میں ہوتا ہے اور جب وہ بقیہ رکعتوں کی ادائیگی کرے تو اس کے ذمہ پہلی دو رکعتوں میں سورۃ الفاتحہ کے ساتھ کوئی دوسری سورۃ ملانا واجب ہے اسی طرح اگر اس سے کچھ سہو ہو جائے اپنی بقیہ رکعتوں کی ادائیگی میں تو اس پر سجدہ سہو کرنا بھی لازم ہوتا ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں مذکورہ شخص پر واجب کے ترک یعنی پہلی دو رکعتوں میں سورت چھوڑنے کی بناء پر نماز کا اعادہ کرنا واجب ہے اور مذکورہ شخص کا اس بات کو علت ومدار بنانا کہ میں نے چونکہ آخری دو رکعتیں امام کے ساتھ پڑھی تھیں اس لئے سجدہ سہو نہیں کیا یہ بات صحیح نہیں۔

لمافی المبسوط للامام السرخسی (۱/۲۲۰): قال وان سها عن القراءة فی الاولیین فعلیه سجود

السهو لان القراءة ركن والاوليان تعينتا لاداء هذا الركن واجبا وبترك الواجب يتمكن النقصان في الصلاة.

وفي الهندية (۱/۹۱): ولو ادرك ركعتين قضى ركعتين بقراءة ولو ترك في احدٰهما فسدت،

وفي (صـ۱۲۶): ولا يجب السجود الا بترك واجب او تاخيره.......... ولو قرأ الفاتحة وحدها وترك السورة يجب عليه سجود السهو وكذا لو قرأ مع الفاتحة آية قصيرة كذا في التبيين.

(۱۶۱) سجدہ میں سو جانے اور نیند یا کسی اور وجہ سے مقتدی کے لاحق ہو جانے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں دکان پر کام کرتا ہوں اور رات دیر تک دکان کھلی رہتی ہے اس لئے صبح کبھی کبھی نیند کا غلبہ ہوتا ہے آج صبح کی نماز میں میں پہلے سجدہ میں سو گیا اور جب آنکھ کھلی تو امام صاحب کھڑے تھے میں بھی کھڑا ہو گیا اور آخر میں امام صاحب کے سلام پھیرنے کے بعد سجدہ سہو کر کے نماز پوری کر لی تو میری یہ نماز ہوئی یا نہیں؟ نہیں ہوئی تو کس طرح ادا کروں از سر نو ادا کروں یا آخر میں امام کے سلام کے بعد سجدہ سہو کر کے ادا کروں۔ تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں جب آپ سجدہ میں سو گئے، اگر اس حالت میں سجدہ کی مسنون کیفیت برقرار نہ رہی تو اس سے آپ کا وضو ٹوٹ گیا، اور نماز بھی جاتی رہی۔ سجدہ کی مسنون کیفیت سے مراد یہ ہے کہ حالت سجدہ میں انسان کا پیٹ رانوں سے اور بازو پہلوؤں سے الگ رہیں اور اگر سجدہ کی مسنون کیفیت برقرار رہی، تو آنکھ کھلنے پر آپ کو چاہئے تھا کہ پہلے دوسرا سجدہ جو آپ سے چھوٹ گیا تھا، ادا کرتے اور پھر امام کے ساتھ رکعت میں شریک ہو جاتے، تو آپ کی نماز درست ہو جاتی، لیکن آپ نے ایسا نہ کیا۔ پھر بھی اگر آپ امام کے سلام پھیرنے کے بعد چھوٹا ہوا سجدہ ادا کر کے سلام پھیر دیتے، تب بھی آپ کی نماز درست ہو جاتی۔ لیکن چونکہ آپ نے ان صورتوں میں سے کوئی بھی صورت اختیار نہ کی بلکہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد سجدہ سہو کیا، حالانکہ سجدہ سہو سے فرض کا تدارک نہیں ہوتا، اور نہ ہی لاحق (جو شروع سے امام کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہو، اور بیچ میں نماز کا کچھ حصہ عذر کی بنا پر چھوٹ جائے) پر سجدہ سہو آتا ہے۔ اور فرض کے رہ جانے سے نماز نماز ہی نہیں رہتی۔ لہٰذا اب آپ کو چاہیے کہ اپنی نماز کی از سر نو قضا کریں۔

لمافي الهندية (۱/۹۲): واذا كبر مع الامام ثم نام حتى صلى الامام ركعة ثم انتبه فانه يصلي الركعة الاولىٰ وان كان الامام يصلي الركعة الثانية هكذا في الذخيرة ولو لم يشتغل بقضاء ما سبقه الامام ولكن يتابع الامام اولا ثم قضى ما سبقه الامام بعد تسليم الامام جازت صلاته عندنا.

وفي الشامية (۱/۱۴۱): (قوله وساجدا) وكذا قائما وراكعا بالاولىٰ والهيئة المسنونة بان يكون رافعا بطنه عن فخذيه مجافيا عضديه عن جنبيه كما في البحر، قال ط: وظاهره ان المراد الهيئة المسنونة في حق الرجل لا المرأة.

﴿فصل فی القراءۃ﴾

(نماز میں قرأت اور پڑھنے والے کی غلطیوں سے متعلق مسائل کا بیان)

(۱۶۲) نماز میں منہ ہی منہ میں قرأت کا حکم

سوال...... سری نماز میں صحت نماز کیلئے صرف حروف کا تلفظ کافی ہے یا آواز کا سنائی دینا بھی ضروری ہے؟ اکثر لوگوں کو میں نے دیکھا ہے کہ وہ منہ ہی منہ میں قرأت کرتے ہیں کیا یہ درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... سری نمازوں میں صحتِ نماز کیلئے تصحیح حروف ضروری ہے اگرچہ نمازی کو اپنی آواز سنائی نہ دے۔ لیکن احتیاط اسی میں ہے کہ قرأت اتنی بلند آواز سے ہو کہ خود نمازی کو اپنی آواز سنائی دے سکے۔

لمافی الهندية(۱/۷۲): اختلفوا فی حد الجهر والمخافتة قال الفقيه ابو جعفر والشيخ الامام ابو بكر...... ادنى الجهر ان يسمع غيره وادنى المخافتة ان يسمع نفسه وعلى هذا يعتمد كذا فی محيط. وهو الصحيح كذا فی الوقاية والنقاية. وبه اخذ عامة المشايخ، ولو كان بحيث تجاوز شفتيه حتى لو قرب انسان صماخه من فمه يدخل صوته فی اذنه وفهم مايقرأ فهذه مجمجة (۱) كذا فی الخلاصة.

وفی الشامية (۱/۵۳۴): فشرط الهندوانی والفضلی لوجودها خروج صوت يصل الى اذنه وبه قال الشافعی وشرط بشر المريسی واحمد خروج الصوت من الفم وان لم يصل الى اذنه...... ولم يشترط الكرخی وابوبكر البلخی السماع واكتفيابتصحيح الحروف. واختار شيخ الاسلام. وقاضيخان وصاحب المحيط والحلوانی قول الهندوانی...... وان ما قاله الهندوانی اصح وارجح لاعتماد اكثر علمائنا عليه.

(۱۶۳) نماز میں دل ہی دل میں تلاوت کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں الحمدللہ ایک عرصہ سے نماز پابندی سے پڑھ رہا ہوں، میں نے اپنی قضائے عمری بھی پوری کرلی ہے۔ ایک صاحب سے ایک دن باتوں باتوں میں اس مسئلے کا پتا چلا کہ نماز میں تلاوت

زبان سے کرنا ضروری ہے، حالانکہ میں تو اب تک ساری نمازوں میں تلاوت وغیرہ دل ہی دل میں کرتا ہوں۔ میں اس سلسلے میں بڑا پریشان ہوں کہ میری گزشتہ نمازوں کا کیا ہوگا؟ کیا دل ہی دل میں تلاوت کرنے سے نماز نہیں ہوتی؟ مہربانی فرما کر اس مسئلے کا حل جلد مرحمت فرمادیں۔

الجواب حامداًومصلیاً......نماز میں تلاوت زبان سے کرنا ضروری ہے اور دل ہی دل میں تلاوت کرنے سے نماز نہیں ہوتی لہٰذا جتنی نمازیں آپ نے اس طرح اکیلے پڑھی ہیں وہ ادا نہیں ہوئیں لہٰذا ان نمازوں کا اعادہ کرنا لازم ہے۔

لـمـافي بدائع الصنائع (۱/۱۶۱، ۱۶۲):ثم المنفرد اذا خافت واسمع أذنيه يجوز بلا خلاف لوجود القراءة بيقين اذ السماع بدون القراءة لا يتصور وأما اذا صحح الحروف بلسانه وأداها على وجهها ولـم يسـمـع أذنيـه ولكن وقع له العلم بتحريك اللسان وخروج الحروف من مخارجها فهل تجوز صلاتـه اختـلف فيـه ذكـر الكـرخـي أنه يجوز وهو قول أبي بكر البلخي المعروف بالأعمش وعن الشيخ أبـي الـقـاسـم الصفار والفقيه أبي جعفر الهندواني والشيخ الامام أبي بكر محمد بن الفضل البـخـاري انـه لا يجوز مالم يسمع نفسه و عن بشر بن غياث المريسي انه قال ان كان بحال لو أدنى رجـل صـمـاخ أذنيـه الـى فيـه سـمـع كفى وإلا فلا ومنهم من ذكر في المسئلة خلافاً بين أبي يوسف ومـحـمـد فقال على قول أبي يوسف يجوز وعلى قول محمد لا يجوز وجه قول الكرخي أن القراءة فعل اللسان وذلك بتحصيل الحروف ونظمها على وجه مخصوص وقدوجد فأما اسماعه نفسه فلا عبرة به لأن السماع فعل الأذنين دون اللسان...... وما قاله الكرخي أقيس وأصح.

وفي الشامية(۱/۵۳۴): اعلم انهم اختلفوا في حد وجود القراءة على ثلاثة أقوال فشرط الهندواني والـفـضـلـي لـوجودها خروج صوت يصل إلى أذنه وبه قال الشافعي. وشرط بشر المريسي وأحمد خـروج الـصـوت مـن الفم وإن لم يصل إلى أذنه لكن بشرط كونه مسموعاً في الجملة حتى لو أدنى أحـدصـمـاخـه إلـى فيـه يـسـمـع ولـم يشتـرط الكرخي وأبو بكر البلخي السماع واكتفيا بتصحيح الـحـروف...... وذكـر أن كـلامـن قـولي الهندواني والكرخي مصححان وأن ما قاله الهندواني أصح وأرجح لإعتماد أكثر علمائنا عليه.

(۱۶۴) سری نمازوں میں قرأت میں تصحیح حروف ضروری ہے یا پھر آواز کا سنائی دینا بھی؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سری نماز میں صحت نماز کیلئے صرف حروف کا تلفظ کافی ہے یا آواز کا سنائی دینا بھی ضروری ہے؟ اکثر لوگوں کو میں نے دیکھا ہے کہ وہ منہ ہی منہ میں تلاوت کرتے ہیں کیا یہ درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... سری نمازوں میں صحتِ نماز کیلئے تصحیح حروف ضروری ہے اگرچہ نمازی کو اپنی آواز سنائی نہ دے۔ لیکن احتیاط اسی میں ہے کہ قرأت اتنی بلند آواز سے ہو کہ خود نمازی کو اپنی آواز سنائی دے سکے۔

لمافی عالمگیری(۱/۷۲): اختلفوا فی حد الجهر والمخافتة قال الفقیه ابو جعفر والشیخ الامام ابو بکر محمد بن الفضل ادنی الجهر ان یسمع غیره وادنی المخافتة ان یسمع نفسه وعلی هذا یعتمد كذا فی المحیط. وهو الصحیح كذا فی الوقایة والنقایة. وبه اخذ عامة المشایخ كذا الزاهدی ولو كان بحیث تجاوز شفتیه حتی لو قرب انسان صماخه من فمه یدخل صوته فی اذنه وفهم مایقرأ فهذه مجمجه كذا فی الخلاصة.

وفی الشامیة (۱/۵۳۴): فشرط الهندوانی والفضلی لوجودها خروج صوت یصل الی اذنه وبه قال الشافعی وشرط بشر المریسی واحمد خروج الصوت من الفم وان لم یصل الی اذنه...... ولم یشترط الكرخی وابوبكر البلخی السماع واكتفیابتصحیح الحروف. واختار شیخ الاسلام. وقاضیخان وصاحب المحیط والحلوانی قول الهندوانی...... وأن ما قاله الهندوانی اصح وارجح لاعتماد اكثر علمائنا علیه.

(۱۶۵) ’’ض‘‘ کی ادائیگی کا طریقہ اور اس میں تعامل عرب

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ’’ض‘‘ کی ادائیگی میں جو اختلاف ہے براہ کرم اس کی صحیح وضاحت فرمادیں کہ کونسا طریقہ افضل ہے ’’دال‘‘ کی آواز میں پڑھنا افضل ہے یا ’’ظاً‘‘ ’’ذال‘‘ کی آواز میں پڑھنا افضل ہے۔ اور یہ بھی وضاحت سے بتادیں کہ تعامل عرب کیا ہے؟ کیونکہ حدیث میں ہے کہ قرآن کو عرب کے طرز میں پڑھیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... جمہور قراء اور فقہاء کرام کا اس پر اتفاق ہے کہ حرف ضاد کا مخرج اصلی حافہ لسان یعنی زبان کی دائیں، بائیں کروٹ اور اس کی متصل داڑھیں ہیں۔ جس کی آواز ظاء معجمہ کے مشابہ ہے البتہ دال کے مشابہ نہیں ہے جیسا کہ بعض کتب فقہ اور قرأت کی کتابوں میں اس کی تشریحات موجود ہیں اور چونکہ حرف ضاد، ظاً کے مشابہ ہے تو قراء کرام نے ضاد کو صحیح طور پر ادا کرنے کیلئے یہ فرمایا ہے کہ اس کو بذریعہ استطالت اور ظاء سے ممتاز کرکے پڑھا جائے تاکہ ہر ایک میں امتیاز ہوسکے۔ البتہ اگر کوئی قاری کوشش کے باوجود بھی حرف ضاد کو صحیح طور پر ادا نہ کرسکے تو پھر فقہاء کرام نے گنجائش رکھی ہے کہ اگر دال یا ذال، یا ظاً میں سے جس کے مشابہ بھی پڑھا جائیگا عموم بلویٰ کے تحت اس کی نماز درست قرار دی جائے گی، البتہ اگر کوشش ہی نہیں کرتا بلکہ جان بوجھ کر غلط پڑھتا ہے تو پھر نماز فاسد ہوجائے گی۔

لما فی الشامیة (۱/۶۳۳): وفی التاتارخانیة عن الحاوی حكی عن الصفار انه كان یقول الخطأ اذا دخل فی الحروف لایفسد لان فیه بلوی عامة الناس لانهم لایقیمون الحروف الابمشقة، اهـ وفیها

اذا لم یکن بین الحرفین اتحاد المخرج ولا قربه الا ان فیه بلوی العامة کا لذال مکان الصاد أو الزای المحض مکان الذال والظاء مکان الضاد لاتفسد عند بعض المشایخ.

وفیه ایضاً(۱/۶۳۳):ان تعمد ذلک تفسد وان جری علی لسانه أو لایعرف التمیز لاتفسد وهو المختار حلیة وفی البزازیة وهو أعدل الاقاویل وهو المختار.

(۱٦٦) ظہر وعصر کی نمازوں میں آہستہ قرأت کرنے کی وجہ

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ظہر اور عصر کی نمازوں میں قرأت آہستہ کیوں کی جاتی ہے جبکہ دیگر نمازوں میں قرأت زور سے کی جاتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ابتداء میں تمام نمازوں کے اندر قرأت جہر (اونچی آواز) کے ساتھ پڑھتے تھے۔ یہاں تک کہ کفار نے مسلمانوں کو ایذاء پہنچانے اوران کی نمازوں میں خلل ڈالنے کیلئے قرأت کے دوران شور مچانے کا مشورہ کیا۔ ظہر اور عصر اِن دواوقات میں یہ لوگ فارغ ہوتے تھے،اسی لئے ان اوقات میں تکلیف پہنچانے اوراپنے مذموم ارادوں کو پورا کرنے کیلئے تیار بیٹھے رہتے تھے۔ بخلاف باقی تین اوقات کے کہ ان میں یہ لوگ مصروف رہتے تھے اس وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ضرر سے بچنے کیلئے ظہر اور عصر کی نمازوں کی قرأت آہستہ پڑھنا شروع کی اور چونکہ اسی پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاحیات مواظبت اختیار کی اس وجہ سے یہ عمل واجب قرار پایا۔ جمعہ اور عیدین میں چونکہ مسلمانوں کی کثرت ہوتی تھی اور یہ نمازیں شہر میں ادا ہوتی تھیں اور کفار کو شہر میں مسلمانوں کو تکلیف پہنچانے کی قوت حاصل نہیں تھی۔اس لئے جمعہ اور عیدین میں قرأت جہراً ہوا کرتی تھی۔

اب بھی ظہر اور عصر میں آہستہ قرأت پڑھنا حکمت اور فائدے سے خالی نہیں۔ یہ کہ قرأت رکن ہے جس کو امام قوم کی طرف سے ادا کرتا ہے تو جہر اس لئے کرتا ہے کہ اس میں فکر کریں اوران کو بھی فائدہ حاصل ہو،لیکن ظہر اور عصر کی نمازوں میں لوگوں کے دل عموماً اپنے کاموں کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ جن کو چھوڑ کر لوگ نماز کیلئے آئے ہوتے ہیں۔اس وجہ سے حقیقی معنوں میں قرأت میں فکر کرنا مشکل ہے۔ اس لئے ظہر اور عصر میں قرأت جہراً مفید نہیں بلکہ سراً مفید ہے۔ بخلاف دوسری نمازوں کے کہ ان میں لوگ فارغ ہو چکے ہوتے ہیں۔اور پوری توجہ قرأت کی طرف یکسوئی کے ساتھ مبذول کی جاسکتی ہے۔اس لئے اس میں قرأت جہراً مفید ہے۔ جمعہ اور عیدین کا خاص دن ہونے کی وجہ سے ان میں تیاری کر کے اہتمام کے ساتھ آتے ہیں۔اور فارغ البال ہو کر توجہ کے ساتھ سنتے ہیں۔

لمافی بدائع الصنائع(۱/۶۸۲،۶۸۳): ویجب علیه المخافتة فیما یخافت وانما کان کذلک لأن القراء ة رکن یتحمله الامام عن القوم فعلا فیجهر لیتأمل القوم ویتفکروا فی ذلک فتحصل ثمرة القراء ة وفائدتها للقوم فتصیر قراء ة الامام قراء ة لهم تقدیرا کأنهم قرؤوا وثمرة الجهر تفوت فی صلوة النهار لأن الناس فی الاغلب یحضرون الجماعات فی خلال الکسب والتصرف والانتشار فی

الارض فكانت قلوبهم متعلقة بذلك فيشغلهم ذلك عن حقيقة التأمل فلا يكون الجهر مفيداً بل يقع تسبيباً الى الاثم بترك التأمل.

وفى المبسوط للسرخسى(۱/۱۷):وقد كان النبى ﷺ فى الابتداء يجهر بالقرآن فى الصلاة كلها وكان المشركون يؤذونه ويسبون من أنزل ومن أنزل عليه فأنزل الله تعالىٰ ولا تجهر بصلاتك ولا تخافت بها وابتغ بين ذلك سبيلا فكان يخافت بعد ذلك فى صلاة الظهر والعصر لأنهم كانوا مستعدين للأذى فى هذين الوقتين ويجهر فى صلاة المغرب لأنهم كانوا مشغولين بالأكل وفى صلاة العشاء والفجر لأنهم كانوا نياما ولهذا جهر فى الجمعة والعيدين لأنه اقامها بالمدينة وما كان للكفار بها قوة الأذى.

وفى الدر المختار(۱/۵۳۳): وكان عليه الصلاة والسلام يجهر فى الكل ثم تركه فى الظهر والعصر لدفع أذى الكفار.

(۱۶۷) قراتِ شاذہ سے تلاوت

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قرأت شاذہ سے تلاوت کرنا کیسا ہے اور اگر نماز میں پڑھے تو پھر کیا حکم ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً..... نماز میں قرأت شاذہ سے تلاوت کرنا بذات خود تو منع نہیں ہے، مگر عام مجمعوں میں اس سے اجتناب کرنا بہتر ہے۔ کیونکہ یہ طریقہ ناواقف لوگوں میں شکوک وشبہات کا باعث بن سکتا ہے۔اس لئے عام مجمعوں میں قرأتِ حفص سے ہی تلاوت کرنی چاہئے۔

لمافى الهندية(۱/۷۹): فى الحجة قراءة القران بالقراءات السبعة والروايات كلها جائزة. ولكنى أرى الصواب أن لايقرأ القراءة العجيبة بالأمالات، والروايات الغريبة.

وفى الطحطاوى على الدر (۱/۲۰۳) : (قوله ومنها القراءة) أى من القرآن المنقول عن الرسول عليه الصلاة والسلام متواترا فلا يقرأ بالشواذ وان قرأ بها لا تفسد ولا يعتد بها .

وفى الشامية(۱/۵۴۴):. حاصل معنى كلام هذين الشيخين بيان وجه الكراهة فى المداومة. وهو أنه ان رأى ذالك حتماً يكره من حيث تغيير المشروع، وإلايكره من حيث إيهام الجاهل.

(۱۶۸) قراءة سبعه او عشره کی نماز میں تلاوت اور مخفف کو مشدد یا برعکس پڑھنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید ''مسجد خالد بن ولید'' میں امام ہے یہ مسجد چونکہ

ہمارے گھر کے قریب ہے اس لئے میں اکثر نمازیں وہاں پڑھتا ہوں، لیکن امام صاحب عام طور پر مشدد الفاظ کو غیر مشدد کر کے پڑھتے ہیں کبھی کبھی غیر مشدد الفاظ کو مشدد کر کے ادا کرتے ہیں، ایک دن میرے ایک دوست جو کہ ''حافظ قرآن اور اچھے قاری ہیں'' تشریف لائے تھے جب ہم مغرب کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلے تو حافظ صاحب نے کہا کہ تمہارے امام صاحب تو قرآن بہت غلط پڑھتے ہیں شاید اس سے نماز فاسد ہوتی ہو۔ لہٰذا آپ کسی مفتی صاحب سے معلوم کرلیں، لیکن پہلے میں نے جا کر اپنے امام صاحب سے پوچھ لیا تو انہوں نے کہا کہ قرآن مجید کی ایک ہی قرأت نہیں بلکہ بہت ساری قرائتیں ہیں اور ان میں سے ہر ایک کو نماز میں پڑھنا جائز ہے۔ لیکن مجھے بہت تعجب ہوا۔ کہ اب تک یہ بات ہم نے کسی سے نہیں سنی تھی۔ لہٰذا مفتی صاحب برائے مہربانی آپ فرمائیں کیا اس طرح قرأت کرنے سے نماز ہو جاتی ہے؟ کیا امام صاحب کا یہ کہنا کہ قرآن پڑھنے کی بہت سی قرأتیں ہیں یہ بات صحیح ہے اور جتنی نمازیں اب تک ہم نے پڑھی ہیں اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً...... قراءة سبعه او عشره (جو کہ مشہور ''سبعہ عشرہ'' سے ہیں) اگرچہ نماز میں پڑھنا درست ہے لیکن ائمہ کرام کیلئے بہتر یہی ہے کہ جو مشہور روایت (امام حفصؒ کی روایت) عام طور پر پڑھی جاتی ہے اس کی تلاوت کریں کیونکہ عوام دوسری روایات کے متعلق علم نہیں رکھتے اس لئے وہ بعض اوقات ان روایات کو صحیح نہیں سمجھتے حالانکہ ان کے صحیح ہونے میں کسی قسم کا کوئی تردد نہیں۔ لہٰذا مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ عوام کو گناہ گار ہونے سے بچانے کیلئے روایت حفص میں ہی قرأت کی جائے۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر امام صاحب قراءۃ سبعہ اور عشرۃ کا علم رکھتے ہیں اور پھر کسی روایت کے تحت مشدد کو غیر مشدد اور غیر مشدد کو مشدد پڑھ رہے ہیں تو ان کیلئے اس طرح پڑھنا جائز ہوگا گو مصلحت کے تحت مناسب نہیں۔ لیکن اگر وہ قراءۃ سبعہ اور عشرۃ کا علم نہیں رکھتے بلکہ مشہور قرأت حفص میں ہی تلاوت کرتے ہوئے مشدد کو غیر مشدد اور غیر مشدد کو مشدد پڑھتے ہیں تو اب دیکھا جائے گا اگر اس سے معنی میں تغیر فحش پیدا نہیں ہوا تو نماز فاسد نہ ہوگی۔

لمافی الصحیح للبخاری(۲/۷۴۷): حدثاه انهما سمعا عمر بن خطاب...... ثم قال اقرأ یاعمر فقرأت القراءة التی اقرأنی فقال رسول الله ﷺ کذلک انزلت ان هذا القرآن انزل علی سبعة احرف فاقرؤا ماتیسر منه.

وفی التاتارخانیة(۱/۲۹۴): فی ترک المد والتشدید فی موضعهما والاتیان بهما فی غیر موضعهما ان کان لا یغیر المعنی ولا یقبح الکلام لایوجب فساد الصلوة وان کان یغیر المعنی ویقبح الکلام اختلف المشائخ: قال بعضهم: لا تفسد الصلوٰة: وقال عامتهم تفسد صلاته، وفی النصاب وعلیه الفتوی.

مثال الاول فی ترک التشدید اذا قرا ''ملعونین اینما ثقفوا اخذوا وقتلو'' بغیر تشدید لا تفسد الصلوته لانه قریب من ''قتّلو'' بالتشدید...... المثال الثانی...... ولو قرا ''فمن اظلم ممن کذب علی

اللہ شدد الذال فی "کذب" اختلف المشائخ فیه وفی الغیاثیه قال بعضهم لاتفسد، وعلیه الفتویٰ.
ولو قرأ "فاولئک هم العادون" وشدد الدال تفسد صلاته بلا خلاف.........

وفی الهندیة (۱/۷۹): فی الحجة قراءة القران القراءات السبعة والروایات کلها جائز ولکنی اری الصواب ان لا یقرأ القراءة العجیبة بالامالات والروایات الغریبة کذا فی التاتارخانیة.

وفی الشامیة(۱/۵۴۱): (قوله ویجوز بالروایات السبع) بل یجوز بالعشر ایضاً کما نص علیه اهل الاصول (قوله بالغریبة) ای بالروایات الغریبه والامالات، لأن بعض السفهاء یقولون مالا یعلمون فیقعون فی الاثم والشقاء، ولا ینبغی للأمة ان یحملوا العوام علی مافیه نقصان دینهم ولا یقرأ عندهم مثل قراءة ابی جعفر وابن عامر وعلی بن حمزة والکسائی صیانه لدینهم فلعلهم یستخفون او یضحکون وان کان کل القراءات والروایات صحیحة فصیحة، ومشایخنا اختاروا قراءة ابی عمر وحفص عن عاصم من التاتارخانیة عن فتاویٰ الحجة.

(۱۶۹) نماز میں قرأت کے چند متفرق مسائل

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز میں ترتیب سورۃ (مثلاً اگر پہلی رکعت میں سورۃ فیل پڑھی ہے تو دوسری رکعت میں سورۃ قریش پڑھیں نہ کہ سورۃ ہمزہ) کا شرعی حکم کیا ہے؟ اور بصورت عدم لحاظ ترتیب شرعی حکم کیا ہوگا؟ اسی طرح ہر رکعت میں ایک ہی سورت پڑھنے کا شرعی حکم کیا ہے؟ اسی طرح پہلی رکعت میں سورۃ نصر اور دوسری میں سورۃ اخلاص پڑھنا شرعاً کیسا ہے؟ نیز پہلی رکعت میں طویل قرأت اور دوسری رکعت میں مختصر قرأت کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟ اور اس کا لحاظ نہ کرنے کا شرعی حکم کیا ہے؟ ان تمام مسائل میں فرض، سنن اور نوافل کے اعتبار سے کوئی فرق ہے؟ اگر کسی شخص کو وتر میں یہ ہی یاد نہ ہو کہ اس نے دعائے قنوت پڑھی یا نہیں تو ایسے شخص پر سجدہ سہو لازم ہوگا یا نہیں؟ چار رکعت والی نماز میں اگر کوئی غلطی سے تیسری رکعت میں قعدہ کرلے پھر یاد آنے پر اللہ اکبر کہہ کر کھڑا ہو یا بغیر تکبیر کہے کھڑا ہو کر چوتھی رکعت مکمل کرے۔ آیا اس کی نماز ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً......فرض نماز میں سورتوں کی ترتیب بلحاظ قراءت ملحوظ رکھنی چاہئے۔ اگر کوئی عدم ترتیب کو عادت بنائے گا تو گناہ گار ہوگا اور قصداً منکوس قراءت کرنا (یعنی پہلی رکعت میں بعد والی سورت اور دوسری رکعت میں اس سے اوپر والی سورت پڑھنا) خلاف اولیٰ ہے۔ البتہ اگر نفل میں کوئی اس طرح کرے تو کوئی حرج نہیں اسی طرح فرض نماز میں چھوٹی سورتوں میں بیچ میں ایک سورت چھوڑنا خلاف اولیٰ ہے۔ پہلی رکعت میں طویل قراءت اور دوسری میں مختصر قرأت کرنا فجر میں سنت ہے اور باقی نمازوں میں اولیٰ ہے۔ اور اس کے برعکس کرنے میں اگر دوسری رکعت تین آیات کی مقدار سے زیادہ طویل ہوجائے تو یہ خلاف اولیٰ ہے۔

اگر کسی کو وتر میں یہ یاد ہی نہ ہو کہ قنوت پڑھی ہے یا نہیں تو اس کو آخر میں سجدہ سہو کرلینا چاہئے۔ چار رکعت والی نماز میں اگر کوئی تیسری

رکعت میں قعدہ کرلے تو پھر یاد آنے پر بغیر تکبیر کہے کھڑا ہو جائے اور اگر تین تسبیح کے بقدر بیٹھا ہو تو آخر میں سجدہ سہو کرنا ضروری ہے۔

لمافی صحیح البخاری(۱/۱۰۷): عن عبدالله بن ابی قتاده عن ابیه ان النبی ﷺ کان یقرء فی الظهر فی الاولیین بام الکتاب وسورتین وفی الرکعتین الاخریین بام الکتاب ویسمعنا الایة ویطول فی الرکعة الاولیٰ مالا یطیل فی الرکعة الثانیة وهکذا فی العصر وهکذا فی الصبح.

وفی حاشیة الطحطاوی (۴۷۴): (قوله: وجب علیه سجود السهو) إذا شغله التفکر عن اداءٍ واجب بقدر رکن...... وهو مقدر بثلاث تسبیحات، ثم ان محل وجوب سجود السهو إذا لم یشتغل حالة الشک بقرأة ولا تسبیح اهـ.

وفی الدر المختار(۱/۵۴۱،۵۴۲): (وتطال اولی الفجر علی ثانیتها) بقدر الثلث وقیل النصف ندبا فلوفحش لابأس به (فقط) وقال محمد: ولی الکل حتی التراویح قیل وعلیه الفتوی (واطالة الثانیة علی الاولی یکره) تنزیها (اجماعا ان بثلث آیات) ان تقاربت طولا وقصرا والااعتبر الحروف والکلمات .... (صـ۵۴۳) (وان باقل لا) یکره.

وفی الدر المختار(۱/۵۴۶،۵۴۷): لابأس ان یقرأ سورة ویعید هافی الثانیة وان یقرأ فی الاولی من محل وفی الثانیة من آخر ولومن سورة ان کان بینهما ایتان فأکثر ویکره الفصل بسورة قصیرة وان یقرأ منکوسا الا اذا ختم فیقرأ من البقرة وفی القنیة قرأ فی الاولی الکافرون وفی الثانیة الم تر أوتبت، ثم ذکر یتم وقیل یقطع ویبدء ولایکره فی النفل شئ من ذلک

وفی الشامیة تحته: (قوله ثم ذکریتم) افادان التنکیس أو الفصل بالقصیرة انما یکره اذا کان عن قصد فلو سهوا فلا کمافی شرح المنیة.

وفیه ایضاً(۲/۹): (ولونسیه) أی القنوت(ثم تذکره فی الرکوع لایقنت) فیه لفوات محله (ولایعود الی القیام) فی الاصح لان فیه رفض الفرض للواجب (فان عادالیه وقنت ولم یعدا لرکوع لم تفسد صلاته) لکون رکوعه بعد قراءة تامة (صـ۱۰) (وسجد للسهو)قنت اولا لزواله عن محله.

(۱۷۰) مسئلہ زلۃ القاری

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱)...... مسئلہ زلۃ القاری میں فتویٰ طرفین رحمہما اللہ کے قول پر ہے یا امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول پر؟

(۲)...... طرفین رحمہما اللہ کے نزدیک فساد وعدم فساد کا مدار، ولفظوں کے آپس میں قریب المعنیٰ اور بعید المعنیٰ ہونے پر ہے، کسی لفظ کے

قریب المعنی اور بعید المعنی ہونے کی کیا تحدید اور ضابطہ ہے؟

(۳)......مسائل زلۃ القاری میں جن مقامات میں متقدمین ومتاخرین کے قول میں اختلاف ہے فتویٰ متقدمین کے قول پر ہے یا متاخرین کے قول پر، مثلاً وہ خطائی الاعراب جو مکفر ہو عندالاعتقاد اور دیگر مقامات۔

الجواب حامداً ومصلیاً......قرآن مجید کو چونکہ اللہ تعالیٰ نے عربی زبان میں اتارا ہے لہٰذا اس کو عربی لہجے میں پڑھنا چاہئے کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: **اقرءوا القرآن بلحون العرب** یعنی قرآن مجید کو عربی لہجے میں پڑھو۔ لہٰذا قرآن مجید کو تجوید کے قواعد کے مطابق یعنی ہر حرف کو اپنے مخارج اور صفات کے ساتھ اپنی قدرت وگنجائش کے موافق پڑھنے کی مشق کرنا اور کوشش کرتے رہنا ضروری ہے لیکن اگر کوئی شخص بے فکر ہو کر ہمیشہ غلط پڑھتا رہے تو وہ گنہگار ہوگا۔

صورت مسئولہ میں جن مقامات میں متقدمین اور متاخرین کا اختلاف ہے وہاں پر فتویٰ متاخرین کے قول پر ہے۔ لیکن جو شخص صحیح حروف اور صحیح اعراب ادا کرنے پر فعلاً قادر ہو اور پھر بھی وہ جان بوجھ کر قصداً غلط ادا کرتا ہے اور غلط ادا کرنے کی وجہ سے معنی میں بھی تغیر فاحش آجائے تو پھر متقدمین اور متاخرین سب کا فتویٰ یہی ہے کہ نماز فاسد ہوگی۔

لما فی الشامیة (۱/۶۳۰): ان الخطاء اما فی الاعراب أی الحرکات والسکون ویدخل فیه تخفیف المشدد وقصر الممدود وعکسهما أو فی الحروف بوضع حرف مکان اخر، أو زیادته أو نقصه أو تقدیمه أو تأخیره أو فی الکلمات أو فی الجمل کذلک أو فی الوقف ومقابله والقاعدة عند المتقدمین ان ماغیر المعنی تغییراً یکون اعتقاده کفراً یفسد فی جمیع ذلک سواء کان فی القرآن أولا. الا ما کان من تبدیل الجمل مفصولا بوقف تام وان لم یکن التغییر کذلک فان لم یکن مثله فی القرآن والمعنی بعید متغیر تغیراً فاحشاً یفسد ایضاً کهذا الغبار مکان هذا الغراب، وکذا اذا لم یکن مثله فی القرآن ولا معنی له کالسرائل باللام مکان السرائر وان کان مثله فی القرآن والمعنی بعید ولم یکن متغیرا فاحشا تفسد أیضا عند ابی حنیفة و محمد، وهو الاحوط، وقال بعض المشایخ: لاتفسد لعموم البلوی، وهو قول أبی یوسف وان لم یکن مثله فی القرآن ولکن لم یتغیر به المعنی نحو قیامین مکان قوامین فالخلاف علی العکس، فالمعتبر فی عدم الفساد عند عدم تغیر المعنی کثیرا وجود المثل فی القرآن عنده والموافقة فی المعنی عند هما، فهذه قواعد الائمة المتقدمین، واما المتأخرون کابن مقاتل وابن سلام واسمعیل الزاهد وابی بکر البلخی والهندوانی وابن الفضل والحلوانی، فاتفقوا علی ان الخطأ فی الاعراب لایفسد مطلقاً ولو اعتقاده کفرا لان اکثر الناس لایمیزون بین وجوه الاعراب، قال قاضیخان: وما قاله المتأخرون أوسع وما قاله المتقدمون أحوط، وان کان الخطأ بابدال حرف بحرف، فان امکن الفصل بینهما بلا کلفة کالصاد مع الطاء بأن قرء

الطالحات مكان الصالحات فاتفقوا على انه مفسد، وان لم يمكن الابمشقة كالظاء مع الضاد والصاد مع السين فاكثرهم على عدم الفساد لعموم البلوى، وبعضهم يعتبر عسر الفصل بين الحرفين وعدمه و بعضهم قرب المخرج وعدمه، ولكن الفروع غير منضبطة على شيئ من ذلك، فالاولى الاخذ فيه بقول المتقدمين لانضباط قواعدهم وكون قولهم احوط واكثر الفروع المذكورة فى الفتاوىٰ منزلة عليه ونحوه فى الفتح، وسياتى تمامه.

وفيه ايضاً (۱/۲۳۳): الاصل فيما اذا ذكر حرفا مكان حرف وغير المعنى ان امكن الفصل بينهما بلا مشقة تفسد، والايمكن الابمشقة كالظاء مع الضاد المعجمتين والصاد مع السين المهملتين والطاء مع التاء قال اكثرهم لاتفسد، وفى خزانة الاكمل قال القاضى ابوعاصم: ان تعمد ذلك تفسد، وان جرى على لسانه او لايعرف التمييز لاتفسد، وهو المختار حلية وفى البزازية: وهو اعدل الاقاويل، وهو المختار.

(۱۷۱) قرأت میں حرکات واعراب کی تبدیلی سے نماز کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری مسجد کے امام صاحب صبح کی نماز پڑھا رہے تھے انہوں نے سورۃ النمل کا آخری رکوع تلاوت کیا جب اس آیت پر پہنچے "وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِى لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ (سورۃ نمل: ۹۲) توانہوں نے مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ کو مِنَ الْمُنْذَرِيْنَ پڑھا جب نماز ہوگئی سارے مقتدی چلے گئے تو بعد میں امام صاحب کو خیال آیا کہ میں نے تو قرأت میں غلطی کی ہے۔ آیا اس طرح قرأت کرنے سے نماز ہوگئی یا اعادہ ضروری ہوگا نیز اعادہ کرنے میں انتشار کا بھی قوی اندیشہ ہے۔ مہربانی فرما کر کوئی آسان ساحل اس مسئلے کا نکالدیں۔

الجواب حامداًومصلیاً..... نماز کے دوران قراءت کرتے وقت حرکات اور اعراب میں غلطی کرنے سے نماز میں کسی قسم کی خرابی اور نقصان واقع نہیں ہوتا ہے۔ اگرچہ حرکات اور اعراب میں غلطی کرنے سے معنی ومطلب میں تبدیلی اور فساد واقع ہوجائے۔ صورت مسئولہ میں اس غلطی سے نماز فاسد نہیں ہوئی۔ لہٰذا اس نماز کا دوبارہ اعادہ کرنا ضروری نہیں ہے۔

لمافى الهندية (۱/۸۱): (ومنها اللحن فى الاعراب) اذا لحن فى الإعراب لحنا لايغير المعنى بأن قرأ "لاترفعوا اصواتكم" "برفع التاء" لاتفسد صلاته بالاجماع وان غير المعنى تغيراً فاحشا بأن قرأ "وعصى آدم ربه" "بنصب الميم" ورفع الرب" وما اشبه ذلک ممالو تعمد به يكفر اذا قرأ خطأ فسدت صلاته فى قول المتقدمين واختلف المتأخرون "إلى ان قال" لاتفسد صلاته وما قاله المتقدمون احوط لانه لو تعمد يكون كفراً وما يكون كفراً لا يكون من القرآن. وما قاله المتأخرون

اوسع لان الناس لایمیزون بین اعراب واعراب کذا فی فتاویٰ قاضی خان. وهو الأشبه کذا فی المحیط، وبه یفتی کذا فی العتابیة، وهکذا فی الظهیریة.

وفی الدر المختار (۱/۶۳۱، ۶۳۲): "ومنها زلة القاری". فلو فی اعراب او تخفیف مشدد وعکسه او بزیادة حرف فأکثر نحو الصراط الذین، او یوصل حرف بکلمة نحو إیاک نعبد، أو بوقف و ابتداء لم تفسد وإن غیر المعنی به یفتی بزازیة الخ.

وفی الشامیة: (قوله فلو فی اعراب) ککسر قواما مکان فتحها وفتح باء تعبد مکان ضمها، ومثال ما یغیر، إنما یخشی الله من عباده العلماء. بضم الجلالة وفتح همزة العلماء، وهو مفسد عند المتقدمین. واختلف المتأخرون، فذهب ابن مقاتل ومن معه الی انه لایفسد والاول أحوط وهذا أوسع، کذا فی زاد الفقیر لإبن الهمام، وکذا. وعصی آدم ربه. بنصب الاول ورفع الثانی یفسد عند العامة، وکذا. فساء مطر المنذرین. بکسر الذال. وإیاک نعبد. بکسر الکاف و. المصور. بفتح الواو إلا اذا نصب الراء أو وقف علیها وفی النوازل: لا تفسد فی الکل، وبه یفتی بزازیة وخلاصة.

(۱۷۲) آیت کا کچھ حصہ چھوٹنے پر نماز کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ امام سے دوران قرأت ایک آیت شریفہ کا کچھ حصہ چھوٹ گیا اس سے آگے کی آیات پڑھ لیں، ایسی صورت میں نماز کا اعادہ کرنا پڑیگا یا نہیں؟ اور اگر امام نے نماز کے آخر میں سجدہ سہو کرلیا ہو تو نماز ہو جائیگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں اگر امام سے دوران قرأت آیت شریفہ کا کچھ حصہ چھوٹ گیا اور اسکی وجہ سے معنی میں تغیرِ فاحش واقع ہو گیا ہو تو نماز فاسد ہو جائیگی چاہے سجدہ سہو بھی کرلیا ہو، اور اگر معنی میں تغیرِ فاحش واقع نہیں ہوا تو نماز بغیر سجدہ سہو کے ہو جائیگی اگر سجدۂ سہو کرلیا تو بھی نماز میں کوئی فرق نہیں پڑیگا۔ نیز اگر ایک آیت کو مکمل کرنے کے بعد عمداً ایک یا چند آیات کو چھوڑ کر آگے سے پڑھ لیا تو یہ مکروہ ہے۔

لمافی الحلبی الکبیر (۱/۴۹۴): لوانتقل فی الرکعة الواحدة من اٰیة الی اٰیة یکره وان کان بینهما اٰیات بلاضرورة.

وفی الدرالمختار (۱/۶۳۲، ۶۳۳): ولوزاد کلمة اونقص کلمة...لم تفسدمالم یتغیر المعنی.

(۱۷۳) آیات کے کلمات میں تقدیم وتاخیر کردینے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج ہمارے امام صاحب مغرب کی نماز پڑھا رہے تھے تو

انہوں نے پہلی رکعت میں سورۃ الغاشیہ کی آخری آیات تلاوت کیں لیکن اس میں تقدیم وتاخیر کردی مثلاً اَفَلَا یَنظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ وَاِلَی السَّمَاءِ کَیْفَ رُفِعَتْ وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ قرآن میں اس طرح ہے لیکن انہوں نے خُلِقَتْ کی جگہ رُفِعَتْ پڑھا، رُفِعَتْ کی جگہ خُلِقَتْ پڑھا، نُصِبَتْ کی جگہ سُطِحَتْ پڑھا اور سُطِحَتْ کی جگہ نُصِبَتْ پڑھا آیا اس صورت میں نماز ہوگئی یا واجب الاعادہ ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً......دوران نماز اگر غلطی سے ایک کلمہ کی جگہ پر دوسرا کلمہ پڑھ لیں اور اس سے معنی میں تغیر فاحش لازم آتا ہو، تو نماز فاسد ہوجاتی ہے لیکن اگر معنی میں فساد زیادہ لازم نہ آتا ہو، اور دوسرا کلمہ قرآن میں موجود بھی ہو تو امام ابوحنیفہ وامام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک اس صورت میں بھی نماز فاسد ہوجاتی ہے لیکن امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس صورت میں نماز فاسد نہیں ہوتی۔ صورت مسئولہ میں اگر چہ احتیاط طرفین کے قول پر عمل کرنے ہی میں ہے کہ نماز کا اعادہ کیا جائے البتہ اس نماز کی ادائیگی کو چند دن گزر چکے ہیں اور اعادہ کا حکم کرنے سے فساد اور حرج کا اندیشہ ہے لہٰذا امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول پر عمل کرنے کی گنجائش ہے۔

لمافی محیط البرهانی(۶۷/۲): وان کان اختلافاً متباعداً نحو أن یختم اية الرحمة باية العذاب أو اية العذاب باية الرحمة، أو اراد أن یقرء الرحمن علم القران فجری علی السانه الشیطان...... فعلی قول أبی حنیفة ومحمد تفسد صلاته وأما علی قول ابی یوسف: فقد اختلف المشایخ، قال بعضهم لا تفسد اذا لم یقصد ذلک، ومر علی لسانه غلطا، ویجعل کأنه ابتدا بکلمة من کلمات القراءة وهذا لأنه قصد قراءة القران علی ما أنزل، فیجعل فی التقدیر کأنه ترک القراءة من هذا الموضع وأخذ بالقراءة من ذلک الموضع، وهو فی ذلک الموضع قرآن فلا تفسد صلاته وبه کان یفتی الشیخ الامام الفقیه ابو الحسن وهو اختیار محمد بن مقاتل الرازی وقیل فی المسئلة عن ابی یوسف روایتان.

وفی خلاصة الفتاوی(۱۱۵/۱): ولو قرء أفلا ینظرون الی قوله والی الجبال کیف سطحت مکان نصبت فعلی قیاس قول ابی یوسف لایفسد وکذا نصبت مکان سطحت وخلقت مکان رفعت وعلی قولهما ینبغی أن یفسد.

وفی الفقه الاسلامی وادلته(۱۰۳۷/۲): تبطل الصلوة بکل ما غیر المعنی تغیراً یکون اعتقاده کفراً، وبکل مالم یکن مثله فی القرآن، والمعنی بعید متغیر تغیراً فاحشاً، کهذا الغبار مکان "هذا الغراب" (المائدة،۳۱/۵) وبکل مالم یکن له مثل فی القران ولا معنی له کالسرائل مکان "السرائر" (الطارق : ۹/۸۶) وتبطل ایضاً عند ابی حنیفة ومحمد بماله مثل فی القران والمعنی بعید ولم یکن متغیرا تغیّراً فاحشاً ولا تبطل عند ابی یوسف لعموم البلوی.

وفی الشامية(۱/۲۳۱): فالمعتبر فی عدم الفساد عند عدم تغير المعنی كثيرا وجود المثل فی القران عنده والموافقة فی المعنی عندهما فهذه قواعد الائمة المتقدمين.

وفی الشامية(۱/۲۳۳): وهذا كله قول المتأخرين، وقد علمت أنه أوسع، وأن قول المتقدمين أحوط، قال فی شرح المنية: وهو الذی صححه المحققون وفرعوا عليه، فاعمل بما تختار، والاحتياط أولیٰ سيما فی أمر الصلوة التی هی أول ما يحاسب العبد عليها.

(۱۷۴) اس آدمی کی نماز کا حکم جو قرأت پر قدرت نہ رکھتا ہو

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک بھائی ہے جس کی زبان میں زبردست قسم کی لکنت ہے۔ ایک ایک حرف کو کئی کئی بار ادا کرتا ہے اور لفظوں کو خوب کھینچ تان کر پڑھتا ہے، مثلاً اگر اس نے یہ پوچھنا ہو (یہ کون ہے) تو کہے گا اے اے اے کون (میں ک ک ک) واو کو بھی خوب کھینچتا ہے تین چار واو بن جاتے ہیں۔ (ہے) کو عجوبہ بناتا ہے۔ وہ بالغ ہے اب نماز کا اس کیلئے مسئلہ ہے سوچتے ہیں قرآن نہ پڑھائیں بگاڑے گا تو گناہگار ہوگا۔ مسجد میں آتا ہے امام کے پیچھے کھڑا ہوتا ہے لیکن پڑھتا نہیں اور جب سنتیں پڑھتا ہے تو ہم کہتے ہیں، اللہ اللہ، پڑھتا رہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کی نماز بغیر قرأت درست ہے یا نہیں؟ یا ہم اس کو لازمی غلط سلط قرآن سکھوائیں یا یوں ہی رہنے دیں اصل بات یہ ہے کہ ہم نے ابتداء میں قرآن پڑھوانے کی کوشش کی امام صاحب بیچارے نے بہت زور لگایا مگر وہ بھی تھک گئے کہنے لگے یہ نہیں پڑھ سکتا اور جو چند جملے سیکھے گا وہ بھی قرآن کی بجائے کوئی لطیفہ نظر آئے گا۔ مہربانی کریں کہ شرعی حکم سے آگاہ کریں تا کہ بیچارا جہنم سے بچ جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... نماز میں قرأت کرنا اُس آدمی پر فرض ہے جو قرأت قرآن پر قادر ہو۔ صورت مسئولہ میں اگر آپ کا بھائی اس طریقہ پر قرآن پڑھتا ہو جس سے معنی میں فساد لازم آتا ہے اور وہ کسی بھی سورت کے صحیح پڑھنے پر قدرت نہیں رکھتا، بہت کوشش کرنے کے بعد وہ سیکھنے سے مایوس ہو جائے، اور کوئی معتبر قاری اس کی تصدیق بھی کرے کہ یہ کبھی بھی درست نہیں پڑھ سکتا تو اس کی نماز بغیر قرأت قرآن کے درست ہے۔

لمافی الشامية(۱/۵۸۲): (قوله دائماً) ای فی آناء الليل وأطراف النهار، فمادام فی التصحيح والتعلم ولم يقدر عليه فصلاته جائزة وان ترك جهده فصلاته فاسدة كما فی المحيط، وغيره، قال فی الذخيره، وانه مشكل عندی، لان ما كان خلقة فالعبد لا يقدر علی تغييره اهـ وتمامه فی شرح المنية.

وفی اعلاء السنن(۴/۱۴۸): عن رفاعة بن رافع أن رسول الله ﷺ علم رجلاً الصلوة فقال ان كان معك قران فاقرأ والا فاحمدالله، وكبره، وهلّله، ثم اركع، رواه ابو داؤد، والترمذی، وأخرجه

النسائی، ایضاً وقال الترمذی: حدیث رفاعة حسن، کذا فی النیل (۱۱۸/۲)

قوله عن رفاعة بن رافع الخ، قلت فیه دلالة علی أن العاجز عن قراءة القران تسقط عنه القراءة مادام عاجزا، ویکفیه الذکر عوضا عنها، ولا یخفی أن الذکر لا یتقید بالعربیة ولا ینحصر فیها بل یحصل بأی لسان کان، کالایمان فانه لو آمن بغیر العربیة جاز اجماعاً لحصول المقصود، کذا فی البحر (۲۰۷/۱).

وفیه ایضاً(۱۶۳/۴): قلت وقد صرح بوجوب التجوید وتصحیح الحروف فقهاء نا الحنفیة ایضاً، قال فی غنیة المستملی: وقال صاحب المحیط: والمختار للفتوی فی جنس هذه المسائل انه إن کان یجتهد آناء للیل وأطراف النهار فی التصحیح ولا یقدر علیه فصلاته جائزة وان ترک جهده فصلاته فاسدة وان ترک جهده فی بعض عمره لا یسعه أن یترکه فی باقی عمره ولو ترک تفسد صلاته، انتهی.

وقال صاحب الذخیرة: وانه مشکل عندی (۱) لان ماکان خلقة فالعبد لا یقدر علی تغییره "انتهی".

وعلی هامشها(۱۶۳/۴): (۱) ای الحکم بفساد صلاة بترک الجهد بعد ما اجتهد مدة وصرف فیها برهة من الزمان...... مشکل یفضی إلی الحرج ولذا قال شیخ فی بعض تصانیفه إن تصحیح الحروف وبذل الجهد فیه واجب مالم یحصل الیاس منه، واذا أیس سقط الجهد وتجوز صلاته دائماً، والمعتبر فی حضول الیأس شهادة حاذق من القراء بان ذالک لا یرجی منه أن یصح الحروف ابداً لا مجرد زعم المتعلم "فانهم" فان هذا لا تجده فی کتاب ولکنه هو الأولی بالصواب.

(۱۷۵) سورۃ "الم السجدة" اور "هل اتی علی الانسان" جمعہ کو فجر کی نماز میں پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک چچازاد بھائی ہے جو گلشن اقبال میں پڑھتا ہے ایک دن اس سے ملنے کسی کام کی وجہ سے جانا ہوا تو رات وہیں رہا صبح کی نماز جماعت سے پڑھی امام نے بہت طویل قرأت کی دونوں رکعتوں میں لمبی لمبی سورتیں پڑھیں جب نماز ختم ہوگئی تو میں نے کہا بھائی تمہارا امام تو بہت طویل قرأت کرتا ہے کہنے لگا اصل میں آج جمعہ ہے اور جمعہ کے دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صبح میں الم السجده اور سورة هل اتی علی الانسان، پڑھتے تھے۔ میں نے کہا ہمارے امام صاحب نے تو کبھی نہیں پڑھی پھر جب میں اپنے محلے میں آیا امام صاحب کو بتایا کہ یوں معاملہ ہوا اس نے کہا ہمارے فقہ میں ان کو پڑھنا منع ہے، اس لئے میں نہیں پڑھتا میرے ذہن میں خیال آیا جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے تھے پھر ہمارے فقہ میں کیوں منع ہے مجھے اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ برائے مہربانی رہنمائی فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً ...... یہ بات تو احادیث مبارکہ سے ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جمعۃ المبارک کے دن فجر کی نماز میں سورۃ ''الم السجدہ ''اور سورۃ ''ھل اتی علی الانسان'' کی تلاوت فرمایا کرتے تھے البتہ یہ سورتیں ہمیشہ جمعہ کے دن فجر کی نماز میں پڑھنے سے ہمارے فقہاء کرام نے منع فرمایا ہے کیونکہ ہمیشہ پڑھنے سے صرف ان سورتوں کی فضیلت اور دوسری سورتوں سے اعراض لازم آتا ہے اور چونکہ ان سورتوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ نہیں پڑھا اس لئے ان پر مداومت اختیار کرنے سے کراہت ثابت ہوتی ہے، لہٰذا جو کام شریعت میں جس طرح ثابت ہے اسی کے مطابق عمل کیا جائے تو وہ باعث ثواب ہوگا ورنہ باعث عقاب، آجکل تو یہ سنت بالکل ہی متروک ہوکر رہ گئی ہے لہٰذا ائمہ مساجد کو کبھی کبھی ان سورتوں کے پڑھنے کا اہتمام کرنا چاہیے تاکہ یہ سنت زندہ ہوسکے۔

خلاصہ یہ کہ یہ سورتیں کبھی کبھی چھوڑ دینی بھی چاہئیں دوام اختیار نہیں کرنا چاہیے البتہ ان ائمہ کرام کا عمل بھی درست نہیں جو ان سورتوں کو کبھی نہیں پڑھتے سب کو اعتدال سے کام لینا چاہیے۔

لمافی ابی داؤد (۱/۱۵۴): عن ابن عباسؓ ان رسول اللہ ﷺ کان یقرأ فی صلوۃ الفجر یوم الجمعة تنزیل السجدة وھل اتیٰ علی الانسان حین من الدھر.

وفی فتح القدیر (۱/۳۳۷): والحق أن المداومة مطلقاً مکروھة سواء رآہ حتما یکرہ غیرہ أولا لأن دلیل الکراھة لا یفصل وھو ایھام التفضیل وھجر الباقی لکن الھجران إنما یلزم لو لم یقرأ الباقی فی صلوۃ أخریٰ فالحق أنه ایھام التعین ثم مقتضی الدلیل عدم المداومة لا المداومة علی العدم کما یفعله حنفیة العصر بل یستحب أن یقرأ بذلک أحیاناً تبرکاً بالمأثور فإن لزوم الایھام ینتفی بالترک أحیاناً.

وفی الھندیة (۱/۷۸): ویکرہ أن یوقت شیئاً من القرآن لشئ من الصلوات قال الطحاوی والاسبیجابی ھذا اذا رآہ حتماً واجباً بحیث لا یجوز غیرہ أو رأی قراءۃ غیرہ مکروھة وأما اذا قرأ لا جل الیسر علیه أو تبرکاً فقراء ته ﷺ فلا کراھیة فی ذلک ولکن یشترط أن یقرأ غیرہ أحیاناً لئلا یظن الجاھل أن غیرہ لا یجوز ھکذا فی التبیین.

وفی الشامیة (۱/۵۴۴): ھذا، وقید الطحاوی والاسبیجابی الکراھة بما اذا رأی ذلک حتماً لا یجوز غیرہ أما لو قراء للتیسیر علیه أو تبرکاً بقراء ته علیه الصلاۃ والسلام فلا کراھة لکن بشرط أن یقرأ غیرھا أحیانا لئلا یظن الجاھل أن غیرھا لا یجوز واعترضه فی الفتح بأنه لا تحریر فیه لأن الکلام فی المداومة اھ.

وأقول: حاصل معنی کلام ھذین الشیخین بیان وجه الکراھة فی المداومة وھو أنه إن رأی ذلک حتماً یکرہ من حیث تغییر المشروع والا یکرہ من حیث ایھام الجاھل وبھذا الحمل یتاید أیضا

كلام الفتح السابق ويندفع اعتراضه اللاحق فتدبر.

(۱۷۶) آیت سجدہ کو بطور مذاق پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم ایک مدرسہ میں پڑھتے ہیں جب کھانے کیلئے جمع ہوتے ہیں تو ایک ساتھی کی عادت ہے کہ وہ سجدہ والی آیت پڑھ دیتا ہے سب ساتھی سجدہ کرتے اور اس کو منع کرتے ہیں مگر وہ باز نہیں آیا اس کی پٹائی بھی لگائی لیکن وہ باز نہ آیا، اب ہم نے کہا ہم سجدہ نہیں کریں گے اور گناہ تم کو ہوگا کیونکہ تم جان بوجھ کر ہمیں تنگ کرتے ہو، سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح دوسروں کو تنگ کرنے کیلئے جو پڑھے اس سے سجدہ تلاوت واجب ہوتا ہے یا نہیں؟ ہم سجدہ چھوڑ دیں تو وہ گناہگار ہوگا یا ہم بھی گناہگار ہوں گے کیونکہ اس کا قصد تلاوت نہیں بلکہ ہمیں تنگ کرنا مقصود ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... آیت سجدہ کی تلاوت کرنے سے یا سننے سے سجدہ تلاوت واجب ہوتا ہے تلاوت کرنے والے یا سننے والے کا ارادہ ہو یا نہ ہو۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ لوگوں پر آیت سجدہ سننے سے سجدہ کرنا واجب ہے اگرچہ آیت سجدہ تلاوت کرنے والا تنگ کرنے کی نیت سے تلاوت کرے البتہ اس طرح کرنے والا لوگوں کو تنگی میں مبتلا کرنے والا ہے جس کی وجہ سے وہ سخت گنہگار ہوگا، نیز آیات قرآنیہ کو بطور مذاق پڑھنے پر فقہاء نے ایسے شخص کے متعلق کفر کا حکم لکھا ہے۔ مذکورہ صورت میں بھی مذاق کی سی صورت پائی جارہی ہے اس لئے اس شخص کو اپنے اس فعل شنیع سے خوب توبہ واستغفار کرنا چاہیے اور آئندہ ایسی نازیبا حرکت سے اجتناب کرنا چاہیے۔

لمافي الهندية(۱/۱۳۲): والسجدة واجبة في هذه المواضع على التالي والسامع سواء قصد سماع القرآن اولم يقصد.

وفي الدرالمختار مع الشامية(۲/۱۰۴): (بشرط سماعها) فالسبب التلاوة وان لم يوجد السماع كتلاوة الاصم والسماع شرط في حق غير التالي ولو بالفارسية......

وفي الشامية تحته: وذكر في المجتبى ان الموجب للسجدة احد ثلاثة التلاوة والسماع والائتمام ...... وصرح ايضا بان السماع شرط في حق غير التالي.

وفي الفقه الاسلامي وادلته(۲/۱۱۲۶): سجدة التلاوة واجبة بالتلاوة على القارى والسامع عند الحنفية، سنة عند بقية الفقهاء سواء عند الحنفية والشافعية قصد السامع سماع القرآن اولم يقصد اى فتطلب من القارى والمستمع (وهو قاصد السماع) والسامع (وهو من لم يقصد السماع)...... استدل الحنفية على الوجوب بحديث (السجدة على من سمعها وعلى من تلاها) وفيه ايضاً(صـ۱۱۴۱) يستحسن اخفاء اية السجدة عن سامع غيرمتهئ للسجود.

وفي الهندية(۲/۲۶۶): اذا انكر الرجل آية من القرآن او تسخر بآية من القرآن وفي الخزانة

او عاب کفر کذا فی التاتارخانية.

وفی بزازية علی هامش الهندية(۶/۳۳۸): قرأ القرآن علی ضرب الدف والقضيب يكفر لاستخفافه وأدب القرآن ان لا يقرأ فی مثل هذه المجالس. والمجلس الذی اجتمعوا فيه للغنا والرقص لا يقرأ فيه القرآن كما لا يقرأ فی البيع والكنائس لانه مجمع الشيطان قال من ذكر الله كبر يكفر. ادخال اية القرآن فی المزاح والدعا به كفر لانه استخفاف به وكذا المزاح به مثل ان يقول قل هو الله احد راپوست بردی. الخ.

(۱۷۷) نماز میں قرآن مجید پڑھتے ہوئے غلطی کرنا

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پچھلے سال مدرسہ کی سالانہ چھٹیوں میں، میں چلّے میں گیا تھا، ہماری تشکیل بلوچستان کے پہاڑی علاقے ڈیرہ بگٹی میں ہوئی وہاں مسجد کے جو امام صاحب تھے قرآن پڑھتے ہوئے تلفظ صحیح طریقے سے ادا نہیں کر سکتے تھے اور ایک بڑی غلطی یہ کرتے کہ الحمدللہ میں الحمد کے الف کو کھینچ کر پڑھتے، تو میں نے ان سے کہا کہ اس طرح پڑھنے سے معنی غلط ہو جاتا ہے اور اس سے نماز بھی مکروہ ہو جاتی ہے تو امام صاحب نے کہا کہ میرے پیچھے کئی مرتبہ علماء نے نماز پڑھی ہے مگر کسی نے اعتراض نہیں کیا ہے تم تبلیغی لوگ ویسے علماء پر اعتراضات کرتے ہو۔ تو میں خاموش ہو گیا کہ جب علماء کرام نے کچھ نہیں فرمایا ہے تو شاید نماز اس سے فاسد نہ ہوتی ہو، مگر دل پھر بھی مطمئن نہ ہوا، لہٰذا مفتی صاحب آپ فرمائیں قرآن وسنت کی روشنی میں کیا اس طریقے سے قرآن پڑھنا جائز ہے؟ کیا اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی؟

الجواب حامداً ومصلياً..... نماز میں قرآن شریف کو صحیح نہ پڑھنا اور تلفظ ادا کرنے میں ایسی غلطی کرنا جس سے معنی میں بگاڑ لازم آتا ہو۔ ایسی غلطی سے نماز فاسد ہو جاتی ہے اور جس غلطی سے معنی میں بگاڑ لازم نہ آتا ہو، تو ایسی غلطی سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں امام صاحب کا الحمد کے الف کو کھینچ کر پڑھنے سے نماز فاسد ہوگی۔ کیونکہ الف کو کھینچ کر پڑھنے سے ہمزہ استفہام بن کر الحمدللہ کا معنی بگڑ جاتا ہے۔

لمافی الهندية(۱/۶۸): ولو قال الله اكبر مع الف الاستفهام لا يصير شارعاً بالاتفاق.

وفيه ايضاً(صـ۷۹): ان ذكر حرفاً مكان حرف ولم يغير المعنى..... لم تفسد صلوته، وان غير المعنى فان امكن الفصل بين الحرفين من غير مشقة كالطاء مع الصاد فقرأ الطالحات مكان الصالحات تفسد صلوته عند الكل وان كان لايمكن الفصل بين الحرفين الا بمشقة كالظاء مع الضاد والصاد مع السين والطاء مع التاء اختلف المشائخ قال اكثرهم لاتفسد صلاته هكذا فی فتاوی قاضيخان وكثير من المشايخ افتوابه.

وفی الدر المختار (۱/۶۳۰): ومنها مد الهمزة فی التکبیر کمامر، ومنها القراءة بالالحان ان غیر المعنیٰ والا لا، الا فی حرف مدّولین اذا فحش والا لا بزازیة.

وفی الشامیة تحته: (قوله والا لا الخ) ای وان لم یغیر المعنی فلا فساد الافی حرف مدّ ولین ان فحش فانه یفسد، وان لم یغیر المعنیٰ.

(۱۷۸) دورانِ نماز سورتوں کے درمیان قصداً ترتیب نہ رکھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے میں مسجد کا جو امام ہے وہ ایک نوجوان آدمی ہے جو کہ صرف حافظ قرآن ہے اب تک اُس نے عالم کا کورس نہیں کیا ہے، بعض اوقات یہ حافظ صاحب نمازوں میں پہلی رکعت میں کوئی سورت پڑھ لیتا ہے پھر دوسری رکعت میں اُس سے پیچھے والی سورت پڑھ لیتا ہے۔ تو ایک دن عشاء کی نماز میں جب اس نے اسی طرح کیا تو نماز کے بعد میں نے کہا کہ حافظ صاحب اس طرح پڑھنا جائز نہیں ہے اور اِس سے نماز فاسد ہوتی ہے تو حافظ صاحب نے کہا کہ قرآن پاک میں اللہ پاک کا ارشاد مبارک ہے ''فَاقْرَؤُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ '' (قرآن مجید میں سے جو آسان ہو پڑھ لو) لہٰذا جس طرح بھی پڑھ لیں نماز ہو جاتی ہے مگر حافظ صاحب چونکہ عالم یا مفتی نہیں ہیں لہٰذا اس کی بات پر مجھے اطمینان نہیں ہوا، لہٰذا مفتی صاحب آپ بتائیں، کیا اس طرح جان بوجھ کر نماز میں قرأت جائز ہے؟ کیا اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... سورتوں کے درمیان ترتیب کی رعایت رکھنا یہ قرآن مجید کی تلاوت کے واجبات میں سے ہے اگر کسی شخص سے غیر ارادی طور پر کبھی سورتوں میں تقدیم اور تاخیر ہو جائے تو نماز بلا کراہت ادا ہو جاتی ہے البتہ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر ایسا فعل کرے تو فرض نماز مکروہ ہوتی ہے نفل نہیں، لہٰذا صورت مسئولہ میں حافظ صاحب کا قصداً اس طرح کرنا اور اس بات کو اپنی عادت بنالینا ٹھیک نہیں کیونکہ اس صورت میں فرض نماز کی ادائیگی کراہت کے ساتھ ہوتی ہے البتہ آپ کا یہ کہنا کہ اس طرح سورتوں میں تقدیم وتاخیر کرنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے تو یہ کہنا صحیح نہیں، کیونکہ سورتوں کے درمیان ترتیب کی رعایت یہ قرآن کی تلاوت کے واجبات میں سے ہے نہ کہ نماز کے واجبات میں سے لہٰذا نماز فاسد نہیں ہوتی مگر قصداً اس طرح کرنے سے فرض نماز مکروہ ضرور ہوتی ہے، لہٰذا حافظ صاحب کو احسن طریقے سے مسئلہ بتا دیا جائے۔

لمافی البحر الرائق (۲/۱۶۵): ...... لو قرأ سورة ثم قرأ فی الثانیة سورة قبلها ساهیا لا یجب علیه السجود لان مراعاة ترتیب السور من واجبات نظم القران لامن واجبات الصلاة فترکها لا یوجب سجود السهو.

وفی الهندیة (۱/۷۸): واذا قرأ فی رکعة سورة وفی الرکعة الاخری اوفی تلک الرکعة سورة فوق تلک السورة یکره...... هذا کله فی الفرائض واما فی السنن فلا یکره.

وفی الدرالمختار (۱/۵۴۶): ویکرہ الفصل بسورۃ قصیرۃ وان یقرأ منکوسا الا اذا ختم فیقرأ من البقرۃ وفی القنیۃ قرأ فی الاولی الکافرون وفی الثانیۃ الم تر او تبت ثم ذکر یتم وقیل یقطع ویبدأ

وفی الشامیۃ تحتہ: (قولہ وان یقرأ منکوسا) بان یقرأ فی الثانیۃ سورۃ اعلی مما قرأ فی الاولی، لان ترتیب السور فی القراءۃ من واجبات التلاوۃ وانما جوز للصغار تسھیلا لضرورۃ التعلیم......(قولہ ثم ذکر یتم) افاد ان التنکیس او الفصل بالقصیرۃ انما یکرہ اذا کان عن قصد فلو سھوا فلا کما فی شرح المنیۃ.

وفیہ ایضاً (۱/۴۵۷) ویؤیدہ ایضا انھم قالوا یجب الترتیب فی سور القران فلو قرأ منکوسا اثم لکن لا یلزمہ سجود السھو لان ذلک من واجبات القراءۃ لامن واجبات الصلوۃ کما ذکرہ فی البحر فی باب السھو لکن قولھم کل صلوۃ ادیت مع کراھۃ التحریم یشمل ترک الواجب وغیرہ ویؤیدہ ماصرحوا بہ من وجوب الاعادۃ بالصلاۃ فی ثوب فیہ صورۃ بمنزلۃ من یصلی وھو حامل الصنم.

(۱۷۹) دورانِ تلاوت سورتوں کے درمیان ترتیب قائم رکھنا کیوں واجب ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دن ہمارے امام صاحب غائب تھے تو ایک بوڑھے آدمی کو لوگوں نے نماز کیلئے آگے کر دیا اس نے پہلی رکعت میں ارأیت الذی (سورۃ الماعون) پڑھی، دوسری رکعت میں الم تر (سورۃ الفیل) پڑھی مسجد میں شور شروع ہوگیا قرآن الٹا پڑھا نماز نہیں ہوئی، متولی صاحب کھڑے ہوگئے اور لوگوں کو خاموش کرایا اور کہا نماز ہوجاتی ہے پھر ہم دو آدمی دوسری مسجد کے امام کے پاس چلے گئے ان سے سوال کیا انہوں نے فرمایا کہ نماز ہوگئی البتہ اس طرح پڑھنا مکروہ ہے وہاں سے تو ہم خاموشی سے چلے آئے مگر میرے ذہن میں یہ بات آتی رہی مکروہ کیوں ہے؟ سارا قرآن ہے جہاں سے پڑھو پھر یہ کراہت کیوں؟ جبکہ بی اے کے نصاب میں ہم نے پڑھا تھا کہ قرآن کی ترتیب نزولی اور ہے جب نازل ہونے میں کسی ترتیب کی ضرورت نہیں پھر بغیر ترتیب کے پڑھنے سے کیوں کراہت آتی ہے؟ مہربانی فرما کر تشفی فرمائیں تاکہ میرے عقائد میں اس وجہ سے کوئی خلل نہ آئے اور اکابر پر بدگمانی نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی جزاء عطا فرمائے۔

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں مذکورہ امام صاحب کا یہ کہنا کہ نماز ہوگئی البتہ اس طرح پڑھنا مکروہ ہے تو یہ بات ٹھیک ہے مگر یہ بات جان لیجئے کہ سورتوں کے درمیان ترتیب کی رعایت یہ تلاوتِ قرآن مجید کے واجبات میں سے ہے نہ کہ نماز کے واجبات میں سے لہٰذا اگر کسی شخص سے بغیر قصد کے اس طرح ہوجائے تو نماز بلا کراہت درست ہے ہاں اگر قصداً اس طرح تقدیم وتاخیر کرے تو فرض نماز مکروہ ہوتی ہے نفل نہیں، جہاں تک آپ کی یہ بات رہی کہ سارا قرآن ہے جہاں سے دل چاہے پڑھو اور آپ کا ''بی اے'' کے نصاب میں یہ بات پڑھنا کہ ترتیب نزولی کچھ اور تھی تو جہاں سے دل چاہے پڑھو اور نماز میں اس طرح کرنے سے کراہت کیوں آتی ہے تو یہ بات سمجھ لیں کہ اگرچہ ترتیب نزولی قرآن مجید کی کچھ اور تھی اور وجہ اس کی موقع ومحل کی مناسبت اور ضرورت تھی کہ جب جس مسئلہ کی

ضرورت ہوئی تو اللہ رب العزت نے وحی کے ذریعے اس کو نازل کردیا مگر جب وحی نازل ہوتی تھی تو حضرت جبرئیل علیہ السلام آکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کرتے تھے کہ اس آیت کو فلاں سورۃ میں فلاں آیت کے بعد رکھیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کاتبینِ وحی کو اسی طرح حکم فرمایا کرتے تھے اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اسی طرح قرآن کو لکھا جس طرح آپ سے سنا، اگرچہ قرآن مجید کو مصحف میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دار فانی سے پردہ فرما جانے کے بعد جمع کیا گیا لیکن صحابہ نے صرف جمع کرنے میں سعی کی، ترتیب میں نہیں، ترتیب وہی تھی جس کو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بطور تلاوت کے سنا تھا یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا تھا کہ اس ترتیب سے رکھو اور مصحف میں اس ترتیب کے ساتھ رکھنے پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اجماع ہے اس وجہ سے سورتوں کے درمیان ترتیب قائم رکھنا دورانِ تلاوت، تلاوت کے واجبات میں سے ہے، لہٰذا اس واجب کے ترک کی بناء پر (جو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور صحابہ کے اجماع سے ثابت ہے) کراہت آتی ہے۔

لمافی البحر الرائق(۱۶۵/۲): الرابع سببه ترک واجب من واجبات الصلاة الاصلية سهوا وهو المراد بقوله "بترک واجب" لاکل واجب بدليل ماسنذکره من انه ترک ترتيب السور لا يلزمه شی مع کونه واجبا وهو اجمع ما قيل فيه.......... لو قرأ سورة ثم قرأ فی الثانية سورة قبلها ساهيا لا يجب عليه السجود لان مراعاة ترتيب السور من واجبات نظم القران لامن واجبات الصلاة فترکها لا يوجب سجود السهو.

وفی الهندية(۷۸/۱): واذا قرأ فی رکعة سورة وفی الرکعة الاخری اوفی تلک الرکعة سورة فوق تلک السورة يکره...... هذا کله فی الفرائض واما فی السنن فلا يکره.

وفی الشامية(۵۴۶/۱): ويکره الفصل بسورة قصيرة وان يقرأ منکوسا الا اذا ختم فيقرأ من البقرة وفی القنية قرأ فی الاولی الکافرون وفی الثانية الم تر أوتبت ثم ذکر يتم وقيل يقطع يبدأ (قوله وان يقرأ منکوسا) بان يقرأ فی الثانية سورة اعلی مما قرأ فی الاولی، لان ترتيب السور فی القراء ة من واجبات التلاوة وانما جوز للصغار تسهيلا لضرورة التعليم (قوله ثم ذکريتم) افاد ان التنکيس او الفصل بالقصيرة انما يکره اذا عن قصد فلو سهوا فلا کما فی شرح المنية، وفيه ايضاً(۴۵۷/۱): ويؤيده ايضا انهم قالوا يجب الترتيب فی سور القران فلو قرأ منکوسا اثم لکن لا يلزمه سجود السهو لان ذلک من واجبات القراء ة لامن واجات الصلوة کما ذکره فی البحر فی باب السهو.

(۱۸۰) ایک رکعت میں دو سورتیں ملا کر پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جمعرات کی رات کو چونکہ مدرسہ میں چھٹی ہوتی

اپنے گھر کو چلا گیا مغرب کو جب نماز پڑھنے کیلئے مسجد گیا تو امام صاحب نے نماز پڑھانے کیلئے مجھے کہا، تو میں نے مغرب کی نماز میں پہلی رکعت میں الم ترکیف اور سورۃ قریش دونوں پڑھیں اور دوسری رکعت میں سورہ اخلاص پڑھی، سلام پھیرنے کے بعد امام صاحب نے کہا کہ جماعت پڑھاتے ہوئے دو سورتیں ایک رکعت میں نہیں پڑھنا چاہیے میں نے کچھ نہیں کہا اور سوچا کہ مدرسہ جا کر مفتی صاحب سے پوچھ لیں گے۔ لہٰذا مفتی صاحب آپ بتلائیں کہ مذکورہ امام کا یہ کہنا کہ ’’فرض نماز کی جماعت کراتے ہوئے دو سورتوں کو ملا کر ایک رکعت میں نہیں پڑھنا چاہیے‘‘ صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......بہتر یہ ہے کہ فرض نماز کی ایک رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد ایک سورت پڑھی جائے دو سورتیں نہ پڑھے اگر دو سورتیں پڑھ لیں، جیسا کہ صورت مذکورہ میں ہے تو بھی بلا کراہت نماز جائز ہے لہٰذا امام صاحب کی بات درست ہے۔

لمافی بدائع الصنائع (۲/۴۴): ولو جمع بین السّورتین فی رکعة لا یکره لما روی أنّ النبی ﷺ اوتر بسبع سور من المفصّل والافضل الّا یجمع.

وفی الهندیة (۱/۷۸): واذا جمع بین سورتین بینهما سور أو سورة واحدة فی رکعة واحدة یکره وأمّا فی الرّکعتین ان کان بینهما سور لا یکره الخ......

وفی الشامیة(۱/۵۴۶): وفی التاتارخانیة: اذا جمع بین سورتین فی رکعة رایت فی موضع انّه لا بأس به وذکر شیخ الاسلام لاینبغی له ان یفعل علی ما هو ظاهرالروایة اهـ وفی شرح المنیة: الاولیٰ ان لا یفعل فی الفرض ولو فعل لا یکره إلّا ان یترک بینهما سورة أو أکثر.

﴿فصل فیما یفسد الصلاۃ وما یکرہ فیھا﴾

(نماز کے مفسدات اور مکروہات کا بیان)

(۱۸۱) دورانِ نماز ستر کھل جانے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک بچہ ہے جس کی عمر دو تین سال ہے میں جب نماز پڑھتی ہوں تو میرے پاس آ کر میرا دوپٹہ اتار لیتا ہے جس کی وجہ سے میرا سر ننگا ہو جاتا ہے بسا اوقات میرے آگے آ کر بیٹھ جاتا ہے میں اس کو ایک طرف کر کے سجدہ کر لیتی ہوں اب سر ننگا ہونے کی وجہ سے یا بچہ کو ہٹانے کی وجہ سے میری نماز میں فساد آئے گا یا نماز درست ہو جائے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... عورت کا نماز کے اندر سوائے چہرہ، ہتھیلی اور قدموں کے تمام بدن کا چھپانا فرض ہے۔ بدن کے جو اعضاء ستر میں داخل ہیں اگر ان میں سے کسی ایک کا چوتھائی یا اس سے زیادہ حصہ نماز پڑھتے وقت کھل جائے اور اتنی دیر کھلا رہے کہ اس دوران میں تین مرتبہ تسبیح پڑھی جا سکتی ہو تو نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ البتہ اگر کھلتے ہی فوراً کھلے ہوئے حصے کو عمل قلیل کے ساتھ چھپالیں تو نماز فاسد نہیں ہوتی۔ عمل قلیل سے مراد وہ کام ہے جو ایک ہاتھ کے ذریعے سے کیا جا سکے اور اس میں تکرار بھی نہ ہو۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر آپ کا سر اتنی دیر تک ننگا رہے کہ اس دوران میں تین مرتبہ تسبیح پڑھی جا سکتی ہے تو آپ کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ البتہ اگر سر کھلتے ہی فوراً عمل قلیل کے ساتھ سر کو دوبارہ چھپالیں تو آپ کی نماز درست ہو جائے گی۔ اسی طرح سجدہ کرنے کیلئے سامنے بیٹھے ہوئے بچے کو عمل قلیل کے ذریعے ایک طرف ہٹا دینے سے بھی نماز فاسد نہیں ہوگی۔

لمافی الھندیة(۱/۵۸): بدن الحرة عورة الاوجهها و كفيها وقدميها كذا فی المتون وشعر المرأة ماعلی راسها عورة واما المسترسل ففيه روايتان الاصح انه عورة كذا فی الخلاصة وهو الصحيح وبه اخذ الفقيه ابو الليث و عليه الفتوى كذا فی معراج الدراية...... وان انكشف عورته فی الصلاة فسترها بلا مكث جازت صلاته اجماعا وان ادى ركنا مع الانكشاف فسدت اجماعاً ...... والعمل القليل ان تاخذه بيدواحدة كذا فی السراج الوهاج.

وفی الدرالمختار(۱/۴۰۵): (وللحرة) ولو خنثى (جميع بدنها) حتى شعرها النازل فی الاصح (خلا الوجه والكفين) فظهر الكف عورة على المذهب (والقدمين)

وفیه ایضاً(۱/۴۰۸):(ویمنع)حتی انعقادها(کشف ربع عضو)قدر اداء رکن بلاصنعه (من عورة غلیظة او خفیفة علی المعتمد(والغلیظة قبل ودبر وماحولهما والخفیفة ماعدا ذلک) من الرجل والمرأة

وفی الشامیة (۱/۴۰۸): (قوله حتی انعقادها)...... ای ویمنع صحة الصلاة حتی انعقادها، والحاصل انه یمنع الصلاة فی الابتداء ویرفعها فی البقاء ح (قوله قدر اداء رکن) ای بسنته منیة قال شارحها وذلک قدر ثلاث تسبیحات اھ.

وفی الهندیة(۱/۱۰۱): العمل الکثیر یفسد الصلاة والقلیل لا کذا فی محیط السرخسی...... وفیه ایضاً (صـ۱۰۲) وکل ما یقام بید واحدة فهو یسیر مالم یتکرر کذا فی فتاوی قاضیخان......

(والثالث) انه لو نظر الیه ناظر من بعید ان کان لا یشک انه فی غیر الصلاة فهو کثیر مفسد وان شک فلیس بمفسد وهذا هو الاصح هکذا فی التبیین وهو احسن کذا فی المحیط السرخسی وهو اختیار العامة کذا فی فتاویٰ قاضیخان والخلاصة.

وکذا اذا تردی برداء او حمل شیئا خفیفا یحمل بید واحدة او حمل صبیا او ثوباً علی عاتقه لم تفسد صلاته کذا فی فتاوی قاضیخان. وان حمل شیئا بحیث یتکلف بحمله وله مونة فسدت صلاته کذا فی الظهیریة.

(۱۸۲) نماز میں قرآن یا کوئی لکھی ہوئی تحریر دیکھ کر پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے کمرے میں مغرب کی جانب دیوار میں ایک بڑا سا چارٹ لگا ہوا ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا شجرہ نسب تفصیل سے لکھا ہوا ہے جب میں کمرے میں نماز پڑھتا ہوں تو بعض اوقات میری نظر اس پر پڑ جاتی ہے کبھی تو الفاظ بھی پڑھ لیتا ہوں تو کیا میری نماز صحیح ہو جائیگی یا دوبارہ لوٹانا لازم ہوگا؟

الجواب حامداًومصلیاً...... اگر کوئی شخص نماز میں قرآن دیکھ کر پڑھتا ہے تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی تھوڑا پڑھا ہو یا زیادہ لہٰذا نماز دوبارہ پڑھے گا اگر اس نے قرآن میں دیکھا اور سمجھ گیا لیکن زبان سے نہیں پڑھا تو اس کی نماز درست ہے لیکن مکروہ ہے۔ لہٰذا اگر آپ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا شجرہ مبارک زبان سے پڑھ لیا تو آپ کی نماز فاسد ہے دوبارہ پڑھنی ہوگی۔

لمافی الدر المختار(۱/۶۲۳): وقراء ته من مصحف ای مافیه قرآن مطلقا لانه تعلم وفی الشامیة قوله ای مافیه قرآن عممه لیشمل المحراب فانه اذا قرأ مافیه فسدت فی الصحیح (قوله مطلقا) ای قلیلا او کثیرا اماماً أو منفردا امیا لا یمکنه القراء ة الا منه اولا.

وفی الفقه الاسلامی (۲/۱۰۲۴): ولا تفسد الصلوة بالنظر الی مکتوب وفهمه غیر انه مکروه اما

القراءة من المصحف فتفسد الصلوة عند ابی حنیفة لان حمل المصحف والنظر فیه وتقلیب الاوراق عمل کثیر ولانه یشبه التلقین من الآخرین.

(۱۸۳) نماز کے اندر سونے کی حالت میں ہنسنا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو، اور نماز کی حالت میں اس کو نیند آجائے تو کیا اس سے نماز میں کچھ خلل پڑے گا یا نہیں؟ نیز اگر نیند کے اندر وہ ہنسنے لگ جائے تو پھر اس کی نماز کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... قہقہہ وہ ہنسی ہے جو دوسرے کو بھی سنائی دے۔ اس سے بیداری کی حالت میں وضو اور نماز دونوں فاسد ہو جاتے ہیں۔ ضحک وہ ہنسی ہے جس کی آواز اپنے تک محدود رہے۔ اس سے بیداری کی حالت میں نماز فاسد ہوتی ہے، نہ کہ وضو۔ اور تبسم وہ مسکراہٹ ہے جس میں کوئی آواز نہ ہو۔ اس سے نہ نماز فاسد ہوتی ہے نہ وضو۔ اور نماز کی حالت میں نیند آنے سے نماز میں کچھ خلل نہیں پڑتا۔ بشرطیکہ نماز ہیئت مسنونہ پر ہو، اور نماز کے اندر سونے کی حالت میں ہنسنے یعنی ضحک سے نہ نماز فاسد ہوتی ہے نہ وضو، اور سونے کی حالت میں قہقہہ لگانے سے صرف نماز فاسد ہو جاتی ہے وضو نہیں ٹوٹتا۔

لمافی تاتارخانیه(۱/۱۳۸): وکذلک القهقهة من النائم فی الصلاة لاینقض الوضوء...... هکذا وقع فی بعض الکتب وذکر الزندوسی فی نظمه، اذا نام فی صلوته قائماً او ساجداً ثم قهقهه لا روایة لهذا فی الاصول قال شداد بن اوس (قال ابو حنیفةؒ تفسد صلوته ولایفسد وضوءه وهکذا افتیٰ الفقیه عبدالواحدؒ.

وفی الهندیة(۱/۱۲): ومنها النوم، ینقضه النوم مضطجعاً فی الصلوة وفی غیرها بلاخلاف بین الفقهاء وکذا النوم متورّکاً بأن نام علی احدورکیه هکذا فی البدائع ...... ولا ینقض نوم القائم والقاعد ولو فی السرج او المحمل ولا الراکع ولا الساجد مطلقاً ان کان فی الصلوة وان کان خارجها فکذلک.

وفی الشامیة(۱/۱۴۱): قال فی شرح الوهبانیة، ظاهر الروایة ان النوم فی الصلوة قائماً او قاعداً او ساجداً لا یکون حدثاً سواء غلبه النوم او تعمده، وفی جوامع الفقه انه فی الرکوع والسجود لاینقض ولو تعمده ولکن تفسد صلوته.

وفی تبیین الحقائق(۱/۵۶): ثم القهقهة ما یکون مسموعاً له ولجیرانه بدت اسنانه اولا وقد تقدم حکمها، والضحک مایکون مسموعاً له دون جیرانه وهو مبطل للصلوة دون الوضوء والتبسم مالاصوت فیه ولا تأثیر له فی واحد منهما.

(۱۸۴) عورت اگر مرد کے محاذاۃ میں کھڑی ہواور دونوں نماز میں مشترک ہوں تو اس کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دن میں گھر میں ظہر کی نماز ادا کرر ہا تھا دو رکعت فرض ادا کئے تھے کہ میری بیوی نے اسی مصلے پر میرے ساتھ نماز پڑھنا شروع کردی اسی دوران میری بیوی کے بڑے بھائی آگئے جو کہ عالم ہیں انہوں نے دیکھ کر فرمایا آپ کی نماز فاسد ہوگئی ہے کیونکہ آپ نے عورت کے ساتھ کھڑے ہوکر نماز پڑھی ہے اب آپ حضرات سے معلوم یہ کرنا ہے کہ واقعی میری نماز فاسد ہوگئی ہے یا نہیں؟ دوبارہ لوٹانے کی ضرورت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... جب کوئی عورت نماز میں مرد کے ساتھ یا آگے اس طرح کھڑی ہوجائے کہ دونوں کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو، اور نہ دونوں میں ایک آدمی کے کھڑے ہونے کے بقدر فاصلہ ہو، اور دونوں ایک ہی نماز میں شریک ہوں، یعنی ایک امام کی اقتداء میں نماز پڑھ رہے ہوں، تو مرد کی نماز فاسد ہوجاتی ہے۔ صورت مسئولہ میں چونکہ یہ صورت نہیں پائی گئی لہٰذا آپ کی نماز صحیح ہے۔ دوبارہ لوٹانے کی ضرورت نہیں، مگر اس طرح عورت کے ساتھ کھڑے ہوکر نماز پڑھنا مکروہ ہے، اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

لمافی الهندية(۱/۸۹): محاذاة المرأة الرجل مفسدة لصلاته...... والمسبوق بان فی حق التحريمة منفرد فيما يقضيه فلو حاذت الرجل المرأة فيما يقضيان لاتفسد صلوته. كذا فی التبيين.

وفی الدر المختار مع الشامية(۱/۵۷۴): (مشتركة) فمحاذاة المصلية لمصل ليس فی صلاتها مكروهة لامفسد.

وفی الشامية تحته: (قوله ليس فی صلاتها) بأن صليا منفردين أو مقتديا أحدهما بامام لم يقتدبه الآخر شرح المنية (قوله مكروهة) الظاهر انها تحريمة لانها مظنة الشهوة والكراهة على الطارئ ط، قلت: وفی معراج الدراية: وذكر شيخ الاسلام مكان الكراهة الاساءة، والكراهة أفحش اهـ.

وفی الشامية(۱/۵۷۳): فالتفسير الصحيح للمحاذاة مافی المجتبى: المحاذاة المفسدة ان تقوم بجنب الرجل من غير حائل او قدامه.

(۱۸۵) مرد کا عورت کے پیچھے کھڑے ہوکر اپنی نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ گھر پر عورت مرد سے آگے نماز پڑھ رہی ہے۔ یعنی مرد اس کے پیچھے کھڑے ہوکر نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر دل میں یہ خیال آجائے کہ عورت امامت کررہی ہے جبکہ وہ امامت نہیں کررہی ہوتی، اس صورت میں مرد کی نماز ہوگی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اصل حکم یہ ہے کہ مرد عورت سے آگے کھڑا ہوکر نماز پڑھے تاکہ نماز میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔ تاہم گھر وغیرہ پر محرم

عورت یا بیوی آگے نماز پڑھ رہی ہے۔ اور مرد اس کے پیچھے کھڑا ہو کر نماز پڑھ لے اس طور پر کہ نماز میں یکسوئی برقرار رہے اور کوئی خلل بھی واقع نہ ہو تو نماز پڑھ سکتا ہے۔ اور دل میں صرف یہ خیال آنا کہ ''عورت امامت کرا رہی ہے'' نماز کیلئے مخل نہیں جبکہ حقیقت میں وہ امامت کرا بھی نہیں رہی ہے۔

لمافی صحیح البخاری(۱/۷۴): عن عائشة رضی الله عنها قالت بئسما عدلتمونا بالکلب و الحمار لقد رأیتنی ورسول الله ﷺ یصلی وانا مضطجعة بینه وبین القبلة فاذا اراد ان یسجد غمز رجلی فقبضتهما.

وفی الشامیة(۱/۶۳۴): (قوله ولو امرأة او کلبا) بیان للاطلاق، واشار به إلی الرد علی الظاهریة بقولهم. یقطع الصلاة مرور المرأة والکلب والحمار.

(۱۸۶) تعدادِ رکعات میں شک کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ میرے ایک عزیز ہیں جنہیں نماز کے دوران اکثر شک پڑ جاتا ہے کہ دو رکعتیں پڑھیں یا تین، ایسی صورت میں انہیں کیا کرنا چاہئے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......دورانِ نماز اگر رکعتوں کی تعداد میں اکثر شک ہوتا ہو تو تحری، غور وفکر کے ذریعے جس جانب ظن غالب ہو اس کے مطابق نماز پوری کرلیں اور اگر کسی ایک جانب ظن غالب نہ ہو تو کم رکعتوں پر بنا کریں اور ہر رکعت پر قعدہ کرکے آخر میں سجدہ سہو کرلیں۔

لمافی الدر المختار(۲/۹۲،۹۳): (اذاشک) فی صلاته..................(وان کثر)شکه (عمل بغالب ظنه ان کان) له ظن للحرج (والاا خذبالاقل) لتیقنه (وقعدفی کل موضع توهمه موضع قعوده) و لو واجبالئلا یصیر تارکافرض القعود او واجبه،

وفی الشامیة تحته: ولوشک انها الثانیة او الثالثة اتمها وقعد ثم صلی اخری وقعد ثم الرابعة وقعد وتمامه فی البحر.

(۱۸۷) نماز میں قطرہ کا وہم اور تعداد رکعات میں شک کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری شادی کو تقریباً ڈیڑھ سال ہو گیا ہے شادی سے پہلے میں بہت دین کا کام کرتی تھی اور بہت زیادہ عبادت کرتی تھی گھر کے تمام کام خود کرتی تھی اور جو کچھ احادیث پڑھتی تھی اُن پر عمل کرتی تھی پھر دوسری حدیث پڑھتی تھی۔

(۱)۔ بہر حال مسئلہ یہ ہے کہ میں آپ کو زیادہ تفصیل نہیں بتا سکتی بس اتنا بتا سکتی ہوں جتنا نماز کو اچھا اور خوبصورت بنانا چاہتی ہوں اتنی ہی نماز میں بھولتی ہوں میں اول وقت میں نماز پڑھتی تھی اللہ کی توفیق سے اور اب بھی میری یہی کوشش ہوتی ہے مگر مجھے بیماری ایسی ہے کہ پیشاب نکل جاتا ہے وہ بھی صرف قطرہ اور کبھی وہم ہوتا اور ایسا لگتا ہے کہ نکل گیا۔ پوری نماز میں مجھے یہی ہوتا ہے کہ نکل گیا جب دیکھتی ہوں تو بعض دفعہ تو ایک قطرہ ہوتا ہے یا نقطہ بعض دفعہ کچھ نہیں مگر نماز میں یہی خیال ہوتا ہے کہ نکل گیا نماز پڑھنے کھڑی ہوتی چار رکعت کی نیت کرتی ہوں اور آرام سے صحیح سے پڑھتی ہوں اور پھر بھول جاتی ہوں کہ کتنی رکعت پڑھی پھر دوبارہ پڑھتی ہوں اور کہیں جاتی ہوں وضو کر کے کہ اگر اذان ہوگی تو فوراً نماز پڑھ لوں گی تو یہی خیال ہوتا ہے کہ پہلے پیشاب کرلوں وضو ٹوٹ گیا نماز کو دیر ہو جاتی ہے اور جب کھڑی ہو جاؤں جلدی تو بھول جاتی ہوں کہ کیا پڑھا اور سوچتی ہوں کہ نفل پڑھوں گی قرآن پڑھوں گی بعض دفعہ تو پڑھ لیتی ہوں اور بعض دفعہ وقت نہیں رہتا اسی میں تھک جاتی ہوں جب باتھ روم جاتی ہوں تو اتنی دیر ہو جاتی ہے پیشاب رک رک کے آتا ہے بار بار دھوتی ہوں پہلے ہر وقت وضو رہتا تھا۔

الجواب حامداً ومصلیاً......(۱)۔ ہر وہ شخص جس کو قطروں کی بیماری ہو، اور اس کے پیشاب کے قطرے ہر وقت ٹپکتے رہتے ہوں اور اس کو نماز پڑھنے کے وقت کے بقدر بھی قطروں سے افاقہ نہ ہوتا ہو تو وہ شخص معذور ہوگا اور اگر یہ کیفیت اور حالت نہ ہو بلکہ پوری نماز بغیر قطروں کے ٹپکنے کے پڑھی جاسکتی ہو تو وہ شخص معذور شمار نہیں ہوگا، لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ معذور کے حکم میں نہیں ہیں اس لئے اچھے طریقے سے وضوء کر کے نماز شروع کریں۔ دورانِ نماز قطرے گرنے کے جو خیالات آتے رہتے ہیں ان کی طرف توجہ نہ دیں بلکہ اپنی نماز پوری کرلیں لیکن اگر قطرے گرنے کا یقین ہو جائے تو پھر نماز توڑ کر وضو کر کے دوبارہ پڑھ لیں۔ بغیر یقین کے جتنے بھی وہم اور خیال قطروں کے گرنے کے آئیں تو نماز نہ توڑیں بلکہ اپنی نماز کو اسی حالت میں پوری کرلیں۔ رہا نماز میں بھول جانے کا مسئلہ تو اس کا حکم یہ ہے کہ جب آپ نماز میں بھول جائیں تو غور وفکر کر کے جتنی رکعت پڑھنے کا ظن غالب ہو جائے اسی رکعت سے آگے پڑھ لیں مثلاً دو اور تین رکعت میں اگر ظن غالب تین رکعتوں کا ہے تو تیسری رکعت سے آگے پڑھنا شروع کریں اور اگر ظن غالب دو رکعتوں کا ہے تو دوسری رکعت سے آگے پڑھنا شروع کریں۔ اور اگر تحری کے باوجود ظن غالب کسی رکعت کا حاصل نہیں ہوتا ہو تو پھر بناء علی الاقل کریں۔ یعنی مثلاً تین اور چار میں تین رکعت پر اکتفاء کر کے مزید ایک رکعت اور ساتھ ملالیں۔ اور پھر آخر میں سجدہ سہو کرلیں۔

لمافی البخاری(۱/۲۵): عن عباد بن تمیم عن عمه انه شکیٰ الی رسول الله ﷺ الرجل الذی یخیل الیه انه یجد الشئ فی الصلاۃ فقال لا ینفتل او لاینصرف حتی یسمع صوتا او یجد ریحا.

وفی الدر المختار (۲/۹۲، ۹۳، ۹۴): (واذاشک) فی صلاته (من لم یکن ذلک) ای الشک (عادة له) وقیل من لم یشک فی صلاة قط بعد بلوغه وعلیه اکثر المشائخ بحر عن الخلاصة (کم صلی استأنف) بعمل مناف و بالسلام قاعدا اولی لانه المحل (وان کثر) شکه (عمل بغالب ظنه ان کان) له ظن للحرج (والا اخذ بالاقل) لتیقنه (وقعد فی کل موضع توهمه موضع قعوده) ولو واجبا

لئلا یصیر تارکا فرض القعود او واجبه (و) اعلم انه (اذا شغله ذلک) الشک فتفکر (قدر اداء رکن ولم یشتغل حالة الشک بقراءة ولا تسبیح) ذکره فی الذخیرة (وجب علیه سجود السهوفی) جمیع (صور الشک) سواء عمل بالتحری اوبنی علی الاقل فتح لتاخیر الرکن لکن فی السراج انه یسجد للسهو فی اخذ الاقل مطلقا وفی غلبة الظن ان تفکر قدر رکن.

(۱۸۸) رکوع وسجود اور سلام میں امام کی متابعت

سوال...... کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مقتدی قعدہ اولی میں اپنا تشہد پورا کر کے اٹھے گا یا امام کی اطاعت کرتے ہوئے اسکے ساتھ اٹھے گا اسی طرح رکوع اور سجدے میں تسبیحات مکمل کر کے اٹھے یا امام کے ساتھ ہی اٹھ جائے؟ نیز قعدہ اخیرہ میں مقتدی کے درود شریف پڑھنے سے پہلے ہی امام نے سلام پھیر دیا تو کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں تین مسئلے ہیں (۱) پہلے مسئلہ میں مقتدی کو چاہئے کہ قعدہ اولی میں اپنا تشہد پورا کر کے پھر اٹھ جائے، اگر تشہد پورا کئے بغیر اٹھ جائے تو یہ بھی جائز ہے لیکن علامہ شامیؒ کی تحقیق کے مطابق اسطرح کرنا مکروہِ تحریمی ہے۔ (۲) (۳) دوسرے اور تیسرے مسئلہ میں مقتدی کو چاہئے کہ رکوع اور سجدے کی تسبیحات کو چھوڑ کر اسی طرح درود شریف کو چھوڑ کر امام کی اتباع کرے کیونکہ تسبیحات اور درود شریف نماز میں پڑھنا سنت ہے جبکہ امام کی اتباع واجب ہے چنانچہ امام کی اتباع میں مقتدی کو رکوع وسجدے سے اٹھ جانا اور درود شریف چھوڑ کر امام کے سلام کے ساتھ سلام پھیر دینا چاہئے۔

لمافی الشامیة (۱/۴۷۰): ......فإن عارضها واجب لاینبغی أن یفوته بل یأتی به ثم یتابع، کما لو قام الإمام قبل أن یتم المقتدی التشهد فإنه یتمه ثم یقوم لان الاتیان به لایفوت المتابعة بالکلیة وانما یؤخرها، والمتابعة مع قطعه تفوته بالکلیة، فکان تأخیر أحد الواجبین مع الاتیان بهما أولی من ترک أحدهما بالکلیة بخلاف مااذاعارضهاسنة کمارفع الامام قبل تسبیح المقتدی ثلاثافالاصح انه یتابعه لان ترک السنة اولی من تاخیر الواجب......

(۱۸۹) سجدہ کی حالت میں پیر کی انگلیوں کا حکم

سوال...... کیافرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ چند دن پہلے ہماری مسجد میں یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک شخص ظہر کی سنتیں ادا کر رہا تھا کہ سجدہ کی حالت میں اسکے پاؤں کی انگلیاں اٹھ گئیں، بعد نماز ایک صاحب نے ان سے کہا کہ آپکی نماز ادا نہیں ہوئی دوبارہ ادا کریں یہ بات ہم نے امام صاحب سے دریافت کی تو وہ ہمیں اسکا کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکے، برائے مہربانی صحیح جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداًومصلیاً......حالت سجدہ میں دونوں پاؤں کی انگلیاں قبلہ کی طرف متوجہ کرنا سنت ہے،دونوں پاؤں زمین سے لگانا واجب ہے اور بلا عذر ایک پاؤں کا زمین سے اٹھائے رکھنا مکروہ تحریمی ہے اور دونوں میں سے ایک پاؤں کا کچھ حصہ زمین پر لگانا فرض ہے چاہے ایک انگلی ہی کیوں نہ ہو اور اگر دونوں پاؤں زمین سے اٹھائے اور تین مرتبہ سبحان اللہ کہنے کی مقدار اٹھائے رکھے تو نماز فاسد ہو جائیگی۔

لمافی البحر الرائق(۲/۱۴): ...... أو سقوط الثوب عن عورته مع التعمد مطلقا ومع اداء رکن ان لم یتعمد علم أو یعلم ومع المکث قدره ان لم یؤد عند أبی حنیفةؒ ومحمدؒ.

وفی الدر المختار(۱/۲۲۵-۲۲۶): (و) یفسدها (أداء رکن) حقیقة اتفاقا (أو تمکنه) منه بسنة، وهو قدر ثلاث تسبیحات...... الخ.

وفی الشامیة(۱/۴۴۷):(قوله وقدمیه) یجب اسقاطه لان وضع اصبع واحدةمنهمایکفی کما ذکره بعد.ح.وافادانه لولم یضع شیأمن القدمین لم یصح السجودوهومقتضی ماقدمناه انفا.

(۱۹۰) دوسرے شخص کا نمازی کو نماز میں یاد دلانا

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ایک عزیز ہیں جنکی عمر بھی زیادہ ہوگئی ہے اور بیماری کی وجہ سے اکثر باتیں بھول جاتے ہیں، چونکہ وہ نماز کے بہت پابند ہیں اگر کوئی نماز ایسی حالت میں قضا ہو جائے تو سب پر ناراض ہوتے ہیں، چنانچہ جب وہ نماز کیلئے کھڑے ہوتے ہیں تو انہیں رکعات کی تعداد بلکہ بعض دفعہ دوسجدوں میں بھی غلطی ہو جاتی ہے، ایسی صورت میں انکے ساتھ ایک آدمی بیٹھتا ہے جو انہیں یاد دلاتا رہتا ہے کہ ابھی کھڑے ہو جائیں اور اب بیٹھ جائیں وغیرہ، کیا ایسی صورت میں انکی نماز ہو جاتی ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......خارج صلوٰۃ سے کسی شخص کا نمازی کو یاد دلانے سے نماز درست نہیں ہوتی بلکہ جو شخص تعداد رکعات وغیرہ میں بھول کے عارضہ میں مبتلاء ہو اور یہ عارضہ اسے کثرت سے پیش آتا ہو تو اسکے لئے حکم یہ ہے کہ ایسا شخص نماز میں غور وفکر کرے اور جس طرف غالب گمان ہو جائے اسی رکن سے نماز پوری کرے اور اگر کسی ایک جانب غالب گمان نہ ہو رہا ہو تو بنا علی الاقل یعنی جو کم رکن ہو اس سے نماز پوری کرے مثلاً پہلی یا دوسری رکعت میں شک واقع ہو گیا تو غور وفکر کے بعد اگر غالب گمان یہ ہو کہ دوسری رکعت ہے تو اسی سے نماز جاری رکھے اور اگر غالب گمان نہ ہو تو پہلی رکعت ہی سمجھے کیونکہ یہ صورت یقینی ہے، اسیطرح سجدوں کی تعداد میں کرے اور آخر میں سجدہ سہو کر لے۔

لمافی الشامیة (۱/۲۲۲): (قوله الااذاسمعه المؤتم الخ) فی البحرعن القنیة ولوسمعه المؤتم ممن لیس فی الصلاة ففتح به علی امامه یجب ان تبطل صلاة الکل لان التلقین من خارج.

وفی الشامیة ایضاً(۲/۹۳): (قوله وان کثرشکه) بان عرض له مرتین فی عمره علی ماعلیه اکثرهم اوفی صلاته علی مااختاره فخرالاسلام...... (وقوله والا) ای وان لم یغلب علی ظنه شئ.

وفیه ایضاً(صـ۹۴): (قوله سواء عمل بالتحری) ای بأن غلب علی ظنه انهاالرکعة الثانیة مثلا، وقوله اوبنی علی الاقل ای بأن لم یغلب علی ظنه شئ واخذبالاقل.

(۱۹۱) فرض کی تیسری اور چوتھی رکعت میں سورۃ فاتحہ کے ساتھ سورت ملانے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر چار رکعت والی فرض نماز میں کوئی تیسری اور چوتھی رکعت میں بھی فاتحہ کے بعد بھی سورت پڑھ لے تو سجدہ سہولازم آئے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اگر کوئی فرض کی تیسری اور چوتھی رکعت میں بھی فاتحہ کے بعد سورت ملالے تو سجدہ سہولازم نہیں آئے گا۔

لمافی الهندیة(۱/۱۲۶): ولو قرأ فی الاخریین الفاتحة والسورة لایلزمه السهو وهو الاصح.

وفی الشامیة (۱/۵۱۱): (قوله ولو زاد ولابأس) ای لوضم إلیها سورة لابأس به لأن القراءة فی الاخریین مشروعة من غیر تقدیر.

(۱۹۲) نمازی کا کسی دوسرے کو سبحان اللہ کہہ کر تنبیہ کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نماز پڑھ رہا ہو۔تو خارج عن الصلوٰۃ کو تنبیہ کرنے کیلئے ''سبحان اللہ'' کہتا ہے اس صورت میں اس کی نماز فاسد ہوگی یا نہیں؟ اگر فاسد ہوتی ہے تو صاحب ہدایہؒ کی اس عبارت کا کیا مطلب ہے:''أو یدفع بالتسبیح لما روینا من قبل ''(الہدایہ،۱/۹۹)

الجواب حامداً ومصلیاً......فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس بات کی تصریح فرمائی ہے کہ اگر نمازی نماز میں قرآن کی آیت یالا الہ الا اللہ یا سبحان اللہ یا الحمدللہ وغیرہ کسی کو جواب دینے کی نیت سے پڑھے تو امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک نماز فاسد ہوئے گی۔اور اگر کوئی نمازی مذکورہ کلمات بطور اِعلام (کہ میں نماز میں ہوں) یا امام دورانِ نماز قرأت وغیرہ میں غلطی کرے اور مقتدی نے یہ کلمات پڑھے تو نماز فاسد نہ ہوگی اگرچہ قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ نماز فاسد ہوجائے لیکن یہاں پر حدیث کی وجہ سے قیاس کو ترک کیا گیا ہے۔اور یہی مقصد صاحب ہدایہ کی اس عبارت کا ہے۔

لمافی البخاری(۱/۱۶۲،۱۶۵،۳۷۰): من نابه شئ فی صلاته فلیقل سبحان الله.

وفی الهدایة(۱/۱۳۸): (فلو اجاب فی الصلوة رجلا بلا إله الا الله فهذا کلام مفسد عند ابی حنیفةؒ ومحمدؒ وقال ابو یوسفؒ لا یکون مفسدا) وهذا الخلاف فیما اذا اراد به جوابه له أنه ثناء بصیغته فلا یتغیر بعزیمته ولهما أنه اخرج الکلام مخرج الجواب وهو یحتمله فیجعل جوابا کالتشمیت والاسترجاع علی الخلاف فی الصحیح(وان اراد به اعلامه انه فی الصلوة لم تفسد بالاجماع) لقوله

علیه السلام اذا نابت احدکم نائبة فی الصلوٰة فلیسبح.

وفی الدر المختار (۱/۶۲۰، ۶۲۱): (وجواب خبر) سوء (باالاسترجاع علی المذهب) لانه بقصد الجواب صار ککلام الناس (وکذا) یفسدها (کل ما قصدبه الجواب) کأن قیل أمع الله اله فقال لا اله الا الله...... (أو الخطاب ک) قوله لمن اسمه یحیی أو موسی (یا یحیی خذ الکتاب بقوة) أو، وما تلک بیمینک یاموسی (مخاطبا لمن اسمه ذلک)......الخ.

وقال فی الشامیة(۱/۶۲۱): واحترز بقصد الجواب عما لو سبح لمن استأذنه فی الدخول علی قصد اعلامه أنه فی الصلاة کما یأتی أو سبح لتنبیه إمامه فانه وان لزم تغییره بالنیة عندهما إلا أنه خارج عن القیاس بالحدیث الصحیح ((اذا نابت أحدکم نائبة وهو فی الصلاة فلیسبح))

(۱۹۳) امام کے پیچھے نیت میں غلطی کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ میں کہ ایک صاحب نے ظہر کی نماز میں امام کے پیچھے ظہر کی جگہ عصر کی نماز کی نیت کر لی تو کیا انکی نماز صحیح ہوگئی اگر صحیح ہوگئی تو ظہر کی ہوئی یا عصر کی؟

الجواب حامداً ومصلیاً......جس شخص نے امام کے پیچھے ظہر کے بجائے عصر کی نیت کی تو نہ ظہر ادا ہوگی نہ ہی عصر البتہ اگر مقتدی کے دل میں نیت ظہر پڑھنے کی تھی لیکن غلطی سے زبان سے عصر کے الفاظ نکل گئے تو اس صورت میں ظہر ہی کی نماز ادا ہوگی۔

لمافی الهندیة(۱/۸۶):لایصح اقتداء مصلی الظهر بمصلی العصر.

وفی الشامیة(۱/۵۷۹): (قوله وبمفترض فرضاآخر) سواء تغایر الفرضان اسماأوصفة کمصلی ظهر امس بمصلی ظهر الیوم.

وفی الدر المختار(۱/۴۱۵): فلا عبرة للذکر باللسان إن خالف القلب لأنه کلام لانیة

وقال الشامی رحمه الله تحته: (قوله إن خالف القلب) فلو قصد الظهر وتلفظ بالعصر سهوا أجزأه.

(۱۹۴) عمداً واجب کو ترک کرنے سے نماز کا لوٹانا واجب ہے

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کل میری والدہ گھر میں عصر کی نماز ادا کر رہی تھیں کہ بھول کر پہلی رکعت میں التحیات پر بیٹھ گئیں اور التحیات پوری پڑھنے کے بعد انہیں یاد آیا کہ یہ تو پہلی رکعت ہے تو فوراً کھڑی ہوگئیں۔اور دوسری رکعت میں التحیات پر نہیں بیٹھیں اور آخری رکعت میں التحیات پڑھ کر سجدہ سہو کیا۔انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ بیٹا کیا اس طرح میری نماز ہوگئی ہے تو میں نے امی سے کہا کہ آپ کو دوسری رکعت میں بھی التحیات میں بیٹھنا چاہیے تھا تو امی کہنے لگیں وہ تو میں پہلی رکعت

میں پڑھ چکی تھی اسلئے نہیں بیٹھی۔لیکن آخر میں سجدہ سہو تو کرلیا ہے۔کیا میری نماز ہوگئی۔تو میں نے امی سے کہا کہ میں اپنے مدرسے میں مفتی صاحب سے پوچھ کر آپ کو بتاؤں گا۔اب آپ سے پوچھنا یہ ہے کہ کیا اس طرح میری والدہ کی نماز درست ہے یا دوبارہ ادا کریں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں چونکہ آپ کی والدہ پہلی رکعت کے بعد بیٹھ گئی تھیں،جس سے تاخیر رکن لازم آیا،اب اگر وہ دوسری رکعت کے بعد بھی بیٹھ جاتیں،اور تشہد پڑھ لیتیں،تو سہواً تاخیر رکن کی وجہ سے سجدہ سہو کر لینے سے نماز درست ہو جاتی،لیکن چونکہ انہوں نے قعدہ اولیٰ قصداً ترک کر دیا اور واجب کو قصداً ترک کرنے سے تو صرف سجدہ سہو کر لینا کافی نہیں بلکہ اعادہ صلوٰۃ (نماز کا لوٹانا) واجب ہے،لہٰذا آپ کی والدہ پر اس نماز کا اعادہ کرنا واجب ہے۔

لمافی الهندية(۱/۱۲۶): وفی الولوالجية: الأصل فی هذا أن المتروک ثلاثة أنواع فرض وسنة، وواجب ...... وفی الثالث ان ترک ساهياً يجبر بسجدتی السهو وان ترک عامداً لا كذا فی التاتارخانية وظاهر كلام الجم الغفير أنه لا يجب السجود فی العمد وانما تجب الاعادة جبراً لنقصانه، كذا فی البحر الرائق.

وفی البحر الرائق(۲/۱۶۱): وظاهر كلام الجم الغفير أنه لايجب السجود فی العمد وانما تجب الاعادة اذا ترک واجباً عمدا جبر النقصانه، وذكر الولوالجی فی فتاواه أن الواجب اذا تركه عمدا لا ينجبر بسجدتی السهو لانها عرفتا جابرتين بالشرع والشرع ورد حالة السهو وجعلها مثلاً لهذا الفائت لا فوقه.

وفی الشامية(۲/۷۹): ولو بنی علی الفرض تطوعاً وقد سها فی الفرض لا يسجد اهـ...... لان النفل صلاة أخری غير الفرض ولا يمكن ان يكون سجود السهو لصلاة واقعاً فی صلاة أخری مقصودة وان كانت تحريمة الفرض باقية فلذا لا يسجد، أو لانه لما بنی النفل عمدا صار مؤخراً للسلام عن محله عمدا، والعمد لا يجبره سجود السهو بل تلزم فيه الاعادة، وحيث كانت الاعادة واجبة لم يبق السجود واجبا عن سهوه فی الفرض لانه بالاعادة يأتی بماسها فيه، والسجود جا بر عما فات قائم مقام الاعادة، فاذا وجبت الاعادة سقط السجود.

(۱۹۵) امام نے پانچ رکعت پڑھیں اعادۂ نماز کے وقت دیگر لوگ شامل ہوگئے انکی نماز کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے میں مولوی صاحب نے عصر کی نماز چار رکعات کی بجائے پانچ رکعات پڑھائیں اور قعدہ اخیرہ میں نہیں بیٹھے تھے۔سلام کے بعد مقتدیوں نے یاد دلایا کہ پانچ رکعتیں ہوگئیں لہٰذا مولوی صاحب نے نماز دوبارہ لوٹا دی اور دوسری جماعت کے بعد یہ اعلان کیا کہ جو حضرات پہلی جماعت میں شریک نہیں تھے وہ دوبارہ نماز دھرائیں ان کی نماز نہیں ہوئی۔کیا ان کا یہ اعلان کرنا درست ہے یا نہیں،اگر درست ہے تو اس کی کیا وجہ ہے؟ تفصیلاً جواب

عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں جب امام صاحب نے پانچ رکعات نماز پڑھائی توان کی فرض نماز باطل ہوگئی لہٰذا جب دوبارہ نماز لوٹانے کیلئے دوبارہ جماعت کرائی گئی تو گویا وہ پہلی بار نماز پڑھ رہے تھے لہٰذا وہ لوگ جو پہلی جماعت میں شریک نہیں تھے لیکن دوسری جماعت میں شریک ہوگئے ان کی نماز درست ہے۔

لـمـافي الهداية(۱/۱۵۹): وان سهى عن القعده الأخيرة حتىٰ قام الى الخامسة رجع الى القعدة مالم يسجد...... والغىٰ الخامسة...... وان قيّد الخامسة بسجدة بطل فرضه عندنا.

وفي الهندية(۱/۱۰۴): ولو زاد فيها ركعةً تامةً قبل إتمام صلٰوته فسدت صلوته.

(۱۹۶) سنت کے فساد پر اعادہ کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ میں کہ اگر عشاء کی نماز میں وتر پڑھنے کے بعد معلوم ہو کہ سنتیں پڑھتے ہوئے کوئی ایسی غلطی ہوگئی تھی جسکی وجہ سے نماز فاسد ہوگئی تھی یا صرف فساد کا شک ہو تو یہ سنتیں دوبارہ پڑھی جائینگی یا نہیں؟ اگر دوبارہ پڑھی جائینگی تو آیا وتر بھی دوبارہ پڑھے جائینگے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اگر سنتوں کے فساد کا یقین ہو تو انکا اعادہ ضروری ہے البتہ وتر دوبارہ پڑھنا ضروری نہیں اگر فساد میں صرف شک ہو پھر ظنِ غالب کو ترجیح دی جائیگی اگر فساد کا ظنِ غالب ہو تو پھر بھی صرف سنتوں کا دوبارہ پڑھنا ضروری ہے نہ کہ وتر اور اگر فساد کا ظن غالب نہیں ہے تو نہ سنتوں کا اعادہ کرنا ہوگا اور نہ وتر کا۔

وفي الشامية(۲/۲۸): ولو صلى العشاء بلاوضوء والوتر والسنة به يعيدالعشاء والسنة لا الوتر .....

.......والله اعلم بالصواب.

(۱۹۷) نماز کے فساد کا اعلان امام پر لازم ہے

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بندہ ایک گاؤں کی مسجد میں امام ہے امسال رمضان المبارک سے پہلے یہ مسئلہ پیش آیا کہ بندہ نے مغرب کی نماز بغیر وضو کے پڑھادی۔ اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......امام اگر کسی خاص محلّہ کا ہے یا معین لوگوں کو نماز پڑھاتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ کسی بھی طریقہ سے مقتدیوں کو اطلاع کردے کہ وہ اپنی نماز کا اعادہ کرلیں، اور اگر بعض مقتدی معین ہوں اور بعض غیر معین ہوں تو جن کو جانتا ہے انکو اطلاع کرنا لازم ہوگا۔ البتہ غیر معین حضرات کو اطلاع کرنا لازم نہ ہوگا۔

لـمـافي الشـامية (۱/۵۹۲): (قـولـه لـومعينين) اى معلومين وقال: ح: وان تعين بعضهم لزمه اخباره

(قوله والا) ای وان لم یکونوا معینین کلهم او بعضهم لایلزمه.

(۱۹۸) پہلے سے نماز میں شامل فرد کا امام کے رکوع کے بعد رکوع کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں رمضان المبارک میں وتر کی نماز پڑھا رہا تھا تو آخری رکعت میں بجائے قنوت کے میں تکبیر کہہ کر رکوع میں چلا گیا مقتدیوں نے لقمہ دیا میں نے نہیں لیا چونکہ میں رکوع میں پہنچ گیا تھا بعد میں کچھ مقتدی تو میرے ساتھ رکوع میں شامل ہوگئے اور بعض نے میرے اٹھنے کے بعد رکوع کیا، میں نے سجدہ سہو کر کے نماز پوری کر لی اب جن حضرات نے میرے بعد رکوع کیا ہے، ان کی نماز کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں جن مقتدیوں نے امام کے ساتھ رکوع نہیں کیا لیکن امام کے بعد کر لیا ہے، تو ان کی نماز بھی درست ہوگئی، ایسے لوگ لاحق کے حکم میں داخل ہوتے ہیں۔

لمافی الهندیة(۱/۱۲۰): "اجمعوا أنّه لو انتهی الی الامام وهو قائم فکبّر ولم یرکع مع الامام حتی رکع الامام، ثم رکع أنّه یصیر مدرکا لتلک الرکعة."

وفی الشامیة(۱/۵۹۴): قال فی الدر المختار: (واللاحق من فاتته) الرکعات (کلها أو بعضها) لکن (بعد اقتدائه بعذر کغفلة وزحمة...... وکذا بلا عذر...... ویبدا بقضاء ما فاته عکس المسبوق ثم یتابع امامه إن امکنه ادراکه والا تابعه.

وقال فی الشامی(صـ۵۹۵): وحق التعبیر أن یقول: ویبدأ بقضاء ما فاته بلا قراءة عکس المسبوق ثم یتابع امامه ان ادرکه ثم ما سبق به.

وفیه ایضاً(۱/۴۷۰، ۴۷۱): "والحاصل ان متابعة الامام فی الفرائض والواجبات من غیر تاخیر واجبة، فان عارضها واجب لاینبغی أن یفوته بل یاتی به ثم یتابع........... نعم تکون المتابعة فرضاً، بمعنی أن یأتی بالفرض مع امامه او بعده، کمالو رکع امامه فرکع معه مقارناً او معاقباً او شارکه فیه او بعد مارفع منه، فلو لم یرکع اصلاً او رکع ورفع قبل ان یرکع امامه ولم یعده معه او بعده بطلت صلاته.

(۱۹۹) نماز پڑھتے ہوئے کسی کی آمد پر دروازہ کھولنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ایک شخص کسی کا انتظار کر رہا ہو، اور اسے نماز بھی پڑھنی ہے تو وہ نماز شروع کر دیتا ہے اب نماز کے دوران آنے والا آجاتا ہے تو پھر نمازی کو کیا کرنا چاہئے، کیا نماز توڑ کر دروازہ کھولنا چاہئے یا اگر وہ دروازے کے قریب ہی ہے تو وہ بغیر نیت توڑے جا کر دروازہ کھول دے اور پھر نماز پوری کرے، کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... نماز چونکہ ایک اہم ترین عبادت ہے بندہ کو چاہئے کہ خشوع وخضوع کے ساتھ نماز ادا کرے اور دھیان صرف اللہ کی طرف ہو، کسی دوسری طرف دھیان نہ جائے اور کوئی منافی صلوٰۃ کام سرزد نہ ہو، لہٰذا جب کوئی شخص نماز کو شروع کرے اور کوئی نماز کے دوران آجائے تو اگر آنے والے کے بارے میں غالب گمان یا یقین ہو کہ اسے کوئی جلدی یا اشد ضرورت نہیں تو نماز مکمل کر کے ہی دروازہ وغیرہ کھولنا چاہئے، تاہم اگر دوران نماز آنے والا بہت جلدی میں ہو، یا اسے کوئی سخت حاجت ہو تو نمازی آدمی کیلئے دورانِ نماز دروازہ کھولنے کی صرف ان شرائط کے ساتھ گنجائش ہے کہ نمازی دروازے کے قریب ہو، اور تھوڑے سے عمل سے دروازہ کھول سکتا ہو۔ اور ایک دوقدم سے زیادہ چلنا پھرنا لازم نہ آتا ہو۔ اور قبلہ سے انحراف بھی لازم نہ آتا ہو، تب اگر ایک دوقدم چل کر دروازہ کھول دے تو اس سے نماز فاسد نہیں ہوگی جب تک کہ عمل کثیر کا ارتکاب نہ کرے، (عمل کثیر یہ ہے کہ اگر نمازی کوئی عمل کرتا ہو، اور نماز سے باہر کوئی اس کو دیکھ لے تو وہ یہ یقین کرے کہ یہ شخص نماز نہیں پڑھ رہا)۔

لمافی مشکوۃ المصابیح(۹۲/۱): وعن عائشة قالت کان رسول الله ﷺ یصلی تطوعاً والباب مغلق علیه فجئت فاستفتحت فمشی ففتح لی ثم رجع الی مصلاه وذکرت ان الباب کان فی القبلة.

(رواه احمد وابو داؤد والترمذی وروی النسائی نحوه)

وفی الشامیة (۶۲۸/۱): هذا وذکر فی الحلیة ایضاً فی فصل المکروهات أن الذی تقتضیه القواعد المذهبیة المستندة الی الادلة الشرعیة ووقع به التصریح فی بعض الصور الجزئیة ان المشی لا یخلوا ما ان یکون بلا عذر او بعذر فالاول ان کان کثیراً متوالیاً تفسد وان لم یستدبر القبلة وان کان کثیراً غیر متوال بل تفرق فی رکعات او کان قلیلاً فان استدبرها فسدت صلاته للمنافی بلا ضرورة والا فلا وکره لما عرف ان من افسد کثیره کره قلیله بلا ضرورة وان کان بعذر فان کان للطهارة عند سبق الحدث او فی صلاة الخوف لم یفسدها ولم یکره قل او کثر استدبر اولا وان کان لغیر ماذکر فان استدبر معه فسدت قل او کثر وان لم یستدبر فان قل لم یفسد ولم یکره وان کان کثیرا متلاحقاً افسد واما غیر المتلاحق ففی کونه مفسداً او مکروها خلاف وتأمل اهـ ملخصاً. وقال فی هذا الباب والذی یظهر ان الکثیر الغیر المتلاحق غیر مفسد ولا مکروه اذا کان لعذر مطلقاً اهـ

(۲۰۰) ایک نیت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ کتنی رکعات پڑھی جاسکتی ہیں؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نیت کے ساتھ گیارہ رکعات نماز بھی پڑھی ہیں، یہ کب اور کس سلسلے میں ہوا، کیا یہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص تھا یا امت کیلئے

بھی حسب ضرورت ایسا کرنا ممکن ہے؟ زیادہ سے زیادہ ایک نیت کے ساتھ کتنی رکعات پڑھی جاسکتی ہیں؟ نفل یا سنت؟

الجواب حامداًومصلیاً ...... یہ جو کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی نیت سے گیارہ رکعات پڑھی ہیں اس کی صراحت تو ہم کو نہیں ملی البتہ بعض احادیث میں یہ آیا ہے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے رات کو گیارہ رکعات پڑھی ہیں، لیکن اس میں یہ صراحت نہیں ہے کہ ایک نیت سے پڑھیں اور اس میں بھی فقہاء حضرات یہ فرماتے ہیں کہ دو دو رکعت ایک نیت سے پڑھی ہیں اور آخر میں تین رکعت وتر ایک نیت سے پڑھی ہیں۔ لہٰذا گیارہ رکعات نماز ایک نیت سے پڑھنا کہیں صراحتاً ثابت نہیں ہے۔ لہٰذا ایک نیت سے گیارہ رکعات نہیں پڑھنی چاہئیں۔ اور دن میں ایک نیت سے چار رکعات نفل ادا کی جاسکتی ہیں اور اس سے زیادہ مکروہ ہے اور رات میں زیادہ سے زیادہ آٹھ رکعات نفل ایک نیت سے ادا کی جاسکتی ہیں اور اس سے زیادہ مکروہ ہے۔ البتہ افضل دونوں میں یہ ہے کہ چار رکعات نفل ایک نیت سے ادا کرے۔

لما فی اعلاء السنن(٧/ ٦٠): والاصل فی ذالک ان النوافل شرعت تبعا للفرائض والتبع لا یخالف الاصل فلوزید علی الاربع فی النهار لخالفت الفرائض وهذا هو القیاس فی اللیل الا ان الزیادة علی الاربع الی الثمان او الیٰ الست عرفناه بالنص وهو ماروی عن النبی علیه الصلوة والسلام انه كان یصلی باللیل خمس ركعات، سبع ركعات تسع ركعات، احدی عشرة ركعة ثلاث عشرة ركعة والثلاث من كل واحد من هذه الاعداد الوتر (والظاهر لفظ الحدیث وان كان یشعر بوصل الوتر بالتطوع وانه صلاهما جمیعاً بتسلیمة واحدة ولكن حدیث عائشة عن احمد وابی داؤد (كان علیه الصلوة والسلام یوتر باربع وثلاث وست وثلاث، وثمان وثلاث وعشرة وثلاث'' صریح فی انه كان یفصل ثلاث الوتر عن التطوع وقد مرانه حسن الاسناد وركعتان من ثلاثة عشر سنة الفجر ......الخ.

وفی الهندیة (١/ ١١٣): وكره الزیادة علی أربع فی نوافل النهار وعلی ثمان لیلاً بتسلیمة واحدة والافضل فیهما رباع لانه ادوم تحریمة فیكون اكثر مشقة وازید فضیلة ولهذا لونذر ان یصلی اربعاً بتسلیمة لایخرج عنه بتسلیمتین وعلی القلب یخرج كذا فی التبیین.

(۲۰۱) پیشاب کی تھیلی جسم پر بندھے ہونے کی حالت میں مریض کا نماز پڑھنا!

سوال ...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کے مثانہ کا آپریشن ہوا ہے اور پیشاب کیلئے ایک نلکی لگی ہوئی ہے۔ جس کے ذریعے سے پیشاب جا کر ایک تھیلی میں جمع ہوجاتا ہے اور وہ تھیلی جسم کے کسی حصے کے ساتھ باندھی ہوئی ہوتی ہے۔ زید نماز پڑھنا چاہتا ہے تو اس کیلئے کیا حکم ہے؟ بمع اس تھیلی کے نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں کیونکہ تھیلی کو نکالنا ممکن نہیں، اگر پڑھ سکتا ہے تو تھیلی کو پیشاب سے خالی کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً...... صورت مسئولہ میں جب تھیلی کوجسم سے ہٹانا ممکن نہیں اور حرج لازم آتا ہے تو اسی لگی ہوئی تھیلی کے ساتھ نماز پڑھ سکتا ہے، لیکن نماز سے پہلے اس کو پیشاب سے خالی کرنا ضروری ہے کیونکہ عذر کی وجہ سے نجاست کو معاف قرار دیا گیا ہے اور عذر میں نجاست کو جس قدر کم کرنا ممکن ہو تو وہ ضروری ہے۔

لمافی الدرالمختار (۱/۳۰۷): وکذا مریض لایبسط ثوبا الاتنجس فوراً له ترکه.

وفی الدر المختار (۱/۳۰۷): یجب ردّ عذره أو تقلیله بقدر قدرته.

(۲۰۲) گندگی اورنجاست کا جیب میں موجود ہونا اوراسی حالت میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں کچھ عرصہ پہلے بیمار ہوگیا ڈاکٹر نے کہا کہ کل صبح جب نیند سے بیدار ہو تو اس وقت پیشاب ایک بوتل میں لے آنا تاکہ ٹیسٹ کرکے بیماری کا پتہ چلایا جاسکے صبح میں نے شیشی میں پیشاب کرکے بند کردیا اور پھر جیب میں ڈال کرہسپتال آیا لیکن کافی دیر ہوگئی اتنے میں ظہر کا وقت ہوگیا۔ میں نے نمازِ ظہر پڑھ لی اور پیشاب والی شیشی میری جیب میں تھی کیا میری نماز صحیح ہوگئی یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً...... کسی نجاست اور گندگی کا اپنی جگہ اور محل میں موجود ہونے سے اُس کو اپنے محل کے اندر نجاست کے حکم میں شمار نہیں کیا جاتا ہے، جیسا کہ دورانِ نماز جیب میں انڈا ہو، جس کا پانی خون میں تبدیل ہوگیا ہو، اُس کی موجودگی میں نماز درست ہوجاتی ہے، اگر وہ نجاست اپنے غیرمحل اور غیر جگہ میں ہو تو اس نجاست کو اپنے غیرمحل کے اندر نجاست کے حکم میں شمار کیا جاتا ہے، جیسا کہ دورانِ نماز جیب میں شیشی ہو، اور اُس میں خون یا شراب وغیرہ ہو تو اُس شیشی کو جیب میں رکھ کر نماز پڑھنا جائز نہیں ہے، اس نماز کا اعادہ کرنا پڑے گا۔ مذکورہ مسئلہ میں جیب میں پیشاب والی شیشی کی موجودگی میں نماز ادا نہیں ہوئی، لہٰذا اس نماز کا دوبارہ اعادہ کرنا ضروری ہے۔

لمافی التاتارخانیة (۱/۲۰۴): وهذه المسائل یبتنی علی اصل ان الحیوانات التی لا تعیش الا فی الماء...... فالماء معدن هذه الحیوانات ومکانها والشئ فی معدنه ومکانه لا یعطی له حکم النجاسة، الاتری ان الرجل اذا صلی وفی کمه بیضة حال محها دماً فصلاته جائزة، ولو صلی وفی کمه قارورة بول لایجوز.

وفی الهندیة (۱/۶۲): إذا صلی وفی کمه بیضة مذرة قد حال محها دماً جازت صلاته وکذا البیضة التی فیها فرخ میت کذا فی فتاویٰ قاضیخان.

رجل صلی وفی کمه قارورة فیها بول لا تجوز الصلوة سواء کانت ممتلئة اولم تکن، لان هذا لیس فی مظانه ومعدنه بخلاف البیضة المذرة لانه فی معدنه ومظانه وعلیه الفتویٰ.

وفی الشامیة(۱/۴۰۳): ونجاسة باطنه فی معدنها فلا یظهر حکمها کنجاسة باطن المصلی، کما لو

صلی حاملا بیضة مذرة صار محها دما جاز، لأنه فی معدنه، والشی مادام فی معدنه لایعطی له حکم النجاسة، بخلاف مالو حمل قارورة مضمومة فیها بول فلا تجوز صلاته لانه فی غیر معدنه کمافی البحر عن المحیط.

(۲۰۳) امام کے بھول جانے پر لقمہ دینے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دن میں نے ایک مسجد میں نماز پڑھی اور نماز میں امام صاحب قراءت میں بھول گئے اب نہ وہ پڑھ سکتے تھے اور نہ ہی رکوع کرتے تھے تو میں نے لقمہ دیا پھر امام صاحب نماز مکمل کرنے کے بعد مجھ پر غصہ ہوئے اور مجھ سے کہا کہ تم اپنی نماز کا اعادہ کرو تمہاری نماز فاسد ہوگئی ہے۔ قریب میں ایک اور صاحب بھی کھڑے تھے جو بظاہر عالم لگتے تھے انہوں نے کہا کہ نماز کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے لقمہ دینے سے نماز فاسد نہیں ہوتی لیکن امام صاحب ماننے کو تیار نہیں۔ اب آپ فیصلہ فرمائیں کہ امام صاحب کی یہ بات درست ہے یا نہیں؟ کیا میرے لئے نماز کا اعادہ کرنا ضروری ہے یا نماز ادا ہوگئی نیز نماز میں امام کو لقمہ دینے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... جب امام نماز پڑھاتے ہوئے قراءت میں بھول جائے اور مقتدی لقمہ دے تو مقتدی کے لقمہ دینے سے اس کی نماز فاسد نہیں ہوتی۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں امام صاحب کا مقتدی سے یہ کہنا کہ وہ نماز کا اعادہ کرے درست نہیں، بلکہ دونوں کی نماز ادا ہوگئی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ البتہ مقتدیوں کو چاہئے کہ وہ بلاضرورت امام کو لقمہ نہ دیں۔ ہاں اگر نماز کے فساد کا اندیشہ ہو یا امام دوران قراءت بالکل رک جائے اور رکوع میں بھی نہ جاتا ہو جیسا کہ صورت مسئولہ میں تو لقمہ دینے میں کچھ مضائقہ نہیں۔ اور امام صاحب کو بھی چاہئے کہ وہ مقتدیوں کو لقمہ دینے کا موقع نہ دیں، دوران نماز ان سورتوں کی قراءت کریں جو اچھی طرح یاد ہوں اور اگر امام قراءت میں بھول جائے اور اتنی مقدار قراءت کرلی ہے کہ جس سے نماز ادا ہوجائے تو رکوع کرلینا چاہئے۔

لمافی الهدایة (۱/۹۷،۹۶): وإن فتح علی امامه لم یکن کلاما استحسانا لانه مضطر الی اصلاح صلاته فکان هذا من اعمال صلاته معنی وینوی الفتح علی امامه دون القراءة هو الصحیح لانه مرخص فیه وقراءته ممنوع عنها.

وفی الهندیة (۱/۹۹): وأما اذ اقرأ أو تحول ففتح علیه تفسد صلاة الفاتح والصحیح انها لا تفسد صلاة الفاتح بکل حال ولا صلاة الامام لو أخذ منه علی الصحیح، هکذا فی الکافی.

وفی الدر المختار مع رد المحتار (۱/۶۲۲): (بخلاف فتحه علی امامه) فانه لا یفسد (مطلقا) لفاتح وآخذ بکل حال.

قال الشامی رحمه الله: (قوله مطلقا) فسره بما بعده (قوله بکل حال) ای سواء قرأ الامام قدر ما

تجوز به الصلاة أم لا انتقل الی آیة اخری ام لا تکرر الفتح ام لا هو الاصح.

(۲۰۴) مقتدی اگر نماز میں اللہ اکبر کہہ دے تو اس کی نماز کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک مسجد میں عصر کی نماز پڑھی امام صاحب دوسری رکعت میں بھی کھڑے ہوگئے تو پیچھے سے ایک شخص نے آواز دی ''اللہ اکبر'' بعد میں جب امام نے سلام پھیرا۔ تو کہا کہ جس شخص نے آواز دی تھی وہ اپنی نماز دوبارہ پڑھ لے۔ یہ کہاں تک درست ہے تفصیل سے جواب مطلوب ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر امام سے نماز میں سہو ہوجائے مثلاً چار رکعت یا تین رکعت والی نماز میں امام دوسری رکعت میں بھی کھڑا ہوجائے اور مقتدی پیچھے سے اصلاح نماز کیلئے تسبیح پڑھتا ہے تو اس صورت میں مقتدی کی نماز فاسد نہیں ہوتی بالکل یہی صورت آپ کے اس مسئلہ میں ہے کہ امام صاحب دوسری رکعت میں قعدہ کئے بغیر کھڑے ہوگئے مقتدی نے پیچھے سے اللہ اکبر کہا تو اس سے مقتدی کی نماز فاسد نہیں ہوئی، لہٰذا دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں۔

لمافی البخاری (۱/۹۴): فقال رسول الله ﷺ مالی رأیتکم اکثر تم التصفیق من نابه شئ فی صلوته فلیسبح فانه اذا سبح التفت الیه وانما التصفیق للنساء.

وفی الهندیة (۱/۹۹): ولو عرض للامام شئ فسبح الماموم لاباس به لان القصد به اصلاح الصلوة ولا یسبح للامام اذا قام الی الاخریین لانه لا یجوز له الرجوع اذا کان الی القیام اقرب فلم یکن التسبیح مفیداً.

وفی الشامیة (۱/۶۲۱): لو سبح لمن استاذنه فی الدخول علی قصد اعلامه انه فی الصلوة کما یأتی او سبح لتنبیه امامه فانه وان لزم تغییره بالنیة عندهما الا انه خارج عن القیاس بالحدیث الصحیح ((اذا نابت احدکم نائبة وهو فی الصلوة فلیسبح.

(۲۰۵) پہلے بائیں طرف سلام پھیرنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دفعہ میں نے غلطی سے پہلے بائیں طرف سلام پھیر لیا اب میں بہت پریشان ہوں کہ میری وہ نماز درست ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... سلام پھیرنے کا سنت طریقہ یہ ہے کہ پہلے دائیں طرف سلام پھیرا جائے پھر بائیں طرف اور اگر کسی نے بھول کر پہلے بائیں طرف سلام پھیر لیا۔ پھر دائیں طرف تو اب دوبارہ بائیں طرف سلام پھیرنے کی ضرورت نہیں۔ تاہم قصداً ایسا کرنا اور اس کی عادت بنالینا خلاف سنت ہے۔

لمافی الهنديه(۱/۷۷): ولوسلم اولاعن يساره فانه يسلم عن يمينه مالم يتكلم ولا يعيد السلام عن يساره.

وفي الدرالمختار(۱/۵۲۴): ثم يسلم عن يمينه ويساره حتى يرى بياض خده، ولوعكس سلم عن يمينه فقط.

وفي الشامية تحته: (قوله ولوعكس) بأن سلم عن يساره أولا عامدا أوناسيا بحر(قوله فقط) اى فلايعيد التسليم عن يساره.

(۲۰۶) امام کے سلام سے پہلے سلام پھیرنے والے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کہتا ہے کہ اگر امام کے سلام پھیرتے وقت امام کے سلام کے الفاظ پورے ہونے سے پہلے مقتدی نے سلام کے الفاظ پورے کرلیے تو اس کی جماعت سے نماز ادا نہ ہوگی گویا اس نے اکیلے نماز پڑھی ہے اور عمرو کہتا ہے کہ اگر مقتدی نے امام کے سلام کے الفاظ پورے ہونے سے پہلے اپنے سلام کے الفاظ پورے کرلئے تو اس کی نماز فاسد ہے دوبارہ نماز پڑھے گا۔ مولوی صاحب ان دونوں مسئلوں کے بارے میں معلوم کرنا تھا دونوں میں کس کا قول صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... مقتدی اگر امام کے سلام اوّل کے لفظ ''السلام'' سے قبل اپنے سلام کے الفاظ پورے کرلے تو بغیر عذر کے ایسا کرنا مکروہ تحریمی ہے کیونکہ مقتدی کی اقتداء امام کے سلام اوّل کے لفظ ''السلام'' تک کہنے پر پوری ہوتی ہے۔ البتہ اس صورت میں اس کی نماز جماعت سے ہی ادا ہوگی۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں مذکورہ دونوں قول زید وعمرو کے کہ اس کی نماز اکیلے ادا ہوگی یا فاسد ہوجائے گی درست نہیں ہیں۔

لمافي الدر المختار (۱/۵۲۵): ولو أتمه قبل امامه فتكلم جاز وكره. وفي الشامي (تحت قوله ولو أتمه الخ) أى لو أتم المؤتم التشهد، بأن أسرع فيه وفرغ منه قبل إتمام امامه فأتى بما يخرجه من الصلاة كسلام أو كلام أو قيام جاز: أى صحت صلاته لحصوله بعد تمام الأركان، لأن الإمام وإن لم يكن أتم التشهد لكنه قعد قدره، لأن المفروض من القعدة قدر أسرع ما يكون من قراءة التشهد وقد حصل، وانما كره للمؤتم ذالک لتركه متابعة الإمام بلا عذر.

وفي الدر المختار (۱/۴۶۸): وتنقضي قدوة باالأول قبل عليكم على المشهور عندنا. وفي الشامية (قوله وتنقضي قدوة بالأول) أى باالسلام الأول. قال في التجنيس: الإمام اذا فرغ من صلاته فلما قال السلام جاء رجل واقتدىٰ به قبل أن يقول عليكم لا يصير داخلاً في صلاته، لأن هذا سلام، ألا ترىٰ أنه لو أراد أن يسلم على احد في صلاته ساهياً فقال السلام ثم علم فسكت تفسد صلاته.

(۲۰۷) مکہ مکرمہ میں زوال کے وقت نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جب میں عمرہ کے لیے گیا تھا وہاں کوئی ایسا وقت نہیں جاتا تھا کہ نماز نہ پڑھتے ہوئے دیکھا گیا جیسے ہمارے یہاں زوال کا وقت ہے لیکن وہاں پر ان کے کسی بھی نماز کے نقشے میں زوال کا وقت نہیں ہے۔اب ہم وہاں پر زوال کا وقت کس طرح معلوم کریں یا وہاں پر زوال کا وقت نہیں ہوتا۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... سورج جب بالکل آسمان کے بیچ میں آجائے تو اس وقت نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے یہاں تک کہ زوال ہو جائے اور یہ حکم احناف کے نزدیک عام ہے تمام نمازوں کیلئے اور تمام مقامات کیلئے لیکن دیگر ائمہ کرام اس حکم سے چند نمازوں کا استثناء کرتے ہیں مثلاً فرض نمازوں کی قضاء کرنا، طواف کی دو رکعت پڑھنا اور نذر کی نماز وغیرہ اور اسی طرح شوافع مکہ مکرمہ کی تخصیص بھی کرتے ہیں کہ مکہ مکرمہ میں اوقات مکروہہ میں نوافل بھی پڑھنا جائز ہے اس لیے لوگ وہاں اس وقت میں بھی نماز پڑھتے ہیں البتہ ہمارے نزدیک مکہ مکرمہ میں بھی اس وقت نماز پڑھنا جائز نہیں اور اس کے تعین کا طریقہ یہ ہے کہ وقتِ زوال طلوع آفتاب سے لے کر غروب آفتاب کے کل وقت کا نصف ہے اس سے پانچ منٹ پہلے اور پانچ منٹ بعد تک نماز نہ پڑھے تا کہ مکروہ وقت نکل جائے۔

لمافی الجامع للترمذی(۱/۲۰۰): عن عقبة بن عامر الجهنی قال ثلث ساعات کان رسول الله ﷺ ینهانا أن نصلی فیهن أو نقبر فیهن موتاناحین تطلع الشمس بازغة حتی ترتفع وحین یقوم قائم الظهیرة حتی تمیل وحین تضیف للغروب حتی تغرب.

وفی عمدة القاری(۵/۷۷،۷۸): احتج به ابو حنیفة علی انه یکره أن یتنفل بعد صلاة الفجر حتی تطلع الشمس وبعد صلاة العصر حتی تغرب الشمس...... وزعم ابن العربی أن الصلاة فی هذین الوقتین تؤدی فیهما فریضة دون النافلة عند مالک وعند الشافعی تؤدی فیهما الفریضة والنافلة التی لها سبب ومذهب آخر لا یصلی فیهما بحال لا فریضة ولانافلة ومذهب آخر تجوز بمکة دون غیرها وزعم الشافعی فی کتاب اختلاف الحدیث و ذکر الصلاة التی لها سبب وعددها ثم قال وهذه الصلاة واشباهها تصلی فی هذه الأوقات بالدلالة عن رسول الله ﷺ حیث قال من نسی صلاة فلیصلها اذا ذکرها وصلی رکعتین کان یصلّیهما بعد الظهر شغل عنهما بعد العصر وأمرأن لایمنع أحد طاف بالبیت أی ساعة شاء والاستثناء الوارد فی حدیث عقبة الابمکة وله فی الجمعة حدیث أبی سعید انه ﷺ نهی عن الصلاة فی نصف النهار الا یوم الجمعة...... الخ.

وفی الشامیة (۱/۳۵۹): (ووقت الظهر من زواله أی میل ذکاء عن کبد السماء) ای وسطها بحسب مایظهر لنا.

وفی الشامية (۱/۳۷۲): وقد قال أصحابنا: ان الصلاة فی هذه الاوقات ممنوع منها بمكة وغيرها اهـ. ورأيت فی البدائع ايضاً مانصه: ما ورد من النهی إلا بمكة شاذ لا يقبل فی معارضة المشهور، وكذا رواية استثناء يوم الجمعة غريب فلا يجوز تخصيص المشهور به اهـ.

(۲۰۸) دوسورتوں کے درمیان سورت چھوڑنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں درجہ خامسہ میں پڑھتا ہوں ہمارے استادوں نے مسئلہ بیان کیا جب آدمی ایک سورت پڑھ لے تو اس کے بعد ایک سورت چھوڑ کر دوسری سورت شروع نہ کرے یعنی درمیان میں ایک سورت کا فرق نہ کرے۔ یہ مسئلہ میرے ذہن پر نہیں لگتا کہ پڑھنا تو قرآن ہی ہے پھر اس کی کیا وجہ ہے معاذ اللہ جب آدمی ایک سورت پڑھ لے تو پھر دوسری سورت چھوڑ کر تیسری پڑھتا ہے قرآن ہی تو پڑھتا ہے کوئی ناجائز کام تو نہیں کرتا پھر منع کیوں؟ پھر بڑی اور چھوٹی سورتوں میں کوئی فرق ہے مثلاً بقرہ پڑھ کر سورۂ نساء پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ اگر فرق ہے تو کتنی آیت والی سورت پڑھ سکتا ہے کتنی والی نہیں پڑھ سکتا۔ میں اس مسئلہ کے بارے میں کافی پریشان ہوں۔ مہربانی فرما کر ضرور ایسا حل عنایت فرمائیں کہ میرے تردد کو دفع کردے۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی وناصر ہو۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

الجواب حامداً ومصلياً...... صورت مسئولہ میں بعض حضرات کے نزدیک مطلقاً کراہت نہیں ہے البتہ بہتر یہ ہے کہ ترتیب سے پڑھے اور درمیان میں کوئی سورت نہ چھوڑے۔

لمافی المحيط البرهانی (۲/۴۷): وأما فی ركعتين فإن كان بينهما سور لا يكره وإن كان بينهما سورة واحدة هل يكره؟ اختلف المشائخ فيه قال بعضهم يكره وقال بعضهم ان كانت السورة طويلة لا يكره وقال بعضهم لايكره أصلاً.

وفی مراقی الفلاح (ص۲۸۷): (و) يكره (فصله بسورة بين سورتين قرأهما فی ركعتين) لمافيه من شبهة التفضيل والهجر وقال بعضهم لا يكره إذا كانت السورة طويلة كما لو كان بينهما سورتان قصيرتان.

وفی الهندية (۱/۷۸): وأما فی ركعتين إن كان بينهما سور لا يكره وإن كان بينهما سورة واحدة قال بعضهم يكره وقال بعضهم إن كانت السورة طويلة لا يكره هكذا فی المحيط كما اذا كان بينهما سورتان قصيرتان كذا فی الخلاصة، وقال بعضهم لايكره أصلاً.

وفی الشامية (۱/۵۴۶): (قوله ويكره الفصل بسورة قصيرة) أما بسورة طويلة بحيث يلزم منه إطالة الركعة الثانية إطالة كثيرة فلايكره شرح المنية كما اذا كانت سورتان قصيرتان وهذا لو فی ركعتين

أما فی ر کعة فیکره الجمع بین سورتین بینهما سور أو سورة فتح.

(۲۰۹) کیا دورانِ نماز انگڑائی لینے سے نماز ہو جائے گی؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر امام یا مقتدی نماز میں انگڑائی اور جمائی کثرت کے ساتھ لیں تو اِن کی نماز ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں نماز میں انگڑائی اور جمائی لینا ویسے بھی مکروہ ہے اس لئے اس کو حتی الامکان دفع کیا جائے اور اگر اتنی زیادہ ہو جائے کہ عمل کثیر بن جائے تو اس وقت نماز فاسد ہو جائے گی۔

لمافی الخلاصة الفتاوی(۱/۵۷): وقوله اذا تثاؤب احدکم فی الصلاة فلیغط فاه دلیل علما انه لا یباح فی غیر تلک الحالة وهذا اذا کان بحال لایمکنه الامتناع عن التثاؤب اما اذا امکنه ان یاخذ شفتیه باسنانه فلم یفعل وغطی فاه بیده او بثوبه یکره.

وفی الهندیة(۱/۱۰۷):ویکره التلثم وهو تغطیة الانف والفم فی الصلاة والتثاؤب فان غلبه فلیکظم ما استطاع فان غلبه وضع یده او کمه علی فیه.

وفی الهندیة(۱/۱۰۲): انه لو نظر الیه ناظر من بعید ان کان لا یشک انه فی غیر الصلاة فهو کثیر مفسد وان شک فلیس بمفسد وهذا هو الاصح هکذا فی التبیین وهو احسن کذا فی محیط السرخسی وهو اختیار العامة.

(۲۱۰) پینٹ شرٹ میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل جدید دور ہے لوگ جدت کی طرف مائل ہیں حتیٰ کہ لباس میں بھی جدت ہے شہروں میں لوگ پینٹ شرٹ پہنتے ہیں اوراس کے ساتھ نماز بھی پڑھتے ہیں تو کیا پینٹ شرٹ پہن کر نماز پڑھنا جائز ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... پینٹ اگر چست ہونے کی بنا پر مخفی اعضاء کو ظاہر کرتی ہے تو اس میں نماز پڑھنا مکروہ ہے اور اگر چست اور باریک نہ ہو، اور پائنچے ٹخنوں سے نیچے نہ ہوں، تو اس میں نماز پڑھنا جائز ہے مگر ایک مسلمان کو صلحاء کا لباس ہی اختیار کرنا چاہئے کیونکہ وہی سنت ہے۔

لمافی الدر المختار(۱/۴۱۰،۴۰۹): (والشرط سترها عن غیره) ولو حکماً کمکان مظلم (لا) سترها (عن نفسه) به یفتی فلو رآها من زیقه لم تفسدو ان کره (وعادم ساتر) لایصف ماتحته ولا

يضر التصاقه وتشكله...... (صـ ۴۱۱) (يصلى قاعداً).

وفى الشامية تحته : (قوله ولا يضر التصاقه) اى بالالية مثلا وقوله وتشكله من عطف المسبب على السبب وعبارة الشرح المنية أما لو كان غليظاً لايرى منه لون البشرة إلا أنه التصق بالعضو وتشكل بشكله فصار شكل العضو مرئياً فينبغي أن لا يمنع جواز الصلوٰة لحصول الستر. اهـ.

(۲۱۱) دورانِ نماز شلوار یا پینٹ وغیرہ ٹخنوں سے نیچے رکھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دوران نماز شلوار یا پینٹ وغیرہ ٹخنوں سے نیچے رکھنا کیسا ہے اور نماز کے علاوہ عام حالت میں نیچے رکھ سکتے ہیں یا نہیں؟ آیا شلوار کو اوپر سے اور پینٹ کو نیچے سے فولڈ کرنے سے نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟ اور پینٹ کو باہر کی طرف فولڈ کریں یا اندر کی طرف؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء

الجواب حامداً ومصلیاً...... مردوں کیلئے شلوار وغیرہ ٹخنوں سے نیچے رکھنا جائز نہیں۔ خواہ نماز کی حالت ہو یا نماز کے علاوہ۔ احادیث میں شلوار ٹخنوں سے نیچے رکھنے والوں سے متعلق بہت سخت وعیدیں آئی ہیں۔ لہٰذا مردوں کو چاہئے کہ وہ اپنی شلوار یا پینٹ وغیرہ ٹخنوں سے اوپر رکھیں خواہ اوپر سے فولڈ کریں یا نیچے سے، باہر کی طرف کریں یا اندر کی طرف دونوں طرح درست ہے۔ اور یہ حکم نماز اور خارج نماز دونوں کیلئے ہے۔

لـمـافى صحيح البخارى(۲/ ۸۶۱): عن ابى هريرة (رضى الله عنه) عن النبى ﷺ قال ما اسفل من الكعبين من الازار فى النار.

وفى تكملة فتح الملهم(۴/۱۲۳): والحاصل عند هذا العبد الضعيف عفا الله عنه ـ ان العلة الاصلية من وراء تحريم الاسبال هى الخيلاء كما صرح به رسول الله ﷺ فى حديث الباب ولكن تحقق الخيلاء أمر مخفى ربما لا يطلع عليه من ابتلى به فأقيم سببه مقام العلة وهو الاسبال الى ان قال. كلما تحقق الاسبال تحت الكعبين جاء المنع الافى غير حالة الاختيار فان انتفاء الخيلاء فى ذلك متيقن.

(۲۱۲) محراب میں کھڑے ہوکر نماز پڑھانے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر امام محراب کے اندر کھڑا ہو تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے صحیح ہے یا نہیں؟

(۲)۔ نماز کتنے سال میں فرض ہوتی ہے اس میں مرد وعورت کا کوئی فرق ہے یا نہیں؟

(۳) میں ۱۱/ سال کی عمر سے نماز پڑھ رہا ہوں کیا میرے اوپر قضائے عمری ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اصل حکم یہ ہے کہ دورانِ امامت امام ایسی جگہ کھڑا ہو کہ صف کی دونوں طرفیں برابر ہوں۔اور اکثر محراب مسجدوں کے درمیان ہی میں بنے ہوئے ہوتے ہیں۔اور محراب مسجد ہی کے حکم میں ہوتا ہے۔امام کو عام حالات میں محراب سے باہر ہی کھڑے ہو کر نماز پڑھانی چاہیے اور اگر ضرورت ہو جیسے جمعہ کے دن میں نمازیوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے تو محراب کے اندر بھی امام کھڑا ہو سکتا ہے۔ لیکن امام کا محراب کے اندر کھڑا ہونا خلاف اولیٰ ہے، بہر صورت ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا درست ہے۔

۲)۔مرد اور عورت جب پندرہ سال کے ہو جائیں اگر چہ ان میں بلوغت کی علامات (مثلاً مرد میں احتلام کا ہو جانا، عورت کو حاملہ کر دینا، اور بیداری کی حالت میں انزال ہو جانا اور لڑکی میں حیض کا آنا، احتلام کا ہو جانا، حاملہ ہو جانا) نہ پائیں جائیں تو پندرہ سال کی عمر میں ان پر نماز فرض ہو جاتی ہے اور اگر پندرہ سال سے پہلے لڑکے یا لڑکی میں مذکورہ علامات ظاہر ہو گئیں تو جس وقت بلوغت کی علامت ظاہر ہونگی اس وقت سے ان پر نماز فرض ہو جائے گی۔

۳)۔نماز کے فرض ہونے کیلئے بلوغت شرط ہے اور لڑکے کے بالغ ہونے کی کم سے کم عمر ۱۲ سال ہے اور زیادہ سے زیادہ عمر ۱۵ سال ہے۔ اگر پندرہ سال سے پہلے لڑکے میں بلوغت کی علامات ظاہر ہو جائیں تو اسی وقت سے نماز فرض ہو جاتی ہے لہٰذا اگر بالغ ہونے کے بعد آپ کی کوئی نماز قضا نہیں ہوئی تو آپ پر قضاء عمری نہیں ہے۔

لمافی الهندية(۱/۱۰۸): ويكره قيام الامام وحده فى الطاق وهو المحراب ولايكره سجوده فيه اذا كان قائما خارج المحراب هكذا فى التبيين، واذا ضاق المسجد بمن خلف الامام فلا بأس بان يقوم فى الطاق كذا فى فتاوى البرهانية.

وفى الشامية(۱/۶۴۷):وحكى الحلوانى عن ابى الليث: لايكره وقيام الامام فى الطاق عند الضرورة بأن ضاق المسجد على القوم......

وفى الدر المختار(۲/۱۵۳،۱۵۴): (بلوغ الغلام بالاحتلام والإحبال والإنزال) والأصل هو الإنزال (والجارية بالاحتلام والحيض والحبل) ولم يذكر الإنزال صريحا لأنه قلما يعلم منها (فإن لم يوجد فيهما) شئ(فحتى يتم لكل منهما خمس عشرة سنة به يفتى) لقصر أعمار أهل زماننا وفى الشامية تحته: (قوله به يفتى) هذا عندهما وهو رواية عن الإمام وبه قالت الأئمة الثلاثة. (وأدنى مدته له اثنتا عشرة سنة ولها تسع سنين) هو المختار كمافى أحكام الصغار.

(۲۱۳) آستینیں چڑھا کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام [illegible] مسئلہ کے بارے میں کہ آستینیں اگر کہنیوں سے اوپر چڑھی ہوئی ہوں تو اس

حالت میں نماز پڑھنا کیسا ہے؟ نیز اگر کہنیوں سے تو نیچے ہوں لیکن کلائیوں سے اوپر ہوں تو اس صورت میں بھی کیا نماز میں کراہت آئے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... آستینیں اگر کہنیوں سے اوپر چڑھی ہوئی ہوں تو اس حالت میں نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔ لیکن اگر کہنیوں سے تو نیچے ہوں لیکن کلائیوں سے اوپر ہوں تو اس صورت میں نماز میں کراہت نہیں آئے گی۔ لیکن احتیاط اسی میں ہے کہ آستینوں کو کلائیوں سے بھی اوپر نہ چڑھائے۔

لما فی الدر المختار (۱/ ۶۴۰): (و) کره (کفه) أی رفعه ولو لتراب کمشمر کم أوذیل.

وفی الشامیة تحته: (قوله کمشمر کم أوذیل) أی کمالو دخل فی الصلوة وهومشمر کمه أوذیله واشاربذالک الی ان الکراهة لاتختص بالکف وهو فی الصلوٰة کما افاده فی شرح المنیة لکن قال فی القنیة. واختلف فیمن صلی و قد شمر کمیه لعمل کان یعمله قبل الصلوة او هیئته ذالک ومثله مالو شمر للوضوء ثم عجل لادراک الرکعة مع الامام: واذا دخل فی الصلوة کذالک وقلنا بالکراهة فهل الأفضل ارخاء کمیه فیها بعمل قلیل اوترکهما؟ لم اره والاظهر الاول بدلیل قوله الاتی ولو سقطت قلنسوته فاعادتها افضل تامل هذا وقید الکراهة فی الخلاصة و المنیة بان یکون رافعا کمیه الی المرفقین وظاهره انه لایکره الی مادونهما قال فی البحر والظاهر الاطلاق لصدق کف الثوب علی الکل ونحوه فی الحلیة وکذا قال فی شرح المنیة الکبیر ان التقیید بالمرفقین اتفاقی. قال: وهذا لوشمرهما خارج الصلوة ثم شرع فیها کذالک امالو شمر وهو فیها تفسد لانه عمل کثیر.

(۲۱۴) نماز میں کہنیوں کو کھلا رکھنے اور مچھروں کی وجہ سے ٹخنے ڈھانپنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دورانِ نماز کہنیوں کو کھلا رکھنے کا کیا حکم ہے؟ اگر کوئی شخص مچھروں سے بچاؤ کے لئے اپنے ٹخنوں کو ڈھانپے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟ اسی طرح نماز کیلئے کپڑوں کا پاک ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر ضروری ہے تو کس حد تک؟ مدلل طور پر جواب دے کر مشکور وممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... نماز کے دوران کہنیوں کا ڈھانپنا سنت ہے اور ان کو کھلا رکھنا مکروہ ہے۔ مردوں کیلئے ٹخنوں سے نیچے پائنچے وغیرہ کا کرنا کسی حال میں بھی جائز نہیں کیونکہ احادیث میں اس کے بارے میں بہت سخت وعید وارد ہوئی ہے۔ البتہ مچھروں سے بچنے کیلئے جرابوں وغیرہ کا استعمال کریں۔

نماز کے درست ہونے کیلئے کپڑوں کا مکمل پاک ہونا ضروری ہے البتہ اگر کسی شخص نے نماز پڑھی اور اس کے کپڑوں میں نجاست غلیظہ

(مثلاً پیشاب، منی، پاخانہ، شراب وغیرہ) لگی ہوئی تھی اب اس نجاست کو دیکھا جائے گا کہ اگر وہ نجاست ایک درہم کی مقدار سے کم ہے تو نماز ہوگئی ہاں اگر ایک درہم یا ایک درہم سے زیادہ ہے تو نماز درست نہ ہوگی۔ اور اگر کپڑے پر نجاست خفیفہ (مثلاً ان جانوروں کا پیشاب جن کا گوشت کھایا جاتا ہے گائے، بکری، وغیرہ) لگی ہوئی تھی اگر اس نجاست کی مقدار کپڑے کے چوتھائی سے کم تھی تو نماز ہوگئی اگر زیادہ تھی تو نماز درست نہ ہوگی۔

لمافی مشكوة المصابيح (۱/ ۲۴۳): عن النبی ﷺ قال: ثلاثة لا يكلمهم الله يوم القيامة ولا ينظر اليهم ولا يزكيهم ولهم عذاب اليم قال ابو ذر: خابوا وخسروا من هم؟ يا رسول الله! قال، المسبل، والمنان، والمنفق سلعته بالحلف الكاذب.

وفی مراقی الفلاح (ص۲۰۷،۲۰۸): (و) منها (طهارة الجسد والثوب والمكان) الذی يصلی عليه ...... (من نجس غير معفو عنه) وتقدم بيانه.

وفيه ايضاً (ص۱۵۶، ۱۵۷): ولما بين القسمين بين القدر المعفو عنه فقال (وعفى قدر الدرهم) وزناً فی المتجسدة وهو عشرون قيراطاً ومساحة فی المائعة وهو قدر مقعر الكف داخل مفاصل الاصابع كما وفقه الهندوانی، و هو الصحيح فذلک عفو (من) النجاسة (المغلظة) فلا يعفى عنها إذا زادت على الدرهم مع القدرة على الازالة (و) عفى قدر مادون ربع الثوب الكامل (أو البدن) كله على الصحيح من الخفيفة لقيام الربع مقام الكل.

وفی الدرالمختار (۱/ ۶۴۰): وكره كفه أی رفعه ولو لتراب كمشمر كم أو ذيل

وفی الشامية تحته: ای كما لو دخل فی الصلاة وهو مشمر كمه أو ذيله وأشار بذلک الی ان الكراهة لاتختص بالكف وهو فی الصلاة كما أفاده فی شرح المنية لكن قال فی القنية واختلف فی من صلى وقد شمر كميه لعمل كان يعمله قبل الصلاة او هيئته ذلک اهـ. ومثله ما لو شمر للوضوء ثم عجل لادراک الركعة مع الامام واذادخل فی الصلاة كذلک وقلنا بالكراهة فهل الأفضل ارخاء كميه فيها بعمل قليل أو تركهما؟ لم أره: والاظهر الأول بدليل قوله الاتی ولو سقطت قلنسوته فإعادتها أفضل.

هذا وقيد الكراهة فی الخلاصة والمنية بأن يكون رافعا كميه الى المرفقين وظاهره أنه لا يكره الى مادونهما قال فی البحر: والظاهر الاطلاق لصدق كف الثوب على الكل اهـ ونحوه فی الحلية وكذا قال فی شرح المنية الكبير: ان التقييد بالمرفقين اتفاقی

قال: وهذا لوشمرهما خارج الصلاة ثم شرع فيها كذلک أما لو شمر وهو فيها تفسد لانه عمل كثير.

(۲۱۵) سود کے پیسوں سے بنائے ہوئے مکان میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ایک دوست سود کا کاروبار کرتے ہیں اور سودی رقم سے مکان بنایا ہے تو اب پوچھنا یہ ہے کہ سود کی رقم سے بنے ہوئے مکان میں نماز پڑھنا جائز ہے یا ناجائز؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں سودی کاروبار کرنے والا گناہ کبیرہ میں مبتلا ہے، اسے چاہئے کہ کوئی جائز کاروبار شروع کرے۔ اوران پیسوں سے جو مکان بنایا ہے اس میں نماز پڑھنا مکروہ ہوگا۔

لما فی الهندية(۱۴۲/۵): فی المنتقی قال ابو یوسفؒ اذا غصب رجل أرضاوبناها حوانيت و حماما و مسجدا فلا باس بالصلوة فی ذلک المسجد فأما الحمام فلا يدخل ولا يستأجر الحوانيت قال ولابأس بان يدخل الحوانيت لشراء المتاع قال هشآم وأنا أكره الصلوة فيه حتى يطيب بذلک اربابه.

وفی الفقه الاسلامی(۹۸۴/۲): الصلوة فی الارض المغصوبة حرام بالاجماع لان اللبث فيها يحرم فی غير الصلاة فلان يحرم فی الصلوة اولی . والله اعلم بالصواب.

(۲۱۶) ٹی وی اور آلات موسیقی والے کمرے میں نماز کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گھر کے ایک کمرے میں ٹی وی رکھا ہوا ہے اس کمرے میں کوئی اور سامان نہیں ہے بالکل خالی ہے تو ہمارے گھر والے اور ہم لوگ اس کمرے میں نماز پڑھتے رہتے ہیں۔ آیا جس کمرے میں ٹی وی رکھا ہو، اس میں نماز پڑھنا شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں اگر ٹی وی چل رہا ہو پھر تو یہ انتہائی مکروہ فعل ہے کیونکہ اس میں تصویروں کی عبادت کرنے والوں سے مشابہت لازم آئے گی لیکن نماز کراہت کے ساتھ ہو جائے گی اور اگر ٹی وی بند ہو تو پھر بھی نماز ہو جائے گی لیکن خلاف اولیٰ ہے کیونکہ عموماً ایسی جگہوں پر نماز میں اطمینان قلب حاصل نہیں ہوتا۔

لما فی الهندية(۶۳/۱): وتكره الصلاة فی تسع مواطن فی قوارع الطريق ومعاطن الابل والمزبلة والمجزرة والمخرج والمغتسل والحمام والمقبرة وسطح الكعبة ولا بأس بالصلاة والسجود على الحشيش والحصير والبسط والبواری هكذا فی فتاویٰ قاضيخان.

وفيه ايضاً(۹۸۱/۲): الكنيسة(معبد النصاری) والبيعة (معبد اليهود) ونحوهما من أماكن الكفرّ تكره الصلاة فيها عند الجمهور وابن عباس مطلقا عامرة أو دارسة الا لضرورة كحر أو برد أو مطر

أو خوف عدّو او سبع فلا كراهة، وحكمة الكراهة إنها ماوى الشياطين لأنها لا تخلو من التماثيل والصور ولأنها موضع فتنة وأهواء مما يمنع الخشوع...... قال النووى فى المجموع. وتكره الصلاة فى مأوى الشياطين كالخمارة وموضع المكس ونحو ذلك من المعاصى الفاحشة.

(۲۱۷) آئینہ کے سامنے نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ میں کہ ایسی جگہ نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے جہاں نمازی کے سامنے بڑا سا آئینہ ہو جس میں اسکی تصویر دکھائی دے رہی ہو، نیز اندھیرے کمرے میں نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... آئینہ کے سامنے نماز پڑھنا جائز ہے البتہ اگر اسکی وجہ سے خشوع وخضوع میں خلل واقع ہو رہا ہو تو آئینے کے سامنے نماز پڑھنا مکروہ ہوگا، نیز اندھیرے کمرے میں نماز پڑھنا بھی درست ہے جبکہ استقبال قبلہ درست ہو، اگر قبلہ کی سمت معلوم نہ ہو تو کسی سے پوچھ کر قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھے اور اگر کوئی بتانے والا نہ ہو تو خود تحری کر کے نماز پڑھ لے۔

لمافى مراقى الفلاح(صـ۲۹۳): (و)تكره بحضرة كل (مايشغل البال) كزينة (و) بحضرة ما (يخل بالخشوع) كلهوولعب ولذانهى النبى ﷺ عن الاتيان للصلاة سعيابالهرولة.

وفى الشامية(۱/۴۳۱):فان كان عاجزابالاشتباه وهوان يكون فى المفازةفى ليلة مظلمةولاعلم له بالامارات الدالةعلى القبلةفان كان بحضرته من يسئله عنهالايجوزله ان يتحرى بل يجب ان يسئل لماقلنااى من ان النسوال أقوى من التحرى.

(۲۱۸) آئینے کے سامنے نماز پڑھنا تصویر کے حکم میں نہیں

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کے سامنے بڑا آئینہ لگا ہوا ہو تو وہ اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں جبکہ اس کی تصویر آئینے میں مکمل طور پر نظر آتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... آئینے میں جو چیز نظر آتی ہے اس کو تصویر نہیں کہا جاتا بلکہ عکس کہا جاتا ہے اس لئے یہ تصویر کے حکم میں نہیں ہے لہٰذا صورت مسئولہ میں آئینے کے سامنے نماز پڑھنے میں فی نفسہٖ کوئی کراہت نہیں جیسا کہ مصلی کا سایہ بحالت نماز سامنے پڑنا موجب کراہت نہیں البتہ آئینہ اور اس جیسی اشیاء جن سے نمازی کے خشوع وخضوع میں خلل آتا ہو سامنے کر کے نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

لمافى قاضى خان(۱/۱۶۸): ولو نظر فى مرأة ورأى فيها فرج إمرأة فنظر عن شهوة لا يحرم عليه أمها وابنتها لانه لم يرفرجها وإنما رأى عكسها. ولو كانت المرأة على شط حوض او على قنطرة فنظر الرجل فى الماء فرأى الرجل فرجها فنظر عن شهوة لا يثبت الحرمة.

وفی الشامیة(۱/۶۵۸):قوله لانه یلهی المصلی: أی فیخل بخشوعه من النظر الی موضع سجوده ونحوه، وقد صرح فی البدائع فی مستحبات الصلوة أنه ینبغی الخشوع فیها ویکون منتهی بصره إلیٰ موضع سجوده الخ وکذا صرح فی الاشباه أن الخشوع فی الصلوة مستحب والظاهر من هذا ان الکراهة هنا تنزیهیة فافهم.

وفیه ایضاً(صـ۴۰۳): وفی القنیة: لو صلّی علی زجاج یصف ماتحته قالو جمیعا یجوز.

وفی المفصل فی احکام المرأة والبیت المسلم(۱/۲۲۹): مایکره فی الصلاة: یکره للمصلی فی صلوته العبث بثوبه او بدنه او...... یرفع بصره الی السماء أو...... إلی ما یشغله عن الصلوة أو...... ان یصلی بحضرة الطعام أو...... ان یترک شیأ من سنن الصلوة.

(۲۱۹) اندھیرے میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے بڑے فرماتے ہیں کہ جب نماز پڑھی جائے تو روشنی کا انتظام پہلے کرلینا ضروری ہے، اندھیرے میں نماز نہیں ہوتی۔ کیا ان حضرات کی بات صحیح ہے یا اندھیرے میں بھی نماز ہوجاتی ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً...... آپ کے بڑوں کا یہ کہنا کہ ''اندھیرے میں نماز نہیں ہوتی'' صحیح نہیں ہے۔ اندھیرے میں نماز بلا کراہت درست ہے۔

لمافی الهندیة(۱/۶۴): رجل صلی فی المسجد فی لیلة مظلمة بالتحری فتبیّن انه الی غیر القبلة جازت صلوته.

وفی الطحطاوی علی الدر(۱/۱۹۲): اما باللیل فیصلی قائماً لان ظلمة اللیل تستر عورته.

وفی الدرالمختار(۱/۴۳۳): وان علم به فی صلوته او تحول رایه .... ولو بمکة او مسجد مظلم ولا یلزمه قرع ابواب ومس جدران.

وفی الشامیة تحته: وفی الخلاصة اذا لم یکن فی المسجد قوم والمسجد فی مصرٍ فی لیلةٍ مظلمةٍ (قوله ومس جدران) لان الحائط لو کانت منقوشة لا یمکنه تمییز المحراب من غیره وعسی ان یکون ثم هامة مؤذیةً .... وهذا انما یصح فی بعض المساجد فاما فی الاکثر فیمکن تمییز المحراب من غیره فی الظلمة بلا ایذاءٍ.

(۲۲۰) سامنے موم بتی یا لالٹین وغیرہ رکھ کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ موم بتی اور لالٹین وغیرہ سامنے رکھ کر نماز پڑھنا کیسا ہے؟

نماز میں کراہت تونہیں آتی ؟

الجواب حامداًومصلیاً......اگر کوئی شخص موم بتی یالالٹین وغیرہ سامنے رکھ کرنماز پڑھے تو نماز درست ہے اور نماز میں کوئی کراہت نہیں آتی ۔ البتہ بہتر یہ ہے کہ نماز کی حالت میں موم بتی یالالٹین وغیرہ جانبین میں سے کسی جانب رکھیں ۔

لمافی الهندية (۱/۱۰۸): ولو توجه الى قنديل أو الى سراج لم يكره.

وفي الدر المختار (۱/۲۵۱):(و) لايكره (صلاة الى ظهر قاعد) أو قائم ولو (يتحدث) الااذا خيف الغلط بحديثه (و) لا الى (مصحف أو سيف مطلقا أو شمع أو سراج) أونار توقد لأن المجوس انما تعبد الجمر لا النار الموقدة .

(۲۲۱) چشمہ لگا کرنماز پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کل ایک صاحب مجھ سے الجھ پڑے کے نماز چشمہ اتار کر پڑھنا چاہئے ، یہی اولیٰ اور افضل ہے۔آنجناب سے گذارش یہ تھی آپ میری صحیح بات کی طرف راہنمائی فرمادیں کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......صورت مسئولہ میں فی نفسہ چشمہ لگانا جائز ہے البتہ اگر سجدہ وغیرہ کرتے وقت ڈھیلا ہونے سے الجھنے کا گمان ہو یا اس سے خشوع وخضوع میں خلل آتا ہوتو چشمہ لگانا نماز میں مکروہ ہے،اس کواتار دینا افضل ہے۔اوراگراس کی وجہ سے خشوع وخضوع میں اضافہ ہوتا ہوتو چشمہ لگا کرنماز ادا کرنا بلاکراہت درست ہے۔نیز ایسے امور میں آپس میں بحث ومباحثہ اورالجھنا اچھانہیں ۔

وفي الهندية(۱/۱۰۹): ولا بأس ان يصلى متقلداً للقوس والجعبة الا ان يتحركا عليه حركة تشغله فحينئذ مكروه ويجزيه.

وفي الدر المختار(۱/۶۴۰):(و) كره(كفه)أى رفعه ولولتراب كمشمركم أوذيل (وعبثه به) اى بثوبه (وبجسده) للنهي الالحاجة ولا بأس به.

وفي الشامية تحته:(قوله وعبثه) هو فعل لغرض غير صحيح قال في النهاية :وحاصله ان كل عمل هو مفيد للمصلى فلا بأس به اصله ماروى ان النبى ﷺ عرق في صلاته فسلت العرق عن جبينه اى مسحه لانه كان يؤذيه فكان مفيداً. وفي زمن الصيف كان اذاقام من السجود نفض ثوبه يمنة أو يسرةً لانه كان مفيدا كي لاتبقى صورة فأما ما ليس بمفيد فهو العبث.

وفي فتاوىٰ اللجنة(۶/۱۷۳): س: ماحكم الصلاة في النظارات الطبية:

ج: يجوز للانسان ان يصلى بالنظارات الطبية الا اذا كان استعمالها يمنع من تمكين المصلى جبهته

او انفه من الارض فلا یجوز.

(۲۲۲) بغیر عمامہ نماز پڑھنے کا حکم

سوال……کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بغیر عمامہ کے نماز پڑھنا پڑھانا کیسا ہے، آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی نماز بغیر عمامہ کے پڑھنا ثابت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً……عمامہ باندھنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک سنت ہے اور احادیث مبارکہ میں عمامہ باندھنے کی بڑی فضیلت آئی ہے اور عمامہ باندھنا اجر وثواب کا باعث ہے. چنانچہ بغیر عمامہ نماز پڑھنا اور پڑھانا اگر چہ جائز ہے لیکن (بعض روایات کے مطابق اگر چہ وہ ضعیف ہیں) عمامہ باندھ کر پڑھی گئی نماز کا ثواب بغیر عمامہ پہنے پڑھی گئی نماز کے مقابلے میں پچیس گنا زیادہ ہے لہٰذا بغیر عمامہ کے پڑھی گئی نماز میں پچیس گنا ثواب سے محرومی ہے۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بغیر عمامہ کے نماز پڑھنا تتبع کے باوجود نہ مل سکا البتہ ننگے سر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوائے حالت احرام کے کبھی نماز نہیں پڑھی۔

لمافی المرقاة (۸/۲۵۰): وروی ابن عساکر عن ابن عمر مرفوعا صلاة تطوع او فريضة بعمامة تعدل خمسا وعشرين صلاة بلا عمامة وجمعة بعمامة تعدل سبعين جمعة بلا عمامة فهذا كله يدل على فضيلة العمامة مطلقا.

وفی حاشية ملتقى الابحر (۲/۲۳۲): العمامة سنة نبوية شريفة غفل عنها كثير من العلماء بل زهدوا حتى فی تغطية الرأس مماليس من شعار الكفرة وقد قال على القاریؒ ان رسول الله ﷺ ماصلى حاسر الرأس الا فی احرامه.

﴿فصل فی السنن والنوافل﴾

(سنن اور نفل نمازوں کا بیان)

(۲۲۳) سنتوں کو اذان سے پہلے پڑھ لینے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ظہر کی اذان سے قبل چار سنتیں پڑھنا کیسا ہے چا ہے بعض مساجد میں اذان ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، یہ سنتیں وقت کی تابع ہیں یا اذان کے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اذان شریعت میں فرض نماز کیلئے مشروع ہوئی ہے اور یہ نماز کے دخول وقت کی علامت ہے۔ البتہ نوافل اور سنتیں فرائض کے تابع ہیں۔ لہٰذا ان کو فرض نماز کا وقت داخل ہونے کے بعد ادا کیا جا سکتا ہے۔ اگر چہ ابھی اذان نہ ہوئی ہو۔

لما فی الدر المختار(۱/ ۳۸۴): (و) سببه (بقاء دخول الوقت،وهو سنة) للرجال فی مكان عال (مؤكدة) هی كالواجب فی لحوق الاثم (للفرائض) الخمس(فی وقتها ولو قضاء) لأنه سنة للصلاة حتی يبرد به لا للوقت (لا) يسن (لغيرها) كعيد.

(۲۲۴) صبح صادق کے بعد ''نفل'' سنت فجر شمار ہوگی

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تہجد کی نیت کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ صبح صادق طلوع ہوگئی ہے تو کیا یہ دو رکعت سنت فجر سے کفایت کرے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر کوئی شخص تہجد کی نفل کی نیت کر کے نماز شروع کر دے بعد میں معلوم ہو جائے کہ صبح صادق طلوع ہو چکی ہے تو یہ دو رکعت فجر کی سنت ہی شمار ہوگی۔

لمافی الهندية(۱/ ۱۱۲): لو صلی ركعتين وهو يظن أن الليل باق فاذا تبين أن الفجر قد كان طلع ...... قال المتأخرون يجزيه عن ركعتی الفجر ذكر الشيخ الامام الاجل شمس الائمة الحلوانی فی شرح كتاب الصلاة ظاهر الجواب أنه يجزيه عن ركعتی الفجر لان الاداء حصل فی الوقت.

(۲۲۵) اگر جماعت کھڑی ہو چکی ہو تو سنت فجر کب پڑھی جائے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی نے فجر کی سنتیں نہ پڑھی ہوں اور امام نماز پڑھا رہا

ہوتو بعض فقہاء فرماتے ہیں کہ اگر کسی طرح یہ یقین یا ظنِ غالب ہوجائے کہ ایک رکعت جماعت سے مل جائے گی تو پھر فجر کی سنتوں کو پڑھ لینا چاہیے اور بعض فرماتے ہیں کہ اگر تشہد ہی مل جانے کی امید ہوتو پھر بھی پڑھ لینا چاہیے۔سوال یہ ہے کہ ان دونوں اقوال میں سے کونسا قول راجح ہے تاکہ اس پر عمل کیا جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... آپ کے ذکر کردہ اقوال میں دوسرا قول راجح ہے یعنی اگر مقتدی کو صرف تشہد مل جانے کی امید ہو، تب بھی فجر کی سنتیں پڑھ لینی چاہئیں نیز اس صورت میں اس کو دونوں فضیلتیں حاصل ہو جائیں گی، سنت فجر کی بھی اور جماعت کی بھی لہٰذا یہی بہتر ہے۔

لمافي الهندية(۱/۱۲۰): ولم يذكر في الكتاب أنه ان كان يرجو ادراک القعدة كيف يفعل فظاهر ما ذكر في الكتاب أنه ان خاف أن تفوته الركعتان يدل على أنه يدخل مع الامام وحكى عن الفقيه أبي جعفرؒ أنه قال على قول أبي حنيفة وأبي يوسف رحمهما الله تعالىٰ يصلي ركعتي الفجر لأن ادراک التشهد عندهما كادراک الركعة كذا في الكفاية.

وفي الشامية(۲/۵۶): (وقيل التشهد) أي اذا رجا ادراک الامام في التشهد لايتركها بل يصليها وان علم أن تفوته الركعتان معه ...... قلت: لكن قواه في فتح القدير بما سيأتي من أن من ادرک ركعة من الظهر مثلا فقد أدرک فضل الجماعة وأحرز ثوابها كما نص عليه محمد وفاقا لصاحبيه وكذا لو ادرک التشهد يكون مدركا لفضيلتها على قولهم قال: وهذا يعكر على ماقيل إنه لورجا ادراک التشهد لايأتي بسنة الفجر على قول محمدؒ والحق خلافه لنص محمد على ما يناقضه أي لان المدار هنا على ادراک فضل الجماعة وقد اتفقوا على ادراكه بادراک التشهد فيأتي بالسنة اتفاقا كما أوضحه في الشرنبلالية ايضا وأقره في شرح المنية الخ.

(۲۲۶) فجر کی سنت کس وقت چھوڑ سکتا ہے

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فجر کی سنتیں کس وقت چھوڑنا جائز ہے نیز اگر مقتدی کو معلوم نہ ہو کہ کونسی رکعت ہے تو اس وقت سنت چھوڑنا جائز ہے کہ نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... فجر کی سنت اس وقت چھوڑ سکتا ہے جبکہ فرض کی دونوں رکعات فوت ہوجانے کا خدشہ ہو، اور اگر یہ یقین ہو کہ امام کے ساتھ تشہد میں شریک ہوسکتا ہوں تو سنت چھوڑنا درست نہیں ہے۔

لمافي التاتارخانية(۱/۶۴۷): اذا كان يرجوا دراک القعدة مع الامام صريحا انه يشتغل بركعتي الفجر: واشار الى انه يدخل مع الامام فانه قال: اذا خشي ان تفوته الركعتان مع الامام دخل في صلاة الامام وبه اخذ بعض المشايخ...... ومنهم من قال على قياس قول ابي حنيفة و ابي يوسف رحمهما

اللہ یجب ان یشتغل برکعتی الفجر اذا کان یرجوادراک الامام فی التشھد.

وفی حلبی کبیر(صـ۳۹۷): بخلاف سنة الفجر الفجر فانه یجوز اداؤھا اذا علم انه یدرکه فی التشھد عندھما وعند محمد اذا علم انه یدرک الرکعة الثانیة.

(۲۲۷) سنتِ فجر کی قضاء نہیں ہے

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک کارخانے میں ملازمت کرتا ہوں اللہ کے فضل سے نمازوں کی پابندی کرتا ہوں کبھی میری صبح جلدی آنکھ نہیں کھلتی جس کی وجہ سے صبح کی سنت رہ جاتی ہیں دن میں مصروفیت کی وجہ سے قضاء بھی نہیں کرپاتا تو کیا صبح کے فرائض کے فوراً بعد میرے لیے سنت پڑھنے کی گنجائش ہوگی؟

الجواب حامداًومصلیاً......سنت فجر کی احادیث میں بہت تاکید وارد ہوئی ہے، اور سنن نماز میں سب سے زیادہ مؤکد سنت ہے۔اس لیے سنتِ فجر کا اہتمام ضرور کرنا چاہیے۔اگر امام کے ساتھ تشہد ملنے کی امید ہو، اور جماعت فوت ہونے کا خوف نہ ہوتو سنت ادا کرکے جماعت میں شامل ہونا چاہیے، تاہم اگر کبھی سنت فجر قضاء ہوجائے تو اصولی طور پر سنت کی قضاء نہیں ہے۔البتہ سنت فجر کی تاکید بہت زیادہ وارد ہونے کی وجہ سے فقہاء فرماتے ہیں کہ اگر سنت فجر فرض کے ساتھ رہ جائے تو طلوع آفتاب کے بعد زوال سے پہلے پہلے اس کی قضا فرض کے تابع ہوکر درست ہوگی۔اور بعداززوال صرف فرض کی قضاء ہوگی۔سنت کی قضاء ساقط ہوجائے گی۔

لمافی الھندیة(۱/۵۳): ومنھا ما بعد صلاة الفجر قبل طلوع الشمس ھکذا فی النھایة والکفایة ولو افسد سنة الفجر ثم قضاھا بعد صلوة الفجر لم یجزه الخ.

(۱/۱۱۲)اقوی السنن رکعتا الفجر...... والسنن اذا فاتت عن وقتھا لم یقضھا الارکعتی الفجر اذا فاتتا مع الفرض یقضیھما بعد طلوع الشمس الی وقت الزوال ثم یسقط ھکذا فی محیط السرخسی وھو الصحیح ھکذا فی البحرالرائق، واذا فاتتا بدون الفرض لایقضی عندھما خلافا لمحمد رحمه اللہ تعالیٰ

وفی المراقی(صـ۳۱۴): رکعتان قبل صلوة الفجر وھی اقوی السنن، وفی حاشیة الطحطاوی (صـ۳۱۵) لکثرة ما ورد فیھا من المرغبات ...... وتقضیٰ اذا فاتت مع الفرض دون غیرھا الخ.

وفی الشامیة علی الدر المختار(۲/۱۴): والسنن آکدھا سنة الفجر اتفاقاً،فیه ایضاً(صـ۱۵) ولا یجوز ترکھا لعالم صار مرجعاً فی الفتاویٰ ...... وتقضی اذا فاتت معه.

وفی الشامیة تحته: (قوله فله ترکھا الخ) الظاھر ان معناه انه یترکھا وقت اشتغاله بالافتاء ...... وظاھر التفرقة بین سنة الفجر وغیرھا، انه لیس له ترک الجماعة لانھا من الشعائر فھی آکد من سنة الفجر

ولذا يترکها لو خاف فوت الجماعة.

وفی الشامية تحته: (قوله وتقضیٰ) ای الی قبيل الزوال وقوله معه تنازعه قوله تقضی وفاتت فلا تقضی الامعه حيث فات وقتها، أما اذا فاتت وحدها فلا تقضی ولا تقضی قبل الطلوع ولا بعد الزوال ولو تبعاً علی الصحيح.

(۲۲۸) ظہر اور جمعہ سے پہلے کی سنتوں کی قضاء کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں اردو فتاویٰ کا ایک دن مطالعہ کر رہا تھا۔ اس میں جمعہ کی سنت قبلیہ کے بارے میں لکھا تھا کہ اگر یہ کسی عذر کی بناء پر نماز جمعہ پڑھنے سے پہلے کوئی نہ پڑھ سکا تو وہ ساقط ہو جائیں گی۔ ان کی قضاء نہیں۔ اس لئے کہ اس بارے میں کوئی نص وارد نہیں۔ اور ظہر کی سنت قبلیہ فوت ہونے کی صورت میں قضاء کرنے کے بارے میں روایت سے صراحت ثابت ہے۔ جبکہ بعض دوسرے فتاویٰ میں قضاء کرنے کی ترتیب لکھی ہے کہ جمعہ کے فرض پڑھنے کے بعد پہلے چار سنتیں پڑھ لے پھر وہ شروع والی فوت شدہ چار سنتیں پڑھ لے۔ جبکہ شروع میں بندہ نے خود اس پہلے قول کے مطابق عمل شروع کیا۔ اب دوسرے فتاویٰ دیکھنے سے تردد میں پڑ گیا۔ کیونکہ دوسرے قول سے قضاء کرنا معلوم ہوتا ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ قول راجح اور مفتی بہ کی طرف رہنمائی فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔ بینوا توجروا

الجواب حامداًومصلیاً..... فقہاء کرام کی تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی نماز کا قضا کرنا فرض یا واجب کے ساتھ مختص ہے۔ اس لئے اگر سنن اپنے محل سے فوت ہو جائیں تو ان کی قضاء نہیں ہے۔ تاہم صبح کی سنتیں زوال تک تبعاً للفرض قضاء کرنا درست ہے اسی طرح اگر کوئی شخص ظہر سے قبل کی چار رکعت سنت جماعت سے پہلے نہ پڑھ سکے تو جماعت کے بعد ان کی قضاء درست ہے۔ ان دو وقت کی سنتوں کو نص کی وجہ سے مستثنیٰ کیا گیا ہے، جمعہ سے قبل کی سنتوں کے متعلق بھی بعض فقہاء کی یہی رائے ہے چنانچہ ابن نجیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **وحکم الاربع قبل الجمعة کالاربع قبل الظهر** "بعض دوسرے فقہاء رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب وہ اپنے وقت سے فوت ہو جائیں تو جمعہ پڑھنے کے بعد نہیں پڑھی جائیں گی۔ علامہ شامی رحمہ اللہ نے اس قول کو ترجیح دی ہے کیونکہ ظہر کی سنتوں کی قضاء کے بارے میں نص موجود ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں "**کان رسول الله ﷺ اذا فاتته الاربع قبل الظهر صلاها بعد الرکعتين بعد الظهر**" (ابن ماجه، ص ۸۰) "یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب ظہر سے پہلے کی چار سنتیں رہ جاتیں تو ان کو ظہر کے بعد کی دو رکعتوں کے بعد پڑھتے تھے" جبکہ جمعہ سے قبل کی سنتوں کے بارے میں کوئی نص نہیں ہے کہ وہ جمعہ کے بعد پڑھیگی ہیں اور سنتوں میں اصل یہ ہے کہ ان کی قضاء نہ کی جائے اس لئے جمعہ سے پہلے کی سنتیں اگر فوت ہو جائیں تو نماز جمعہ پڑھنے کے بعد ان کی قضاء نہ کی جائے لہٰذا جن مفتیان کرام نے قضاء کا فتویٰ دیا ہے انہوں نے ظہر سے قبل کی چار سنتوں پر قیاس کیا ہے اور بعض فقہاء کرام کا یہ قول بھی ہے اور جن حضرات نے عدم قضاء کا فتویٰ دیا ہے انہوں نے اصول کو پیش نظر رکھا ہے البتہ احتیاط اس میں ہے کہ پڑھ لی جائیں۔

لـمـافی البحر الرائق(۲/۷۵):(وقضی التی قبل الظهر فی وقته قبل شفعه) بیان لشیئین احدهما القضاء والثانی محله اما الاول ففیه اختلاف والصحیح انها تقضی کما ذکره قاضیخان فی شرحه مستدلا بما عن عائشة ان النبی ﷺ کان اذا فاتته الاربع قبل الظهر قضا هن بعده وظاهر کلام المصنف انها سنة لا نفل مطلق الی ان قال وحکم الاربع قبل الجمعة کالاربع قبل الظهر کما لا یخفی.

وفی الدرالمختار(۲/۵۷،۵۸): ولا یقضیها الا بطریق التبعیة لقضاء فرضها قبل الزوال لا بعده فی الاصح لورود الخبر بقضائها فی الوقت المهمل، بخلاف القیاس فغیره علیه لا یقاس بخلاف سنة الظهر وکذا الجمعة فانه ان خاف فوت رکعة یترکها ویقتدی ثم یاتی بها علی انها سنة فی وقته ای الظهر،

وفی الشامیة تحته: (قوله وکذا الجمعة) ای حکم الاربع قبل الجمعة کالاربع قبل الظهر کما لا یخفی بحر، وظاهره انه لم یره فی البحر منقولا صریحاً وقد ذکره القهستانی لکن لم یعزه الی احد، وذکر السراج الحانوتی ان هذا مقتضی مافی المتون وغیرها لکن قال فی روضة العلماء انها تسقط لما روی انه علیه الصلاة والسلام قال "اذا خرج الامام فلا صلاة الا المکتوبة" اقول وفی هذا الاستدلال نظر لانه انما یدل علی انها لا تصلی بعد خروجه لاعلی انها تسقط بالکلیه ولا تقضی بعد الفراغ من المکتوبة والالزم ان لا تقضی سنة الظهر ایضاً. فانه ورد فی حدیث مسلم وغیره اذا اقیمت الصلوة فلا صلاة الا المکتوبة نعم قد یستدل للفرق بینهما بشی اخر وهو ان القیاس فی السنن عدم القضاء کمامر وقد استدل قاضیخان لقضاء سنة الظهر بما عن عائشة رضی الله عنها "ان النبی ﷺ کان اذا فاتته الاربع قبل الظهر قضاهن بعده" فیکون قضاؤها ثبت بالحدیث علی خلاف القیاس کمافی سنة الفجر، کماصرح به فی الفتح فالقول بقضاء سنة الجمعة یحتاج الی دلیل خاص. وعلیه فتنصیص المتون علی سنة الظهر دلیل علی ان سنة الجمعة لیست کذالک فتامل.

(۲۲۹) تحیۃ المسجد سنتوں کے قائم مقام نہیں ہوسکتی

سوال......کیافرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ میں کہ اگرکوئی ظہر یاجمعہ کی چاررکعات ،فرضوں سے پہلے نہ پڑھ سکےتو آیافرضوں کے بعدکی دوسنتوں کے بعد پڑھے گایاپہلے؟اسیطرح اگرکوئی شخص ظہرکی چاررکعات کی جگہ تحیۃ المسجد پڑھ لےتو یہ سنتوں کے قائم مقام ہوجائینگی؟

الجواب حامداًومصلیاً......صورت مسئولہ میں تحیۃ المسجد پڑھنا سنتوں کے قائم مقام نہیں ہوسکتا اسی طرح اگر چاررکعات سنتیں فرضوں سے پہلے رہ جائیں توانکوفرضوں کے بعدادا کیا جائیگا البتہ دوسنتوں کے بعدادا کرنا بہتر ہے۔

لمافی الشامية(۲/۵۹): قوله وبه يفتى (اقول وعليه المتون لكن رجح فى فتح القدير تقديم الركعتين وقال وفى الامداد، فى فتاوى العتابى أنه المختار، وفى مبسوط شيخ الاسلام أنه الاصح لحديث عائشة (انه عليه الصلاة والسلام كان اذا فاتته الاربع قبل الظهر يصليهن بعد الركعتين) وهوقول الامام الاعظم ابى حنيفة رحمه الله تعالى.

(۲۳۰) فجر، ظہر اور عصر کی سنتوں کا فرض کے بعد پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ میں کہ اگر کسی شخص کی فجر کی سنتیں رہ جائیں اور وہ فرض باجماعت پڑھ لے تو یہ سنتیں بعد میں پڑھی جاسکتی ہیں یا نہیں، اگر ادا کی جاسکتی ہیں تو کب تک؟ نیز ظہر، عصر کی چار رکعات جو پہلے ادا کی جاتی ہیں اگر ادا نہ ہوسکیں تو انہیں بعد میں ادا کیا جاسکتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر کسی کی فجر کی سنتیں رہ جائیں تو وہ طلوع آفتاب کے بعد سے زوال تک انکی قضا کرسکتا ہے اسی طرح اگر ظہر سے پہلے کی چار سنتیں رہ جائیں تو انکو ظہر کے وقت میں پڑھ سکتا ہے البتہ اگر عصر سے پہلے کی چار سنتیں رہ جائیں تو انہیں ادا نہیں کریگا کیونکہ عصر کی نماز کے بعد نوافل مکروہ ہیں۔

لمافی الشامية(۲/۵۷): (قوله ولايقضيها الابطريق التبعية الخ) اى لايقضى سنة الفجر الااذافاتت مع الفجر فيقضيها تبعالقضائه لو قبل الزوال واما اذافاتت وحدهافلا تقضى قبل طلوع الشمس بالاجماع لكراهة النفل بعدالصبح واما بعد طلوع الشمس فكذالک عندهما وعند محمدؒ احب الیّ ان يقضيها إلى الزوال كمافى الدرر، قيل هذاقريب من الاتفاق.

وفى الدر المختار(۲/۵۸): (بخلاف سنة الظهر) وكذا الجمعة (فإنه) إن خاف فوت ركعة (يتركها) ويقتدى (ثم يأتى بها) على أنها سنة (فى وقته) اى الظهر (قبل شفعه) عند محمد وبه يفتى وفى الشامية تحته: (قوله فى وقته) فلا تقضى بعده لا تبعا ولا مقصودا بخلاف سنة الفجر.

وفى الشامية (۱/۳۷۵): (قوله بعد صلوة فجر وعصر) متعلق بقوله وكره اى وكره نفل الخ بعد صلاة فجر وعصر أى إلى ما قبيل الطلوع والتغير الخ.

(۲۳۱) سنتوں کی تیسری رکعت میں خطبہ شروع ہوجائے تو کیا کرے

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص جمعہ کے دن خطبہ سے پہلے چار رکعت سنتیں پڑھ رہا تھا۔ جب وہ تیسری رکعت کیلئے کھڑا ہوگیا، تو امام صاحب نے خطبہ شروع کیا۔ تو اس نے فوراً قعدہ کی طرف واپس آ کر سجدہ سہو

کر کے سلام پھیر دیا۔تو ایک مولوی صاحب اس کے قریب کھڑے تھے۔انہوں نے دیکھا تو بعد میں اس سے کہا۔ایسی صورت میں آپ پر سجدہ سہو واجب نہیں ہے کیونکہ یہاں آپ سے سہو نہیں ہوا تھا بلکہ یہ تو شریعت کی طرف سے آپ کو حکم ہے۔تو کیا مولوی صاحب کی یہ بات صحیح ہے یا ایسے آدمی پر سجدہ سہو لازم ہوگا؟ دلائل کی روشنی میں جواب مطلوب ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً......کوئی شخص جمعہ کے دن چار رکعت سنتیں پڑھ رہا ہو،اسی دوران خطبہ شروع ہو جائے تو اگر وہ ایک رکعت پڑھ چکا ہے تو دوسری رکعت ملا کر دو رکعت مکمل کر کے سلام پھیر دے اگر تیسری رکعت کیلئے کھڑا ہو گیا تو اس صورت میں چار رکعت پوری پڑھنا لازم ہے۔لہٰذا مذکورہ شخص کو چار رکعت سنت پوری کرنی چاہیے تھی جو کہ اس نے پوری نہیں کی اس لئے اس کے ذمے اس کی قضاء لازم ہوگی۔

لمافی المحیط البرهانی(۲/۴۶۴): وان افتتح الصلاة بعد ما خرج الامام خففها و اتمها قال الشیخ الامام الاجل شمس الائمة الحلوانی ابهم الجواب فی الاصل فسره فی النوادر فقال ان کان صلی رکعة اضاف الیها اخری وسلم وان کان نوی اربعا عند التکبیر فان قید الثالثة بالسجدة اضاف الیها الرابعة وسلم وخفف القراءة فیها فیقرأ بفاتحة الکتاب وسورة قصیرة وان کان له ورد فی القراءة ترک الورد فی هذه الصورة واذا لم یقید الثالثة بالسجدة ماذا یصنع؟ لم یذکر هذا الفصل فی النوادر والمتاخرون فی هذا علی قولین منهم من قال یمضی فیها ویتمها اربعا ویخفف القراءة ومنهم من قال یعود الی القعدة وکان هذا القائل قاس هذه السئلة بمسألة باب الحدث.

وفی الشامیة (۲/۱۶):(قوله ولا یصلی الخ) أقول قال فی البحر فی باب صفة الصلاة: إن ما ذکر مسلم فیما قبل الظهر، لما صرحوا به من أنه لا تبطل شفعة الشفیع بالانتقال إلی الشفع الثانی منها ولو أفسدها قضی أربعا الخ.

وفی الدر المختار(۲/۱۵۸): (اذا خرج الامام) من الحجرة ان کان والافقیامه للصعود شرح المجمع (فلا صلاة ولا کلام الی تمامها) وان کان فیها ذکر الظلمة فی الاصح (خلا قضاء فائتة لم یسقط الترتیب بینها وبین الوقتیة) فانها لاتکره سراج وغیره لضرورة صحة الجمعة والا لا ولو خرج وهو فی السنة او بعد قیامه لثالثة النفل یتم فی الاصح ویخفف القراءة.

وفی الشامیة (۲/۱۵۹): عزاه فی البحر الی الولوالجیة والمبتغی ولم یذکر مسئلة النفل فی الشرنبلالیة عن الصغریٰ وعلیه الفتوی. قال فی البحر وما فی الفتح من أنه لوخرج وهو فی السنة یقطع علی رأس رکعتین ضعیف و عزاه قاضیخان الی النوادر.

(۲۳۲) شرعی سفر میں سنت ونوافل کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے اکثر سفر پر جانا ہوتا ہے تو مجھ پر فرائض کے علاوہ سفر کے دوران سنتیں اور نوافل بھی پڑھنا ضروری ہے یا صرف فرائض پر اکتفاء کرنا کافی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... شرعی سفر میں گاڑی وغیرہ کے نکلنے کا خوف ہو، یا جلدی ہو یا حالتِ سیر (یعنی چلنے کی حالت) ہو تو پھر صرف فرائض کی ادائیگی کافی ہے۔ اور اگر حالتِ نزول (یعنی ٹھہرنے کی حالت) اور امن ہو، جلدی بھی نہ ہو تو اس حالت میں سنت مؤکدہ کا حکم وہی ہے جو حالتِ اقامت میں ہے۔ البتہ سنن غیر مؤکدہ اور نوافل پڑھ لینا افضل ہے۔

وفی الهندية (۱/۱۳۹): **وبعضهم جوزوا للمسافر ترك السنن والمختار انه لاياتی بها فی حال الخوف وياتی بها فی حال القرار والامن.**

وفی الدرالمختار (۲/۱۳۱): **(وياتی) المسافر (بالسنن) ان كان (فی حال امن وقرار والا) بان كان فی خوف وفرار (لا) ياتی بها هو المختار لانه ترك لعذر، تجنيس، قيل الاسنة الفجر.**

وفی الشامية تحته: **(قوله وياتی المسافر بالسنن) ای الرواتب...... (قوله هو المختار) وقيل الافضل الترك ترخيصا، وقيل الفعل تقربا. وقال الهندوانی: الفعل حال النزول والترك حال السير...... قلت: والظاهران مافی المتن هو هذا وان المراد بالامن والقرار النزول وبالخوف والفرار السير لكن قدمنا فی فصل القراء ة أنه عبر عن الفرار بالعجلة لانها فی السفر تكون غالبا من الخوف تامل.**

(۲۳۳) سنتوں کے بعد اجتماعی دعا کی شرعی حیثیت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ماموں کے گھر کے پاس جو مسجد ہے اس میں ہر نماز کے بعد خصوصاً جن نمازوں کے بعد سنتیں وغیرہ پڑھی جاتی ہیں۔ ان نمازوں میں امام صاحب سنتوں سے فارغ ہو کر اجتماعی دعا کرواتے ہیں اور سب لوگ ان کے ساتھ شریک ہو کر آمین آمین بآواز بلند کہتے ہیں، آنجناب سے اسی مسئلہ کے متعلق یہ معلوم کرنا تھا کہ سنتوں کے بعد اس طرح اجتماعی دعا کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... سنتوں کے بعد اجتماعی دعا کا مروجہ طریقہ کہ امام بآواز بلند دعا کرتا ہے اور سارے مقتدی آمین کہتے ہیں اور بعض جگہ اس کو واجب اور اتنا ضروری سمجھا جاتا ہے کہ اگر امام سے دعا میں تاخیر ہو جائے تو اس پر بھی اعتراض کیا جاتا ہے اور اس کے نہ کرنے والے پر ملامت کی جاتی ہے یہ بدعت کے زمرے میں آتا ہے۔ لہٰذا شرعاً سنتوں کے بعد دعا کا اس طرح التزام درست نہیں اس سے اجتناب کرنا چاہئے۔

لمافی اعلاء السنن (۲۰۵/۳): ورحم الله طائفة من المبتدعة فی بعض اقطار الهند حیث واظبوا علی ان الامام ومن معه یقومون بعد المکتوبة بعد قرائتهم اللهم انت السلام ومنک السلام الخ.
ثم اذا فرغوا من فعل السنن والنوافل یدعوا الامام عقب الفاتحة جهراً بدعاء مرة ثانیةً والمقتدون یؤمنون علی ذلک وقد جری العمل منهم بذلک علی سبیل الالتزام والدوام حتی ان بعض العوام اعتقدوا ان الدعاء بعد السنن والنوافل باجتماع الامام والمأمومین ضروری واجب حتی انهم اذا وجدوا من الامام تاخیراً لاجل اشتغاله بطویل السنن والنوافل اعترضوا علیه قائلین: انا منتظرون للدعاء ثانیاً وهو یطیل صلاته وحتی ان متولی المساجد یجبرون الامام الموظف علی ترویج هذا الدعاء المذکور بعد السنن والنوافل علی سبیل الالتزام ومن لم یرض بذلک یعزلونه عن الامامة ویطعنونه ولا یصلون خلف من لایصنع بمثل صنیعهم، وایم الله! ان هذا امر محدث فی الدین...... وایضاً ففی ذلک من الحرج مالا یخفی وایضاً فقد مرّ ان المندوب ینقلب مکروهاً اذا رفع عن رتبته لأن التیمن مستحب فی کل شئ من امور العباداة لکن لماخشی ابن مسعودؓ ان یعتقدوا وجوبه اشار الی کراهته. فکیف بمن اصرّ علی بدعة اومنکر؟...... کان ذلک بدعة فی الدین محرمة...... (وفی ص ۲۰۷) ویستحب ان یستقبل بعده ای بعد التطوع الناس ویستغفرون الله ثلاثاً...... ثم یدعون لانفسهم وللمسلمین رافعی ایدهمالخ فانه لادلالة فیه علی قراءة کل ذلک والدعاء بعدهامجتمعین.
وفی مرقاة المفاتیح(۲۶/۳): وقال الطیبی: وفیه ان من اصر علی امر مندوب وجعله عزماً ولم یعمل بالرخصة فقد اصاب منه الشیطان من الاضلال فکیف من اصر علی بدعة او منکر.

(۲۳۴) دن ورات میں نفل نمازیں، ان کی تعدادِ رکعات اوران کےاوقات کا بیان

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک مزدور آدمی ہوں اور پہلے نمازوں میں بہت کوتاہی کرتا تھا اب ایک دوست کی دعوت پر تبلیغ میں ایک چلہ لگایا جس سے زندگی میں کافی تبدیلی رونما ہوئی چنانچہ اب پنج وقتہ نماز جماعت کے ساتھ ادا کرتا ہوں اور چلہ کے دوران امیر صاحب نے دو نفل نمازیں بتائی تھیں، اشراق اور تہجد اس کے پڑھنے کی بھی کوشش کرتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ فرض نمازوں کے علاوہ دن رات میں کتنی نفل نمازیں ہوتی ہیں اور ان کے کیا اوقات ہیں اور کتنی کتنی رکعات ادا کی جاتی ہیں؟ جواب مرحمت فرما کر مشکور فرمائیں۔ بینوا توجروا

الجواب حامداًومصلیاً...... دن ورات میں فرض نمازوں کے علاوہ آپ نفل نمازیں جتنی چاہیں پڑھ سکتے ہیں ان کی کوئی تعداد متعین نہیں ہے بشرطیکہ مکروہ وقت نہ ہو البتہ چند نفل نمازیں مخصوص ہیں ان میں:

(۱)۔نماز تہجد ہے اس کی کم سے کم دو رکعتیں اور زیادہ سے زیادہ آٹھ رکعتیں ہیں اس کا وقت نصف شب کے بعد شروع ہوتا ہے (سویا ہو یا نہ سویا ہو، ہاں سوکر اٹھنے کے بعد پڑھنا بہتر ہے) صبح صادق تک رہتا ہے۔

(۲)۔اشراق کی نماز ہے اس کی کم سے کم دو رکعتیں اور زیادہ سے زیادہ چار رکعتیں ہیں اس کا وقت طلوعِ آفتاب ہونے کے بعد احتیاطاً پندرہ منٹ بعد شروع ہوتا ہے اور چاشت کی نماز تک رہتا ہے۔

(۳)۔چاشت کی نماز ہے اس کی کم سے کم دو رکعتیں اور زیادہ سے زیادہ بارہ رکعتیں ہیں اس کا وقت بھی مکروہ وقت کے بعد سے شروع ہو کر زوال تک رہتا ہے لیکن افضل ومختار یہ ہے کہ ایک چوتھائی دن گزرنے کے بعد پڑھی جائیں۔

(۴)۔زوال کے بعد ظہر سے پہلے چار رکعت

(۵)۔عصر کی فرض نماز پڑھنے سے پہلے چار رکعت

(۶)۔مغرب کی سنتیں پڑھنے کے بعد اوابین کی چھ رکعت

(۷)۔عشاء کی فرض نماز پڑھنے سے پہلے چار رکعت

(۸)۔صلوٰة التسبیح کی چار رکعت روزانہ دن میں مکروہ وقت کے علاوہ اور رات میں جب بھی پڑھ لی جائیں وگرنہ ہفتے یا مہینے یا سال یا زندگی میں ایک مرتبہ پڑھ لی جائیں۔

(۹)۔دو رکعت تحیۃ الوضو

(۱۰)۔دو رکعت تحیۃ المسجد

(۱۱)۔عشاء کے بعد صلوٰة التوبہ دو رکعت

(۱۲)۔صلوٰة الحاجات دو رکعت

(۱۳)۔دو رکعت صلوٰة الاستخارہ

لما فی الهندية (۱/۱۱۲): ومن المندوبات صلوة الضحیٰ واقلها ركعتان واكثرها ثنتا عشرة ركعة ووقتها من ارتفاع الشمس الى زوالها.

وفی الدر المختار (۲/۲۲): وندب اربع فصاعدا فی الضحیٰ علی الصحيح من بعد الطلوع الى الزوال ووقتها المختار بعد ربع النهار وفی المنية اقلها ركعتان واكثرها اثنی عشر واوسطها ثمان وهو افضلها كما فی الذخائر الاشرفية الخ.

وفی الهندية (۱/۱۱۲): وندب الاربع قبل العصر والعشاء وبعدها والست بعد المغرب كذا فی الكنز...... ومنها (ای المندوبات) تحية المسجد وهی ركعتان ومنها ركعتان عقب الوضوء ومنها صلاة الاستخارة وهی ركعتان ومنها صلاة الحاجة وهی ركعتان ....واما صلوة التسبيح فذكرها فی

الملتقط يكبر ويقرأ الثناء ثم يقول سبحان الله والحمد لله ولا اله الا الله والله اكبر خمس عشرة الخ.

وفي الدر المختار (۱۳/۲): ويستحب اربع قبل العصر وقبل العشاء وبعدها بتسليمة ...... وست بعد المغرب ليكتب من الاوابين بتسليمة اوثنتين او ثلاث والاول ادوم واشق:

وفي الشامية تحته: (قوله من الاوابين) جمع اواب: اى رجاع الى الله تعالىٰ بالتوبة والاستغفار (قوله بتسليمة اوثنتين او ثلاث) جزم بالاول في الدرر، وبالثاني في الغزنوية و بالثالث في التجنيس كمافي الامداد لكن الذى في الغزنوية مافي التجنيس ...... فكان المستحب فيه ثلاث تسليمات ليكون على نسق واحد قال هذا ماظهرلي ولم اره لغيرى.

وفي الشامية (۳۷۳/۱): واعلم ان الاوقات المكروهة نوعان الاول الشروق والاستواء والغروب والثاني مابين الفجر والشمس وما بين صلوة العصر الى الاصفرار: فالنوع الاول لاينعقد فيه شئ من الصلوات التى ذكرناها اذا شرع بها فيه وتبطل ان طرأ عليها الا صلاة جنازة حضرت فيها وسجدة تليت آيتها فيها وعصر يومه والنفل والنذر المقيدبها وقضاء ماشرع به فيها ثم افسده فتنعقد هذه الستة بلا كراهة اصلا في الاولى منها ومع الكراهة التنزيهية في الثانية والتحريمية في الثالثة وكذا في البواقي لكن مع وجوب القطع والقضاء في وقت غير مكروه: والنوع الثاني ينعقد فيه جميع الصلوات التى ذكرناها من غير كراهة الاالنفل والواجب لغيره فانه ينعقد مع الكراهة فيجب القطع والقضاء في وقت غير مكروه اهـ.

وفي الدر المختار (۲۴/۲): وصلاة الليل واقلها على مافي الجوهرة ثمان ولو جعله اثلاثا فالاوسط افضل ولو انصافا فالاخير افضل

وفي الشامية تحته: (قوله ولو جعله اثلاثا الخ) اى لو اراد ان يقوم ثلثة وينام ثلثيه فالثلث الاوسط افضل من طرفيه لان الغفلة فيه اتم والعبادة فيه اثقل ولو اراد ان يقوم نصفه وينام نصفه فقيام نصفه الاخير افضل لقلة المعاصي فيه غالبا الخ.

(۲۳۵) میت کیلئے بطور ایصالِ ثواب نوافل پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱)۔ میرے والد صاحب کا انتقال ہوگیا ہے ان کے جو کپڑے وغیرہ ہیں یہ کپڑے کن کو دینا جائز ہیں مؤذن یا مدرسہ میں اور ان کیلئے نوافل پڑھی جائے تو اس کی کیا نیت ہوگی؟

(۲)۔جس وقت یہ نوافل پڑھی جاتی ہے تو اسی وقت کی نسبت ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......(۱)۔آپ کے والد صاحب کے کپڑے ان کے ترکے میں شامل ہوں گے یہ تمام ورثاء کی ملکیت ہوں گے البتہ اگر سب ورثاء اپنی رضامندی سے کسی ضرورت مند کو صدقہ کردیں تو درست ہے بشرطیکہ ورثاء میں کوئی نابالغ نہ ہو۔

(۲)۔عام نفل کی طرح نیت کر کے میت کو ایصالِ ثواب کریں، اس وقت کی طرف منسوب کرنا ضروری نہیں، اس کے علاوہ کسی مدرسہ میں یا محتاج کو صدقہ وغیرہ کر کے بھی ایصالِ ثواب کیا جاسکتا ہے۔

لمافی الفقه الاسلامی وادلته (۱/۷۷۲۶): الترکة لغة مایترکه الشخص ویبقیه، واصطلاحاً عند الحنفیة الاموال والحقوق المالیة التی کان یملکها المیت فتشمل الاموال المادیة من عقارات ومنقولات ودیون علی الغیر ،والحقوق العینیة التی لیست مالاً، ولکنها تقوم بمال أو تتصل به.

وفی الشامیة (۲/۲۴۳): تنبیه: صرح علماؤنا فی باب الحج عن الغیر بان للانسان ان یجعل ثواب عمله لغیره صلاة أو صوماً أو صدقة أوغیرها کذا فی الهدایة، بل فی زکاة التتارخانیة عن المحیط: الافضل لمن یتصدق نفلاً أن ینوی لجمیع المؤمنین والمؤمنات لانها تصل الیهم ولا ینقص من أجره شئ اهـ هو مذهب اهل السنة والجماعة.

وفی الدرالمختار (۱/۴۱۷): ولا عبرة بنیة متأخرة عنها علی المذهب وجوزه الکرخیؒ الی الرکوع و کفی مطلق نیة الصلاة وان لم یقل لله لنفل وسنة راتبة وتراویح علی المعتمد اذ تعیینها بوقوعها وقت الشروع، والتعیین احوط، ولا بد من التعیین عند النیة

وفی الشامیة تحته:(قوله وکفی الخ) أی بان یقصد الصلوة بلا قید نفل أو سنة أو عدد (قوله لنفل) هذا بالاتفاق.

(۲۳۶) نفل کی نیت سے فرض نماز پڑھنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دفعہ میں نے غلطی سے نفل کی نیت سے فرض نماز پڑھ لی تو اب میں کیا کروں، نماز کو دوبارہ لوٹادوں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......نیت کہتے ہیں دل کے ارادے کو، اور زبان سے تلفظ کرنا اگرچہ مستحسن ہے مگر نماز کے صحیح ہونے کیلئے شرط نہیں، اس لئے دل کے ارادے کا اعتبار ہوگا۔لہٰذا اگر نیت سے مقصود فرض نماز تھی لیکن غلطی سے زبان سے نفل نکل گیا تو اس سے نماز کی صحت میں کوئی فرق نہیں آئے گا بلکہ دل کے قصد کا اعتبار کر کے نماز کو درست کہا جائے گا۔

لمافی الهندیة (۱/۶۵): (الفصل الرابع فی النیة)النیة ارادة الدخول فی الصلواة والشرط ان یعلم

بقلبه ای صلاة يصلي وادناها مالو سئل لامكنه ان يجيب على البديهة وان لم يقدر على ان يجيب الابتامل لم تجز صلاته ولا عبرة للذكر باللسان.

وفي الشامية (۱/۴۱۵): (قوله ان خالف القلب) فلو قصد الظهر وتلفظ بالعصر سهواً اجزأه كما في الزاهدي قهستاني.

(۲۳۷) سنت نماز یا دوگانہ نماز کے تحیۃ المسجد وتحیۃ الوضو کے قائم مقام ہونے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ظہر کی چار سنتیں پڑھ کر مسجد میں جائے تو تحیۃ المسجد پڑھنا کیسا ہے؟ اور ان چار رکعت کے بعد تحیۃ الوضو پڑھنا کیسا ہے؟ اسی طرح تحیۃ الوضو وتحیۃ المسجد دونوں کی نیت کرکے صرف دو رکعت پر اکتفا کرسکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... ظہر کی سنتیں پڑھ کر مسجد پہنچنے کے بعد اگر وقت باقی ہو تو تحیۃ المسجد پڑھنا درست ہے۔ تحیۃ المسجد اور تحیۃ الوضو دونوں کے لئے ایک نماز کافی ہے، بلکہ مسجد میں داخل ہونے کے بعد جو بھی نماز پڑھی جائے گی تحیۃ المسجد ادا ہوجائے گی اسی طرح وضو کرنے کے بعد جو بھی نماز پڑھی جائے گی تحیۃ الوضو ادا ہوجائے گی۔

لمافي الدر المختار (۲/۲۲): (وندب ركعتان بعد الوضوء) يعني قبل الجفاف، كما في الشرنبلالية عن المواهب.

وفي الشامية تحته: (قوله وندب ركعتان بعد الوضو)...... وانظر هل تنوب عنهما صلاة غيرهما كالتحية ام لا؟ ثم رأيت في شرح لباب المناسك ان صلاة ركعتي الاحرام سنة مستقلة كصلاة استخارة وغيرها مما لا تنوب الفريضة منا بها بخلاف تحية المسجد وشكر الوضوء فانه ليس لهما صلاة على حدة كماحققه في الحجة.

(۲۳۸) سنت اور نفل نماز گھر میں پڑھنا لازمی نہیں، بلکہ افضل ہے

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم چار بھائی ہیں سب سے بڑا بھائی سعودیہ میں رہتا ہے اور سال، دو سال بعد گھر آتے ہیں حال ہی میں وہ سعودیہ سے آئے جب نماز کا وقت ہوگیا ہم مسجد چلے گئے جماعت سے فارغ ہوکر وہ گھر واپس آئے اور میں نے سنت اور نفل وہاں مسجد میں پڑھی جب میں گھر آیا تو اس نے مجھے تاکید کی کہ فرض نماز مسجد میں ادا کیا کریں اور باقی تمام سنت اور نوافل گھر پر ادا کیا کرو کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ اور اپنے گھروں میں نماز ادا کرو، لہٰذا میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان اپنے بھائی جان کی زبانی سنا تو میں بھی اسی پر عمل کرتا ہوں جس کا مجھے حکم ملا، اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا سنت اور نفل نماز گھر پر پڑھنا لازمی ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......سنت اورنفل نماز گھر پر پڑھنا لازمی نہیں بلکہ افضل ہے حدیث شریف میں ہے کہ ''آدمی کا سوائے فرض نمازوں کے باقی نمازیں گھر میں پڑھنا میری اس مسجد (مسجد نبوی) میں نماز پڑھنے سے زیادہ افضل ہے'' بشرطیکہ سنت اور نفل پڑھنے کیلئے گھر لوٹ کر جانے سے نمازی کو کسی کام میں مشغول ہوجانے کا خوف نہ ہو، گھر میں نماز پڑھنے سے نمازی کے خشوع وخضوع میں کمی واقع ہونے کا خوف نہ ہو تو گھر میں پڑھنا افضل ہے ورنہ مسجد ہی میں پڑھنا چاہیے۔

لمافی اعلاء السنن(۲۵/۷): والامر للاستحباب لان الاجازة وردت فی التطوع فی المسجد ایضاً کما یدل علیه الحدیث الثانی من الباب وسیأتی تقریره قال المؤلف: النوافل التی فیها الجماعة مستثناة من هذا العموم، وکذلک تحیة المسجد للاحادیث التی وردت فیها.

قوله عن انس الخ' قال المؤلف دلالته علی الجزء الثانی من الباب کماقرره النووی ونصه: وفیه جواز النفل فی المسجد، فانها کانت تصلی النافلة فیه فلم ینکر علیها.(۲۶۶/۱)

وفی الهندیة(۱۱۳/۱): الافضل فی السنن والنوافل المنزل لقوله علیه السلام صلاة الرجل فی المنزل افضل الا المکتوبة الخ.

وذکر الحلوانی الافضل ان یؤدّی کله فی البیت الا التراویح ومنهم من قال یجعل ذلک احیانا فی البیت والصحیح ان کل ذلک سواء فلا تختص الفضیلة بوجه دون وجه ولکن الافضل ما یکون ابعد من الریاء واجمع للاخلاص والخشوع کذا فی النهایة.

وفی الشامیة(۲۲/۲): (قوله والافضل فی النفل الخ) شمل ما بعد الفریضة وما قبلها، لحدیث الصحیحین "علیکم الصلاة فی بیوتکم فان خیر صلاة المرء فی بیته الا المکتوبة" واخرج ابو داؤد "صلاة المرء فی بیته افضل من صلاته فی مسجدی هذا الا المکتوبة" وتمامه فی شرح المنیة وحیث کان هذا افضل یراعی مالم یلزم منه خوف شغل عنها لوذهب لبیته، او کان فی بیته ما یشغل باله ویقلل خشوعه فیصلیها حینئذ فی المسجد لان اعتبار الخشوع ارجح

(قوله غیر التراویح) ای لانها تقام بالجماعة ومحلها المسجد، واستثنی فی شرح المنیة ایضا تحیة المسجد وهو ظاهر.

(۲۳۹) نفل نماز میں قراءۃ سبعہ پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ الحمد للہ میں نے لاہور سے سبعہ قرأت مکمل پڑھ لی جس میں بعض ہمیں قرأت شاذہ بتاتے ہیں بعض مشہورہ اور بعض متواترہ میرا ارادہ ہوا کہ ہرایک قرأت میں نوافل میں ختم کروں لیکن مسائل

سے ناواقف ہوں میں نے کہا کہیں ایسا نہ ہو کہ نیکی کے بجائے گناہ سرلوں، اس لئے آپ سے التماس ہے کہ میری رہنمائی فرمائیں کہ میں اس طرح پڑھ سکتا ہوں میری نماز میں تو کوئی خلل نہ آئے گا اس لئے کہ اگر ان کو نماز میں پڑھنا گناہ ہو، اس سے باز رہوں لیکن ساتھ ذہن میں خدشہ ہوتا ہے جب ان سے نماز فاسد ہوتی پھر ان کو پڑھنا کیسے جائز ہوگا قراء اس کی تعلیم بھی نہ دیں؟ اسی طرح قاری عاصم کوفی کے علاوہ دیگر ائمہ کی قرأت کو پڑھنا نماز میں کیسا ہے؟ جلد جواب عنایت فرمائیں بندہ اپنے معمولات شروع کرنے کیلئے آپ کے جواب کا منتظر ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... قراءۃ سبعہ نماز میں پڑھنا جائز ہے۔ البتہ جماعت کی نماز میں امام نہ پڑھے اور یہ کہ جماعت کی نماز میں عام لوگوں کا قرأت کے بارے میں تشویش میں پڑھنے کا قوی اندیشہ ہے عام لوگ اس بارے میں جاہل ہوتے ہیں۔ ایک قرأت مشہورہ کے علاوہ دوسری قراءتوں کا ان کو پتہ ہی نہیں ہوتا۔ اگر وہ دوسری قرأت سنیں گے۔ تو بعض مرتبہ جہالت کی وجہ سے بعض لوگ اس کے قرأت ہونے کا انکار کردیتے ہیں، یا مذاق اڑانا شروع کردیتے ہیں۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ عوام کو گناہ گار ہونے سے بچانے کیلئے جماعت کی نماز میں قرأت مشہورہ (روایت حفص) میں تلاوت کرے۔ ہاں اگر دوسری قرأت پڑھنا چاہے تو نفل نماز میں پڑھ سکتے ہیں، ان قرأت کے پڑھانے میں کوئی قباحت نہیں۔ بلکہ اس کے پڑھانے پر ان شاء اللہ تعالیٰ اجر وثواب ملے گا اور یہ قرأت سبعہ فصیح اور صحیح ہیں۔

لمافی الهندية(۷۹/۱): وفی الحجة قراءة القرآن بالقرا آت السبعة والروايات كلها جائزة ولكنی أرى الصواب أن لا يقرأ القرأة العجيبة بالإمالات والروايات الغريبة.

وفی الدر المختار (۵۴۱/۱): ويجوز بالروايات السبع، لكن الأولى ان لا يقرأ بالغريبة عند العوام صيانةً لدينهم

وفی الشامية تحته: أی بالروايات الغريبة والإمالات، لأن بعض السفهاء يقولون مالا يعلمون فيقعون فی الإثم والشقاء ولا ينبغی للأئمة أن يحملوا العوام على مافيه نقصان دينهم، ولا يقرأ عندهم مثل قراءة ابی جعفر وابن عامر وعلی بن حمزة والكسائی صيانة لدينهم فلعلهم يستخفون أو يضحكون وإن كان كل القراء ات والروايات صحيحة: فصيحة ومشائخنا اختاروا اقراء ة أبی عمرو حفص عن عاصم.

وفی حاشية الطحطاوی على الدر (۲۳۶/۱): (قوله ويجوز بالروايات السبع) لاوجه للتقييد بالسبع بل يجوز الى العشر كما نص عليه اهل الأصول (قوله صيانةً لدينهم) لأن بعض السفهاء ربما يقع فی الإثم فلا يقرأ عند العوام بقراءة أبی جعفر وابن عامر وحمزة و الكسائی صيانةً لدينهم فربما يستخفون أو يضحكون وإن كانت كلها صحيحة فصيحة ومشائخنا اختار واقراء ة أبی عمرو وحفص عن ابن عامر أبو السعود عن شارح المنية.

(۲۴۰) بغیر عذر کے نوافل نہ پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری دلی خواہش تھی کہ میرا کوئی بیٹا عالم بن جائے تو میں نے ایک بیٹے کو پڑھنے کیلئے کراچی بھیج دیا وہ اس سال فراغت حاصل کر کے مفتی بن رہا ہے جب وہ گھر آتا ہے تو نمازوں کے وقت صرف فرائض وسنن پڑھ کر چلا جاتا ہے نوافل نہیں پڑھتا اور کہتا ہے نوافل لازمی نہیں ہیں پڑھو تو ثواب ہے نہ پڑھو تو کوئی گناہ نہیں ہے۔ کیا واقعی اس کی بات صحیح ہے کہ نوافل لازم نہیں۔ اگر کوئی بغیر عذر کے نوافل چھوڑ دے تو گناہ گار ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... نوافل اور مستحبات کی دین میں بڑی اہمیت ہے جن کی برکت سے اللہ تعالیٰ روزِ قیامت فرائض کی کمی بیشی کو پورا فرمادیں گے اور ان میں سستی بھی نہیں کرنی چاہیے تاہم اگر کوئی نوافل کو بغیر عذر کے بھی ترک کرتا ہے تو وہ قابل عتاب اور مواخذہ نہیں۔ لہٰذا آپ کے بیٹے کی بات درست ہے۔

لمافی ردالمحتار (۱/۱۰۲): اعلم ان المشروعات اربعة اقسام، فرض وواجب وسنة ونفل فما كان فعله اولى من تركه مع منع الترك ان ثبت بدليل قطعي ففرض او بظني فواجب، وبلا منع الترك ان كان مما واظب عليه الرسول ﷺ أو الخلفاء الراشدون من بعده فسنة والا فمندوب ونفل والسنة نوعان: سنة الهدى، وتركها يوجب اساءة وكراهية كالجماعة والاذان والاقامة ونحوها. وسنة الزوائد وتركها لايوجب ذالك كسير النبى عليه الصلوٰة والسلام فى لباسه وقيامه وقعوده، والنفل ومنه المندوب يثاب فاعله ولا يسيئى تاركه، قيل وهو دون سنن الزوائد.

وفى الفقه الاسلامى وادلته(۲/۱۰۵۵): "فصلاة التطوع: هى ما طلب فعلها من المكلف زيادة على الفرائض طلباً غير جازم، وتكمل به صلاة الفرض يوم القيامة، ان لم يكن المصلى اتمها، وفيه حديث صحيح مرفوع رواه احمد فى المسند......

وحكمها: أنه يثاب على فعلها ولايعاقب على تركها".

(۲۴۱) اشراق اور چاشت ایک وقت میں پڑھنا صحیح ہے یا نہیں؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک طالبعلم ہوں درجہ ثانیہ میں پڑھتا ہوں اللہ کے فضل سے تہجد، اشراق اور اوابین کا اہتمام کرتا ہوں لیکن پڑھائی کی وجہ سے چاشت ادا نہیں کر پاتا چونکہ اساتذہ کرام چھٹی نہیں دیتے اس جمعرات اپنے شیخ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے فرمایا آپ چاشت کو اشراق کے ساتھ ادا کرلیا کرو۔ چونکہ وہ عالم نہیں ہیں اس لئے ان کی بات سے دل مطمئن نہیں ہوا، اب آپ حضرات میری رہنمائی کریں کہ اشراق اور چاشت ایک وقت میں پڑھنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اشراق اور چاشت دونوں ایک ہی نماز ہے، البتہ سورج نکلنے کے فوراً بعد جو نماز پڑھی جاتی ہے بعض حضرات نے اس کو اشراق کہا ہے۔ اور جو تھوڑی دیر بعد جبکہ سورج بلند ہو جائے پڑھی جاتی ہے اس کو چاشت کہا ہے۔ لہٰذا اشراق اور چاشت کو ایک وقت میں پڑھنا صحیح ہے۔

لمافی الهندية (۱/۱۱۲): (ومن ا' مندوبات صلوة الضحى) واقلها ركعتان واكثرها ثنتا عشرة ركعة ووقتها من ارتفاع الشمس الى زوالها.

وفي الدر المختار (۲/۲۲): (و) ندب (اربع فصاعدا في الضحى) على الصحيح من بعد الطلوع الى الزوال، ووقتها المختار بعد ربع النهار.

وفي الشامية تحته: (قوله من بعد الطلوع) عبارة شرح المنية من ارتفاع الشمس. (قوله ووقتها المختار) اى الذى يختار ويرجح لفعلها وهذا عزاه في شرح المنية الى الحاوى، وقال: لحديث زيد بن ارقم ان رسول الله ﷺ قال ((صلاة الاوابين حين ترمض الفصال'' رواه مسلم. وترمض بفتح التاء والميم اى تبرك من شدة الحر في اخفافها اه.

(۲۴۲) کیا عورت اپنے گھر میں تحیۃ الوضوء اور تحیۃ المسجد پڑھ سکتی ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مولانا صاحب نے اس جمعرات کو ہمارے محلے کی مسجد میں بیان فرمایا جس کے اندر مرد اور خواتین کی اکثریت نے شرکت کی مولانا صاحب نے فرمایا کہ جب انسان مسجد آئے تو وضو کرنے کے بعد دو رکعت تحیۃ الوضو اور تحیۃ المسجد پڑھ لے۔ اس کے انھوں نے کافی فضائل سنائے تو محلے کی عورتیں فضائل سن کر پڑھنے کو تیار ہو گئیں لیکن ان کو علم نہیں کہ عورتیں بھی تحیۃ الوضوء اور تحیۃ المسجد پڑھ سکتی ہیں یا نہیں؟ یا صرف یہ نمازیں مردوں کیلئے ہیں۔ آپ حضرات صحیح رہنمائی فرمائیں کہ عورتیں تحیۃ الوضوء اور تحیۃ المسجد پڑھ سکتی ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......جس طرح مرد تحیۃ الوضوء اور تحیۃ المسجد پڑھ سکتے ہیں، اسی طرح عورتیں بھی تحیۃ الوضوء اور تحیۃ المسجد پڑھ سکتی ہیں۔ البتہ خوف وفتنہ کی وجہ سے عورت کا مسجد میں جانا ممنوع قرار دیا گیا ہے تو گھر میں جو جگہ نماز کیلئے مخصوص کی ہو جس طرح اس میں اعتکاف کیلئے بیٹھ سکتی ہے اسی طرح اگر اس جگہ میں تحیۃ المسجد بھی پڑھ لیں تو انشاء اللہ اجر ملے گا۔ اور تحیۃ الوضوء کسی جگہ کے ساتھ خاص نہیں ہے اس لئے عورت بھی تحیۃ الوضوء پڑھ سکتی ہے۔

لمافي مسند احمد (۷/۲۱۴): عن ام سلمة (رضى الله تعالىٰ عنها) عن رسول الله ﷺ أنه قال ''خير مساجد النساء قعر بيوتهن''.

وفي الهندية (۱/۱۱۲): (ومن المندوبات صلاة الضحى) الى ان قال (ومنها) تحية المسجد وهي

رکعتان (ومنها) رکعتان عقیب الوضوء.

وفی الدر المختار مع الشامیة(۲/۱۸، ۱۹): (ویسن تحیة) رب (المسجد وهی رکعتان وأداء الفرض) أو غیره وکذا دخوله بنیة فرض أو اقتداء وتکفیه لکل یوم مرة ولا تسقط بالجلوس عندنا بحر.

وفیه ایضاً(۲۲): (قوله وندب رکعتان بعد الوضوء) لحدیث مسلم "مامن أحد یتوضاء فیحسن الوضوء ویصلی رکعتین یقبل بقلبه ووجهه علیهما الا وجبت له الجنة" خزائن.

(۲۴۳) بیٹھ کر نوافل پڑھنا افضل ہے یا کھڑے ہوکر؟

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اکثر پرانے وقت کے لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ ظہر کے بعد مغرب کے بعد اسی طرح عشاء کے بعد کے نوافل بیٹھ کر پڑھتے ہیں جب ان سے پوچھا جائے تو کہتے ہیں نوافل بیٹھ کر پڑھنا افضل ہے اب معلوم یہ کرنا ہے کہ واقعی نوافل بیٹھ کر پڑھنا افضل ہے؟ کھڑے ہوکر نوافل پڑھنے یا بیٹھ کر پڑھنے میں ثواب برابر ملے گا؟ حالت صحت اور بیماری میں حکم یکساں ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....نفل نماز میں شرعاً قاعدہ یہ ہے کہ عام حالات میں کھڑے ہوکر پڑھنے میں پورا ثواب ملتا ہے اور بغیر کسی عذر کے بیٹھ کر پڑھنے میں ثواب کم ہوگا۔ اس کے برخلاف بیماری کی حالت میں آدمی کو اپنی عبادت کا پورا ثواب ملتا ہے۔ خواہ کھڑے ہوکر نماز ادا کرے یا بیٹھ کر یا جس طرح ممکن ہو، اور اگر مریض تحمل مشقت کرتے ہوئے کھڑے ہوکر نماز پڑھتا ہے تو ایسی صورت میں اس مریض کو مشقت برداشت کرنے پر جو کامل اجر وثواب ملے گا، اسی طرح کا مریض اگر رخصت پر عمل کرتے ہوئے بیٹھ کر نماز پڑھ لیتا ہے تو اس کو کھڑے ہونے والے مریض کی بہ نسبت آدھا ثواب ملے گا جو کہ عام تندرست آدمی کی کامل نماز کے پورے ثواب کے برابر ہوگا۔ اور عذر کی وجہ سے اس کے ثواب میں کمی نہ ہوگی۔

لمافی فتح الباری (۲/۴۶۷): قال: قال الخطابی کنت تأولت هذاالحدیث علی ان المراد به صلاة التطوع یعنی للقادر لکن قوله من صلی نائما یفسده لان المضطجع لایصلی التطوع کما یفعل القاعد، لانی لا احفظ عن احد من اهل العلم انه رخص فی ذلک...... وقد رأیت الآن ان المراد بحدیث عمران المریض المفترض الذی یمکنه ان یتحامل فیقوم مع مشقة فجعل اجر القاعد علی النصف من اجر القائم ترغیباً له فی القیام مع جواز قعوده...... فمن صلی فرضا قاعدا وکان یشق علیه القیام اجزأه وکان هو ومن صلی قائما سواء کما دل علیه حدیث انسؓ وعائشةؓ فلو تحامل هذا المعذور وتکلف القیام ولو شق علیه کان أفضل لمزید اجر تکلف القیام فلا یمتنع ان یکون اجرهٗ

علی ذلک نظیر اجره علی الصلاۃ فیصح ان اجر القاعد علی النصف من اجر القائم ومن صلی النفل قاعدا مع القدرۃ علی القیام اجزأہ وکان اجرہٗ علی النصف من اجر القائم بغیر اشکال الخ.

وفی اعلاء السنن(۶/ ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷): اجعلوا اخر صلوتکم من اللیل وترا الخ..... وقد ورد مایخالفہ ایضاً ففی صحیح مسلم فی حدیث طویل ثم یصلی النبی ﷺ بعد الوتر رکعتین بعد ما یسلم وھو قاعد. واخرج الدار قطنی فی سننہ عن ام سلمۃ رضی اللہ عنھا ان النبی ﷺ کان یصلی رکعتین خفیفتین بعد الوتر وھو جالس..... واخرج الدارمی والطحاوی والدار قطنی واللفظ لھما عن ثوبان مولی رسول اللہ ﷺ قال کنامع رسول اللہ ﷺ فی سفر فقال "ان السفر جھد وثقل فاذا اوتر احد کم فلیرکع رکعتین فان استیقظ والا کانتالہ، وفی التعلیق المغنی اسنادہ جید وفی آثار السنن اسنادہ حسن ..... وأخرج الطحاوی عن ابی امامۃ رضی اللہ عنہ"ان النبی ﷺ کان یصلیھما بعد الوتر وھو جالس یقرأ فیھما، اذا زلزلت وقل یآایھا الکٰفرون، واسنادہ حسن:

والتطبیق بینھما وبین حدیث الباب بوجوہ منھا ماذکرہ الحافظ فی الفتح بما نصہ، وقد ذھب الیہ (ای الی مشروعیۃ التنفل بعد الوتر)بعض اھل العلموجعلوا الامر فی قولہ اجعلوا اخرصلاتکم من اللیل وتراً. مختصاً بمن اوتر آخر اللیل. وقال العبد الضعیف: معناہ اوتروا فی اللیل مرۃ لامرتین لتکون اخر صلوتکم باللیل وترا فان من اوتر مرتین فقد جعل آخر صلاتہ باللیل شفعاً..... وحمل بعضھم حدیث الرکعتین بعد الوتر علی الجواز، وامر الایتار اخر اللیل علی الاستحباب.....

قال النووی فی شرح مسلم ھذا الحدیث (ای حدیث الرکعتین بعد الوتر) اخذ بظاھرہ الاوزاعی واحمد فیما حکاہ القاضی عنھما. فأباحا رکعتین بعد الوتر جالساً..... قلت والصواب ان ھاتین الرکعتین فعلھما علیہ السلام بعد الوتر جالسا لبیان جواز الصلاۃ بعد الوتر، وبیان جواز النفل جالسا، ولم یواظب علی ذلک بل فعلہ مرۃ او مرتین او مرات قلیلۃ. وانما تأولنا حدیث الرکعتین جالسا لان الروایات المشھورۃ فی الصحیحین وغیرھما عن عائشۃ مع روایۃ خلائق من الصحابۃ فی الصحیحین مصرحۃ بان اخر صلاتہ ﷺ فی اللیل کان وتراً. وفی الصحیحین احادیث کثیرۃ مشھورۃ بالامر بجعل اخر صلاۃ اللیل وترا فکیف یظن بہ علیہ السلام مع ھذہ الاحادیث واشباھھا انہ یداوم علی الرکعتین بعد الوتر ویجعلھما اخر صلاۃ اللیل؟

وانما معناہ ماقدمناہ من بیان الجواز وھذا الجواب ھو الصواب.

(۲۴۴) بیٹھ کر نماز پڑھنے میں آدھے ثواب کا حکم فرائض یا نوافل سب میں ہے یا صرف نوافل میں؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کہا جاتا ہے کہ بیٹھ کر نماز پڑھنے سے ثواب آدھا ملتا ہے اگر معذوری نہ ہو تو؟ مثلاً ایک شخص بخار کی حالت میں ہے یا بدن، ہاتھ میں اچھا خاصا درد ہو، یا تھکاوٹ بہت لگ رہی ہو، اس صورت میں بھی نماز کھڑے ہو کر پڑھنی چاہئے، کیا صرف فرض نماز میں ثواب آدھا ہو جاتا ہے یا سنت اور نفل میں بھی آدھا ہو جاتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... فرض نماز میں رکوع اور سجدہ کی طرح قیام بھی فرض ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص بغیر عذر کے فرض نماز بیٹھ کر پڑھے گا تو اس کی نماز ہی نہ ہوگی اور اگر کوئی شخص معذور ہو، مثلاً قیام پر قدرت نہ رکھتا ہو، یا قیام کرنے سے بیماری بڑھنے کا خدشہ ہو تو اس صورت میں اگر وہ بیٹھ کر نماز پڑھے گا تو اس کو نماز کا پورا ثواب ملے گا، البتہ نوافل میں قیام فرض نہیں ہے اس لئے اگر کوئی شخص بغیر عذر کے بیٹھ کر نفل پڑھے گا تو اس کو نماز کا آدھا ثواب ملے گا اور اگر کسی عذر کی وجہ سے بیٹھ کر پڑھے گا تو پورا ثواب ملے گا۔

لمافی الصحیح لمسلم (۱/۲۵۳): وعن عبدالله بن عمرو رضی الله عنه قال: حدثت أن رسول الله ﷺ قال صلوة الرجل قاعداً نصف الصلاة، قال فأتيته فوجدته يصلی جالسا فوضعت يدی علی رأسه فقال: مالک يا عبدالله بن عمرو قلت حدثت يا رسول الله أنک قلت "صلوة الرجل قاعدا علی نصف الصلاة" وأنت تصلی قاعدا قال اجل ولكنی لست كأحد منكم

وفی جامع الترمذی (۱/۸۵): (باب ماجاء ان صلاة القاعد علی النصف من صلاة القائم) عن عمران بن حصين قال سألت رسول الله ﷺ عن صلاة الرجل وهو قاعد فقال من صلی قائما فهو افضل ومن صلاها قاعدا فله نصف أجر القائم ....وقال سفيان الثوری فی هذا الحديث من صلی جالسا فله نصف أجر القائم قال هذا للصحيح ولمن ليس له عذر فأما من كان له عذر من مرض أوغيره فصلی جالسافله مثل أجر القائم.

و فی الشامية (۱/۴۴۵): (قوله القادر عليه) فلو عجز عنه حقيقة وهو ظاهر او حكما كما لو حصل له به ألم شديد أوخاف زيادة المرض وكالمسائل الآتية فی قوله وقد يتحتم القعود الخ فإنه يسقط.

(۲۴۵) سنت فجر گھر میں پڑھ کر آنے والے کیلئے تحیۃ المسجد کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص فجر کی سنتیں گھر میں پڑھے اور پھر مسجد میں آئے تو کیا وہ دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... تمام سنتوں کی طرح سنت فجر بھی گھر میں پڑھنا افضل ہے اور طلوع فجر کے بعد نوافل پڑھنا مکروہ ہے۔ لہٰذا جو

شخص گھر میں سنت فجر پڑھ کر مسجد آئے تو اس کے لئے تحیۃ المسجد پڑھنا درست نہیں بلکہ اسے چاہئے کہ تیسرا کلمہ اور درود شریف پڑھے یہ پڑھنے سے اسے تحیۃ المسجد پڑھنے کا ثواب مل جائے گا اور اگر مسجد میں آتے ہی فرض نماز میں مشغول ہوگیا تو پھر فرض نماز تحیۃ المسجد کے قائم مقام ہوجائے گی اگر چہ اس نے تحیۃ المسجد کی نیت نہ کی ہو۔

لمافی قاضی خان(۱/۳۶): **وركعتي الطواف وتحية المسجد أولم يكن لها سبب بعد طلوع الفجر قبل صلوة الفجر** لايجوز إلا سنة الفجر **وبعد الفريضة قبل طلوع الشمس.**

وفی الهندية(۱/۵۲): **منها مابعد طلوع الفجر قبل صلاة الفجر كذا فی النهاية والكفاية يكره فيه التطوع بأكثر من سنة الفجر.**

وفی الشامية(۲/۱۸): **وركعتان أو اربع وهي أفضل لتحية المسجد الا اذا دخل فيه بعد الفجر أو العصر** فإنه يسبح ويهلل ويصلي على النبی ﷺ **فإنه حينئذ يؤدی حق المسجد كما اذا دخل للمكتوبة فانه غير مامور بها حينئذ كمافي التمرتاشي.**

(۲۴۶) تہجد کی کم سے کم مقدار کیا ہے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تہجد کی کم تعداد کتنی ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کم سے کم تہجد کتنی رکعات پڑھیں، دو یا چار رکعات تہجد ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلياً...... تہجد کی اقل مقدار کی احادیث میں کوئی تصریح موجود نہیں ہے البتہ فقہاء کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اقل مقدار دو رکعت ہے۔

لمافی الشامية(۲/۲۵): **وهذا بناء علی ان اقل تهجده ﷺ كان ركعتين وان منتهاه كان ثماني ركعات الی ان قال اقول فينبغي القول بان اقل التهجد ركعتان واوسطه اربع واكثره ثمان.**

(۲۴۷) صلاۃ التسبیح پڑھنے کا طریقہ

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ ان سے اصلاحی تعلق قائم کرلوں انہوں نے میری درخواست قبول کرلی اور مجھے کچھ معمولات بتائے جن میں سے ایک صلوٰۃ التسبیح بھی ہے، انہوں نے فرمایا کہ ہفتہ میں کم از کم ایک مرتبہ صلوٰۃ التسبیح ضرور پڑھا کرو اب مجھے معلوم نہیں ہے کہ یہ کیسے پڑھی جاتی ہے۔ اب آپ حضرات اس کے پڑھنے کا طریقہ بتادیں نیز یہ بھی بتائیں کہ صلوٰۃ التسبیح پڑھنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلياً...... صلاۃ التسبیح بڑی اہم نماز ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو یہ نماز بڑی تاکید کے بعد

بطور تحفہ سکھائی تھی۔ امام حاکم نے لکھا ہے کہ اس حدیث کے صحیح ہونے پر یہ دلیل ہے کہ تبع تابعین کے زمانہ سے ہمارے زمانہ تک مقتداء حضرات اس پر مداومت کرتے اور لوگوں کو تعلیم دیتے رہے ہیں جن میں عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ تعالیٰ عنہ بھی ہیں۔ یہ چار رکعات والی نماز ہے جس میں تین سو مرتبہ تسبیحات پڑھی جاتی ہیں۔

صلاۃ التسبیح پڑھنے کے دو طریقے ہیں:

اوّل...... یہ کہ کھڑے ہو کر الحمد شریف اور سورت کے بعد پندرہ مرتبہ تیسرا کلمہ سبحان اللہ والحمدللہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر پڑھے، پھر رکوع میں سبحان ربی العظیم کے بعد دس مرتبہ پڑھے پھر رکوع سے کھڑا ہو کر سمع اللہ لمن حمدہ ربنا لک الحمد کے بعد دس مرتبہ پڑھے پھر دونوں سجدوں میں سبحان ربی الاعلیٰ کے بعد دس دس مرتبہ پڑھے پھر دونوں سجدوں کے درمیان دس مرتبہ پڑھے اور جب دوسرے سجدے سے اللہ اکبر کہہ کر اُٹھے تو کھڑے ہونے کے بجائے بیٹھ جائے اور دس مرتبہ پڑھے۔ پھر بغیر اللہ اکبر کہے کھڑا ہو جائے۔ اسی طرح تیسری رکعت کے بعد جب چوتھی رکعت کیلئے اٹھنا ہو وہاں بھی پہلے اللہ اکبر پھر تسبیحات اور پھر بغیر اللہ اکبر کہے کھڑا ہو جائے لیکن پہلے قعدہ میں اللہ اکبر کے بعد تسبیحات پھر التحیات اور پھر اللہ اکبر کہہ کر تیسری رکعت کیلئے کھڑا ہو جائے۔ اسی طرح پہلے اور دوسرے قعدہ میں پہلے ان تسبیحات کو دس دس مرتبہ پڑھے پھر التحیات پڑھے۔

دوم...... یہ ہے کہ سبحانک اللھم کے بعد الحمد شریف سے پہلے پندرہ مرتبہ تیسرا کلمہ پڑھے اور الحمد شریف اور سورت کے بعد دس مرتبہ پڑھے باقی وہی طریقہ ہے جو پہلے میں تھا۔ البتہ اس صورت میں نہ دوسرے سجدہ کے بعد بیٹھنے کی ضرورت ہے اور نہ التحیات کے ساتھ پڑھنے کی۔ علماء نے کہا ہے اور لکھا ہے کہ بہتر یہ ہے کہ کبھی اس طرح پڑھ لیا کریں اور کبھی اس طرح پڑھ لیا کریں۔

یہ نماز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباس اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو سکھائی تھی لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود پڑھی ہے یا نہیں یہ بات تتبع کے باوجود نہیں مل سکی۔

لمافی المشکوۃ (ص۱۱۷): صلوۃ التسبیح - عن ابن عباس ان النبی ﷺ قال للعباس بن عبدالمطلب یا عباس یا عماہ الا اعطیک الا امنحک الا اخبرک الا افعل بک عشر خصال اذا انت فعلت ذالک غفر اللہ لک ذنبک اولہ واخرہ قدیمہ وحدیثہ خطأہ وعمدہ صغیرہ وکبیرہ سرہ وعلانیتہ ان تصلی اربع رکعات تقرء فی کل رکعة فاتحة الکتاب وسورة فاذا فرغت من القراءة فی اول رکعة وانت قائم قلت سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر خمس عشرة مرة ثم ترکع فتقولھا وانت راکع عشرا ثم ترفع راسک من الرکوع فتقولھا عشرا ثم تھوی ساجدا فتقولھا وانت ساجد عشراً ثم ترفع راسک من السجود فتقولھا عشرا ثم تسجد فتقولھا عشرا ثم ترفع راسک فتقولھا عشرا فذالک خمس وسبعون فی کل رکعة تفعل ذالک فی اربع رکعات ان استطعت ان تصلیھا فی کل یوم مرة فافعل فان لم تفعل ففی کل جمعة مرة فان لم تفعل ففی کل سنة

مرة فان لم تفعل ففی عمرک مرة رواه ابو داؤد وابن ماجه والبیهقی فی الدعوات الکبیر وروی الترمذی عن ابی رافع نحوه.

وفی المستدرک علی الصحیحین(۱/۴۶۵): ......ثنا/ ابو وهب محمد بن مزاحم قال: سألت عبدالله بن المبارک عن الصلوة التی یسبح فیها، فقال تکبر ثم تقول: سبحانک اللهم وبحمدک وتبارک اسمک وتعالی جدک ولا اله غیرک ثم تقول خمس عشرة مرة سبحان الله والحمد لله ولا اله الا الله والله اکبر، ثم تتعوذ وتقرأ بسم الله الرحمٰن الرحیم وفاتحة الکتاب وسورة، ثم تقول عشر مرات سبحان الله والحمدلله ولا اله الا الله والله اکبر ثم ترکع فتقولها عشرا ثم ترفع راسک فتقولها عشرا ثم تسجد فتقولها عشرا ثم ترفع راسک فتقولها عشرا ثم تسجد الثانیة فتقولها عشرا، ثم ترفع راسک فتقولها عشرا تصلی اربع رکعات علی هذا، فذالک خمس وسبعون تسبیحة فی کل رکعة، وذالک تمام الثلاث مائة فان صلاها لیلا فأحب الی ان یسلم فی الرکعتین فان صلی نهارا فان شاء سلم وان شاء لم یسلم. رواة هذا الحدیث عن ابن المبارک کلهم ثقات اثبات ولا یتهم عبدالله ان یعلمه مالم یصح عنده سنده

وفی مرقاة المفاتیح(۳/۳۷۷): وینبغی للمتعبد ان یعمل بحدیث ابن عباس تارة ویعمل بحدیث ابن مبارک أخری.

(۲۴۸) صلوٰۃ التسبیح میں چھوٹ جانے والی تسبیح کو دوسرے رکن میں پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مولانا صاحب نے مجھے فرمایا کہ آپ ہفتہ میں ایک مرتبہ صلوٰۃ التسبیح پڑھا کرو میں نے معمول بنالیا کہ جمعہ والے دن اذان کے فوراً بعد پڑھا کروں گا اس جمعہ کو میں نے پڑھنا شروع کی تو پہلی رکعت میں رکوع سے اٹھنے کے بعد کی تسبیحات بھول گیا پھر میں نے سجدے میں دوگنی پڑھ دیں گویا کہ تین سو تعداد مکمل ہوگئی آیا میری نماز صحیح ہوگئی یا دوبارہ لوٹانا ضروری ہوگا صلوٰۃ التسبیح میں تسبیحات پڑھنا واجب ہیں یا مسنون یا مستحب ان کی کیا حیثیت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صلوٰۃ التسبیح پڑھنا مستحب ہے اور احادیث میں اس کی بڑی فضیلت آئی ہے اس کے پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی ہر رکعت میں ۷۵ مرتبہ تسبیح پڑھی جاتی ہے جن کی تعداد چار رکعات میں ۳۰۰ بنتی ہے اور اس میں اصل مطلوب ۳۰۰ کا عدد پورا کرنا ہے اور ان تسبیحات کا پڑھنا مسنون عمل ہے اگر کسی سے ایک رکن میں تسبیح ادا کرنا رہ گئی تو وہ دوسرے رکن میں دگنی ادا کر کے تعداد پوری کر سکتا ہے پس صورت مسئولہ میں جب آپ نے رکوع سے اٹھنے کی تسبیحات کو سجدے میں ادا کرلیا تو تسبیحات کی تعداد مکمل ہوگئی اس لیے آپ کی نماز درست ہے دوبارہ لوٹانے کی ضرورت نہیں۔

لمافی الهندية(۱/۱۱۲): (ومن المندوبات)...... واما صلوة التسبيح فذكرها فى الملتقط يكبرو يقرأ الثناء ثم يقول سبحانه الله والحمدلله ولا اله الا الله والله اكبر خمس عشر مرة ثم يتعوذ ويقرأ فاتحة الكتاب وسورة ثم يقرأ هذه الكلمات عشرا وفى الركوع عشرا وفى القيام عشرا وفى كل سجدة عشرا وبين السجدتين عشرا ويتمها اربع ركعات.

وفى الشامية(۲/۲۷): والطعن فى ندبها بان فيها تغييرا لنظم الصلوة انما يتاتى على ضعف حديثها فاذا ارتقى الى درجة الحسن اثبتها...... قال الملا على فى شرح المشكاة مفهومه انه سها ونقص عددا من محل معين ياتى به فى محل آخر تكملة للعدد المطلوب قلت و استفيد انه ليس له الرجوع الى المحل الذى سها فيه وهو ظاهر وينبغى كما قال بعض الشافعية ان ياتى بما ترك فيما يليه ان كان غير قصير فتسبيح الاعتدال ياتى به فى السجود اما تسبيح الركوع فياتى به فى السجود ايضا لافى الاعتدال لانه قصير قلت وكذا تسبيح السجدة الاولىٰ ياتى به فى الثانية لافى الجلسة لان تطويلها غير مشروع عندنا على مامر فى الواجبات.

(۲۴۹) مغرب کی دوسنتوں کے بعد نوافل کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ (۱)...... اکثر لوگ عموماً مغرب کی دوسنت کے بعد دو رکعت نفل پڑھتے ہیں، آیا مغرب کی دوسنت کے بعد دورکعت نفل پڑھنا مسنون ہے حدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟

(۲)...... صلوٰۃ الاوابین کی کل کتنی رکعت ہیں فرض کے بعد والی دورکعت سنت کو بھی صلوٰۃ الاوابین میں شمار کر سکتے ہیں یا نہیں مثلاً دورکعت سنت کے ساتھ چار رکعت اور ملالیں تو چھ رکعت صلوٰۃ الاوابین بن گئی یا دورکعت سنت کے علاوہ چھ رکعت پڑھنا ضروری ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً...... (۱)۔نمازِ مغرب کی دوسنتوں کے بعد نوافل کا پڑھنا یقیناً باعث اجروثواب ہے، جیسا کہ متعدد روایات میں اس کی تصریح موجود ہے لیکن سنتوں کی ادائیگی کے بعد دورکعت نفل پڑھنے کو مسنون قرار دینے کی صراحت بندہ کو نہ مل سکی البتہ مستحب کہہ سکتے ہیں۔

(۲)۔متعدد روایات میں صلاۃ الاوابین کی رکعات کی تعداد چھ (۶) ملتی ہے اگر چہ اس سے کم وبیش کی بھی صراحت ملتی ہے۔ چنانچہ افضل صورت یہی ہے کہ دورکعت سنت مؤکدہ کی ادائیگی کے بعد چھ (۶) رکعت صلاۃ الاوابین کی مستقل ادائیگی کی جائے البتہ مشاغل کی کثرت کی وجہ سے چار رکعت پر اکتفا کر کے دورکعت سنت مؤکدہ کو بھی ساتھ شمار کیا جاسکتا ہے۔

لما فى كنز العمال(۷/۳۸۶): ۱۹۴۲۱. من صلى بعد المغرب ركعتين قبل أن يتكلم كتبتا فى عليين.

وفيه ايضاً(۷/۳۹۲): ۱۹۴۵۱. من صلى أربع ركعات بعد المغرب كان كمن عقب غزوة بعد غزوة فى سبيل الله عزوجل (أبو الشيخ عن ابن عمر).

وفی الشامية(۲/۱۴): (قوله وهل تحسب المؤكدة) أى فى الأربع بعد الظهر وبعد العشاء والست بعد المغرب بحر (قوله إختارالكمال) نعم ذكر الكمال فى فتح القدير أنه وقع إختلاف بين أهل عصره فى أن الأربع المستحبة هل هى أربع مستقلة غير ركعتى الراتبة أو أربع بهما؟ وعلى الثانى هل تؤدى معهما بتسليمة واحدة أو لا، فقال جماعة لا، واختار هو أنه إذا صلى أربعا بتسليمة أو تسليمتين وقع عن السنة والمندوب، وحقق ذلک بمالا مزيد عليه وأقره فى شرح المنية والبحر والنهر.

(۲۵۰) دورکعت نمازنفل میں متعدد نیت کرنے سے متعدد نفل ادا کرنے کا ثواب ملے گا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک ساتھی نے بتایا نفل دورکعت میں جتنے دوسرے نوافل کی نیت کروسب ادا ہوجاتے ہیں۔ مثلاً دورکعت نفل نماز میں اگر کوئی شخص حاجت کی نماز، توبہ کی نماز، شکرانے کی نماز، اشراق چاشت کی نماز کی نیت کرتا ہے تو دورکعت نفل پڑھنے سے سب نمازیں ادا ہوجائیں گی۔ کیا ان کا کہنا صحیح ہے یا نہیں؟ اگر صحیح نہیں ہے تو دو رکعت نفل مطلقاً ادا ہوجائیگی یا ان میں سے جس کی نیت پہلے کی ہوگی وہ ادا ہوگی یا کوئی بھی ادا نہ ہوگی۔ کیا اس طرح نیت کرنا صحیح ہے زیادہ ادا نہ ہوں ایک دو ادا ہوجائے مثلاً دورکعت میں توبہ شکرانے کی نماز کی نیت کرلے یا توبہ حاجت کی نماز کی نیت کرلے۔ جلدی جواب دیں اللہ آپ کو ثواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... آپ کے ساتھی کی بات صحیح ہے کہ دورکعت نفل میں جتنی نوافل کی نیت کروسب ادا ہوجاتی ہیں۔ البتہ وہ نوافل جو کسی وقت کے ساتھ موقت ہیں۔ یا ذوات الاسباب ہیں۔ تو ان کے ادا ہونے کیلئے وقت اور سبب کا پایا جانا ضروری ہے۔ مثلاً دورکعت نفل میں اشراق کی نیت کی جائے تو اشراق تب ادا ہوگی جب اشراق کا وقت موجود ہو۔ یا دورکعت نفل میں تحیۃ المسجد کی نیت کی جائے تو تحیۃ المسجد تب ادا ہوگی جب دخول مسجد ہو۔

لمافى الصحيح للبخارىؒ(۱/۲): .... علقمة ابن وقاص الليثى يقول سمعت عمر بن الخطاب رضى الله تعالىٰ عنه على المنبر يقول سمعت رسول الله ﷺ يقول انما الاعمال بالنيات وانما لامرئ مانوى.

وفى حاشية الطحطاوى على مراقى الفلاح(صـ۲۱۶): ثم انه ان جمع بين عبادات الوسائل فى النية صح كمالو اغتسل لجنابة وعيد وجمعة اجتمعت ونال ثواب الكل وكمالو توضا لنوم وبعد غيبة وأكل لحم جزور وكذا يصح لونوى نافلتين او اكثر كمالو نوى تحية مسجد وسنة وضوء وضحى وكسوف.

وفى الفقه الاسلامى وادلته(۱/۷۷۹): وان كانت الصلاة نافلة: فيجب تعيينها ان كانت معينة او

موقتة بوقت کصلوة الکسوف والاستسقاء والتراویح والوتر والسنن الرواتب.

(۲۵۱) موٹر سائیکل پر نفل پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے مطالعہ کا بہت شوق ہے چند روز قبل دوران مطالعہ میں نے ایک صحابیؓ کے حالات میں پڑھا ہے کہ انہوں نے دوران سفر سواری پر بیٹھے بیٹھے نفل ادا کئے تو کیا آج بھی سواری پر بیٹھ کر اشارہ سے نوافل پڑھنا جائز ہے؟ میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے روزانہ دو ڈھائی گھنٹے سفر کرنا پڑتا ہے اگر میں بھی دوران سفر سواری پر نفل نماز اشارے سے پڑھتا رہوں تو میرے لئے جائز ہوگا؟ نیز اگر میں موٹر سائیکل خود چلاؤں تو پھر نفل پڑھ سکتا ہوں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں نفل نماز حالتِ سفر میں سواری پر پڑھنا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے لہٰذا ہمارے فقہاءِ کرام نے شہر سے باہر نفل نماز اشارہ سے پڑھنے کے جواز کے قول کو اختیار کیا ہے. البتہ اگر سواری خود چلا رہا ہے تو شرط یہ ہے کہ عمل کثیر نہ پایا جائے اگر سواری چلاتے وقت عمل کثیر پایا گیا تو نماز درست نہ ہوگی۔ اور چونکہ موٹر سائیکل چلاتے وقت عام طور سے عمل کثیر پایا جاتا ہے اس لیے موٹر سائیکل چلاتے ہوئے نماز پڑھنا درست نہیں۔

لمافی الشامیة (۳۸/۲): (قوله خارج المصر) هذاهوالمشهور، وعندهمایجوزفی المصر، لکن بکراهة عندمحمدلانه یمنع من الخشوع وتمامه فی الحلیة.

(قوله محل القصر) : بالنصب بدل من خارج المصروفائدته شمول خارج القریة وخارج الاخبیة ح ای المحل الذی یجوز للمسافر قصر الصلاة فیه وهو الصحیح بحر ....

(قوله ولوسیرها):ذکره فی النهربحثااخذامن قولهم اذاحرک رجله أوضرب دابته فلابأس به اذالم یکن کثیرا.

(۲۵۲) وتروں کے بعد دو رکعت کا مخصوص سورتوں کے ساتھ ثبوت

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ وتروں کے بعد دو رکعت مخصوص سورتوں کے ساتھ ثابت ہے یا نہیں؟ اگر ثابت ہو تو ان کی ترتیب اور فضیلت بھی بیان فرمادیں۔ بڑی مہربانی ہوگی۔

الجواب حامداً ومصلیاً......وتروں کے بعد دو رکعت مخصوص سورتیں، سورۃ الزلزال اور سورۃ الکافرون کے ساتھ پڑھنا حدیث سے ثابت ہے۔ البتہ ان کو لازم نہ سمجھا جائے۔ کبھی کبھار ترک بھی کر دینا چاہئے۔ تا کہ واجب کا اعتقاد نہ رہے۔ اور ابن خزیمہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ تم رات کے قیام کو لازم پکڑو۔ کیونکہ بے شک یہ تم سے پہلے نیک لوگوں کا طریقہ رہا ہے اور قربت کا ذریعہ ہے اور گناہوں کا کفارہ ہے اور گناہوں سے روکنے کا ذریعہ ہے اور طبرانی میں ہے کہ جو نماز، نمازِ عشاء کے بعد سونے سے پہلے پڑھی جائے وہ صلوۃ اللیل

میں شمار ہوتی ہے۔

لمافی مشکوۃ المصابیح (صـ۱۱۳): عن ام سلمة ان النبی ﷺ کان یصلی بعد الوتر رکعتین.

وفیه ایضاً: عن ثوبان عن النبی ﷺ قال ان هذا السهر جهد وثقل فاذا اوتر احدکم فلیرکع رکعتین فان قام من اللیل والا کانتا له.

وفیه ایضاً: عن ابی امامة (رضی الله عنه) ان النبی ﷺ کان یصلّیهما بعد الوتر وهو جالس یقرأ فیهما اذا زلزلت وقل یایها الکفرون.

وفی الشامیة(۲/۲۴): قال فی البحر، فمنها مافی صحیح مسلم مرفوعاً افضل الصلاة بعد الفریضة صلاة اللیل، وروی الطبرانی مرفوعاً ((لابد من صلاة بلیل ولو حلب شاة وما کان بعد صلاة العشاء فهو من اللیل)) وهذا یفید ان هذه السنة تحصل بالتنفل بعد صلاة العشاء قبل النوم.

وفیه ایضاً(۲/۳۸۱): وکذا قالوا بسنیة قرائة السور الثلاثة فی الوتر مع الترک احیاناً لئلا یعتقد وجوبها.

(۲۵۳) فوت شدہ نماز کے بارے میں یاد نہیں کہ کونسی تھی تو اس کی قضا کرنے کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ چار سال قبل میں ساتھیوں کے ساتھ کسی تفریحی مقام پر پکنک منانے گیا تھا اور میں نے قصداً اور سستی کی وجہ سے نماز نہیں پڑھی، لیکن اب میں اس پر بہت نادم ہوں اور مجھے وہ نماز بھی یاد نہیں ہے کہ ظہر کی نماز چھوڑی تھی یا عصر کی۔ تو اب میں کیا کروں کوئی شرعی حل بتائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... اگر کسی سے کوئی نماز فوت ہو جائے لیکن اس کو یہ یاد نہ ہو کہ کونسی نماز فوت ہوئی ہے تو یہ آدمی پورے دن کی نمازوں کی قضا کرے۔ صورت مسئولہ میں آپ کو چونکہ صرف ظہر اور عصر میں تردد ہے اس لئے صرف ان دونوں کی قضاء کرلیں۔

لمافی فتاویٰ سراجیة(صـ۱۶): رجل فاتته صلاة من یوم ولیلة ولا یدری ایة صلاة هی اعاد صلاة یوم ولیلة احتیاطاً.

وفی الهندیة(۱/۱۲۴): رجل نسی صلاة ولا یدریها ولم یقع تحرّیه علی شئ یعید صلاة یوم ولیلة عندنا کذا فی الظهیریة.

(۲۵۴) چھوڑی ہوئی نمازوں اور روزوں کی قضاء کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری عمر پچاس سال ہے اللہ پاک نے کافی مال سے

نوازا ہے اور اولاد بھی دی ہے لیکن آج تک میں احکام خداوندی سے دور تھا نماز اکثر چھوڑ دیتا تھا روزے بھی کبھی رکھ لیے اور کبھی چھوڑ دیے اب سے کچھ عرصہ پہلے ایک جماعت والے آئے وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے میں نے ایک چلہ جماعت کے ساتھ لگایا تو اب ندامت ہوتی ہے میں نے ساری عمر ضائع کی ہے۔ تو اسی وقت اللہ پاک سے توبہ کرلی اور آئندہ نماز نہ چھوڑنے کا عزم کیا ہے۔ کیا جتنے روزے اور نمازیں چھوڑ دیں معاف ہوجائیں گی یا ان کیلئے مزید کوئی اور حکم ہے؟ مہربانی فرما کر میری رہنمائی کریں میں انتہائی پریشان ہوں۔

الجواب حامداًومصلیاً...... جتنے روزے اور نمازیں آپ نے چھوڑی ہیں ان سب کی قضاء آپ پر لازم ہے۔ اور قضاء کے ساتھ ساتھ اللہ رب العزت سے استغفار بھی کریں۔ اس لیے کہ بغیر عذر نماز، روزہ، وغیرہ کو چھوڑنا بہت سخت گناہ ہے۔

لمافی مصنف ابن ابی شیبہ(۲/۳۴۷): عن سعید بن المسیب قال جاء رجل النبی ﷺ فقال انی افطرت یوماً فی رمضان فقال له النبی ﷺ تصدق واستغفر الله وصم یوماً مکانه.

وفی الدر المختار(۲/۶۵): والقضاء فعل الواجب بعد وقته. (وفیه ،۲/۶۲) اذا لتاخیر بلا عذر کبیرة لاتزول باالقضاء بل باالتوبة او الحج

وفی الشامیة تحته: قوله (لاتزول باالقضاء) وانما یزول اثم الترک فلا یعاقب علیها اذا قضاها واثم التاخیر باق بحر.

(۳۵۵) وقتی اور فوت شدہ نمازوں میں ترتیب کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کی فجر، ظہر، عصر، مغرب کی نمازیں قضا ہوجائیں تو ترتیب کے ساتھ یہ نمازیں پڑھنا ضروری ہے یا بغیر ترتیب بھی پڑھنا جائز ہے۔ اسی طرح اگر کسی سے فجر کی نماز رہ گئی تو ظہر کی جماعت کا وقت ہوجانے پر کیا پہلے فجر کی نماز پڑھنا ضروری ہے یا ظہر کی نماز پڑھ کر پھر فجر پڑھ لیں، امام ومقتدی کے اعتبار سے اس مسئلے میں کچھ فرق ہے یا دونوں کا ایک ہی حکم ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً...... (۱)۔ کسی کی فجر، ظہر، عصر اور مغرب کی نمازیں قضاء ہوجائیں، اگر وہ شخص صاحب ترتیب ہے (صاحب ترتیب اس شخص کو کہتے ہیں جس کے ذمے چھ نمازیں باقی نہ ہوں، چاہے پرانی ہوں یا نئی مسلسل ہوں یا متفرق، اگر کسی کے ذمے چھ نمازوں کی قضاء باقی ہو تو وہ صاحب ترتیب نہیں) تو ترتیب کے ساتھ ان نمازوں کو ادا کرنا اس کیلئے ضروری ہے۔ اگر صاحب ترتیب نہیں تو ترتیب کا لحاظ رکھنا بہتر ہے اور بغیر ترتیب کے پڑھنا بھی جائز ہے۔ اسی طرح کسی کی فجر کی نماز رہ گئی ابھی تک ادا نہیں کرسکا تھا کہ ظہر کی جماعت کا وقت ہوگیا اگر وہ امام ہے اور صاحب ترتیب بھی ہے تو اس صورت میں اگر مقتدی حضرات امام کے قضاء نماز ادا کرنے تک انتظار کو گوارا کرتے ہوں تو امام پہلے قضاء نماز پڑھے بعد میں جماعت کرائے، اگر مقتدی حضرات انتظار کو گوارا نہیں کرتے تو کسی اور شخص سے

جماعت کروائے اور خود پہلے قضاء نماز پڑھے بعد میں وقتی نماز، اگر وہ شخص امام نہیں بلکہ عام آدمی ہے تو صاحب ترتیب ہونے کی صورت میں اس کیلئے بھی پہلے قضاء نماز ادا کرنا ضروری ہوگا بعد میں وقتی نماز پڑھے گا۔ صاحب ترتیب نہ ہونے کی صورت میں پہلے وقتی نماز پڑھ سکتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ صاحب ترتیب آدمی کیلئے وقتی نمازوں اور فوت شدہ نمازوں میں ترتیب قائم رکھنا ضروری ہے، غیر صاحب ترتیب کے لئے ضروری نہیں۔

لمافی الدر المختار(۲/۶۸، ۶۹): (اوفاتت ست اعتقادیة) لدخولها فی حد التکرار المتقضی للحرج (بخروج وقت السادسة) علی الاصح ولو متفرقة او قدیمة علی المعتمد.

وفی الشامیة تحته: ولا یسقط الترتیب الا بفوت ست صلوات............... (قوله ولو متفرقة) ای یسقط الترتیب بصیرورة الفوائت ستا ولو کانت متفرقة.

(۳۵۶) امدادی کاروائیوں کی وجہ سے نماز قضاء کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں میں زلزلہ آ گیا تھا اور اکثر آبادی اپنے گھروں میں دب گئی تھی (تقریباً ۳۰۰/افراد) لیکن ہم ۸ دوست زلزلے میں دبنے سے رہ گئے تو کیا ہم امدادی کارروائیوں کی وجہ سے نماز قضاء کر سکتے ہیں کیونکہ ہم نے لوگوں کو ملبے سے نکالنے کیلئے اپنی کافی ساری نمازیں قضا کر دی تھیں اور کافی لوگوں کو ملبے سے زندہ نکالنے میں کامیاب ہوگئے تھے؟ جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ تمام نمازیں بروقت باجماعت ادا کرے۔ تاہم اگر کسی عذر شرعی کی بناء پر نماز میں تاخیر ہوجائے اور وقت میں ادا نہ ہو سکے تو اس کی قضاء کرنے میں تاخیر نہ کرنی چاہئے۔ لہٰذا آپ سے اگر امدادی کارروائیوں میں شریک ہوکر دوسرے مسلمانوں کی جان بچاتے ہوئے نمازیں قضاء ہوگئی ہیں تو امید ہے کہ عنداللہ مؤاخذہ نہ ہوگا۔ البتہ آپ کیلئے ضروری ہے کہ آپ ان نمازوں کی جلد از جلد قضاء کریں۔

لمافی صحیح البخاری(۱/۷۶): سألت النبی ﷺ ای العمل احب الی اللہ قال الصلوٰۃ علی وقتها قال ثم ای قال ثم بر الوالدین قال ثم ای قال الجهاد فی سبیل اللہ قال حدثنی بهن ولو استزدته لزادنی.

وفی الدر المختار مع الشامیة(۲/۲۲): ومن العذر العدو وخوف القابلة موت الولد لأنه علیه الصلاة و السلام اخرها یوم الخندق.

قال الشامی رحمه اللہ تعالیٰ تحته: قوله ومن العذر ای لجواز تأخیر الوقتیة عن وقتها ......قوله العدو کما اذا خاف المسافر من اللصوص او قطاع الطریق جاز له أن یؤخر الوقتیة لأنه بعذر.

وفی مراقی الفلاح(صـ۳۷۱): من تأخیر الصلوٰۃ وترکها (یجب قطع الصلوٰۃ) ولو فرضاً باستغاثة شخص

ملهوف لمهم أصابه كما لو تعلق به ظالم أو وقع فی ماء أو صال علیه حیوان فاستغاث بالمصلی.

(۳۵۷) دورانِ نماز دورہ پڑ جائے تو اس نماز کی قضاء کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا چھوٹا بھائی اسلم جس کی عمر تقریباً ۲۰ سال ہے گزشتہ رات عشاء کی نماز پڑھ رہے تھے کہ اچانک دورہ پڑ گیا اور گر گیا تقریباً ۲۴ گھنٹے بعد بحمد اللہ ہوش میں آ گیا۔اب جو نمازیں اس کی رہ گئی ہیں ان کی قضاء واجب ہے یا نہیں؟ اگر نہیں، تو کیا وہ نماز جس کو شروع کیا تھا دورہ پڑ گیا تو اس کی قضاء بھی واجب نہیں یا اس کی قضاء واجب ہے؟ اس لئے کہ اس کو شروع کیا تھا، اور جب نماز کو شروع کرنے کے بعد توڑ دیا جائے تو احناف کے نزدیک اس کی قضاء واجب ہے لہٰذا مفتی صاحب آپ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب دے کر مشکور فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......اگر کوئی شخص دورانِ نماز بے ہوش ہو جائے اور پانچ نمازوں تک بے ہوش رہے تو قضاء واجب ہوگی۔البتہ اگر پانچ نمازوں سے زائد وقت گزر جائے تو قضاء واجب نہ ہوگی۔صورت مسئولہ میں آپ کے بھائی اسلم اگر پانچ نمازوں کے مکمل وقت بے ہوش رہے تو ان پر قضاء واجب نہ ہوگی۔اور اگر پانچ نمازوں کے مکمل وقت میں یا اس سے کم بے ہوش رہے تو شروع کی ہوئی نماز سمیت تمام نمازوں کی قضاء واجب ہوگی۔

لمافی الهندیة(۱/۱۳۷): ومن أغمی علیه خمس صلوات قضی ولو أكثر لا یقضی والجنون كالإغماء وهو الصحیح ثم الكثرة تعتبر من حیث الاوقات عند محمد رحمه الله تعالیٰ وهو الاصح.

وفی الدر المختار(۲/۱۰۲): (ومن جن أو اغمی علیه) ولو بفزع من سبع أو آدمی (یوما ولیلة قضی الخمس وإن زاد وقت صلوٰة) سادسة (لا) للحرج.

وفی الشامیة تحته: (ومن جن أو أغمی علیه) الجنون افة تسلب العقل والاغماء أفة تستره الی ان قال: واعتبر الزیادة بالأوقات علی قول الثالث وهو الأصح.

وفی الفقه الاسلامی وادلته(۱/۶۲۸،۶۲۷): فلو جن البالغ أو أغمی علیه أو حاضت المرء ة أو نفست فی أول الوقت أو أثناء ه بحیث یمكنه أداء الصلاة وجب علیه عند الجمهور غیر الحنفیة قضاء تلک الصلوٰة ان مضی قدر الفرض مع الطهر، ولا تجب الصلاة الثانیة التی تجمع معها لأن وقت الاولی لا یصلح للثانیة الا اذا صلاهما جمعاً بخلاف العكس الی ان قال: وقال الحنفیة لا تجب صلاة ذلک الوقت علی أصحاب الأعذار هؤلاء. لأن سبب ایجاب الصلوة: هو الجزء الذی یتصل به الأداء من الوقت فان لم یؤد تعین الجزء الاخیر الذی یسع الواجب للسببیة، وبعد خروج الوقت تضاف السببیة الی جملة الوقت.

فصل فی التراویح

(تراویح سے متعلق مسائل کا بیان)

(۲۵۸) تعدادرکعاتِ تراویح کی بحث

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں تراویح صرف آٹھ رکعت ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول بھی آٹھ ہی کا تھا بیس تراویح کا ثبوت کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں آٹھ تراویح کے بارے میں کافی روایات ہیں کیا واقعی ان لوگوں کی بات صحیح ہے یا بیس رکعت کا ثبوت احادیث میں ہے اگر ہے تو ان روایات کو ذکر کریں بشرطیکہ وہ روایات صحیح ہوں، اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیس رکعت تراویح کا ثبوت ہو تو اس کو ضرور بیان فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... حدیث مرفوع صحیح سے صرف دو امر ثابت ہیں اول یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو تراویح کی ترغیب فرمایا کرتے تھے۔ دوم یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بذاتِ خود تین دن تراویح کی جماعت کا اہتمام فرمایا حتی کہ لوگوں کو اور گھر والوں کو بھی جمع فرمایا لیکن پھر فرضیت کے خوف کی بنا پر جماعت ترک فرمادی، اس سے تراویح کی سنیت اور جماعت کا ثبوت بوجہ احسن ہوتا ہے البتہ تعداد رکعات مذکور نہیں، تعداد رکعات کیلئے حدیث حسن لغیرہ اور آثار صحابہ بکثرت موجود ہیں بیس رکعاتِ تراویح سے متعلق ایک حدیث سند ضعیف کے ساتھ حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے اور چونکہ تراویح کا تعلق فرائض سے تو ہے نہیں تطوعات سے ہے اور تطوعات میں ضعیف روایات بھی قابل قبول ہوتی ہیں جبکہ کوئی اور روایت اس کے معارض نہ ہو خصوصاً جبکہ جمہور صحابہ کرام اور تابعین کا بیس رکعات پر اتفاق واجماع ہے۔

اور آٹھ رکعات والی روایات تراویح سے متعلق نہیں ان کا تعلق تہجد سے ہے جیسا کہ فتح الباری میں صراحت مذکور ہے اس لئے ان سے تراویح کی تعداد رکعات پر استدلال کرنا لغو ہے اور اگر بالفرض مان بھی لیا جائے تب بھی ان میں آٹھ رکعات سے زائد کی نفی مذکور نہیں بلکہ یہ احتمال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ رکعات گھر ہی میں ادا فرمالی ہوں اور آٹھ رکعات باہر تشریف لاکر جماعت سے ادا فرمائی ہوں ''اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال''۔

لمافی السنن الکبریٰ للبیہقی(۲/۴۹۶): **عن ابن عباسؓ قال کان النبی ﷺ یصلی فی شهر رمضان فی غیر جماعة بعشرین رکعة والوتر تفرد به ابو شیبة ابراهیم بن عثمان العبسی الکوفی وهو ضعیف.**

وفی فتح الملهم (۵/۱۱۵): روی ابن خزیمة وابن حبان عن جابرؓ **"صلی بنا رسول الله ﷺ فی**

رمضان ثمان رکعات، ثم اوتر، فلما كانت القابلة اجتمعنا فی المسجد ورجونا أن يخرج إلينا حتى اصبحنا ثم دخلنا فقلنا يا رسول الله...... فهذا كما تراه ليس فيه الابيان فعله الجزئی فی ليلة واحدة فقط دون سائر الليالی بل ليس فيه التصريح بنفی الزائد علی الثمان فی تلک الليلة أيضاً فإنه يمكن ان يكون هو ﷺ قد صلی قبل الخروج اليهم منفرداً عنهم ماشاء الله من الركعات ثم صلی بهم ثمان ركعات والوتر.

وفی ايضاً(۵/۱۱۷): واحاديث الزيادة علی فعله فی بعض الاوقات نادراً وحينئذ فلا منافاة بين حديث عائشة وبين ماروی ابن ابی شيبة والطبرانی والبيهقی من حديث ابن عباسؓ باسناد ضعيف "أنه عليه الصلاة والسلام كان يصلی فی رمضان عشرين ركعة سوی الوتر" أی فی بعض الليالی، لا فی اكثرها والمسئلة ليست من الفرائض والواجبات بل هی من الفضائل والتطوعات والحديث الضعيف مقبول فيها اذا لم يعارضه حديث صحيح وقدبينا أنه لا معارضة بين حديث العشرين وحديث عائشة اذا حمل حديثها علی الاوقات الغالبة والأحوال الاكثرية ولاسيما اذا اتفق جمهور الصحابة والتابعين علی العشرين فی اخر الامر قال البيهقی "ثم استقر الأمر علی العشرين فإنه المتوارث."

وفی فتح الباری(۳/۱۶): وظهر لی أن الحكمة فی عدم الزيادة علی احدی عشرة أن التهجد والوتر مختص بصلاة الليل وفرائض النهار الظهر وهی أربع والعصر وهی أربع والمغرب وهی ثلاث وتر النهار فناسب ان تكون صلوة الليل كصلاة النهار فی العدد جملة وتفصيلاً وأما مناسبة ثلاث عشرة فبضم صلاة الصبح لكونها نهارية إلی ما بعدها.

(۲۵۹) بغیر روزہ رکھے تراویح کی نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں سانس کا مریض ہوں روزے رکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ایک روز تراویح کیلئے چلا گیا تو ایک صاحب نے کہا کہ تراویح اس شخص پر لازم ہے جو روزے رکھ رہا ہو، چونکہ آپ روزے نہیں رکھ رہے اس لئے آپ کو تراویح نہیں پڑھنی چاہیے۔ کیا اس شخص کی بات صحیح ہے؟ اور کیا روزے نہ رکھنے والا تراویح ادا کرسکتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... تراویح سنت مؤکدہ ہے، اس کا چھوڑنا اور بغیر عذر کے چھوڑنے پر اصرار کرنا جائز نہیں اور تراویح رمضان کے روزوں کے ساتھ مقید نہیں ہے۔ بلکہ رمضان کے روزے اور رمضان میں رات کا قیام یعنی تراویح دونوں الگ الگ عبادتیں ہیں۔ لہٰذا جو شخص روزہ رکھنے سے معذور ہے اور تراویح پڑھنے پر قادر ہے، تو اس کو تراویح پڑھنی چاہیے۔ اگرچہ روزہ نہ رکھتا ہو۔

لمافی الهندية(۱/۱۱۶): وهی سنة رسول الله ﷺ وقيل هی سنة عمر رضی الله عنه، والاول اصح كذا فی جواهر الاخلاطی، وهی سنة للرجال والنساء جميعاً، كذا فی الزاهدی ونفس التراويح سنة علی الاعيان عندنا كما روی الحسن عن ابی حنيفةؒ وقيل تستحب والاول أصح.

وفی الدر المختار(۲/۴۳): (التراويح سنة) مؤكدة لمواظبة الخلفاء الراشدين (للرجال والنساء) اجماعاً.

وفی الشامية(۲/۱۲): ولهذا كانت السنة المؤكدة قريبة من الواجب فی لحوق الأثم كمافی البحر، ويستوجب تاركها التضليل واللوم كمافی التحرير ای علی سبيل الاصرار بلا عذر.

(۲۶۰) تراویح میں امام کو کھانسی وغیرہ کے ذریعے غلطی پر متنبہ کرنا

سوال...... کیافرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید تراویح پڑھاتا ہے اور عمرو سامع ہے، زید عمرو سے کہتا ہے کہ مجھ سے کوئی غلطی تلاوت میں ہوجائے تو آپ صرف کھانسی یا کھنکارنے کے ذریعے مجھے مطلع کیجئے اگر پھر بھی صحیح نہ کرسکا تو پھر بھلے آپ بتا بھی سکتے ہیں، اس کے ساتھ یہ بات یادرہے کہ یہ ساری کہانی جوحضرت قاری صاحب نے بنارکھی ہے، اس لئے کہ مقتدیوں کو پتہ نہ چلے کہ کیسا حافظ ہے۔آپ علماء سے یہ معلوم کرنا ہے کہ اس صورت میں نماز کا کیا حکم ہوگا آیا نماز میں کچھ فساد تو نہیں آئے گا۔

الجواب حامداًومصلیاً...... نماز میں کسی عذر (مثلاً گلے میں خراش وغیرہ) کی وجہ سے کھانسنا یاغرض صحیح (مثلاً تحسین صوت یامقتدی کا امام کو غلطی پر متنبہ کرنے پر) کھانسنا یہ مفسدِ صلوۃ نہیں۔اوراگر بلاعذراور بلاوجہ کھانسا جائے تواس سے نماز ٹوٹ جائے گی۔لہٰذا صورت مسئولہ میں سامع کا قاری کی تلاوت میں غلطی آنے پراس وجہ سے کھنکارنا کہ دوسرے لوگ غلطی پر مطلع نہ ہوں اور قاری صاحب کو پتہ چل جائے اس سے نماز تو فاسد نہ ہوگی البتہ اس طرح کرنا ایک نامناسب حرکت ہے اس سے گریز کرنا چاہئے۔

لما فی الشامية (۱/۶۱۹): (قوله علی الصحيح) لانه يفعله لاصلاح القراءة فيكون من القراءة معنی كالمشی للبناء فانه وإن لم يكن من الصلاة لكنه لاصلاحها فصار منها معناً شرح المنية عن الكفاية، لكنه لايشمل مالو كان لاعلام انه فی الصلاة اوليهتدی امامه الی الصواب. والقياس الفساد فی الكل الافی المدفوع اليه كما هو قول ابی حنفية ومحمد لانه كلام، والكلام مفسد علی كل حال كما مر وكأنهم عدلوا بذلک عن القياس وصححوا عدم الفساد به اذا كان لغرض صحيح لوجود نص.

وفی الفقه الاسلامی (۲/۱۰۲۳): وتبطل بالتنحنح بحرفين بلاعذر، فان وجد عذر، كان نشأ من طبعه فلا تفسد، كمالا تفسد ان كان لغرض صحيح كتحسين الصوت، اوليهتدی امامه الی

الصواب، اوللاعلام انه فی الصلاۃ، فلا فساد علی الصحیح، وھکذا فإن التنحنح عن عذر لا یفسد الصلاۃ.

(۲۶۱) نمازِ تراویح کی بیس رکعات کا دو اماموں کا پڑھانا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری مسجد میں رمضان المبارک کے مہینے میں تراویح کیلئے دو امام ہوتے ہیں ایک امام صاحب سولہ رکعت پڑھاتے ہیں اور دوسرے چار رکعت پڑھاتے ہیں دونوں مل کر قرآن پاک مکمل سناتے ہیں معلوم یہ کرنا ہے کہ نماز تراویح دو امام پڑھا سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... تراویح کی نماز دو امام پڑھا سکتے ہیں۔

لمافی خلاصة الفتاویٰ (۱/۶۴): اذا صلی الترویحة الواحدة امامان کل امام رکعتین اختلف المشایخ فیه والاصح انه لایستحب لکن کل ترویحة یؤدیها امام واحد.

وفی الهندیة (۱/۱۱۶): واذا جازت التراویح بامامین علی هذا الوجه جاز ان یصلی الفریضة احدهما ویصلی التراویح الاخر وقد کان عمرؓ یؤمهم فی الفریضه والوتر وکان ابی یؤمهم فی التراویح کذا فی السراج الوهاج.

(۲۶۲) تراویح میں ایک امام کا بارہ رکعات، دوسرے کا آٹھ رکعات پڑھانا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری مسجد میں دو سال سے یہ معمول ہو گیا ہے کہ رمضان المبارک میں تراویح دو امام پڑھاتے ہیں۔ ایک بارہ رکعات اور دوسرا آٹھ رکعات، تو کیا ایک مصلے پر دو امام ایک قرآن سنا سکتے ہیں؟ یا ایک ہی کو سنانا چاہئے؟ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کے دور میں اس کی کوئی مثال ملتی ہے؟ اور افضل صورت کیا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... ایک امام کا بارہ رکعات اور دوسرے کا آٹھ رکعات پڑھانا درست ہے۔ جبکہ ایک امام پورا ایک ترویحہ پڑھائے۔ رہی یہ بات کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور میں اس کی کوئی مثال تو اس کے متعلق صاحب الجوہرۃ النیرۃ علامہ ابو بکر بن محمد رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ عشاء کی نماز اور وتر پڑھاتے اور حضرت اُبَی بن کعب رضی اللہ عنہ نماز تراویح پڑھاتے تھے۔ لہٰذا دو اماموں کا نماز پڑھانا اور انصراف جائز ہے۔

لمافی الجوهرة النیرة طبع مکتبه رحمانیه (۱/۲۴۶): والأفضل أن یصلّی التراویح بامام واحد لأنّ عمر رضی الله عنه جمع الناس علی قارئ واحد، وهو أبی بن کعب رضی الله عنه، فان صلوها بإمامین فالمستحب ان یکون انصراف کل واحد علی کمال الترویحة فإن انصرف علی تسلیمة، لا

يستحب ذلك وكان عمر رضي الله عنه يؤمهم في الفريضة والوتر، وكان أبي بن كعب رضي الله عنه يؤمهم في التراويح.

وفي فتاوىٰ قاضي خان(۱/۱۱۲): ولو أقاموا التراويح بإمامين فصلّى كل امام تسليمة بعضهم جوّزوا ذلك والصحيح أنّه لا يستحب وانما يستحب ان يصلى كل امام ترويحة ليكوّن موافقا عمل أهل الحرمين.

وفي الهندية(۱/۱۱٦): والأفضل أن يصلّى التراويح بإمام واحد فان صلّوها بإمامين فالمستحب ان يكون انصراف كل واحد على كمال الترويحة فإن انصرف على تسليمة لا يستحب ذلك في الصحيح.

(۲٦۳) فلیٹ میں نماز پنجگانہ اور تراویح پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم لوگ ماریہ لگژری اپارٹمنٹ میں ابھی حال ہی میں رہائش پذیر ہوئے ہیں یہاں سارے فلیٹ ہیں کیونکہ یہاں نہ کوئی مسجد بنائی گئی ہے اور نہ ہی کوئی مسجد کی جگہ دی ہے لہٰذا ہم لوگ آپ سے یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ماریہ فلیٹ کے کمپاؤنڈ میں نماز تراویح اور پانچوں وقت کی نماز ادا کر سکتے ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صحت نماز کیلئے مسجد کا ہونا ضروری نہیں بلکہ زمین کے ہر ہر جزء اور موضع میں نماز جائز ہے اگر چہ مسجد میں نماز پڑھنے کا ثواب زیادہ ہے لہٰذا صورتِ مسئولہ میں فلیٹ کے کمپاؤنڈ میں نماز پنجگانہ اور تراویح جائز ہے۔ البتہ اس جگہ کی حیثیت شرعاً مسجد کی نہ ہوگی کیونکہ مسجد کیلئے ضروری ہے کہ مالک اس جگہ میں ہمیشہ کیلئے لوگوں کو نماز کی اجازت دیتے ہوئے اس کو اپنی ملکیت سے خارج کردے چنانچہ پھر یہ جگہ اس کی میراث میں بھی تقسیم نہ ہوگی جبکہ صورت مسئولہ میں ایسا نہیں ہے۔

لما في البخاري(۱/٦۲): باب قول النبيﷺ جعلت لي الارض مسجدا وطهورا. عن جابر بن عبدالله رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ اعطيت خمسا لم يعطهن احد من الأنبياء قبلي، نصرت بالرعب مسيرة شهر وجعلت لي الارض مسجدا و طهورا الخ.

وفي البحر الرائق(۵/۲۱٦): ولا قال المصنف ؒ ومن جعل ارضه مسجدا بدل قوله ومن بنى لكان اولى لأنه لو كان له ساحة لابناء فيها فأمر قومه ان يصلوفيها بجماعة قالوا ان امرهم بالصلوة فيها ابدا او أمرهم بالصلوة فيها بالجماعة ولم يذكر ابدا الا أنه ارادبها الأبد ثم مات لايكون ميراثا عنه وان امرهم بالصلاة شهرا او سنة ثم مات تكون ميراثا عنه لأنه لابدمن التابيد والتوقيت ينافي التابيد كذا في الخانية.

(۲۶۴) نمازِ تراویح میں ہر چار رکعت کے بعد قہوہ پینا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری مسجد کے امام صاحب نمازِ تراویح میں چار رکعت کے بعد قہوہ پیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اس سے میرا گلہ صاف ہوجاتا ہے؟ تو کیا تراویح کی نماز کے دوران اس عذر پر قہوہ پینا درست ہے؟ نماز تراویح مکروہ تو نہیں ہوتی؟

الجواب حامداًومصلیاً...... اگر کوئی میٹھی چیز پی کر نماز کے اندر داخل ہوجائے جبکہ اس کے منہ میں مٹھاس باقی ہو، اور وہ اس کو نگلتا ہے تو اس سے نماز کی صحت پر کچھ فرق نہیں آئے گا۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں تراویح کی نماز کے دوران جبکہ عذر بھی ہے قہوہ پینا جائز ہے۔

لمافی الهندية(۱/۱۰۲):اذا كان بين اسنانه شئ من الطعام فابتلعه ان كان قليلاً دون الحمصة لم تفسد صلوته الا أنه يكره، وان كان مقدار الحمصة فسدت......

......ولو أكل شيأً من الحلاوة وابتلع عينها فدخل فى الصلوة فوجد حلاوتها فى فيه فابتلعها لا تفسد صلوته ولو ادخل الفانيد او السكر فى فيه ولم يمضغه لكن يصلى والحلاوة تصل الى جوفه تفسد صلاته.

وفى الشامية(۱/۶۲۳): قوله كسكر الخ، أفاد ان المفسد اما المضغ الكثير أو وصول عين المأكول الى الجوف بخلاف الطعم. قال فى البحر عن الخلاصة: ولو أكل شيأً من الحلاوة وابتلع عينها فدخل فى الصلاة فوجد حلاوتها فى فيه وابتلعها لاتفسد صلاته، ولو ادخل الفانيد او السكر فى فيه ولم يمضغه لكن يصلى والحلاوة تصل الى جوفه تفسد صلاته.

(۲۶۵) نمازِ تراویح کے بعد اجتماعی دعا مانگنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فرض نماز اور تراویح اور اسی طرح جب وتر نماز جماعت کے ساتھ رمضان المبارک میں ادا کی جاتی ہے۔ اس کے بعد دعا انفرادی طور پر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن اس دعا کو ایک ہیئت اور جمعیت کے ساتھ لازم سمجھنا کہ امام کے ساتھ دعا کے بغیر کوئی بھی نہ اُٹھے تو یہ کام کیسا ہے؟ شریعت کے موافق ہے یا نہیں؟ اگر شریعت کے موافق ہے یا نہیں تو دونوں کی ادلہ اربعہ شرعیہ سے وضاحت فرمائیں۔

الجواب حامداًومصلیاً...... حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرض نمازوں کے بعد اجتماعی دعا مانگنا ثابت ہے البتہ فرض نمازوں کے بعد اجتماعی دعا پر ایسا التزام ودوام کرنا کہ جو شخص اس اجتماعی دعا میں شامل نہ ہو رہا ہو اس پر طعن وتشنیع کی جائے درست نہیں نیز تراویح کے بعد اجتماعی طور پر دعا ثابت تو نہیں البتہ تلاوتِ قرآن کے بعد دعا کے قبول ہونے کے بارے میں بکثرت احادیث وارد ہوئی ہیں اس لئے کبھی کبھار ترک کے ساتھ سنت سمجھے بغیر اگر تراویح کے بعد دعا کرلی جائے تو حرج نہیں اور اکابرین سے یہ متوارث بھی ہے تاہم رمضان کے وتر کی

جماعت کے بعد بھی اسی اجتماعی ہیئت سے دعا مانگنا صحیح نہیں۔

لمافی اعلاء السنن(۳/۱۹۳): واعلم انه قد وقع العرف فی دیارنا ان الامام والقوم یدعون مستقبل القبلة رافعی ایدیهم عقیب السلام معافی الظهر والمغرب والعشاء ولا ینحرف الامام فی هذه الاوقات عن القبلة وبعد العصر والفجر ینحرف یمینا وشمالا ویقرأ شیئاً من الورد جالسا. وکذا القوم معه ثم یدعون فانکر بعض الناس علی ذلک بوجهین اما اولا فلعدم انحراف الامام یمینا وشمالا فی الظهر والمغرب والعشاء ودعائه مستدبرا للمأمومین. وقد ثبت انه ﷺ کان ینحرف دائما، واما ثانیا فلان الدعاء بعد السلام من الصلاة لم یثبت عنه ﷺ بل عامة الادعیة المتعلقة بالصلاة انما فعلها فیها، وامر بها فیها. والجواب عن الاول بانه قد ثبت عنه ﷺ انه دعا فی بعض الاحیان مستقبل القبلة مستدبرا القوم ...... وعن الثانی بان الدعاء بعد السلام ثبت عنه ﷺ، قولا وفعلا، وانکار ذلک مکابرة الخ......

وفیه ایضاً(صـ۱۹۴):قوله عن ابی امامة الخ، قلت فیه اثبات الدعا بعد الصلاة فاندحض به ماا وردہ ابن القیم ان الدعاء بعد السلام من الصلاة مستقبل القبلة او المأمومین. فلم یکن من هدیه ﷺ اصلا ولا روی عنه باسناد صحیح ولا حسن...... قلت قد ثبت ذلک عنه ﷺ قولا وفعلا فهذا حدیث ابی امامة فیه ارشاد الامة بالدعاء بعد الصلوات المکتوبات واما تاویله بان المراد من دبر الصلوات ما قبل السلام کما زعمه ابن القیم فباطل...... فان فیه یسبحون دبر کل صلاة وهو بعد السلام جزماً......

وفی سنن الدارمی(۲/۵۶۱): عن مجاهد قال بعث الی قال انمادعوناک انا اردنا ان نختم القرآن وانه بلغنا ان الدعاء یستجاب عند ختم القران قال فدعوا بدعوات.

(۲۶۶) تراویح کی جماعت ثانی کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے چچازاد بھائی امریکہ میں رہتے ہیں انہوں نے ایک مسئلہ معلوم کروایا ہے کہ امریکہ میں بعض جگہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی مسجد میں محراب میں تھوڑے وقفے سے دو الگ تراویح کی جماعت ہوتی ہیں، دراصل لوگوں کی ڈیوٹی ٹائمنگ کچھ ایسی ہے کہ یوں کرنا پڑتا ہے؟ اس میں کوئی شرعی قباحت تو نہیں ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... فرض نماز میں جماعت ثانی جماعت اولیٰ کی تبدیل ہیئت کے باوجود مکروہ ہے لیکن تراویح میں فرائض کی بہ نسبت توسع ہے اس لئے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول پر عمل کرتے ہوئے تراویح کی جماعت ثانی پہلی جماعت کی ہیئت کی تبدیلی کے ساتھ

درست ہے اور ہمارے اسلاف رحمہ اللہ سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے جیسا کہ امداد الاحکام (۶۳۴/۱) میں یہ مسئلہ مذکور ہے۔ چونکہ آپ کے مسئلہ میں جماعت ثانی پہلی جماعت کی ہیئت پر ہے اس وجہ سے یہ دوسری جماعت مکروہ ہے نیز اگر پہلا امام اور پہلے مقتدی دوسری مرتبہ تراویح کی جماعت کرواتے ہیں تو یہ جماعت ثانی مکروہ ہے خواہ مسجد میں پڑھیں یا مسجد سے باہر پڑھیں۔

لمافی الشامیة(۵۵۳/۱): عن ابی یوسف رحمه الله انه اذا لم تکن الجماعة علی الهیئة الاولی لا تکره والا تکره وهو الصحیح وبالعدول عن المحراب تختلف الهیئة کذا فی البزازیة.

وفی کبیری(ص۳۸۹): ولو امّ فی التراویح مرّتین فی مسجد واحد کره.

وفی حاشیة الطحطاوی علی مراقی الفلاح(ص۳۳۵) : وکره ان یوم فی التراویح مرّتین فی لیلة واحدة وعلیه الفتوی لان السنة لاتتکرر فی الوقت الواحد فتقع الثانیة نفلا مضمرات.

وفی قاضی خان(۱۱۲/۱):ولو صلی التراویح مرّتین فی مسجد واحد یکره کما لو اذّن واقام مرّتین فی مسجد واحد واختار الفقیه ابو اللیث قول ابی بکر هذا اذا امّ للناس مرّتین.

وفی الهندیة(۱۱۶/۱): ولو صلی التراویح مرّتین فی مسجد واحد یکره.

(۲۶۷) عذر کی وجہ سے تراویح کی جماعت چھوڑنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ایک بچپن کے دوست ہیں ہم دونوں کلاس فیلو بھی رہے ہیں ان بیچاروں کو ڈکار کا مرض ہے، اور ڈکاریں بھی گیس کی آتی ہیں۔ نماز تراویح میں انہیں بڑی پریشانی اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آیا اس صورت میں وہ نماز تراویح چھوڑ سکتے ہیں؟ یا تنہا گھر پر پڑھ لیا کریں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر گیس کی ڈکاریں ایسی ہوں کہ جس سے لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہو مثلاً ان میں بدبو ہو یا ڈکاریں ایسی آواز ہوں کہ جن کی وجہ سے پریشانی اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہو، تو ایسی صورت میں تراویح کی نماز گھر پے ادا کر سکتا ہے۔ البتہ بغیر عذر کے تراویح کی نماز کو بالکل چھوڑ دینا جائز نہیں کیونکہ تراویح سنت مؤکدہ ہے اور بغیر عذر کے سنت مؤکدہ کے چھوڑنے پر اصرار کرنے میں گناہ ہے۔

لمافی الشامیة(۱۲/۲): (قوله سن مؤکدا)...... زیادة علی بقیة النوافل ولهذا کانت السنة المؤکدة قریبة من الواجب فی لحوق الاثم کمافی البحر، ویستوجب تارکها التضلیل واللوم...... ای علی سبیل الاصرار بلا عذر.

وفی الشامیة(۶۶۱/۱): کل ماله رائحة کریهة مأکولا او غیره...... وکذلک الحق بعضهم بذلک من بفیه بخراوبه جرح له رائحة وکذلک القصاب والسماک والمجذوم والابرص اولی بالإلحاق

وقال سحنون لاأری الجمعة عليهما.

وفی الهندية(۱/۸۳): وتسقط الجماعة بالاعذار حتی لا تجب علی المريض والمقعد والزمن ومقطوع اليد والرجل من خلاف ومقطوع الرجل والمفلوج الذی لا يستطيع المشی والشيخ الكبير العاجز والاعمی عند ابی حنيفة رحمه الله تعالیٰ والصحيح انها تسقط بالمطر والطين والبرد الشديد والظلمة الشديدة كذا فی التبيين وتسقط بالريح فی الليلة المظلمة...... أو كان اذا خرج يخاف أن يحسبه غريمه فی الدين أو يريد سفرا واقيمت صلاة فيخشی ان تفوته القافلة أو كان قيما لمريض أو يخاف ضياع ماله.

وفی الدرالمختار(۱/۵۵۴،۵۵۵،۵۵۶): (فتسن أو تجب) ثمرته تظهر فی الإثم بتركها مرة (علی الرجال العقلاء البالغين الأحرار القادرين علی الصلاة بالجماعة من غير حرج) ولو فاتته ندب طلبها فی مسجد آخر الا المسجد الحرام ونحوه (فلا تجب علی مريض ومقعدوزمن ومقطوع يدورجل من خلاف) او رجل فقط...... (وبرد شديد وظلمة كذلک) وريح ليلا لانهارا، وخوف علی ماله او من غريم او ظالم أو مدافعة أحد الأخبثين الخ.

(۲۶۸) بیس رکعات تراویح کا دورانیہ کتنا ہو؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ رمضان المبارک میں حفاظ نماز تراویح مختلف انداز اور رفتار سے پڑھاتے ہیں۔ کوئی تو ڈیڑھ دو گھنٹے لگا دیتا ہے اور کوئی آدھ پون گھنٹے میں فارغ کردیتے ہیں۔ مجھے آپ سے یہ پوچھنا تھا کہ بیس رکعات نماز تراویح کتنی دیر میں ختم ہونا چاہئے؟ اس بارے میں شریعت کا کوئی حکم ہے؟ اگر ہے تو براہ کرم مرحمت فرمادیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... بیس رکعات نمازِ تراویح ختم کرنے کا کوئی متعین وقت مقرر نہیں قاری کی اس رفتار کا اعتبار ہے جو شریعت میں معتبر ہے لہٰذا شرعاً اتنی مقدار پڑھنے کی اجازت ہے جس سے لوگ تراویح کی جماعت میں آنے سے متنفر نہ ہوں اور اتنی سرعت کے ساتھ پڑھنا کہ الفاظ پوشیدہ رہ جائیں یا اپنے مخارج سے ادا نہ ہوسکیں مکروہ ہے بلکہ بین بین ہو یعنی نہ تو اتنی تیز رفتاری ہو کہ سمجھ میں ہی نہ آئے، اور نہ اتنی سست روی کہ لوگ اکتا جائیں۔

لمافی الهندية(۱/۱۱۸): والافضل فی زماننا أن يقرأ بما لا يؤدی إلی تنفير القوم عن الجماعة لكسلهم لأن تكثير الجمع أفضل من تطويل القراءة.

وفی الشامية(۱/۵۴۱): (قوله وفی الحجة) اسم كتاب من كتب الفتاوی(قوله بين بين) أی بأن تكون بين الترسل والاسراع.

وفی الفقه الاسلامی وادلته(۲/۱۰۹۰): قال احمد رحمه الله! یقرأ الامام بالقوم فی شهر رمضان ما یخف علی الناس ولا یشق علیهم.

(۲۶۹) نمازِ تراویح کے بعد قرآن مجید کا خلاصہ بیان کرنا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اس رمضان میں پورے مہینے میری رات کی ڈیوٹی رہی میں اپنی فیکٹری کے قریب جا کر ہی ایک مسجد میں تراویح پڑھتا تھا۔ چونکہ ڈیوٹی کا وقت تھوڑی دیر میں شروع ہوتا تھا اس لئے تراویح کے بعد کچھ دیر وہیں تلاوت کا معمول بنانے کا سوچا تھا لیکن اس مسجد میں تراویح کے بعد تھوڑی دیر خلاصہ سنایا جاتا تھا، میں بھی اس میں شریک ہوجاتا تھا، مجھے یہ انداز بہت اچھا لگا، لیکن پھر خیال آتا ہے کہ کہیں یہ بدعت میں تو شمار نہیں ہوتا؟ آپ مجھے اس بارے میں صحیح صحیح بتادیں کہ آئندہ میں اسی کے مطابق عمل کروں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... ہر وہ کام جو دین نہ ہو پھر اسے دین سمجھ کر کرنا بدعت کہلاتا ہے۔ لہٰذا تراویح کے بعد خلاصہ بیان کرنا بدعت نہیں۔ بلکہ یہ اشاعت للدین کے زمرہ میں آتا ہے۔ اور اس کے لئے ہر وہ صورت جو کہ قواعد شرع کے خلاف نہ ہو اختیار کرنا جائز ہے۔ جبکہ دیگر موانع موجود نہ ہوں، مثلاً نمازیوں کو اس طور سے پابند کرنا نہ پایا جاتا ہو کہ جس سے وہ دین کی بات سننے سے اکتا جائیں۔ حاصل کلام یہ کہ جو نمازی اپنی خوشی سے آسانی کے ساتھ بیٹھ کر سننا چاہیں ان کیلئے مناسب مقدار میں بیان کردینا چاہئے۔

لمافی مرقاة المفاتیح(۱/۲۱۶): قال النووی رحمه الله: البدعة کل شئ عمل علی غیر مثال سبق وفی الشرع احداث مالم یکن فی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم.

وفی فتح الباری(۱/۱۳۳): قال: کان عبدالله یذکر الناس فی کل خمیس فقال له رجل یا ابا عبدالرحمن لوددت انک ذکرتنا کل یوم قال أما إنه یمنعنی من ذلک أنی أکره أن املکم وإنی أتخو لکم بالموعظة کما کان النبی صلی الله علیه وسلم یتخولنا بها مخافة السامة علینا.

ویستفاد من الحدیث استحباب ترک المداومة فی الجد فی العمل الصالح خشیة الملال وان کانت المواظبة مطلوبة لکنها علی قسمین اما کل یوم مع عدم التکلف واما یوما بعد یوم فیکون یوم الترک لاجل الراحة لیقبل علی الثانی بنشاط واما یوما فی الجمعة ویختلف باختلاف الاحوال والاشخاص والضابط الحاجة مع مراعاة وجود النشاط.

(۲۷۰) تراویح میں دوسرے ختم کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ رمضان المبارک میں ایک قاری صاحب نے قرآن

مجید کا ختم کیا اپنی مسجد میں دوسرا ختم وہ اسی مسجد میں نہیں کرسکتا جبکہ مقتدین حضرات کہتے ہیں کہ دوسرا ختم بھی سناؤ کیونکہ تین ختم مسنون ہوتے ہیں آپ حضرات تفصیل سے آگاہ فرمائیں کہ تین ختم کرنا اس قاری صاحب کیلئے ضروری ہیں؟ **بینوا توجروا**

الجواب حامداً ومصلیاً......واضح رہے کہ رمضان المبارک میں ایک مرتبہ تراویح میں قرآن پاک ختم کرنا سنت ہے ایک سے زیادہ مرتبہ افضل ضرور ہے لیکن لازمی اور ضروری نہیں۔ لہٰذا صورت مذکورہ میں مقتدین حضرات کا قاری صاحب کے اوپر زبردستی کرنا (کہ آپ دوسرا ختم بھی سنائیں) درست نہیں تاہم اگر وقت ہو، اور قاری صاحب اپنی خوشی سے سنانا چاہیں تو افضل اور بہتر ہے ورنہ ایک ہی ختم کافی ہے۔

لمافی الهندية(۱/۱۱۷):السنة فی التراويح انما هو الختم مرّة فلا يترک لكسل القوم...... والختم مرتين فضيلة والختم ثلاث مرات افضل كذا فی السراج الوهاج.

وفی الدر المختار(۲/۴۶): (والختم) مرّة سنة ومرتين فضيلة وثلاثا افضل (ولا يترک) الختم (لكسل القوم).

﴿فصل فی الوتر﴾

(وتر سے متعلق مسائل کا بیان)

(۲۷۱) دعائے قنوت کے وقت ہاتھ کانوں تک اٹھانا، اور قنوت نازلہ پڑھنے کا وقت

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا قرآن وحدیث میں وتروں میں دعائے قنوت کے وقت رفع یدین کا ثبوت ہے یا نہیں؟ اور قنوت کے وقت ہاتھ کہاں باندھے؟ اور قنوت نازلہ کن کن نمازوں میں پڑھی جاسکتی ہے، اور قنوت نازلہ کے وقت ہاتھ باندھنے ہیں یا چھوڑنے ہیں؟ کن حالات میں قنوت نازلہ پڑھنی چاہئے؟ جلد از جلد جواب عنایت فرمائیں بڑی مہربانی ہوگی۔

الجواب حامداً ومصلیاً..... وتروں میں دعائے قنوت کے وقت رفع یدین ثابت ہے البتہ اگر وتر فوت ہوجائے اور اس کو لوگوں کے سامنے پڑھنا ہو تو ہاتھ نہ اٹھانے کی بھی گنجائش ہے تاکہ لوگوں کو اس کی سستی پر علم نہ ہو، اور قنوت کے وقت ہاتھوں کو زیر ناف باندھے اور قنوت نازلہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک صرف نماز فجر میں مسلمانوں پر سخت حالات مثلاً (قحط، وباء، خوف) کے وقت پڑھنی چاہئے اور قنوت نازلہ کے وقت ہاتھوں کو چھوڑنا بہتر ہے۔

لما فی الهندية (۱/۱۱۱): اذا فرغ من القراء ة فی الرکعة الثالثة کبرورفع يديه حذاء اذنيه ويقنت قبل الرکوع....... واختلفوا انه يرسل يديه فی القنوت ام يعتمد و المختار انه يعتمد.

وفی الدرالمختار(۲/۶): (ويکبر قبل رکوع ثالثته رافعا يديه) کما مرثم يعتمد وقيل کالداعی (وقنت فيه) (فی رد المحتار قوله رافعايديه) ای سنة الی حذاء اذنيه کتکبيرة الاحرام وهذا کما فی الامداد عن مجمع الروايات لوفی الوقت اما فی القضاء عند الناس فلا يرفع حتی لايطلع احد علی تقصيره...... (قوله ثم يعتمد) ای يضع يمينه علی يساره کما فی حالة القراء ة (قوله وقيل کالداعی) ای عن ابی يوسفؒ انه يرفعهما الی صدره وبطونهما الی السماء امداد والظاهر انه يبقيهما کذلک الی تمام الدعاء علی هذه الرواية تأمل.

وفی تنوير الابصار مع الدر(۲/۸،۹): (وياتی الماموم بقنوت الوتر لاالفجر بل يقف ساکتا علی الاظهر) مرسلايديه قال الشامی تحت(قوله مرسلايد يه) لان الوضع سنة قيام طويل فيه مسنون

وھذا الذکر لیس بمسنون عندنا.

(۲۷۲) دعائے قنوت سے پہلے رفع یدین کا حدیث سے ثبوت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ صلوٰة وتر میں دعائے قنوت پڑھتے وقت رفع الیدین کرنا کہاں سے ثابت ہے آ ثار صحابہ اور احادیث نبوی سے مزین جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... وتر کی نماز میں دعائے قنوت پڑھتے وقت رفع الیدین کرنا احادیث نبوی اور آ ثار صحابہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عمرؓ کے تعامل سے ثابت ہے۔

لمافی السنن الکبری(۲/۲۱۱): عن سلمان الفارسی رضی الله عنه عن النبی ﷺ قال إن الله حیی کریم یستحیی اذا رفع الرجل إلیه یدیه ان یردهما صفرا خائبتین. رفعه جعفر بن میمون هکذا وقفه سلیمان التیمی عن أبی عثمان فی احدی الروایتین عنه والحدیث فی الدعاء جملة الا ان عددا من الصحابة رضی الله تعالیٰ عنهم رفعوا أیدیهم فی القنوت مع مارویناه عن انس بن مالک عن النبی ﷺ.

وفی اعلاء السنن(۶/۸۶): عن أبی عثمان: "کان عمر رضی الله تعالیٰ عنه یرفع یدیه فی القنوت.

وفی شرح معانی الآثار(۱/۴۱۷): وقدروی فی ذلک عن ابراهیم النخعی ماحدثنا سلیمٰن بن شعیب بن سلیمٰن عن ابیه عن ابی یوسف عن ابی حنیفة عن طلحة بن مصرف عن ابراهیم النخعی قال ترفع الایدی فی سبع مواطن فی افتتاح الصلوة وفی التکبیر للقنوت فی الوتر وفی العیدین وعند استلام الحجر و علی الصفا والمروة وبجمع وعرفات وعند المقامین عند الجمرتین.

(۲۷۳) دعائے قنوت کیلئے ہاتھ کانوں تک اٹھا کر باندھنے کا ثبوت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ وتر میں دعائے قنوت کے وقت جو ہاتھ اٹھائے جاتے ہیں آیا یہ کانوں تک اٹھا کر باندھنا کسی حدیث یا نص سے ثابت ہے؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ دعا کی صورت میں اٹھانا چاہیے، ان کی بات کہاں تک درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... نماز وتر میں دعائے قنوت پڑھنا واجب ہے، اور دعائے قنوت کیلئے کانوں کی لوتک ہاتھوں کو اٹھانا اور پھر دونوں ہاتھوں کو باندھنا سنت ہے۔ صورت مسئولہ میں دعائے قنوت کیلئے دونوں ہاتھوں کو اُٹھانا یہ حدیث مبارکہ سے ثابت ہے حدیث مبارکہ یہ ہے:

(۱)۔"عن ابراهيم قال: ارفع يديک للقنوت"۔(مصنف ابن ابی شیبہ،۴/۵۳۱)

(۲)۔"عن ليث، عن ابن الاسود، عن ابيه، عن عبدالله بن مسعودؓ: أنه كان يرفع يديه إذا قنت فى الوتر"۔ (مصنف ابن ابی شیبہ،۴/۵۳۱)

لیکن ہاتھوں کے اُٹھانے میں دونوں احتمال موجود ہیں کہ کانوں کی لوتک دونوں ہاتھوں کو اُٹھایا گیا ہو، یا دعاء کی طرح دونوں ہاتھوں کو سینے تک اُٹھایا گیا ہو۔لہٰذا ان احتمالات کی وجہ سے ان احادیث کو کانوں کی لوتک اُٹھانے پر بطور استدلال پیش نہیں کیا جا سکتا۔البتہ فقہاء اور علماء کے اقوال اور افعال سے دونوں ہاتھوں کو کانوں کی لوتک اُٹھا کر باندھنا ثابت ہے۔وہ اس طرح کہ دعائے قنوت میں دونوں ہاتھوں کو کانوں کی لوتک اُٹھانے کو احنافؒ نے تکبیر تحریمہ پر قیاس کیا ہے کیونکہ تکبیر تحریمہ میں کانوں کی لوتک اُٹھانا مسنون ہے۔

اور پھر دونوں ہاتھوں کو باندھنا قیام پر جس میں طویل اور مسنون ذکر ہو، قیاس کیا ہے۔لہٰذا فقہاء احناف نے احادیث میں رفع یدین کے دونوں احتمالوں کو قیاس سے ثابت کیا ہے۔

لمافى المصنف لابن ابى شيبة(۴/ ۵۳۱): ۵۹۴. فى رفع اليدين فى قنوت الوتر.

۷۰۲۶. حدثنا ابو الاحوص، عن مغيرة، عن ابراهيم قال: ارفع يديک للقنوت.

۷۰۲۷. حدثنا معاوية بن هشام قال: حدثنا سفيان، عن ليث، عن عبدالرحمن بن الأسود، عن ابيه، عن عبدالله بن مسعود: انه كان يرفع يديه فى قنوت الوتر.

۷۰۲۸. حدثنا عبدالرحمن بن محمد المحاربى: عن ليث: عن ابن الاسود، عن ابيه، عن عبدالله بن مسعود: انه كان يرفع يديه اذا قنت فى الوتر.

وفى الدر المختار (۲/۶): (ويكبر قبل ركوع ثالثته رافعا يديه) كمامر ثم يعتمد، وقيل كالداعى (وقنت فيه) ويسن الدعاء المشهور، ويصلى على النبى ﷺ به يفتى.

وفى الشامية تحته: (قوله رافعاً يديه) أى سنة الى حذاء أذنيه كتكبيرة الاحرام وهذا كما فى الامداد عن مجمع الروايات لوفى وقت، أما فى القضاء عند الناس فلا يرفع حتى لا يطلع احد على تقصيره اهـ (قوله كمامر) أى فى فصل اذا اراد الشروع فى الصلوٰة عند قوله ولا يسن رفع اليدين الا فى سبع. (قوله ثم يعتمد) أى يضع يمينه على يساره كمافى حالة القراءة ح (قوله وقيل كالداعى) أى عن أبى يوسف انه يرفعهما الى صدره وبطونهما الى السماء امداد، والظاهر أنه يبقيهما كذلک الى تمام الدعاء على هذه الرواية تامل (قوله وقنت فيه) اى فى الوتر او الضمير الى ماقبل الركوع.

وفى اعلاء السنن(۶/ ۱۲۲): وأما السادس: فلم أرفقهائنا تعرضوا له خصوصاً، نعم مقتضى اطلاقهم ان من محال الرفع القنوت وهو يعم قنوت النوازل أيضاً ان يرفع يديه عنده، ولكن الدليل الذى

استدل به الحنفية للرفع فى قنوت الوتر لايعم غيره، بل يختص به، هو أثر ابراهيم النخعى بسند صحيح عند الطحاوى، قال "ترفع الايدى فى سبع مواطن، فى افتتاح الصلاة وفى التكبير للقنوت فى الوتر الخ.

وفيه ايضاً (صـ۱۲۳، ۱۲۴): بقى أنه لا دليل فيه ولا فى أثر غيره على أنه ﷺ كان يضع يديه بعد رفعهما حيال منكبيه او يرسلهما، فمن اين قال ابو حنيفةؒ وابو يوسفؒ بالوضع فى القنوت بعده؟ والجواب: أن الوضع والارسال بعد الرفع مسكوت عنهما فى الاحاديث، فجرى محمدؒ على الأصل وهو الإرسال، لأن الوضع عمل حادث يحتاج الى الدليل، وأخذ الشيخان بالقياس وقالا: إن ارسال اليدين زمانا طويلا ينافى الخشوع، وإنما السنة أن نقول وضع الكف على الكف تحت السرة كمامر فى باب صفة الصلاة، وكان مقتضى ذلک ان نقول بالوضع فى القومة بين الركوع والسجدة أيضاً، لكن فى الوضع للقيام اليسير وتركه معا حرج، فقلنا بأن الوضع سنة قيام فيه ذكر مسنون طويل، فيضع يديه فى القنوت للنازلة أيضاً، لكونه ذكر اطويلا، ولا يرفعهما حذاء الوجه، فقدروى مسلم عن حصين عن عمارةؓ بن رويبة: "رأى بشر بن مروان على المنبر رافعاً يديه، فقال، قبح الله هاتين اليدين، لقد رأيت رسول الله ﷺ مايزيد على أن يقول بيده هكذا، وأشار باصبعة المسبحة اهـ (۱/۲۸۷) فلما أنكر على الرفع فى حال الخطبة التى هى مشابهة بالصلاة فكيف فى عين الصلاة؟ فما ورد عن النبى ﷺ أنه رفع يديه يدعو فى القنوت للنازلة، وما ورد عن عمر مثله محمول على الرفع القصير الذى يكون قبل القنوت وهذا هو الأمر التاسع فافهم.

.....وايضاً (صـ۱۲۳): والحاصل: أنه يضع عند الشيخين فى القنوت سواء كان قبل الركوع أو بعده، وعند محمد يرسل ولا يرفع يديه فى خلال القنوت خذاء الوجه او الصدر كرفعهما فى الدعاء خارج الصلاة عندهم اتفاقاً، فإن المشروع عندهم بعد رفعهما فى افتتاح الصلاة أو عند القنوت، إما الوضع وإما الإرسال لا إبقائهما مرفوعتين الخ.

(۲۷۴) دعائے قنوت کی جگہ سورۂ اخلاص پڑھنے کا حکم

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں جن عورتوں کو دعائے قنوت نہیں آتی وہ اس کی جگہ "سورہ اخلاص" پڑھتی ہیں تو کیا اس سے دعائے قنوت کا وجوب ادا ہو جائے گا یا نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو کیا ان عورتوں پر ان سب وتر نمازوں کی قضاء کرنا واجب ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... وتر کی تیسری رکعت میں رکوع سے پہلے کوئی مخصوص دعا پڑھنا واجب نہیں بلکہ کوئی بھی دعا پڑھ سکتے ہیں البتہ احنافؒ کے نزدیک مشہور دعا ''اللھم انا نستعینک ونستغفرک ونومن بک...... الخ '' پڑھنا سنت ہے۔لیکن اگر کسی شخص کو یہ دعا یاد نہیں تو اسے چاہیے کہ اس کو یاد کرے اور جب تک یہ دعا یاد نہیں ہوتی اس کی جگہ دوسری دعا مثلاً '' رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّار '' یا '' اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ '' تین مرتبہ پڑھنے سے نماز درست ہوجائے گی۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں جن عورتوں کو مذکورہ دعا یاد نہیں تو ان کو چاہیے کہ اس کو یاد کرنے کی کوشش کریں اور جب تک یاد نہ ہو تو مذکورہ دعاؤں میں سے کوئی دعا پڑھ سکتی ہیں اس سے نماز درست ہوجائے گی۔عام حالت میں حکم یہی ہے تاہم اگر کسی شخص کو دعائے قنوت یا کوئی دعا یاد نہیں تو اگر وہ اس کی جگہ تین مرتبہ'' سورۃ اخلاص'' پڑھ لیتا ہے تو اس کی نماز درست ہوجائے گی۔

لمافی الشامیة (۲/ ۶، ۷): (قوله ویسن الدعاء المشهور) قد منافی بحث الواجبات التصریح بذلک عن النهر، وذکر فی البحر عن الکرخی انّ القنوت لیس فیه دعاء مؤقت، لانه روی عن الصحابة ادعیة مختلفة، لانّ المؤقت من الدعا یذهب برقة القلب...... ومن لا یحسن القنوت یقول. ربنا اتنا فی الدنیا حسنه۔الآیة. وقال ابو لیث یقول: اللهم اغفرلی یکررها ثلاثا، وقیل یقول یارب ثلاثا، ذکره فی الذخیرة.

وفی السعایة فی کشف مافی شرح الوقایة، باب صفة الصلاة(۲/ ۱۳۹): وفی مقدمة الغزنویة: ان کان لایحسن القنوت یقرأ ثلاث مرات "قُلْ هُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ" او ثلاث مرات "اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَنَا ولِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ".

وفی حاشیة الطحطاوی علی الدر المختار (۱/ ۲۸۰): (وقوله ویسن الدعاء المشهور) وهو اللهم انا نستعینک ونستهدیک ونستغفرک ونتوب الیک ونومن بک......الخ ویجوز ان یقتصر فی دعا القنوت علی نحو قوله رَبَّنَا آتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَفِیْ الآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ او یقول یا رب ثلاثا او اللهم اغفرلی ثلاثا لانه غیر مؤقت فی ظاهر الروایة مطلقا سواء کان یحسن الدعا اولا......

(۲۷۵) وتر کی تیسری رکعت کے رکوع سے قنوت کیلئے لوٹنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص وتر کی نماز پڑھ رہا تھا، تیسری رکعت میں دعائے قنوت پڑھنا بھول گیا اور رکوع میں چلا گیا، جب رکوع میں یاد آیا کہ دعائے قنوت نہیں پڑھی تو وہ واپس کھڑا ہوگیا اور دعائے قنوت پڑھ کر دوبارہ رکوع کیا، اب پوچھنا یہ تھا کہ آیا یہ شخص سجدہ سہو کر کے سلام پھیر دے تو نماز درست ہوجائے گی یا نہیں؟ یا پھر اسے دوبارہ سے

نماز پڑھنا چاہیے؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں اگر سجدہ سہو کرلیا جائے تو نماز درست ہوجائے گی۔البتہ اس صورت میں رکوع کی طرف واپس نہیں آنا چاہیے تھا۔

لمافی الشامیة(۲/ ۸۱): **والحاصل ان مایقرؤہ یلتحق بما قبل الرکوع ویلغو ھذا الرکوع فتلزم اعادتہ، حتی لو لم یعدہ بطلت صلاتہ بل ذکر فی شرح المنیة انہ لو قام لاجل القراءۃ ثم بدا لہ فسجد ولم یقرأ ولم یعد الرکوع قال بعضھم تفسد لانہ لما انتصب قائماً للقراءۃ ارتفض رکوعہ وان کان البعض یقول لا تفسد اھ وھذا کلہ بخلاف مالو تذکر القنوت فی الرکوع فالصحیح انہ لایعود، ولو عاد وقنت لا یرتفض رکوعہ وعلیہ السھو لان القنوت اذا اعید یقع واجباً لا فرضاً.**

وفی الھندیة (۱/ ۱۲۷): **وکذا اذا سجد فی موضع الرکوع أو رکع فی موضع السجود أو کرّر رکناً أو قدم الرکن أو أخرہ ففی ھذہ الفصول کلھا یجب سجود السھو.**

(۲۷۶) رمضان میں عشاء کی نماز باجماعت نہ پڑھنے والے کا وتر باجماعت پڑھنا

سوال.....کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے رمضان المبارک میں نماز عشاء جماعت کے ساتھ نہیں پڑھی آیا یہ آدمی وتر کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرسکتا ہے یا نہیں؟ مفتی بہ قول ذکر کریں۔

الجواب حامداً ومصلیاً.....صورت مسئولہ میں جس آدمی نے عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ نہ پڑھی ہو، وتر کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرسکتا ہے۔یہی مفتی بہ قول ہے۔

لمافی حلبی کبیری(صـ۴۱۰): **واذا لم یصل الفرض مع الامام فعن عین الائمة الکرابیسی انہ لا یتبعہ فی التراویح ولا فی الوتر وکذا اذا لم یتابعہ فی التراویح لا یتابعہ فی الوتر، وقال ابویوسف البانی اذا صلی مع الامام شیئا من التراویح یصلی معہ الوتر وکذا اذا لم یدرک معہ شیئا منھا وکذا اذا صلی التراویح مع غیرہ لہ ان یصلی الوتر معہ وھو الصحیح ذکرہ ابو اللیث وکذا قال ظھیر الدین المرغینانی الخ.**

وفی حاشیة طحطاوی علی الدر المختار(۱/ ۲۹۷): **قولہ فلیراجع قضیة التعلیل فی المسئلة السابقة بقولھم لانھا تبع أن یصلی الوتر بجماعة فی ھذہ الصورة لانہ لیس بتبع للتراویح ولا للعشاء عند الامام رحمہ اللہ تعالیٰ انتھیٰ حلبی.**

وفی فتاویٰ دارالعلوم دیوبند(۴/ ۱۵۲): جماعت وتر میں شریک ہوسکتا ہے۔ **کذا صرح بہ فی الطحطاوی،**

اور علامہ شامی نے بے شک عدم جواز نقل کیا ہے لیکن طحطاوی کی عبارت میں جواز کی تصریح ہے، اور قاعدہ بھی مقتضی جواز کو ہے اس لئے ہمارے اکابر اساتذہ وتر کی جماعت میں شرکت کے جواز کے قائل ہیں کیونکہ وجہ عدم جواز کی کچھ نہیں ہے۔

(۲۷۷) صرف رمضان میں وتر جماعت سے ادا کرنے کی شرعی حیثیت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ رمضان کے مہینہ میں وتر باجماعت ادا کیے جاتے ہیں دوسرے مہینوں میں انفرادی طور پر ادا کیے جاتے ہیں اس کی وجہ کیا ہے نیز رمضان میں وتر جو باجماعت ادا کیے جاتے ہیں فرض ہیں یا واجب یا سنت؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... رمضان میں وتر جو باجماعت ادا کیے جاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اثر سے ثابت ہے اور مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے اور دوسرے مہینوں میں انفرادی اس لئے ادا کیے جاتے ہیں کہ ان مہینوں میں کوئی اثر وارد نہیں ہے۔ وتر جو باجماعت ادا کیے جاتے ہیں یہ مستحب ہے۔

لمافی البحر الرائق(۲/ ۶۹): (قوله ویوتر بجماعة فی رمضان فقط) أی علی وجه الاستحباب وعلیه اجماع المسلمین کمافی الهدایة واختلفوا فی الافضل ففی الخانیة الصحیح ان اداء الوتر بجماعة فی رمضان أفضل لان عمرؓ کان یؤمهم فی الوتر الخ.

وفی الشامیة(۲/ ۴۹،۴۸): أن جماعة الوتر تبع لجماعة التراویح وان کان الوتر نفسه أصلا فی ذاته لان سنة الجماعة فی الوتر انما عرفت بالأثر تابعة للتراویح..........

(ص۴۹) فالوتر کالتراویح فکما أن الجماعة فیها سنة فکذلک الوتر بحر وفی شرح المنیة والصحیح أن الجماعة فیها أفضل الا ان سنیتها لیست کسنیة جماعة التراویح الخ.

(۲۷۸) وتر میں نو سورتیں پڑھی جانے والی حدیث پر عمل کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک حدیثِ مبارکہ میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وتر میں (۹) سورتیں تلاوت فرماتے تھے پہلی رکعت میں سورۃ التکاثر، سورۃ القدر، سورۃ الزلزال، دوسری رکعت میں سورۃ العصر، النصر، الکوثر اور تیسری رکعت میں سورۃ الکافرون، اللہب اور سورۃ الاخلاص، اب اگر کوئی اتباع سنت کی نیت سے ان (۹) سورتوں کو پڑھے تو جو ترتیب حدیث میں وارد ہوئی ہے اس طرح پڑھنا مسنون ہوگا یا قرآن شریف کی ترتیب پر پڑھنا مسنون ہوگا۔ کیا ذخیرہ احادیث میں اس مضمون کی حدیث ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... فرض اور واجب نماز میں ترتیب سے قرأت کرنا قرأت کے واجبات میں سے ہے اور اس کی مخالفت کرنا مکروہ

ہے البتہ نوافل کے اندر اس کی گنجائش ہے اور چونکہ وتر کی نماز ہمارے ہاں واجب ہے اور واضح رہے کہ قرآن کی سورتوں کی ترتیب بھی صحیح قول کے مطابق توقیفی ہے لہٰذا اس کی رعایت کرنا ضروری ہے اسی وجہ سے ہمارے ائمہ نے نمازِ وتر کے اندر پہلی رکعت میں سورۃ الاعلیٰ دوسری میں سورۃ الکافرون، تیسری میں سورۃ الاخلاص پڑھنے والی روایت کو سنیت پر محمول کیا ہے لہٰذا یہی طریقہ سنت ہے البتہ مسند احمد کی روایت سے ان ''۹'' سورتوں کا پڑھنا بھی ثابت ہے لیکن اس میں چونکہ ترتیب توقیفی (جس کی رعایت واجب ہے) کا عکس ہے اس لئے اس کو بیان جواز پر محمول کیا جائے گا۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں وتر کی نماز میں سورۃ الاعلیٰ، سورۃ الکافرون، سورۃ الاخلاص پڑھنا ہی مسنون ہے البتہ یہ روایت (کہ جس میں ان ۹ سورتوں کا پڑھنا مذکور ہے) جواز پر محمول ہے۔ اگر کبھی کبھار اس طرح پڑھ لے تو اس کی گنجائش ہے۔ اور بعض حضرات نے وتر میں مسنون قرأت کے چار طریقے بیان فرمائے ہیں۔

(۱)۔ پہلی رکعت میں سورۃ الاعلیٰ، دوسری میں سورۃ الکافرون، تیسری میں سورۃ الاخلاص۔

(۲)۔ پہلی میں سورۃ التکاثر، دوسری میں سورۃ العصر، تیسری میں سورۃ الکافرون۔

(۳)۔ پہلی رکعت میں سورۃ القدر، دوسری رکعت میں سورۃ النصر، تیسری میں سورۃ اللہب۔

(۴)۔ پہلی رکعت میں سورۃ الزلزال، دوسری میں سورۃ الکوثر اور تیسری میں سورۃ الاخلاص۔

اگر اس تاویل کو لے لیا جائے تو اس میں سورتوں کی ترتیب کی بھی رعایت ہو جاتی ہے اور تمام روایات پر عمل بھی ہو جاتا ہے لیکن اس میں بھی پہلا طریقہ زیادہ راجح ہے لانہ اکثر عملاً، البتہ وتر کی جماعت میں (جو کہ صرف رمضان میں ہوتی ہے) اس پر بھی التزام نہ کیا جائے۔

لمافی الترمذی (۱۰۶/۱): عن عبدالعزیز بن جریج قال سالت عائشة بأی شئ کان یوتر رسول الله ﷺ قالت کان یقرأ فی الاولی بسبّح اسم ربک الاعلی وفی الثانیة بقل یایها الکافرون وفی الثالثة قل هو الله احد والمعوذتین.

وفی تحفة الاحوذی (۳۴۱/۱): والذی اختاره اکثر اهل العلم من اصحاب النبی ﷺ ومن بعدهم ان یقرأ بسبّح اسم ربک الاعلی وقل یاایها الکفرون وقل هو الله احد ویقرأ فی کل رکعة من ذلک بسورة وبه قال الحنفیة.

وفی المسند للامام احمد(۱۴۳/۱): عن علی رضی الله تعالیٰ عنه قال کان رسول الله ﷺ یوتر بتسع سور من المفصل، قال اسود: یقرأ فی الرکعة الأولی الهاکم التکاثر، وإنا انزلناه فی لیلة القدر، واذا زلزلت الارض وفی الرکعة الثانیة والعصر واذا جاء نصر الله والفتح وانا اعطیناک الکوثر وفی الرکعة الثالثة قل یاایها الکافرون وتبت یدا ابی لهب وقل هو الله احد.

وفی الموسوعة الفقهیة(۲۹۸/۲۷): اتفق الفقهاء علی انه یقرأ فی کل رکعة من الوتر الفاتحة ...... ثم ذهب الحنفیة الی انه لم یوقت فی القراء ة فی الوتر شئ غیر الفاتحة فما قرأ فیه فهو حسن، وما

ورد عن النبی ﷺ: انه قرأ به فی الأولی بسورة سبح اسم ربک الاعلی وفی الثانیة الکافرون، وفی الثالثة بالاخلاص فیقرأ به احیانا، ویقرأ بغیره احیانا للتحرز عن هجران باقی القرآن.

وفی الهندیة (۱/۷۹): هذا کله فی الفرائض اما فی السنن فلا یکره هکذا فی المحیط.

وفی الشامیة (۱/۵۴۴): لان الشارع إذا لم یعین علیه شیئا تیسیرا علیه کره له ان یعین...... لما فیه من هجر الباقی وایهام التفضیل ...... وهذا اذا صلی الوتر بجماعة وان صلی وحده یقرأ کیف شاء اهـ .... فیستحب ان یقرا ذلک احیانا تبرکا بالماثور

وایضاً ذکر فی وتر البحر عن النهایة انه لا ینبغی ان یقرأ سورة متعینة علی الدوام لئلا یظن بعض الناس انه واجب...... اما لو قرأه للتیسیر علیه او تبرکا بقراءته علیه السلام فلا کراهة ولکن بشرط ان یقرأ غیرها احیانا لئلا یظن الجاهل ان غیرها لایجوز......

وفی الشامیة (۲/۶):والسنة السور الثلاث ای الاعلی والکافرون والاخلاص لکن فی النهایة ان التعیین علی الدوام یفضی الی اعتقاد بعض الناس أنه واجب وهو لا یجوز فلو قرأ بما وردبه الآثار احیانا بلا مواظبة یکون حسنا......

وفی الدرالمختار(۱/۵۴۶): ویکره الفصل بسورة قصیرة وان یقرأ منکوسا الا اذا ختم فیقرأ من البقرة ...... وفی الشامیة تحته (وقوله وان یقرأ منکوسا) بأن یقرأ فی الثانیة سورة اعلی مما قرأ فی الاولی لان ترتیب السور فی القراة من واجبات التلاوة وانما جوز للصغار تسهیلا لضرورة التعلیم ......

وفی مرقاة المفاتیح(۵/۱۱۱): بخلاف ترتیب السور فانه لما کان مختلفا فیه کرهت مخالفته لغیر عذر، ولما ورد أنه ﷺ قرا النسآء قبل آل عمران لبیان الجواز او نسیانا لیعلم الصحة به، مع ان الاصح ان ترتیب السور توقیفی.

(۲۷۹) وتر کی نماز دو سلاموں سے پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ارادہ انشاء اللہ رمضان المبارک میں عمرہ کرنے کا ہے اب مسئلہ یہ ہے کہ وہاں کے ائمہ وتر کی نماز میں دو رکعات پر سلام پھیرتے ہیں پھر اسکے بعد ایک رکعت پڑھ کر دوبارہ سلام پھیرتے ہیں، آیا میرے لئے اسطرح انکی اقتداء میں نماز پڑھنا جائز ہوگا یا نہیں اگر نہیں تو کیا انفرادا وتر کی نماز پڑھوں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں اصح قول کی بنا پر کسی حنفی المسلک کو ایسے امام کی اقتداء درست نہیں بلکہ انفرادی نماز پڑھ لی جائے۔

لمافی الشامیة (۲/۸): ولم یذکر الشارح تعلیل اشتراط عدم الفصل بسلام اکتفاءً بمااشار الیه قبله من ان الاصح اعتبار اعتقاد المقتدی والسلام قاطع فی اعتقاده فیفسد اقتدائه وان صح شروعه معه اذلامانع منه فی الابتداء کماافاده. ح

(۲۸۰) وتر میں حنفی کا شافعی کی اقتداء کرنا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ (۱)۔عربوں کے یہاں وتر دواور ایک رکعت کر کے پڑھی جاتی ہے، حنفی ایک نیت کے ساتھ تینوں رکعت پڑھتے ہیں، اگر شافعی امام کے پیچھے نماز پڑھی جائے (رمضان میں) تو پھر حنفی ان کے ساتھ نماز پڑھیں یا نہیں؟ اکثریت حنفی کی پڑھتی ہے، شرعاً کیا حکم ہے؟

(۲)۔دوسری بات یہ ہے کہ نیت کیا کرنی چاہئے امام نماز سے پہلے بولتا ہے کہ دورکعت نماز عشاء ہے اور پھر بعد میں کہتا ہے کہ ایک رکعت نماز وتر ہے، اس میں یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ نیت کس نماز کی کرنی چاہئے لہٰذا اکثر حنفی یہ نیت کرتے ہیں کہ ''جونیت امام کی وہ میری'' کیا یہ صحیح ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً...... (۱)۔احناف کے ہاں وتر تین رکعات ہیں جو کہ ایک سلام کے ساتھ ادا کی جاتی ہے۔لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر شافعی امام وتر میں پہلی دورکعات کے بعد سلام پھیرتا ہے اور اس کے بعد ایک رکعت پڑھ کر آخر میں پھر سلام پھیرتا ہے تو ایسے شافعیؒ امام کے پیچھے حنفی کی اقتداء شرعاً درست نہیں ہے۔

(۲)۔اگر شافعی امام دورکعات کے بعد سلام نہیں پھیرتا ہے بلکہ تینوں رکعات کیلئے آخر ہی میں سلام پھیرتا ہے تو اس کے پیچھے حنفی کی اقتداء درست ہے البتہ بہتر یہ ہے کہ حنفی وتر کی نیت میں مطلقاً وتر کا ذکر کرے۔

لما فی الدر المختار (۲/۷): (وصح الاقتداء فیه) ففی غیره اولی ان لم یتحقق منه مایفسدها فی اعتقاده فی الاصح کما بسطه فی البحر (بشافعی) مثلاً (لم یفصله بسلام) لا ان فصله (علی الاصح) فیهما للاتحاد وان اختلف الاعتقاد (و) لذا (ینوی الوتر لاالوتر الواجب کما فی العیدین) للاختلاف.

(۲۸۱) حنفی کا شافعی امام کے پیچھے وتر میں لفظ واجب ملانے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک مفتی صاحب سے یہ مسئلہ سنا ہے کہ حنفی آدمی شافعی آدمی کے پیچھے نماز پڑھ سکتا ہے بشرطیکہ امام اس حنفی مقتدی کے مسائل اختلافیہ میں اس کی رعایت رکھتا ہو، اب میرے ذہن میں یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ اگر کوئی حنفی وتر یا عیدین شافعی امام کے پیچھے پڑھتا ہے تو چونکہ احناف کے نزدیک یہ نمازیں واجب ہیں اور شوافع

کے نزدیک غیر واجب ہیں، آیا اس صورت میں اقتداء درست ہو جائے گی؟ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ وتر کے ساتھ واجب کا لفظ نہ کہو تو پھر ہو جائے گی کیا یہ درست ہے؟ اس صورت میں بھی تو عملاً نماز بہر حال مقتدی کی واجب ہی رہے گی تو اس کا کیا جواب ہوگا؟

براہ کرم تفصیل سے دلائل کے ساتھ میرے اس مسئلے کا جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً ...... حنفی آدمی کا شافعی مسلک امام کی اقتداء میں وتر ادا کرنا درست ہے اس شرط کے ساتھ کہ امام وتر کی دوسری رکعت میں سلام نہ پھیرے اور ایک شرط یہ بھی ہے کہ امام نے مطلق وتر کی نیت کی ہو، وتر سنت کی نیت نہ کی ہو، اور اس دوسری شرط کا علم چونکہ قدرے دشوار ہے اس لئے بہتر یہ ہے کہ وتر الگ سے یا حنفی امام کے پیچھے پڑھے اور یہ بات کہ شافعی امام کے پیچھے جب وتر پڑھے تو لفظ واجب وتر کے ساتھ نہ کہے جیسا کہ فقہاء نے تصریح کی ہے۔(وینوی الوتر لا الواجب) استحباب پر محمول ہے جیسا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے امداد الفتاویٰ (۳۰۲/۱) میں تصریح کی ہے۔ اگر کوئی لفظ واجب ساتھ کہہ دے تو اس سے صحت اقتداء پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ احناف کے نزدیک وتر اور عید کی نماز واجب ہے اور شوافع کے نزدیک سنت ہے اور فرض یا واجب پڑھنے والے کیلئے نفل پڑھنے والے کی اقتداء کرنا درست نہیں، لہٰذا مذکورہ صورت میں اقتداء کرنا درست نہ ہوا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ عقیدہ میں شافعی امام اور حنفی کا اختلاف ہے، حنفی کے نزدیک وتر واجب اور شافعی کے نزدیک سنت ہے لیکن نیت دونوں کی ایک نماز یعنی وتر یا عید کی ہے پس اس نیت کے اتحاد کا اعتبار کرتے ہوئے اقتداء درست ہے اور وتر میں ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وتر کا وجوب ضعیف ہے کیونکہ بہت سی چیزوں میں وتر کی سنت سے مشابہت ہے مثلاً ایک یہ کہ وتر کیلئے باقی فرائض کی طرح مستقل وقت نہیں بلکہ عشاء کے تابع ہے اور اس کیلئے اذان ہے اور نہ ہی اقامت، یہی وجہ ہے کہ سنت کی طرح وتر کی بھی تمام رکعات میں قرأت فرض ہے پس ان وجوبات کی بنا پر اقتداء کرنا درست ہے۔

وفی الهندية(۸۴/۱): قال الفضلی يصحّ اقتداء الحنفی فی الوتر بمن يری مذهب ابی يوسف ومحمد رحمهما الله تعالیٰ هكذا فی الخلاصة.

وفيه ايضاً(۱۱۱/۱): ولو صلی الوتر بمن يقنت فی الوتر بعد الركوع فی القومة والمقتدی لا يری ذالک تابعه فيه هكذا فی فتاوی قاضيخان.

وفی الدر المختار(۸،۷/۲): (وصح الاقتداء فيه) ففی غيره أولی ان لم يتحقق منه ما يفسدها فی اعتقاده فی الأصح كما بسطه فی البحر (بشافعی) مثلاً (لم يفصله بسلام) لا ان فصله (علی الاصح) فيهما للاتحاد وان اختلف اعتقاد (و) لذا (ينوی الوتر لا الوتر الواجب كمافی العيدين) للاختلاف.

وفی الشامية تحته: (قوله للاتحاد الخ) علة لصحة الاقتداء. ورد علی مامرّ من الإرشاد بما نقله أصحاب الفتاوی عن ابن الفضل أنه يصح الاقتداء لأنّ كلا يحتاج إلی نية الوتر، فأهدر اختلاف الاعتقاد فی صفة الصلاة، واعتبر مجرد النية اهـ. .... ورده فی البحر بما صرّح به فی التجنيس

ایضاً من انّ الامام ان نوی الوتر وهو یراه سنة جاز الاقتداء کمن صلی الظهر خلف من یری انّ الرکوع سنة وان نواه بنیة التطوع لایصح الاقتداء لانه یصیر اقتداء المفترض بالمتنفّل اهـ..........

(قولهلا الوتر الواجب) الذی ینبغی ان یفهم من قولهم انه لا ینوی انه واجب انه لا یلزمه تعیین الوجوب لامنعه من ذالک لانه ان کان حنفیاً ینبغی ان ینویه لیطابق اعتقاده وان کان غیره فلا تضره تلک النیة بحر (قوله للاختلاف) ای فی الوجوب والسنیّة وهو علة للعیدین فقط.

(۲۸۲) وتر کے بعد دو رکعت کھڑے ہوکر پڑھنا افضل ہے

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید ایک دیندار انسان ہے تمام نمازیں باجماعت پڑھنے کا اہتمام کرتا ہے اسی طرح نوافل کا بھی اہتمام کرتا ہے چنانچہ وہ روزانہ وتر کے بعد دو رکعت نفل بیٹھ کر پڑھتا ہے لیکن عمرو کہتا ہے کہ کھڑے ہوکر پڑھنا چاہیے کیونکہ بیٹھ کر پڑھنے سے ثواب آدھا ملے گا، اب پوچھنا ہے کہ وتر کے بعد دو رکعت نفل بیٹھ کر پڑھنا افضل ہے یا کھڑے ہوکر پڑھنا افضل ہے؟ بینوا توجروا

الجواب حامداً ومصلیاً..... نفل نماز مطلقاً چاہے وتر کے بعد کی دو رکعت ہوں یا دیگر نوافل، کھڑے ہوکر پڑھنا افضل ہے اور اگر کوئی شخص بغیر عذر کے بیٹھ کر پڑھے تو اس کو آدھا اجر ملے گا۔

لمافی مشکوة المصابیح (صـ۱۱۳): وعن أبی امامة أن النبی ﷺ کان یصلیهما بعد الوتر وهو جالس یقرأ فیهما إذا زلزلت وقل یاأیها الکفرون رواه احمد.

وفی النسائی (۱/۱۸۸): عن عبدالله بن عمرو قال رأیت النبی ﷺ یصلی جالساً فقلت حدثت انک قلت ان صلوة القاعد علی النصف من صلوة القائم وأنت تصلی قاعداً قال أجل ولکنی لست کأحد منکم.

وفی هامشه (صـ۵): قوله لست کأحد منکم یفید انه مخصوص بینهم بأن لا ینقص له فی الاجر فی صلاته قاعداً وقائماً کذا قال السندی.

وفی الدر المختار (۲/۳۶): (ویتنفل مع قدرته علی القیام قاعداً)...... وفیه أجر غیر النبی ﷺ علی النصف الا بعذر.

وفی الشامیة تحته: (قوله أجر غیر النبی ﷺ) أما النبی ﷺ فمن خصائصه أن نافلته قاعداً مع القدرة علی القیام کنافلته قائماً...... (قوله علی النصف الابعذر) أمامع العذر فلا ینقص ثوابه عن ثوابه قائماً.

وفی شرح النووی علی هامش الصحیح المسلم(۱/۲۵۴): قلت الصواب أن هاتین الرکعتین فعلهما ﷺ بعد الوتر جالساً لبیان جواز الصلوة بعد الوتر وبیان جواز النفل جالساً ولم یواظب علی ذالک بل فعله مرة أو مرتین أو مرات قلیلة ولا تغتر بقولها کان یصلی فإن المختار الذی علیه الأکثرون والمحققون من الأصولیین أن لفظة کان لایلزم منها الدوام ولا التکرار وانما هی فعل ماض یدل علی وقوعه مرة فان دل دلیل علی التکرار عمل به وإلا فلا تقتضیه بوضعها وقد قالت عائشة رضی الله عنها کنت أطیب رسول الله ﷺ لحله قبل أن یطوف ومعلوم أنه ﷺ لم یحج بعد أن صحبته عائشة الاحجة واحدة وهی حجة الوداع فاستعملت کان فی مرة واحدة.

﴿فصل فی سجود السهو والتلاوة﴾

(سجدۂ سہو اور سجدۂ تلاوت کے مسائل کا بیان)

(۲۸۳) سجدۂ سہو کے واجب ہونے کی صورتیں

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے اکثر نماز میں یہ پریشانی لاحق ہوجاتی ہے کہ کچھ چیزیں چھوٹ جاتی ہیں، کبھی رکوع وسجدے کی تسبیحات چھوٹ جاتی ہیں اور کبھی کیا، میں اس پر سجدہ سہو کرلیا کرتا تھا، پھر میرے ایک دوست نے کہا کہ ہر غلطی پر سجدۂ سہو نہیں ہوتا بلکہ بعض مخصوص صورتیں ہیں کسی عالم دین سے اس کی تفصیل پوچھ لو۔ براہ کرم آپ مجھے اس تحریر کے ذریعے بتادیں کہ سجدہ سہو کن کن صورتوں میں کرنا ضروری ہوتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... سجدہ سہو کسی واجب کے چھوٹ جانے یا واجب یا فرض میں تاخیر یعنی دیر ہوجانے یا کسی فرض کو اس کی جگہ سے ہٹا کر پہلے کردینے یا کسی فرض کو دوبارادا کردینے سے واجب ہوجاتا ہے اور سجدہ سہو سے اس بھول کی تلافی ہوجاتی ہے اگر قصداً ایسا کرے تو سجدۂ سہو سے کام نہ چلے گا بلکہ نماز کا دوہرانا لازم ہوگا اور اگر کوئی فرض چھوٹ جائے تو اس کی تلافی سجدۂ سہو سے نہ ہوگی۔ اور تسبیحات وغیرہ جو سنت اور مستحب کی قبیل سے ہیں ان کے چھوٹنے پر کچھ واجب نہیں۔

لمافی المحیط البرهانی(۲/۳۰۸): تكلم المشائخ فی هذا و اكثرهم علی انه يجب بستة اشياء بتقديم ركن وتاخير ركن وبتكرار ركن وبتغير واجب وبترك واجب وبترك سنة تضاف الی جميع الصلاة. اما تقديم الركن نحو ان يركع قبل ان يقرأ ويسجد قبل ان يركع وتاخير الركن ان يترك سجدة صلبية سهوا فيذكرها فی الركعة الثانية فيسجدها أو يؤخر القيام الی الثالث بالزيادة علی قدر التشهد وتكرار ركن. ان يركع ركوعين أو يسجد ثلاث سجدات وتغيير الواجب ان يجهر فيما يخافت او يخافت فيما يجهر وترك الواجب نحو ان يترك القعدة الاولی (فی الفرائض وترك السنة المضافة الی جميع الصلاة نحو ان يترك التشهد فی القعدة الاولیٰ.

وفی الهندية(۱/۱۲۶): ولايجب بترك التعوذ والبسملة فی الاولیٰ والثناء وتكبيرات الانتقالات الخ.

وفی الشامية (۲/۷۹): والعمد لا يجبره سجود السهو بل تلزم فيه الاعادة.

وفی شرح الوقاية (۱/۱۸۴): فی هامش (۱۲) بعد اسطر: ولا يجب ايضا بترك ركن عمدا كان

او سھوا لان ترک الرکن مبطل للصلوٰۃ رأسا ولا یمکن جبر نقصان ثابت به ولو ترک الواجب عمدالا یسجد لان الوارد فی الاحادیث ھو السجود عند السھو لا عند العمد بل یعید الصلوٰۃ.

(۴۸۴) امام کا قرأت کے دوران بھول کر خاموش رہنا پھر سجدہ سہو کرنا کیسا ہے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ماموں نے تبلیغی جماعت میں ۴ مہینے لگائے، جب گاؤں میں واپس آئے تو انہوں نے بتایا کہ اکیلے نماز پڑھنے کے مقابلے میں جماعت سے نماز پڑھنے میں ستائیس گنا زیادہ ثواب ملتا ہے اس لئے اکیلے اکیلے نماز پڑھنے کے بجائے تم اور دوستوں کو بھی یہاں میری بیٹھک میں ہی لے آیا کرو، ہم سب مل کر جماعت سے نماز پڑھا کریں گے۔ الحمدللہ اب ہم سب جماعت سے نماز پڑھتے ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ دوسروں کی نسبت ماموں کو قرآن پڑھنا درست آتا ہے اسلئے وہ ہمارے امام بن جاتے ہیں لیکن قرأت کے دوران غلطیاں بہت کرتے ہیں کبھی پڑھتے پڑھتے بھول جاتے ہیں تو خاموش ہوجاتے ہیں یا پھر دوسری سورت شروع کردیتے ہیں اور آخر میں سجدہ سہو کرتے ہیں کیا اس طرح ہم سب کی نماز سجدہ سہو کرنے سے درست ہوجائے گی؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ چاہے کہ کل قیامت کے دن اللہ جل شانہٗ کی بارگاہ میں مسلمان بن کر حاضر ہو، وہ ان نمازوں کو ایسی جگہ ادا کرنے کا اہتمام کرے جہاں اذان ہوتی ہو (یعنی مسجد میں) اس لئے کہ حق تعالیٰ شانہ نے تمہارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کیلئے ایسی سنتیں جاری فرمائی ہیں جو سراسر ہدایت ہیں انہیں میں سے یہ جماعت کی نمازیں بھی ہیں۔ اگر تم لوگ اپنے گھروں میں نماز پڑھنے لگو گے جیسا کہ فلاں شخص پڑھتا ہے تو نبی علیہ السلام کی سنت کو چھوڑنے والے ہوگے، اور یہ سمجھ لو کہ اگر نبی علیہ السلام کی سنت کو چھوڑ دو گے تو گمراہ ہوجاؤ گے (مسلم شریف، ۲۳۲/۱)...... دوسری حدیث شریف میں آیا ہے کہ مسجد کے پڑوسی کی نماز صرف مسجد میں ہی ہوگی (کنز العمال، ۶۵۰/۷)، نیز اور بے شمار وعیدیں وارد ہوئی ہیں ان لوگوں کے بارے میں جو بلا عذر اپنے گھروں میں نماز پڑھ لیتے ہیں، ان تمام احادیث کی بنا پر آپ کے ماموں کیلئے یہ بات جائز نہیں کہ یہ مسجد کو چھوڑ کر بیٹھک میں جماعت کروائیں لہٰذا ان کو چاہیے کہ تمام نمازوں کو مسجد میں جا کر جماعت کے ساتھ ادا کریں ہاں اگر قریب میں کوئی مسجد نہیں تو کسی مسجد کی بنیاد رکھیں تاکہ ان وعیدوں سے بچ سکیں البتہ صورت مسئولہ میں اگر آپ کے ماموں قرأت کے دوران ایسی غلطیاں کرتے ہیں جن سے معنی تبدیل نہ ہوتے ہوں تو اس صورت میں نماز فاسد نہ ہوگی، ہاں ان کا بھول جانا پھر خاموش ہوجانا اگر ایک رکن کی مقدار ہے تو اس صورت میں سجدہ سہو کرنے سے نماز درست ہوگی اور اگر اتنی مقدار سے کم خاموش رہے تو سجدہ سہو واجب نہیں ہوگا، اور نماز درست ہوگی۔

لمافی المسلم (۲۳۲/۱): عن عبداللہ قال من سرہ ان یلقی اللہ تعالیٰ غدا مسلما فلیحافظ علی ھولاء الصلوات حیث ینادیٰ بھن فان اللہ شرع لنبیکم سنن الھدی، وانھن من سنن الھدی ولو انکم صلیتم

فی بیوتکم کما یصلی هذا المتخلف فی بیته لترکتم سنة نبیکم ولو ترکتم سنة نبیکم لضللتم ......الخ.

وفی سنن ابی داؤد(۱/۸۱): عن ابن عباس رضی الله عنهما قال قال رسول الله ﷺ من سمع المنادی فلم یمنعه من اتباعه عذر قالوا وما العذر قال خوف أو مرض لم تقبل منه الصلوة التی صلیٰ.

وفی المحیط البرهانی(۲/۳۱۴): وشرح الکافی "للصدر الشهید: وکان الشیخ الامام الأجل ظهیر الدین المرغینانی یقول: لا یجب سجود السهو بقوله : اللهم صل علی محمد ونحوه، وانما المعتبر مقدار ما یؤدی فیه رکناً.

وفی البحر الرائق(۱/۲۰۲): وسئل الحلوانی عمن یجمع باهله احیانا هل ینال ثواب الجماعة أولا؟ قال: لا ویکون بدعة ومکروها بلا عذر.

وفی التاتارخانیة(۱/۱۵۷): سئل الحلوانی عمن یصلی جماعة مع اهله فی بیته أحیانا هل ینال فضل الجماعة؟ قال لا وسئل هل یکون بدعة ومکروها؟ قال نعم.

وفی الهندیة (۱/۸۱): وان غیر المعنی تغیرا فاحشا بأن قرأ "وعصی ادم ربه" بنصب المیم ورفع الرب وما أشبه ذلک مما لو تعمد به یکفر اذا قرأخطأ فسدت صلاته فی قول المتقدمین واختلف المتأخرون قال محمد بن مقاتل...... وشمس الائمة الحلوانی لاتفسد صلاته الخ.

(۲۸۵) قیام میں پہلے التحیات پڑھے پھر فاتحہ یا قعدہ میں فاتحہ پڑھے تو کیا حکم ہے

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی قیام میں التحیات للہ الخ پڑھ لیتا ہے پھر اس کو خیال آیا اور قرأت کی۔ آیا اس پر سجدہ سہو لازم ہوگا یا نہیں؟ اسی طرح اگر تشہد میں سورۂ فاتحہ پڑھے تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... کوئی شخص قعدہ میں تشہد سے پہلے فاتحہ پڑھے تو اس پر سجدہ سہو واجب ہوتا ہے اور اگر قیام میں پہلے تشہد پڑھے پھر فاتحہ پڑھے تو اس پر سجدہ سہو واجب نہیں ہوتا، اور اگر قعدہ میں پہلے تشہد پڑھے پھر فاتحہ تو بھی سجدہ سہو واجب نہیں ہوگا۔

لمافی الخلاصة(۱/۱۷۷): وفی الفتاوی لو قرأ الفاتحة او آیة من القرآن فی القعدة اوفی الرکوع اوفی السجود او قرأ التشهد فی الرکوع اوفی السجود علیه السهو، ولو قرأ التشهد فی القیام قبل ان یشرع فی القرآءة عامداً او ناسیاً فلا سهو علیه.

لمافی الهندیة(۱/۱۲۷): واذا قرأ الفاتحة مکان التشهد فعلیه السهو وکذالک اذا قرء الفاتحة ثم التشهد کان علیه السهو کذا روی عن ابی حنیفة رحمة الله تعالیٰ علیه فی الواقعات الناطفیة وذکر هناک اذا بدأ فی موضع التشهد بالقرآءة ثم تشهد فعلیه السهو ولو بدأ بالتشهد ثم بالقرآءة فلا

سھو علیه.

(۲۸۶) سبحان ربی العظیم کی جگہ سبحان ربی الاعلی پڑھ لیا تو سجدہ سہو کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے نماز میں سبحان ربی العظیم کی جگہ سبحان ربی الاعلیٰ پڑھ لیا تو اس شخص پر سجدۂ سہو لازم ہوگا یا نہیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... مذکورہ صورت سجدہ سہو لازم نہیں۔

لمافی التاتارخانية(۱/۵۱۷): واما الاذکار کل ذکر لم یقصد لنفسه ...... لا یلزمه السهو...... و کتسبیحات الرکوع والسجود.

وفی الشامية (۲/۸۰): قوله بترک واجب) .... واحترز بالواجب عن السنة، کاالثناء والتعوذ ونحوهما.

(۲۸۷) قعدہ اولی نہ کرنے کا حکم

سوال...... جناب حضرت مفتی صاحب ایک مسئلہ پوچھنا ہے کہ اگر چار رکعات والی سنتوں میں یا وتر میں کوئی قعدہ اولی بھول جائے تو سجدہ سہو کرنے سے نماز ہو جائیگی؟ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ سنتوں اور وتر میں قعدہ اولی فرض ہے لہٰذا بھول جانے پر سجدہ سہو کافی نہیں، نماز نہیں ہوگی اعادہ واجب ہوگا۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... چار رکعات والی سنتوں اور وتر میں قعدہ اولی واجب ہے نہ کہ فرض، لہٰذا اگر کسی سے قعدۂ اولی رہ گیا تو سجدہ سہو کر لینے سے نماز ہو جائیگی اعادہ واجب نہ ہوگا۔

لمافی الدرالمختار(۱/۴۶۵): (والقعودالاول) ولوفی النفل فی الاصح وکذاترک الزیادة فیه علی التشهد.

(۲۸۸) غلطی سے قاعدہ اولی میں سلام پھیرنے کا حکم

سوال...... ایک شخص نماز پڑھ رہا تھا چار رکعات کی نیت باندھ لی تھی لیکن بھولے سے قعدہ اولی میں سلام پھیر دیا جب یاد آیا کہ یہ میری دوسری رکعت ہے تو فوراً کھڑا ہوگیا اور باقی نماز پڑھ لی اور آخر میں سجدہ سہو بھی کر لیا آیا اس شخص کی نماز ہوگئی؟ نیز اگر مسبوق سے امام کے ساتھ یا امام کے فارغ ہونے کے بعد کوئی واجب رہ جائے تو اسپر سجدہ سہو واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں جب بھولے سے سلام پھیر لیا اور قبلہ کی طرف سینہ پھیرنے اور کسی مفسد صلاۃ کے ارتکاب

سے پہلے بقیہ رکعات پڑھ کر سجدہ سہو کرلیا تو نماز ہوگئی، نیز مسبوق اگر امام کے سلام پھیرنے سے پہلے کوئی واجب چھوڑ دے تو اس پر سجدہ سہو لازم نہیں ہوتا البتہ اگر امام کے سلام پھیرنے کے بعد کوئی واجب رہ جائے تو اس پر سجدہ سہو واجب ہوگا۔

لمافی الشامية(۲/ ۹۲): در: ويسجدللسهوولومع سلامه ناوياللقطع لان نية تغير المشروع لغو ...... مالم يتحول عن القبلةاويتكلم...... سلم مصلى الظهرمثلاعلى راس الركعتين توهما اتمها اربعا وسجد للسهولان ساهيالايبطل لانه دعاء من وجه بخلاف مالوسلم على ظن.

وفى الشامية تحته: قوله لانه دعاء من وجه اى فلذاخالف الامام ......

وفى الشامية (۱/ ۵۹٦): قوله حتى يثنى، تفريع على قوله منفردفيمايقضيه بعدفراغ امامه ...... ويلزمه السجودداذاسهافيمايقضيه.

(۲۸۹) قعدۂ اولیٰ سہواً چھوٹ جانے کے بعد قیام سے دوبارہ واپس آنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کل ظہر کی پہلی چار سنتیں جماعت سے پہلے نہیں پڑھ سکا اور بعد میں چار سنتیں پڑھ رہا تھا۔ تو دوسری رکعت میں التحیات میں بیٹھنا بھول گیا اور سیدھا کھڑا ہوگیا ابھی تک سورۃ فاتحہ شروع نہیں کی تھی کہ مجھے یاد آ گیا کہ میں التحیات پر بیٹھنا بھول گیا ہوں، تو میں فوراً التحیات میں بیٹھ گیا۔ پھر تیسری اور چوتھی رکعت پوری کی اور آخر میں سجدۂ سہو کیا۔ کیا اس طرح میری نماز درست ہوگئی ہے۔ یا سجدہ سہو کرنے کی ضرورت نہیں تھی؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں آپ کی نماز ہوگئی اور آپ نے جو سجدہ سہو کیا ہے وہ بھی ٹھیک ہے۔ البتہ زیادہ بہتر یہ تھا کہ آپ نہ بیٹھتے اور آخر میں سجدۂ سہو کر کے اپنی نماز کو مکمل کرتے۔

لمافى الفتاوىٰ التاتارخانية(۱/ ۷۳۸): وفى الفتاوى العتابية وان كان فى التطوع قال بعضهم يعود مالم يقيد بالسجدة والصحيح انه لا يعود.

وفى الطحطاوى على الدر(۱/ ۳۱۲): (قوله واماالنفل) ولو الرباعية المؤكدة نهر (قوله فيعود) لان كل شفع صلاة على حدة فى حق القراء ة فأمر نابالعود الى القعدة احتياطا ومتى عادتبين ان القعدة وقعت فرضا فيكون رفض الفرض لمكان الفرض فيجوز وقيل لا يعود لانه صار كاالفرض حلبى عن البحر.

وتحت (قوله ويسجد لتاخير الواجب) الاولى ان يقول لتاخير الفرض وهو القيام اويقول لترك الواجب وهو القعود.

وفى الدر المختار(۲/ ۸۴): (وإلا) أى وإن استقام قائما (لا) يعود لاشتغاله بفرض القيام (وسجد

للسهو) لترك الواجب (فلو عاد إلى القعود) بعد ذلك (تفسد صلاته) لرفض الفرض لما ليس بفرض وصححه الزيلعي (وقيل لا) تفسد لكنه يكون مسيئا ويسجد لتأخير الواجب (وهو الأشبه) كما حققه الكمال وهو الحق بحر الخ.

وفي الشامية تحته: (قوله بعد ذلك) اى بعد ما استقام قائما ...... (قوله لكنه يكون مسيئا) أى ويأثم.

(۲۹۰) دونوں طرف سلام پھیر کر سجدۂ سہو کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سجدہ سہو کیلئے منفرد کو دونوں طرف سلام پھیر کر سجدہ سہو کرنا چاہئے یا ایک طرف بھی سلام پھیرنا کافی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... منفرد کو سجدۂ سہو میں ایک طرف سلام پھیر کر سجدۂ سہو کرنا چاہئے البتہ اگر دونوں طرف سلام پھیر کر سجدۂ سہو کرلیا تو بھی نماز ہو جائے گی۔

لمافي الشامية (۲/۷۸): والذى ينبغي الاعتماد عليه تصحيح المجتبى أنه يسلم عن يمينه فقط......

...... ويؤيده ماوجهوا به القول الواحدة من أن السلام الأول لشيئين: للتحليل وللتحية والسلام الثانى للتحية فقط اى تحية بقية القوم لأن التحليل لا يتكرر، وهنا سقط معنى التحية عن السلام لأنه يقطع الإحرام فكان ضم الثانى إليه عبثا ولو فعله فاعل لقطع الإحرام.

(۲۹۱) سجدہ سہو کرنا بھول کر دونوں طرف سلام پھیر دینے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ایک شخص نے نماز میں غلطی کی اور سجدہ سہو کرنا تھا مگر بھول کر سلام پھیر دیا اب اسے پوری نماز دھرانی پڑے گی یا کوئی اور طریقہ ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر کسی وجہ سے سجدہ سہو کرنا تھا لیکن یاد نہ رہا اور بھول کر سلام پھیر دیا تو اس صورت میں اگر نمازی نے کوئی منافی صلاۃ عمل نہ کیا ہو، مثلاً اپنی جگہ سے ابھی اٹھا نہیں اور نہ ہی قبلہ سے رُخ پھیرا ہو کہ اس کو یاد آ گیا تو فوراً سجدہ سہو کر کے نماز پوری کرلے اور اگر کوئی عمل منافی صلاۃ کیا ہو تو اس صورت میں سجدۂ سہو چھوڑ دینے کی وجہ سے نماز واجب الاعادہ ہوگی۔

لمافي فتاوىٰ التاتارخانية (۱/۷۳۲): واذا سلم يريد به قطع الصلوة وعليه سجود السهو فعليه أن يسجد للسهو ...... فقد شرط لاداء سجدتى السهو شرطاً زائداً وهو أن لا يتكلم ولا يقوم عن محله ذالك، فهذا اشارة الى أنه متى قام عن محله واستدبر القبلة أنه لا يأتى بسجدتى السهو وان كان لم يخرج عن المسجد بعد.

وفی الدر المختار (۱/۴۵۶): (ولها واجبات) لاتفسد بترکها وتعاد وجوبا فی العمد و السهو إن لم یسجدله.

(۲۹۲) سجدۂ سہو بھول کر سلام پھیرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پچھلے ہفتے میں کسی کام کے سلسلے میں صدر گیا ہوا تھا اور وہاں عشاء کی اذان ہوگئی تو میں نے اپنے کام کو مؤخر کیا اور مسجد میں عشاء کی نماز پڑھنے گیا۔ جماعت سے نماز پڑھنے کے بعد وتر کی نماز میں دعا قنوت پڑھنا بھول گیا اور رکوع میں چلا گیا۔ کیونکہ مجھے مسئلہ معلوم تھا کہ اب رکوع سے نہیں اٹھنا چاہیے بلکہ آخر میں سجدہ سہو کر لینا چاہیے۔لیکن آخری قعدہ میں بھی سجدہ سہو کیے بغیر ہی بھول کر سلام پھیر دیا۔ جب سلام پھیرا تو مجھے یاد آیا کہ مجھ پر سجدہ سہو کرنا ضروری تھا اور میں نے سجدۂ سہو نہیں کیا۔ اس لئے میں نے دوبارہ وتر ادا کئے۔ کیا اگر سجدۂ سہو واجب ہو، اور آدمی سجدہ سہو کرنا بھول جائے تو نماز نئے سرے سے پڑھنا ضروری ہے یا اس وقت صرف سجدۂ سہو کرلیں تو کیا نماز درست ہو جاتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... دعائے قنوت پڑھنا واجب ہے، نہ پڑھنے کی صورت میں سجدۂ سہو لازم ہوگا۔ تاہم اگر کوئی شخص سجدۂ سہو بھول جائے اور نماز ختم کرنے کی نیت سے سلام پھیر دے۔ تو اس صورت میں اگر قبلہ سے انحراف نہ پایا گیا ہو، اور بات چیت نہ کی ہو تو ترکِ واجب کے یاد آنے پر سجدۂ سہو کر لینے سے اس کی نماز بغیر نقصان کے درست ہو جائے گی۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر سلام پھیرنے کے بعد سجدۂ سہو کر لیتے تو آپ کی نماز بغیر نقصان کے ٹھیک ہو جاتی اور دوبارہ پڑھنے کی حاجت نہ ہوتی۔

لما فی فتاویٰ التاتارخانیة (۱/۷۳۲): واذا سلم یرید به قطع الصلوة وعلیه سجود السهو فعلیه أن یسجد للسهو ...... فقد شرط لاداء سجدتی السهو شرطاً زائداً وهو أن لا یتکلم ولا یقوم عن محله ذالک، فهذا اشارة الی أنه متی قام عن محله واستدبر القبلة أنه لا یأتی بسجدتی السهو وان کان لم یخرج عن المسجد بعد.

وفی الشامیة (۲/۹۱): قال فی الدر: (ویسجد للسهو ولو مع سلامه) ناویاً (للقطع) لأن نیة تغییر المشروع لغو، (مالم یتحول عن القبلة او یتکلم) لبطلان التحریمة.

قال فی الشامیة: قید بالسهو لأنه لو سلم ذاکراً أن علیه سجدة تلاوة او قراء ة التشهد الأخیر سقطت عنه، لأن سلامه عمد فیخرجه من الصلاة ولا تفسد صلاته لأنه لم یبق علیه رکن من أرکان الصلوة بل تکون ناقصة لترک الواجب ......

(قوله لبطلان التحریمة) ای بالتحول أو التکلم، وقیل لا یقطع بالتحول مالم یتکلم أو یخرج من المسجد کما فی الدرر عن النهایة.

(۲۹۳) سورۂ فاتحہ کے بعد سورت کی جگہ دوبارہ سورۃ فاتحہ پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نماز کے اندر سورۂ فاتحہ کے بعد سورت کی جگہ پر بھی فاتحہ کو پڑھتا ہے تو اس شخص کی نماز کا کیا حکم ہے نماز ہو جائے گی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......فرض کی آخری دو رکعتوں کے علاوہ چاہے فرض ہو یا واجب سنت ہو یا نفل ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ کوئی سورت، تین چھوٹی آیتیں یا ایک بڑی آیت ملانا واجب ہے۔

صورت مسئولہ میں دوبارہ فاتحہ پڑھنے سے واجب ادا نہ ہوا۔ پس اگر یہ فعل سہواً صادر ہوا ہو، تو سجدہ سہو کرنے سے نماز صحیح ہو جائے گی۔ اور اگر قصداً کیا ہے تو نماز کا اعادہ کرنا لازم ہوگا۔

لمافی القدوری (باب النوافل) (صـ۲۶): القراءة واجبة فی الرکعتین الاولیین وهو مخیر فی الاخریین ان شاء قرأ الفاتحة، وان شاء سکت وان شاء سبح والقراءة واجبة فی جمیع رکعات النفل وجمیع الوتر.

وفی الطحطاوی علی الدر (۱/۲۵۸): (قوله کذا ترک تکریرها) فلو قرأ الفاتحة مرتین قبل السورة وجب سجود السهو لتاخیر السورة.

وفی الشامیة(۱/۴۵۶): (قوله وتعاد وجوباً) ای بترک هذه الواجبات او واحد منها وما فی الزیلعی والدرر والمجتبی من انه لو ترک الفاتحة یؤمر بالاعادة لالو ترک السورة رده فی البحر بان الفاتحة وان کانت آکد فی الوجوب للاختلاف فی رکنیتها دون السورة لکن وجوب الاعادة حکم ترک الواجب مطلقا لا الواجب المؤکد وانما تظهر الآکدية فی الاثم لانه مقول بالتشکیک.

(۲۹۴) سجدہ سہو ادا کرنے کے بعد قیام کی طرف لوٹنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے نماز کے دوران سہو ہونے کی وجہ سے سجدہ سہو کیا اس کے بعد نماز کو پورا کرنے کے بجائے کھڑے ہو کر سورہ فاتحہ پڑھنے لگا پھر سورہ فاتحہ پڑھتے وقت یاد آ جائے تو اس کو کیا کرنا چاہیے؟ از روئے شرع اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں یہ شخص سجدہ سہو کرنے کے بعد نماز کو مکمل کرنے کے بجائے کھڑا ہو گیا اب یہ شخص قعدہ کی طرف واپس لوٹ آئے اور سلام پھیر کر نماز کو ختم کرے۔

لمافی الهندية(۱/۱۲۶): قال فی الفتاوی القعدة بعد سجدتی السهو لیست برکن وإنما أمر بها بعد

سجدتي السهو ليقع ختم الصلاة بها حتى لو تركها فقام وذهب لاتفسد صلاته كذا قاله الحلواني كذا في السراج الوهاج.

وفي الدر المختار (۲/۸۵): (ولو سها عن القعود الأخير) كله أو بعضه، (عاد) ويكفي كون كلا الجلستين قدر التشهد، (مالم يقيدها بسجدة) لأن مادون الركعة محل الرفض وسجد للسهو لتأخير القعود،

وفي الشامية تحته: (قوله ولو سها عن القعود الأخير) اراد به القعود المفروض او ماكان آخر الصلاة فيشمل نحو الفجر،

وفي الهندية(۱/۱۳۰): السهو في سجود السهو لا يوجب السهو لانه لايتناهى كذافي التهذيب.......... ولو سها في صلاته مرارا يكفيه سجدتان كذا في الخلاصة.

(۲۹۵) امام کا بھول کر سری نماز میں جہراً تلاوت کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ الحمدللہ میں نے قرآن مجید حفظ کیا ہے اور تجوید بھی کی ہے اور میرا ارادہ تھا کہ عالم بھی بنوں گا لیکن گھر کے حالات کچھ ایسے تھے کہ میں عالم نہیں بن سکا اب ایک مسجد میں امامت کراتا ہوں کل عصر کی نماز کے وقت جب میں امامت کرا رہا تھا تو بھول کر سورۃ فاتحہ زور سے پڑھنا شروع کردی جب اهدنا الصراط تک پہنچا تو پیچھے سے کسی نے لقمہ دیا (سبحان اللہ) تو مجھے یاد آیا کہ میں تو عصر کی نماز پڑھا رہا ہوں اور اس میں قرأت آہستہ کرنی ہوتی ہے اور میں نے زور سے پڑھا ہے تو میں فوراً خاموش ہوگیا اور باقی سورۃ فاتحہ اور دوسری سورت دل میں ہی پڑھی ہے۔ کیا اس طرح نماز درست ہوگئی ہے۔ یا پھر سجدہ سہو کرنا ضروری تھا۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... امام کیلئے جہری نمازوں میں جہراً اور سری نمازوں میں سراً قرأت کرنا واجب ہے۔ اگر امام بھول کر کسی سری نماز میں جہراً قرأت شروع کردے تو اگر ایک طویل آیت یا تین چھوٹی آیتوں کے بقدر تلاوت کردی تو ترک واجب کی بناء پر سجدہ سہو واجب ہوگا۔ اب اگر امام سجدہ سہو کرلیتا ہے تو نماز بلا کراہت درست ہوجائے گی اور اگر سجدہ سہو نہیں کیا تو ترک واجب کی بناء پر نماز مکروہ ہوگی اور نماز کا اعادہ واجب ہوگا۔

صورت مسئولہ میں آپ پر سجدہ سہو واجب تھا اگر آپ نے بغیر سجدہ سہو کئے سلام پھیر دیا تو اگرچہ فرضیت ادا ہوگئی مگر واجب ترک کرنے کی وجہ سے نماز مکروہ ہوگئی جس کا اعادہ آپ پر اور مقتدیوں پر واجب ہے۔ اعادہ نہ کرنے کی صورت میں گناہ گار ہوں گے۔

لمافي الهندية(۱/۱۲۸): (ومنها الجهر و الإخفاء) حتى لو جهر فيما يخافت أو خافت فيما يجهر وجب عليه سجود السهو واختلفوا في مقدار ما يجب به السهو منهما قيل يعتبر في الفصلين بقدر ما

تجوز به الصلاة وهو الأصح ولا فرق بين الفاتحة وغيرها.

وفي الدر المختار (۸۱/۲): (والجهر فيما يخافت فيه)...... (وعكسه)...... والأصح تقديره (بقدر ما تجوز به الصلاة في الفصلين. وقيل) قائله قاضيخان يجب السهو (بهما) أي باالجهر والمخافتة (مطلقا) أي قل أو كثر (وهو ظاهر الرواية)

وفي الشامية تحته: (قوله والأصح الخ) صححه في الهداية والفتح والتبيين والمنية لأن اليسير من الجهر والإخفاء لايمكن الإحتراز عنه وعن الكثير يمكن وما تصح به الصلاة كثير غير أن ذالک عنده آية واحدة وعندهما ثلث آيات هداية.

وفي الدرالمختار (۴۵۶،۴۵۷/۱): (ولها واجبات) لاتفسد بتركها وتعاد وجوباً في العمد والسهو ان لم يسجد له، وإن لم يعدها يكون فاسقاً آثماً، وكذا كل صلاة أديت مع كراهة التحريم تجب اعادتها.

وفي الشامية تحته: (قوله وتعاد وجوباً) أي بترک هذه الواجبات أو واحدمنها..............

(قوله إن لم يسجد له) أي للسهو، وهذا قيد لقوله والسهو، إذ لا سجود في العمد...... وهل تجب الاعادة بترک سجود السهو لعذر كما لو نسيه أو طلعت الشمس في الفجر؟ لم أره فليراجع والذي يظهر الوجوب كماهو مقتضىٰ اطلاق الشارح، لأن النقصان لم ينجبر بجابر، وإن لم يأثم بتركه فليتأمل.

وفي (صـ۴۵۷)وأن النقص إذا دخل في صلاة الإمام ولم يجبر وجبت الإعادة على المقتدي أيضاً.

(۲۹۶) فرض کے چھوٹ جانے کی کمی کو سجدۂ سہو سے پورا کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ گزشتہ رات ہماری بستی کے امام صاحب عشاء کی نماز میں چوتھی رکعت میں بیٹھنا بھول گئے۔ یعنی التحیات نہیں پڑھی اور کھڑے ہوگئے۔ پیچھے سے ایک مقتدی نے لقمہ بھی دیا لیکن امام صاحب نے پانچویں رکعت پوری کی پھر چھٹی رکعت پوری کر کے سجدہ سہو کیا اور سلام پھیر دیا۔ ان کے سلام پھیرنے کے بعد کچھ لوگ کہنے لگے کہ اس طرح نماز نہیں ہوئی لیکن امام صاحب کہتے ہیں کہ میں بھول گیا اور جب کوئی بھول ہوجائے تو سجدہ سہو کرتے ہیں اور میں نے سجدہ سہو بھی کیا ہے، لہٰذا نماز درست ہے بلکہ چار رکعت فرض نماز ہوگئی اور دو رکعت نفل ہوگئی۔ آپ حضرات سے پوچھنا یہ ہے کہ کیا امام صاحب کی بات درست ہے اور سجدہ سہو کرنے سے نماز ہوگئی ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......نماز میں واجب کے چھوٹ جانے سے سجدہ سہو کرنے سے اس کی کمی پوری ہوجاتی ہے۔ اور فرض کے چھوٹ

جانے سے سجدہ سہو کرنے سے اس کی کمی پوری نہیں ہوتی ہے، بلکہ دوبارہ اس نماز کا اعادہ ضروری ہوتا ہے۔
چونکہ نماز میں قعدہ اخیرہ فرض ہے، اور امام صاحب نے قعدہ اخیرہ نہیں کیا، بلکہ پانچویں رکعت کیلئے کھڑے ہوگئے تو فرض کے چھوٹ جانے سے نماز کا دوبارہ اعادہ کرنا پڑے گا، سجدہ سہو کرنے سے یہ نماز نہیں ہوئی، باقی امام صاحب کا یہ کہنا کہ ''بھول سے سجدہ سہو کرتے ہیں، اس لئے میں نے کیا'' یہ بات درست نہیں بلکہ سجدہ سہو اس وقت واجب ہوتا ہے جب کوئی واجب چھوٹ جائے یا فرض اور واجب میں تاخیر ہو جائے۔ لہٰذا امام سمیت سب مقتدیوں پر اس نماز کا اعادہ لازمی ہے۔

وفي الدرالمختار (۲/۸۵ تا ۸۸): (ولو سها عن القعود الأخير) كله أو بعضه (عاد) ويكفي كون كلا الجلستين قدر التشهد (مالم يقيدها بسجدة) لان مادون الركعة محل الرفض وسجد للسهو لتأخير القعود، (وإن قيدها) بسجدة عامدا أو ناسيا أو ساهيا او مخطئا (تحول فرضه نفلاً برفعه) الجبهة عند محمد، وبه يفتى، لأن تمام الشئ بآخره، فلو سبقه الحدث قبل رفعه توضأ وبنى خلافاً لأبي يوسفؒ، حتى قال: زه صلاة فسدت أصلحها الحدث والعبرة للإمام، حتى لو عاد ولم يعلم به القوم حتى سجدوا لم تفسد صلاتهم مالم يتعمدوا السجود. وفيه يلغز: أىّ مصلّ ترك القعود الأخير وقيد الخامسة بسجدة ولم يبطل فرضه، (وضم سادسة) ولو في العصر والفجر (إن شاء) لاختصاص الكراهة والإتمام بالقصد (ولا يسجد للسهو على الأصح) لأن النقصان بالفساد لا ينجبر (وإن قعد في الرابعة) مثلاً قدر التشهد (ثم قام عاد وسلم) ولو سلم قائما صح، ثم الاصح أن القوم ينتظرونه، فإن عاد تبعوه (وإن سجد للخامسة سلموا) لأنه تم فرضه، إذ لم يبق عليه إلا السلام (وضم إليها سادسة) لو في العصر، وخامسة في المغرب: ورابعة في الفجر، به يفتى (لتصير الركعتان له نفلا) والضم هنا آكد، ولا عهدة لوقطع، ولا بأس بإتمامه في وقت كراهة على المعتمد (وسجد للسهو) في الصورتين لنقصان فرضه بتاخير السلام في الأولى وتركه في الثانية.

(۲۹۷) مقتدی سے سہو کی صورت میں سجدۂ سہو کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ہم امام کے ساتھ نماز پڑھ رہے ہوں اور کوئی غلطی ہو جائے تو سجدہ سہو کرنا چاہیئے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر آپ امام کے ساتھ نماز پڑھ رہے ہیں اور آپ سے کوئی سہو یا غلطی ہو جائے تو آپ سجدہ سہو نہیں کریں گے۔

وفي الهندية (۱/۱۲۸): سهو المؤتم لايوجب السجدة.

(۲۹۸) سجدۂ سہو میں تکرار نہیں

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سجدہ سہو کے بعد اگر دوبارہ غلطی کی تو دوبارہ سجدۂ سہو لازم ہوگا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورتِ مسئولہ میں جبکہ نمازی ایک مرتبہ غلطی کرنے پر سجدۂ سہو کر چکا ہو، تو دوسری بار غلطی کرنے پر دوبارہ سجدۂ سہو واجب نہیں ہوگا۔ کیونکہ سہو کے دو سجدے تمام غلطیوں کا ازالہ کر دیتے ہیں اور سجدۂ سہو میں تکرار نہیں ہے۔

وفی التجنیس (۱۴۸/۲): قال الشیخ الامام شمس الأئمة الحلوانی، القعدة بعد سجدتی السهو لیس برکن، وانما امرنا بها بعد سجود السهو لیقع ختم الصلوة بها. فیوافق ذالک موضع الصلوة ونظمها، فأما أن یکون رکناً فلا، حتی لو ترکها، بان سجد سجدتین، بعد السلام ثم قام وذهب لم تفسد صلوته ...... ولو سجد قبل السلام لا یعید، لانه مجتهد فیه، فاذا اداه، وقع جائزا وهذا لأنه لوأعاده یؤدی إلی تکرار سجود السهو ولم یقل به احد.

وفی الطحطاوی علی الدر (۳۱۰/۱): لو سجد قبل السلام لایعیده،لأنه لو أعاده یتکرر وهو خلاف الاجماع.

وفی الهندیة (۱۳۰/۱): السهو فی سجود السهو لایوجب السهو لأنه لا یتناهی کذا فی التهذیب.

(۲۹۹) سجدہ تلاوت کے وجوب سے لاعلمی کی بناء پر سجدہ تلاوت نہ کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے بچپن میں ایک حافظ صاحب سے قرآن پڑھا تھا تقریباً اس وقت میری عمر دس پندرہ سال تھی اب میں چالیس سال کے قریب ہوں مسئلہ یہ پیش آیا کہ میں نے سجدہ تلاوت کو کبھی بھی ادا نہیں کیا کیونکہ مجھے پتہ بھی نہ تھا کہ اس طرح سجدہ تلاوت واجب ہوتا ہے اب چار ماہ لگائے تو پتہ چلا کہ سجدہ واجب ہوتا ہے میں بہت پریشان ہوں کہ پچیس سال میں نہ جانے کتنے سجدے چھوڑے اور نماز میں بھی سورۂ علق پڑھتا تھا کیونکہ مجھے میرے استاد نے بتایا تھا کہ یہ قرآن کی سب سے پہلے نازل ہونے والی سورت ہے مجھے بہت پسند ہے، اب ان نمازوں کی بھی تعداد یاد نہیں۔ برائے مہربانی آپ حضرات علماء ہیں رہنمائی فرمائیں کہ ان سجدوں اور نمازوں کا میں کیا کروں کوئی تاوان ہے یا قضاء ہے اگر قضاء ہے تو نمازوں کا کیا حکم ہے ان کی بھی قضاء ضروری ہے یا فقط ان سجدوں کی قضاء کافی ہے۔ جو نماز میں نہیں کئے گئے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... قرآن کریم میں چودہ مقامات ایسے ہیں جن کے تلاوت کرنے سے یا سننے سے سجدۂ تلاوت واجب ہو جاتا ہے۔ اب آیت سجدہ تلاوت کرنے والا یا سننے والا، نماز میں ہوگا یا غیر نماز میں۔ اگر نماز میں ہو تو مقتدی ہوگا یا منفرد اگر مقتدی ہو تو اپنے امام سے

آیت سجدہ سننے سے، سجدہ کرنے میں امام کا تابع ہوگا اگر کسی اور شخص سے سنے جو اس نماز میں شریک نہ ہو تو نماز کے بعد اس پر سجدہ کرنا واجب ہوگا۔ اور اگر منفرد ہو تو آیت سجدہ کے تلاوت کرنے سے نماز میں سجدہ تلاوت کرنا واجب ہوگا۔ البتہ اگر نماز میں کسی وجہ سے سجدہ نہیں کیا تو نماز کے بعد اس کو ادا نہیں کیا جائے گا بلکہ ساقط ہو جائے گا (البتہ ترکِ واجب کا گناہ ہوگا)۔ جبکہ حالتِ نماز کے علاوہ آیت سجدہ خود پڑھنے یا دوسرے سے سننے پر سجدہ تلاوت واجب ہو جاتا ہے جو ادا کئے بغیر ساقط نہیں ہوتا۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں جو نمازیں آپ نے پڑھی ہیں اور ان میں سورۃ علق تلاوت کی ہے اور نماز میں سجدہ تلاوت ادا نہیں کیا ہے تو نمازیں درست ہیں ان کا اعادہ نہیں ہے اور سجدے بھی ساقط ہو گئے ہیں البتہ واجب کے چھوڑنے کی وجہ سے گناہ ہوگا جس سے توبہ واستغفار ضروری ہے۔ جبکہ نماز کے علاوہ جتنے سجدے آپ پر، آیت سجدہ خود پڑھنے سے یا دوسروں سے سننے سے واجب ہوئے ہیں ان کا ادا کرنا ضروری ہے۔ لہٰذا بلوغت سے اب تک کا حساب لگا کر تمام سجدے اسی حساب سے ادا کئے جائیں۔

لمافی الجوهرة النيرة (۱/۱۱۱): وفی رواية النوادر: ماوجب خارج الصلوة لا يسقط.

وفی الهندية (۱/۱۳۲): والسجدة واجبة فی هذه المواضع علی التالی والسامع سواء قصد سماع القران اولم يقصد كذا فی الهداية (وفی صـ۱۳۳) ولو قرأ بالعربية يلزمه مطلقا لكن يعذر بالتاخير مالم يعلم.............. ولو سمعها من الامام اجنبی ليس معهم فی الصلاة ولم يدخل معهم فی الصلاة لزمه السجود كذا فی الجوهرة النيرة وهو الصحيح كذا فی الهداية سمع من امام فدخل معه قبل ان يسجد سجد معه وان دخل فی صلاة الامام بعد ما سجدها الامام لا يسجد ها.............. ولو سمع المصلی من اجنبی يسجد بعد الفراغ. (وفی صـ ۱۳۴) و السجدة التی وجبت فی الصلاة لا تؤدی خارج الصلاة كذا فی السراجية وهكذا فی الكافی. (وفی صـ ۱۳۵) وفی الغياثية واداؤها ليس علی الفور حتی لو ادّاها فی ایّ وقت كان يكون مؤديا لاقاضيا كذا فی التتارخانية.

وفی الدر المختار مع الشامية(۲/۱۰۹): (وهی علی التراخی) علی المختار ويكره تاخيرها تنزيها، ويكفيه ان يسجد عدد ما عليه بلا تعيين و يكون مؤديا.

وفی الشامية تحته: (قوله علی المختار) كذا فی النهر: وينبغی ان يكون محل الخلاف فی الاثم وعدمه حتی لو اداها بعد مرة كان مؤديا اتفاقا لاقاضيا اهـ...... (قوله تنزيها) لانه بطول الزمان قدينساها، ولو كانت الكراهة تحريمية لو جبت علی الفور وليس كذلک ولذا كره تحريما تاخير الصلاتية عن وقت القراءة امداد واستثنی من كراهة التاخير ما اذا كان الوقت مكروها كوقت الطلوع.

(۳۰۰) آیت سجدہ سننے والوں کو اگر علم ہو کہ آیتِ سجدہ تلاوت کی گئی ہے تو سجدہ کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جب رمضان قریب آتا ہے حفاظ دو دو ہو کر ایک دوسرے کا قرآن دن کو سنتے ہیں ہم بھی ساتھ بیٹھتے ہیں کبھی کبھی وہ سجدہ کرتے ہیں ہمیں تو کچھ پتہ نہیں لگتا تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے میں نے ایک حافظ صاحب سے پوچھا اس نے کہا قرآن میں چودہ سجدے ہیں پڑھنے اور سننے والے پر جب بھی پڑھے یا سنے واجب ہے کہ سجدہ کرے۔اب سوال یہ ہے کہ ہمیں تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ آیت سجدہ ہے یا نہیں پھر ہمارے لئے آگے دو حالتیں ہوتی ہیں کبھی تو پڑھنے والا سجدہ کرتا ہے ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ آیت سجدہ تھی۔لیکن کبھی پڑھنے والا ہمیں نظر ہی نہیں آتا اور وہ آیت سجدہ پڑھ رہا ہوتا ہے ہم گزر جاتے ہیں آیت سن لیتے ہیں۔مگر خبر نہیں ہوتی کہ آیت سجدہ تھی۔کیا دونوں حالتوں میں سجدہ واجب ہوگا اور ترک پر گناہ ہوگا یا کچھ فرق ہوگا؟ تفصیل سے آسان اور واضح الفاظ میں جواب عنایت فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔اللہ آپ کو دنیا وآخرت میں اجرِ عظیم عطا فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... سجدے کے وجوب کا تعلق نفسِ سماع سے ہے چاہے سننے کا ارادہ ہو یا نہ ہو۔البتہ جو شخص ان مقاماتِ سجدہ سے ناواقف ہو تو اس پر سجدہ تلاوت واجب ہونے کیلئے شرط یہ ہے کہ اسے معلوم بھی ہو جائے کہ آیت سجدہ کی تلاوت کی گئی ہے، اور معلوم نہ ہونے کی صورت میں ترکِ واجب کا گناہ بھی نہ ہوگا۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں آپ کو جب اس بات کا علم ہو جائے کہ آیت سجدہ تلاوت کی گئی ہے تو آپ پر سجدہ کرنا واجب ہے، اور اگر آپ کو علم نہ ہو سکا تو سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے آپ پر کوئی گناہ نہ ہوگا، یہاں تک کہ اس کا علم ہو جائے لیکن جس شخص نے آیت سجدہ کی تلاوت کی ہے اس کی ذمہ لازم ہے کہ یا تو آیت سجدہ کے مقام پر اپنی آواز کو پست رکھے تا کہ زیادہ لوگ مشقت میں نہ پڑیں یا پھر تلاوت کے بعد سامعین کو اس سے باخبر کر دے کہ آیت سجدہ تلاوت کی گئی ہے۔

لما فی الخانیة(۱/۴۲): اما السامع إن علم انها آية السجدة يلزمه السجدة والا فلا الخ.

وفی الهندية(۱/۱۳۳): اذا قرأ آية السجدة بالفارسية فعليه وعلى من سمعها السجدة فهم السامع أولا اذا أخبر السامع انه قرأ آية السجدة وعندهما ان كان السامع يعلم أنه يقرأ القرآن يلزمه والا فلا ...... ولو قرأ بالعربية يلزمه مطلقاً لكن يعذر بالتاخير مالم يعلم الخ.

وفی الدر مع الشامية(۲/۱۰۵): فی الدر: والسماع شرط فی حق غير التالی ولو بالفارسية اذا اخبر الخ.

وفی الشامية تحته: (قوله اذا أخبر) ای بأنها آية سجدة سواء فهمها او لا وهذا عند الإمام، و عندهما ان علم السامع أنه يقرأ القرآن لزمته والا فلا بحر، وفی الفيض وبه يفتی، وفی النهر عن السراج أن

الامام رجع الی قولهما وعليه الاعتماد...... أمّا لو كانت بالعربية فانه يجب بالاتفاق فهم أو لا لكن لا يجب على الأعجمي مالم يعلم كمافي الفتح أي وان لم يفهم الخ.

وفيه ايضاً(۲/۱۱۸): واستحسن اخفاؤها عن سامع غير متهيئ للسجود الخ.

وفي الشامية تحته: (قوله واستحسن اخفاء ها الخ) لأنه لو جهربها لصار موجبا عليهم شيئاً ربما يتكاسلون عن ادائه فيقعون في المعصية فان كانوا متهيئين جهربها بحر عن البدائع قال في المحيط بشرط أن يقع في قلبه أن لا يشق عليهم أداء السجدة فان وقع أخفاها وينبغي أنه اذا لم يعلم بحالهم أن يخفيها نهر.

(۳۰۱) سجدۂ شکر کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں جب بھی وتر سے فارغ ہوتا ہوں یا صلاۃ الضحیٰ سے فارغ ہوتا ہوں تو اس کے بعد سجدۂ شکر ادا کرتا ہوں، میرے ایک دوست نے مجھے کہا کہ اس طرح کرنا صحیح نہیں ہے، تو اب آپ حضرات سے یہ سوال ہے کہ میرا اس طرح کرنا صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......کسی نعمت کے حصول یا مصیبت سے نجات پر سجدۂ شکر کرنا مستحب ہے۔ البتہ کسی بھی نماز کے فوراً بعد سجدۂ شکر کرنے کو فقہاء کرام نے مکروہ لکھا ہے۔ لہٰذا آپ کے دوست کا یہ کہنا کہ ''اس طرح کرنا صحیح نہیں'' درست ہے۔ اس سے اجتناب کیا جائے۔ تاہم دیگر اوقات میں سجدۂ شکر ادا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

لمافي الدر المختار(۲/۱۱۹، ۱۲۰): وسجدة الشكر، مستحبة به يفتى، لكنها تكره بعد الصلاة، لأنّ الجهلة يعتقدونها سنة أو واجبة وكل مباح يؤدي اليه فمكروه.

وفي الشامية تحته: (قوله. وسجدة الشكر)...... وهي لمن تجددت عنده نعمة ظاهرة أو رزقه الله تعالىٰ مالاً أو ولداً أو اندفعت عنه نقمة ونحوذلك، يستحب له أن يسجد لله تعالىٰ شكراً مستقبل القبلة يحمد الله تعالىٰ فيها ويسبحه ثم يكبّر فيرفع رأسه كما في سجدة التلاوة، سراج.

﴿فصل فی المریض والمسافر﴾

(مریض اور مسافر کی نماز کا بیان)

(۳۰۲) زخم سے مسلسل خون نکلنے کی صورت میں نماز کی صورت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کے ایسا زخم ہو جس سے مسلسل خون رستا رہتا ہو تو اب وضو اور نماز کی صورت کیا ہوگی؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر خون اس قدر مسلسل بہتا ہو کہ اس شخص پر ایک نماز کا مکمل وقت اس طرح گزر جائے کہ اس کو وضو سے فراغت کے بعد خون بہنے کی وجہ سے اس قدر موقع نہ ملے کہ وہ نماز کے وقت میں فرض نماز پڑھ سکے تو وہ معذور سمجھا جائے گا، اور اس وقت تک معذور شمار کیا جائے گا جب تک ایک نماز کے مکمل وقت میں ایک دفعہ بھی اس کا عذر پایا جائے۔ ایسی صورت میں وہ ایک نماز کے وقت میں ایک دفعہ وضو کرلے پھر اس وضو سے اس نماز کے وقت کے ختم ہونے تک جس قدر فرائض ونوافل چاہے ادا کرسکتا ہے اور وقت کے ختم ہوتے ہی اس کا وضو ٹوٹ جائے گا دوسری نماز کے لئے دوبارہ وضو کرنا پڑے گا۔ اور اگر خون اس قدر مسلسل نہیں بہتا تو وہ معذور نہیں ہے بلکہ پاکی کی حالت میں نماز کی ادائیگی ضروری ہے۔

لمافی الدر المختار (۳۰۵/۱):(وصاحب عذر من بہ، سلس) بول لا یمکنه امساكه(او استطلاق بطن ......ان استوعب عذره تمام وقت صلاة مفروضة)بان لایجد فی جمیع وقتها زمنا یتوضأ ویصلی فیه خالیا عن الحدث(ولو حکما)لان الانقطاع الیسیر ملحق بالعدم(وهذا شرط)العذر (فی حق الابتداء وفی)حق(البقاء کفی وجوده فی جزء من الوقت)ولو مرة(وفی)حق الزوال یشترط(استیعاب الانقطاع)تمام الوقت (حقیقة)لانه الانقطاع الکامل.

(وحکمه الوضو)لا غسل ثوبه وفی(صـ۳۰۶) ونحوه (لکل فرض)اللام للوقت کمافی لدلوک الشمس ثم یصلی به (فیه فرضا ونفلا)فدخل الواجب بالاولی(فاذا خرج الوقت بطل).

(۳۰۳) زخمی کیلئے لیٹ کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید میرا خالہ زاد بھائی ہے پچھلے ہفتے وہ بذریعہ ٹرین ڈیرہ

غازی خان سے آ رہا تھا راستہ میں ٹرین کے بعض ڈبے پٹری سے اترنے کی وجہ سے زید کی ٹانگ ٹوٹ گئی اب الحمدللہ آپریشن ہوا ہے جو کہ بظاہر کامیاب ہے۔ آپ سے پوچھنا یہ ہے کہ زید کھڑا تو نہیں ہوسکتا لیکن بیٹھنے میں بھی کافی تکلیف ہوتی ہے کیا زید کیلئے ایسی حالت میں لیٹ کر نماز پڑھنا جائز ہے۔ اگر جائز ہے تو کیا نوافل اور سنن بھی لیٹ کر پڑھ سکتے ہیں یا صرف فرائض جائز ہے لیٹ کر؟ برائے مہربانی قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں زید اگر سہارا لگا کر بیٹھ سکتا ہو، اگرچہ بیٹھنے میں تھوڑی بہت مشقت ہو، تو اس کے لئے لیٹ کر نماز پڑھنا جائز نہیں۔ اگر زید کو سہارا لگا کر بیٹھنے سے بھی شدید تکلیف ہو یا مرض کے بڑھنے کا خوف ہو، تو اس کے لئے لیٹ کر نماز پڑھنا (سر اور ہاتھوں کے اشارہ سے) جائز ہے۔ خواہ فرض نماز ہو یا سنت یا نفل سب کا حکم یکساں ہے۔

لمافی الهندية (۱/۱۳۶،۱۳۷): اذا عجز المريض عن القيام صلى قاعدا يركع ويسجد وأصح الاقاويل فى تفسير العجز ان يلحقه بالقيام ضرر وعليه الفتوى ...... واذا لم يقدر على القعود مستوياً وقدر متكئا أو مستنداً الى حائط أو انسان يجب أن يصلى متكئا أو مستنداً ولا يجوز له أن يصلى مضطجعاً على المختار .... وان تعذر القعود أو ما بالركوع والسجود مستلقياً على ظهره وجعل رجليه إلى القبلة وينبغي أن يوضع تحت رأسه وسادة حتى يكون شبيه القاعد ليتمكن من الايماء بالركوع والسجود واضطجع على جنبه ووجهه الى القبلة وأومأجاز والاول أولى كذا فى الكافى وان لم يستطع على جنبه الايمن فعلى الايسر كذا فى السراج الوهاج ووجهه الى القبلة.

وفى الدر المختار (۲/۹۵،۹۶،۹۷): (من تعذر عليه القيام) أى كله (لمرض) حقيقى وحده أن يلحقه بالقيام ضرر به يفتى، (قبلها أو فيها) أى الفريضة .... (صلى قاعداً) ولو مستنداً إلى وسادة أو إنسان فإنه يلزمه ذلك على المختار. .... وفى(صـ۹۹): (وإن تعذر القعود) ولو حكماً (أومأ مستلقياً) على ظهره (ورجلاه نحو القبلة).

(۳۰۴) مسلسل قطرات آنے کی صورت میں نماز کیسے پڑھیں؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کو پیشاب کی تکلیف ہے جس کی وجہ سے اسے مسلسل پیشاب کے قطرے آتے رہتے ہیں اور وضو کر کے نماز پڑھنا انتہائی مشکل ہوتا ہے، کیا ایسا شخص نماز پڑھے گا، اگر پڑھے گا تو پڑھنے کی صورت کیا ہوگی؟ قرآن وسنت کی روشنی میں تفصیلاً جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں اگر پیشاب کے قطرات اس قدر مسلسل آتے ہوں کہ اس پر ایک نماز کا مکمل وقت اس طرح گزر جائے کہ اس کو وضو سے فراغت کے بعد قطرات کی وجہ سے اس قدر موقع نہ ملے کہ وہ نماز کے وقت میں فرض نماز پڑھ سکے تو وہ

معذور سمجھا جائے گا، اور اس وقت تک معذور شمار کیا جائے گا جب تک ایک نماز کے مکمل وقت میں ایک دفعہ بھی اس کا عذر پایا جائے۔ ایسی صورت میں وہ ایک نماز کے وقت میں ایک دفعہ وضو کر لے پھر اس وضو سے اس نماز کے وقت کے ختم ہونے تک جس قدر فرائض ونوافل چاہے ادا کر سکتا ہے اور وقت کے ختم ہوتے ہی اس کا وضو ٹوٹ جائے گا دوسری نماز کے لئے دوبارہ وضو کرنا پڑے گا۔ اور قطرات اگر اس قدر مسلسل نہیں آتے تو وہ معذور نہیں ہے بلکہ پاکی کی حالت میں نماز کی ادائیگی ضروری ہے۔

لما فی المصنف لعبدالرزاق (۱/۱۵۱): عبدالرزاق عن معمر عن الزهری عن خارجة بن زيد قال بن زيد حتی سلس منه البول فكان يداويه مااستطاع فاذا غلبه توضأثم صلی.

بقية الدلائل مر سابقاً فی السوال السابق

(۳۰۵) اگر اٹھنے پر قادر نہ ہو تو ایسے شخص پر نماز فرض ہے یا نہیں؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص اتنا زخمی ہو چکا ہو کہ اس کا چار پائی سے اٹھنا بھی مشکل ہو، تو کیا ایسی حالت میں اس پر نماز واجب ہے یا نہیں؟ اور اگر واجب ہو، تو پھر وضو کس طرح کرے حالانکہ اس کا چار پائی سے اُٹھنا بھی مشکل ہے۔

الجواب حامداً ومصلياً...... مریض اگر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے پر قادر نہ ہو تو بیٹھ کر پڑھے گا اور اگر بیٹھ کر پڑھنے پر قادر نہ ہو تو لیٹ کر سر کے اشارے سے نماز پڑھے گا اور اگر اس پر بھی قادر نہ ہو تو نماز کو مؤخر کرے گا صحیح ہونے تک، صحیح ہونے کے بعد اگر پانچ سے کم نمازیں قضا ہوئی ہوں تو ان کی قضا کرنا لازمی ہے اور اگر اس سے زیادہ ہوں تو اس سے قضا ساقط ہوگی لہٰذا صورت مذکورہ میں اگر کھڑے ہونے پر قادر نہیں ہے تو بیٹھ کر پڑھے، اس پر بھی قادر نہیں ہے تو لیٹ کر اشارہ سے پڑھے اور وضو اگر نہ خود کر سکتا ہے نہ ایسا شخص ہے جو اسے وضو کرائے تو تیمم کر کے نماز پڑھے۔ الغرض نماز ایسے شخص پر بھی فرض ہے جو بیٹھ کر یا اشارہ سے پڑھ سکتا ہو۔

لمافی الطحطاوی علی الدر (۱/۱۲۵): (قوله يشتد) تقييد لاطلاق المصنف المرض فيعلم ان اليسير لايبيح التيمم ولا فرق فی الاشتداد بين ان يشتد بالتحرک كالمبطون كما افاده بقوله ولو بتحرک او بالاستعمال كالجدری وجاز له التيمم اتفاقا ان كان لايجد من يوضئه ولا يقدر بنفسه

وفيه ايضاً (۱/۳۱۹): (قوله بان زادت علی يوم وليلة) ای بالساعات او بالاوقات علی وزان ماسيأتی فی مسئلة المجنون (قوله فی ظاهر الرواية) وقيل تؤخرولا تسقط وصحح (قوله وعليه الفتوی) راجع الی المغيابه لاللمغيا عليه وهو اذا لم يفهم فانه لايقضی فيه إجماعاً ومحل الخلاف فيما اذا بری من مرضه...... علی الايماء بالرأس اما ان قدر عليه بعد عجزه فانه يلزمه القضاء وان كان القضاء يجب موسعا لتظهر فائدته فی الايصاء بالاطعام عنه بحر.

وفی الشامیة (۲/۹۹): (قوله بان زادت علی یوم ولیلة) أما لوکانت یوماً ولیلة أو أقل وهو یعقل فلا تسقط بل تقضی اتفاقاً وهذا اذا صح فلو مات ولم یقدر علی الصلاة لم یلزمه القضاء حتی لایلزمه الایصاء...... (قوله فی ظاهر الروایة) وقیل لایسقط القضاء بل تؤخر عنه اذا کان یعقل وصححه فی الهدایة وهو من اهل الترجیح لکن خالف نفسه فی کتابه التجنیس.

(۳۰۶) معذور آدمی کا گھر پر جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک معذور آدمی ہوں اور مسجد کے پڑوس میں رہتا ہوں لیکن مسجد میں عذر کی وجہ سے نہیں جاسکتا، تو کیا میں اپنے بیٹوں کے ساتھ گھر پر جماعت کے ساتھ نماز پڑھ سکتا ہوں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... شریعت مطہرہ نے عذر شرعی، مثلاً بیماری، شدید بارش، شیخ فانی وغیرہ کا اعتبار کیا ہے اور معذور آدمی کو مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ترک کرنے کی رعایت رکھی ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ مسجد کے پڑوس میں رہتے ہوئے بھی گھر میں اپنے تیمار دار یا دیکھ بھال کرنے والے کسی فرد کے ساتھ جماعت سے نماز پڑھ سکتے ہیں۔

لمافی الهندیة (۱/۸۲): الجماعة سنة مؤکدة کذا فی المتون والخلاصة والمحیط ومحیط السرخسی...... (صـ۸۳) وتسقط الجماعة بالأعذار حتی لاتجب علی المریض والمقعد و الزمن ومقطوع الید والرجل من خلاف ومقطوع الرجل والمفلوج الذی لا یستطیع المشی والشیخ الکبیر العاجز والاعمیٰ عند أبی حنیفة رحمه الله تعالیٰ.

وفی الدرالمختار (۱/۵۵۲): (والجماعة سنة مؤکدة للرجال...... (وأقلها اثنان)...... (وقیل واجبة وعلیه العامة)...... (فتسنّ أو تجب)...... علی الرجال العقلاء البالغین الأحرار القادرین علی الصلاة بالجماعة من غیر حرج)...... (فلا تجب علی مریض ومقعد وزمن ومقطوع یدورجل من خلاف) ...... (ومفلوج وشیخ کبیر عاجز وأعمیٰ) وإن وجد قائداً...... وقیامه بمریض الخ. قال الشامی رحمه الله تحته: (۱/۵۵۵) (قوله ولو فاتته ندب طلبها)...... وذکر القدوری: یجمع بأهله ویصلی بهم، یعنی وینال ثواب الجماعة کذا فی الفتح.

(۳۰۷) دورانِ نماز اگر قیام سے عاجز ہوجائے تو باقی نماز بیٹھ کر ادا کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پچھلے دو ہفتوں سے میں شدید بخار میں مبتلا ہوں اب اللہ پاک کا فضل ہے صحت تھوڑی اچھی ہوگئی ہے لیکن چونکہ دو ہفتوں کے مسلسل بخار نے بہت کمزور کردیا ہے اب میری حالت یہ ہے کہ جب

نماز میں کھڑا ہوتا ہوں تو تھوڑی دیر کے بعد سر پر چکرآ نا شروع ہوتا ہے تو گرنے لگتا ہوں تو کیا ایسی حالت میں بیٹھ کر نماز پڑھ سکتا ہوں؟ یا کھڑے ہوکر نماز شروع کروں جب چکرآ جائے پھر بیٹھ جاؤں۔ لہٰذا جو بھی صورت شرعاً جائز ہو، تحریر فرما کر اللہ کے حضور اجر کے مستحق بنئے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... نماز کے اندر قیام فرض ہے اور اگر کوئی عذر کی وجہ سے کھڑے ہوکر نماز ادا نہیں کر سکتا تو بیٹھ کر نماز ادا کرے۔ البتہ جتنی دیر قیام پر قادر ہے اتنی دیر کھڑا رہے پھر بیٹھ جائے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ کھڑے ہوکر نماز شروع کرنے پر قادر ہیں اس لئے کھڑے ہوکر نماز شروع کریں جب چکرآ نا شروع ہو جائیں تو اس وقت بیٹھ جائیں۔

لـمافي الفتاویٰ الهندية(۱/۱۳۶): ولو كان قادر اعلى بعض القيام دون تمامه يؤمر بان يقوم قدر ما يقدر حتى اذا كان قادر اعلى ان يكبر قائما ولا يقدر على القيام للقراء ة او كان قادر اعلى القيام لبعض القراءة دون تمامها يؤمر بان يكبر قائما ويقرأ قدرما يقدر عليه قائما ثم يقعد اذا عجز قال شمس الائمة الحلواني رحمه الله تعالىٰ هو المذهب الصحيح ولو ترك هذا خفت ان لا تجوز صلاته كذا في الخلاصة.

وفي الشامية(۲/۹۷): وفي شرح الحلواني نقلا عن الهندواني: لو قدر على بعض القيام دون تمامه، أو كان يقدر على القيام لبعض القراء ة دون تمامها يؤمر بأن يكبر قائما ويقرأ ما قدر عليه ثم يقعد ان عجز وهو المذهب الصحيح لايروى خلافه عن اصحابنا.

(۳۰۸) بیمار آدمی کیلئے قبلہ رُخ کئے بغیر نماز ادا کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی جس کی وجہ سے وہ ہسپتال کی چارپائی پر پڑا ہوا ہے اور چارپائی مریضوں کے زیادہ ہوجانے کی وجہ سے ادھر ادھر بھی نہیں ہوسکتی تو کیا مریض بغیر قبلہ رخ کئے نماز ادا کرسکتا ہے کیونکہ چہرہ قبلہ کی طرف نہیں بلکہ شمال کی جانب ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورتِ مسئولہ میں مریض کے چہرے کو قبلہ کی طرف پھیرنے والا موجود ہے تو قبلہ کی طرف منہ پھیر کر نماز پڑھے اگر مریض کے پاس کوئی بھی موجود نہ ہو، اور وہ خود بھی نہیں پھیر سکتا تو جس طرف پھیرنے کی قدرت ہو اسی طرف منہ کر کے نماز ادا کرے۔

لـمافي الهندية(۱/۶۳): مريض صاحب فراش لا يمكنه ان يحول وجهه وليس بحضرته احد يوجهه يجزيه صلوته الى حيث ماشاء كذا في الخلاصة وكذا اذا كان يجد من يحوله ولكن يضره التحويل هكذا في الظهيرية.

وفي الدر المختار (۱/۴۳۲): (وقبلة العاجز عنها) لمرض وان وجد موجها عند الامام اوخوف مال وكذا كل من سقط عنه الأركان

وفي الشامية تحته: (وكذا كل من سقط عنه الاركان) أي تكون قبلته جهة قدرته ايضا.

(۳۰۹) قیام، رکوع وسجدہ سے عاجز کا بیٹھ کر اشارے سے نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری والدہ جوڑوں (گٹھیا) کی مریض ہیں اور زیادہ اٹھنے بیٹھنے سے انہیں بہت تکلیف ہوتی ہے، اب اگر وہ اس مجبوری کی بنا پر تخت یا چارپائی وغیرہ پر ہی بیٹھ کر نماز پڑھنا چاہیں تو کیا یہ درست ہے یا نہیں؟ اور اگر بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھنا چاہیں تو کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں اگر آپ کی والدہ قیام، رکوع وسجدہ کرنے سے عاجز ہیں تو بیٹھ کر نماز پڑھ سکتی ہیں، چاہے چارپائی پر پڑھیں یا تخت پر۔ اگر بیٹھ کر رکوع وسجدہ سے بھی عاجز ہوں تو پھر اشارے سے نماز پڑھ لیں لیکن سجدہ کا اشارہ رکوع سے ذرا جھک کر کریں۔

لما في الهندية (۱/۱۳۶): اذا عجز المريض عن القيام صلى قاعدا يركع ويسجد كذا في الهداية وان عجز عن القيام والركوع والسجود وقدر على القعود يصلي قاعدا بايماء ويجعل السجود اخفض من الركوع.

وفي الدر المختار (۲/۹۷): (وان تعذرا)...... وفي (ص۹۸) (أوما) بالهمز قاعدا وهو افضل من الايماء قائما لقربه من الارض (ويجعل سجوده اخفض من ركوعه).

(۳۱۰) تختہ لگی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض مساجد میں ایسی کرسیاں استعمال ہوتی ہیں جن میں آگے ایک تختی لگی ہوتی ہے اور کرسی پر بیٹھنے والا اس پر سجدہ کرتا ہے کیا فرش کے علاوہ کسی اور چیز پر سجدہ کرنا جائز ہے؟ اگر اس میں ائمہ اربعہ کا اختلاف ہو تو ضرور بیان کریں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... ہر ایسی چیز پر سجدہ کرنا درست ہے جو کہ حجم رکھتی ہو، اور ٹھوس ہو کہ پیشانی اس پر ٹھہر سکے تو ایسی چیز زمین ہی کے حکم میں ہوگی۔ صورت مسئولہ میں معذور شخص جو کہ رکوع اور سجدہ کرنے سے عاجز ہو، تو اس کیلئے اس مخصوص کرسی پر بیٹھ کر سامنے نصب شدہ تختی پر سجدہ کرنا اور نماز کا پڑھنا بلا کسی کراہت کے جائز ہے اور ائمہ اربعہ کا اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

لما في الشامية (۱/۴۵۴): (وشرط سجود) مبتدأو مضاف اليه (فالقرار) خبر بزيادة الفاء (لجبهة)

أی یفترض أن یسجد علی مایجد حجمه بحیث أن الساجد لوبالغ لایتسفل رأسه ابلغ مما کان علیه حال الوضع، فلا یصح علی نحو الأرز والذرة، الا ان یکون فی نحو جوالق، ولا علی نحو القطن والثلج والفرش الا ان وجد حجم الارض بکبسه.

(۳۱۱) زمین یا کرسی وغیرہ پر بیٹھ کر نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عام طور پر آج کل لوگ مساجد میں مخصوص کرسیوں پر بیٹھ کر نماز پڑھتے ہیں کیا ان کا یہ عمل درست ہے؟ اور کتنے عذر کی بنا پر آدمی کیلئے بیٹھ کر نماز پڑھنے کی گنجائش ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... جو لوگ مخصوص کرسیوں وغیرہ پر بیٹھ کر نماز پڑھتے ہیں ان لوگوں کا ان کرسیوں پر فرض نماز بیٹھ کر پڑھنا اس شرط کے ساتھ جائز ہوگا کہ یہ لوگ بغیر ضرر کے کھڑے ہونے پر قادر نہ ہوں لیکن اگر بغیر ضرر کے تکبیر تحریمہ کہنے کے بقدر بھی قیام پر قادر ہوں اور رکوع وسجدہ بھی کر سکتے ہوں تو تکبیر تحریمہ کھڑے ہو کر کہیں اور پھر بیٹھ جائیں۔ یا جتنی مقدار بھی کھڑے ہونے پر بغیر ضرر کے قادر ہوں تو اس قدر کھڑے ہونا ان حضرات پر لازم ہے پھر جب عاجز ہو جائیں تو بیٹھ جائیں، اور اگر رکوع اور سجدہ پر قدرت نہ رکھتے ہوں تو اگرچہ قیام پر بغیر ضرر کے بھی قادر ہوں تو پھر ان حضرات کیلئے یہ جائز ہے بلکہ افضل ہے کہ بیٹھ کر نماز پڑھیں اور قیام ان لوگوں سے ساقط ہو جائے گا۔ اور جس شخص کیلئے کھڑا ہونا متعذر ہو یا کھڑا ہونے میں ان کو ضرر لاحق ہوتا ہو، تو اس شخص کو بیٹھ کر نماز پڑھنا درست ہے۔

لمافی الهندیة(۱/۱۳۶): اذا عجز المریض عن القیام صلی قاعدا یرکع ویسجد کذا فی الهدایة واصح الاقاویل فی تفسیر العجز ان یلحقه بالقیام ضرر وعلیه الفتویٰ کذا فی معراج الدرایة. وکذلک اذا خاف زیادة المرض او ابطاء البرء بالقیام او دوران الراس کذا فی التبیین او یجد وجعاً لذلک، فان لحقه نوع مشقة لم یجز ترک ذلک القیام کذا فی الکافی ولو کان قادراً علی بعض القیام دون تمامه یؤمر بان یقوم قدر مایقدر حتی اذا کان قادراً علی ان یکبر قائما ولا یقدر علی القیام للقراءة او کان قادراً علی القیام لبعض القرآة دون تمامها یؤمر بان یکبر قائما ویقرء قدر ما یقدر علیه قائما ثم یقعد اذا عجز قال شمس الائمة الحلوانی رحمه الله تعالیٰ هو المذهب الصحیح ولو ترک هذا خفت ان لا تجوز صلا ته کذا فی الخلاصة ولو قدر علی القیام متکئاً الصحیح انه یصلی قائما متکئاً ولا یجزیه غیر ذلک وکذلک لو قدر علی ان یعتمد علی عصا او علیٰ خادم له فانه یقوم ویتکئ کذا فی التبیین ویکره للمؤمی ان یرفع الیه عوداً او وسادة لیسجد علیه ...... فان کانت الوسادة موضوعة علی الارض وکان یسجد علیها جازت صلوته.

وفی الدر المختار (۲/۹۷): (وإن تعذرا) لیس تعذرهما شرطا بل تعذر السجود کاف (لا القیام)

وفی الشامیة تحته: وفي الذخيرة: رجل بحلقه خراج إن سجد سال وهو قادر على الركوع والقيام والقراءة يصلي قاعدا يومئ، ولو صلى قائما بركوع وقعد وأومأ بالسجود أجزاه والأول أفضل، لان القيام والركوع لم يشرعا قربة بنفسها بل ليكونا وسيلتين الى السجود اهـ.

وفيه ايضاً (۹۵/۲): (من تعذر عليه القيام) اى كله (لمرض) حقيقي و حدّه ان يلحقه بالقيام ضرر به يفتى (قبلها أو فيها) أى الفريضة (أو) حكمي بأن (خاف زيادته أو بطء برئه بقيامه او دوران رأسه او وجد لقيامه الما شديداً) أو كان لو صلى قائما سلس بوله أو تعذر عليه الصوم كما مر (صلى قاعداً) ولو مستندا الى وسادة أو انسان فانه يلزمه ذلک على المختار (كيف شاء) على المذهب ...... (بركوع وسجود وان قدر على بعض القيام) ولو متكئاً على عصا أو حائط (قام) لزوماً بقدر مايقدر ولو قدر آية أوتكبيرة على المذهب.

و فى الشامية : (۹۶/۲) واختلفوا فى التعذر......فقيل ما يبيح الافطار وقيل التيمم وقيل بحيث لو قام سقط وقيل ما يعجزه والاصح ان يلحقه ضرربالقيام ...... (قوله ولو مستنداً الخ) اى اذا لم يلحقه ضرربه بدليل مامر (وفى صـ۹۷) وبه ظهر ان المراد بالانسان من يطيعه اعم من الخادم والاجنبى ...... (قوله كيف شاء) اى كيف تيسرله بغير ضرر من تربع او غيره (قوله على المذهب) جزم به فى الغرر ونور الايضاح وصححه فى البدائع وشرح المجمع واختاره فى البحر والنهر.

(۳۱۴) نمازیوں کی مروجہ کرسیوں میں ۹/انچ اونچائی رکھنے کی علت

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلّہ کی مسجد میں چند کرسیاں جو آجکل مساجد میں بزرگ حضرات نماز ادا کرنے کیلئے استعمال کرتے ہیں موجود تھیں۔ کچھ دن قبل یہ کرسیاں مذکورہ مسجد کے خطیب کے کہنے پر اٹھادی گئیں تھیں، اُن کا کہنا تھا کہ ان پر سجدہ ادا کرنا صحیح نہیں ہے، لیکن چند دن بعد دوبارہ رکھ دی گئیں اور کہا گیا کہ ان کرسیوں میں سے جن کی اونچائی ۹/انچ تھی ان پر سجدہ ادا کرنا صحیح ہے اور جن کی اونچائی ۹/انچ نہیں ہے اُن کو ۹/انچ تک برابر کرواکر دوبارہ رکھ دیں گے۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ اس ۹/انچ اونچائی کی کیا علت ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......سجدہ کے لغوی معنی ہے پیشانی زمین پر رکھنا یعنی آدمی جس جگہ بیٹھا ہوا ہو، اس جگہ سے جھک کر پیشانی زمین پر رکھے یا وہ جو زمین کے قائم مقام ہو، مثلاً تخت وغیرہ پس اگر سجدہ والی جگہ بیٹھنے والی جگہ کی بہ نسبت اونچی ہو تو اس صورت میں سجدہ ادا ہوگا یا نہیں تو اس کے لئے فقہاءکرام نے یہ حد مقرر کی ہے کہ اگر سجدہ والی جگہ نصف ذراع کے بقدر اونچی ہے تو سجدہ ادا ہوجائے گا اور اگر اس سے زیادہ اونچی ہے تو پھر سجدہ ادا نہ ہوگا اور نصف ذراع تقریباً ۹/انچ ہے کما صرّح به فى اوزان الشرعية (صفحہ ۶۲) لہٰذا مذکورہ

امام صاحب کی بات درست ہے۔

لمافی المحیط البرھانی(۲/۱۲۳): واذا کان موضع السجود ارفع من موضع القدمین (کہ زمین نشیب بود) قیل ذکر الشیخ الامام الاجل شمس الائمّة الحلوانی فی شرح کتاب الصلوة انّه ان کان التفاوت بمقدار لبنة او لبنتین یجوز وان کان اکثر من ذلک لایجوز واراد باللبنة اللبنة المنصوبة دون المفروشة.

وفی الدر المختار(۱/۵۰۳): ولو کان موضع سجوده ارفع من موضع القدمین بمقدار لبنتین منصوبتین (ای موضوعة احدهما فوق الاخری) جاز سجوده وان اکثر لا الالزحمة کمامر والمراد لبنة بخاری وھی ربع ذراع عرض ستة اصابع(ای مقدر بعرض ستة اصابع مضموم بعضها الی بعض لا بطولها) فمقدار ارتفاعهما نصف ذرائع ثنتا عشرة اصبعاً ذکره الحلبی

وفیه ایضاً(۲/۴۰): ولو صلی علی دابة فی شق محمل وھو یقدر علی النزول بنفسه لاتجوز الصلاة علیها اذا کانت واقفة الا ان تکون عیدان المحمل علی الارض بأن رکز تحته خشبة.

وفی الکبیری(صـ۲۷۸): والخامسه من الفرائض السجدة وھی فریضة تتادی بوضع الجبهة علی الارض اوما یتصل بها بشرط الانخفاض الزائد علی نهایة الرّکوع مع الخروج عن حدّ القیام لانّه لا یعد ساجداً لغة وعرفاً بما دونه ویعدبه.

وفیه ایضاً(صـ۲۸۱): ولو کان موضع السجود ارفع من موضع القدمین ان کان ارتفاعه مقدار ارتفاع لبنتین منصوبتین جاز السجود علیه والا فلا یجوز السجود واراد باللبنة لبنة بخاری وھی ربع ذراع عرض ست اصابع فمقدار ارتفاع اللبنتین المنصوبتین نصف ذراع طول اثنتی عشرة اصبعاً...... وذکر الزاهدی لو سجد یعنی المریض علی دکان دون صدره یجوز کالصحیح انتهی والاقرب ماذکر المصنف لما قدمناه فی اوّل بحث السجدة من حدادنی السجود المجزی فانه صادق فیما اذا کان الارتفاع ھذا المقدار لافی الأزید فلیتامل.

(۳۱۳) بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کے رکوع کا طریقہ

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بیٹھ کر نماز پڑھنے والا سر کو کس قدر جھکائے تا کہ رکوع ادا ہو جائے؟

الجواب حامداًومصلیاً......اگر کوئی شخص بیٹھ کر نماز پڑھتا ہے، اس کیلئے مناسب یہ ہے کہ رکوع میں جاتے ہوئے وہ اپنی پیشانی کو اپنے گھٹنے

کے سرے کے قریب کرے۔

وفی الشامیة(۱/۴۴۷): قال الشامی: وفی حاشیة الفتال عن البرجندی: ولو کان یصلی قاعداً ینبغی ان یحاذی جبهته قدام رکبتیه لیحصل الرکوع اھ قلت ولعله محمول علی تمام الرکوع والافقد لممت حصوله باصل طأطأة الراس ای مع انحناء الظهر تأمل.

(۳۱۴) کرسی پر بیٹھ کرنماز پڑھنے والا سجدہ کی حالت میں کہاں تک سر جھکائے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض مساجد میں معذور حضرات کیلئے کرسیاں رکھی ہوئی ہوتی ہیں اور اس میں آگے تختہ لگا ہوا ہوتا ہے تا کہ اس پر سر رکھ کر سجدہ کیا جاسکے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا اس تختہ پہ سر رکھ کر سجدہ کرنا درست ہے؟ یا ویسے ہی تھوڑا سا جھک کر سجدہ کیا جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... سجدہ کیلئے ضروری ہے کہ وہ زمین یا اس جیسی سخت چیز پر اپنی پیشانی کو اچھی طرح سے ٹکائے البتہ اگر کوئی شخص عذر کی بناء پر سجدہ کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ اور اس کے لئے کسی سہارے پر مثلاً تکیہ، میز وغیرہ پر سر رکھ کر سجدہ کرنا آسان ہوتو اس کی بھی گنجائش ہے، اور اگر اس پر بھی قدرت نہیں تو صرف اشارہ سے سجدہ کرنا کافی ہے۔ اور اگر زمین پر بھی نہیں بیٹھ سکتا بلکہ کسی اونچی چیز کرسی وغیرہ (جیسا کہ آج کل مساجد میں کرسیاں رکھی گئی ہیں سامنے تختہ لگا ہوا ہے) پر بیٹھ کر نماز پڑھ سکتا ہے تو اس کی بھی گنجائش ہے۔ لیکن تختہ پر پیشانی رکھ کر سجدہ کرنا ضروری ہے ہاں اگر عذر ہوتو حسبِ طاقت اشارہ کرے۔ لیکن یہ خیال رہے کہ سجدہ میں رکوع سے زیادہ جھکنا پایا جائے۔

بیٹھ کر زمین پر سجدہ کرکے نماز پڑھنے کی قدرت کے باوجود معمولی عذر کی بنا پر کرسیوں پر نماز پڑھنا درست نہیں۔

لما فی سنن الکبریٰ للبیهقی(۲/۳۰۷): عن الحسن عن امه قالت رأیت ام سلمة زوج النبی ﷺ تسجد علی وسادة من ادم من رمدبها.

وفی الدر المختار(۲/۹۶، ۹۷، ۹۸): (صلی قاعدا) ولو مستندا إلی وسادة ...... الی قوله...... (وان تعذرا لیس تعذر هما شرطا بل تعذرا السجود کاف (لا القیام أو ما) بالهمز (قاعدا)...... (ویجعل سجوده اخفض من رکوعه)

وفی الشامیة(۲/۹۶): (قوله فانه یکره تحریما) قال فی البحر: واستدل للکراهة فی المحیط بنهیه علیه الصلاة والسلام عنه، وهو یدل علی کراهة التحریم وتبعه فی النهر.

اقول: هذا محمول علی ماذا کان یحمل الی وجهه شیا یسجد علیه بخلاف ماذا کان موضوعاً علی الارض یدل علیه مافی الذخیره حیث نقل عن الاصل الکراهة فی الاول ثم قال فان کانت

الوسادة موضوعة علی الارض و کان یسجد علیها جازت صلاته، فقد صح ان ام سلمة کانت تسجد علی مرفقة موضوعة بین یدیها لعلة کانت بها ولم یمنعها رسول الله ﷺ من ذلک هـ

فان مفاد هذه المقابلة والاستدلال عدم الکراهة فی الموضوع علی الارض المرتفع ثم رأیت القهستانی صرح بذلک.

وفیه ایضاً (۹۹/۲): انه لو کان قادرا علی وضع شیٔ علی الارض مما یصح السجود علیه انه یلزمه ذلک لأنه قادر علی الرکوع والسجود حقیقة ولا یصح الایماء بهما مع القدرة علیهما بل شرطه تعذرهما کما هو موضوع المسألة.

(۳۱۵) خروج ریح کی صورت میں اشارہ سے رکوع وسجدہ کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے کافی عرصہ سے ایک بیماری ہے جو نماز کیلئے پریشانی کا باعث بنتی ہے وہ یہ ہے کہ جب میں نماز کے دوران رکوع یا سجدہ کرتا ہوں تو ریح خارج ہو جاتی ہے۔ ایک صاحب نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ آپ نماز بیٹھ کر ادا کیا کریں اور رکوع اور سجدہ کرنے کی بجائے اشارہ کیا کریں۔ آیا ایسی صورت میں میرے لئے بیٹھ کر اشارے سے نماز پڑھنا جائز ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں مذکورہ عذر (خروج ریح) کی وجہ سے آپ کیلئے بیٹھ کر نماز پڑھنا اور رکوع اور سجدہ اشارہ سے کرنا جائز ہے۔

لمافی الهندیة (۱/ ۱۳۸): کلّ من لا یقدر علی اداء رکن الابحدث یسقط عنه ذالک الرکن کذا فی فتاویٰ قاضیخان. حتی لو کان به جراحة لا یستطیع ان یسجد الا وتسیل جراحته وهو صحیح فیما سوی ذالک یقدر علی الرکوع والقیام والقراءة یصلی قاعداً ویؤمی ایماءً.

وفی الشامیة (۹۸/۲): رجل بحلقه خراج ان سجد سال وهو قادر علی الرکوع والقیام والقراءة یصلی قاعداً ویومی.

وفیه ایضاً(۱/ ۳۰۷): (قوله ولو بصلاته مؤمئا) ای کما اذا سال عند السجود ولم یسل بدونه فیؤمی قائما او قاعدا وکذا لو سال عند القیام یصلی قاعدا.

(قوله وبرده لا یبقی ذاعذر) قال فی البحر: ومتی قدر المعذور علی رد السیلان برباط او حشو أو کان لوجلس لا یسیل ولو قام سال وجب رده، وخرج برده عن ان یکون صاحب عذر، ویجب ان یصلی جالسا بایماء ان سال بالمیلان لان ترک السجود اهون من الصلاة مع الحدث.

(۳۱۶) کبڑے شخص کے رکوع کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کبڑا شخص نماز کے اندر رکوع کس طرح کرے جبکہ وہ عام حالات میں بھی اتنا جھکا ہوتا ہے جیسے رکوع کی حالت میں ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... کبڑاپن اگر حالت رکوع تک پہنچ جائے تو پھر کبڑا شخص سر کے اشارے سے رکوع کرے گا۔

لمافی الخلاصة (۱/۵۳): الاحدب اذا بلغت حدوبته الركوع يشير براسه للركوع.

وفی الهندية (۱/۷۰): والاحدب اذا بلغت حدوبته الركوع يشير براسه للركوع.

(۳۱۷) دو راستوں میں کم وزیادہ مسافت کے وقت سفر شرعی کیلئے ۴۸ میل کا اعتبار ہوگا

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کے اپنے سسرال جانے کیلئے دو راستے ہیں ایک ہموار اور دوسرا ناہموار۔ زید جب ہموار راستے سے اپنے سسرال جاتا ہے تو تین دن میں ۴۸ میل سفر طے کرتا ہے اور جب ناہموار راستے سے جاتا ہے تو تین دن میں ۴۲ میل کا فاصلہ طے کرتا ہے اب معلوم یہ کرنا ہے کہ جب زید ناہموار راستے سے تین دن میں ۴۲ میل کا فاصلہ طے کرتا ہے تو اب وہ قصر نماز پڑھے گا یا مکمل نماز پڑھے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً......فقہاء احناف کے یہاں سفر کی ادنیٰ مقدار مسافر شرعی بننے کیلئے وہ تین دن اور تین رات کا سفر ہے چاہے حقیقتاً تین دن پائے جائیں یا تین دن کی مسافت کے بقدر مسافت پائی جائے دونوں صورتوں میں انسان مسافر شرعی کہلاتا ہے اور اس پر سفر کے احکام جاری ہوتے ہیں، اصل مذہب کے اعتبار سے فرسخ کا اعتبار نہیں ہے بلکہ صرف تین دن کی مسافت کا اعتبار ہے اگرچہ بعد کے فقہاء نے فرسخ کا اعتبار کیا ہے جس کو موجودہ دور میں میل اور کلومیٹر سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن ان حضرات کا مقصد بھی فرسخ وغیرہ سے اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ تین دن میں انسان درمیانی چال (اونٹ یا پیدل سفر کرنے) سے اتنی مسافت طے کرتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص تین دن کا سفر کر کے کسی جگہ پہنچتا ہے زمین کے دشوار گزار ہونے کی بناء پر تو وہ بھی مسافر شرعی ہے اگرچہ فرسخ کے اعتبار سے کم ہی فاصلہ ہو، اس صورت میں فرسخ وغیرہ کا اعتبار نہیں کیا جاتا بوجہ نص کے کیونکہ نص میں تین دن کے الفاظ موجود ہیں لہٰذا صورت مسئولہ میں جب زید ناہموار راستے سے تین دن میں ۴۲ میل کا فاصلہ طے کرتا ہے تو اس صورت میں وہ مسافر شرعی ہے اور وہ قصر نماز پڑھے گا کیونکہ تین دن کے سفر کی صورت میں میل اور فرسخ وغیرہ کا اعتبار نہیں کیا جاتا ہے البتہ یہ حکم اس شخص کیلئے ہے جو کہ معتاد تین دن اور تین رات کا سفر کرے اور اگر کوئی شخص گاڑی وغیرہ میں سفر کرتا ہے جیسا کہ موجودہ زمانے میں کیا جاتا ہے تو وہاں ۴۸ میل کا ہی اعتبار ہوگا چاہے ۴۸ میل تین دن سے کم میں ہی مکمل ہو جائیں اس صورت میں دنوں کا اعتبار نہیں ہوگا اگر ۴۸ میل کا سفر طے کر لیا ہے تو قصر پڑھے گا ورنہ نہیں۔

لمافی الهندية (۱/۱۳۸): فاذا قصد بلدة والى مقصده طريقان أحدهما مسيرة ثلاثة ايام ولياليها

والآخر دونها فسلک الطریق الابعد کان مسافرا عندنا هکذا فی فتاویٰ قاضی خان وان سلک الا قصریتم کذا فی البحر.

وفی فتح القدیر (۲/۳۰): (قوله هو الصحیح) احتراز عما قیل یقدربها فقیل بأحد وعشرین فرسخا وقیل بثمانیة عشر وقیل بخمسة عشر وکل من قدر بقدر منها اعتقد انه مسیرة ثلاثة ایام وانما کان الصحیح ان لا یقدر بها لانه لو کان الطریق وعراً بحیث یقطع فی ثلاثه ایام اقل من خمسة عشر فرسخا قصر بالنص وعلی التقدیر باحد هذه التقدیرات لایقصر فیعارض النص فلا یعتبر سوی سیر الثلاثة وعلی اعتبار سیرا لثلاثة بمشی الاقدام لوسارها مستعجل کالبرید فی یوم قصر فیه وافطر لتحقق سبب الرخصة وهو قطع مسافة ثلاثة بسیر الابل ومشی الاقدام.

وفی الدرالمختار (۲/۱۲۲، ۱۲۳): (مسیرة ثلاثة أیام ولیالیها) من أقصر أیام السنة ولا یشترط سفر کل یوم إلی اللیل بل إلی الزوال ولا اعتبار بالفراسخ علی المذهب (بالسیر الوسط مع الاستراحات المعتادة) حتی لواسرع فوصل فی یومین قصر، ولو لموضع طریقان أحدهما مدة السفر والاخر اقل قصر فی الاول لا الثانی. قال العلامة الشامی علیه الرحمة فی رد المحتار: قال فی النهایة: أی التقدیر بثلاث مراحل قریب من التقدیر بثلاثة ایام لان المعتاد من السیر فی کل یوم مرحلة واحدة خصوصا فی أقصر أیام السنة کذا فی المبسوط اهـ وکذا مافی الفتح من أنه قیل یقدر بأحد وعشرین فرسخا وقیل بثمانیة عشر وقیل بخمسة عشر وکل من قدر منها اعتقد أنه مسیرة ثلاثة ایام اهـ ای بناء علی اختلاف البلدان فکل قائل قدر ما فی بلده من أقصر الأیام أو بناء علی اعتبار أقصر الأیام او أطولها او المعتدل منها وعلی کل فهو صریح بأن المراد بالأیام ماتقطع فیها المراحل المعتادة فافهم .... (قوله علی المذهب) لأن المذکور فی ظاهر الروایة اعتبار ثلاثة ایام کمافی الحلیة وقال فی الهدایة: هو الصحیح احتراز عن قول عامة المشایخ من تقدیرها بالفراسخ.

وفی فتح الملهم (۴/۵۳۷): تنبیه: نبه ابن عابدین علی ان المراد بالایام ما تقطع فیه المراحل المعتادة، وفی الدر المختار وغیره لو اسرع فوصل فی یومین الی مکان مسافة ثلثة ایام بالسیر المعتاد: قصر. قال ابن عابدین وظاهره انه کذلک لو وصل الیه فی زمن یسیر بکرامة لکن استبعده (ابن الهمام) فی فتح القدیر بانتفاء مظنة المشقة وهی العلة فی القصر قلت: والظاهر ان هذا الاستبعاد من ابن الهمام یجری فی اسفار زماننا ایضا من سیر البابورة والمواتر وغیرهما والله اعلم.

(۳۱۸) مسافر شرعی کی تعریف

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسافر شرعی کسے کہتے ہیں؟ آج کل تبلیغی جماعت والے جب چلہ یعنی چالیس دن لگاتے ہیں تو ایک بستی میں پندرہ دن یا اس سے زیادہ دن تشکیل ہو جانے کی صورت میں بعض جماعتیں سفری نماز ہی پڑھتی ہیں حالانکہ ہم نے سنا ہے کہ کسی شخص کا پندرہ دن یا اس سے زیادہ وقت اگر ایک جگہ پر رہنے کا ارادہ ہو تو وہ مسافر مقیم ہو جاتا ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... جو شخص ایسی جگہ جانے کا ارادہ کرے جس کی مسافت تین دن پیدل چلنے یا اونٹ کے چلنے کے برابر ہو جس کا اندازہ فقہاء کرام نے ۴۸ میل/ ۷۷ء۲۴۸۵ کلومیٹر لگایا ہے اور وہاں پر پندرہ دن یا اس سے زیادہ ٹھہرنے کی نیت نہ ہو تو ایسا شخص مسافر شرعی کہلائے گا اور یہ شخص قصر کرے گا۔ پس صورت مسئولہ میں جن جماعتوں کی تشکیل ایک ہی بستی یا شہر میں پندرہ دن یا اس سے زیادہ ہو جائے اور وہاں پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت بھی ہو، یہ لوگ پوری نماز پڑھیں گے ہاں اگر پندرہ دن سے کم ہو تو پھر یہ مسافر ہوں گے اور نماز قصر پڑھیں گے۔

وفی الهندية(۱/۱۳۹): **ولایزال علی حکم السفر حتی ینوی الاقامة فی بلدة أوقرية خمسة عشر يوما أو اکثر کذا فی الهداية.**

وفی الدر المختار(۲/۱۲۵): (اوینوی) **ولو فی الصلوٰة اذا لم یخرج وقتها ولم یک لاحقا** (اقامة نصف الشهر) حقیقة اوحکما لما فی البزازية وغیرها: **لودخل الحاج الشام وعلم انه لایخرج الامع القافلة فی نصف شوال أتم لانه کناوی الاقامة.**

(۳۱۹) مسافت شرعی کی ابتداء وانتہا کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سفر کی مسافت جو کہ ۴۸ میل ہے اس کا اعتبار وشمار کہاں سے ہوگا، شہر کی حدود کے باہر سے یا مسافر کے گھر سے؟ اسی طرح جس شہر کی طرف سفر کر رہا ہے، وہاں پر بھی اس شہر کی حدود تک مسافت کا اعتبار ہوگا یا اس خاص مقام تک کا اعتبار کیا جائے گا جہاں وہ قیام پذیر ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... سفر کی مسافت کا اعتبار اپنے شہر کی آبادی اور حدود کے ختم ہونے کے بعد سے کیا جاتا ہے۔

لما فی الهندية (۱/۱۳۹): قال محمد رحمه الله: **یقصر حین یخرج من مصره ویخلف دور المصر کذا فی المحیط.**

وفی الدر المختار(۲/۱۲۱): (من خرج من عمارة موضع اقامته) **من جانب خروجه وان لم یجاوز**

من الجانب الاخر.

وفی الشامیة (۲/۱۲۱): (قوله من جانب خروجه الخ) قال فی شرح المنیة: فلا یصیر مسافراً قبل ان یفارق عمران ماخرج منه من الجانب الذی خرج حتی لو کان ثمة محلة منفصلة عن المصر وقد کانت متصلة به لایصیر مسافراً مالم یجاوزها، ولوجاوز العمران من جهة خروجه وکان بحذائه محلة من الجانب الاخر یصیر مسافراً اذ المعتبر جانب خروجه.

(۳۲۰) مسافت سفر کی ابتداء وانتہاء کہاں سے ہوگی؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے مسافتِ سفر کے بارے میں ایک مسئلہ معلوم کرنا ہے وہ یہ کہ اگر کوئی شخص گوجرانوالہ سے لاہور شہر کا ارادہ کرتا ہے تو اس کی مسافت کی مقدار سفر شرعی کے برابر نہیں بنتی، لیکن وہ لاہور شہر ہی میں اتنی دور چلا جاتا ہے کہ اس کی مسافت کی مقدار سفرِ شرعی کی مقدار کے برابر ہو جاتی ہے تو آیا اس پر احکاماتِ سفر لازم ہوں گے یا نہیں، اور مقدار مسافت کب شروع ہوتی ہے اور کب ختم ہوتی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر گوجرانوالہ سے لاہور کے اس مقام تک جانے کی نیت کی ہے جہاں تک سفرِ شرعی نہیں بنتا تو مسافر نہیں ہوگا۔ البتہ اگر لاہور سے آگے جا رہا ہے اور گوجرانوالہ سے نکل کر وہاں تک مدتِ شرعی ہے۔ تو گوجرانوالہ سے نکلتے ہی مسافر شمار کیا جائے گا۔ باقی مقدار مسافت شہر یا بستی کی آبادی سے نکلنے سے شروع ہوتی ہے اور دوبارہ آبادی میں آنے سے ختم ہو جاتی ہے۔

لمافی الدر المختار (۲/۱۲۱،۱۲۲): (من خرج من عمارة موضع اقامته)...... (قاصدا) (مسیرة ثلاثة أیام ولیا لیها) ......(حتی یدخل موضع مقامه) ان سار مدة السفر......

وفی بدائع الصنائع (۱/۴۷۷): وفعل السفر لا یتحقق الا بعد الخروج من المصر فمالم یخرج لا یتحقق قرآن النیة بالفعل، فلا یصیر مسافراً.

(۳۲۱) جب کسی شخص کا سفر شرعی پر جانے کا ارادہ ہو تو وہ کب قصر کرے گا؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارا گاؤں سڑک سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اگر ہمیں سفر کرنا ہو تو ایک کلومیٹر پیدل سفر کر کے گاڑی پر جا کر سوار ہوتے ہیں اب مسئلہ یہ ہے کہ اگر ہم سے کسی کو مسافت شرعی سے زیادہ کہیں سفر پر جانا پڑے تو راستے میں قصر ہوگی۔ اب یہ قصر گاؤں سے نکلتے ہی شروع ہوگی یا اڈے سے سوار ہونے کے بعد قصر کے احکامات شروع ہوں گے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... جب کسی شخص کا سفر شرعی پر جانے کا ارادہ ہو، تو جب وہ شہر کی آبادی اور فناء مصر سے نکل جائے گا تو اس پر سفر کے

احکام جاری ہوں گے، لہٰذا اگرصورت مسئولہ میں اڈہ فناء مصر میں داخل ہے تو اڈے سے نکلتے ہی سفر کے احکام جاری ہوں گے اگر اڈہ فناء مصر میں داخل نہیں تو پھر آبادی سے نکلتے ہی سفر کے احکام جاری ہوں گے۔

لمافی الهندية(۱/۱۳۹): قال محمد رحمة الله تعالیٰ يقصر حين يخرج من مصره ويخلف دور المصر كذا في المحيط. وفي الغياثيه هو المختار وعليه الفتوى كذا في التتارخانية، الصحيح ما ذكر انه يعتبر مجاوزة عمران المصر لا غير الا اذا كان ثمة قرية او قرى متصلة بربض المصر فحينئذ تعتبر مجاوزة القرى بخلاف القرية التي تكون متصلة بفناء المصر فانه يقصر الصلاة وان لم يجاوز تلك القرية كذا في المحيط.

وفي الدر المختار(۲/۱۲۱): (من خرج من عمارة موضع اقامته) من جانب خروجه وان لم يجاوز من الجانب الاخر.

(۳۲۲) مسجد حرام اور مسجد نبوی میں قصر نماز کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں عمرہ کرنے گیا۔ وہاں پر پہنچ کر عمرہ ادا کیا اس کے بعد آرام کرنے ہوٹل چلے گئے اور سو گئے آنکھ کھلی تو عصر کی نماز ہو رہی تھی۔ ہم نے جماعت سے نماز ادا کی۔ پھر اس کے بعد ظہر کی قضا نماز ادا کی۔ قصر نہیں پڑھی کسی نے ہمیں بتایا کہ مسجد حرام اور مسجد نبوی میں قصر نماز نہیں پڑھنی چاہیے کیا یہ صحیح ہے۔ باقی سب جگہ پر قصر نماز صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... جب کوئی مقیم شخص گھر سے سفر شرعی کے ارادے سے نکلتا ہے جو آجکل کے حساب سے اڑتالیس میل (۹۸ء۷۷ کلومیٹر) بنتا ہے۔ اپنے شہر یا بستی سے نکلنے کے بعد اس پر مسافر کے احکام جاری ہوجاتے ہیں مثلاً یہ کہ نماز قصر پڑھے۔ اور یہ قصر نماز پڑھنا واجب ہے یعنی چار رکعت والی فرض نمازیں دو رکعت پڑھے گا۔ اور یہ حکم کسی خاص جگہ یا مقام کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ جب تک کہ وہ مسافر پندرہ دن یا اس سے زیادہ دن کسی جگہ ٹھہرنے کی نیت نہ کرے۔ یا اپنے شہر لوٹ نہ آئے۔ اس پر وہی مسافر کے احکام جاری ہوں گے البتہ پندرہ دن یا اس سے زیادہ دن ٹھہرنے کی نیت کرنے کے بعد وہ شخص پوری نماز پڑھے گا۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر آپ عمرہ کیلئے پندرہ دن سے کم وقت کیلئے گئے تھے۔ تو آپ کا پوری نماز پڑھنا درست نہیں۔ بلکہ آپ کیلئے قصر نماز پڑھنا ضروری تھا۔ البتہ جو نمازیں آپ نے پوری پڑھی ہیں وہ ادا ہوگئی ہیں۔ بشرطیکہ ان نمازوں میں قعدہ اولیٰ کیا ہو۔ اور کسی کا یہ کہنا کہ مسجد حرام اور مسجد نبوی میں قصر درست نہیں بلکہ پوری نماز پڑھی جائے گی۔ یہ بات درست نہیں۔ بلکہ قصر کا حکم مسافر کیلئے ہر جگہ ہے۔ چاہے وہ کہیں بھی ہو، خود حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد جب مکہ مکرمہ تشریف لائے تو مسجد حرام میں قصر نماز پڑھی ہے۔

لمافي الدر المختار(۲/۱۲۳، ۱۲۴): (صلّى الفرض الرباعي ركعتين) وجوبا لقول ابن عباسؓ: ان الله فرض على لسان نبيكم صلاة المقيم أربعا والمسافر ركعتين ولذا عدل المصنف عن قولهم قصر

لان الركعتين ليستا قصرا حقيقة عندنا بل هما تمام فرضه والاكمال ليس رخصة فى حقه بل اساءة.

وفى الفتاوىٰ الهندية(۱/۱۳۹): والقصر واجب عندنا كذا فى الخلاصة، فان صلى أربعا وقعد فى الثانية قدر التشهد أجزأته والأخريان نافلة ويصير مسيئاً لتأخير السلام وان لم يقعد فى الثانية قدرها بطلت كذا فى الهداية.

(۳۲۳) ۹۵ کلومیٹر مسافت پر پندرہ دن سے کم قیام کی صورت میں قصر کا حکم

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک استفتاء کسی ساتھی کے توسط سے داخل کیا تھا (استفتاء نمبر ۲۲۱۳) جسکا جواب مل گیا لیکن اب مسئلہ یہ درپیش ہوا، ہمارا گھر اور کوئٹہ کے درمیان 95 کلومیٹر فاصلہ ہے پہلے والے میں (70 کلومیٹر) لکھا ہوا تھا جو کہ غلط تھا اب معلوم کرنے پر 95 کلومیٹر بنتا ہے۔

اب کیا میں مسافر ہوں یا نہیں؟ جبکہ میں ایک سرکاری ملازم ہوں اور میں نے کوئٹہ میں ایک کرائے کا کمرہ لیا ہوا ہے، جب میں آتا ہوں تو ایک دو دن کیلئے ٹھہرتا ہوں پھر گھر جاتا ہوں پھر گھر سے واپس آکر تین چار دن رہ کر پھر واپس گھر جاتا ہوں یعنی پندرہ دن سے کم رہتا ہوں تو اندازاً پندرہ دن میں میں دو تین مرتبہ گھر جاتا ہوں اور کرایہ کا مکان اس لئے لیا ہے تاکہ میرا سامان اور آرام کرنے کی جگہ معین ہو۔ تو اب ان تمام صورتوں میں میرے لئے کیا حکم ہے کیا میں مسافر ہوں یا نہیں؟ اگر میں مسافر نہیں ہوں تو جو نمازیں میں نے مسافرانہ پڑھی ہیں ان کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً..... صورتِ مسئولہ میں اگر آپ کے گھر اور کوئٹہ شہر کے درمیان 95 کلومیٹر کا فاصلہ ہے اور آپ کوئٹہ شہر میں 15 روز یا اس سے زیادہ ٹھہرنے کی نیت بھی نہیں کرتے (اگرچہ آپ نے سامان وغیرہ کی حفاظت کی غرض سے وہاں مکان کرائے پر لیا ہوا ہے) تو شرعاً آپ مسافر ہیں اس لئے آپ کی نماز بھی مسافرانہ ہوگی کیونکہ سفر کی مسافت شرعیہ تین دن کی مسافت ہے جو کہ 48 میل کے برابر ہوتی ہے 48 میل کے تقریباً 77 کلومیٹر بنتے ہیں اور جو نمازیں آپ نے قصر یعنی مسافرانہ پڑھی ہیں وہ ادا ہوگئیں ان کی قضاء کرنے کی ضرورت نہیں۔

لمافى التاتارخانيه (۲/۱): فى بيان ادنى مدة السفر الذى يتعلق به قصر الصلوة قال علمائنا ادناها مسيرة ثلاثة ايام ولياليها مع الاستراحات...... وعن ابى حنيفة انه اعتبر ثلاث مراحل.

وفى الشامية (۲/۱۳۳) فاذا دخل المسافر بلدة ونوىٰ ان يقيم بها يوما مثلا ثم خرج منها ثم رجع اليها قصر فيها كما كان يقصر قبل خروجه وعليه يحمل كلام المحققين لقول البحر انهم قالوا لافائدة فيه لانه يبقى فيه مسافرا على حاله.

(۳۲۴) کوئٹہ سے قلات اگر پندرہ دن سے کم کیلئے جانا ہوتو قصر کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بغرضِ ملازمت میرا ضلع قلات آنا جانا رہتا ہے۔ ہمیشہ جب بھی جاتا ہوں ایک آدھ ہفتہ کی نیت ہوتی ہے۔ اس کے بعد واپس اپنے وطن اصلی کوئٹہ آجاتا ہوں۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ قلات میں نماز قصر کروں یا پوری پڑھوں؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... چونکہ ضلع قلات اور آپ کے وطن اصلی کوئٹہ کے درمیان مسافت، شرعی مقدار مسافت سے زیادہ ہے اور وہاں پر آپ کی پندرہ دن یا اس سے زیادہ ٹھہرنے کی نیت بھی نہیں ہوتی اس لئے آپ پر قلات میں اور حالت سفر میں قصر نماز پڑھنا لازم ہے۔

لمافی الهندية(۱/۱۳۹): ولا يزال على حكم السفر حتى ينوى الاقامة فى بلدة او قرية خمسة عشر يوما أو اكثر كذا فى الهداية هذا اذا سار ثلاثة ايام.

وفى الشامية(۲/۱۳۱): (قوله الوطن الاصلى) ويسمى بالاهلى ووطن الفطرة والقرار (قوله او تأهله) اى تزوجه قال فى شرح المنية: ولو تزوج المسافر ببلد ولم ينو الاقامة به فقيل لايصير مقيما وقيل يصير مقيما وهو الاوجه ولو كان له اهل ببلدتين فأيتهما دخلها صار مقيما، فان ماتت زوجته فى احداهما وبقى له فيها دور وعقار قيل لايبقى وطناله اذا المعتبر لاهل دون الدار كما لو تاهل ببلدة واستقرت سكناله وليس له دارفيها وقيل تبقى (قوله او توطنه) أى عزم على القرار فيه وعدم الارتحال وان لم يتأهل، فلو كان له ابوان ببلد غير مولده وهو بالغ ولم يتاهل به فليس ذلك وطناله الا اذا عزم على القرار فيه وترك الوطن الذى كان له قبله.

(۳۲۵) دوشہروں میں رہائش ہوتو وطن اصلی کونسا ہوگا؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کا آبائی شہر سکھر ہے لیکن اب اس نے لاہور میں شادی کرلی ہے کبھی سکھر میں رہتا ہے اور کبھی لاہور میں تو اس کا وطن اصلی لاہور ہوگا یا سکھر؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں اگر مذکورہ شخص اپنے اہل وعیال کے ساتھ سکھر میں رہتا ہو، اور یہاں پر ہمیشہ رہنے کا ارادہ ہو، اور کبھی لاہور میں اپنے اہل عیال کے ساتھ رہتا ہو، اور یہاں اپنا گھر بھی ہو، اور یہاں پر ہمیشہ رہنے کا ارادہ ہو، تو دونوں جگہیں ان کا وطن اصلی ہوگا۔ اور اگر سسر کے ہاں بچوں کو ملنے ملانے کیلئے آیا ہوتو اگر پندرہ دن یا زیادہ دن تک ٹھہرنے کا ارادہ ہوتو مقیم ہوگا۔

لمافی الهندية(۱/۱۴۲): ويبطل الوطن الاصلى بالوطن الاصلى اذا انتقل عن الاول بأهله واما اذا لم ينتقل بأهله ولكنه استحدث اهلا ببلدة اخرى فلا يبطل وطنه الاول ويتم فيهما.

وفی الخانیه علی هامش الهندیة(۱/۱۶۶): الکوفی اذا نوی الاقامة بمکة ومنی خمسة عشر یوما لم یکن مقیما وان لم یکن بینهما مسیرة سفر لانه لم ینو الاقامة فی احدهما خمسة عشر یوما وان تأهل بهما کان کل واحد من الموضعین وطنا اصلیا له.

وفی الشامیة(۲/۱۳۱): ولو کان له أهل ببلدتین فایتهما دخلها صار مقیما.

(۳۲۶) کسی دوسرے شہر کو وطن بنالیا تو کیا اب وطن اصلی میں پندرہ دن سے کم قیام پر قصر کریگا؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا تعلق صوبہ پنجاب سے ہے اور کراچی میں ملازمت کرتا ہوں، اب صورت حال یہ ہے کہ میں اہلیہ کے ساتھ کرایہ کے مکان میں رہائش پذیر ہوں اور کم از کم پچیس سال ملازمت کے ہیں جن میں یہیں رہنے کا ارادہ ہے اور اپنا ذاتی مکان بنانے کا ارادہ بھی ہے جس کیلئے پلاٹ خرید لیا ہے جبکہ اپنا اصلی گھر جو پنجاب میں ہے وہاں والدین اور بھائی رہتے ہیں اب پوچھنا یہ ہے بسا اوقات میں پندرہ دن سے کم مدت کیلئے پنجاب جاتا ہوں تو آیا جب میں اپنے وطن اصلی میں جاؤں گا تو میں نماز مکمل پڑھوں گا یا قصر ہوگی؟ شریعت مطہرہ کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں آپ نے اگر یہاں (کراچی میں) مستقلاً رہنے کا ارادہ کرلیا ہے اور یہاں سے مستقلاً پنجاب واپس جانے کا ارادہ نہیں اور اپنے بیوی بچوں کو بھی کراچی منتقل کردیا ہے تو اس صورت میں کراچی آپ کا وطن اصلی ہوگیا ہے پنجاب آپ کا وطن اصلی نہیں رہا، اگرچہ والدین وغیرہ وہاں ہیں۔ اب پنجاب جانے کی صورت میں اگر آپ کی وہاں ٹھہرنے کی نیت پندرہ دن سے کم کی ہو، تو اِس صورت میں آپ قصر کریں گے۔

وفی الشامیة (۲/۱۳۱): (قوله الوطن الأصلی) ویسمٰی بالأهلی ووطن الفطرة والقرار ح عن القهستانی (قوله أوتأهله) أی تزوجه قال فی شرح المنیة: ولو تزوج المسافر ببلدولم ینوالأقامة به فقیل لایصیر مقیما وقیل یصیر مقیما،وهو الأوجه ولو کان له أهل ببلدتین فأیتهما دخلها صارمقیما، فأن ماتت زوجته فی إحداهما وبقی له فیها دور وعقار قیل لایبقی وطناله اذ المعتبر الأهل دون الدار کمالو تاهل ببلدة واستقرت سکناله ولیس له فیها دار...... وقیل تبقی (قوله أو توطنه) أی عزم علی القرار فیه و عدم الارتحال وإن لم یتأهل، فلو کان له أبوان ببلد غیر مولده وهو بالغ ولم یتأهل به فلیس ذلک وطناله الااذا عزم علی القرار فیه وترک الوطن الذی کان له قبله.

(۳۲۷) رہائش کراچی میں ہو، اور سسرال سجاول میں، تو سسرال میں نمازوں کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں خود کراچی میں رہتا ہوں اور میرے سسرال والے سجاول میں رہتے ہیں اور میرا اکثر سجاول آنا جانا رہتا ہے۔ تو کیا میں جب سجاول جاؤں تو وہاں نماز قصر کرسکتا ہوں جبکہ کراچی سے سجاول

تک مسافت شرعی پائی جاتی ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......صورت مسئولہ میں جب آپ کی رہائش بیوی بچوں کے ساتھ کراچی میں ہے اور پھر آپ سسرال سجاول پندرہ دن یا اس سے زیادہ رہنے کی نیت سے جاتے ہیں تو پھر آپ وہاں پوری نماز پڑھیں گے اور اگر آپ کی نیت سسرال پندرہ دن سے کم رہنے کی ہے تو وہاں آپ قصر کریں گے۔

لمافی الهندية (۱/۱۴۲): وطن أصلی وهو مولد الرجل أو البلد الذی تأهل به...... ويبطل الوطن الأصلی بالوطن الاصلی اذا انتقل عن الاول بأهله وأما اذا لم ينتقل بأهله ولكنه استحدث أهلا ببلدة أخرى فلا يبطل وطنه الاول ويتم فيهما.

وفی الهندية (۱/۱۳۹): ولا يزال علی حكم السفر حتی ينوی الاقامة فی بلدة أو قرية خمسة عشر يوما أو أكثر كذا فی الهداية.

(۳۲۸) عورت کا شادی کے بعد وطن اصلی کون سا ہوگا؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے والدین کراچی میں رہتے ہیں میں بھی ان ہی کے ساتھ رہتی تھی اب میرے والدین نے میری شادی کوئٹہ کے ایک لڑکے کے ساتھ کردی اب میری رہائش بھی کوئٹہ ہی میں ہے اب میرا وطن اصلی کون سا ہوگا؟ اور میرے لئے شرعاً کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداًومصلیاً......انسان کی جہاں پیدائش ہو وہ یا وہ شہر جہاں گھر بنالیا ہو اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ مستقل رہائش اختیار کرلی ہو وطن اصلی کہلاتا ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ وطن اصلی باطل ہوتا ہے وطن اصلی سے۔ اور یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ بیوی سفر واقامت میں اپنے شوہر کے تابع ہوتی ہے جبکہ وہ مہر معجّل ادا کر چکا ہو، اور عدم ادائیگی کی صورت میں حق زوجیت ادا کرنے سے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں کوئٹہ آپ کے حق میں وطن اصلی ہے اپنے شوہر کے ہمراہ مستقل رہائش اختیار کرنے کی وجہ سے۔ اور اب کراچی آپ کے حق میں وطن اصلی نہیں رہا۔

لمافی كبيری (صـ۵۰۱): فالاصلی وهو مولد الانسان او موضع تأهل به ومن قصده التعيش به لا الارتحال عنه اما لو كان له ابوان ببلد غير مولده وهو بالغ ولم يتأهل به فليس ذلك وطنا له وفی المبسوط هو الذی نشأفيه او توطن فيه اوتأهل فقوله او توطن فيه يتناول ماعزم القرار فيه وعدم الارتحال وان لم يتاهل فعلی هذا لو عزم من له ابوان فی بلد علی القرار فيه وترک الوطن الذی كان قبله له يكون وطناله ولو تزوج المسافر ببلدة ولم ينو الاقامة به فقيل لا يصير مقيما وقيل يصير مقيما وهوا لاوجه لمامر من حديث عثمانؓ.

لمافی الشامية(۲/۱۳۱): (قوله الوطن الاصلی) ويسمی بالأهلی ووطن الفطرة والقرارح عن

القهستانى (قوله أو تأهله) اى تزوجه قال فى شرح المنية: ولو تزوج المسافر ببلد ولم ينو الإقامة به فقيل لا يصير مقيما وقيل يصير مقيما، وهو الاوجه.

وفى الهندية(۱/۱۴۱): وكل من كان تبعا لغيره يلزمه طاعته يصير مقيما باقامته ومسافرا بنيته وخروجه الى السفر.

(۳۲۹) ۳۰ میل سفر کی نیت کے بعد ۲۵ میل آگے اور جانا پڑ جائے تو نماز کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے اپنے کام کے سلسلے میں گھر سے تقریباً ۳۰ میل کے فاصلے پر تین روز کیلئے جانا ہوا۔ وہاں جا کر کچھ مزید کام آ گیا اور اس مقام سے تقریباً ۲۵ میل دور اور سفر کرنا پڑا اور یہاں قیام تیرہ دن کا تھا اس کے بعد اپنے گھر جو کہ یہاں سے ۵۵ میل کے فاصلے پر ہے آنا تھا۔ اب میں اس دوسرے مقام پر نمازیں قصر کروں یا نہیں؟ براہ کرم جواب سے جلد سرفراز فرمائیے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... سفر شرعی کیلئے مسافت سفر کی نیت کرنا ضروری ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ اس دوسرے مقام پر بھی نماز پوری پڑھیں گے اس لئے کہ وہاں سے نکلتے وقت آپ کی نیت مسافت سفر شرعی سے کم مقدار طے کرنے کی تھی تو آپ شرعاً مسافر نہیں ہوں گے اور آپ پر احکام سفر لاگو نہ ہوں گے البتہ وہاں سے گھر لوٹتے وقت آپ قصر کریں گے کیونکہ واپسی کے وقت میں مسافت سفر پوری ہے۔

لمافى فتح القدير(۲/۲۸):السفر الذى يتعلق به تغير هذه الاحكام واخذ فيه مع المقدار الذى ذكره القصد فافادانه لوطاف الدنيا من غير قصد إلى قطع مسيرة ثلاثة ايام لا يترخص وعلى هذا قالوا امير خرج مع جيشه فى طلب العدو ولم يعلم اين يدركهم فانهم يصلون صلوة الاقامة فى الذهاب وان طالت المدة وكذا المكث فى ذلك الموضع اما فى الرجوع فان كانت مدة سفر قصروا......

وعلى اعتبار القصد تفرع فى صبى ونصرانى خرجا قاصدين مسيرة ثلاثه أيام ففى اثنائها بلغ الصبى وأسلم الكافر يقصر الذى اسلم فيما بقى ويتم الذى بلغ لعدم صحة القصد والنية من الصبى حين أنشأ السفر بخلاف النصرانى و الباقى بعدصحة النية أقل من ثلاثة أيام.

وفى الشامية(۲/۱۲۲): (قوله قاصداً) اشاربه مع قوله خرج الى أنه لو خرج ولم يقصد أو قصد ولم يخرج لا يكون مسافراً...... (قوله بلا قصد) بأن قصد بلدة بينه وبينها يومان للاقامة بها فلما بلغها بدا له ان يذهب إلى بلدة بينه وبينها يومان وهلم جرًا. قال فى البحر وعلى هذا قالوا امير خرج مع جيشه فى طلب العدو ولم يعلم اين يدركهم فانه يتم وان طالت المدة أو المكث، امّا فى الرجوع فان كانت مدة سفر قصر.

﴿فصل فی الجمعة والعیدین﴾

(جمعہ اور عیدین کی نمازوں کے بیان میں)

(۳۳۰) جمعہ کی نماز کی نیت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں اور میرا دوست پابندی سے نماز پڑھتے ہیں آپ سے ایک بات یہ پوچھنی تھی کہ جمعہ کی نماز کی کیا نیت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... جمعہ کی نماز کی نیت کیلئے آپ امام صاحب کے پیچھے ان الفاظ سے نیت کرلیا کریں ''دو رکعت جمعہ کی ان امام صاحب کی اقتداء میں ادا کرتا ہوں۔''

وفی الدرالمختار (۱/۴۲۰، ۴۲۱): وینوی المقتدی المتابعة لم یقل ایضاً لانه لو نوی الاقتداء بالامام أو الشروع فی صلاة الامام ولم یعین الصلاة صح فی الاصح وان لم یعلم بها لجعله نفسه تبعاً لصلوة الامام.

(۳۳۱) نماز جمعہ کا مستحب وقت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جمعہ کی نماز اول وقت میں پڑھنا سنت ہے یا نہیں؟ ہمارے محلے میں ایک مسجد ہے اس میں جمعہ کی نماز بہت تاخیر سے ہوتی ہے جس کی وجہ سے بعض اوقات نمازیوں کو پریشانی ہوتی ہے خاص کر سردیوں کے موسم میں لہٰذا اس مسئلے کا شرعی حل بتلائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... سردی اور گرمی میں مطلقاً نماز جمعہ اوّل وقت ہی میں پڑھنا مستحب ہے، اس لئے ائمہ مساجد اور کمیٹی والوں کو چاہئے کہ وہ مستحب اوقات میں ہی نماز جمعہ کا وقت مقرر کریں، البتہ اگر کسی مصلحت کے تحت نماز جمعہ کا وقت تھوڑا بہت تاخیر سے رکھا جائے تو اس میں فقہاء نے گنجائش رکھی ہے۔ لیکن اتنی تاخیر میں نماز جمعہ کا وقت مقرر کرنا کہ اگلی نماز کا وقت قریب ہونے لگے یا امام کا ''مقررہ وقت سے'' بلاوجہ اتنی زیادہ تاخیر کرنا کہ جس سے مقتدیوں کو پریشانی ہو، یہ طریقہ خلاف سنت ہے اس سے احتراز کرنا چاہئے۔

لمافی البخاری (۱/۱۲۳): عن أنس ابن مالک رضی الله عنه أن رسول الله ﷺ کان یصلی الجمعة حین تمیل الشمس.

وفی الدرالمختار (۱/۳۶۶،۳۶۷): (وتاخیر ظهر الصیف) بحیث یمشی فی الظل (مطلقا)......
(وجمعة کظهر اصلا واستحبابا) فی الزمانین لأنها خلفه

وقال الشامی رحمه الله تحته: (قوله واستحبابا فی الزمانین) أی الشتاء والصیف ح ....وقال الجمهور: لیس بمشروع لأنها تقام بجمع عظیم فتأخیرها مفض إلی الحرج ولا کذلک الظهر وموافقة الخلف لأصله من کل وجه لیس بشرط اهـ.

(۳۳۲) سعی الی الجمعہ کونسی اذان پر واجب ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جمعہ کے دن اذان کے وقت سعی الی الجمعہ واجب ہے تو اذان سے کون سی اذان مراد ہے آیا خطبے کے وقت کی اذان مراد ہے یا اس سے پہلے والی اذان مراد ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... جمعہ کے دن خطبۂ جمعہ سے قبل دو اذانیں دی جاتی ہیں ان دونوں میں جو پہلی اذان ہے اس وقت سعی الی الجمعہ واجب ہے۔

لمافی الهندیة (۱/۱۴۹): ویجب السعی وترک البیع بالاذان الاول وقال الطحاوی یجب السعی ویکره البیع عند أذان المنبر وقال الحسن ابن زیاد المعتبر هو الأذان علی المنارة والأصح ان کل أذان یکون قبل الزوال فهو غیر معتبر والمعتبر أوّل الاذان بعد الزوال سواء کان علی المنبر أو علی الزوراء.

وفی الشامیة (۲/۱۶۱): وحاصله أن السعی نفسه فرض والواجب کونه فی وقت الأذان الأول.

(۳۳۳) عیدگاہ سے واپسی پر تکبیر پڑھنا کیسا ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عیدگاہ سے واپسی پر راستے میں تکبیر پڑھنا مسنون ہے کہ نہیں؟ کوئی پڑھے تو نفس جواز کی وجہ سے جائز ہے کہ نہیں یا بدعت کہلائے گی؟ زید کہتا ہے کہ متون وشروح میں صرف جاتے ہوئے پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے، عیدگاہ پہنچنے پر ترک کا حکم ہے، اس کے علاوہ واپسی پر پڑھنے کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا ہے، لہٰذا واپسی پر پڑھنا صحیح نہیں؟ جبکہ بکر کا کہنا ہے کہ مصنف میں ان من السنة التکبیر یوم العید، اور اعلاء السنن میں زینوا اعیادکم بالتکبیر اور انه ذکر مشروع سے استدلال کر کے جواز کا قول کیا جا سکتا ہے، ان دونوں میں کس کا قول صحیح ہے؟ اگر مع حوالہ جات عربی کتب جواب عنایت فرمادیں تو مہربانی ہوگی۔

الجواب حامداً ومصلیاً......عید الاضحیٰ میں عیدگاہ کی طرف جاتے ہوئے زور سے تکبیر کہنا سنت ہے یہاں تک کہ عیدگاہ پہنچ جائے اور عیدگاہ

سے واپسی پر تکبیر زور سے کہنا مسنون نہیں البتہ آہستہ کہنا جائز ہے۔لہٰذا صورت مسئولہ میں زید کا یہ کہنا صحیح ہے کہ متون اور شروحات میں صرف جاتے ہوئے تکبیر کہنے کا حکم دیا گیا ہے البتہ عیدگاہ پہنچنے پر ترک کا حکم جو دیا گیا ہے وہ جہراً ترک کا حکم دیا گیا ہے اگر کوئی آدمی عیدگاہ سے واپسی پر آہستہ آواز سے تکبیر کہے تو جائز ہے اس لئے کہ یہ ذکر ہے اور ذکر میں اخفاء کا حکم دیا گیا ہے اور بکر نے جو کہا ہے کہ عیدگاہ سے واپسی پر تکبیر کہنا جائز ہے تو اس کی بات صحیح ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ تکبیر آہستہ آواز سے کہی جائے۔لیکن اس نے جن احادیث سے استدلال کیا ہے اس کا استدلال کمزور ہے اس لئے کہ مصنف میں جو حدیث ہے کہ **ان من السنة ان یکبر یوم العید** اس سے کسی نے استدلال نہیں کیا ہے اور دوسری حدیث جو اعلاء السنن میں مذکور ہے **زینوا اعیادکم بالتکبیر** ۔اس سے مراد جہری تکبیر ہے جو عیدگاہ کی طرف جاتے ہوئے راستے میں پڑھی جاتی ہے نہ کہ واپسی پر البتہ تکبیر کہنا فی نفسہ جائز ہے اس لئے کہ یہ تکبیرات ذکر ہیں اور ذکر کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں **ان النبی ﷺ کان یذکر اللہ تعالیٰ فی کل احیانہ** لہٰذا ان تکبیرات کو اگر کوئی آدمی آہستہ آواز سے کہے تو اس میں کوئی حرج نہیں البتہ زور سے کہنا مسنون نہیں۔

لمافی المصنف لابن شیبة(۱۹۲/۴): حدثنا عبد اللہ بن ادریس عن یحیی بن عبداللہ بن ابی قتادة قال: أراه عن محمد بن ابراهیم: ان ابا قتادة کان یکبر یوم العید ویذکر اللہ.

وفی اعلاء السنن(۱۱۸/۸): ویکبر عقب الصلاة جهراً ولا یجهر فیما سوی ذالک ای لایسن والا فهو ذکر مشروع هذا محصل مافی (الشامیة، ۸۷۵/۱)

وفی کتاب التجنیس والمزید(۲۳۵/۲): واذا توجه الی المصلی یکبر فی عید الاضحیٰ لانه علیه الصلاة والسلام کان یکبر فی الطریق ولا یکبر فی عید الفطر جهراً عند ابی حنیفةؒ خلافا لهما وهو معروف. وفی الهامش قال المؤلف فی الهدایة فی العنوان السابق(۶۴/۱) ویتوجه الی المصلی ولا یکبر عند ابی حنیفةؒ فی طریق المصلی وعندهما: یکبر اعتباراً بالاضحیٰ وله أن الاصل فی الثناء الاخفاء والشرع وردبه فی الاضحی لانه یوم تکبیر ولا کذالک یوم الفطر وروی عن ابن عمر رضی اللہ عنهما انه کان اذا غدا الی المصلی کبر فرفع صوته بالتکبیر وفی روایة اخری: کان یغدو الی المصلی یوم الفطر اذا طلعت الشمس فیکبر حتی یأتی المصلی ثم یکبر بالمصلی حتی اذا جلس الامام ترک التکبیر قال مجدّ الدین: رواهما الشافعی. المنتقیٰ: باب الخروج الی العید ماشیأ والتکبیر فیه وما جاء فی خروج النساء(صـ۲۶۲) رقم الحدیث(۱۶۵۲،۱۶۵۳) ونیل الاوطار(صـ۲۸۵،۲۸۶) یستفاد من الحدیثین واحادیث الباب علی ان التکبیر سنة حال المشی الی المصلی وفی المصلی الی ان یقیم الصلوٰة، اشار الی هذا ابن قدامه.

وفی الطحطاوی علی الدر(۳۵۵/۱): ویکبر جهراً اتفاقاً فی الطریق قیل وفی المصلی وعلیه عمل

الناس اليوم لافی البيت.

وفی الدرالمختار(۲/۱۸۰): ولا بأس به عقب العيد لأن المسلمين توارثوه وفی الهامش: "قوله لا بأس ...... كلمة لا بأس قد تستعمل فی المندوب كمافی البحر من الجنائز والجهاد ومنه هذا الموضع لقوله فوجب اتباعهم(قوله فوجب) الظاهر ان المراد بالوجوب الثبوت لا الوجوب المصطلح عليه وفی البحر عن المجتبى والبلخيون يكبرون عقب صلاة العيد لانها تؤدى بجماعة فاشبهت الجمعة اهـ وهو يفيد الوجوب المصطلح عليه ط.

(۳۳۴) خطبۂ عید میں خطیب کے ساتھ تکبیرات پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عید کے خطبہ کے دوران خطیب صاحب تکبیر پڑھتے ہیں تو سننے والا بھی خطیب کیساتھ تکبیر پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ اگر کوئی پڑھتا ہے تو اسکے بارے میں شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... سامعین کا سماع خطبہ کے وجوب کی وجہ سے تکبیرات پڑھنا مکروہ تحریمی ہے اگر کوئی پڑھتا ہے تو گنہگار ہوگا۔

لمافی حاشية الطحطاوی علی المراقی (ص۵۳۵): قال عبدالله بن مسعودؓ، هو السنة ويكبر القوم معه ويصلون على النبی ﷺ فی أنفسهم امتثالاً للامر وسنة الانصات.

وقال الطحطاوی تحته: (قوله فی انفسهم)المرادانهم يسرون به كماتقدم والظاهر انه متعلق بالتكبير والصلاة لانه يجب الانصات لجميعها وقوله سنة الانصات الاولى ان يقول وواجب الانصات.

(۳۳۵) عید کے خطبوں میں تکبیرات کتنی مرتبہ اور کب کہی جائیں گی؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عیدین کے پہلے خطبے میں نو بار اور دوسرے میں سات بار تکبیریں ہیں یہ تکبیریں مسلسل کہی جائیں یا پورے خطبے میں متفرق طور پر بھی کہی جا سکتی ہیں؟ اولیٰ وافضل کیا ہے؟ نیز تکبیر سے مراد صرف اللہ اکبر ہے یا پوری تکبیر تشریق ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... عیدین میں جو دوران خطبہ تکبیریں کہی جاتی ہیں ان کی کوئی تعداد متعین نہیں لیکن مناسب یہ ہے کہ تکبیر خطبہ سے زیادہ نہ ہو، اور عیدالاضحیٰ کے خطبہ میں عیدالفطر کے خطبے کے بنسبت زیادہ تکبیریں ہوں البتہ مستحب وافضل یہ ہے کہ پہلے خطبہ کے شروع میں مسلسل نو مرتبہ اور دوسرے خطبہ کے شروع میں مسلسل سات مرتبہ تکبیریں کہی جائیں نیز تکبیر سے پوری تکبیر تشریق (اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد) مراد ہے۔

لمافی الدرالمختار (۲/۱۷۵): (ويبدأ بالتكبير فی) خمس (خطبة العيدين) ...... (ويستحب ان

یستفتح الاولی بتسع تکبیرات تتری) ای متتابعات (والثانیۃ بسبع) ھو السنۃ الخ.

وفی الشامیۃ (۱۷۵/۲): (قولہ ویستحب الخ) ذکر ذلک فی المعراج عن مجمع النوازل وقال فی الخانیۃ انہ لیس للتکبیر عدد فی ظاھر الروایۃ لکن ینبغی ان لا یکون اکثر الخطبۃ التکبیر ویکبر فی الاضحی اکثر من الفطر اھ قلت: واطلاق العدد فی ظاھر الروایۃ لاینافی تقییدہ بماورد فی السنۃ وقال بہ الشافعی رحمہ اللہ تعالیٰ.

وفی الام(۲۷۳/۱): التکبیر فی الخطبۃ فی العیدین...... عن عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبۃ قال السنۃ فی التکبیر یوم الاضحیٰ والفطر علی المنبر قبل الخطبۃ ان یبتدیء الامام قبل ان یخطب وھو قائم علی المنبر بتسع تکبیرات تتری لا یفصل بینھا بکلام ثم یخطب ثم یجلس جلسۃ ثم یقوم فی الخطبۃ الثانیۃ فیتفتحھا بسبع تکبیرات تتری لا یفصل بینھا بکلام ثم یخطب الخ.

وفی المغنی (۲۴۴/۲): فان صفۃ الخطبتین کصفۃ خطبتی الجمعۃ الا انہ یستفتح الاولی بتسع تکبیرات متوالیات والثانیۃ بسبع متوالیات قال القاضی وان ادخل بینھما تھلیلا او ذکرا فحسن الخ.

(۳۳۶) جمعہ کے دوخطبوں سے پہلے خطیب صاحب کے عربی اردو ملا خطبہ کے دوران نفل نماز پڑھنے کی ممانعت سے متعلق ایک دارالافتاء کی تحقیق اوراس پر استدراک

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مسئلہ کی تحقیق کی درخواست ہے براہ کرم فقہاء احناف کی معتبر کتب سے اس کا مدلل جواب چاہیے۔

مسئلہ یہ ہے کہ نماز جمعہ کیلئے جامع مسجد کی پہلی اذان کے بعد خطیب صاحب خطبہ اور نماز جمعہ پڑھانے کی ہی نیت سے آتے ہیں لوگ بھی خطبہ سننے کی غرض سے مسجد میں جمع ہوتے ہیں، خطیب صاحب منبر پر تشریف لاتے ہیں تو سب سے پہلے عربی کلمات میں حمد وثنا شہادۃِ توحید ورسالت صلاۃ وسلام علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام ودیگر تمام مسلمانوں کے لئے دعا اور موضوعِ خطاب سے متعلق قرآن کریم سے چند آیات کی تلاوت فرماتے ہیں اس کے بعد انہیں آیات سے متعلق تفسیر اور احادیث کی روشنی میں اردو میں خطاب کرتے ہیں، جیسا کہ ہندو پاک میں عام معمول ہے، پھر عربی میں بھی دو مستقل خطبے اذانِ ثانی کے بعد دیتے ہیں پھر نماز پڑھاتے ہیں۔

خطبہ کی شرائط سنن ومستحبات کا مختلف عربی فتاوی مثلاً شامیہ، البحر الرائق، طحطاوی علی مراقی الفلاح، بدائع الصنائع، خلاصۃ الفتاویٰ ہندیہ، محیط البرھانی، اوران کے علاوہ بھی کئی فتاویٰ کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ دوخطبوں سے پہلے یہ عربی اردو ملا خطبے کا بھی وہی حکم ہے جو عربی خطبہ کا ہے اس پر بھی خطبہ کی تعریف صادق آتی ہے، چنانچہ کوئی شخص صرف اسی پر اکتفاء کرلے تو شرط

کے درجہ میں نماز جمعہ کی صحت کیلئے کافی ہے۔ چنانچہ حضرت اقدس مفتی اعظم مولانا محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

''کہ خطبہ کے لئے کچھ تو ارکان وفرائض ہیں جن پر خطبہ کی صحت وعدم صحت کا مدار ہے اور کچھ آداب وسنن ہیں۔ جو اس کے مکملات میں سے ہیں'' (جواہر الفقہ، ص:۳۴۹)

اگرچہ ترک سنت کی وجہ سے مکروہ ہوگا اور اس کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن کم از کم شرط کے درجہ میں خطبہ کا مقام اس کو بھی حاصل ہے لہٰذا اس دوران بھی نوافل پڑھنا منع ہے اور اس کی اجازت دینے میں شرائط وارکان کے وجود پر مشتمل عمل کے وجود کو تسلیم نہ کرنا لازم آتا ہے جو کہ فقہاء کرام کی تعریفات وتشریحات کے انکار کو مستلزم ہے۔

اس لئے کہ فقہاء کرام کی عبارات میں اتفاقی قیودات نہیں ہوتے، ان کی تعریفات جامع اور مانع ہوتی ہیں چنانچہ ان کی عبارات کا مفہوم مخالف بھی معتبر مانا جاتا ہے۔ ایسے ہی مسئلہ کے متعلق علامہ شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں'' **والالزم الحکم ببطلان الاولیٰ بترک ما لیس برکن ولا شرط کمامر عن الفتح.** (شامی، ص ۶۵ ج ۲)''

ذیل میں فقہی عبارات سے حوالے ملاحظہ ہوں استشہاد صحیح ہو تو براہ کرم تائید فرمائیں اور اگر ہم نے صحیح نہ سمجھا ہو تو اصلاح فرمائیں نوازش ہوگی۔

خطبہ کی تعریف وحقیقت واضح کرتے ہوئے'' مراقی الفلاح'' اور اس کی شرح'' حاشیۃ الطحطاوی'' میں لکھتے ہیں:

(والرابع الخطبۃ ولو بالفارسیۃ من قادر علی العربیۃ ویشترط لصحۃ الخطبۃ فعلھا قبلھا...... وفی الطحطاوی علی مراقی الفلاح (والرابع الخطبہ فعلۃ بمعنی مفعولۃ فھی اسم لما یخطب بہ غایۃ من الخطب وھو فی الاصل کلام بین اثنین قھستانی عن الا زاھر وھی بالضم فی الموعظۃ الجمع خطب وبالکسر طلب التزوج (ص ۵۰۹، قدیمی کتب خانہ)

کذا فی جامع الرموز للقھستانی (ص۲۶۴ ج ۱) وکذا فی قواعد الفقہ (ص ۲۷۶)

وفی المحیط البرھانی: ولان ما یشبہ الامر بالمعروف خطبۃ من حیث المعنی وان لم یکن خطبۃ من حیث النظم لان الخطبۃ فی الحقیقۃ وعظ وامر بالمعروف (المحیط البرھانی، ص ۴۵۹، ج ۲)

خطبہ کی شرائط نہایت جامع انداز میں'' مراقی الفلاح'' اور اس کی شرح حاشیۃ الطحطاوی میں بیان فرماتے ہیں:

فھذہ خمس شروط اوست لصحۃ الخطبۃ فلیتنبہ، قال الطحطاوی (۱) الاول ان تکون قبل الصلاۃ (۲) والثانی ان تکون بقصد الخطبۃ (۳) الثالث ان تکون فی الوقت (۴) والرابع ان یحضرھا واحد (۵) الخامس ان یکون ذالک الواحد ممن تنعقد بھم الجمعۃ (۶) السادس عدم الفصل بین الخطبۃ والصلاۃ بقاطع. (مراقی الفلاح، ص ۵۱۰)

حضرت اقدس مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

’’کہ خطبہ کے لئے کچھ تو ارکان وفرائض ہیں جن پر خطبہ کی صحت وعدم صحت کا مدار ہے اور کچھ آداب وسنن ہیں۔ جو اس کے مکملات میں سے ہیں‘‘ (جواہر الفقہ ،ص:۳۴۹)

دوسری جگہ فرماتے ہیں ’’فرض صرف دو ہیں (۱) وقت جمعہ (۲) مطلق ذکر اللہ خواہ کسی لفظ سے ہو پھر امام صاحب کے مذہب پر طویل ہو یا مختصر اور صاحبین کے مذہب پر ذکر طویل جس کو عرفاً خطبہ کہا جاسکے شرط ہے۔ کذا فی الھدایہ والفتح والبحر‘‘ (جواہر الفقہ ص:۳۵۰)

اسی طرح ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں ’’اسی کے ساتھ ایک سولہویں سنت اور ہے .... کہ خطبہ صرف عربی زبان میں ہو غیر عربی میں نہ ہو۔ (جواہر الفقہ ص۳۵۰)

اردو کے مذکورہ بیان پر فقہاء کرام کی وضاحت کے مطابق پوری طرح خطبہ کی تعریف صادق آتی ہے، اس لئے کہ یہ ذکر تو ہے ہی جو کہ خطبہ کے لئے رکن ہے، اس کے علاوہ خطبہ کی تمام شرائط پر بھی مشتمل ہے اور یہ بھی واضح فرمادیا ہے کہ خطبہ کا عربی میں ہونا کوئی شرط نہیں ہے ہاں سنت موکدہ ہے تو وجوب استماع کے لئے معلوم نہیں کونسی چیز مانع ہے؟ جبکہ احتیاط کا بھی یہی تقاضا ہے کہ جب مبیح اور محرم دونوں دلائل متوجہ ہوں تو محرم کو ترجیح دی جاتی ہے۔

اور خطبہ کی سنن کو تفصیلا شمار فرمایا:

(وسنن الخطبة ثمانية عشر شيئا بل يزاد عليها...... منها الطهارة...... والجلوس على المنبر قبل الشروع في الخطبة والاذان بين يديه كالاقامة ثم قيامه والسيف بيساره وبدونه في بلدة فتحت صلحا واستقبال القوم بوجهه وبدائته بحمد الله والثناء عليه بما هو اهله والشهادتان وصلاة على النبي صلى الله عليه وسلم والعظة والتذكير وقراءة آية من القرآن والجلوس بين الخطبتين الخ (مراقي الفلاح،ص ۵۱۴،ج ۱) وكذا في جامع الرموز للقهستاني (ص ۲۶۹،ج ۱)

وكذا الفقه الاسلامي وادلته (ص ۱۳۱۱،ج ۲) كذا في خلاصة الفتاوىٰ (ص ۲۰۵،ج ۱)

- خطبہ کا بڑا مقصد یعنی وعظ وتعلیم تو اس خطاب سے حاصل ہورہا ہے۔ **كما في الدر (۱۷۵/۳): لان الخطبة شرعت للتعليم.**

اور رکن وشرائط کے علاوہ کئی سنتوں پر بھی مشتمل ہے، لیکن تمام تر سنتوں کا امتثال چونکہ عربی خطبہ میں ہی ہوتا ہے اور اس کی اپنی اہمیت ہے جیسا کہ حضرت مفتی اعظم پاکستان نے اپنے رسالہ میں واضح فرمادیا ہے، اس لئے عربی خطبے مستقل دیئے جاتے ہیں تاہم شرط کے درجہ میں اس سے خطبہ کی ضرورت بلاشبہ پوری ہوتی ہے، تو اس دوران نماز وتلاوت وغیرہ کی اجازت کیسے دی جاسکتی ہے؟ چنانچہ علامہ شامی

رحمہ اللہ ایک مسئلہ کے ضمن میں بیان فرماتے ہیں۔

قال و الطهارة سنة عندنا لاشرط حتى ان الامام اذا خطب جنبا او محدثا فانه يعتبر شرطا لجواز الجمعة.

قال المحشي تحت هذا القول: قوله (فانه يعتبر شرطا اى مافعله الامام من الخطبة جنبا او محدثا يعتبر ويعتدبه من حيث كونه شرطا لصحة الجمعة بمعنى انه يجزى ويكفي وان كان مرتكبا لمحرم لو كان بلا عذر. (شامی، ص ۱۵۰، ج ۲)

ان تمام دلائل سے ہم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ یہ خطاب بھی خطبہ کے حکم میں ہے اور اس دوران استماع کے خلاف کوئی بھی عمل جائز نہیں اگرچہ عربی خطبہ کی طرح تمام صفات پر مشتمل نہ ہونے کی وجہ سے بدرجہ اتم نہیں ہے لیکن خطبہ ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ کسی عمل کو فقہاء کرام کی تعریفات اور توضیحات پر ہی پرکھا جائے گا۔

عربی اور اس خطبہ کے درمیان فرق یہ ہے کہ اس کے شروع کا حصہ تو عربی ہے لیکن بعد کا حصہ زیادہ اردو پر مشتمل ہے، دوسرا فرق یہ ہے کہ عربی خطبوں کے لیے اذانِ ثانی دی جاتی ہے، تیسرا یہ کہ یہ خطبہ عموماً خطیب بیٹھ کر دیتا ہے اور عربی خطبے کھڑے ہو کر، چوتھا یہ کہ عربی خطبوں کے درمیان تھوڑی دیر کے لیے خطیب بیٹھ کر دونوں خطبوں کے درمیان فصل دیتا ہے لیکن یہ تمام صفات ایسی نہیں ہیں کہ جن کی رعایت نہ رکھنے کی وجہ سے یہ خطبہ ہی نہ رہے، بلاشبہ شرط کے درجہ میں یہ بھی خطبہ ہے اگرچہ ناقص ہے اور عربی کے دونوں خطبے بدرجہ اتم واکمل ہیں اور اس کے لئے شواہد اور نظائر بھی ہیں طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو ذکر کر دیتے، اور اذان ثانی کو قاطع بھی نہیں قرار دے سکتے۔

چنانچہ عمل قاطع کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

(وعمل قاطع) كما اذا جامع ثم اغتسل واما اذا لم يكن قاطعا كما اذا تذكر فائتة وهو فى الجمعة فاشتغل بالقضاء او افسد الجمعة فاحتاج الى اعادتها او افتتح التطوع بعد الخطبة لاتبطل الخطبة بذالك لانه ليس بعمل قاطع لكن الاولى اعادتها كمافى البحر. (مراقى الفلاح، ص ۵۱۰ م قديمى) كذافى خلاصة الفتاوى (ص ۲۰۵، ج ۱)

بالفرض فقہاء کرام کی عبارات میں کوئی جزئیہ ملے جس سے یہ واضح ہو کہ اس کو خطبہ کا درجہ نہیں دیا جا سکتا حالانکہ کافی تلاش کے باوجود ہماری نظروں سے اب تک ایسا کوئی جزئیہ نہیں گزرا لیکن اصل موقف ''کہ اس خطاب کے دوران حاضرین کے لئے نوافل پڑھنا منع ہے'' کے ثبوت کیلئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد:

''عن ابن عمر رضى الله عنه قال سمعت النبى صلى الله عليه وسلم اذا دخل احدكم المسجد والامام على المنبر فلا صلاة ولا كلام حتى يفرغ الامام. رواه الطبرانى بحواله اعلاء السنن

وعن ابی هريرة رضی الله عنه خروج الامام يوم الجمعة يقطع الصلاة و كلامه يقطع الكلام (رواه البيهقی بحواله اعلاء السنن، ج ۲/ص ۷۱) بھی کافی ہے۔

چنانچہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ امام کے نکلنے کے ساتھ ہی نماز، ذکر تلاوت وغیرہ کومنع فرماتے ہیں۔ اگر چہ منبر تک پہنچے نہیں ہیں اور خطبہ شروع نہیں کیا۔

كمافی مراقی الفلاح (واذا خرج الامام فلا صلاة ولا كلام) وهو قول الامام رحمه الله تعالیٰ لانه نص النبی صلی الله عليه وسلم (ص ۵۱۸)

اور صاحبین بھی نماز کو امام صاحب کے نکلنے کے ساتھ ہی منع فرماتے ہیں البتہ ذکر و تلاوت منبر پر تشریف لانے کے بعد منع فرماتے ہیں۔

وقال ابو يوسف ومحمد رحمهما الله تعالیٰ لا باس بالكلام اذا خرج قبل ان يخطب واذا نزل قبل ان يكبر. واختلفا فی جلوسه اذا سكت فعند ابی يوسف يباح وعند محمد لا يباح" مراقی الفلاح (ص۵۱۸)

نماز کی ممانعت میں فقہاء کرام نے امام ابوحنیفہؒ کے قول کو ترجیح دی ہے اور اس کو مفتی بہ قرار دیا ہے۔

فی الدرالمختار: اذا خرج الامام) من الحجرة ان كان والافقيامه للصعود شرح المجمع (فلا صلاة ولا كلام الی تمامها) وان كان فيها ذكر الظلمة فی الاصح

قال الشامی: واخرج ابن ابی شيبه فی مصنفه عن علی وابن عباس وابن عمر رضی الله عنهم كانوا يكرهون الصلاة والكلام بعد خروج الامام والحاصل ان قول الصحابی حجة يجب تقليده عندنا اذا لم ينفه شئ آخر من السنة. (درمختار، ج ۲/ص ۱۵۸)

قال الطحطاوی اذا خرج من حجرته ان كانت والافقيامه للصعود قاطع كمافی شرح المجمع فيثبت المنع بمجرد ظهوره ولو قبل صعوده المنبر وقيل اذا صعد وعليه جری الكمال والزيلعی والعينی وقال بعد اسطر اختلف المشائخ علی قول الامام فی الكلام قبل الخطبة ...... (مراقی ص ۵۱۹)

اور اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ امام صاحب خطبہ ہی کی غرض سے حجرہ سے نکل آئے ہیں اور اب منبر پر بھی تشریف فرما ہیں۔ لہٰذا تمام دلائل اس تائید میں ہیں کہ دوران اردو خطبہ نماز ذکر و تلاوت وغیرہ کو اب موخر کریں اور خطبہ کی طرف متوجہ ہوں نوافل اور تلاوت کے لئے پھر بھی موقع مل سکتا ہے اور یہ موقع خطبہ کے لیے ہے۔ نیز تمام فتاویٰ میں یہ حکم واضح فرمادیا ہے کہ وجوب استماع کا یہ حکم جمعہ اور عیدین کے خطبوں کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ تمام خطبے سننا واجب ہے۔

(۱) چنانچہ مفتی اعظمؒ نے بھی جواہر الفقہ میں واضح فرمادیا ہے۔

خطبہ جمعہ وعیدین ونکاح وغیرہ اس بات میں قول مختار کے موافق سب شریک ہیں کہ جب خطیب خطبہ پڑھے تو کلام وسلام یہاں تک کہ ذکر وتسبیح وغیرہ سب ناجائز ہوجاتے ہیں بلکہ چپ بیٹھنا اور خطبہ سننا ضروری ہوجاتا ہے۔
(جواہر الفقہ، ص۳۶۵)

وفی مراقی الفلاح: كذا استماع سائر الخطب كخطبة النكاح والختم (مراقی الفلاح ص ۵۱۹)

وفی قواعد الفقه: والخطب كثيرة كخطبة الجمعة والعيدين والاستسقاء والكسوف والنكاح وختم القرآن وغير ذالك ويجب فی الجميع الاستماع كذا فی الدرر. (ص۲۷۸) كذا فی ردالمحتار (ص ۱۵۹، ج ۲)

(۲) خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز کا فتویٰ ہے کہ ہر وعظ کے دوران انصات ضروری ہے۔

وفی التفسير المظهری: قال عمر بن عبدالعزيز الانصات لقول كل واعظ (مظهری، ص ۴۵۰، ج ۳)

(۳) امام بخاریؒ اور اسی طرح دیگر محدثین نے اس موضوع پر مستقل ابواب قائم کئے ہیں۔

باب اصغاء الجليس لحديث جليسه الذی ليس بحرام واستنصات العالم والواعظ حاضری مجلسه (دليل الفالحين، ۱۴۷/۳)

(۴) علماء کرام کے بیان کے لئے انصات کا حکم ہے۔ "لمافی البخاری: باب الانصات للعلماء (بخاری، ۲۳/۱)"
علامہ بدرالدین عینیؒ عمدۃ القاری میں علماء کے بیان کے لئے وجوب استماع وانصات کا حکم دے رہے ہیں۔

هذا باب فی بيان الانصات لاجل العلماء واللام فيه للتعليل والانصات بكسر الهمزة السكوت والاستماع للحديث يقال نصت نصتا وانصت انصاتا اذا سكت واستمع للحديث وجه المناسبة بين البابين من حيث ان العلم انما يحفظ من العلماء ولا بدفيه من الانصات لكلام العالم حتى لا يشذ عنه شئ

وفيه ايضا: بيان استنباط الاحكام. الاول قال ابن بطالؒ فيه ان الانصات للعلماء والتوقير لهم لازم للمتعلمين قال الله تعالىٰ لا ترفعوا اصواتكم الخ.

ويجب الانصات عند قراة حديث رسول الله (صلى الله عليه وسلم) مثل ما يجب له وكذالك يجب الانصات للعلماء لانهم الذين يحيون سنته ويقيمون بشريعته...... الخ

(عمدة القاری، ۷۰/۳)

(۵) کسی بھی بیان کرنے والے کے سامنے نماز پڑھنا اس کے لئے تشویش کا باعث ہے بلکہ قریب میں سننے والے بھی متاثر ہوتے ہیں ایسی صورت میں ایذاء مسلم میں بھی داخل ہے۔

(۶) ایک اصلاحی اجتماعی عمل سے بلاضرورت اعراض بلکہ ظاہری مخالفت ہے۔اوراجتماعیت کی اہمیت شاید کسی عالم پر مخفی ہو۔

چند شبہات اوران کے جوابات:۔

شبہ(۱):۔حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اسی طرح حضرت عبداللہ ابن بسر رضی اللہ عنہ جمعہ کے روز منبر کے ساتھ کھڑے ہوکر احادیث بیان فرماتے تھے۔

لمافی المستدرک علی الصحیحین عن محمد عن ابیه قال رأیت اباهریرة رضی الله عنه یخرج یوم الجمعة فیقبض علی رمانتی المنبر قائما ویقول حدثنا ابو القاسم رسول الله صلی الله علیه وسلم الصادق المصدوق فلا یزال یحدث حتی اذا سمع فتح باب المقصورة لخروج الامام لصلاة جلس (ص ۵۸۶، ج ۳)

وفیه ایضا: عن ابی الزاهریة قال کنت جالسا مع عبدالله بن بسر یوم الجمعة فمازال یحدثنا حتی خرج الامام (ص ۴۲۵، ج ۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل خطبہ سے پہلے احادیث بیان کرنا کوئی خطبہ نہیں ہے چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور عبداللہ ابن بسر رضی اللہ عنہ خطیب کے نکلنے سے پہلے تک احادیث بیان فرماتے تھے البتہ خطیب کے نکلنے کے ساتھ ہی درس ختم کرتے تھے اور بیٹھ جاتے تھے۔

جواب:۔ مذکورہ دونوں حوالوں میں اس موقف کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے بلکہ اس سے مزید تائید مل رہی ہے چنانچہ صراحت ہے کہ خطیب کے نکلتے ہی درس کو ختم فرمادیتے تھے،اس میں اصل موقف کے خلاف کونسی بات ہے کہ اس دوران نماز پڑھنا جائز ہے یا یہ کہ دوخطبوں سے پہلے خود خطیب صاحب اگر وعظ کریں تو وہ خطبہ نہیں کہلائے گا؟اس سے زیادہ سے زیادہ یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ امام صاحب سے پہلے بھی کوئی دوسرا شخص درس یا وعظ کرے تو یہ جائز ہے۔

شبہ(۲):۔عربی خطبہ کے لئے اذان دی جاتی ہے اور یہ عربی اردو ملا خطبہ اذان اوّل کے بعد شروع ہوتا ہے اگر اس کو خطبہ کا حکم دیں تو خطبوں کے درمیان اذان دینا لازم آتا ہے۔

جواب:۔اذان ثانی کوئی شرط نہیں ہے جس کے انتفاء سے حکم بھی منتفی ہو اور خطبہ کے بعد یا درمیان میں دینے سے یہ کوئی عمل قاطع بھی نہیں ہے جیسا کہ حوالوں سے واضح ہے۔

شبہ(۳):۔اس طرح تو تین خطبے ہوجائیں گے؟

جواب:۔دوخطبے سنت ہیں ایک سے بھی شرط کے درجہ میں ضرورت پوری ہوجاتی ہے لیکن دو سے زیادہ خطبے دینے سے یہ تو

لازم نہیں آتا کہ خطبہ قرار نہ دیں۔اور معذرت کے ساتھ کہتے ہیں کہ علماء کرام صرف دوخطبوں پر ہی اکتفاء کرتے اگر پاک وہند کے عوام کی ضرورت سامنے نہ ہوتی۔تو یہ ضرورت کی وجہ سے رائج ہوا ہے۔

شبہ(۴):۔درمختار میں ہے"فی المسجد عظة وقرآن فاستماع العظة اولیٰ. ص ۶۶۳، ج ۱"
جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وعظ کا سننا اولیٰ ہے، جس کے خلاف کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔

جواب شبہ:۔حوالہ میں استماع قرآن کو بمقابلہ وعظ غیر اولیٰ قرار دیا ہے اور استماع وعظ کو اولیٰ قرار دیا ہے جبکہ استماع قرآن خارج نماز بھی مطلقاً واجب ہے۔

فی الدر (فروع) یجب الاستماع للقراءة مطلقا لان العبرة لعموم اللفظ.

وفی الشامیة قوله یجب الاستماع للقراءة مطلقا ای فی الصلاة وخارجها لان الآیة وان کانت واردة فی الصلاة علی مامر فالعبرة لعموم اللفظ لا لخصوص السبب وفی الفتح عن الخلاصة رجل یکتب الفقه وبجنبه رجل یقرء القرآن فلا یمکنه استماع القرآن فالاثم علی القاری (ص ۵۴۶، ج ۱)

وکذا فی الطحطاوی علی الدر (ص ۲۳۷، ج ۱)

وفی روح المعانی : وفی کلام اصحابنا یدل علی وجوب الاستماع فی الجهر بالقرآن مطلقا الخ (ص ۲۰۳، ج ۹)

تو اولیٰ یعنی وعظ کا استماع حاضرین مجلس پر بطریقہ اولیٰ واجب ہے۔آسانی کے لئے ہم شکل اوّل جو کہ بدیہی النتیجہ ہے کو ترتیب دیتے ہیں۔

شکل اوّل:۔**استماع الوعظ اولیٰ من استماع التلاوة. واستماع التلاوة واجب فاستماع الوعظ واجب.**

(۱) مقدمہ اولیٰ مسلمہ (جیسا کہ شبہ میں پیش کردہ حوالہ سے واضح ہے)

(۲) مقدمہ ثانیہ: شامی اور روح المعانی وغیرہ کے حوالہ سے واضح ہے۔

وجہ استدلال یا تلازم: **مقدمه مسلمه عندالمعقولین: ما ثبت لادنی فهو ثابت لاعلیٰ طبعا بالضرورة.**

بدقسمتی سے عام لوگ اپنی مذہبی زبان "عربی" کچھ نہیں جانتے اور خطبہ جس کا بڑا مقصد وعظ ونصیحت اور تعلیم ہے اگر صرف عربی خطبہ ہی رہے تو لوگ اس فائدہ سے محروم رہتے ہیں اسی ضرورت کے تحت تو یہ اردو بیان رائج ہوا ہے ورنہ عربی جیسے جامع خطبوں سے پورا استفادہ کرنے کی صورت میں اردو خطبوں کی کیا ضرورت تھی؟ تو عربی خطبے بدرجہ اتم خطبے ہیں اور اردو خطبہ کو بھی خطبہ کا مقام حاصل ہے ورنہ فقہاء کرام کی تصریحات وتشریحات سے انکار لازم آتا ہے۔

خلاصہ کلام

خطبہ جمعہ سے پہلے اردو وعظ کے دوران بھی نوافل پڑھنا منع ہے، بلکہ کوئی بھی مجلس وعظ ہوتو اس مجلس میں ہوتے ہوئے استماع کے خلاف کوئی عمل کرنا جائز نہیں ہے، ضرورت ہوتو اس مجلس سے نکلنا ضروری ہے۔

(۱) جمعہ کا یہ وعظ خطبہ کے حکم میں ہے اس لئے کہ یہ خطبہ کے تمام فرائض اور بعض سنتوں پر بھی مشتمل ہے۔

(۲) چونکہ امام صاحب منبر پر تشریف فرما ہوتے ہیں اور خطبہ ونماز ہی کی غرض سے حاضر ہوتے ہیں تو نفلی نماز وتلاوت وغیرہ کی اجازت دینے میں حدیث باب کے ظاہر کی مخالفت ہے۔

(۳) ہر خطبہ کے دوران نفل کا پڑھنا منع ہے جمعہ کے لئے یہ وعظ بھی ایک خطبہ ہے۔

(۴) اس وعظ کا شروع حصہ عربی میں مسنون کلمات کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔

(۵) خطبہ جمعہ کے لئے وجوب استماع وانصات کا حکم معلول بالعلۃ ہے یہ علت ہر وعظ میں پائی جاتی ہے۔

(۶) درمختار میں ہے ''**فی المسجد عظة وقرآن فاستماع العظة اولیٰ.** (ص ۲۶۳، ج ۱) ''مفتی بہ قول کے مطابق وجوب استماع قرآن کا حکم مطلقاً واجب ہے، یعنی نماز کے علاوہ بھی واجب ہے خصوصاً کوئی قاری پہلے سے پڑھ رہا ہے تو اس کے پاس جا کر خلاف استماع کوئی کام کرنا جائز نہیں ہے ملاحظہ ہو (حوالہ مذکورہ) تو وعظ جو کہ اولیٰ ہے اس مجلس میں شریک افراد کے لئے خلاف استماع عمل کرنا بطریقہ اولیٰ ناجائز ہے۔

(۷) شرح بخاری عمدۃ القاری میں ایک حدیث سے استنباط فرماتے ہوئے فیصلہ فرمادیا ہے کہ ہر عالم کی مجلس میں انصات کا حکم ہے۔

(۸) ریاض الصالحین میں ہے ''**باب اصغاء الجليس لحديث جليسه الذى ليس بحرام واستنصات العالم والواعظ حاضرى مجلسه** (**دليل الفالحين**، ص ۱۴۷، ج ۳) ''

تو ایک عام آدمی کی ایک عام بات کی طرف توجہ کرنے کا حکم ہے بالفرض اگر استحباب کے درجہ میں ہے تو دین کی بات (خصوصاً جب اجتماعی ہو) کو عام دنیوی بات پر بلاشبہ فوقیت عظمت اور اہمیت حاصل ہے تو اس کیلئے حکم بھی استحباب سے بڑھ کر ہی ہوگا جس کے خلاف کرنے میں کم ازکم کراہت ضروری ہوگی۔

(۹) مجلس میں ہوتے ہوئے خلاف استماع کام کرنے میں واعظ کو اور دیگر مجلس والوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے اس لئے اذیت مسلم میں بھی داخل ہے۔

(۱۰) اجتماعی بات سے اعراض بلکہ مخالفت ظاہر ہے اور اجتماعیت کے خلاف کرنا ''من شذ شذ'' کے مصداق بننے کا اندیشہ ہے۔

تلک عشرة کاملة

علماء کرام سے گزارش ہے کہ اس مسئلہ کی اہمیت سامنے رکھتے ہوئے اپنی تحقیق سے فیض یاب فرمائیں۔

مذکورہ استفتاء پر حضرت مفتی صاحب مدظلہم کا جواب

الجواب حامداً ومصلیاً......

مکرمی ومحترمی جناب حضرت مولانا مفتی......صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

دوسرا تفصیلی مراسلہ نظرنواز ہوا مراسلہ کے بابت ہم نے اپنے مؤقف کی وضاحت اجمالاً کردی تھی اب قدرے تفصیل سے خدمت عالیہ میں عرض کرتے ہیں۔ابتداء میں چندگزارشات بطورتمہید زیب قرطاس ہیں۔

تمہید(۱):......صحت خطبہ کیلئے قصداورنیت شرط ہے۔

لمافی مراقی الفلاح(صـ۵۱۰): والثانی ان تکون بقصد الخطبة.

وفی البنایة(۸۰۶/۲): ثم اشترط عند ابی حنیفة ان یکون قوله الحمد للّٰه علی قصد الخطبة حتی لو قال یرید الحمدللّٰه علی اعطاء لا ینوب عن الخطبة وقیل ینوب، والاوّل اصح.

وفی فتاویٰ الهندیة (۱۴۶/۱): ومنها الخطبة...... وکفت تحمیدة او تهلیلة هذا اذا کان علی قصد الخطبة.

وفی فتاویٰ الشامیة (۱۴۸/۲): (بنیتها) ای نیة الخطب.

تمہید(۲):......عربی پرقادرشخص کا غیرعربی میں خطبہ دینے سے صاحبین رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک خطبہ اداہی نہیں ہوتا امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اگرچہ جواز کے قائل ہیں لیکن بعض حضرات نے امام صاحب کا صاحبین کی طرف اس مسئلہ میں رجوع ثابت کیا ہے اگر رجوع ثابت نہ بھی ہوتب بھی عربی پرقادرشخص کا غیرعربی میں خطبہ دینا مکروہ تحریمی اور بدعت ہے۔

لمافی عمدة الرعایة (صـ۲۰۰): فانه لا شک فی ان الخطبة بغیر العربیة خلاف السنة المتوارثة من النبی ﷺ والصحابة فیکون مکروها تحریماً.

وفی البنایة (۱۹۵/۱): ویروی رجوعه فی اصل المسئلة (یعنی القراء ة الفارسیة) إلی قولهما وعلیه الاعتماد لتنزله منزلة الاجماع .... والخطبة یوم الجمعة والتشهد علی هذا الاختلاف.

وفی جواهر الفقه (۳۵۵/۱): وعلی هذا الخلاف الخطبة وجمیع الاذکار

یعنی خطبہ اورتمام اذکار واوراد میں بھی یہی اختلاف ہے کہ امام صاحب غیرعربی میں جائز فرماتے ہیں اورصاحبین ناجائز،(لیکن امام صاحب سے صاحبین کےقول کی طرف رجوع منقول ہے۔)

تمہید (۳):......خروج امام مانع صلوۃ وکلام اس وقت ہے کہ جب یہ خروج بنیت خطبہ ہو۔

لمافی العناية بهامش فتح القدير (۲/۶۷): واذا خرج الامام يوم الجمعة يعنى لأجل الخطبة.

وفى البحر الرائق (۲/۱۷۱): وفى شرح المجمع عبارة الخروج واردة على عادة العرب من انهم يتخذون لامام مكانا خالياً تعظيماً لشانه فيخرج منه حين اراد الصعود هكذا شاهدناه فى ديارهم والقاطع فى ديارنا يكون قيام الامام للصعود فالحاصل ان الامام ان كان فى خلوة فالقاطع انفصاله عنها وظهوره للناس والافقيامه للصعود.

وفى البناية (۱/۸۵۳): ولا اذا خرج الامام من بيت الخطابة يوم الجمعة لأجل الخطبة.

وفى نهر الفائق (۱/۳۶۳): و(اذا خرج الامام) اى صعد على المنبر كذا فى معراج........ والقاطع فى ديارنا هو قيام الامام للصعود.

مذکورہ بالاتمہیدات کی روشنی میں اردو ملے خطبہ پر عربی خطبہ کے احکام لاگو نہیں ہوں گے کیونکہ صحت خطبہ کیلئے قصد اور نیت شرط ہے جیسا کہ تمہید (۱) کے حوالوں سے واضح ہے جبکہ وعظ ونصیحت سے قبل تحمید وتسبیح بنیت خطبہ نہیں ہوتی بلکہ اتباع حدیث کل امر ذی بال الخ اور تعامل وتوارث کی بناء پر پڑھی جاتی ہے۔ نیز سابقہ تحریر کے شبہ اوّل کے جواب میں درج عبارت ''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ خطبہ جمعہ کی نیت سے یہ خطبہ نہیں دیتے تھے جو کہ خطبہ کیلئے شرط ہے'' بھی صحت خطبہ کیلئے قصد اور نیت پر دال ہے۔ نیز اشتراط نیت للخطبہ میں خطیب اور غیر خطیب کا حکم یکساں ہے۔ دونوں میں اس بابت فرق کرنا محتاج دلیل ہے۔ جس پر ہم مطلع نہ ہوئے۔

نیز خروج امام مانع صلوٰۃ واذکار اس وقت ہوگا جب یہ خروج بنیت خطبہ منبر ومحراب کی آغوش میں امام کی عظمت الشان ومرتبت کیلئے واقع مقصورۃ (حجرہ) سے ہو جیسا کہ عرب میں دستور تھا۔

لمافى سير اعلام النبلاء (۴/۲۰۰): عاصم بن محمد عن ابيه: رأيت ابا هريرة يخرج يوم الجمعة، فيقبض على رُمّانتى المنبر قائماً، ويقول: حدثنا ابو القاسم ﷺ الصادق المصدوق: فلا يزال يحدث حتى يسمع فتح باب المقصورة لخروج الإمامة فيجلس.

جبکہ ہمارے دیار میں خروج امام مانع صلوٰۃ واذکار اس وقت ہوگا جب امام صاحب خطبہ کیلئے منبر پر جلوہ افروز ہو جائے۔ کیونکہ ہماری مساجد میں مقصورہ ندارد۔

لمافى البحر الرائق (۲/۱۵۵): وفى شرح المجمع عبارة الخروج واردةٌ على عادة العرب من انهم يتخذون لإمام مكاناً خالياً تعظيماً لشانه فيخرج منه حين اراد الصعود هكذا شاهدناه فى ديارهم والقاطع فى ديارنا يكون قيام الإمام للصعود فالحاصل ان الامام ان كان فى خلوة فالقاطع انفصاله عنها وظهوره للناس والا فقيامه للصعود.

وفیہ ایضاً(۲/۲۷۰): فان لم یکن فی المسجد مقصورة یخرج منها لم یترکوا القراءة والذکر الا اذا قام الامام إلی الخطبة.

وفی البناية علی شرح الهداية (۱/۸۵۳): ولا اذا خرج الامام من بیت الخطابة یوم الجمعة لإجل الخطبة.

وفی النهر الفائق(۱/۳۶۳): واذا خرج الامام: ای صعد علی المنبر.......... والقاطع فی دیارنا هو قیام الامام للصعود.

بالفرض اگر کہیں خروج امام مقصورہ (حجرہ) سے ہو تب بھی زیر بحث مسئلہ میں یہ خروج مانع صلوٰۃ واذ کار نہیں ہوگا کیونکہ خروج امام من المقصورة پر"فلا صلوٰة ولا کلام" کا حکم اس وقت لاگو ہوگا جب یہ خروج بنیت خطبہ ہو کمافی البناية(۱/۸۵۳) جبکہ زیرنظر مسئلہ میں خروج للوعظ ہوتا ہے۔

ولا اذا خرج الامام من بیت الخطابة یوم الجمعة لإجل الخطبة.

نیز اس خروج کو تشریک نیت پر محمول کرنا بایں معنیٰ کہ یہ خروج للوعظ والخطبۃ دونوں ہو درست نہیں کیونکہ قصد اوّل کا اعتبار ہوتا ہے جبکہ خطیب صاحب کا قصداوّل بالخروج وعظ کرنا ہوتا ہے۔

کتاب الفتاویٰ (۳/۴۷): یوں تو منبر پر اردو میں بیان وتقریر کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے.....تاہم جمعہ میں چونکہ منبر پر کھڑے ہو کر اردو بیان میں اس کے خطبہ ہونے کا وہم ہوسکتا ہے حالانکہ خطیب کا مقصد اس سے خطبہ دینا نہیں ہے۔انتھی

نیز اگر مطلقاً خروج مانع گفت وشنید اذ کار وصلوٰۃ ہو تو سوال ہوگا کہ اردو تقریر کے بعد عربی خطبہ سے قبل چار رکعت سنتیں پڑھنا جبکہ امام تشریف لا چکا ہو جائز ہے یا نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو یہ اکابرین واسلاف رحمہم اللہ تعالیٰ کے عمل سے متصادم ہے اگر جواب اثبات میں ہے تو کس دلیل کی بنیاد پر جبکہ امام مصلّی پر براجمان ہے۔

معلوم ہوا مطلقاً خروج امام مانع صلوٰۃ واذ کار نہیں۔

یہ مسئلہ چونکہ اچھنبا اور نیا نہیں بلکہ ہمارے اکابرین رحمہم اللہ تعالیٰ کی حیات مبارکہ میں بھی پیش آیا تھا الحمدللہ اکابرین رحمہم اللہ تعالیٰ کی نوک قلم سے نکلی ہوئی تحقیقات وتدقیقات بھی اس مسئلہ میں موجود ہیں۔ذیل میں چند ایک ملاحظہ ہو۔

اردو ملے خطبہ کے وعظ ہونے پر حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا تفصیلی اور تحقیقی فتویٰ۔

سوال:.....ایک مسجد کا خطیب بعداذان اوّل جبکہ کچھ لوگ جمع ہو جاتے ہیں مسجد سے ملے ہوئے مکان سے مسجد میں آتا ہے سلام کر کے لکڑی کے منبر کے پاس کھڑے ہو کر خطبہ ووعظ یعنی"الحمدللہ ونحمدہ الخ" کے بعد کوئی ایک یا چند آیات تلاوت کر کے اردو میں وعظ کرتا ہے یوں پون گھنٹہ یا کم بیش وعظ کے بعد چار سنت ادا کرتا ہے اور دیگر مردم کچھ تو اذان اوّل کے بعد وعظ سے پہلے فارغ ہو لیتے ہیں کوئی درمیان وعظ ہی میں پڑھ لیتا ہے باقی وعظ کے بعد پڑھ لیتے ہیں۔خطیب سنت ادا کرنے کے بعد منبر پر بیٹھتا ہے اس کے سامنے اذان

ثانی ہوتی ہے پھر خطبہ مسنونہ پڑھ کر نماز پڑھاتا ہے اس صورت مذکورہ کو ایک مولوی صاحب خلاف سنت بتاتے ہیں اور تین خطبوں سے تعبیر کرتے ہیں۔

الجواب:...... یہ صورت جائز ہے اور تین خطبے نہیں ہوئے بلکہ اذانِ ثانی کے بعد جو خطبے وہ پڑھتا ہے وہی مسنون خطبے جمعہ کے ہو جاتے ہیں اور پہلا وعظ وعظ ہی ہوگا خطبہ میں شامل نہیں ہوگا۔

حضرت کا مذکورہ فتویٰ اردو ملے خطبے کے وعظ ہونے میں بے غبار ہے۔

حضرت کا اس کو وعظ فرمانا جبکہ مرسلہ تحریر کے مطابق ''خطبہ کے ہمہ شرائط وارکان موجود ہیں'' سوائے اس کے کہ اس میں شرط خطبہ ''خطبہ بنیت خطبہ'' نہیں پائی جاتی اور کیا تبصرہ ہوسکتا ہے۔

اردو ملے خطبے کے دوران سنتیں پڑھنے کے جواز پر کتاب الفتاویٰ (۳/۴۶) ملاحظہ ہو۔

اصل وہ دونوں خطبے ہیں جو عربی زبان مین دیئے جاتے ہیں اس سے پہلے اگر خطیب اردو زبان میں اپنے اس خطبہ کا خلاصہ لوگوں کو سنائے اور بتائے تو یہ خطبہ کے حکم میں نہیں اس دوران سنت ادا کی جاسکتی ہے۔

البتہ مرسلہ تحریر میں درج جواہر الفقہ کی عبارت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ خطبہ فقط ذکر سے عبارت ہے قصد اور نیت شرط نہیں۔ ہمارے نزدیک اس کی توجیہ یہ ہے کہ مفتی اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ عنہ نے جواہر الفقہ میں صرف خطبہ کے ارکان وفرائض وآداب کا تذکرہ فرمایا ہے شرائط خطبہ سے تعرض نہیں فرمایا۔

جواہر الفقہ کی عبارت ملاحظہ ہو (۳/۳۴۹):

فرض صرف دوہیں: (۱) وقت جمعہ، (۲) مطلق ذکر اللہ خواہ کسی لفظ سے ہوانتھی، جبکہ تمام متداول ومعتمد کتب میں خطبہ کیلئے قصد کو ضروری قرار دیا ہے۔

کمافی مراقی الفلاح (ص۵۱۰): والثانی ان تکون بقصد الخطبة.

وفی فتاویٰ الشامیة (۲/۱۴۸): وكفت تحميدة او تهليلة...... بنيتها.

قوله كفت تحميدة. شروع فی ركن الخطبة بعد بيان شروطها قوله بنيتها ای نيّة الخطب.

مندرجہ بالا عبارت میں رکن خطبہ کے ساتھ اشتراط نیت کی صراحت بھی ہے۔

وفی كتاب الفقه علی المذاهب الاربعة (۱/۳۹۱): ثانيها: نية الخطبة فلو خطب بغير النية لم يعتد بخطبة عند الحنفية.

البتہ خانیہ میں امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے اگرچہ ایک روایت عدم قصد کی ہے۔

لمافی فتاویٰ خانية (۴/۳۴۳): ولو عطس فقال الحمد لله يريد به التحميد علی العطاس فذبح لا يحل بخلاف الخطبة اذا عطس علی المنبر فقال الحمدلله فانه يجوز به الجمعة فی

احد الروايتين. عن ابی حنيفة لان المامور به فی الجمعة ذكر الله مطلقاً وههنا الشرط ذكر الله على الذبح.

لیکن بنایۃ میں اشتراط نیت کو اصح قرار دیا ہے۔

لمافی البناية (۱/۸۰۶): ثم اشـ ـرط عند ابی حنيفة ان يكون قوله الحمدلله على قصد الخطبة حتى لو قال يريد الحمدلله على اعطاء لا ينوب عن الخطبة وقيل ينوب، والاوّل اصح.

نیز حموی علی الاشباہ والنظائر (۱/۷۵) پر اشتراط قصد کو مذہب ثابت کیا ہے۔

اما النية فی الخطبة للجمعة فشرط لصحتها. لم تصح قيل هذا هو المذهب...... وفی رواية يجزئه ذالک لكن المذهب ماتقدم.

لمافی فتاویٰ الهندية (۱/۱۴۶): ومنها الخطبة...... وكفت تحميدة او تهليلة. هذا اذا كان على قصد الخطبة.

البتہ یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ خطبہ جمعہ کیلئے شرط ہے۔ جبکہ شرائط میں قطع نظر اشتراط نیت وغیرہ سے محض وجود کا اعتبار کیا جاتا ہے۔

كمافی الحموی على الاشباه والنظائر (۱/۶۸): امّا اذا كان شرطا لحكم لا تشترط النية فی هذا الشرط لان الشرط يراعی وجوده مطلقاً لا وجوده قصداً.

اس کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ خطبہ محض شرط ہی نہیں بلکہ اس میں رکنیت کا بھی ادنیٰ شائبہ موجود ہے۔

لمافی البناية (۱/۸۰۰): وعن عمر رضی الله تعالیٰ عنه قال قصرت الصلوة لأجل الخطبة وعن عائشة مثله وعن سعيد بن جبير قال كانت الجمعة اربعاً فجعلت الخطبة، فكان ركعتين.

نیز خطبہ نری شرط ہی نہیں بلکہ مشروط بھی ہے کیونکہ سعی کا حکم خطبہ کیلئے ہے۔

بالفرض اگر تسلیم کرلیا جائے کہ خطیب ابتداء وعظ میں تحمید وتسبیح بنیت خطبہ پڑھتا ہے تب بھی اس اردو ملے خطبہ کو اصل خطبہ کا درجہ نہیں دیا جائے گا۔ کیونکہ یہ بدعت ہے اور ترک بدعت واجب ہے چہ جائیکہ اس کا استماع لازم ہو اور اس دوران صلوٰۃ، نوافل واذکار حرام ہوں۔

لمافی امداد المفتين (۱/۳۸۵): فالحاصل ان اختصاص اللغة العربيّة فی الخطبة وان كان فی الاصل من السنن إلا انه لحق بتركه امور آخر من ابتداع بدعة واثم الادمان على ترک السنة وترک البدعة واجب: فجاء الوجوب من هذا القبيل لا بمحض المواظبة عليه وبالجملة فالحكم بوجوب العربيّة واثم تاركها فی خطبة الجمعة. وان ترجمتها بغير العربيّة بدعة حق لاريب فيه.

وفیہ (۱/۳۸۴): والحاصل ان اللغة العربيّة فی الخطبة سنة مؤكدة عندنا ولكن ترك العربيّة وجعلها بالعجميّة مكروه تحريماً وتاركها آثم ولا سيما المدمن عليه.

یہ شبہ نہ ہونا چاہیے کہ مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ خالص اردو خطبہ کو بدعت فرما رہے ہیں جبکہ ہمارا کلام اردو ملے خطبہ کے بارے میں ہے۔ کیونکہ حضرت کے نزدیک خالص اردو خطبہ اور اردو ملا خطبہ بدعت ہونے میں یکساں ہے۔

لمافی امداد المفتین (۱/۳۸۵):

سوال نمبر (۶۴):...... جمعہ کے خطبہ کے ساتھ اردو نظم یا نثر میں اس کا مطلب بیان کیا جاتا ہے۔ آیا اس طرح پڑھنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب:...... جمعہ کے خطبہ کے ساتھ اردو میں ترجمہ خواہ نثر سے ہو یا نظم سے بدعت ہے اور ناجائز ہے۔ قرون مشہود لھا بالخیر میں باوجود ضرورت اور قدرت اس کی کوئی نظیر نہیں۔ نیز مرسلہ تحریر میں یہ مؤقف اختیار کیا گیا ہے کہ خطبہ کا عربی میں ہونا کوئی شرط نہیں جبکہ یہ مؤقف فتاویٰ اکابرین رحمہم اللہ تعالیٰ سے میل نہیں کھا رہا۔ کیونکہ حضرت مفتی شفیع رحمہ اللہ تعالیٰ نے جواہر الفقہ میں خطبہ کیلئے عربی کو شرط گردانا ہے۔

جواهر الفقه (۱/۳۵۵): وقال النووی: فی كتاب الاذكار حمد الله تعالیٰ ويشترط كونها خطبة الجمعة وغيرها بالعربيّة.

نیز جواہر الفقہ میں حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے عربی پر قادر شخص کا غیر عربی میں خطبہ دینا کالعدم قرار دیا ہے۔ کیونکہ امام صاحب اگرچہ جواز کے قائل تھے لیکن ان کا صاحبین رحمہما اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع منقول ہے۔

جواهر الفقه (۱/۳۵۵): وعلى هذا الخلاف الخطبة وجميع الاذكار......

یعنی خطبہ اور تمام اذکار واوراد میں بھی یہی اختلاف ہے کہ امام صاحب غیر عربی میں جائز فرماتے ہیں اور صاحبین ناجائز (لیکن امام صاحب سے صاحبین کے قول کی طرف رجوع منقول ہے)۔ انتھی کلامہ

اب نہ معلوم غیر خطبہ (جب خالص اردو میں) ہو یا خطبہ مبتدعہ (اردو ملا خطبہ) بنیت خطبہ کا استماع کیوں لازم ہے اور اس دوران نوافل کی ممانعت کس بناء پر ہے جبکہ اردو ملا خطبہ بنیت خطبہ بدعت ہے اور ترک بدعت واجب ہے۔

مرسلہ تحریر میں خطبہ کا بڑا مقصد وعظ وتعلیم مرقوم ہے جبکہ اکابرین کی تصریحات اس کے خلاف ہیں۔

لمافی جواہر الفقہ (۱/۳۵۵): یہاں تک کل تقریر کا حاصل یہ ہوا کہ خطبہ جمعہ کا اصلی رکن اور مقصد صرف ذکر اللہ ہے۔ تبلیغ یا وعظ وتذکیر اس کے فرائض میں داخل نہیں حضرت چند سطر بعد رقم طراز ہیں۔ اگر خطبہ کا مقصد ذکر محض نہ تھا بلکہ وعظ وتبلیغ مقصود تھی تو وقت ظہر کی کیا تخصیص ہے۔

نیز فرماتے ہیں: اگر خطبہ پڑھنے کے بعد امام کسی کام میں مشغول ہوگیا اور نماز میں کوئی معتد بہ فصل ہوگیا تو قول مختار کے موافق خطبہ کا اعادہ ضروری ہے۔ اگرچہ سننے والے دوبارہ بھی وہی لوگ ہوں گے جو پہلے سن چکے ہیں......

اگر وعظ و پند ہی خطبہ کا مقصد ہوتا تو اس اعادہ سے کیا فائدہ متصور ہے انتھی کلامہ۔

نیز اردو ملے خطبہ کو اصل خطبہ تسلیم کرنے کی صورت میں دو بدعتوں میں سے ایک کا ارتکاب لازم آئے گا کیونکہ اگر اردو ملے خطبہ کو اصل خطبہ تسلیم کیا جائے تو باقی دو خطبے نفل ہوں گے جبکہ جمعہ میں خطبہ نفلاً مشروع نہیں۔

لمافی الاشباہ مع الحموی (۱/۱۳۵): وكذا الخطبة .... ان شرطنا لها النيّة لانها لا يتنفل بها.

اگر باقی دو خطبے نہ پڑھے جائیں تو اس صورت میں بھی ارتکاب بدعت سے خالی نہیں کیونکہ اردو ملا خطبہ بتصریحات اکابرین خطبہ مبتدعہ ہے۔ جبکہ ترک بدعت واجب ہے۔

علاوہ ازیں تینوں خطبوں کو ماننے کی صورت میں ایک تیسرا خلاف سنت امر ''تطویل خطبہ'' کا ارتکاب لازم آئے گا جو کہ بنص حدیث ممنوع ہے۔ چنانچہ جواہر الفقہ (۱/۳۵۹) میں مذکور ہے کہ مؤطا امام مالک میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ قرن صحابہ کے خصوصی فضائل میں اختصار خطبہ کو اور آخر امت کے فتن و مفاسد میں تطویل خطبہ کو شمار فرماتے ہیں۔

چونکہ مرسلہ تحریر کا نچوڑ اور لب لباب امرین کا اثبات ہے۔

(۱)۔ اردو ملا خطبہ بھی عربی خطبہ کے حکم میں ہے۔

(۲)۔ ہر وعظ کا سننا واجب ہے۔

لہٰذا مرسلہ تحقیق کی ہر شق اور عبارت پر کلام کرنا مفید نہیں انہی دو دعووں کو موضوع بحث بناتے ہیں۔

اب تک پہلے دعویٰ پر کلام تھا جس کا حاصل یہ ہے کہ اردو ملے خطبہ پر عربی خطبہ کے احکام لاگو نہیں ہوں گے۔

اوّلاً تو اس میں خطبہ کی اہم شرط خطبہ بنیت خطبہ نہیں پائی جاتی۔

ثانیاً اگر خطبہ مان بھی لیا جائے تو بتصریحات اکابرین یہ بدعت ہے۔ جس کا ترک واجب ہے۔

اب ہم دوسرے دعوے (ہر وعظ کا سننا واجب ہے) کے بابت اپنے مؤقف کی وضاحت کرتے ہیں...... ہمارے نزدیک ہر وعظ کا سننا واجب نہیں اگر چہ سننا اولیٰ اور بہتر ہے جیسا کہ تمہید نمبر (۵) میں تفصیل مذکور ہے۔ لیکن خطبہ کی طرح اس خطاب کے دوران صلوٰۃ واذکار حرام نہیں ہوں گے۔ کیونکہ اس کیلئے محرّم نص درکار ہے جو ہماری دانست میں دریں باب ندارد۔ درمختار کی عبارت **فی المسجد عظة الخ** سے اپنے مدعیٰ کے اثبات کیلئے ترتیب شدہ شکل اوّل میں ہمیں کبریٰ تسلیم نہیں۔ کیونکہ عالمگیری میں اس عبارت سے قبل یہ جزئیہ مذکور ہے۔

لمافی فتاویٰ الهندية (۵/۳۱۸): يكرر من الفقه وغيره يقرأ القرآن لا يلزمه الاستماع.

اس سے معلوم ہوا کہ استماع التلاوۃ واجب علی الاطلاق نہیں۔

نیز شامی میں استماع العظۃ اولیٰ کا حکم قاری کے علاوہ دوسرے سامع کیلئے ہے جبکہ خود قاری کیلئے کیا حکم ہے؟

فتاویٰ شامی ملاحظہ ہو۔(۱/۶۶۳)

قولہ: فاستماع العظة اولیٰ، الظاهر ان هذا خاص بمن لا قدرة له على فهم الآيات القرآنية والتدبر فی معانيها الشرعية والاتعاظ بمواعظها الحكمية اذ لا شک ان من له قدرة على ذالک يكون استماعه اولیٰ بل اوجب. بخلاف الجاهل فانه يفهم من المعلم والواعظ مالا يفهمه من القاری فكان ذالک انفع له.

علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ کے مذکورہ تبصرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر سامع عالم ذی فہم معانی قرآن سے واقف ہوتو اس کیلئے استماع قرآن اولیٰ بلکہ واجب ہے اور یہ تب ہی ہوسکتا ہے جب تلاوت جاری ہو جبکہ مرسلہ تحریر میں پیش کردہ دعویٰ دوران وعظ مطلقاً نوافل، تلاوت وغیرہ کی ممانعت کا ہے۔

نیز بحرالرائق (۲/۵۵) پر ہے:

ولهذا نقل الشارح عن الصحابة رضی الله تعالیٰ عنهم ان بعضهم كانوا يقرؤون القرآن وبعضهم يتذاكرون العلم والمواعظ وبعضهم يصلون ولم ينههم النبی ﷺ عن ذالک ولو كان مكروهاً لنهاهم.

مذکورہ بالا عبارت سے صاحب بحر نے اس مسئلہ پر استدلال کیا ہے کہ اگر کوئی نمازی سامنے بیٹھے شخص کی پشت کی طرف نماز پڑھ رہا ہو جبکہ وہ شخص محو کلام ہوتو یہ جائز ہے کیونکہ مسجد نبوی میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مختلف حلقے لگتے تھے اس میں نماز پڑھنے والے، باہمی وعظ و پند کرنے والے اور ایک حلقہ تلاوت کرنے والوں کا تھا جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس طرز عبادت وتلاوت سے منع نہیں فرمایا۔ معلوم ہوا کہ تلاوت اور وعظ کا علی الاطلاق سننا واجب نہیں ورنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سب کو حلقۂ تعلیم میں بیٹھنے یا استماع تلاوت کا حکم صادر فرماتے۔

نیز خارج نماز عدم استماع تلاوت کے وجوب پر ابن کثیر ملاحظہ ہو۔

تفسیر ابن کثیر (۲/۲۵۹): سورة الاعراف (آیة: ۲۰۴)

حدثنا الجريری عن طلحة بن عبيد الله بن كريز قال رأيت عبيد بن عمير وعطاء بن ابی رباح يتحدثان والقاص يقص فقلت الا تستمعان الى الذكر، و تستو جبان الموعود؟ قال فنظرا إلیّ ثم اقبلا على حديثهما، قال فاعدت فنظرا إلیّ واقبلا على حديثهما، قال فاعدت الثالثه قال فنظرا الی فقالا انما ذالک فی الصلوة.

مذکورہ بالا حوالہ میں جہاں خارج نماز عدم وجوب استماع التلاوۃ کی صراحت ہے وہاں وعظ و پند کے عدم وجوب استماع پر بھی القاص یقص'' کی بناء پر بین دلیل ہے۔

نیز ابن کثیر (۲/ ۲۵۹) ملاحظہ ہو۔

قال عبدالرزاق عن الثوری عن لیث عن مجاهد قال لا بأس اذا قرأ الرجل فی غیر الصلوٰة ان یتکلم وكذا قال سعید بن جبیر والضحاک وابراهیم النخعی وقتادة ان المراد بذالک فی الصلوٰة.

كذا فی تفسیر القرآن لصنعانی (۲/ ۲۴۷)

اس حوالہ بالا کی روشنی میں علی الاطلاق وجوب استماع تلاوت کا حکم دشوار ہے۔

تفسیر الدر المنثور میں (۹/ ۶۳۵) پر بھی اس کی تائید موجود ہے:

عن عبدالله بن مغفل انه سئل اكل من سمع القرآن یقرأ وجب علیه الاستماع والانصات؟ قال لا قال انما نزلت هذه الاية............ فی قراءة الامام اذا قرأ الامام فاستمع له وانصت.

نیز تفسیر مظہری میں خلاصۃ الفتاویٰ کے جزئیہ "رجل یکتب الفقه وبجنبه یقرأ القرآن فلا یمکنه الاستماع فالاثم علی القاری الخ" پر محدثانہ تبصرہ ملاحظہ ہو۔

تفسیر مظهری (۳/ ۴۵۱): اختلف العلماء فی وجوب الاستماع والانصات علی من هو خارج الصلوٰة یبلغه صوت من یقرأ القرآن فی الصلوٰة او خارجها. قال البیضاوی عامة العلماء علی استحبابها خارج الصلوٰة...... قال فی الخلاصة رجل یکتب الفقه الخ.

قلت: وقد ثبت عنه ﷺ انه كان یقرأ القرآن باللیل جهراً بحیث یسمع من وراء حجرته وربما یسمعه الجیران.

وفی الصحیحین عنه قال قال رسول الله ﷺ انی لاعرف اصوات رفقة الاشعریین حین یرحلون واعرف منازلهم من اصواتهم بالقرآن باللیل...... ولا شک ان بعض الناس فی العسكر كانوا نیاما وقت قراءة الاشعریین.

فهذا الاحادیث تدل علی فساد ما افتی به صاحب الخلاصة.

حضرت کا یہ تبصرہ اگر چہ بظاہر وعلی هذا لو قرأ علی السطح الخ کے متعلق ہے لیکن حضرت کا رجحان خارج نماز عدم وجوب استماع التلاوت معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ تفسیر ابن مردویہ کے حوالہ سے رقم طراز ہیں:

اخرج ابن مردویه فی تفسیره قال .... قال عبدالله بن مغفل اكل من سمع القرآن وجب علیه الاستماع والانصات قال انما نزلت هذه الاية اذا قرأ القرآن الخ فی القراءة خلف الامام.

بلکہ حضرت مندرجہ ذیل الفاظ سے صاف صاف اپنی رائے کا اظہار فرمارہے ہیں۔

قلت واللام فی قوله تعالیٰ اذا قرئ القرآن للعهد دون الجنس والمراد به القرآن المقرو لاستماعكم كالامام يقرأ حتى يسمع من خلفه والخطيب يقرأ للتخاطب والمقرى يقرأ على التلميذ.

معلوم ہوا مطلقاً استماع تلاوت واجب نہیں۔

نیز حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کا فتویٰ خارج نماز استماع تلاوت کے بابت ملاحظہ ہو۔

امدادی الفتاویٰ (۴/۵۹): الجواب......سماع قرآن میں دونوں قول ہیں آسانی کیلئے میں اسی کا اختیار کرتا ہوں کہ خارج صلوٰۃ مستحب ہے۔

حضرت کے نزدیک جب وجوب استماع تلاوت علی الاطلاق نہیں تو اس پر مبنی مسئلہ وجوب استماع وعظ بھی یقیناً واجب نہیں ہوگا۔

نیز استماع تلاوت مطلقاً میں اتنا عموم اور توسیع کہ مجلس تلاوت میں بیٹھے ہمہ حاضرین وسامعین پر استماع واجب ہو پھر اس پر بناء کر کے مجلس وعظ میں موجود تمام سامعین پر وجوب وعظ کا حکم لاگو کرنا خود علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ کی عبارت سے متضاد ہے۔ کیونکہ علامہ شامی رحمہ اللہ جہاں استماع تلاوت علی الاطلاق کے قائل ہیں وہاں استماع تلاوت خارج نماز فرض (واجب) کفائی کی تصریح فرمارہے ہیں۔ جبکہ مرسلہ تحریر میں مثبت دعویٰ اس کے خلاف ہے۔

فتاویٰ شامية (۱/۵۴۶): وفی شرح المنية: والاصل ان الاستماع للقرآن فرض كفاية لانه لاقامة حقه بأن يكون ملتفتا إليه غير مضيع وذالک يحصل بانصات البعض، كمافی رد السلام حين كان لرعاية حق المسلم كفى فيه البعض عن الكل.

نیز بیان القرآن میں خارج نماز استماع تلاوت کے بابت مفصل اور فیصلہ کن کلام ملاحظہ ہو۔

بیان القرآن (۱/۳۶۳):......اور اسی سے خارج عن الصلوٰۃ بھی قرأت کے وقت دوسرے کام میں مشغول ہونے کو ہمارے فقہاء حنفیہ نے ممنوع فرمایا ہے۔ اور اسی پر مشغول کے پاس بیٹھ کر پکار کر پڑھنے کو منع کیا ہے نقلہ فی الروح عن الخلاصۃ۔

اور مبنیٰ اس کا مسئلہ مشہورہ اصولیہ کے اعتبار سے عموم لفظ کا ہے نہ کہ خصوص سبب کا لیکن احقر کو اس میں شفاء نہیں۔ نہ اس مسئلہ اصولیہ میں اور نہ اس فرع فقہی میں کیونکہ ایسا عموم جو مراد متکلم سے بھی متجاوز ہو مراد لینا صحیح نہیں جیسا کہ حدیث ''لیس من البر الصیام فی السفر'' میں صیام کو کسی نے عام نہیں لیا اور یہاں مجموعہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو تلاوت خارج صلوٰۃ اپنے ثواب یا یاد کیلئے ہو کسی کو تذکیر و تبلیغ کیلئے نہ ہو وہ آیت میں مراد نہیں۔

وايضاً فی السراج المنير للخطيب الشربينی عن البيضاوی وظاهر اللفظ يقتضی وجوبهما حيث يقرأ القرآن مطلقاً وعامة العلماء على استحبابهما خارج الصلوٰة.

پس ظاہراً عامۃ العلماء میں حنفیہ بھی داخل ہیں اور یہ لفظ قریب اجماع ہے۔ پس اس قول کو حنفیہ کا قول محقق اور قول اوّل کو ان کا قول مشہور کہیں گے۔

ضمیمہ:...... بعد تحریر تحقیق بالاطحطاوی علی مراقی الفلاح (ص:۱۰۸) میں یہ روایت نظر پڑی جس میں فرع مذکور میں بھی حنفیہ کے نزدیک گنجائش کی تصریح ہے۔

وفی الدر المنیفة عن القنیة یکرہ للقوم ان یقرؤا القرآن جملةً لتضمنها ترک الإستماع والانصات وقیل لا باس؟، انتھی کلام

حکیم الامت:...... نیز بزازیہ کی عبارت میں واشگاف الفاظ میں خارج نماز میں استماع قرآن کے بابت قول آخر (عدم استماع) کی طرف اشارہ موجود ہے۔

لمافی البزازیة(۱/۱۴): یکتب الفقه وبحنبه رجل یقرأ القرآن......فالا ثم علی القاری..........

وھذا علی قول من قال استماع القرآن واجب خارج الصلوٰۃ.

معلوم ہوا مذہب میں دوسرے قول کی بھی گنجائش ہے۔

نیز فتاویٰ حقانیہ(۲/۱۷۰) پر خارج نماز استماع تلاوت کے بابت فتویٰ ملاحظہ ہو۔

الجواب:...... اس بارے میں دوطرح کے اقوال موجود ہیں، ایک وجوب کا اور دوسرا عدم وجوب کا، متاخرین فقہاء کرام نے آسانی اور سہولت کیلئے دوسرے قول کو ترجیح دی ہے۔ لہٰذا خارج نماز قرآن کریم کی تلاوت سننا واجب نہیں تاہم مستحب ضرور ہے۔

وحکی ابن المنذر: الاجماع علی عدم وجوب الاستماع والانصات فی غیر الصلوٰۃ والخطبة وذالک ان یجابھما علی کل من یسمع احداً یقرأ فیه حرج عظیم لانه یقتضی ان یترک له المشتغل بالعلم علمه والمشتغل بالحکم حکمه الخ. (تفسیر المنار، ۹/۵۵۲، ۵۵۳)

نیز احکام القرآن للجصاص رحمہ اللہ تعالیٰ کا خارج نماز استماع تلاوت کے متعلق مفسر قرآن حضرت ابن عباسؓ سے فیصلہ کن اور محتاط کلام ملاحظہ ہو (احکام القرآن للجصاص،۳/۳۹)۔

عن ابن عباس فی قوله تعالیٰ (واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا. قال المؤمن فی سعة من الاستماع إلیه الافی صلاة مفروضة او یوم جمعة او فطر او اضحیٰ.

مذکورہ بالا ہمہ حوالہ جات شکل اوّل کے کبریٰ اور اس سے اخذ شدہ نتیجہ سے ہماری نظر میں میل نہیں کھا رہے ہیں۔

البتہ امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کے باب ''**الانصات للعلماء**'' کے تحت علامہ عینی اور علامہ ابن بطال رحمہما اللہ تعالیٰ کے کلام سے بظاہر ہر وعظ کے استماع کا وجوب معلوم ہوتا ہے لیکن خارج نماز سماع تلاوت کے بابت ذکر کردہ روایات اور تصریحات اکابر کے

تناظر میں علامہ ابن بطال رحمہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں تاویل کی جائے گی کیونکہ جب کلام خالق جل جلالہ کا استماع علی الاطلاق واجب نہیں تو وجوب استماع کلام عالم وکلام الناس بدون نص صریح غیر معارض چہ معنی دارد۔

نیز اگر علماء کرام کے ہمہ کلام خواہ از قبیل خطبہ ہو یا وعظ و پند سننا واجب ہو تو پھر ''یجب الاستماع لسائر الخطب'' کا محمل کیا ہوگا جبکہ مرسلہ تحریر کے مطابق ''فقہاء کرام کی عبارات میں اتفاقی قیودات نہیں ہوتے۔ چنانچہ ان کی عبارات کا مفہوم مخالف بھی معتبر مانا جاتا ہے الخ''۔

لہٰذا ابن بطال رحمہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں سوائے تاویل کے کوئی چارہ کار نہیں۔

وباب التاويل متسع

اوّلاً......وجوبِ انصات العالم اس وقت ہوگا جب وہ خطبہ دے رہا ہو جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے باب الانصات للعلماء کے تحت جو حدیث نکالی ہے اسی حدیث کیلئے (اگرچہ سند مختلف ہے)(۱/۴۳۳) پر باب باندھا ہے باب ''الخطبة بایام منی'' ورنہ انصات مستحب ہوگا۔

یہ شبہ نہ کیا جائے کہ علامہ عینی رحمہ اللہ تعالیٰ کے کلام سے مطلقاً عالم کیلئے انصات معلوم ہو رہا ہے کیونکہ ''جب کسی اسم مشتق پر حکم لگتا ہے تو مادہ اشتقاق اس کی علت بنتا ہے جیسا کہ علامہ عینی رحمہ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں'' **الانصات لاجل العلماء واللام فيه للتعليل**''

جواباً ہم عرض کرتے ہیں کہ اگر عالم کا ہر کلام خطبہ وغیر خطبہ سننا واجب ہو تو پھر یجب الاستماع لسائر الخطب کے مابین تعارض آئے گا اس تعارض کے دفعیہ کیلئے مذکورہ بالا تاویل کے علاوہ کوئی مخلص نہیں۔

ثانیاً......وجوب بمعنی ثبوت ہے کما ھو شائع ذائع۔

ثالثاً......محقق العصر محدث وقت حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''الدر'' کی عبارت ''**یجب الاستماع لسائر الخطب**'' کے عموم پر گہری تشویش کا اظہار فرمایا ہے چہ جائیکہ ہر عالم کے کلام اور ہر وعظ کا سننا واجب ہو۔

لما في فيض الباري (۲/۳۴۷): **قوله (تركوك قائماً) فان قلت كيف وهم اتقى الناس في الارضين وازهدهم بعد الانبياء والمرسلين قلت والجواب كما في التوشيح للسيوطي. ان الخطبة في الجمعة كانت على شاكلة العيدين بعد الصلوٰة ثم قدمت عليها فلعلهم حملوا استماعها على الاستحباب وظنوه كسائر الخطب ولم يروه عزيمةً عليهم سيما اذا كان عند النسائي ان النبي ﷺ كان ينادي بعد العيدين ان من شاء منكم ان يمكث فليمكث ومن شاء ان يذهب فليذهب وتردد فيه الحفاظ فدل على التوسيع في خطبة العيدين.**

وفي الدر المختار ان استماع جميع الخطب واجب" قلت ولا يناسب هذا التوسيع بل ينبغي ان يفصل في الامر.

وفیه تحت باب کلام الامام والناس فی خطبة العید الخ.

(۲/۳۶۳) کلام الامام الناس)........... لعل المصنف رحمه الله تعالیٰ یشیر الی ان فی خطبة العیدین سعة بالنسبة إلی خطبة الجمعة وهو المختار عندی وان کان فی کتبنا انهما سواء.

وفی النسائی (۱/۱۷۸) مع حاشیة للسیوطی

ان النبی ﷺ صلی العید قال من احب ان ینصرف فلینصرف ومن احب ان یقیم للخطبة فلیقم.

قوله من احب ان یقیم. وعلم منه ان استماع خطبة العید غیر واجب.

شاہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی مذکورہ بالا تحقیق کے تناظر میں ہر وعظ کے وجوبِ استماع کا حکم لگانا یقیناً دشوار ہے۔

نیز قاعدہ مسلّمہ ''المشقة تجلب التیسیر'' بھی عدم وجوب کا متقاضی ہے۔علاوہ ازیں بعض صحابہ کے طرزِ عمل سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

لمافی موضوعات الکبریٰ لملا علی القاری (ص۴۴): واخرج المروزی عن سالم ان ابن عمر کان یلفی خارجاً من المسجد فیقول ما اخرجنی الا صوت قاصّکم هذا.

یہ تو اس مسئلہ کا علمی اور فقہی پہلو تھا جس کے بابت ہم نے اپنے مؤقف کی وضاحت کر دی البتہ عملی نقطۂ نظر سے علماء کرام کی توقیر، عزت واحترام اور ان کے کلام، وعظ اور پند کو ہمہ تن، دلجمعی اور یکسوئی سے سننے سے کسی کو انکار کی مجال نہیں بلکہ اس پہلو کو عوام الناس میں ترغیبی انداز میں اجاگر کرنے کی اشد ضرورت اور عصر حاضر کا اہم تقاضا ہے۔کیونکہ افادہ اور استفادہ کا دارومدار اعتقاد اور باہمی الفت ومحبت پر ہے۔عوام الناس کے قلوب میں علماء کرام کا اعتقاد، تعظیمی اور توقیری شعور بیدار کرنے کیلئے اس مسئلہ کو منصۂ شہود پر لانا انتہائی قابل ستائش اور مستحسن اقدام ہے۔اس مسئلہ کو عملی جامہ پہنانے سے میڈیا، مغرب زدہ طبقہ اور سازشی عناصر کے ہاتھوں عوام اور علماء کرام کے مابین پھیلائی انارکی، فساد، نفرت اور قائم خلیج کے فاصلے رفو ہو کر علماء کرام عوام الناس کے تمام شعبہ ہائے زندگی میں بہتر انداز میں صحیح دینی اور اخلاقی رہنمائی کر سکیں گے اور کافی حد تک عریانی اور فحاشی سے آلودہ معاشرہ کا مداوا ہو سکے گا۔

(۳۳۷) خطبہ اور جماعت کے درمیان خطیب صاحب کا مخصوص اعلان کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری مسجد کے خطیب صاحب جمعہ کے خطبہ کے بعد اقامت سے پہلے دو چار باتوں کا اعلان کرتے ہیں، وہ یہ ہیں ''صفیں درست فرمالیں، چھوٹے بچوں کو پچھلی صفوں میں، یا صفوں کے دائیں بائیں کردیں، اپنے سروں کو ڈھانپ لیں اپنے پائچوں کو ہمیشہ کھلا رکھا کیجئے اور اپنے موبائل فونز بند کرلیں'' اس اعلان کے بعد اقامت ہوتی ہے اور پھر نماز۔معلوم یہ کرنا تھا کہ آیا اس طرح کے اعلان سے خطبہ جمعہ اور نماز میں فصل واقع نہیں ہوتا؟ آیا اس طرح کا اعلان کرنا خطیب صاحب کیلئے درست ہے؟ میں نے کئی بڑے بڑے بزرگوں کے پیچھے نماز جمعہ پڑھی ہے انہیں اس طرح کے اعلانات

کرتے کبھی نہیں سنا، ازراہ کرم اگر بزرگوں میں سے کسی سے متعلق بھی معلوم ہوجائے کہ ان کی یہ عادت تھی تو بڑی مہربانی ہوگی۔

الجواب حامداًومصلیاً..... امر بتسویۃ الصفوف یعنی نماز کے لئے جب صفیں بنائی جائیں تو صفوں کو سیدھا کرنے کا حکم کرنا نماز کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے، خدا کے بعد سب سے بڑے بزرگ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز پڑھانے کے لئے تشریف لاتے تو تکبیر کہنے سے پہلے صفوں کو سیدھا کرنے کا حکم فرماتے۔ کتب احادیث اس قسم کی احادیث سے بھری ہوئی ہیں۔ اس تمہید کی روشنی میں جواباً عرض ہے کہ خطیب صاحب کا یہ اعلان کرنا جائز و مستحسن اور سنن صلوۃ میں سے ایک سنت کو پورا کرنا ہے، جہاں تک خطبہ اور اقامت کے درمیان فصل کا تعلق ہے جس کو فقہاء نے مکروہ لکھا ہے وہ اس صورت میں ہے جبکہ دنیاوی باتوں کے ذریعہ ہو، اگر دینی باتوں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یا کسی عذر شرعی کی بنا پر فصل آجائے تو یہ مکروہ نہیں ہے۔ خطیب صاحب مذکور فی السوال کا یہ اعلان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے قبیل سے ہے لہٰذا یہ فصل مضر نہیں۔ آپ کا کسی سے نہ سننا ان کے خلاف حجت نہیں۔

لمافی سنن النسائی(۱/۹۳): مایقول الامام اذا تقدم فی تسویۃ الصفوف، اخبرنا بشر بن خالد...... عن أبی مسعود رضی اللہ عنہ قال کان رسول اللہ ﷺ یمسح عواتقنا ویقول استووا ولا تختلفوا فتختلف قلوبکم ولیلینی منکم اولو الاحلام والنہی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم...... عن انس قال اقبل علینا رسول اللہ ﷺ بوجہہ حین قام الی الصلوۃ قبل ان یکبر فقال اقیموا صفوفکم وتراصوا فانی اراکم من وراء ظہری.

وفی صحیح البخاری(۱/۱۰۰): قال انس بن مالک رضی اللہ عنہ اقیمت الصلوۃ فاقبل علینا رسول اللہ ﷺ بوجہہ فقال اقیموا صفوفکم وتراصّوا فانی اراکم من وراء ظہری.

وفی عمدۃ القاری(۵/۲۵۴): ذکر ما یستفاد منہ فیہ الامر بتسویۃ الصفوف وھی من سنۃ الصلوۃ عند ابی حنیفۃ والشافعی ومالک رحمہم اللہ تعالیٰ، وزعم ابن حزم انہ فرض لان اقامۃ الصلوۃ فرض وما کان من الفرض فہو فرض.

وفی الدر المختار مع الشامیۃ (۲/۱۶۱): فاذا اتم اقیمت ویکرہ الفصل بامر الدنیا ذکرہ العینی، قولہ اقیمت، بحیث یتصل اول الاقامۃ باٰخر الخطبۃ وتنتہی الاقامۃ بقیام الخطیب مقام الصلوۃ...... قولہ بامر الدنیا اما بنہی عن منکر او امر بمعروف فلا وکذا بوضوء او غسل لو ظہر انہ محدث او جنب کمامر بخلاف اکل أوشرب.

(۳۳۸) خطبہ اور جمعہ میں فصل کی شرعی حیثیت

سوال..... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر خطبہ اور نمازِ جمعہ میں فصل ہوجائے تو شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... خطبہ اور نماز جمعہ میں وصل سنت ہے۔ پھر اگر فصل اخروی امور کی وجہ سے ہو۔ جیسے وضو کرنا وغیرہ تو دوبارہ خطبہ دینا مستحب ہے۔ اگر خطبہ نہ دے، پھر بھی جائز ہے۔ لیکن اگر فصل دنیاوی امور کی وجہ سے ہو، جیسے کھانا پینا وغیرہ تو مکروہ ہے اور اگر فصل لمبا ہو جائے تو دوبارہ خطبہ دینا ضروری ہوگا۔

لمافی الدر المختار علی هامش الطحطاوی (۱/۳۴۳): ولو خطب جنبا ثم اغتسل وصلی جازولو فصل باجنبی فان طال بان رجع لبيته فتغدى أو جامع واغتسل استقبل خلاصة ای لزوما لبطلان الخطبة.

وقال الطحطاوی تحته: **(قوله جاز) أی ولا يعد الغسل فاصلا لانه من اعمال الصلاة (فان طال)** الظاهر انه يرجع فی الطول الى نظر **المبتلی**.

وفيه ايضاً (صـ۲۴۸): (فاذا اتم) **الامام الخطبة (أقيمت ويكره الفصل بامر الدنيا) يفهم منه انه** لايكره الفصل بامر الآخرة كذكروهو كذلک لان الخلاف على الاصح انما هو فی كلام الدنيا كما قدمناه ولكن مالم يلزم منه تاخر.

وفی الشامية (۲/۱۵۱): **(قوله جاز) أی ولا يعد الغسل فاصلا لانه من اعمال الصلاة و لكن الاولى** اعادتها كما لو تطوع بعدها اوافسد الجمعة او فسدت بتذكرفائتة فيها. وفی (صـ۱۶۱): (قوله فاذا أتم) ای الامام الخطبة (قوله أقيمت) بحيث يتصل اول الاقامة بآخر الخطبة ....

وفی (صـ۱۶۲): (قوله بامر الدنيا) اما بنهی عن منكر او امر بمعروف فلا وكذا بوضوء او غسل لوظهر انه محدث او جنب كما مر بخلاف اكل وشرب حتى لوطال الفصل استأنف الخطبة.

(۳۳۹) عربی میں خطبہ پڑھنے کی شرعی حیثیت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جمعہ کے وقت عربی زبان میں جو خطبہ پڑھا جاتا ہے اس کا عربی زبان میں پڑھنا فرض ہے واجب یا سنت؟ اگر کوئی عربی زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں پڑھتا ہے یا عربی کے ساتھ ساتھ کسی دوسری زبان میں ترجمہ بھی ہوتا ہے تو اس خطبے کا کیا حکم ہوگا؟ اور اس صورت میں نمازِ جمعہ کا کیا حکم ہوگا؟ نیز اس مسئلے میں جواز اور عدم جواز کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں ان کو مفصلاً ومدللاً بیان فرمادیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... جمہور ائمہ کے نزدیک نماز جمعہ کیلئے خطبہ پڑھنا فرض اور عربی زبان میں پڑھنا واجب ہے، حضرت امام ابوحنیفہؒ کا پہلے یہ قول تھا کہ قراءت بالفارسیہ جائز ہے اس شخص کیلئے جو عربی زبان پر قدرت رکھتا ہو، پھر انہوں نے صاحبینؒ کے قول کی طرف رجوع کر لیا اور اب احنافؒ کا مفتی بہ قول یہ ہے کہ قرأت بالفارسیہ جائز نہیں، اور شروع فی الصلاۃ بالفارسیۃ میں بھی یہی اختلاف ہے۔

صاحبینؒ کے نزدیک عربی زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں جائز نہیں اور حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جائز ہے، اور فقہاء کرام شروع فی الصلاۃ بالفارسیۃ کے اس اختلاف کو مدار بنا کر نماز کے تمام اذکار، دعاء قنوت اور خطبے وغیرہ کو قیاس کرتے ہیں۔

صاحبین کے نزدیک عربی کے علاوہ کسی اور زبان میں جائز نہیں ہے، اور حضرت امام صاحبؒ کے نزدیک جائز ہے، اور حضرت امام ابو حنیفہؒ کا رجوع شروع فی الصلاۃ بالفارسیۃ میں صاحبینؒ کے قول کی طرف ثابت ہے۔

لہٰذا احنافؒ کا اب قول یہ ہے کہ عربی زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں شروع فی الصلاۃ بالفارسیۃ، نماز کے تمام اذکار اور دعاء قنوت، اور خطبہ وغیرہ سب جائز نہیں ہیں۔

صورت مسئولہ میں خطبہ غیر عربی میں پڑھنا جائز نہیں ہے۔ اگر کسی نے عربی زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں خطبہ پڑھا تو اس خطبے کا اعادہ ضروری ہوگا۔

وفی الهندية (١/١٤٦): (ومنها الخطبه قبلها) حتى لو صلوا بلا خطبة أو خطب قبل الوقت لم يجز كذا في الكافي.

وفي الشامية(١/٤٨٣): (قوله ايضاً الخ) أي كما صح شروعه بالتكبير السابق صح ايضاً بالتسبيح ونحوه، لكن مع كراهة التحريم، لأن الشروع بالتكبير واجب، وقدمنا ان الواجب لفظ الله اكبر من بين الفاظ التكبير الأتية، وقال في الخزائن هنا، وهل يكره الشروع بغير الله اكبر؟ تصحيحان، والراجح انه مكروه تحريما، وان وجوبه عام لاخاص بالعبد كماحرره في البحر للمواظبة التي لم تقترن بترك اهـ...... وفيه أيضاً (صـ٤٨٤) (قوله وجميع اذكار الصلاة) في التتارخانية عن المحيط: وعلى هذا الخلاف لوسبح بالفارسية في الصلاة او دعا أو أثنى على الله تعالىٰ او تعوذ اوهلل او تشهد او صلى على النبي صلى الله عليه وسلم بالفارسية في الصلاة اى يصح عنده لكن سيأتي كراهة الدعاء بالاعجمية.

وفي الفقه الاسلامي (٢/٨٤٠): وقد اجمع الفقهاء على انه لا تجزى القراء ة بغير العربية، ولا الإبدال بلفظها لفظاً عربياً آخر، سواء احسن قراء تها بالعربية أو لم يحسن، لقوله تعالىٰ: (قرآناً عربياً) (يوسف، ١٢/٢). وقوله سبحانه: "بلسان عربي مبين" (الشعراء:٢٦/١٩٥) ولا القرآن معجزة بلفظه ومعناه، فإذا غيرّ خرج عن نظمه، فلم يكن قرآناً ولا مثله، وإنما يكون تفسيراً له، والتفسير غير المفسر الخ.

وفي الدر المختار (١/٥٢١): (ودعا) بالعربية، وحرم بغيرها نهر، لنفسه وابويه واستاذه المؤمنين.

وفي الشامية تحته: (قوله وحرم بغيرها) الى قول لكن المنقول عندنا الكراهة، فقد قال في غرر

الافکار شرح درر البحار فی هذا المحل: وکره الدعاء بالعجمیة، لأن عمرؓ نهی عن رطانة الأعاجم اھ .. والرطانة کما فی القاموس: والکلام باالاعجمیة، ورأیت فی الولوالجیة فی بحث التکبیر بالفارسیة ان التکبیر عبادة لله تعالیٰ، والله تعالیٰ لایحب غیر العربیة، ولهذا کان الدعاء بالعربیة اقرب الی الاجابة، فلایقع غیرها من الألسن فی الرضاء والمحبة لها موقع کلام العرب اھ. وظاهر التعلیل أن الدعاء بغیر العربیة خلاف الاولیٰ، وان الکراهة فیه تنزیهیة، الی قول ولا یبعد ان یکون الدعاء بالفارسیة مکروها تحریما فی الصلوة وتنزیها خارجها، فلیتامل ولیراجع.

وفی مجموعة الفتاویٰ هامش خلاصة الفتاویٰ(۱/۱۵۰): سوال: چه میفرمایند علماء دین متین اندرین مسئله که خطبه جمعه بر زبان اردو یا فارسی یا باشعار اردو یا فارسی خواندن جائز ودرست است یا نه؟ واگر جائز است پس درکدام کتاب مذکور است بینوا توجروا، هو العلیم الخبیر خطبه جمعه بر زبان اردو نثر باشد یا نظم وهمچنان برزبان فارسی نثر باشد یا فارسی وعلی هذا القیاس خطبه که قدری عبارتش بلغت عربی باشد وقدری بزبان اردو یا فارسی نثر یا نظم باشد مکروه بکراهت تحریمی است چرا که مخالف سنت هدیٰ است زیراچه پیغمبر خدا علیه التحیة والثناء وصحابه کرامؓ علی الدوام خطبه بزبان عربی خوانده است ودرآن وقت از کسی خواندن خطبه بغیر زبان عربی منقول نیست چنانکه درکتاب آکام النفائس فی اداء الاذکار بلسان الفارس مسطورست وهذه عبارته "الکراهة انما هی لمخالفة السنة لان النبی ﷺ واصحابه قد خطبوا دائما بالعربیة ولم ینقل عن احد منهم أنهم خصبوا ولو خطبة غیر الجمعة بغیر العربیة انتهیٰ، وپوشیده نماندکه باعث احداث خطبه غیر عربیه نیست مکر نفهمیدن عجم عبارات عربیه راحالانکه این امردر قرون ثلاثه هم موجود بود چرا که هر گاه بلاد وامصار در اطراف مختلفه مفتوح شدند واکثر مردمان فارس وحبش وروم وغیره مشرف باسلام شدند وایشان درمجالس شعائر الاسلام مثل جمعه وعید وغیرها حاضر میشدند وظاهر است که آن مردمان رابوجه عدم وقوف از لغت عربی شعور فهم عبارات عربیه نبود با این همه کسے شخصے بنا بر رعایت فهم اشخاص عجمیه خطبه در غیر زبان عربی ننخوانده باوجودیکه تعلیم وتفهیم که از شان خطبا وعلماست مقتضی این بود هر گاه در آن وقت چنین نه شده پس درکراهت خطبه غیر عربیه که ادنیٰ مرتبه ضلالت ست، هیچ شکے نماند، چنانکه درکتاب آکام النفائس فی اداء الأذکار بلسان الفارس مذکور ست، الخطبة بالفارسیة التی احدثوها واعتقدوا حسنها لیس الباعث الیها الاعدم

فهم العجم اللغة العربية وهذا الباعث قد كان موجود فی عصر خير البرية وان كان فی اشتباه فلا اشتباه فی عصر الصحابة والتابعين ومن تبعهم من الائمة المجتهدين حيث فتحت الامصار الشاسعة والديار الواسعة واسلم اكثر الحبش والروم والعجم وغير هم من الاعجام وحضروا مجالس الجمع والاعياد وغيرها من شعائر الاسلام وقد كان اكثرهم لايعرفون اللغة العربية ومع ذلک لم يخطب احد منهم بغير العربية ولما ثبت وجود الباعث فی تلک الازمنة وفقدان المانع والتكاسل ونحوه معلوم بالقواعد المبرهنة لم يبق الا الكراهة التی هی ادنیٰ درجات الضلالة انتهی، الی قول (صـ ۱۵۱) چنانچه هم در آن کتاب مرقوم است، وقدوردان النبی ﷺ لما فرغ من الخطبة فی بعض الاعياد وظن انها لم تصل الی اذان النساء لبعدهن حضرهن ووعظهن وخطبهن ولم يرووا لومن رواية الافراد أنه عقدين ألم يكن يفهم العربی مجلساً عليحدة ووعظهم وخطبهم بلغة غير عربية ولا يتوهم انه لم يكن النبی ﷺ يعلم اللغة العجمية وغيرها من اللغات الغير العربية ولو كان علمها لخطب بها لأنا نقول بعد تسليم ذلک ان بعض الصحابة كزيد بن ثابت قد كان يعلم اللسان العجمی والرومی والحبشی وغيرها من الا لسنة كماصرح به فی الاعلام بسيرة النبی ﷺ وغيره من كتب الاعلام فلم لم يامره النبی ﷺ بان يخطبهم ويعظهم بالسنتهم وبالجملة فالاحتياج الی الخطبة بغير العربية لتفهيم اصحاب العجمية كان موجودا فی القرون الثلثة ومع ذلک فلم يرو واحد من احد فی تلک الأزمنه وهذا اول دليل علی الكراهة انتهی.

وفی اعلاء السنن(۱/۱۱۳): هذا هو قول أبی حنيفةؒ أولا ثم رجع عنه إلی قولهما، وقال بأن القرآن اسم للفظ والمعنی جميعا لا للمعنی فقط. وقال: لا تجوز الصلوة بالعجمية للقادر علی العربية، وتجوز للعاجز عنها، قال فی البحر: وهو الحق لأن المفهوم من القرآن باللام انما هو العربی فی عرف الشرع وهو المطلوب من قوله تعالیٰ: "فَاقْرَؤُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ".

وفی كتاب الفقه علی مذاهب الاربعة(۱/۳۹۱،۳۹۲): يشترط لخطبتی الجمعة امور: احدها: أن تتقدما علی الصلاة، فلا يعتدبهما إن تاخرتا عنها...... ثالثها أن تكون بالعربية علی تفصيل فی المذاهب.

(حاشية نمبر ۲): الحنابلة: قالو الا تصح الخطبة بغير العربية إن كان قادراً عليها، فإن عجز عن الاتيان بها أتی بغيرها ممايحسنه، سواء كان القوم عرباً أو غيرهم، لكن الآية التی هی ركن من اركان الخطبتين لا يجوز له ان ينطق بها بغير العربية. فيأتی بدلها بأی ذكر شاء بالعربية، فان عجز

سکت بقدر قراء ۃ الآیۃ.

الشافعیۃ: قالوا: یشترط ان تکون ارکان الخطبتین باللغۃ العربیۃ: فلا یکفی غیر العربیۃ متی امکن تعلمها، فإن لم یمکن خطب بغیرها، هذا إذا کان القوم عرباً، أما إن کانوا عجماً فإنه لایشترط اداء أرکانهما بالعربیۃ مطلقاً، ولو أمکنه تعلمها ماعدا الآیۃ، فإنه لابدأن ینطق بها بالعربیۃ، الا اذا عجز عن ذلک، فإنه یأتی بدلها بذکر أو دعاء عربی، فان عجز عن هذا ایضاً فعلیه ان یقف بقدر قراء ۃ الآیۃ، ولا یترجم، وأما غیر ارکان الخطبۃ فلا یشترط لها العربیۃ بل ذلک سنۃ.

المالکیۃ: قالوا: یشترط فی الخطبۃ ان تکون باللغۃ العربیۃ، ولو کان القوم عجماً لایعرفونها، فإن لم یوجد فیهم من یحسن اللغۃ العربیۃ بحیث یودی الخطبۃ بها سقطت عنهم الجمعۃ.

(۳۴۰) خطبہ میں طہارت شرط نہیں

سوال...... ہمارے امام صاحب کچھ عرصے سے سلسل البول کے مرض میں مبتلا ہیں، اس سال عید کے روز لوگ دوردراز سے انکی تقریر سننے آگئے تو امام صاحب نے کہا کہ میں معذور ہوں لہٰذا نماز انکے بیٹے نے پڑھائی اورانہوں نے صرف خطبہ دیا اب معلوم یہ کرنا ہے کہ معذور شخص خطبہ دے سکتا ہے؟ کیا خطبہ کیلئے طہارت ضروری ہے؟ نیز جوشخص خطبہ دیگا وہی نماز پڑھائیگا یانہیں۔

الجواب حامداًومصلیاً...... خطبہ کیلئے طہارت شرط نہیں بلکہ سنت ہے، اگر کوئی شخص بغیر طہارت کے خطبہ دیدے تو خطبہ تو ہوجائیگا لیکن مکروہ ہوگا، لہٰذا معذور شخص بوجہ کراہت کے صرف تقریر کرلے خطبہ نہ دے بلکہ خطبہ اورنماز کوئی اور پڑھالے نیز خطبہ ایک شخص دے اورنماز دوسرا شخص پڑھادے تو یہ بھی جائز ہے البتہ بہتر یہ ہے کہ ایک ہی شخص خطبہ بھی دے اورنماز بھی پڑھائے۔

لمافی الهندیۃ(۱/۱۴۶)واماسننهافخمسۃعشراحدهاالطهارۃحتی کرهت للمحدث والجنب.

وفیهاایضاً(۱/۱۴۷):ولاینبغی ان یصلی غیرالخطیب. والله اعلم بالصواب.

(۳۴۱) خطبہ میں ''السلطان المسلم الخ'' کے الفاظ پڑھنے کی ابتداء اور شرعی حیثیت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اکثر خطیب خطبہ میں السلطان المسلم ظل الله فی الارض من اهان سلطان الله فی الارض اهانه الله کے الفاظ پڑھتے ہیں تو ایک صاحب کہتے ہیں کہ یہ الفاظ کہیں سے ثابت نہیں، خلفاء راشدین کے بعد کے بادشاہوں کے من گھڑت ہیں، انہوں نے اپنی عزت کرانے کیلئے خطبہ میں ان الفاظ کوشامل کیا ہے، تو اب آپ سے معلوم یہ کرنا ہے کہ ان الفاظ کا ثبوت کہاں سے ہے اور کب یہ خطبہ میں شامل کئے گئے نیز آج کل کے دور میں ان کا خطبہ میں پڑھنا کیسا ہے؟ جبکہ موجودہ دور کے حکمران ان کو اپنے حق میں لیتے ہیں۔ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......صورتِ مسئولہ میں مذکورہ الفاظ بادشاہوں کے من گھڑت نہیں بلکہ دومختلف احادیث مبارکہ سے ثابت ہیں۔ ہمیں تتبع بسیار کے بعد یہ تو معلوم نہ ہوسکا کہ یہ الفاظ خطبہ میں کب شامل کئے گئے البتہ موجودہ دور میں بھی ان الفاظ حدیث کو خطیب خطبہ میں پڑھ سکتا ہے۔ کیونکہ ظالم اور جابر بادشاہ جس سے دین اسلام کو نقصان اور کفر کو فائدہ ہورہا ہو تو وہ اس حدیث کا مصداق ہی نہیں ہے۔ چہ جائیکہ وہ اس حدیث کو اپنے حق میں مراد لے۔ کیونکہ اھانت سے مراد جائز امور میں سلاطین کی نافرمانی کرنا ہے۔ لہٰذا ناجائز امور میں ان کی فرمانبرداری جائز ہی نہیں ہے۔

لما فی الصحیح لمسلم (۲/۱۲۵): عن ابن عمر عن النبی ﷺ انه قال علی المرأ المسلم السمع والطاعة فیما أحب وکره الاأن یؤمر بمعصیة فاذا أمر بمعصیة فلا سمع ولاطاعة.

وفی الجامع للإمام الترمذی (۲/۴۲): عن زیاد بن کسب العددی قال کنت مع أبی بکرة تحت منبر ابن عامر وهو یخطب وعلیه ثیاب رقاق فقال ابو بلال انظروا الی امیرنا یلبس ثیاب الفساق فقال ابوبکرة اسکت فسمعت رسول الله ﷺ یقول من أهان سلطان الله فی الارض اهانه الله.

(۳۴۲) دورانِ خطبہ چندے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ خطبہ کے دوران چندہ مانگنا کیسا ہے اس کے بارے میں کیا حکم ہے، مسئلے کو وضاحت سے تحریر فرمائیں۔ آپ کی عین نوازش ہوگی۔

الجواب حامداً ومصلیاً......جب امام خطبہ شروع کردے تو تمام نمازیوں کو چاہئے کہ خاموشی کے ساتھ خطبہ سنیں کیونکہ خطبہ سننا واجب ہے اور خطبہ سننے میں خلل ڈالنے والے تمام کاموں سے اجتناب کریں کیونکہ دوران خطبہ ایسے کاموں کا کرنا مکروہ ہے۔ لہٰذا دورانِ خطبہ چندہ نہ کیا جائے کیونکہ اس سے خطبہ سننے میں خلل ہوگا۔ مصالح مسجد کیلئے چندہ کرنا ہو تو خطبہ سے پہلے یا نماز کے بعد کیا جائے البتہ اگر لوگوں کا مسجد میں جمع ہونا وقت خطبہ کے علاوہ دوسرے اوقات میں ممکن نہ ہو، اور مسجد کیلئے چندہ کی بھی اشد ضرورت ہو تو ایسی صورت میں دوران خطبہ چندہ کرنے کی گنجائش ہے بشرطیکہ خطبہ سننے میں مخل نہ ہو۔

لمافی الترمذی(۱/۱۱۴): عن ابی هریرة ان رسول الله ﷺ قال من قال یوم الجمعة والامام یخطب انصت فقد لغا.

وفی سنن ابی داؤد(۱/۱۵۹): عن ابی الزاهریة قال کنامع عبد الله بن بسر صاحب النبی ﷺ یوم الجمعة فجاء رجل یتخطی رقاب الناس فقال عبدالله بن بسر جاء رجل یتخطی رقاب الناس یوم الجمعة والنبی ﷺ یخطب فقال له النبی ﷺ إجلس فقد اذیت.

وفی سنن النسائی(۱/۱۵۸): (باب حث الامام علی الصدقة یوم الجمعة فی خطبته) عن عیاض بن

عبدالله قال سمعت ابا سعيد الخدری (رضی الله عنه) يقول جاء رجل يوم الجمعة والنبی ﷺ يخطب بهيأة بذّة فقال له رسول الله ﷺ اصليت قال لا قال صل ركعتين وحث الناس على الصدقة فالقوا ثياباً فاعطاه منها ثوبين فلما كانت الجمعة الثانية جاء ورسول الله ﷺ يخطب فحث الناس على الصدقة فالقى احدثوبيه فقال رسول الله ﷺ جاء هذا يوم الجمعة بهيأة بذّة فامرت الناس بالصدقة فالقوا ثياباً فامرت له منها بثوبين ثم جاء الأن فامرت الناس بالصدقة فالقى احدهما فانتهره وقال خذثوبك.

وفى حاشيته (قوله صل ركعتين) قيل امره ليرى الناس هيئته فيترحمون عليه لكن مقتضى السوال بقوله اصليت الخ انه ماقصد بالامر ذلک ثم كلامه ﷺ وكذا كلام المجيب ليس من باب الكلام حالة الخطبة فلا يشمله النهى لان الامام اذا شرع فى الكلام فما بقيت الخطبة تلک الساعة كذا قال السندى قلت والظاهر انه ﷺ امره ليرى الناس هيئته يدل عليه حثه ﷺ بالصدقة.

(۳۴۳) خطبہ جمعہ کے علاوہ اس سے پہلے کی جانے والی تقریر کی شرعی حیثیت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جمعہ کے دن بہت سے ملکوں میں یہ طریقہ رائج ہے کہ پہلے ایک شخص منبر کے علاوہ دوسری جگہ کھڑا ہوکر خطبہ دیتا ہے یہ خطبہ اسلامی احکام کے بجائے عام طور پر وہاں کے مسلمانوں کے مسئلے مسائل پر زیادہ توجہ دیتا ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ جائز نہیں ہے کہ جمعہ کے دن خطبہ میں دنیاوی باتیں کی جائیں، بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ جائز ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر ہمیشہ دنیاوی باتیں بھی مسجدوں میں زیر بحث آتی رہی ہیں جب پہلا شخص تقریر ختم کرتا ہے تو دوسرا شخص جو امام ہوتا ہے وہ بھی خطبہ دیتا ہے اور نماز پڑھاتا ہے یہ عام طور پر امریکہ، کینیڈا اور یورپ وغیرہ میں ہوتا ہے۔ پاکستان میں بھی کسی حد تک یہ طریقہ رائج ہے مگر یہاں عام طور پر امام نہیں بدلتا ہے، شرعی حکم بتا کر ممنون فرمائیں۔ جزاکم اللہ خیراً

الجواب حامداً ومصلیاً...... جمعہ کا خطبہ واجبہ اصلاً تو وہی عربی خطبہ ہے جو کہ دوسری اذان کے متصل بعد دیا جاتا ہے اور اسی خطبہ کے متعلق یہ حکم ہے کہ اس میں دنیاوی باتیں اور نماز جائز نہیں ہے البتہ عرب ممالک کے علاوہ دوسرے ممالک میں چونکہ لوگ عربی کو نہیں سمجھتے اور خطبہ کا ایک مقصد وعظ ونصیحت بھی ہے لہٰذا اگر پہلی اذان کے بعد مقامی زبان میں بیان کیا جائے اور وعظ ونصیحت کیا جائے تو یہ جائز ہے جیسا کہ بعض صحابہ سے ثابت ہے۔

لمافى المستدرک على الصحيحين (۱/۱۹۰): أخبرنا أحمد بن سلمان الفقيه...... كان ابوهريرةؓ يقوم يوم الجمعة الى جانب المنبر فيطرح اعقاب نعليه فى ذراعيه ثم يقبض على رمانة المنبر يقول قال ابو القاسم ﷺ قال محمد ﷺ قال رسول الله قال الصادق المصدوق ﷺ ثم يقول فى بعض

ذلک، ویل للعرب من شرٍ قد اقترب فاذا سمع حرکة باب المقصورة بخروج الامام جلس.

وفی المصنف لعبدالرزاق(۳/۲۱۹): عبدالرزاق عن معمر عن الزهری قال اوّل من قصّ تمیم الداری علی عهد عمر استأذ نه فی کل جمعة مقاماً فاذن له فکان یقوم قال: ثم استزاده مقاما آخر فزاده، فلما کان عثمان استزاده مقاما آخر فکان یقص فی الجمعة ثلاث مرات قال معمر وسمعت غیر الزهری یقول کان عمر اذا مرّبه وهو یقصّ امر علی حلقه السیف.

(۳۴۴) جمعہ کی تقریر اگر جمعہ کی سنتوں میں مخل ہو تو سنتوں کو کب ادا کیا جائیگا؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید ایک فیکٹری میں کام کرتا ہے اور نماز جمعہ فیکٹری میں واقع جامع مسجد میں ادا کرتا ہے۔ نماز جمعہ اور کھانے کیلئے ایک بجے چھٹی ہو جاتی ہے۔ جبکہ نماز جمعہ کی جماعت ایک بج کر پینتالیس منٹ پر کھڑی ہوتی ہے۔ زید پہلے کھانا کھاتا ہے اور پھر مسجد میں نماز پڑھنے آجاتا ہے۔ اس وقت سوا ایک بج رہا ہوتا ہے یا ایک بج کر بیس منٹ ہو رہے ہوتے ہیں۔ مسجد میں امام صاحب تقریر جمعہ سوا ایک بجے شروع کر چکے ہوتے ہیں۔ اب زید سنتِ جمعہ جب ادا کرتا ہے تو جمعہ کی تقریر سنت میں مخل ہوتی ہے اور سنت پڑھنے میں دشواری کا سامنا ہوتا ہے۔ تو کیا زید سنتِ جمعہ دورانِ تقریر ادا کرے یا بعد جمعہ ادا کرے؟ واضح رہے کہ زید کی ڈیوٹی ٹائم دو بجے پھر شروع ہو جاتی ہے اور بعد جمعہ وقت کی تنگی کی وجہ سے سنت ادا کرنا مشکل ہوتا ہے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر تقریر کے بعد سنت پڑھنے کا وقت دیا جاتا ہو، تو تقریر کے بعد سنت ادا کرے، اور یہی طریقہ بہتر ہے۔ اس لئے امام کو چاہئے کہ تقریر کے بعد سنت ادا کرنے کا وقت دیا کریں ورنہ سنت میں خلل واقع ہونے یا سنت میں تاخیر کی وجہ سے امام گنہگار ہوگا۔ اور مقتدیوں کو چاہئے کہ اس بات کی اصلاح کریں۔ اور اگر تقریر کے بعد سنت پڑھنے کا وقت نہ ہو۔ تو پھر مسجد سے باہر کسی جگہ میں سنت ادا کرلے تاکہ سنت میں خلل واقع نہ ہو۔ اور اگر ایسی جگہ بھی نہ ہو کہ وہاں آرام سے سنتیں ادا کی جائیں تو پھر سنتیں تقریر کے دوران مسجد ہی میں پڑھی جائیں۔

لمافی الشامیة (۱/۴۷۴): و تارکها یستوجب اساءة: ای التضلیل واللوم: وفی التلویح ترک السنة المؤکدة قریب من الحرام، وقد یوفق بأن مرادهم بالکراهه التحریمیة ...... قلت: لکن کونه سنة مؤکدة لایستلزم الاثم بترکه مرة واحدة بلاعذر، فیتعین تقیید الترک بالاعتیاد والاصرار تو فیقا بین کلامهم. کما قد مناه.

(۳۴۵) آبادی اور سہولیات کے اعتبار سے دورِ حاضر میں جمعہ کی شرائط

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارا بسا اوقات جماعت تبلیغ کا سفر ہوتا ہے اور بعض

اوقات سندھ، بلوچستان تشکیل ہوتی ہے۔ وہاں چھوٹی چھوٹی بستیوں میں نماز جمعہ ادا کی جاتی ہے۔ جماعت جب وہاں پہنچتی ہے تو اگر کوئی عالم صاحب جماعت میں ہوں تو وہ کہتے ہیں کہ جمعہ پڑھاؤ۔ ہم کہتے ہیں کہ یہاں تو شرائط ہی پوری نہیں ہیں وہ کہتے ہیں کہ

(۱)۔ ہم نے پوچھا ہے مفتیوں سے کہ جہاں پہلے سے (پاک وہند کی تقسیم سے پہلے سے، یا بعد میں بھی) جمعہ شروع ہو چکا ہے وہاں جمعہ بند نہ کیا جائے اور نئی جگہ جہاں شرائط نہ ہوں وہاں شروع نہ کیا جائے۔ گاؤں کے لوگ پورا ہفتہ نمازوں کیلئے نہیں آتے۔ صرف ایک دن جمعہ کے عنوان سے آتے ہیں اگر جمعہ بند ہو گیا تو یہ اس دن بھی نہ آئیں گے۔ اس بہانے چلو مسجد میں آتو جاتے ہیں اور خطبہ سے پہلے بیان بھی سن لیتے ہیں شاید کسی کے دل میں بات اتر جائے۔ چلو نمازِ جمعہ نہ ہوتی ہو۔ اگر ظہر پڑھیں تو بھی وہ نہ آئیں گے۔ جمعہ میں فائدہ ہی ہے نا۔ گاؤں والے یہ دلائل بیان کرتے ہیں۔ اس صورت حال میں کہ وہاں جماعت والے کیا کریں ان کو سمجھائیں تو مقامی علماء جن کا فتویٰ ان کے پاس ہے اس سے ٹکراؤ ہوتا ہے اور اگر پڑھائیں تو کیسے؟ آپ سے راہنمائی طلب کی جاتی ہے۔

(۲)۔ اس دور میں جمعہ کی شرائط آبادی اور سہولیات کے اعتبار سے کیا ہیں؟

(۳)۔ کیا جمعہ کی شرائط میں موجودہ دور میں بھی سلطان اور قاضی کی شرط ہے؟ اگر ہے تو کیسے؟ موجودہ دور میں تو ناظم، نائب ناظم وغیرہ ہوتے ہیں۔

(۴)۔ جمعہ سلطان قائم کرتا ہے جبکہ آجکل تو امام مسجد ہی پڑھاتے ہیں۔ آپ پورے مسئلے کی وضاحت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... جمعہ کے درست ہونے کیلئے شہر یا قصبہ ہونا ضروری ہے جس میں تمام حوائج اصلیہ پورے ہوں وہاں گلی کوچے ہوں محلے ہوں، ضروریات ہمیشہ میسر ہوں۔ حکیم یا ڈاکٹر ہو، ڈاکخانہ ہو، حاکم یا پنچایت کا انتظام ہو، ضروری پیشہ ور موجود ہوں۔ مذکورہ سہولیات جتنی تعداد کی آبادی میں میسر ہوں وہاں جمعہ درست ہے تعداد کی متعین مقدار منقول نہیں ہے۔

(۱)۔ لہٰذا جہاں ان شرائط کے فقدان کے باوجود جمعہ شروع کیا گیا وہاں نماز جمعہ ادا نہیں ہوگی بلکہ ظہر کی نماز پڑھنا لازم ہے اور صرف انتشار کے خوف سے یا یہ کہ لوگ پھر مسجد آنا چھوڑ دیں گے خروج عن المذہب درست نہیں بلکہ لوگوں کو حکمت و مصلحت سے سمجھائیں اور ظہر کی نماز پڑھنے کیلئے تیار کریں۔

(۲)۔ اس دور میں جمعہ کی شرائط آبادی اور سہولیات کے اعتبار سے وہی ہیں جو کہ اوپر مذکور ہیں۔

(۳)۔ جمعہ کی شرائط میں سلطان اور قاضی کی جو شرط رکھی گئی تھی وہ رفع منازعت کیلئے تھی لیکن اگر سلطان اور قاضی ان امور میں سستی سے کام لیتے ہیں جیسا کہ آجکل ہے تو پھر لوگ جس امام پر متفق ہو جائیں وہی نماز جمعہ پڑھائے اور سلطان یا قاضی کی اجازت ضروری نہیں۔

(۴)۔ آجکل کے حکمران چونکہ دینی امور میں سستی سے کام لیتے ہیں اور بسا اوقات ان میں امامت کی شرائط نہیں پائی جاتیں لہٰذا امام مسجد ہی نماز جمعہ پڑھائے۔

لمافی احکام القرآن للجصاص (۳/۴۴۵): إتفق فقهاء الأمصار على أن الجمعة مخصوصة بموضع لايجوز فعلها فى غيره لأنهم مجمعون على أن الجمعة لاتجوز فى البوادى ومناهل الأعراب فقال

أصحابنا هي مخصوصة بالامصار ولاتصح في السواد...... قال أبو بكر روى عن النبي ﷺ أنه قال لا جمعة ولا تشريق إلا في مصر جامع وروى عن على مثله وايضاً لو كانت الجمعة جائزة في القرى لو رد النقل به متواترا كوروده في الأمصار لعموم الحاجة إليه وايضاً لما اتفقوا على امتناع جوازها في البوادى لأنها ليست بمصر وجب مثله في السواد وروى أنه قيل للحسن أن الحجاج أقام الجمعة بالأهواز فقال لعن الله الحجاج يترك الجمعة في الأمصار ويقيمها في حلاقيم البلاد.

وفي الفقه النافع(۱/۲۷۴):لاتصح الجمعة إلافي مصر جامع للحديث لاجمعة ولا تشريق ولا فطر ولا أضحى إلا في مصر جامع ويجوز في مصلى المصر لإتصاله به ولا يجوز في القرى ولا تجوز إقامتها إلا للسلطان أو من أمره السلطان لأن كل واحد يتقدم أو يقدم رجلا فيؤدى إلى المنازعة المبطلة للجمعة.

وفي الشامية(۱۳۸/۲): وعبارة القهستاني تقع فرضاً في القصبات والقرى الكبيرة التى فيها أسواق ...... وفيما ذكرنا إشارة إلى أنه لاتجوز في الصغيرة التى ليس فيها قاض ومنبر وخطيب كما في المضمرات والظاهر أنه اريدبه الكراهة لكراهة النفل بالجماعة الا ترى أن في الجواهر لوصلوا في القرى لزمهم أداء الظهر.

وفي الدر المختار مع الشامية(۱۴۳/۲): (ونصب العامة) الخطيب (غير معتبر مع وجود من ذكر) أمامع عدمهم فيجوز للضرورة. وفي الشامي تحت (قوله فيجوز للضرورة) ومثله مالومنع السلطان أهل مصر أن يجمعوا إضراراً وتعنتاً فلهم أن يجمعوا على رجل يصلى بهم الجمعة.

وفي الشامية تحته: (قوله مالو منع السلطان الخ) ونقل شيخنا عن عقد اللآلى أنه لو تعذر الا ستئذان من السلطان كما في هذا الزمان من عدم إلتفات السلاطين لمثل تلك الأمور فاجتمعت الناس على شخص ليصلى بهم جاز.

(۳۴۶) گاؤں میں ۴۰، ۵۰سال سے جاری جمعہ موقوف کرنے پر فتنہ کا اندیشہ ہوتو کیا کرے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارا گاؤں صوبہ سرحد ضلع کوہاٹ کے نواح میں پنڈی روڈ پر واقع ہے جس کی آبادی تقریباً 1500 کے لگ بھگ ہے جس میں ضروریات زندگی کیلئے چھ دوکانیں، ایک میڈیکل کلینک، ایک موچی کی اور ساتھ ہی ایک ٹیلرز کی دوکان بھی ہے۔ تین مسجدیں جن میں سے دو میں نمازیں ہوتی ہیں اور ایک بالکل ویران ہے۔ اور گاؤں میں گاڑیوں کی سہولت کے ساتھ فون کی سہولت بھی میسر ہے اور اس کے علاوہ آٹے کی مشینیں بھی موجود ہیں۔ ان تمام سہولتوں کے

باوجود اکثر ضروریات زندگی کیلئے شہر جانا پڑتا ہے اور بڑے مریضوں کو شہر لے جایا جاتا ہے۔
اب مسئلہ یہ ہے کہ اس گاؤں میں تقریباً ۴۰۔۵۰ سال سے جمعہ اور عیدین کی نمازیں ادا کی جاتی ہیں، آیا اس گاؤں میں جمعہ کی نماز کے بارے میں کیا حکم ہے ہوتی ہے یا نہیں؟ بعض مفتیان صاحبان نے عدم جواز کا حکم دیا ہے جبکہ اس کے روکنے میں فتنہ اور فساد کا قوی اندیشہ ہے اس لئے کہ اس گاؤں میں فرقۂ مخالف کے لوگ (یعنی بریلوی حضرات) موجود ہیں اگر اس کو روکا جائے اگرچہ روکنا ممکن نہیں لیکن بالفرض پھر بھی اگر روکا جائے تو فرقۂ مخالف والے اپنی مسجد میں جمعہ شروع کردیں گے جس سے مزید فتنہ اور فساد پھیلنے کا سخت اندیشہ ہے، اس کا خیال رکھتے ہوئے اس مذکورہ مسئلے کا تفصیلی جواب ارسال کرکے احسان فرمائیں۔
الجواب حامداً ومصلیاً......(۱)۔نمازِ جمعہ کی ادائیگی کے صحیح ہونے کی شرطوں میں سے ایک شرط یہ ہے کہ وہ جگہ جہاں نمازِ جمعہ ادا کی جارہی ہے شہر ہو، اور شہر اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں ہزاروں کے لگ بھگ لوگ بستے ہوں، مختلف محلے اور بازار ہوں، ضروریات زندگی کو پورا کرنے کیلئے سہولیات میسر ہوں، لہٰذا صورت مسئولہ میں چونکہ اس جگہ پر جہاں جمعہ کی نماز ادا کی جاتی ہے شہر کی تعریف صادق نہیں آتی جیسا کہ سوال سے واضح ہے۔اس لئے وہاں جمعہ کی نماز ازروئے فقہ حنفی جائز نہیں ہے۔
(۲)......اگر نماز جمعہ کی ادائیگی سے روکنے میں فتنہ وفساد کا قوی اندیشہ ہو تو اس صورت میں حکومتِ وقت یا اُس کے نائب سے اجازت لے کر نمازِ جمعہ کی ادائیگی جائز ہو جائے گی۔

لما فی المصنف لعبد الرزاق(۱۶۷/۳): عن الحارث عن علی قال: لاجمعة ولاتشریق الا فی مصر جامع.

وفی الدر المختار(۱۳۸/۲):وفی القهستانی: اذن الحاکم ببناء الجامع فی الرستاق اذن بالجمعة اتفاقاً علی ماقاله السرخسی واذا اتصل به الحکم صار مجمعاً علیه فلیحفظ.

(۳۴۷) چھوٹی بستی میں قائم نماز جمعہ کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں میں تقریباً پندرہ بیس سال سے جمعہ کی نماز ادا کی جاتی ہے۔ جبکہ ہمارے گاؤں کی آبادی تقریباً بالغ افراد ۳۵۰ ہوں گے اور ۱۱۰ گھر ہیں۔ اور دو دکانیں ایک پی سی او، ایک میڈیکل اسٹور اور پن چکی ہیں، نیز لڑکوں کا ہائی اسکول اور لڑکیوں کا مڈل اسکول بھی ہے۔اب پوچھنا یہ ہے کہ
(۱)۔کیا مذکورہ گاؤں میں نماز جمعہ ادا کرنا درست ہے یا نہیں؟
(۲)۔بصورت عدم جواز کیا اس نماز جمعہ کے ادا کرنے سے منع کرنا درست ہے یا منع نہ کیا جائے۔جبکہ اس ممانعت میں لوگوں کے انتشار کا خوف اور اندیشہ ہو۔تو کیا ایسی صورت میں شوافع کے مذہب کے مطابق جواز کا فتویٰ دینا درست ہے یا نہیں؟
(۳)۔بعض حضرات یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ کفایت المفتی وغیرہ میں توسع سے کام لیا ہے۔تو کیا اس توسع کو بطور دلیل پیش کرنا درست

ہے؟ جبکہ اس صورت میں چند خرابیاں لازم آتی ہیں جیسے کہ احسن الفتاویٰ میں مذکور ہیں۔
۱) نفل کی جماعت کا التزام لازم آتا ہے۔ ۲) نفل نہار میں جہر۔ ۳)۔غیر لازم کا التزام۔ ۴) ترک جماعت نماز ظہر جبکہ جمعہ درست نہ ہو۔ ۵)۔اگر کوئی ظہر نہ پڑھے تو ترک فریضہ لازم آتا ہے جو کہ فسق ہے۔
نیز احتیاط الظہر ادا کرنا کیسا ہوگا جائز یا ناجائز؟ قرآن وسنت اور فقہ حنفی سے مدلل جواب دے کر عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب حامداًومصلیاً...... جمعہ کے واجب ہونے کیلئے شہر کا ہونا شرط ہے۔قصبات اور بڑی بستیاں بھی شہر کے حکم میں ہیں۔قصبہ اور بڑی بستی کی فقہاء کرام نے مختلف علامات بیان کی ہیں۔جیسا کہ بدائع میں تفصیل سے مذکور ہیں۔

(۱)۔ صورت مسئولہ میں، چونکہ آپ کے گاؤں میں ان علامات میں سے کوئی علامت موجود نہیں ہے لہٰذا یہ بڑی بستی میں داخل نہیں ہے بلکہ قریہ صغیرہ (چھوٹی بستی) ہے اور چھوٹی بستی میں باتفاق فقہاءِ احناف جمعہ پڑھنا جائز نہیں ہے۔لہٰذا مذکورہ گاؤں میں جمعہ ادا کرنا درست نہیں۔البتہ اگر حاکم اجازت دے دے تو پھر جمعہ درست ہوسکتا ہے۔

(۲)۔ بحالت موجودہ، جب جمعہ درست نہیں ہے تو لوگوں کو حکمت اور مصلحت کے ساتھ نماز جمعہ کے ادا کرنے سے منع کیا جائے۔اس لئے کہ جمعہ کے ادا کرنے سے ظہر کی نماز ذمہ سے ساقط نہ ہوگی بلکہ ظہر کا ادا کرنا لازم ہوگا۔ایسی صورت میں شوافع کے مذہب کے مطابق جواز کا فتویٰ دینا درست نہیں ہے اس لئے کہ مذہب غیر پر فتویٰ ضرورت شدیدہ کی وجہ سے دیا جاتا ہے اور اس مسئلہ میں حنفیہ کو بمذہب دیگر ائمہ عمل کرنے کی فقہاء نے اجازت نہیں دی۔

(۳)۔ اور کفایت المفتی میں جواز کے بارے میں توسع سے کام لینا حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ کی ذاتی رائے اور تفرد ہے۔ حضرت کے علاوہ کسی نے بھی جواز کا قول نہیں کیا ہے بلکہ سب عدم جواز کے قائل ہیں۔لہٰذا اس توسع کو بطور دلیل پیش کرنا درست نہیں ہے۔

رہا احتیاط الظہر کا مسئلہ! تو اس کا پڑھنا وہاں ہوتا ہے جہاں جمعہ کے جواز میں شہر وغیرہ ہونے یا نہ ہونے میں شک واقع ہوجائے اور وہاں کے لوگوں نے جمعہ قائم کرنا شروع کر دیا ہو، جبکہ یہاں پر یہ بات یقینی ہے کہ آپ کا گاؤں شہر یا بڑی بستی نہیں ہے بلکہ چھوٹی بستی ہے لہٰذا ظہر کی نماز ہی پڑھی جائے گی۔

لما فی الفقه النافع (۱/۲۷۴): لاتصح الجمعة الافی مصر جامع للحديث: ((لاجمعة ولا تشريق ولا فطر ولا اضحی) الافی مصر جامع)) ويجوز فی مصلی المصر لاتصاله به ولا يجوز فی القری.

وفی بدائع الصنائع(۲/۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰): اما المصر الجامع: فشرط وجوب الجمعة، وشرط صحة ادائها عند اصحابنا...... فلا تجب علی اهل القری التی ليست من توابع المصر، ولا يصح اداء الجمعة فيها ......(صـ ۱۸۹) اما المصر الجامع: فقد اختلفت الاقاويل فی تحديده. ذكر الكرخی ان المصر الجامع ما اقيمت فيه الحدود، ونفذت فيه الاحكام. وعن ابی يوسف روايات، ذكر فی

"الاملاء": کل مصر فیه منبر وقاض ینفذ الاحکام ویقیم الحدود، فهو مصر جامع، تجب علی اهله الجمعة. وفی روایة: قال: اذا اجتمع فی قریة من لایسعهم مسجد واحد. بنی لهم الامام جامعا، ونصب لهم من یصلی بهم الجمعة. وفی روایة: ((لو کان فی القریة عشرة آلاف اواکثر. امرتهم باقامة الجمعة فیها)) وقال بعض اصحابنا: المصر الجامع مایتعیش فیه کل محترف بحرفته من سنة الی سنة، من غیر ان یحتاج الی الانتقال الی حرفة اخری. وعن ابی عبدالله البلخی، انه قال: احسن ما قیل فیه: اذا کانوا بحال لو اجتمعوا فی اکبر مساجد هم لم یسعهم ذلک، حتی احتاجوا الی بناء مسجد الجمعة، فهذا مصر تقام فیه الجمعة، وقال سفیان الثوری: المصر الجامع مایعده الناس مصرا عند ذکر الامصار المطلقة. وسئل ابو القاسم الصفار عن حد المصر الذی تجوز فیه الجمعة، فقال: ان تکون لهم منعة لوجاء هم عدو قدروا علی دفعه، فحینئذ جاز ان یمصر، وتمصره ان ینصب فیه حاکم عدل یجری فیه حکما من الاحکام، وهو ان یتقدم الیه خصمان فیحکم بینهما و روی عن ابی حنیفة رحمه الله: انه بلدة کبیرة، فیها سکک واسواق، ولهارساتیق، وفیها وال یقدر علی انصاف المظلوم من الظالم بحشمه وعلمه او علم غیره، والناس یرجعون الیه فی الحوادث، وهو الاصح.

وفی الدر المختار(۲/۱۳۷):(ویشترط لصحتها) سبعة اشیاء: الاول: (المصر وهو مالایسع اکبر مساجده اهله المکلفین بها) وعلیه فتوی اکثر الفقهاء مجتبی لظهور التوانی فی الاحکام، وظاهر المذهب انه کل موضع له امیر وقاض یقدر علی اقامة الحدود کما حررناه فیما علقناه علی الملتقی. وفی القهستانی: اذن الحاکم ببناء الجامع فی الرستاق اذن بالجمعة اتفاقا علی ماقاله السرخسی واذا اتصل به الحکم صار مجمعا علیه فلیحفظ. وقال العلامة ابن عابدین الشامی رحمه الله تحته (قوله وفی القهستانی الخ) تأیید للمتن. وعبارة القهستانی تقع فرضافی القصبات والقری الکبیرة التی فیها اسواق قال ابو القاسم: هذا بلا خلاف اذا اذن الوالی او القاضی ببناء المسجد الجامع واداء الجمعة لان هذا مجتهد فیه فاذا اتصل به الحکم صار مجمعا علیه، وفیما ذکرنا اشارة الی انه لا تجوز فی الصغیرة التی لیس فیها قاض ومبر وخطیب کمافی المضمرات والظاهر انه اریدبه الکراهة لکراهة النفل بالجماعة، الاتری ان فی الجواهر لوصلوافی القری لزمهم اداء الظهر الخ.

وفی الصفحة ۱۴۵ من باب الجمعة: فیصلی بعدها اخر ظهر وکل ذلک خلاف المذهب، فلا یعول علیه کما حرره فی البحر. وقال العلامة الشامی تحته (قوله فیصلی بعدها اخرظهر)...... وقال فی البحر: انه لا احتیاط فی فعلها لانه العمل باقوی الدلیلین اهـ اقول: وفیه نظر بل هو الاحتیاط

بمعنی الخروج عن العهدة بيقين لان جواز التعدد وان كان ارجح واقوى دليلا، لكن فيه شبهة قوية لان خلافه مروی عن ابی حنیفة ایضا......(ص-۱۴۶) نعم ان ادى الى مفسدة لاتفعل جهارا والكلام عند عدمها ولذا قال المقدسی نحن لانامر بذلک امثال هذه العوام بل ندل علیه الخواص ولو بالنسبة الیهم اهـ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۳۴۸) گاؤں میں نمازِ جمعہ درست نہیں

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جواز صلوٰۃ الجمعہ کے بارے میں درج ذیل صفات سے موصوف بستی کان مہترزئی جوکہ پہاڑ کے دامن میں کوئٹہ، ژوب شاہراہ پرواقع ہے بلوچستان کے سردترین علاقوں میں سے ہےاور سردیوں میں کافی برف باری ہوتی ہے۔قریہ ہذا تقریباً ایک مربع کلومیٹر رقبے پر مشتمل ہے۔جن میں کل ۳۹۳ گھر جن میں ۱۶ مساجد ہیں۔اور گاؤں کے وسط میں ایک بڑی پکی مسجد جس کی لمبائی ۹۱ فٹ اور چوڑائی ۴۵ فٹ ہے تعمیر کی گئی ہے۔اوران میں بالغ مرد کی تعداد ۱۴۵۴، بالغ عورتیں ۱۳۷۷،اورنابالغ بچوں کی تعداد ۲۲۸۵ ہے۔کہیں کہیں گھروں میں اتصال اورگلیاں موجود ہیں۔لیکن اکثر جگہوں پرگلیاں اور کوچے نہیں باغات اورزرعی زیرکاشت رقبہ گھروں کے درمیان فاصل بن رہی ہے۔دوتین گھروں کے علاوہ تمام مکانات کچی مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔پندرہ سے بیس گھروں کے مکانوں کی چھت سٹیل کی چادراور باقی مکانوں کی چھت جڑی بوٹیوں کی بنی ہوئی ہے۔اراضی کے سیرابی باغات کیلئے ایک قدرتی چشمہ بہتا ہے۔جس کے پانی کے لئے نالیاں بستی کے وسط تک پکی بنائی گئی ہیں۔اوراس کے علاوہ دو سو سے زائد ٹیوب ویل سیرابی باغات کیلئے مصروف عمل ہیں۔بستی میں تین دینی مدارس ہیں جن میں مقامی اور باہر کے طلبہ زیرتعلیم ہیں۔ لڑکوں کی عصری تعلیم کیلئے ایک ہائی اسکول اور پانچ پرائمری اسکول ہیں۔جبکہ لڑکیوں کیلئے ایک ہائی اسکول اورتین پرائمری گرلز اسکول ہیں۔اورعوام کی سہولت کیلئے ایک ہزارلائن کا ڈیجیٹل سسٹم ایکسچینج ہےجس سے تین سو کے قریب ٹیلیفون کنکشن لگے ہوئے ہیں۔صحت کیلئے ایک ڈسپنسری بنائی گئی ہے۔جس میں ایک مستندایم بی بی ایس ڈاکٹرایک LHVاورڈسپنسرکام پرمامور ہیں۔یہاں ڈاکٹر کی رہائش کا انتظام نہیں اس لئے وہ ۲۵ کلومیٹرمسلم باغ سے آتا جاتا ہے۔اورایمبولینس بھی ساتھ رکھتا ہےلیکن ادویات کےفقدان کی وجہ سے کم لوگ اس سے استفادہ کررہے ہیں۔بستی کے باشندوں کی ضروریات کیلئے آب نوشی سکیم کے تحت تین ٹیوب ویل حکومت کی طرف سے لگے ہوئے ہیں جوکہ اب معطل ہیں۔بستی کے وسط میں پانچ سے زائد میڈیکل اسٹور ہیں جن میں ڈسپنسرلوگوں کے معمولی علاج معالجے کیلئے کوشش کرتے ہیں۔اورادویات فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔پانچ دوکانیں گوشت کی اورتقریباًدس سے زائد سبزی فروش موجود ہیں ایک کشیدہ کاری اور پانچ درزی ٹیلرز دس پرچون اسٹورز ہیں جبکہ پانچ سے زائد گیس سلنڈر میں لاکرفروخت کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔کل تقریباً ۴۵ سے زائد دکان جن میں اتصال نہیں علاوہ ازیں بستی میں متفرق جگہوں پرعوام کی ضروریات کیلئے ۱۵ دکانیں اورایک میڈیکل اسٹوران میں تین آٹافروش کی دکان موجود ہے۔جن میں دوسابق راشن ڈیلررہ چکے ہیں۔لیکن مکمل ضروریات پوراکرنے کیلئے

وہ اور بازاروں کا رخ کرتے ہیں۔ نیز آہنگر، دوحمام، موٹر سائیکل مرمت، ویلڈنگ، گاڑی مرمت کی دکانیں بھی موجود ہیں۔ اور کپڑے کی دو دکانیں بھی موجود ہیں۔ اور پٹرول، ڈیزل کے تقریباً پانچ پمپ موجود ہیں۔ اور اس کے ساتھ ایک بیکری اور دو چائے کے ہوٹل مستقل موجود ہیں۔ اور تین پی سی او موجود ہیں۔ جنوباً آدھ کلومیٹر کے فاصلے پر قومی شاہراہ گزرتی ہے۔ جس پر موسم گرما میں عوام کی ضروریات کیلئے عارضی طور پر کریٹ گودام اور فروٹ کی ترسیلی کمپنیاں کھل جاتی ہیں۔ اور ان کے ساتھ ساتھ چند ہوٹل اور تندور بھی کھل جاتے ہیں۔ اور یہ چھ مہینے تک تقریباً کھلے رہتے ہیں۔ بستی سے ضرورت آمدورفت قومی شاہراہ سے بستی کی طرف مختلف فاصلوں پر کچی اور پکی سڑکیں جاتی ہیں۔ جن میں دو مستقل اور تین سیلاب نہ ہونے کی صورت میں سیلابی ندیاں بطور سڑک استعمال کی جاتی ہیں۔ نیشنل ہائی وے پر گاؤں کے زرعی آبادی کے متصل ایک لیویز تھانہ جو مذکورہ گاؤں کے نام سے موسوم ہے (اور پولیس تھانہ نہیں ہے) جو روڈ کی حفاظت کے ساتھ ساتھ لڑائی جھگڑے کی صورت میں گاؤں میں مداخلت کرتے ہیں۔ اور روڈ کے حفاظت کیلئے ایک اور لیویز چوکی موجود ہے اور یہ حکومت کو مطلع کرتی ہیں اور مذکورہ بستی سے روزانہ ایک بس اور دو ویگن کوئٹہ جاتی ہیں اور متعدد کار اور موٹر قریبی بازاروں میں جاتے ہیں۔ البتہ حکومت کی طرف سے عوام کے درمیان کوئی انصاف دار شخصیت نہیں اور اسی گاؤں کے علماء اور ملک و سردار یہ معاملے حل کرتے ہیں۔ یا پچیس کلومیٹر دور بازار جاتے ہیں۔ اور مذکورہ بستی میں ڈاکخانہ نہیں۔ دھوبی نہیں بزاز نہیں اور کسی نام سے موسوم گلی کوچے نہیں البتہ عرف میں کان مہترزئی ایک بڑے گاؤں کے نام سے مشہور ہے۔ اور آس پاس کے لوگ بھی ضروریات کیلئے رجوع کرتے ہیں۔ لیکن حکومت کی طرف سے اس کو شہر یا قصبہ نہیں کہا جاتا اور بعض پیشے والے لوگ جیسے موچی، لوہار، ترکھان وغیرہ سال بھر کا گزارہ اپنے پیشے پر نہیں کر سکتے اس لئے وہ اور طرح کی محنت میں بھی مشغول ہوتے ہیں۔ اور صنعت وحرفت کیلئے بھی کام شروع ہے۔ اور مسافر خانہ نہیں، مستقل ہوٹل کھانے کا نہیں، پولیس تھانہ نہیں۔ لہٰذا مذکورہ تفصیل کے مطابق بستی مذکورہ کان مہترزئی میں نمازِ جمعہ جائز ہے یا نہیں؟ اور مذکورہ بستی کا شمار شرعی قریہ کبریٰ ہے یا صغریٰ؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... جمعہ قائم کرنے کی شرائط میں سے شہر یا بڑی بستی (جس میں گلیاں، عدالت، حکومت کی طرف سے قاضی، مستقل پولیس تھانہ، بازار، محلے، ڈاکخانہ، حکیم یا ڈاکٹر، اور لوگوں کی تمام ضروریات زندگی سہولت کے ساتھ میسر ہوں) کا ہونا ضروری ہے۔ وگرنہ جمعہ قائم کرنا درست نہیں۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں بستی کان مہترزئی کا شمار بڑی بستی میں مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر نہیں ہوسکتا اور وہ یہ ہیں کہ (۱) اکثر جگہوں میں گلیاں نہیں ہیں۔ (۲) عدالت نہیں ہے۔ (۳) حکومت کی طرف سے کوئی قاضی مقرر نہیں ہے۔ (۴) مستقل پولیس تھانہ نہیں ہے۔ (۵) بازار، محلے، ڈاکخانہ، اور حکیم یا ڈاکٹر اس طور پر نہیں ہیں کہ ان سے لوگوں کی ضروریات سہولت کے ساتھ پوری ہو جائیں نیز ادویات کی فراہمی اور ایمرجنسی سہولیات بھی میسر نہیں ہیں۔ اور یہ ساری وجوہات ضرورت اصلیہ میں شامل ہیں۔ اسی بناء پر یہاں جمعہ قائم کرنا درست نہیں۔

لما في مصنف عبدالرزاق (۱۶۷/۳): عن علي رضی اللہ تعالیٰ عنه قال: لا جمعة ولا تشريق الا في مصر جامع.

وفی الفتاویٰ التاتارخانیة(۲/۴۹): ظاهر المذهب ان المصر الجامع ان یکون فیه جماعات الناس وجامع واسواق التجارات وسلطان وقاض یقیم الحدود وینفذ الاحکام..... وروی عن ابی حنیفة رحمه الله تعالیٰ وهو بلدة کبیرة فیها سکک واسواق ولهارساتیق وفیها وال یقدر علی انصاف المظلوم من الظالم بحشمته وعلمه او علم غیره ویرجع الناس الیه فیما وقع لهم من الحوادث وهذا هو الاصح.

وفی الشامیة (۲/۱۳۷): "قوله وظاهر المذهب" قال فی شرح المنیة والحد الصحیح ما اختاره صاحب الهدایة انه الذی له امیر وقاض ینفذ الاحکام ویقیم الحدود .... عن ابی حنیفة رحمه الله تعالیٰ انه بلدة کبیرة فیها سکک واسواق ولها رساتیق وفیها وال یقدر علی انصاف المظلوم من الظالم بحشمته وعلمه او علم غیره یرجع الناس الیه فیما یقع من الحوادث وهذا هو الاصح.

وفیه ایضاً(۲/۱۳۸): قوله وفی القهستانی الخ تأیید للمتن وعبارة القهستانی تقع فرضا فی القصبات والقری الکبیرة التی فیها اسواق قال ابو القاسم: هذا بلا خلاف اذا اذن الوالی او القاضی ببناء المسجد الجامع واداء الجمعة لان هذا مجتهد فیه فاذا اتصل به الحکم صار مجمعا علیه وفیما ذکرنا اشارة الی انه لا تجوز فی الصغیرة التی لیس فیها قاض ومنبر وخطیب کمافی المضمرات والظاهر انه ارید به الکراهة ..... الا تری ان فی الجواهر لو صلوا فی القری لزمهم اداء الظهر وهذا اذا لم یتصل به حکم. وفی (صـ۱۳۹) فقد نص الائمة علی ان الفناء ما اعد لدفن الموتی وحوائج المصر کرکض فیه نظر والدواب وجمع العساکر والخروج للرمی وغیر ذلک وای موضع یحد بمسافة یسع عساکر مصر ویصلح میدانا للخیل والفرسان ورمی النبل و البندق البارود واختیار المدافع.....فظهران التحدیدبحسب الامصار.....وقد جزم فیها بصحة الجمعة فی مسجدسبیل علان الذی بناه بعض امراء زمانه وهو فی فناء مصربینه وبینها نحو ثلاثة اربا ع فرسخ وشئ.

وفی الموسوعة الفقهیة(۳۳/۱۶۱): المصر فی اللغة: اسم لکل بلد محصور ای محدود تقام فیها الدور والاسواق والمدارس وغیرها من المرافق العامة ویقسم فیها الفئ والصدقات. واختلفوا فی معناها الاصطلاحی، فعن ابی حنیفة رحمه الله تعالیٰ: ان المصر بلدة کبیرة فیها سکک واسواق ولها رساتیق وفیها وال یقدر علی انصاف المظلوم من الظالم بحشمه وعلمه او علم غیره والناس یرجعون فی الحوادث الیه..... وقال القلیوبی: المصر العمارة المجتمعة الذی فیه حاکم شرعی

وشرطي واسواق للمعاملات والمصر اعظم من القرية.

(۳۴۹) جس عذر کی وجہ سے نمازِ جمعہ ترک کرنا جائز نہیں

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر بجلی وغیرہ کے بل کی آخری تاریخ آجائے اور دن جمعہ کا ہو، اور بل بھرنے کی قطار بھی کافی طویل ہو، اور جمعہ کی نماز پڑھنے جانے کی صورت میں نمبر نکل جانے اور پھر کافی مشقت کا سامنا کرنے کا اندیشہ ہو تو اس عذر کی بنا پر جمعہ کی نماز چھوڑنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... نماز جمعہ ہر اس مسلمان مرد پر فرض ہے جس میں چند شرائط موجود ہوں، آزاد ہونا مقیم ہونا، تندرست ہونا، خوف کا نہ ہونا۔ اس لئے صورت مسئولہ میں نمازِ جمعہ مذکورہ عذر کی وجہ سے چھوڑنا جائز نہیں۔

لمافی الطحطاوی علی الدر (۱/۳۴۵): (قوله فلا يكره) أی صلوة الظهر واما تفويت الجمعة فحرام، بحر:

وفی رد المحتار (۲/۱۵۵): (قوله وحرم الخ) عدل عن قول القدوری والكنز وكره لقول ابن الهمام لابد من كون المراد حرم لانه ترك الفرض القطعي باتفاقهم الذی هو آكد من الظهر غير أن الظهر تقع صحيحة وان كان مأمورا بالإعراض عنها. وأجاب فی البحر بان الحرام هو ترك السعی المفوت لها...... (قوله فلا يكره) بل هو فرض عليه لفوات الجمعة قال فی البحر فنفس الصلوة غير مكروهة وتفويت الجمعة حرام و هو مؤيد لما قلنا، يعنی ان الكراهة ليست لذات الصلوة بل لخارج عنها وهو كونها سببا، لتفويت الجمعة بدليل انه لو صلاها بعد فوت الجمعة لم يكره فعلها بعدها بل يجب.

(۳۵۰) عذر کی وجہ سے ایک مسجد میں دو مرتبہ نمازِ جمعہ قائم کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ایک عزیز جو امریکہ میں ہیں ان سے بات ہوتی رہتی ہے۔ انہوں نے میری وساطت سے ایک مسئلہ آپ حضرات سے معلوم کرایا ہے کہ امریکہ، کینیڈا اور دیگر ممالک میں مسجدیں جہاں بہت کم ہیں یا چھوٹی ہیں تو عام طور ان مسجدوں میں نماز دوبار ہوتی ہے جو لگ بھگ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے وقفے سے ہوتی ہے ایک مسجد میں دوبارہ نماز جمعہ وخطبہ کے بارے میں شرعاً کیا حکم ہے؟ براہ کرم مسئلہ کا جواب بحوالہ جلد مرحمت فرما کر ممنون ہوں، تا کہ جو لوگ اعتراض کرتے ہیں یا غلط کرتے ہیں وہ صحیح مسئلہ سے واقف ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... جمہور حضرات فقہاء کے نزدیک مسجد کے اندر ایک نماز خواہ وہ جمعہ کی ہو یا کوئی اور اس کی جماعت ثانیہ مکروہ ہے۔ البتہ اگر کوئی مسجد جو کسی راستے وغیرہ پر واقع ہو یا وہ مسجد ایسی ہو، جس میں امام اور مؤذن مقرر نہ ہوں تو ایسی مساجد میں تکرار جماعت جائز

ہے۔

ہاں اگر کوئی ایسا علاقہ ہے جہاں مساجد بہت کم ہیں یا بہت چھوٹی ہیں ان میں ایک ہی مرتبہ جماعت کرنا ممکن نہ ہو، تو ایسی صورت میں حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول پر عمل کرنے کی گنجائش ہوسکتی ہے۔ وہ اس طرح کہ دوسری جماعت کی صورت پہلی جماعت سے کچھ مختلف ہو۔ اس کی صورت یہ ہوگی پہلی جماعت جہاں ہوئی ہے دوسری جماعت اس سے ذراہٹ کرادا کی جائے۔

لمافی البدائع الصنائع(۱/۱۵۳):ولو صلى في مسجد باذان واقامة هل يكره أن يؤذن ويقام فيه ثانياً هذا لا يخلو من احد وجهين، اما ان كان مسجداً له اهل معلوم او لم يكن فان كان له أهل معلوم فان صلّى فيه غير أهله باذان واقامة لا يكره لاهله ان يعيد والاذان والاقامة وان صلى فيه أهله باذان واقامة أو بعض اهله يكره لغير أهله وللباقين من اهله ان يعيد والاذان والاقامة. وان كان مسجداً ليس له اهله معلوم بان كان على شوارع الطريق لا يكره تكرار الاذان واقامة.

ولنا ماروى عبدالرحمن ابن ابى بكرة رضى الله تعالىٰ عنه عن ابيه ان رسول الله ﷺ خرج من بيته ليصلح بين الانصار لتشاجر بينهم فرجع وقد صلى فى المسجد بجماعة فدخل رسول الله ﷺ فى منزل بعض أهله فجمع أهله فصلى بهم جماعة ولو لم يكره تكرار الجماعة فى المسجد لماتركها رسول الله ﷺ مع علمه لفضل الجماعة فى المسجد.

وروى انس بن مالك رضى الله تعالىٰ عنه ان اصحاب رسول الله ﷺ كانوا اذا فاتتهم الجماعة صلوا فى المسجد فرادى ولان التكرار يؤدى الى تقليل الجماعة لان الناس اذا علموا انهم تفوتهم الجماعة فيستعجلون فتكثر الجماعة واذا علموا أنها لاتفوتهم يتأخرون فتقل الجماعة وتقليل الجماعة مكروه الخ.

وفى الشامية(۱/۳۹۵): (وتكرار الجماعة) لما روى عبدالرحمن بن ابى بكرة عن ابيه رضى الله تعالىٰ عنهما "أن رسول الله ﷺ خرج من بيته ليصلح بين الانصار فرجع وقد صلى فى المسجد بجماعة فدخل رسول الله ﷺ فى منزل بعض أهله فجمع أهله فصلى بهم جماعة، ولو لم يكره تكرار الجماعة فى المسجد لصلى فيه وروى عن أنس رضى الله عنه ان اصحاب رسول الله ﷺ كانوا اذا فاتتهم الجماعة فى المسجد صلوا فى المسجد فرادى، ولان التكرار يؤدى إلى تقليل الجماعة لان الناس اذا علموا أنهم تفوتهم الجماعة يتعجلون فتكثر والا تأخروا. وحينئذ فلو دخل جماعة المسجد بعد ماصلى فيه أهله فانهم يصلون واحداناً وهو ظاهر الرواية الخ وعن ابى يوسف رحمه الله تعالىٰ اذا لم تكن على الهيئة الاولىٰ لاتكره والاتكره وهو الصحيح وبالعدول عن

المحراب تختلف الهيئة كذا فى البزازية اهـ وفى التاتارخانية عن الولوالجية، وبه ناخذ فقط.

وفيه ايضاً (١/٥٥٢): (قوله ويكره) اى تحريما لقول الكافى لايجوز، والمجمع لايباح، وشرح الجامع الصغير إنه بدعة كما فى رسالة السندى(قوله بأذان وإقامة الخ) عبارته فى الخزائن: أجمع مماهنا ونصبها: يكره تكرار الجماعة فى مسجد محلة بأذان وإقامة، إلا اذا صلى بهما فيه أولا غير أهله او أهله لكن بمخافتة الاذان، ولو كرر أهله بدونهما اوكان مسجد طريق جاز اجماعا، كما فى مسجد ليس له امام ولامؤذن ويصلى الناس فيه فوجا فوجا، فان الافضل ان يصلى كل فريق باذان واقامة على حدة كما فى أمالى قاضيخان اهـ.

(۳۵۱) عیدین میں سجدہ سہو کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عالم صاحب فرمار ہے تھے کہ اگر عیدین کی زائد تکبیرات چھوٹ جائیں تو سجدۂ سہو کرنا لازمی نہیں ہے حالانکہ میں نے سنا ہے کہ تکبیرات واجب ہیں اور واجب کے چھوٹ جانے کی وجہ سے سجدۂ سہو لازم ہوتا ہے تو کیا ان عالم کی بات صحیح ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......تکبیرات عیدین چونکہ واجب ہیں اس لئے ان کے چھوٹ جانے کی صورت میں سجدہ سہو واجب ہوتا ہے لیکن جمعہ وعیدین میں مجمع زیادہ ہونے کی وجہ سے سجدہ سہو کرنے میں انتشار اور فتنہ کا خدشہ ہوتا ہے اس لئے متاخرین فقہاء کرام کے نزدیک سجدہ سہو کرنا لازم نہیں، اور بظاہر عالم صاحب کی مراد بھی یہی معلوم ہوتی ہے تاہم اگر فتنہ اور انتشار کا خدشہ نہ ہو یا مجمع چھوٹا ہو تو اس صورت میں سجدہ سہو کرنا لازم ہوگا۔

لمافى الهندية(١/١٢٨): ويستوى فى الزيادة والنقصان القليل والكثير فقد روى عن الحسن عن ابى حنيفة رحمه الله اذا سها الإمام عن تكبيرة واحدة فى صلاة العيد يسجد للسهو كذا فى الذخيرة السهو فى الجمعة والعيدين والمكتوبة والتطوع واحد إلا أن مشايخنا قالوا لايسجد للسهو فى العيدين والجمعة لئلايقع الناس فى فتنة.

وفى الدر المختار(٢/٩٢): (والسهو فى صلاة العيد والجمعة والمكتوبة والتطوع سواء) والمختار عند المتأخرين عدمه فى الأولیين لدفع الفتنة.

وفى الشامية(٢/٩٢): (قوله عدمه فى الأولیين) الظاهر ان الجمع الكثير فيما سواهما كذلك كما بحثه بعضهم وكذا بحثه الرحمتى وقال خصوصاً فى زماننا وفى جمعة حاشية ابى السعود عن العزمية انه ليس المراد عدم جوازه بل الاولىٰ ترك لئلا يقع الناس فى فتنة (قوله وبه جزم فى الدرر)

لکنه قیده محشیها الوانی بما اذا حضر جمع کثیر وإلا فلا داعی الی الترک.

(۳۵۲) شافعی امام کے پیچھے نماز عید کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نمازِ عید میں حنفی مذہب کے لوگ شافعی مذہب کے امام کے پیچھے نماز پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... حنفی مذہب کے لوگ شافعی مذہب کے امام کے پیچھے نماز عید پڑھ سکتے ہیں بشرطیکہ وہ امام مواضع اختلاف میں حنفی مقتدی کے مذہب کی رعایت کرتا ہو۔

لمافی الهندیة(۱/۸۴): والاقتداء بشافعی المذهب انما یصح اذا کان الامام یتحا می مواضع الخلاف بان یتوضأ من الخارج النجس من غیر السبیلین کالفصد وان لا ینحرف عن القبلة انحرافاً فاحشاً...... قال الفضلی یصح اقتداء الحنفی فی الوتر بمن یری مذهب أبی یوسف ومحمد رحمهما الله تعالیٰ.

وفی الشامیة(۲/۷): (قوله ان لم یتحقق الخ) فلو راه احتجم ثم غاب فالاصح انه یصح الاقتداء به لانه یجوز ان یتوضأ احتیاطا وحسن الظن به اولی بحر عن الزاهدی (قوله کما بسطه فی البحر) حیث ذکر ان الحاصل انه ان علم الاحتیاط منه فی مذهبنا فلا کراهة فی الاقتداء به وان علم عدمه فلا صحة وان لم یعلم شیئاً کره.

(۳۵۳) خواتین کیلئے جمعہ کی نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ خواتین جمعے کے دن مسجد میں آکر جمعہ کی نماز پڑھتی ہیں حالانکہ ان پر ظہر واجب ہے تو انکا جمعہ پڑھنا شرعاً کیسا ہے اور ان کی ظہر اس سے ادا ہو جاتی ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... عورتوں کا نماز جمعہ کے لئے باہر جانا خوف فتنہ کی وجہ سے ناجائز ہے البتہ اگر انہوں نے نماز جمعہ باجماعت ادا کی تو ظہر ان سے ساقط ہو جائیگی۔

وفی خلاصة الفتاویٰ (۱/۲۱۴): ولا یخرج الشاب من النساء فی جمیع الصلوات واما العجوز فتخرج فی العیدین والفجر والعشاء...... وقد ذکرنا الجواب المختار فی زماننا انهن لا یخرجن.

وفی الهندیة (۱/۱۴۴، ۱۴۵): لاتجب الجمعة علی العبید والنسوان والمسافرین والمرض کذا فی محیط السرخسی...... ومن لا جمعة علیه ان أدّاها جاز عن فرض الوقت کذا فی الکنز.

(۳۵۴) عورتوں کیلئے عیدگاہ جانے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں میں چند سالوں سے غیر مقلدین آئے ہوئے ہیں پورے گاؤں کو خراب کر رہے ہیں کافی لوگ ان کے چکر میں پھنس گئے ہیں اس مرتبہ انہوں نے عید نماز کیلئے اپنی عورتوں کو بھی عید نماز پڑھنے کا حکم دیا کہ جس طرح مردوں پر نماز عید واجب ہے اسی طرح عورتوں پر بھی واجب ہے اگر عورتیں نماز عید نہیں پڑھیں گی تو گناہگار ہوں گی کیا واقعی عورتوں پر نمازِ عید واجب ہے؟ اور عورتوں کے نماز عید کیلئے عیدگاہ جانے کا ثبوت کسی روایت سے ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... عید کی نماز مردوں پر واجب ہے عورتوں پر عید کی نماز واجب نہیں۔ رہی یہ بات کہ عورتوں کا عیدگاہ میں جانا، تو اسلام کے ابتدائی دور میں چونکہ امن تھا اور کوئی فتنے کا خوف نہ تھا اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو مساجد اور عیدگاہ میں جانے کی اجازت دی تھی۔ بخاری وترمذی کی روایت ہے کہ حضرت امّ عطیہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ہمیں عیدگاہ جانے کا حکم دیا گیا۔ لیکن جب فتنوں کا دور بڑھا تو عورتوں کو مساجد جانے سے روک دیا گیا اور گھر میں نماز پڑھنے کی تاکید کی گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ عورت کا اپنے گھر میں نماز پڑھنا مسجد میں پڑھنے سے بہتر ہے۔ حضرت عمرؓ نے جب عورتوں کو مساجد جانے سے روکا تو عورتوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے شکایت کی تو حضرت عائشہ نے فرمایا اگر حضور علیہ الصلاۃ والسلام یہ جان لیتے جو عمر کو معلوم ہے تو وہ تمہیں نکلنے کی اجازت نہیں دیتے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اگر ان حالات کو پالیتے جو آج عورتوں کے ساتھ پیش آرہے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو ضرور مسجد جانے سے منع فرمادیتے۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں نہ عورتوں پر عید کی نماز واجب ہے اور نہ ہی ان کا عیدگاہ جانا درست ہے۔

لمافی اعلاء السنن(۴/ ۲۶۱): عن امّ سلمة رضی الله عنها قالت: قال رسول الله ﷺ: صلاة المرأة فی بیتها خیر من صلاتها فی حجرتها، وصلاتها فی حجرتها خیر من صلاتها فی دارها وصلاتها فی دارها خیر من صلاتها فی مسجد قومها.

وفی المحیط البرهانی(۲/ ۴۸۵): ولیس علی النّساء خروج فی العیدین، وکان یرخّص لهنّ فی ذالک. قال: وقال أبو حنیفة رحمه الله تعالیٰ: وامّا الیوم فانّی أکره لهنّ ذلک، وأکره لهنّ شهود الجمعة الخ.

وفیه ایضاً قال...... واعلم بانّ النساء امرن بالقرار فی البیوت، قال الله تعالیٰ "وقرن فی بیوتکن" ونهین عن الخروج، قال الله تعالیٰ: "ولا تبرجن تبرج الجاهلیة الأولیٰ" الا انه ابیح لهن الخروج فی الابتداء الی الجماعات، لقوله علیه السلام "لاتمنعوا إماء الله مساجد الله ولتخرجن اذا خرجن تفلات" أی غیر متطیبّات، ثم منعن بعد ذلک لمافی خروجهن من الفتنة: قال الله تعالیٰ "ولقد علمنا

المستقدمين منكم ولقد علمنا المستأخرين" قيل في تفسير الآية: نزلت في شان النسوة كان المنافقون يتأخرون حتى يطلعوا على عورات النساء، فمنعن بعد ذالک. وقال النبی عليه الصلاة والسلام "صلاة المرأة في دارها أفضل من صلاتها في مسجد وصلاتها في بيتها افضل من صلاتها في دارها)) وعن عمر رضي الله عنه انه نهى النساء عن الخروج إلى المساجد فشكون إلى عائشة رضي الله عنها، فقالت عائشة رضي الله تعالیٰ عنها: ((لو علم النبی عليه الصلاة والسلام ما علمه عمر ما أذن لكنّ في الخروج.

وفي الدر المختار (١/٥٦٦): (ويكره حضورهن الجماعة) ولو لجمعة وعيد ووعظ (مطلقا) ولو عجوز اليلا (على المذهب) المفتی به لفساد الزمان.

وفي الشامي - (قوله على المذهب المفتیٰ به) أي مذهب المتأخرين. قال في البحر: وقد يقال هذه الفتویٰ التي اعتمدها المتأخرون مخالفة لمذهب الامام وصاحبيه، فانهم نقلوا أن الشّابة تمنع مطلقاً اتفاقاً.

(۳۵۵) تکبیراتِ تشریق مرد اور عورت دونوں پر واجب ہیں

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے حج کے مسائل کی ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ تکبیرات تشریق مرد وعورتوں دونوں کو پڑھنا چاہئے۔ اپنے امام صاحب سے جب میں نے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے ارشاد فرمایا کہ دراصل اس میں ائمہ کرام کا اختلاف ہے بعض کے نزدیک صرف مردوں پر ہی ہے۔ البتہ آپ کسی مفتی صاحب سے اس اختلاف کو سمجھ لیں اور فتویٰ کس کے قول پر ہے یہ بھی معلوم کرلیں۔ آنجناب سے پہلے بھی کئی مسائل کے سلسلے میں رجوع کر چکا ہوں، مہربانی فرما کر اس مسئلے کو بھی واضح اور تفصیل سے لکھ کر دیدیں، نیز فتویٰ کس کے قول پر ہے یہ بھی بتادیں بندہ آپ کا بہت ممنون ہوگا۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... تکبیراتِ تشریق کس پر واجب ہے؟ اس میں امام اعظم رحمہ اللہ اور صاحبین رحمہما اللہ کا اختلاف ہے۔ امام صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک یوم عرفہ (نویں ذی الحجہ) کی صبح سے عید (دسویں ذی الحجہ) کے عصر تک ایک دفعہ تکبیر تشریق کہنا ہر مرد، عاقل، مقیم، آزاد اور شہر میں رہنے والے پر جبکہ اس نے نماز، جماعت کے ساتھ پڑھی ہو، پر واجب ہے۔ تو اس قول کے مطابق عورت، بچے، مجنون، مسافر اور دیہات میں رہنے والے پر اور اس شخص پر جس نے نفل نماز یا فرض نماز اکیلے پڑھی ہو، تکبیر تشریق پڑھنا واجب نہیں ہے۔ اور صاحبین (امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ) کے نزدیک ۹/ ذی الحجہ کی صبح سے ۱۳/ ذی الحجہ کی عصر تک ہر فرض نماز پڑھنے والے پر چاہے جو بھی ہو اور جس جگہ بھی نماز پڑھی ہو، ایک دفعہ تکبیر تشریق پڑھنا واجب ہے۔ تو اس قول کے مطابق مرد اور عورت دونوں پر تکبیر تشریق کہنا واجب ہے۔ اور فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے۔

لمافی الدرالمختار(۲/۱۷۹): ووجوبه (علی امام مقیم) بمصر (و) علی مقتد (مسافر او قروی او امرأة) بالتبعية لكن المرأة تخافت ويجب على مقيم اقتدى بمسافر (وقالا بوجوبه فوركل فرض مطلقا) ولو منفردا او مسافرا او امرأة لانه تبع للمكتوبة (الى) عصر اليوم الخامس (آخر ايام التشريق وعليه الاعتماد) والعمل والفتوى فى عامة الامصار وكافة الاعصار. الدر المختار وقال ابن عابدين الشامی رحمه الله تحته (قوله تخافت) لان صوتها عورة كمافى الكافى والتبيين...... (قوله فوركل فرض) بان ياتى به بلا فصل يمنع البناء كمامر ط (قوله لانه تبع للمكتوبة) فيجب على كل من تجب عليه الصلوة المكتوبة بحر (قوله وعليه الاعتماد الخ) هذا بناء على انه اذا اختلف الامام وصاحباه فالعبرة لقوة الدليل وهو الاصح كمافى اخر الحاوى القدسى اوعلى ان قولهما فى كل مسألة مروى عنه ايضا والافكيف يفتى بقول غير صاحب المذهب. وبه اندفع مافى الفتح من ترجيح قوله هنا ورد فتوى المشائخ بقولهما بحر.

وفى الفقه الاسلامى وادلته(۲/۱۴۰۸): فقال الحنفية: يجب على الرجال والنساء تكبير التشريق فى الاصح مرة، وان زاد عليها يكون فضلا، عقب كل فرض عينى بلا فصل يمنع البناء على الصلاة (كالخروج من المسجد او الكلام او الحدث عامدا) ويؤدى بجماعة او منفردا، ولو قضاء، ويكون التكبير للرجال جهرا، وتخافت المرأة بالتكبير، ولا يكبر عقب الوتر وصلاة العيد.

ومدته: من فجر يوم عرفة الى عصر يوم العيد عند ابى حنيفة، والى صلاة العصر من اخر ايام التشريق عند الصاحبين، وبقولهما يفتى، فهى ثلاث وعشرون صلاة.

﴿باب فی تقدیر الاوزان الشرعیة بالمساحة الجدیدة﴾

(شرعی اوزان کی مقدار کا ازسرنو تحقیق کے ساتھ بیان)

(۳۵۶) الاصبع کی تحقیق

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری فقہ کی کتب میں پیمائش کے پیمانوں میں سے ایک الاصبع ذکر کیا ہوا ہے آجکل چونکہ جدید پیمانے آچکے ہیں ان قدیم کو کوئی بھی نہیں جانتا حالانکہ اصل مدار ان جدید پیمانوں کا قدیم پیمانوں ہی کے اوپر ہے تو الاصبع کس پیمانے کا نام ہے اور اس میں کتنے سینٹی میٹر وغیرہ آئیں گے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......ایک ذراع میں چھ قبضہ ہوتا ہے اور ایک قبضہ چار اصبع (انگشت) کا ہوتا ہے۔اور چار اصبع ۳ انچ کے برابر ہوتے ہیں۔اور ۳ انچ ۷٫۶۲ سینٹی میٹر کے برابر ہوتا ہے ایک انچ ۲٫۵۴ سینٹی میٹر کے برابر ہوتا ہے۔لہٰذا ایک اصبع (انگشت)، ۰٫۷۵ انچ یا ۱٫۹۰۵ سینٹی میٹر کے برابر ہے۔اور ایک سینٹی میٹر میں ۱۰ ملی میٹر ہوتے ہیں تو اس اعتبار سے ایک اصبع (انگشت) تقریباً ۱۹٫۰۵ ملی میٹر ہے۔

لمافی منحة الخالق علی هامش البحر الرائق(۱/۲۴۳): قال صاحبنا ابو العباس احمد شهاب الدین ابن الهائم رحمه الله وإلیه یرجع فی هذا الباب البرید اربعة فراسخ والفرسخ ثلثة امیال والمیل الف باع والباع أربعة أذرع والذراع أربعة وعشرون إصبعا والاصبع ست شعیرات مرصوصة بالعرض والشعیر ست شعرات بشعر البرذون.

وفی الفتاویٰ الهندیة (۱/۱۸):والمعتبر ذراع الکرباس کذا فی الظهیریة وعلیه الفتوی کذا فی الهدایة. وهو ذراع العامة ست قبضات اربع وعشرون إصبعا کذا فی التبیین.

وفی الشامیة(۱/۱۹۶): قال فی البحر: وفی الخانیة وغیرها ذراع المساحة وهو سبع قبضات فوق کل قبضة اصبع قائمة (الی قوله) وفی البحر أن فی کثیر من الکتب انه ست قبضات لیس فوق کل قبضة اصبع قائمة فهو اربع وعشرون اصبعا بعدد حروف "لا اله الا الله محمد رسول الله" والمراد بالاصبع القائمة ارتفاع الابهام کمافی غایة البیان والمراد بالقبضة اربع أصابع مضمومة.

(۳۵۷) الشبر کی تحقیق

سوال……کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ لمبائی کے پیمانوں کے اندر ایک الشبر نامی پیمانہ ہے تو یہ پیمانہ جدید پیمانوں کے لحاظ سے کتنا ہوگا اس میں کتنے سینٹی میٹر وغیرہ آئیں گے؟

الجواب حامداً ومصلیاً……ایک ذراع ۱۸/۲اِنچ کا ہوتا ہے اور دو ''۲'' شبر ایک ذراع ہوتا ہے لہٰذا ایک شبر ''۹'' انچ کا ہوا، اور ایک انچ ڈھائی سینٹی میٹر کا ہوتا ہے لہٰذا ایک شبر تقریباً ۲۳ سینٹی میٹر ہوا، اور ایک سینٹی میٹر دس ملی میٹر ہوتا ہے لہٰذا ایک شبر ۲۳۰ ملی میٹر ہوا۔

لمافی منحة الخالق علی هامش البحر الرائق(۱/۲۴۳،۲۴۵): والمیل ألف باع، والباع اربعة اذرع، والذراع أربعة وعشرون أصبعاً، والاصبع ست شعیرات مرصوصة بالعرض، والشعیر ست شعرات بشعر البرزون…… (الی قوله) ……قلت یمکن ان یقال لا خلاف لحمل کلام ابن شجاع علی ان مراده بالذراع ما فیه اصبع قائمة عند کل قبضة فیبلغ ذراعاً ونصفاً بذراع العامة.

وفی الشامیة(۱/۱۹۶): (قوله وهو سبع قبضات فقط) ای بلااصبع قائمة، وهذا مافی الولوالجیة، وفی البحران فی کثیر من الکتب انه ست قبضات لیس فوق کل قبضة أصبع قائمة، فهو اربع وعشرون أصبعاً بعدد حروف (لا اله الا الله محمد رسول الله) والمراد بالاصبع القائمة ارتفاع الابهام کمافی (غایة البیان) اهـ والمراد بالقبضة أربع أصابع مضمومة نوح، أقول وهو قریب من ذراع الید، لانه ست قبضات وشئی، وذالک شبران.

(۳۵۸) فرسخ کی تحقیق

سوال……کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ ایک فرسخ تین میل کا ہوتا ہے اگر کوئی سولہ فرسخ سفر پر جانے کا ارادہ کریگا تو وہ قصر کرے گا مسئلہ یہ ہے آجکل میل اور فرسخ نہیں بلکہ کلومیٹر اور میٹر ہیں۔ تو معلوم یہ کرنا ہے کہ ایک فرسخ میں کتنے کلومیٹر اور کتنے میٹر ہوں گے؟

الجواب حامداً ومصلیاً……ایک فرسخ=۳ شرعی میل، ایک میل=۴۰۰۰ ذراع

ایک ذراع ڈیڑھ(۱٫۵)فٹ=۱۸ انچ، ۱۸x۴۰۰۰=۷۲۰۰۰ انچ

ایک میٹر=۳۹ انچ، ۷۲۰۰۰÷۳۹=۱۸۴۶٫۱۵۳۸ شرعی میل میں میٹر ۱۸۴۶٫۱۵۳۸÷۱۰۰۰=۱٫۸۴۶۱۵۳۸ = شرعی میل میں کلومیٹر

ایک فرسخ میں کلومیٹر= ۱٫۸۴۶۱۵۳۸x۳=۵٫۵۳۸۴۶۱۴کلومیٹر

لہٰذا اس حساب سے معلوم ہوا کہ ایک فرسخ میں ۵٫۵۳۸۴۶۱۴ کلومیٹر ہوتے ہیں اور ۵۵۳۸٫۴۶۱۴ میٹر ہوتے ہیں۔

ایک فرسخ میں انگریزی میل

ایک انگریزی میل میں فٹ = ۱۷۶۰×۳=۵۲۸۰ فٹ

ایک انگریزی میل میں انچ = ۵۲۸۰×۱۲=۶۳۳۶۰ انچ

ایک انگریزی میل میں میٹر = ۶۳۳۶۰÷۳۹= ۱۶۲۴٫۶۱۵۴ میٹر

ایک انگریزی میل میں کلومیٹر = ۱۶۲۴٫۶۱۵۴÷۱۰۰۰= ۱٫۶۲۴۶۱۵۴ کلومیٹر

ایک فرسخ میں انگریزی کلومیٹر = ۱٫۶۲۴۶۱۵۴×۳=۴٫۸۷۳۸۴۶۲ کلومیٹر

لہٰذا اس حساب سے معلوم ہوا کہ ایک انگریزی میل کے ایک فرسخ میں ۴٫۸۷۳۸۴۶۲ کلومیٹر ہوتے ہیں اور ۴۸۷۳٫۸۴۶۲ میٹر ہوتے ہیں۔البتہ آجکل مفتی بہ قول کے مطابق ۴۸ میل انگریزی ۷۷٫۹۸۱۵۳۹ کلومیٹر مقدار سفر شرعی بنتی ہے لہٰذا جو شخص ۴۸ میل انگریزی کی مسافت کے بقدر سفر کرے تو وہ شخص قصر کرے گا۔

لمافی البحر الرائق(۱/۲۴۳): کذا فی الصحاح والمغرب والمراد ھنا ثلث الفرسخ والفرسخ اثنا عشر ألف خطوۃ، کل خطوۃ ذراع ونصف بزراع العامۃ وھو اربع وعشرون اصبعاً.

وفی منحۃ الخالق علی ھامش البحر(۱/۲۴۳): والفراسخ ثلثۃ امیال والمیل الف باع والباع اربعۃ اذرع والذراع اربعۃ وعشرون اصبعاً والاصبع ست شعیرات مرصوصۃ بالعرض والشعیر ست شعرات بشعر البرزون.

(۳۵۹) میل کی تحقیق

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فقہ کی کتب میں موجود ہے کہ اگر کوئی شخص اڑتالیس میل سفر پر جانے کا ارادہ کرے تو وہ نماز قصر کرے گا آجکل تو میل نہیں کلومیٹر اور میٹر ہیں تو یہ وضاحت فرمادیں کہ ایک میل میں کتنے میٹر اور کلومیٹر ہوں گے اور اڑتالیس میل کے کتنے کلومیٹر اور کتنے میٹر ہوں گے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......سفر شرعی کی مسافت کی تعیین میں صحابہ وتابعین اور ائمہ مجتہدین کے مذاہب مختلف ہیں۔جن کی تفصیل عمدۃ القاری شرح بخاری وغیرہ میں مذکور ہے۔امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی بھی اس بارے میں روایات مختلف ہیں مگر راجح اور صحیح مذہب امام اعظم کا یہ ہے کہ کسی خاص مقدار کی تحدید میلوں وغیرہ سے نہ کی جاوے بلکہ تین دن تین رات میں جس قدر مسافت انسان پیدل چل کر بآسانی طے کر سکے یا اونٹ کی سواری پر بآسانی طے کرے وہ مقدار مسافت سفر شرعی ہے۔فتح القدیر، عمدۃ القاری، البحر الرائق، درمختار اور شامی وغیرہ سب کا اسی پر اتفاق ہے۔

اس کے برخلاف بعض فقہاء نے فراسخ یا میلوں کی تعیین بھی فرمائی ہے۔حضرت امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ ۴۸ میل سے کم میں قصر نہ کرے۔اور یہی امام احمد رحمہ اللہ کا مذہب ہے،اور امام شافعی رحمہ اللہ سے بھی ایک روایت یہی ہے،جبکہ مشائخ حنفیہ میں سے بعض نے اکیس فرسخ جس کے تریسٹھ میل شرعی بنتے ہیں،بعض نے اٹھارہ فرسخ جس کے چون میل بنتے ہیں اور بعض نے پندرہ فرسخ جس کے پینتالیس میل بنتے ہیں مسافت قصر قرار دی ہے،شامی اور بحر نے بحوالہ مجتبیٰ اکثر ائمہ خوارزم کا فتویٰ پندرہ فرسخ کی روایت پر ذکر کیا ہے، اس لئے محققین علماء ہند نے (۴۸) اڑتالیس میل انگریزی کو مسافت قصر قرار دیا ہے اور فقہائے حنفیہ کے اقوال میں سے جو قول ائمہ خوارزم کا پندرہ فرسخ کا نقل کیا گیا ہے وہ تقریباً اس کے برابر ہے،کیونکہ پندرہ فرسخ کے پینتالیس میل شرعی بنتے ہیں،اور شرعی میل انگریزی میل سے دوسو چالیس گز بڑا ہوتا ہے،اس وجہ سے پینتالیس میل شرعی اڑتالیس میل انگریزی سے کچھ زیادہ متفاوت نہیں،بہ نسبت دیگر اقوال کے کہ ان میں اور پینتالیس میل شرعی میں فرق بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔

پینتالیس میل شرعی کے اعتبار سے مسافت قصر کی تفصیل یہ ہے کہ شرعی میل دو ہزار گز انگریزی کا ہوتا ہے اور انگریزی میل سترہ سو ساٹھ گز کا تو گویا کہ شرعی میل انگریزی میل سے دوسو چالیس گز بڑا ہوتا ہے،اس فرق کی وجہ سے اصل مسافت قصر جو کہ پینتالیس میل ہے اور مقرر کردہ مسافت جو کہ اڑتالیس میل ہے،میں فرق کا ہونا ظاہر ہے کہ پینتالیس میل شرعی کے.....۵۱٫۱۳۶۳۶۴ میل انگریزی بنتے ہیں یعنی اصل مسافت جو شرعاً پینتالیس میل ہے اور مقرر کردہ مسافت میں تقریباً ۳٫۱۳۶۳۶۴ میل کا فرق آتا ہے۔لیکن اس فرق کے ہوتے ہوئے حالات زمانہ اور چند دیگر ضرورتوں کی بناء پر محققین متاخرین نے اڑتالیس میل انگریزی کو پینتالیس میل شرعی کے قائم مقام قرار دیا ہے۔اور یہی قول مفتی بہ ہے۔پھر جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ سفر شرعی اڑتالیس میل انگریزی کے حساب سے بنتے ہیں۔لہٰذا ہم اس کے میٹر اور کلومیٹر کی تفصیل ذکر کرتے ہیں۔

ایک ذراع شرعی=۱۸ انچ، ایک فٹ= ۱۲ انچ

ذراع انگریزی=۳۶ انچ، ایک میٹر= ۳۹ انچ

ایک کلومیٹر= ۱۰۰۰ میٹر

۱۷۶۰ گز شرعی x۲=۳۵۲۰ گز انگریزی

۳۵۲۰x۱٫۵= ۵۲۸۰ فٹ

۵۲۸۰فٹ x۱۲= ۶۳۳۶۰ انچ

۶۳۳۶۰ ÷ ۳۹= ۱۶۲۴٫۶۱۵۴ میٹر

۱۶۲۴٫۶۱۵۴ ÷ ۱۰۰۰ = ۱٫۶۲۴۶۱۵۴ کلومیٹر

۱٫۶۲۴۶۱۵۴ x ۴۸= ۷۷٫۹۸۱۵۳۹ کلومیٹر

اس تفصیل سے ہمیں معلوم ہوا کہ ایک میل میں ۱۶۲۴٫۶۱۵۴ میٹر اور ۱٫۶۲۴۶۱۵۴ کلومیٹر ہوتے ہیں اور ۴۸ میل میں ۷۷٫۹۸۱۵۳۹

میٹراور۹۸۱۵۳۹ء۷۷ کلومیٹر ہوتے ہیں۔

لمافی البحر الرائق(۱/۲۴۳): المیل فی کلام العرب منتهی مدالبصر، وقیل للاعلام المبنية فی طريق مکة اميال، لانها بنيت علی مقادير منتهی البصر كذا فی الصحاح والمغرب، والمرادهنا ثلث الفرسخ والفرسخ اثنا عشر الف خطوة كل خطوة ذراع ونصف بذراع العامة وهو اربع وعشرون اصبعاً.

وفی الهندية(۱/۲۷): وأقرب الاقوال أن الميل وهو ثلث الفرسخ اربعة آلاف ذراع طول كل ذراع اربع وعشرون اصبعاً، وعرض كل اصبع ست حبات شعير ملصقة ظهر البطن.

وفی الشامية مع الدر (۱/۲۳۳): فی الدر من عجز عن استعمال الماء لبعده ميلاً اربعة آلاف ذراع.

وقال الشامیؒ قوله اربعة آلاف ذراع الخ كذا فی الزيلعی والنهر والجوهرة، وقال فی الحلية انه المشهور كما نقله غير واحد منهم السروجی فی غايته، وفی شرح العينی ومسكين و البحر عن الينابيع انه اربعة آلاف خطوة، قال الرملی والاول هو المعول عليه.

(۳۶۰) برید کی تحقیق

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مصنف عبدالرزاق (۲/۵۲۵) میں ذکر ہے کہ چار برید سفر کرنے سے قصر کے احکام لاگو ہوں گے اور ایک برید چار فرسخ کا ہوتا ہے اب الجھن یہ ہے کہ آجکل نہ برید ہیں نہ فرسخ بلکہ کلومیٹر یا میٹر ہیں، تو اب یہ بتایئے گا کہ ایک برید کتنے کلومیٹر اور کتنے میٹر کا ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... ایک برید میں ۴ فرسخ ہوتے ہیں ایک فرسخ ۳ میل کا ہوتا ہے تو ایک برید میں ۱۲ میل ہوں گے پھر ایک میل میں ۴۰۰۰ ذراع ہوتے ہیں، ایک ذراع میں ۱۸/ انچ ہوتے ہیں، اس لحاظ سے ایک میل میں ۷۲۰۰۰/ انچ ہوں گے اور ایک میٹر میں ۳۹/ انچ ہوتے ہیں اس اعتبار سے ایک میل میں ۱۸۴۶ء۱۵۳۸ میٹر جو ۱ء۸۴۶۱۵۳۸ کلومیٹر کے برابر ہوگا اور جب ایک برید میں ۱۲ میل ہوتے ہیں تو ایک برید ۲۲۱۵۳ء۸۴۶۱۵ میٹر کا اور ۲۲ء۱۵۳۸۴۶۱۵ کلومیٹر کا ہوگا۔

لمافی البخاری (۱/۱۴۷): وسمی النبی ﷺ السفر يوما وليلة وكان ابن عمروابن عباس يقصر ان ويفطر ان فی اربعة برد وهو ستة عشر فرسخاً.

وفی الهندية(۱/۲۷): واقرب الاقوال ان الميل وهو ثلث الفرسخ اربعة الاف ذراع طول كل ذراع اربع وعشرون اصبعا وعرض كل اصبع ست حبات شعير ملصقة ظهر البطن.

وفی منحة الخالق بهامش البحر الرائق(۱/۲۴۳-۲۴۴): البريد اربعة فراسخ والفراسخ ثلثة اميال

والمیل الف باع والباع اربعة اذرع والذراع اربعة وعشرون اصبعا والاصبع ست شعیرات مرصوصة بالعرض والشعیر ست شعرات بشعر البرزون

ان البرید من الفراسخ اربع	**ولفرسخ فثلاث امیال ضعوا**
والمیل الف ای من الباعات قل	**والباع اربع اذرع تتتبع**
ثم الذراع من الاصابع اربع	**فی بعدها العشرون ثم الاصبع**
ست شعیرات فظهر شعیرة	**منها الی بطن لاخری توضع**
ثم الشعیرة ست شعیرات فقل	**من شعر بغل لیس فیها مدفع**

(۳۶۱) مرحلہ کی تحقیق

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری کتابوں میں سفر کے مسائل میں مراحل کا لفظ آتا رہتا ہے تو معلوم یہ کرنا ہے کہ ایک مرحلہ کتنا ہوتا ہے اور آجکل کے لحاظ سے میٹر اور کلومیٹر کے لحاظ سے کتنا ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... مرحلہ کہتے ہیں ایک دن میں طے کردہ فاصلے کو اور عموماً ایک دن میں آدمی درمیانی رفتار میں پانچ فرسخ طے کرسکتا ہے۔ اور ایک فرسخ تین (۳) میل شرعی بنتا ہے۔ اور پانچ فرسخ پندرہ (۱۵) میل شرعی بنتے ہیں۔ تو اس لحاظ سے ایک مرحلہ پندرہ (۱۵) میل شرعی بنتا ہے اور آجکل کے لحاظ سے ایک مرحلہ ۲۷٫۶۹۲ کلومیٹر یا ۲۷۶۹۲ میٹر۔ لہٰذا اس اعتبار سے تین مراحل میں ۴۵ میل شرعی۔ ۸۳۰۷۶ میٹر اور ۸۳٫۰۷۶ کلومیٹر بنتے ہیں۔ البتہ آجکل مفتی بہ قول کے مطابق ۴۸ میل انگریزی ۷۷٫۹۸۱۵۳۹ کلومیٹر مقدار سفر شرعی بنتی ہے۔

مرحلہ کی تحقیق......

ایک مرحلہ = ۵ فرسخ

ایک فرسخ = ۳ میل شرعی

ایک میل شرعی = ۴۰۰۰ گز اور ایک گز = ڈیڑھ فٹ یا ۱۸/ انچ۔

ایک میل شرعی میں فٹ = (۴۰۰۰×۱۸=۷۲۰۰۰ (انچ) ÷ ۱۲ = ۶۰۰۰ فٹ)

ایک میل شرعی میں ۶۰۰۰ فٹ ہوتے ہیں

ایک میل شرعی میں میٹر (۶۰۰۰ ÷ ۳٫۲۵) = ۱۸۴۶٫۱۵۳۸ میٹر

ایک میل شرعی میں کلومیٹر (۱۸۴۶٫۱۵۳۸ ÷ ۱۰۰۰) = ۱٫۸۴۶ کلومیٹر

تین میل شرعی (ایک فرسخ) میں فٹ = ۶۰۰۰×۳ = ۱۸۰۰۰ فٹ

تین میل شرعی (ایک فرسخ) میں میٹر (۱۸۴۶٫۱۵۳۸×۳)=۵۵۳۸٫۴۶۱۴میٹر

تین میل شرعی (ایک فرسخ) میں کلومیٹر (۵۵۳۸٫۴۶۱۴÷۱۰۰۰)=۵٫۵۳۸کلومیٹر

تین مراحل=۱۵فرسخ=۴۵میل شرعی

تین مراحل میں میٹر (۱۸۴۶٫۱۵۳۸×۴۵)=۸۳۰۷۶٫۹۲۱میٹر

تین مراحل میں کلومیٹر (۸۳۰۷۶٫۹۲۱÷۱۰۰۰)=۸۳٫۰۷۶کلومیٹر

میل انگریزی کے حساب سے ایک مرحلہ میں ۱۶میل انگریزی=۲۵٫۷۴۸کلومیٹر اور ۲۵۷۴۸میٹر بنتے ہیں۔

تین مراحل میں ۴۸میل انگریزی ۷۷٫۲۴۸۱۵۳۹کلومیٹر ۷۷۲۴۸۱۵۳۹میٹر بنتے ہیں۔

میل انگریزی اور میل شرعی میں فرق

میل انگریزی میل شرعی سے ۷۲۰فٹ، ۲۴۰گز چھوٹا ہوتا ہے۔

وجہ فرق=اسلئے کہ میل شرعی ۴۰۰۰گز شرعی=۶۰۰۰فٹ کا ہوتا ہے۔ جبکہ میل انگریزی ۱۷۶۰/گز انگریزی=۵۲۸۰فٹ کا ہوتا ہے۔
میل شرعی اور میل انگریزی میں اس طور پر فرق اس لئے آرہا ہے کہ میل شرعی ۴۰۰۰گز شرعی کا ہوتا ہے اور ایک گز ۱۸/انچ کا ہوتا ہے۔ اور میل انگریزی ۱۷۶۰/گز انگریزی کا ہوتا ہے اور ایک گز انگریزی ۳۶/انچ کا ہوتا ہے فرق معلوم کرنے کے لئے میل شرعی کے گز کو انگریزی گز میں تبدیل کر دیا تو میل شرعی انگریزی گز کے اعتبار سے ۲۰۰۰/انگریزی گز کا ہوگا، اور میل انگریزی ۱۷۶۰/گز انگریزی کا ہوتا ہے لہٰذا ۲۰۰۰ میں سے ۱۷۶۰ نفی کیا تو ۲۴۰گز کا فرق آیا تو اس سے معلوم ہوا کہ میل انگریزی میل شرعی سے ۲۴۰گز چھوٹا ہوتا ہے۔

لمافی معجم لغة الفقهاء (ص ۴۲۱): **المرحلة: بفتح الميم، مسيرة نهار بسيرا لابل المحملة وقدرها أربعة وعشرون ميلا هاشميا، او ثمانية فراسخ او ۴۴۳۵۲ متراً. وفيه ايضاً** (ص ۴۷۰) **الميل بالكسر جمع اميال: مقدار مد البصر الميل الشرعی الهاشمی الف با ع والباع قدر مد اليدين ۴۰۰ زراعاً = ۱۸۴۸ مترا......**

وفی الهندية (۱۳۸/۱): **أقل مسافة تتغير فيها الاحكام مسيرة ثلاثة ايام...... وهل يشترط سير كل يوم الى الليل اختلفوا فيه الصحيح انه لا يشترط حتى لو بكر فی اليوم الاول ومشی الى الزوال وبلغ المرحلة ونزل وبات فيها ثم بكر فی اليوم الثانی كذلک ثم فی اليوم الثالث كذلک يصير مسافرا كذا فی السراج الوهاج ولا معتبر بالفراسخ هو الصحيح كذا فی الهداية.**

وفی الشامية (۱۲۲/۲): **(قوله ولا يشترط الخ) إذلا بد للمسافر من النزول للأكل والشرب والصلاة ولأكثر النهار حكم كله فإن المسافر إذا بكر فی اليوم الاول وسار الى وقت الزوال حتى بلغ المرحلة فنزل بها للاستراحة وبات بها ثم بكر فی اليوم الثانی وسار الى ما بعد الزوال ونزل ثم**

بكر في اليوم الثالث ومشى الى الزوال فبلغ المقصد قال شمس الأئمة السرخسى الصحيح أنه يصير مسافراً عند النية كما فى الجوهرة.

وفيه ايضاً(صـ۱۲۳): قال فى النهاية. اى التقدير بثلاث مراحل قريب من التقدير بثلاثة أيام لأن المعتاد من السير فى كل يوم مرحلة واحدة خصوصاً فى أقصر ايام السنة كذا فى المبسوط وكذا مافى الفتح من أنه قيل يقدر بأحد وعشرين فرسخا وقيل بثمانية عشر وقيل بخمسة عشر وكل من قدر منها اعتقدانه مسيرة ثلاثة ايام. اى بناء على اختلاف البلدان فكل قائل قدّر مافى بلده من أقصر الأيام او بناء على اعتبار أقصر الأيام أو أطولها أو المعتدل منها وعلى كل فهو صريح بأن المراد بالأيام ما تقطع فيها المراحل المعتادة فافهم...... (قوله ولا اعتبار بالفراسخ) الفرسخ ثلاثة أميال، والميل أربعة الأف ذراع...... (قوله على المذهب) لأن المذكور فى ظاهر الرواية اعتبار ثلاثة أيام كما فى الحلية وقال فى الهداية هو الصحيح احترازا عن قول عامة المشايخ من تقديرها بالفراسخ. ثم اختلفوا فقيل: أحد وعشرون، وقيل ثمانية عشر وقيل خمسة عشر، والفتوى على الثانى لأنه الأوسط وفى المجتبى فتوى أئمة خوارزم على الثالث وجه الصحيح أن الفراسخ تختلف باختلاف الطريق فى السهل والجبل والبر والبحر بخلاف المراحل معراج.

فصل فی المسائل المتفرقة المتعلقة بالصلاة

(نماز کے متفرق مسائل کا بیان)

(۳۶۲) فریضۂ صلوٰۃ قرض ہے یا فرض؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز ہمارے اوپر اللہ تعالیٰ کا قرض ہے یا فرض؟ میرے ایک دوست فرماتے ہیں کہ قرض ہے؟ آپ صحیح بات کی طرف ہماری رہنمائی فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... پانچوں نمازیں ہر ''عاقل، بالغ، مسلمان مرد وعورت'' پر ان کے اوقات مقررہ میں ادا کرنا قرآن وحدیث اور اجماع امت کی رو سے فرض عین ہے قرض نہیں۔

اس لئے کہ قرض کہا جاتا ہے کسی دوسرے کو مال دینا اس شرط پر کہ قرض دار وہ مال قرض خواہ کو واپس لوٹائے گا جہاں تک آپ کے دوست کا کہنا ہے کہ فریضہ صلوٰۃ ''قرض'' ہے، تو یہ اس صورت پر محمول کیا جاسکتا ہے کہ مقصود لزوم ادائیگی ہو۔ اور عام طور پر مراد بھی یہی ہوتی ہے کہ جس طرح ادائیگی قرض بہرصورت ضروری ہے، ایسے ہی ادائیگی فرض بھی ضروری ہے۔ تاہم اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نماز فرض نہیں۔

لمافی الهندية(۱/۵۰): الصلاة فريضة محكمة لايسع تركها ويكفر جاحدها كذا فی الخلاصة.

وفی المعجم الوسيط (صـ۷۲۷): "القرض "ماتعطيه غيرک من مال علی ان يرده اليک ......" ج" قروض.

(۳۶۳) فقہاء نے ''نماز کے ارکان وشرائط'' کے اعتبار سے جو تقسیم فرمائی ہے اس کا مقصد

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فقہاء نے جو تقسیم فرمائی ہے نماز کے ارکان وشرائط کے اعتبار سے اس کا کیا مقصد ہے، آیا نماز کی صحت کیلئے ضروری ہے یا نہیں؟ اس کے علاوہ مراقی الفلاح والے کی اس عبارت کا کیا مطلب ہوگا: ويشترط التحريمة وليست ركنا وعليه عامة المشايخ المحققين علی الصحيح......(صـ۱۷۴ باب شروط الصلوٰة)

الجواب حامداً ومصلیاً...... فقہاء نے جو تقسیم کی ہے اس کا مقصد نماز کے ''ارکان اور شرائط'' کے درمیان فرق کرنا ہے اور وہ یہ ہے کہ ''شرط'' وہ عمل ہے کہ خارج نماز اس کو پورا کرنا صحت نماز کیلئے ضروری ہے اور ''رکن'' وہ عمل ہے کہ نماز کے اندر اس کو انجام دینا صحت نماز کیلئے

ضروری ہے دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ شرط، نماز کا جز اور حصہ نہیں ہوتی بلکہ نماز سے الگ اور باہر جداگانہ عمل ہے جیسے نماز کیلئے وضو شرط ہے۔ ''نماز'' اور ''وضو'' دونوں الگ الگ عمل ہیں۔ جبکہ نماز کا ''رکن'' خود نماز کا ایک جزء ہوتا ہے جیسے ''رکوع''، ''سجود'' نماز کے ''ارکان'' ہیں البتہ حکماً دونوں فرض ہیں چنانچہ اگر کوئی آدمی ان میں سے ایک کو بھی انجام نہ دے تو اس کی نماز صحیح نہیں ہوگی۔ اور مراقی الفلاح کی عبارت کا مقصد یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ عندالاحناف شروط میں سے ہے کیونکہ خارج نماز ادا ہو جاتی ہے۔

لمافی الحلبی (صـ۱۲): ثم اعلم بان للصلوة شرائط جمع شریطة بمعنی الشرط وهو فی اللغة العلامة اللازمة وفی الشرع مایتعلق به الوجود دون الوجوب والثبوت قبلها صفة موضحة وبیان للواقع اذ شرط الشی لا یکون فیه ولا بعده وانما یکون قبله...... واعلم ان للصلوة ارکانا جمع رکن وهو فی اللغة الجانب الاقوی و فی الاصطلاح الجزء الذاتی الذی تترکب الماهیة منه ومن غیره.

وفی المراقی(۱/۱۶۶): شروط جمع شرط...... وفی الشریعة هو مایتوقف علی وجوده الشی، وهو خارج عن ماهیته، والارکان جمع رکن: وهو فی اللغة......الجانب الاقوی وفی الاصطلاح الجزء الذاتی الذی تترکب الماهیة منه ومن غیره.

وفی الهندیة(۱/۶۸): الفصل الاول فی فرائض الصلوة وهی ست منها التحریمة، وهی شرط عندنا حتی ان من یحرم للفرائض کان له ان یودی بها التطوع.

وفی الدر المختار مع الشامیة (۱/۴۴۲): (من فرائضها) التی لا تصح بدونها (التحریمة) قائماً (وهی شرط)

وفی الشامیة تحته: (قوله من فرائضها) جمع فریضة اعم من الرکن الداخل الماهیة والشرط الخارج عنها ...... (قوله وهی شرط) وانما لم یذکرها مع الشروط المارة لاتصالها بها بمنزلة الباب للدار ...... (قوله به یفتی)، الضمیر راجع الی الحکم علیها بالشرطیة.

(۳۶۴) حرم سے باہر سمتِ قبلہ کا تعین

سوال......کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل مسجد حرام کے باہر سمت قبلہ کا تعین کیسے کیا جائے جبکہ اونچی اونچی عمارتیں حائل ہیں برائے مہربانی مسئلہ کی پوری وضاحت فرمادیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......قبلہ اگر نمازی کے سامنے ہو تو عینِ قبلہ کی طرف رخ کرنا ضروری ہے البتہ اگر نمازی ایسی جگہ پر ہو جہاں قبلہ نظروں کے سامنے نہ ہو تو جہت قبلہ کا رخ کر لینا کافی ہے لیکن اگر قبلہ نمازی کی نظروں کے سامنے نہ ہو اور سمت قبلہ کے بارے میں بھی شبہ ہو جائے تو وہ مقامی لوگوں سے دریافت کریگا، اگر کوئی شخص ایسا نہ ملے جو اسے سمت قبلہ بتا سکے تو غور وفکر کر کے جس طرف بھی غالب گمان

ہو جائے اسی طرف رخ کر کے نماز ادا کریگا۔

لمافی محیط البرھانی (۲/۲۱): وکل من کان بحضرة الکعبةیجب علیه اصابةعینهاومن کان غائباعنهافـفرضه جهةً الکعبةلاعینهاوهذاقول الشیخ الامام ابی الحسن الکرخی والشیخ الامام ابوبکرالرازی لانه لیس فی وسعه سوی ذالک والتکلیف بحسب الوسع.

وفی الهندیة (۱/۶۴): وان اشتبهت علیه القبلةولیس بحضرته من یسئله عنهااجتهدوصلی کذافی الهدایة ...... واذاکان بحضرته من یسئله عنها وهومن اهل المکان عالم بالقبلة فلا یجوزله التحری.

(۳۶۵) مسجد حرام میں نماز پڑھنے کا ثواب سب سے زیادہ ہے

سوال......ایک شخص اللہ کے راستہ میں (مراد اس سے دعوت وتبلیغ ہے) نماز پڑھتا ہے جبکہ دوسرا دہ شخص ہے جو مسجد حرام میں نماز پڑھتا ہے، ان دونوں میں کس کو زیادہ ثواب ملے گا۔ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرما کر مشکور فرمائیں۔

الجواب حامداًومصلیاً......جواب کو سمجھنے سے پہلے یہ سمجھئے کہ حضرات مفسرین نے، فی سبیل اللہ، میں تبلیغ کے علاوہ اور بھی بہت سے امور داخل کئے ہیں جیسا کہ حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب قدس اللہ سرہ نے تفسیر مظہری (۲/۲۱۱) میں لکھا ہے کہ، طلبِ علم، جہاد، اطاعت، تقوی کیلئے نکلنا اور اسی طرح رزق حلال کے حصول کیلئے نکلنا یہ سب، فی سبیل اللہ میں داخل ہیں جبکہ بعض حضرات اسکے استعمال میں غلطی کر جاتے ہیں کہ اللہ کے راستے میں نکلنے کو صرف تبلیغ کیساتھ خاص کرتے ہیں حالانکہ اسکے علاوہ اور نیک کاموں میں نکلنے والے بھی اللہ کے راستہ میں نکلنے والے ہیں۔ اب جواب کو سمجھ لیجئے کہ اللہ کے راستہ میں عبادت کرنا تو بہت ہی سعادتمندی کی بات ہے احادیث میں اسکے متعلق بہت فضائل مروی ہیں لیکن جو شخص مسجدِ حرام میں نماز پڑھتا ہو تو ظاہر ہے کہ اسکا ثواب سب سے بڑھ کر ہے بلکہ مسجدِ نبوی علی صاحبها الصلاة و السلام میں نماز پڑھنے سے بھی افضل ہے۔

لمافی الشامیة(۱/۶۵۸): وفی تسهیل المقاصدللعلامة احمدبن العماد: ان افضل المساجدالارض الکعبةلان اول بیت وضع للناس ثم المسجدالمحیط بهالانه اقدم مسجد بمکة ثم مسجد المدینة لقوله ﷺ صلاة فی مسجدی هذاتعدل الف صلاة فیماسواه الاالمسجدالحرام.

(۳۶۶) نماز کا پڑھنا ہی اخلاق کی درستگی کا سبب ہے

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مفتی صاحب میں ابھی جماعت کے ساتھ چلہ لگا کر آیا ہوں اللہ کے فضل سے تمام اعمال میں جڑتا ہوں ہماری مسجد میں بدھ کے دن گشت ہوتا ہے، ہم باہر گئے تو ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو بظاہر نیک دیندار معلوم ہوتے تھے ہم نے ان سے بات کی تو فرمانے لگے پہلے اخلاق کی درستی ہونی چاہیے پھر نماز پڑھنی چاہیے،

سارے ساتھی ان کی بات سن کر حیران ہوگئے کہ یہ بات ہم نے پہلی مرتبہ سنی ہے کیا ان صاحب کی بات صحیح ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......نماز چونکہ اہم ترین عبادت ہے قرآن اور احادیث نے جا بجا اس کی تاکید فرمائی ہے لہٰذا اس کو کسی حال میں ترک نہیں کیا جائے گا اخلاق کی درستی بھی شریعت میں مطلوب ہے لیکن اس کی وجہ سے نماز کو نہیں چھوڑا جائے گا بلکہ نماز ہی کی برکت سے رفتہ رفتہ اخلاق کی درستگی بھی ہوجائے گی جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے کہ نماز فحاشی اور برے کاموں سے روکتی ہے اور اسی طرح حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صاحب کے بارے میں پوچھا گیا کہ نماز بھی پڑھتا ہے اور چوری بھی کرتا ہے تو آپ نے فرمایا کہ نماز اس کو اس کام سے روک دے گی لہٰذا ان صاحب کا یہ کہنا کہ پہلے صرف اخلاق کی درستگی ہو پھر نماز ہو تو یہ بات از روئے شریعت درست نہیں۔

لمافی احکام القرآن للجصاص (۳/ ۳۵۰): روی عن ابن مسعود وابن عباس تأمر بالمعروف وتنهى عن المنكر...... وقيل أن النبى ﷺ قيل له إن فلانا يصلى بالليل ويسرق بالنهار فقال لعل صلاته تنهاه الخ. وقوله تعالىٰ وأقيموا وجوهكم عند كل مسجد. (آلاية، سورة الاعراف)

وفى الفقه على المذاهب الأربعة (۱/ ۱۷۳): فهذه هى الصلوة فى نظر الدين وهى بهذا المعنى لها احسن الأثر فى تهذيب النفوس وتقويم الأخلاق فان فى كل جزء من اجزائها تمريناً على فضيلة من الفضائل الخلقية وتعويدا على صفة من الصفات الحميدة ....

(۳۶۷) موبائل میں گانے والی ٹونز لگوانے اور دوران نماز موبائل کی گھنٹی بند کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ موبائل فون میں گانے کی ٹونز لگوانا کیسا ہے؟ نیز نماز پڑھنے کے دوران اگر موبائل کی گھنٹی بجنا شروع ہوجائے تو کیا نمار کے اندر اس کو بند کیا جاسکتا ہے تاکہ دوسروں کی نماز میں خلل نہ آئے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......دین اسلام میں موسیقی کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا موبائل پر گانا یا کسی بھی ایسی گھنٹی کا لگانا جس میں موسیقی کی آمیزش پائی جاتی ہو، ناجائز ہے۔ تاہم موبائل میں عام اور سادہ گھنٹی لگانی چاہئے جس میں موسیقیت کا پہلو ظاہر نہ ہو۔ اور مسجد میں داخل ہونے سے پہلے ہی موبائل بند کر دیا جائے البتہ اگر کسی وقت بند کرنا بھول جائیں اور نماز میں گھنٹی بجنے لگے تو اولاً کوشش کریں کہ بغیر عمل کثیر کے اسے ایک ہاتھ سے بند کریں البتہ اگر بغیر عمل کثیر کے اسے بند کرنا مشکل ہو یا گھنٹی کے بار بار بجنے کی وجہ سے دوسرے نمازیوں کی نماز بھی خراب ہوتی ہو تو بار بار بند کرنے کے بجائے نماز توڑ کر گھنٹی بند کر دیں، تاکہ اس سے پیدا ہونے والے مفاسد سے بچا جاسکے مثلاً۔

۱)......گھنٹی کا بجتے رہنا نمازیوں کی نماز میں خلل عظیم کا باعث ہے۔

۲)......گھنٹی کا بجتے رہنا تقدس مسجد کے پامال ہونے کا باعث ہے۔

۳)......گھنٹی کا بجتے رہنا نماز کی کامل ادائیگی میں نقصان کا باعث ہے۔

۴)......گھنٹی کا بجتے رہنا مسلمانوں کی ایذا رسانی کا باعث ہے۔

۵)...... گھنٹی کے بجتے رہنے سے کسی حد تک مشرکین کے افعال قبیحہ سے مشابہت پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ بیت اللہ میں دورانِ طواف اور مسلمانوں کی نماز میں خلل پیدا کرنے کیلئے سیٹیاں اور تالیاں بجایا کرتے تھے۔

۶)...... حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اقوال وافعال سے گھنٹی کی مذمت فرمائی ہے، اور اس کو شیطان کا آلہ فرمایا ہے۔

۷)...... گھنٹی کے بجتے رہنے سے جہری نمازوں میں امام صاحب کی تلاوت اور مقتدیوں کی سماعت میں حرج پیدا ہوتا ہے۔

۸)...... گھنٹی کے بجتے رہنے سے گرجا گھروں میں کی جانے والی عبادت کے ساتھ مشابہت پیدا ہوجاتی ہے۔ آج بھی نصاریٰ گرجا گھروں میں عبادت بجتی گھنٹیوں کے ساتھ کرتے ہیں۔

۹)...... گھنٹی کا بجتے رہنا لغویات میں شامل ہے اور نماز میں لغویات سے پرہیز از حد ضروری ہے۔

۱۰)...... گھنٹی کا بجتے رہنا فرشتوں کیلئے منافرت کا باعث ہے۔ **تلک عشرۃ کاملۃ**

نیز نماز توڑنے کے بعد نئی تکبیر تحریمہ باندھ کر نماز میں شریک ہوجائے۔ اور امام صاحب کی ادائیگی سلام کے بعد فوت شدہ نماز کو مکمل کرے، اور ادائیگی نماز کے بعد خوب توبہ واستغفار کرے۔ اور آئندہ اس طرح کی غفلت سے اجتناب کرے۔

لمافی مجمع الانھر (۱/۲۰۸): والاصل فیه ان نقض العبادة قصداً وبلا عذر حرام واما اذا کان لامر شرعی مثل الاکمال فیجوز وان کان نقضا صورة فهو اکمال معنی کهدم المسجد لتجدیده.

وفی خلاصة الفتاویٰ (۱/۶۰): ویکره ان یدخل فی الصلاة وبه غائط اوبول فلوشرع فی الصلاة مع هذا وشغله عن الصلوٰة قطعها جاز فان مضی جازوأساء وسواء کان به وقت الافتتاح اوحصل فی الصلوٰة.

(۳۶۸) فرض نمازوں کی رکعات کا احادیث مبارکہ سے ثبوت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فرض نمازوں کی رکعتیں قرآن کریم سے ثابت ہیں یا نہیں اگر نہیں ہیں تو وہ کونسی احادیث مبارکہ ہیں جو ان رکعتوں کی تعیین پر دلالت کرتی ہیں، برائے مہربانی مدلل جواب تحریر فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... قرآن پاک سورۃ الروم آیت نمبر ۱۷، ۱۸ سے پانچ نمازوں کے نفس ثبوت کی طرف اشارہ ہے۔ تاہم بالتفصیل: فرض نماز اور ان کی رکعات کا ذکر کتب احادیث میں موجود ہے۔ چنانچہ فجر کی دو رکعت فرض کا ذکر: بخاری (۱/۱۰۶، ۱۰۷) ومسلم (۱/۱۸۶) وابوداؤد (۱/۱۱۸) ''باب الرجل یعید سورة واحدة فی الرکعتین'' پر موجود ہے۔

ظہر وعصر، مغرب اور عشاء کی فرض رکعات کا اکٹھا ذکر: بخاری (۱/۷۷) وابوداؤد (۱/۱۷۱) پر موجود ہے۔ اور اسی طرح ظہر، عصر اور مغرب کی فرض رکعات کا الگ الگ ذکر بھی موجود ہے۔ چنانچہ ظہر کی چار رکعات فرض کا ذکر: بخاری (۱/۱۰۷) ومسلم (۱/۱۸۵) وابوداؤد (۱/۱۴۵) ترمذی (۱/۹۱) پر موجود ہے۔

عصر کی چار رکعات فرض کا ذکر: مسلم (۱/۲۲۵) پر موجود ہے۔ مغرب کی تین رکعات فرض کا ذکر بخاری (۱/۱۴۸) پر موجود ہے۔ اور پانچوں نمازوں کی تمام فرض رکعات کا ایک ساتھ ذکر السنن الکبریٰ للبیہقی (۱/۳۶۱) اور اعلاء السنن (۲/الجزء ۴، صفحہ ۷) پر موجود ہے۔

لما في القرآن الكريم(سورة الروم: ۱۸،۱۷): (قال الله تعالىٰ) "فسبحن الله حين تمسون وحين تصبحونo وله الحمد في السموات والارض وعشيا وحين تظهرونo

وفي التفسير الكبير(۱۰۴/۱۳)الجزء ۲۵: وأما المعنى فقال بعض المفسرين: المراد منه الصلوة، أي صلوا، وذكروا انه أشار الى الصلوات الخمس.

وفي التفسير روح المعاني(۲۸/۷): وقيل: المراد بالتسبيح الصلاة. واخرج عبدالرزاق اخرج عبد الرزاق، والفريابي وابن جريد وابن النذر.............الى ان قال جاء نافع ابن الازرق الى ابن عباس فقال هل تجد الصلوات الخمس في القرآن؟ فقال: نعم فقرأ (فسبحان الله حين تمسون) صلاة المغرب (وحين تصبحون) صلاة الصبح (وعشيا) صلاة العصر (وحين تظهرون) صلاة الظهر وقرء (ومن بعد صلاة العشاء) واخرج ابن ابي شيبة، وابن جرير، وابن المنذر عنه قال: جمعت هذه الاية مواقيت الصلاة (فسبحان الله حين تمسون) المغرب والعشاء (وحين تصبحون) الفجر (وعشيا) العصر (وحين تظهرون) الظهر...... الخ.

(۳۶۹) کسی مسجد کو مسجد ضرار کہنا درست نہیں

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک میں منافقین نے مسجد قبا کے مقابلے میں ایک مسجد تعمیر کی تھی تو قرآن پاک میں اس مسجد کو مسجد ضرار کہا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے گرانے کا حکم دیا تھا اب سوال یہ ہے کہ آجکل اگر کوئی شخص ایک مسجد کے قریب دوسری مسجد تعمیر کر لیتا ہے تو یہ مسجد ضرار کے زمرے میں آئے گی یا نہیں؟ نیز اس میں نماز پڑھنے کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً......قرآن کریم میں جس مسجد کو مسجد ضرار کہا گیا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے جسے منہدم کر کے جلا دیا گیا، درحقیقت وہ مسجد نہ تھی، بلکہ منافقین نے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے اور انکے خلاف سازشیں کرنے کیلئے مسجد کا نام رکھ کر ایک عمارت بنائی تھی، جس کے چار مذموم ومکروہ مقاصد قرآن کریم نے بیان کیے ہیں اور وہ یہ ہیں:

اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانا، اللہ اور رسول کے ساتھ کفر کرنا، مسلمانوں کے اتحاد اور جماعت میں تفریق پیدا کرنا، اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے باغی (ابو عامر) کو پناہ گاہ فراہم کرنا۔ اس سے مندرجہ ذیل امور معلوم ہوئے۔

(۱)......اگر کچھ مسلمان کسی مسجد کے مقابلے میں اس کے قریب دوسری مسجد ریاء ونمود یا ضد وعناد کی وجہ سے بنالیں اور بنانے کا مقصد یہی

باہم تفرقہ اور پہلی مسجد کی جماعت توڑنا وغیرہ اغراض فاسدہ ہوں تو اگر چہ ایسی مسجد بنانے والے کو ثواب نہ ملے گا بلکہ تفریق بین المؤمنین کی وجہ سے گنہگار ہوگا، لیکن اس کے باوجود اس جگہ کو شرعی حیثیت سے مسجد ہی کہا جائے گا اور مسجد کے تمام آداب اور احکام اس پر جاری ہوں گے۔

(۲)......اس طرح کی مسجد کو اصطلاح میں قرآن والی مسجد ضرار کہنا درست نہیں۔

(۳)......ایسی مسجد میں نماز نہ پڑھنا بہتر ہے اگر پڑھ لی گئی تو ہو جائے گی۔

لما فی الدر المنثور فی التفسیر المأثور(۲۸۴/۴): اخرج ابن الجریر وابن المنذر و ابن ابی حاتم وابن مردویة والبیھقی فی الدلائل عن ابن عباس فی قوله(والذین اتخذوا مسجدا ضرارا) قال: ھم اناس من انصار ابتنوا مسجدا، فقال لھم ابوعامر، ابنو مسجدکم واستمدوا ما استطعتم من قوة و سلاح فانی ذاھب الی قیصر ملک الروم فآتی بجنده من الروم فاخرج محمدا واصحابه. فلما فرغوا من مسجدھم اتوا النبی ﷺ فقالوا: قد فرغنا من بناء مسجدنا، فنحب ان تصلی فیه وتدعو بالبرکة، فانزل الله: (لاتقم فیه ابدا)

وفی التفسیر المظھری(۲۹۵/۴): والذین اتخذوا مسجدا ضرارا ای مضارة للمومنین..................

وفی (صـ۲۹۶): وکفرا بالله ورسوله ﷺ وتفریقا بین المومنین لانھم کانوا یصلون فی مسجد قبا فبنوا مسجد الضرار لیصلی فیه بعضھم فیودی ذالک الی الاختلاف وافتراق الکلمة الخ، وارصادا ای انتظارا واعدادا لمن حارب الله ورسوله. الخ

(۳۷۰) ایک طرف سے آ کر نمازی کے آگے بیٹھ جانے کے بعد پھر اٹھ کر دوسری طرف جانے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عمرو نماز پڑھ رہا تھا کہ زید دائیں طرف سے آیا عمرو کے سامنے قبلہ رو بیٹھ گیا، دو تین منٹ بیٹھا تھا دو تین منٹ کے بعد بائیں طرف گیا، تو آیا زید کا اس طرح کرنا اعراض میں شمار ہے یا کہ مرور میں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں زید کا یہ فعل مرور میں شمار ہوگا۔

لمافی صحیح البخاری(۷۲/۱): باب الصلوة الی السریر: عن عائشة (رضی الله عنھا) قالت: اعدلتمونا بالکلب والحمار لقد رأیتنی مضطجعة علی السریر فیجئ النبی ﷺ فیتوسط السریر فیصلی فأکره ان اسنحه فانسل من قبل رجلی السریر حتی انسلّ من لحافی.

وفیه ایضاً(۷۳/۱): قال رسول الله ﷺ لو یعلم المار بین یدی المصلی ماذا علیه لکان ان یقف

اربعين خير اله من ان يمربين يديه الخ.

وفی فيض الباری(۸۳/۲): قوله ((فأكره أن أسنحه)) (يعنی آری آجاؤل) وعلم ان مسألة المرور فی الفقه فيما اذا مرامامه من جانب الی جانب ولا تفصيل فيه فيما اذا كان قاعدا فصلی خلفه رجل هل ينسل ام لا قلت: فليعمل بهذا لحديث ولا شک ان الانسلال أفيد وهو الخروج من التحت خفية والسنوح اقرب من المرور فلذا كانت تكرهه.

وفی الشامية(۶۳۶/۱): ولومر إثنان يقوم أحدهما أمامه ريمرالاخر ويفعل الاخر هكذا يمران.

(۳۷۱) سترہ کی مقداراوراس کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کسی صحرامیں ایک امام ہےاوراس کے پیچھےمقتدی بھی ہیں،اب جماعت پڑھنے کے دوران صرف امام کے سامنے کاسترہ کافی ہے یامقتدی بھی سترہ لگائیں گے،اورسترے کی مقدارکتنی ہونی چاہئے؟

الجواب حامداًومصلیاً......امام کاسترہ مقتدیوں کیلئے کافی ہےاورسترہ کی مقدارکم ازکم ایک ذراع لمبی اورایک انگلی کے بقدرموٹی ہونی چاہیے۔

لمافی معارف السنن(۳۴۹/۳): واتفق الثلاثة علی ان سترة الإمام سترة لمن خلفه.

معارف السنن(۳۵۰/۳): ونقح فقهاؤنا الحنيفة قدر السترة بالذراع طولا وبالمسبحة ثخنا وغلظا كما هو فی عامة كتبنا. وفی (۳۵۳/۳) أنه اذا صلی خاشعا راميا بصره الی موضع سجوده لا يقع بصره عليه واختار ابن الهمام فی الفتح (۲۸۸/۱) فی الخلاصة وهو الصحيح وفی البدائع: وهو الأصح، وفی النهاية وهو الأشبة، وراجع "الفتح" للتفصيل اهـ.

وفی البحر الرائق (۱۰/۲): واختار فخر الاسلام فانه قال اذا صلی راميابصره إلی موضع سجوده فله يقع عليه بصره له يكره وهذا حسن وفی البدائع وقال بعضهم قدر ما يقع بصره علی المار لوصلی بخشوع وفيما وراء ذلک لايكره وهو الأصح ورجحه فی النهاية بأنه اشبه الصواب.

(۳۷۲) حضور ﷺ کیسے درود پڑھتے تھے؟ کیا آپ پر درود پڑھنا واجب تھا؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں کس طرح درود پڑھا کرتے تھےاورآپ کیلئے درودکا کیا حکم تھا؟ براہ کرم بحوالہ جواب جلدازجلدمرحمت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں درج ذیل درود پڑھا کرتے تھے۔

اللهم صل علی محمد وال محمد كما صليت علی ابراهيم وال ابراهيم وبارک علی محمد وال محمد كما باركت علی ابراهيم وال ابراهيم انک حميد مجيد. (السنن الکبری للبیهقی ۲/۱۴۷، مطبع ادارہ تالیفات اشرفیه)

نیز اس کے علاوہ بھی الفاظ کی کمی زیادتی کے ساتھ مختلف روایات میں درود پڑھنے کا حکم ہے۔ جیسے اللهم صل علی محمد وعلی ال محمد كما صليت علی ابراهيم وعلی ال ابراهيم انک حميد مجيد اللهم بارک علی محمد وعلی ال محمد كما باركت علی ابراهيم وعلی ال ابراهيم انک حميد مجيد. (ابن ماجه ص۶۵، مستدرک حاکم علی الصحيحين ۳/۱۶۰) جہاں تک "آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے درود کے حکم" کی بات ہے تو آپ کے لئے اپنے اوپر درود بھیجنا واجب نہیں تھا۔

لمافي السنن الكبری للبيهقي (۲/۱۴۷): عن كعب بن عجرة عن النبي ﷺ انه كان يقول في الصلوة اللهم صل علی محمد وال محمد كما صليت علی ابراهيم وال ابراهيم وبارک علی محمد وال محمد كما باركت علی ابراهيم وال ابراهيم انک حميد مجيد.

وفي الدر المختار (۱/۵۱۵): وفي المجتبی: لا يجب علی النبي ﷺ ان يصلي علی نفسه.

وفي الشامية تحته: (قوله لا يجب علی النبي ﷺ ان يصلي علی نفسه) لانه غير مراد بخطاب صلوا ولا داخل تحت ضميره كما هو المتبادر من تركيب. صلواعليه. وقال في النهر: لا يجب عليه بناء علی ان. يايها الذين امنوا. لا يتناول الرسول ﷺ، بخلاف. يايها الناس. يا عبادی كما عرف في الاصول اهـ.

وفي البحر الرائق (۱/۵۷۳): وفي المجتبی معزيا الی خزانة الاكمل: انه لا يجب علی النبي ﷺ ان يصلي علی نفسه.

وفي النهر الفائق (۱/۲۲۳): قال في ((المجتبی)) معزيا الی ((خزانة الاكمل)): هذا في حق الامة اما هو فلا يجب عليه ان يصلي علی نفسه انتهی بناء علی ان (يايها الذين امنوا) لاتتناول الرسول بخلاف (يايهاالناس) (ياعبادی) كما عرف في الاصول.

(۳۷۳) "ہر وہ نماز جو کراہت تحریمیہ کے ساتھ ادا کی گئی ہو اس کا اعادہ واجب ہے"

کیا یہ قاعدہ کلی ہے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ یہ جو قاعدہ ذکر کیا گیا ہے کل صلاۃ ادیت مع

کراهة التحریم تجب ان عادتها کیا یہ قاعدہ کلی ہے؟اور جو بھی نماز مکروہ تحریمی ہو جائے اور جس طرح بھی کراہت تحریمی آئی ہو، اس صورت میں نماز کا اعادہ واجب ہے یا اس میں تخصیص ہے اور کیا یہ ،بوب وقت کے اندر ہے یا وقت کے بعد بھی اس کا اعادہ واجب ہے؟

(۲)۔نیز اگر تصویر سامنے ہو،اور نماز ادا کر لی تو جو علامہ شامیؒ نے فرمایا کہ جو کراہت ماہیت صلاۃ میں آئی ہو،اس صورت میں نماز کا اعادہ واجب ہے ورنہ نہیں اور کیا تصویر اگر سامنے ہو،اور نماز پڑھ لی تو جو کراہت نماز میں آئی ہے یہ کراہت ماہیت صلاۃ میں داخل ہے یا نہیں؟ اس کی وضاحت فرمائیں۔بینوا توجروا

الجواب حامداً ومصلیاً......مذکورہ قاعدہ کلی ہے بشرطیکہ کراہت ماہیت صلوٰۃ میں داخل ہو،حاصل اس کا یہ ہے فریضہ ذمہ سے ساقط ہوجاتا ہے لیکن کراہت تحریمی کے ارتکاب کی وجہ سے نماز کا اعادہ واجب ہے یہ وقت کے اندر نہیں کیا تو بعد میں کرے،تصویر سامنے ہونے کی صورت میں جو کراہت نماز میں آئی ہے یہ ماہیت صلاۃ میں داخل ہے کیونکہ علامہ شامی علیہ الرحمۃ نے تصویر والے کپڑوں میں نماز کی کراہت کو" حامل صنم پر قیاس کر کے" ماہیت صلاۃ میں داخل کیا،تصویر سامنے ہونے کی صورت میں بھی کراہت ماہیت صلاۃ میں داخل ہوگی کیونکہ اس میں کراہت اُس سے زیادہ ہے لہٰذا اس نماز کا اعادہ واجب ہے۔

بخلاف اس صورت کے کہ اگر کسی نے تنہا ظہر کی فرض نماز کی تین رکعت پڑھ لیں اور اسی اثناء میں جماعت کھڑی ہوگئی یہ اپنی نماز اکیلے پوری کرے اگر چہ جماعت کے ساتھ نہ پڑھنے کی وجہ سے کراہت تحریمی کے ساتھ ادا ہوئی لیکن کراہت ماہیت صلاۃ میں داخل نہ ہونے کی وجہ سے اعادہ واجب نہیں کیونکہ جماعت نماز کی ایک صفت ہے جو ماہیت صلاۃ سے خارج ہے اسی لئے اس کو واجبات الصلوٰۃ میں ذکر نہیں کرتے ہیں۔

لمافی الدر المختار (۱/۴۵۷):وکذا کل صلوٰة ادیت مع کراهة التحریم تجب اعادتها والمختار انه جابر للاول ......وفی الشامیة: وان النقص اذا دخل فی صلاة الامام ولم یجبر وجبت الاعادة علی المقتدی ایضا: وانه یستثنی منه الجمعة والعید اذا ادیت مع کراهة التحریم الا اذا اعادها الامام والقوم جمیعا............

بقی هنا شی وهو ان صلاة الجماعة واجبة علی الراجح فی المذهب او سنة موکدة فی حکم الواجب کمافی البحر وصرحوا بفسق تارکها وتعزیره وانه یأثم ومقتضی هذا انه لو صلی مفردا یومر باعادتها بالجماعة وهو مخالف لما صرحوا به فی باب ادراک الفریضة من انه لو صلی ثلاث رکعات من الظهر ثم اقیمت الجماعة یتم ویقتدی متطوعا فانه کالصریح فی انه لیس له اعادة الظهر بالجماعة مع ان صلاته منفردا مکروهة تحریماً او قریبة من التحریم. فیخالف تلک القاعدة، الا ان یدعی تخصیصها بان مرادهم بالواجب والسنة التی تعاد بترکه ما کان من ماهیة الصلاة واجزائها فلا یشمل الجماعة

لانها وصف لها خارج عن ماهيتها او يدعى تقييد قولهم يتم ويقتدى متطوعا بما اذا كانت صلاته منفردا لعذر كعدم وجود الجماعة عند شروعه فلا تكون صلاته منفردا مكروهة والاقرب الاول ولذا لم يذكروا الجماعة من جملة واجبات الصلاة لانها واجب مستقل بنفسه خارج عن ماهية الصلاة ويويده ايضاً انهم قالوا يجب الترتيب فی سور القرآن، فلو قرأ منكوساً اثم لكن لا يلزمه سجود السهو لان ذالک من واجبات القراءة لامن واجبات الصلاة! كماذكر فی البحر فی باب السهو لكن قولهم كل صلوة اديت مع كراهة التحريم يشمل ترک الواجب وغيره ويويده ما صرحوا به من وجوب الاعادة بالصلاة فی ثوب فيه صورة بمنزلة من يصلی وهو حامل الصنم.

(۳۷۴) دونمازوں کوایک وقت میں جمع کر کے ادا کرنے کا حکم اور اس کی شرائط

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے ماموں مجھے بتارہے تھے کہ حج کے موقع پر ایک دن ایسا ہوتا ہے کہ ظہر وعصر کی نماز ظہر کے وقت جماعت سے پڑھی جاتی ہے، اگر کسی کی جماعت نکل گئی تو پھر ظہر کی ظہر کے وقت اور عصر کی عصر کے وقت ہی پڑھی جاتی ہے، اور مزدلفہ میں مغرب وعشاء، عشاء کے وقت میں ایک ساتھ پڑھی جاتی ہے خواہ جماعت سے پڑھو یا اکیلے اکیلے۔ ہم نے تو آج تک کبھی ایسے نہیں پڑھی، کیا یہ صرف حج کے موقع پر سب جگہ پڑھی جاسکتی ہے یا صرف حاجیوں کو اس کی اجازت ہے؟ اس کی کیا وجہ ہے؟ اور اس کی شرائط کیا ہیں؟ براہِ کرم تفصیل سے اس مسئلہ کو ذکر کردیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......نماز صحیح ہونے کیلئے وقت شرط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کلام پاک میں نماز کو اس کے مقررہ وقت میں پڑھنے کی تاکید فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَاباً مَّوْقُوْتاً۔ (بے شک نماز مومنوں پر اوقات مقررہ میں ادا کرنا فرض ہے) (سورۂ نساء:۱۰۳)۔ امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دونمازوں کو ایک وقت میں جمع کرکے ادا کرنے سے لوگوں کو منع کیا اور فرمایا کہ یہ کبیرہ گناہوں میں سے ایک گناہ ہے۔ اور امام محمد رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں کہ عرفات میں ظہر اور عصر کو اور مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کو جمع کرنے کے علاوہ ہم دونمازوں کو ایک وقت میں جمع نہیں کرتے لہٰذا معلوم ہوا کہ عرفات اور مزدلفہ کے علاوہ باقی کہیں بھی دونمازوں کو ایک وقت میں جمع کرنا جائز نہیں۔ اور جواز جمع بھی صرف حاجیوں کیلئے ہے۔ وہ بھی چند شرائط کے ساتھ جیسا کہ کتب فقہ میں مذکور ہیں۔ اس کی وجہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے جو کہ احادیث سے ثابت ہے اور دوسری وجہ جماعت کی حفاظت ہے۔ عصر کو ظہر کے وقت میں ظہر کے ساتھ جمع کرنے کیلئے حسب ذیل شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔ (۱) امام اعظم یا اس کے نائب کا نماز پڑھانا۔ (۲) ظہر کی ادائیگی سے قبل ہی احرام حج میں ہونا۔ (۳) ظہر کو عصر سے پہلے ادا کرنا۔ (۴) عرفات کا دن ہونا۔ (۵) عرفات کا میدان ہونا۔ (۶) امام اعظم کی اقتداء میں دونوں نمازوں کو باجماعت ادا کرنا۔ مغرب کو عشاء کے وقت میں عشاء کے ساتھ جمع کرنے کیلئے حسب ذیل شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔ (۱) احرام حج۔ (۲) وقوف عرفہ کو مقدم کرنا۔ (۳) عیدالاضحیٰ کی رات

ہونا۔(۴)مزدلفہ کا میدان ہونا۔(۵)عشاء کا وقت ہونا۔

لمافی الهندية(۱/۲۲۸،۲۲۹): ثم لجواز الجمع أعنى تقديم العصر على وقتها وادائها فى وقت الظهر شرائط ((منها)) ان تكون مرتبة على ظهر جائز استحسانا.......... ((ومنها الوقت)) وهو ان يكون يوم عرفة ((والمكان)) وهو عرفات كذا فى الكفاية((ومنها احرام الحج)) قالوا ينبغى ان يكون محرما بالحج عند اداء الصلاتين...... ثم لابد من الاحرام بالحج قبل الزوال فى رواية تقديما للاحرام على وقت الجمع وفى اخرى يكتفى بالتقديم على الصلاة لان المقصود هو الصلاة هو الصحيح كذا فى الهداية ......((ومنها الجماعة)) عند ابى حنيفة رحمه الله تعالىٰ وعندهما ليست بشرط. فمن صلى الظهر وحده فى رحله صلى العصر فى وقته عند ابى حنيفة رحمه الله تعالىٰ وقالا يجمع بينهما المنفرد كذا فى الهداية والصحيح قول ابى حنيفة رحمه الله تعالىٰ. كذا فى الزاد ولو فاتتا مع الامام او فاتته واحدة منهما صلى العصر لوقته ولا يجوز له تقديم العصر على قول ابى حنيفة رحمه الله تعالىٰ. ولا يشترط الامام لجميع اداء الظهر...... فاذا ادرک مع الامام ركعة واحدة من الصلاتين او شيئا من الصلاتين جاز الجمع اجماعاً كذا فى الجوهرة النيرة. ولو نفر الناس عن الامام فصلى وحده الصلاتين جاز...... ((ومنها)) ان يكون الامام هو الامام الاعظم او نائبه وهو شرط عند ابى حنيفة رحمه الله. فلو صلى الظهر بجماعة لامع الامام والعصر مع الامام لم يجز العصر عند ابى حنيفة رحمه الله والصحيح قوله هكذا فى البدائع. ولو مات الامام وهو الخليفة جمع نائبه او صاحب شرطته ولو لم يكن نائب ولا صاحب شرطته صلوا كل واحدة منهما فى وقتها كذا فى التبيين.

وفيه ايضاً(صـــ۲۳۰): والافضل ان يصلى مع الامام بالجماعة كذا فى الايضاح. ذكر الامام المحبوبى ولا يشترط فى جمع المزدلفة الخطبة و السلطان والجماعة والاحرام كذا فى الكفاية

وفى الشامية(۲/۵۰۴): (تنبيه) اقتصر من الشروط على الإمام والإحرام وزاد فى اللباب تقديم الظهر على العصر حتى لو تبين للإمام وقوع الظهر قبل الزوال أو بغير وضوء والعصر بعده او بوضوء اعادهما جميعا والزمان وهو يوم عرفة والمكان وهو عرفة وما قرب منها والجماعة فالشروط ستة.

(۳۷۵) داڑھی منڈوانے والے شخص کوصف اول سے پیچھے کردینے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص شیو کرتا ہوتو کیا اس کوصف اوّل میں نماز

پڑھنے سے روکا جائے گا یانہیں؟ آیا شیو کی وجہ سے اس کو صف اوّل سے محروم کیا جائے گا یانہیں؟ کراچی کے ایک بہت بڑے عالم ہیں، وہ اپنی مسجد میں شیو کرنے والوں کو صف اول سے نکال دیتے ہیں آیا ان کا یہ فعل درست ہے یانہیں؟ برائے مہربانی شریعت کی روشنی میں اس مسئلہ کو حل فرمائیں عین نوازش ہوگی۔شکریہ

الجواب حامداً ومصلیاً......داڑھی رکھنا واجب ہے اور تمام انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے اور داڑھی کو منڈوانا حرام ہے۔ جو لوگ اس حرام کام میں مبتلا ہوں ان کو چاہیے کہ اس سے اجتناب کریں اور اللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار کریں۔اور جماعت سے نماز پڑھتے وقت ایسے لوگوں کو چاہیے کہ علماء وصلحاء سے بڑھ کر پہلی صف میں کھڑے نہ ہوجائیں بلکہ پہلی صف میں ایسے لوگ کھڑے ہوجائیں جو علماء وصلحاء ہوں جیسا کہ علامہ ظفر احمد عثمانیؒ نے اس حدیث کی تشریح میں (**لیلینی منکم اولو الاحلام والنھی**) علامہ شعرانی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ صف اول میں وہ لوگ کھڑے ہوجائیں جن کا ظاہر وباطن اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہو۔ورنہ ان کیلئے آخری صفوں میں کھڑا ہونا بہتر ہے (اعلاء السنن،۴/۳۶۶)۔البتہ ایسے لوگوں کے کھڑے ہوجانے کے بعد بھی اگر پہلی صف میں کوئی خلاء باقی رہ جائے تو پھر اس صورت میں ان پرلازم ہے کہ پہلی صف کو مکمل کریں اور اگر کوئی عالم ایسا ہو کہ جس کو اپنے علاقے میں لوگ اپنا مقتداء مانتے ہوں اور اسکی بات کی وجہ سے لوگ دین سے متنفر نہ ہوتے ہوں تو ایسا عالم اگر اصلاح کیلئے زجراً ان لوگوں کو جو داڑھی منڈاتے ہوں پہلی صف سے ہٹا دے تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

لمافی الصحیح البخاری(۲/۸۷۵): عن ابن عمر رضی الله عنهما قال قال رسول الله ﷺ خالفوا المشركين او فروا اللحىٰ واحفوا الشوارب.

وفی البداية والنهاية (۴/۲۶۹): ودخلا على رسول الله ﷺ وقد حلقا لحاهما وأعفيا شواربهما فكره النظر اليهما وقال، ويلكما من أمر كما بهذا؟ قالا امرنا ربنا يعنيان كسرى، فقال رسول الله ﷺ ولكن ربى أمرنى بإعفاء لحيتى وقص شاربى.

وفی الصحيح لمسلم (۱/۱۸۱): عن ابن مسعود قال كان رسول الله ﷺ يمسح مناكبنا فی الصلاة ويقول استووا ولا تختلفوا فتختلف قلوبكم وليلنى منكم اولو الاحلام والنُهىٰ ثم الذين يلونهم ثم الذين يلونهم.

وفی اعلاء السنن (۴/۳۶۵،۳۶۶): قلت وعلى هذا، **فيجوز إيثار العالم وكبير السن بالصف الأول** بل يجب نظرا إلى الأمر، فإن الجاهل والصغير مأمور بالتأخر عن اهل الحلم والنهى، ويؤيده ماروه الحاكم فی مستدركه عن أبی بن كعب مرفوعا "**لا يقوم فی الصف الاول الا المهاجرون والانصار**" ذكره فی كنز العمال بلا تعقب (۴:۱۳۵) **فهو صحيح على قاعدته، وهو صريح فی النهی لغير** هؤلاء عن التقدم الى الصف الأول، وتخصيص الانصار والمهاجرين بالذكر لكونهم أولى الأحلام

والنهی اذ ذاک فی الأغلب، وکونهم افضل من غیرهم. وأفاد هذا الحدیث أن أمر المسارعة الی الصف الاول لیس علی إطلاقه بل هو مختص بأولی الفضل و الصلاح، وکذا الوعید الوارد علی التأخر عنه مختص بهم أیضا نعم ایشمل الوعید غیرهم اذا بقی فی الصف الأول فرجة فلم یسدوها فافهم، فلو تأخر أحد عن الصف الاول لخلوه عن الصلاح والفضل والتقوی بشرط أن یرجوا کمال الصف بغیره ممن هو اهله فله ذلک ولا لوم علیه، بل ذلک متعین فی حقه.

قال العلامة الشعرانی فی العهود المحمدیة، أخذ علینا العهد إذا صفت سرائرنا من جمیع ما یسخط الله عزوجل بحیث لم یبق فی سرائرنا وظواهرنا الا ما یرضی ربنا أن نواظب علی الصلوة فی الصف الأول عملا بقوله ﷺ لیلنی منکم اولو الاحلام و النهی ای العقل ولا یکون العبد عاقلا الا اذا کان بهذا الوصف الذی ذکرناه فإن من کان فی ظاهره أو باطنه صفة یکرهها الله تعالیٰ فلیس بعاقل کامل ولا یتقدم للصف الأول بین یدی الله فی المواکب الإلهیة الا الأنبیاء والملائکة ومن کان علی اخلاقهم وأما من تخلف عن اخلاقهم فیقف فی آخریات الناس.

وفی الشامیة(۴۱۸/۲): وأما الأخذ منها وهی دون ذلک کما یفعله بعض المغاربة ومخنثة الرجال فلم یبحه أحد.

(۳۷۶) فرض نماز اور تراویح کے بعد اجتماعی دعا کی شرعی حیثیت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ فرض نمازوں اور تراویح اور اسی طرح جب وتر نماز جماعت کے ساتھ رمضان میں ادا کی جاتی ہے، اس کے بعد دعا انفرادی طور پر تو کرنے میں کوئی مزائقہ نہیں ہے۔ لیکن اس دعا کو ایک ہیئت اور جمعیت کے ساتھ لازم سمجھنا کہ امام کے ساتھ دعا کے بغیر کوئی بھی نہ اٹھے تو یہ کام کیسا ہے؟ شریعت کے موافق ہے یا نہیں؟ اگر شریعت کے موافق ہے یا نہیں تو دونوں کو ادلۂ شرعیہ سے واضح کریں۔ شکریہ

الجواب حامداً ومصلیاً...... دعا ایک عبادت ہے، کثرت سے احادیث مبارکہ دعا کے متعلق کتب احادیث میں موجود ہیں۔ جن سے دعا کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ تاہم بعض حضرات نماز کے بعد دعا کے متعلق افراط وتفریط کا شکار ہیں۔ جس کی دین اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ فرض نمازوں اور تراویح کے بعد امام کے ساتھ تمام مقتدیوں کا مل کر دعا مانگنا جائز ہے اس میں کوئی قباحت نہیں۔ البتہ اس طور پر التزام کہ امام کے ساتھ دعا کے شروع کرنے اور ختم کرنے کو لازم سمجھنا یا بغیر دعا مانگے اٹھنے والے کو طعن وتشنیع کا نشانہ بنانا اور اسی طرح اس بے جا التزام کی آڑ میں نفس دعا ہی کا انکار کر دینا دونوں امر حد سے متجاوز اور غلو فی الدین کے مترادف ہیں۔ ان سے اجتناب انتہائی ضروری ہے خاص طور پر ہمارے زمانے میں جبکہ امت کا شیرازہ بکھرا ہوا ہے۔ اور فقط چند عبادات میں امت کی اجتماعیت کی اک کرن

باقی ہے۔اس میں بھی اختلاف وانتشار کا دروازہ کھول لینا قطعاً مناسب نہیں ہے۔

لمافی البخاری(۲/۹۳۷). باب الدعاء بعد الصلوة: ......عن ورّاد مولی المغیرة بن شعبة قال کتب المغیرة الی معاویة ابن ابی سفیان ان رسول اللہ ﷺ کان یقول فی دبر صلوته اذا سلّم لا اله الا اللہ وحده لا شریک له له الملک وله الحمد وهو علی کل شیٔ قدیر، اللهم لا مانع لما اعطیت ولا معطی لما منعت ولا ینفع ذالجد منک الجد.

وفی فتح الباری(۱۱/۱۱۱): (قوله باب الدعاء بعد الصلوة) ای المکتوبة وفی هذه الترجمة رد علی من زعم أن الدعاء بعد الصلوة لا یشرع متمسکا بالحدیث الذی اخرجه مسلم والجواب ان المراد بالنفی المذکور نفی استمراره جالسا علی هیئته قبل السلام الا بقدر ان یقول ما ذکر. فقد ثبت انه کان اذا صلی أقبل علی أصحابه فیحمل ماورد من الدعاء بعد الصلوة علی انه کان یقول بعد ان یقبل بوجهه علی اصحابه.

وفی فیض الباری علی صحیح البخاری(۴/۴۱۷): باب "الدعاء بعد الصلاة" لا ریب ان الادعیة دبر الصلوات قد تواترت تواترا لا ینکر، اما رفع الأیدی فثبت بعد النافلة مرة او مرتین، فالحق بها الفقهاء المکتوبة ایضا، وذهب ابن تیمیة وابن القیم إلی کونه بدعة بقی ان المواظبة علی امر لم یثبت عن النبی ﷺ الامرة او مرتین، کیف هی فتلک هی الشاکلة فی جمیع المستحبات فانها تثبت طورا فطورا، ثم الامة تواظب علیها، نعم نحکم بکونها بدعة اذا افضی الامر إلی النکیر علی من ترکها.

وفی اعلاء السنن(۳/۱۸۳): قال الحافظ فی الفتح: قال ابن المنیر: ان المندوبات قد تنقلب مکروهات اذا رفعت عن رتبتها، لان التیامن مستحب فی کل شیٔ من أمرر العبادة لکن لما خشی ابن مسعود ان یعتقدولوجوبه اشار الی کراهته. واللہ اعلم اهـ.

ولیتنبه لهذا من یصر علی القیام عند ذکر الولادة الشریفة ویطعن فی من لایقوم وکذا کل من رفع المباح او المندوب عن رتبتهما وطعن فی تارکهما فافهم.

وفی مجموعة الفتاوی علی خلاصة الفتاوی(۱/۱۰۰):الجواب صحیح والرای نجیح ویؤید ما رواه ابو بکر بن ابی شیبة فی المصنف عن الاسود العامری عن ابیه قال صلیت مع رسول اللہ ﷺ الفجر فلما سلم انصرف ورفع یدیه ودعا الحدیث. فثبت بعد الصلوة المفروضة رفع الیدین فی الدعا عن سید الانبیاء و اسوة الاتقیاء صلعم کمالا یخفی علی العلماء الاذکیاء.

﴿احکام المساجد﴾

(۳۷۷) مسجد میں کسی جگہ رومال وغیرہ رکھ کر جگہ گھیرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلے کی مسجد میں دو چار آدمی ایسے ہیں جو کہ پہلی صف میں رومال وغیرہ رکھ کر جگہ گھیرتے ہیں اور خود وضو وغیرہ کیلئے چلے جاتے ہیں تو کیا اس طرح صف میں رومال وغیرہ رکھ کر جگہ گھیرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... جو شخص پہلے آکر مسجد میں نہ بیٹھا ہو وہ اپنا رومال کسی جگہ مسجد میں قبضہ کرنے کی غرض سے رکھ دے یہ شرعاً جائز نہیں ہے اور اس سے اس کا حق بھی قائم نہیں ہوتا، خواہ وضو کیلئے جائے یا اور کسی غرض سے جائے۔ ہاں وہ پہلے سے بیٹھا ہوا تھا، لیکن کسی عذر کی وجہ سے چلا جائے تو پھر گنجائش ہے۔

لمافی الهندية(۱/۱۰۸): ويكره للانسان ان يخص لنفسه مكانا فی المسجد يصلی فيه.

وفی الشامية(۱/۶۶۲): قوله وتخصيص مكان لنفسه: لانه يخل بالخشوع كذا فی القنية ای لانه اذا اعتاده ثم صلى فی غيره يبقى باله مشغولا بالاوّل بخلاف ما اذا لم يالف مكانا معينا (قوله وليس له) قال فی القنية له فی المسجد موضع معين يواظب عليه وقد شغله غيره قال الاوزاعی له ان يزعجه وليس له ذلك عندنا ای لان المسجد ليس ملكا لاحد. بحر عن النهاية قلت: وينبغی تقييده بما إذا لم يقم عنه على نية العود بلا مهلة، كمالو قام للوضوء مثلا ولا سيما إذا وضع فيه ثوبه لتحقق سبق يده تأمل.

(۳۷۸) سرکاری زمین میں حکومت کی اجازت کے بغیر مسجد کی توسیع اور اس میں نماز پڑھنا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سرکاری زمین پر حکومت کی اجازت کے بغیر مسجد کی توسیع کرنا اور اور اس میں نماز پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ مساجد بنائے اور ان کی توسیع کرے اگر حکومت اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتی تو وہ گناہگار ہوگی۔ جاننا چاہیے کہ سرکاری زمینیں دو قسم کی ہیں پہلی قسم وہ زمینیں جو صرف حکومت کی ملکیت میں ہوں اور عوام کا اس میں کوئی حق نہ ہو، مثلاً حکومت نے اس کو ہسپتال یا اسکول کیلئے خاص کیا ہو، تو ایسی زمینوں میں حکومت کی اجازت کے بغیر مسجد بنانا یا اس کی توسیع کرنا

جائز نہیں اور اگر بنائی گئی تو اس میں نماز پڑھنا مکروہ ہوگا۔
دوسری قسم وہ زمینیں جو رفاہی ہوں جیسے مویشیوں کی چراگاہ، بچوں کے کھیل کے میدان وغیرہ تو اس میں ضرورت کے وقت حکومت کی اجازت کے بغیر بھی مسجد کی توسیع کرنا جائز ہے، اور اس میں نماز پڑھنا بلا کراہت جائز ہوگا۔

لمافي الهندية(۳۵۳/۲): ومنها الملك وقت الوقف حتى لوغصب ارضافوقفها ثم اشتراها من مالكها ودفع الثمن اليه اوصالح على مال دفعه اليه لاتكون وقفا كذا في البحر الرائق.

وفيه ايضاً(۴۵٦/۲): ارض وقف على مسجد والارض بجنب ذلك المسجد وارادوا ان يزيدوا في المسجد شيئا من الارض جاز لكن يرفعون الامرالى القاضي ليأذن لهم.

وفي الفقه الاسلامي(٦/۴٦۰۷): الأراضي نوعان ارض مملوكة وارض مباحة والمملوكة نوعان عامرة وخراب والمباحة نوعان ايضا نوع هو من مرافق البلد للاحتطاب ورعى المواشي ونوع ليس من مرافقها وهو الارض الموات اوما يسمى الآن املاك الدولة العامة.

وفيه ايضاً(٦/۴٦۰۸): ما كان من مرافق أهل بلدة تستعمل مرعى للمواشي ومحتطبا لهم أو مقبرة لموتاهم أو ملعباً لصغارهم، سواء كانت داخل البلدة أم خارجها فيكون حقالهم لامواتا فلا يجوز للإمام أن يقطعه لأحد.

(۳۷۹) مساجد میں ایکوساؤنڈ کے استعمال کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض مساجد (جیسا کہ ہماری مسجد) میں ایکوساؤنڈ لگا ہوتا ہے جس کی وجہ سے جب مؤذن یا امام ایک مرتبہ اللہ اکبر کہتا ہے تو ایک مرتبہ کہنے کی وجہ سے تین چار مرتبہ آواز سنائی دیتی ہے کیا اس سے نماز میں کراہت نہیں آتی؟ نیز یہ آواز جتنی مرتبہ سنائی دیتی ہے اتنی مرتبہ ہی شمار ہوگی یا ایک مرتبہ شمار ہوگی؟ بخاری (۸۵/۱) پر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا اثر ہے کہ ''اذن اذانا سمحا والافاعتزلنا'' اور سمحا کا مطلب یہ ہے کہ سہل و بلانغمہ ہو، آواز میں طرب (یعنی درجہ بدرجہ) نہ ہو، کیا ایکو (Echo) والی آواز میں طرب نہیں ہے اگر ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟ قرآن وحدیث کی رُو سے تحقیقی جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... عبادات کی ادائیگی کا جو طریقہ عہد نبوی سے تا حال چلا آرہا ہے وہ شریعت میں آج بھی ممدوح ومطلوب ہے جیسا کہ باجماعت نماز کی ادائیگی میں نمازیوں کی کثرت کی وجہ سے مکبّرین کا تقرر جو کہ قدیم سنت ہے، اس پر عمل پیرا ہونا افضل ہے۔ جبکہ سائنس کی نئی نئی ایجادات جن میں آلۂ مکبر الصوت ''لاؤڈ اسپیکر'' بھی داخل ہے جس کے ہوتے ہوئے مکبّرین کے تقرر کی طرف احتیاج باقی نہیں رہتی، تو حضرات مفتیان کرام نے نماز میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کو سہولت اور عموم بلوی کے پیش نظر جائز قرار دیا ہے۔

جہاں تک مساجد میں ایکو ساؤنڈ کا استعمال ہے تو اس سے مقصود تحسین صوت ہے کہ اذان وقرأت کی ادائیگی قلوب پر اثر انداز ہو کے خشوع کی زیادتی کا باعث بنے جو کہ غرض صحیح ہے۔ ایکو ساؤنڈ کے ذریعہ کلمات کا تکرار جو سننے میں آتا ہے تو وہ بمنزلہ صدائے بازگشت کے ہے جس کا کوئی اعتبار نہیں، لہٰذا صورت مسئولہ میں ایک ہی تکبیر شمار ہوگی البتہ اگر یہ گونج اس قدر زیادہ ہو کہ جس سے نمازی کے خشوع میں خلل واقع ہو، اور قرأت ہی سمجھ میں نہ آئے تو ایسی صورت میں ایکو ساؤنڈ کے استعمال سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا مؤذن کو "**اذن اذانا سمحا والافاعتزلنا**" ارشاد فرمانا اس وجہ سے نہیں تھا کہ وہ اذان کے کلمات میں زائد تکرار کر رہے تھے بلکہ وہ تصنع اور گا گا کر اذان دیا کرتے تھے اس تفسیر کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے اس مقولہ کو (جو کہ صحیح بخاری شریف میں تعلیقا ذکر ہے) ابن ابی شیبہ نے موصولا روایت کیا ہے جس میں لفظ تطریب کی صراحت ہے۔ (۱/۲۰۷)

وفی الدر المختار(۲/۱۰۸): (لا) تجب (بسماعه من الصدی والطیر)

وفی اللجنة الدائمة(۶/۶۵): س: هل صح قول من قال: بعدم استحباب الأذان بمكبرات الأصوات باعتبارها المولدة لمضاعفات الأصوات عن الحجم الصغير يلقيه المؤذن فی الأصل، ذلک لالحاقه بالأذان بالراديو أو التلفاز،

ج: ألأذان بمكبرات الصوت لتبليغ من بعد وغيره لاحرج فيه، لما فی ذلک من المصلحة العامة.

(۳۸۰) مسجد میں نمازیوں کے سامنے کی طرف ہیٹر لگانے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسجد میں ہیٹر لگانا کیسا ہے؟ نیز اگر ہیٹر نمازیوں کے سامنے صف میں یا اکیلے آدمی کے سامنے پڑا ہو تو نماز میں کوئی حرج آئے گا؟ یا اگر دیوار پر اوپر سامنے لگا ہوا ہو تو نماز میں کوئی حرج آئے گا یا نہیں؟ کیا اس میں تشبہ بالمجوس ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... مسجد میں ضرورت کی وجہ سے ہیٹر لگانے میں کوئی حرج نہیں اور اس کے سامنے ہونے سے تشبہ بالمجوس بھی لازم نہیں آتا۔

لمافی الشامية (۱/۶۵۲): وفی شرح المنية: وجه عدم الكراهة أن كراهة استقبال بعض الأشياء باعتبار التشبه بعبادها...... (قوله أوشمع)...... وعدم الكراهة هو المختار كما فی غاية البيان وينبغی الاتفاق عليه فيما لو كان علی جانبيه كما هو المعتاد فی ليالی رمضان بحر:........(قولهٗ قنية) ذكر ذلک فی القنية فی كتاب الكراهية ونصه: الصحيح أنه لايكره أن يصلّی وبين يديه شمع أو سراج لأنّه لم يعبدهما أحد والمجوس يعبدون الجمر لاالنّار الموقدة، حتّی قيل لايكره إلی النّار الموقدة

وظاهره أنّ المراد بالموقدة التي لها لهب، لكن قال في العناية: أن بعضهم قال: تكره إلى شمع أو سراج كما لو كان بين يديه كانون فيه جمر أو نار موقدة اهـ وظاهره انّ الكراهة في الموقدة متّفق عليها كما في الجمر تأمّل.

وفي اللجنة الدائمة(۷/۸۸): س ۵: هل يجوز توليع الدفايات الكهربائية أمام المصلّين أولا.

ج۵: يجوز ذلك لمسيس الحاجة إلى ذلك.

(۳۸۱) مسجد کے پودوں کے مالی کو مسجد کی آمدنی سے تنخواہ دینے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک متولی مسجد نے مسجد کی رقم سے مسجد کی دیواروں کے ساتھ ساتھ سبزہ و پودے لگوائے ہیں۔ کچھ عرصہ تک ایک مالی کو رکھ کر اس کو بھی مسجد سے تنخواہ ادا کرتا رہا ہے اب مالی کی چھٹی کردی گئی ہے جس سے وہ سبزہ وغیرہ خشک ہو رہے ہیں۔ اب حل طلب مسئلہ یہ ہے کہ مسجد کی رقم سے سبزہ پودے وغیرہ لگانا اور مالی کو تنخواہ دینا جائز ہے؟ اور وہ متولی مسجد اللہ کے ہاں مجرم ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... مسجد میں سبزہ و پودے لگانے سے مسجد کا ماحول پر رونق وخوشگوار بنتا ہے۔ اس لئے یہ مصالح مسجد میں داخل ہے اور اس کیلئے مالی رکھنا اور اس کو مسجد کی رقم سے تنخواہ دینا درست ہے، مسجد کے مصارف میں تعاون کرنے والوں کی طرف سے دلالۃً اس کی اجازت ہوتی ہے۔ لیکن اس میں اعتدال کو ملحوظ رکھنا چاہئے، اسراف ہرگز نہ کرنا چاہئے۔

لما في الولوالجية(۳/۸۸): رجل غرس في المسجد ههنا اربع مسائل احداها هذه: (بعد ثلاثة اسطر) ففي المسئلة الاولى: الشجر يكون للمسجد، لانه بمنزلة بناء المسجد.

وفي الخانية على الهندية (۳/۳۱۰): ولو غرس في المسجد يكون للمسجد لانه لايغرس لنفسه في المسجد...... مسجد فيه شجرة التفاح قال بعضهم يباح للقوم ان يفطروا بهذا التفاح والصحيح انه لايباح لان ذالك صار للمسجد، يصرف الى عمارة المسجد.

(۳۸۲) جوتے پہن کر مسجد میں آنا اور انہی میں نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کوئی آدمی جوتے پہن کر مسجد میں آکر نماز پڑھتا ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟

(۲)۔ گھر وغیرہ میں ان جوتوں میں نماز پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... جوتے اگر ایسے ہوں کہ سجدے میں وہ پیروں کی انگلیاں زمین پر لگنے سے مانع نہ ہوں، اور ناپاک نہ ہوں تو ایسے

جوتوں میں اگر نماز پڑھ لی جائے اگر چہ مسجد میں ہی کیوں نہ ہو، درست ہو جائے گی البتہ آجکل عرفاً یہی مناسب ہے کہ جوتوں کے ساتھ نماز نہ پڑھی جائے کیونکہ آجکل مساجد میں فرش اور قالین ہوتا ہے جوتوں میں نماز پڑھنے کی وجہ سے عام طور پر مسجد کی تلویث کا خطرہ رہتا ہے۔

(۲)۔اسی طرح گھر وغیرہ میں بھی جوتوں میں نماز پڑھنا درست ہے مذکورہ بالاشرائط کے ساتھ۔

لـمافی فتح الملهم(۴/ ۱۲۹): قوله قال نعم،الخ فيه جواز الصلوة فی النعال والخفاف، ای اذا تحقق طهارتها، ويتمكن معها من تمام السجود، بأن يسجد علی جميع اصابع رجليه كما قاله الخطابی.

وفـی الـدر المختارمع رد المحتار(۱/ ٦۵٧): وينبغی لداخله تعاهد نعله وخفه وصلوته فيهما افضل (لا) يـكره. (قوله وصلاته فيهما) ای فی النعل والخف الطاهرين افضل مخالفة لليهود...... قلت لكن اذا خشـی تـلـويـث فـرش المسجد بها ينبغی عدمه وان كانت طاهرة واما المسجد النبوی فقد كان مفروشا بالحصی فی زمنه ﷺ بخلافه فی زماننا الخ.

وفـی الشامية(۱/ ۴۴٧): (قوله وقدميه) يجب اسقاطه لان وضع اصبع واحد منهما يكفی كما ذكره بعدح وأفاد انه لو لم يضع شيئاً من القدمين لم يصح السجود.

وفـی الفقه الاسلامی(۱/ ۵۵۳): السنة لمن اراد دخول المسجد أن يتفقد نعليهويمسح ما فيهما من اذی قبـل دخـولـه لـحـديـث، ((اذا جـاء احـدكـم الـمـسـجـد فـلـينظر فان رأی فی نعليه قذرا اواذی فليمسحه وليصل فيهما.

﴿کتاب الجنائز والشهيد﴾

(نماز جنازہ، تجہیز و تکفین اور شہید سے متعلق مسائل کا بیان)

(۳۸۳) میت کو غسل دیتے وقت کان وناک کے سوراخوں میں روئی رکھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جس وقت میت کو غسل کیلئے تختے پر لٹایا جائے تو پہلے میت کے ناک وکان کے سوراخوں میں روئی کی پھریری رکھنے کا جو دستور ہے اس کا ثبوت ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... ظاہر الروایات سے تو اس کا ثبوت نہیں ملتا لیکن غیر ظاہر الروایت میں امام ابوحنیفہؒ سے ایک قول مروی ہے کہ عند الغسل روئی کی پھریری میت کے اعضائے مذکورہ میں رکھ دے۔

لمافی الدر المختار(۲/۱۹۸): ولا بأس بجعل القطن علی وجهه وفی مخارقه کدبر وقبل واذن وفم.

وفی الشامیة(۲/۱۹۸): (قوله ولا باس الخ) کذا فی الزیلعی واشار الی ان ترکه اولیٰ قال فی الفتح ولیس فی الغسل استعمال القطن فی روایات الظاهرة وعن ابی حنیفة انه یجعل فی منخریه وفمه وقال بعضهم فی صماخه ایضاً وقال بعضهم فی دبره ایضاً قال فی الظهیریة واستقبحه عامة العلماء لکن فی الحلیة انه منقول عن الشافعی وابی حنیفة فاطلاق انه قبیح لیس بصحیح الخ.

(۳۸۴) میت کو غسل دیتے وقت سر کے مسح کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت کو غسل دیتے وقت سر کا مسح کرنا بھی سنت ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صحیح قول کے مطابق میت کو غسل سے پہلے وضو کراتے وقت اس کے سر پر مسح کیا جائے گا۔

لمافی الدر المختار(۲/۱۹٦): ویبدأ بوجهه ویمسح رأسه. وقال الشامی تحت قوله یمسح رأسه ای فی الوضوء وهو ظاهر الروایة کالجنب بحر.

وفی الهندیة(۱/۱۵۸): الفصل الثانی فی الغسل...... واختلفوا فی مسح رأسه والصحیح انه یمسح رأسه......

(۳۸۵) میت کو غسل دینے کے بعد اگر نجاست خارج ہوجائے تو غسل کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر میت کو کفن دینے کے بعد کوئی نجاست خارج ہو تو کیا اسے دوبارہ غسل دیا جائے گا یا یہی غسل کافی ہے اور صرف نجاست کو دھو دیا جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں دوبارہ غسل دینے کی ضرورت نہیں پہلے والا غسل کافی ہے صرف محل نجاست کو دھو لیا جائے جہاں پر نجاست لگی ہے اس مقام کو دھولیا جائے۔

لمافی الهندية (۱/۱۵۸): ويمسح بطنه مسحاً رفيقاً تحرزاً عن تلويث الكفن فان خرج منه شئ غسله ولا يعيد غسله ولا وضوءه ثم ينشفه بثوب كيلا تبتل اكفانه الخ.

وفي ملتقى الابحر (۱/۱۵۶): فان خرج منه شئ غسله ولا يعيد غسله ولا وضوءه وينشفه بثوب الخ.

وفي الدر المختار مع الشامية (۲/۱۹۷): ولا يعاد غسله ولا وضوءه بالخارج منه لان غسله ماوجب لرفع الحدث لبقائه بالموت بل لتنجسه بالموت كسائر الحيوانات الدموية الا ان المسلم يطهر بالغسل كرامة له وقد حصل بحر.

وفي الشامية تحته: (قوله وقد حصل) اى الغسل وبطرو النجاسة بعده لايعاد بل يغسل موضعها.

(۳۸۶) کوئی شخص کسی حادثہ میں مرجائے اور اعضاء متفرق ہوجائیں تو غسل کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص آگ میں جھلس کر مرگیا اس کے بعض اعضاء ٹکڑے ٹکڑے ہوکر بکھر گئے اور بعض راکھ بن گئے۔ اسی طرح سے ایک شخص گاڑی کے ایکسیڈنٹ میں جان بحق ہوگیا اور اس کے بھی اعضاء اس حادثے میں بکھر گئے کچھ پتہ نہیں چل رہا کہ اس کا سر کہاں ہے؟ ایسے اشخاص کے بارے میں غسل اور ان کی نمازِ جنازہ کا شریعت میں کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اگر میت کے جسم کے اکثر اعضاء یا آدھا جسم سر کے ساتھ موجود ہو تو اس صورت میں اس کو غسل بھی دیا جائے گا اور اس پر نمازِ جنازہ بھی پڑھی جائے گی لیکن اگر میت کا آدھا جسم بغیر سر کے یا آدھے سے بھی کم جسم (اگرچہ سر کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو) پایا گیا تو اس کو نہ ہی غسل دیا جائے گا اور نہ ہی اس پر نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی۔ بلکہ اس کو یونہی دفن کردیا جائے گا۔

لمافی الهندية (۱/۱۵۹): ولو وجد اكثر البدن او نصفه مع الراس يغسل ويكفن ويصلى عليه كذا في المضمرات.......... وان وجد نصفه من غير الرأس او وجد نصفه مشقوقاً طولاً فانه لايغسل ولا

يصلى عليه ويلف فى خرقة ويدفن فيها كذا فى المضمرات.

وفى الدر المختار و رد المحتار (۱۹۹/۲): (وجد رأس آدمى) او احد شقيه (لايغسل ولا يصلى عليه) بل يدفن الاان يوجد اكثر من نصفه ولو بلا رأس الخ.

وفى الشامية تحته: (قوله ولو بلا رأس) وكذا يغسل لو وجد النصف مع الرأس بحر.

(۳۸۷) عورت کی میت کونہلاتے وقت اس کے ستر کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مُردہ عورت کونہلاتے وقت پورے بدن پر کپڑا ڈالنا ضروری ہے یا مرد کی طرح صرف گھٹنوں اور ناف تک چھپانا کافی ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں عورت کوعورت سے اس قدر پردہ ہے جتنا مرد کومرد سے اس لئے عورت کونہلاتے وقت صرف ناف سے زانو تک کپڑا ڈالنا کافی ہے۔

لمافى الدر المختار (۱۹۵/۲): عبارة الزيلعى حتى يغسل وعبارة النهر قبل غسله (وتستر عورته الغليظة فقط على الظاهر) من الرواية (وقيل مطلقا) الغليظة والخفيفة (وصحح) صححه الزيلعى وغيره (ويغسلها تحت خرقة) السترة (بعد لف) خرقة (مثلها على يديه)

وفى الشامية تحته: (قوله صححه الزيلعى وغيره) والاوّل صححه فى الهداية وغيرها لكن قال فى شرح المنية ان الثانى هو المأخوذ به لقوله عليه الصلوة والسلام لعلى "لاتنظر الى فخذ حى ولا ميت" لان ماكان عورة لا يسقط بالموت...... وهذا شامل للمرأة والرجل لان عورة المرأة للمرأة كالرجل للرجل.

(۳۸۸) عورت کوکفن دیتے وقت بالوں کو کس طرح رکھا جائے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کفن کے وقت عورت کے سر کے بالوں کو کیسے رکھا جائے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں عورت کے سر کے بالوں کو دو حصے کر کے سینہ کے اوپر دائیں بائیں رکھا جائے۔

وفى الهندية (۱۶۱/۱): ويجعل شعرها ضفيرتين على صدرها فوق الدرع.

وفى الدر المختار (۲۰۴/۲): ويجعل شعرها ضفيرتين على صدرها فوقه اى الدرع.

(۳۸۹) آبِ زمزم سے احرام کی چادریں دھو کر کفن کے لئے رکھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے میری خالہ جو کہ میری ساس بھی ہیں نے ایک نصیحت کی ہے کہ بیٹا اس سال آپ حج پر جارہے ہو، اپنے احرام کو مائے زمزم میں ضرور دھولینا، اور پھر آ کر اس کو محفوظ کر کے کفن کی نیت سے رکھ لینا، کیا اس طرح کرنا بدعت تو نہیں ہوگا؟ اور اس میں کوئی شرعی مانع تو نہیں ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اپنے لئے مرنے سے پہلے کفن تیار کرنا اور اسی طرح مقدس چیزوں سے تبرک حاصل کرنا شرعاً جائز ہے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ احرام کی چادروں کو آبِ زمزم سے دھو کر اپنے کفن کے لیے رکھ سکتے ہیں، نہ یہ بدعت میں شامل ہے اور نہ اس میں کوئی شرعی مانع ہے۔

لمافی مرقاة المفاتیح(۱۰۶/۴): وعن عبدالله بن عباس قال ان رجلا کان مع النبی ﷺ فوقصته ناقته وهو محرم فمات فقال رسول الله ﷺ((اغسلوه بماء سدر وکفنوه فی ثوبیه ولا تمسوه بطیب ولا تخمّروا راسه فانه یبعث یوم القیامة ملبّیا)) متفق علیه. وقد قال علیه الصلوة والسلام فی ذلک المحرم کفنوه فی ثوبیه وهما ثوبا احرامه ازاره ورداؤه ومعلوم ان ازاره من الحقو وکذا حدیث ام عطیة.

وفی عمدة القاری(۸/۶۳ ـ ۶۱): (باب من استعد الکفن فی زمن النبی ﷺ فلم ینکر علیه) واستفید من ذلک جواز تحصیل مالا بد للمیت منه من کفن ونحوه فی حال حیاته لان افضل ماینظر فیه الرجل فی الوقت المهمل وفسحة الاجل الاعتداد للمعاد. وفیه التبرک بآثار الصالحین وفیه جواز اعداد الشئ قبل وقت الحاجة الیه.

وفی فتح الباری(۳/۱۱ـ۸ـ۱۰۷): (قوله باب الکفن فی القمیص الذی یکف اولایکف)......وکذا رایته فی اصل ابی القاسم بن الورد قال والذی یظهر لی ان البخاری لحظ قوله تعالیٰ استغفر لهم اولا تستغفر لهم ای ان النبی ﷺ البس عبدالله بن ابی قمیصه سواء کان یکف عنه العذاب اولا یکف استصلاحا للقلوب المولفة فکأنه یقول یوخذ من هذا التبرک بآثار الصالحین سواء علمنا انه مؤثر فی حال المیت اولا.

واستنبط منه الاسما عیلی جواز طلب آثار اهل الخیر منهم للتبرک بها وان کان السائل غنیا فیستفاد منه جواز تحصیل مالا بدللمیت منه من کفن ونحوه فی حال حیاته.

(۳۹۰) نمازِ جنازہ کی ترتیب اور تکبیرات کا حدیث سے ثبوت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نمازِ جنازہ پڑھنے کی ترتیب کیا ہوگی؟ نیز بتائیں تکبیریں چار ہیں یا پانچ؟ حدیث سے چار کا ثبوت ملتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... نمازِ جنازہ میں چار تکبیرات ہوتی ہیں، پہلی تکبیر کہہ کر **سبحانک اللّٰھم** الخ پڑھا جائے پھر دوسری تکبیر کہہ کر درود شریف پڑھا جائے، پھر تیسری تکبیر کہہ کر میت کیلئے دعا پڑھی جائے اور تمام مسلمانوں کیلئے دعا کی جائے اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے **اللھم اغفر لحینا ومیتنا الخ** ثابت ہے۔ اور اگر میت چھوٹا بچہ ہے تو دعا میں **اللھم اجعله لنا فرطاً وجعله لنا اجراً وذخراً واجعله لنا شافعاً ومشفعاً** پڑھے، اور اگر چھوٹی بچی ہو تو **اللھم اجعلھا لنا فرطاً الخ** پڑھے پھر چوتھی تکبیر کہہ کر دونوں طرف سلام پھیر دے، اور جنازے میں چار تکبیروں کا ثبوت حضرت ابو ہریرۃؓ، عبداللہ بن ابی اوفیٰ، حضرت جابرؓ، حضرت انسؓ اور یزید بن ثابتؓ کی احادیث سے ہوتا ہے، نیز حضرت ابن عباسؓ کی حدیث سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔

لما في الترمذی (۱۹۸/۱): لما جآء عن ابی هريرةؓ: أن النبی ﷺ صلى على النجاشی فكبر اربعاً، وفی الباب عن ابن عباسؓ وابن ابی اوفیٰ وجابرؓ وانسؓ ويزيد بن ثابت...... قال ابو عيسیٰ حديث ابی هريرةؓ هذا حديث حسن صحيح"

وفی الهندية(۱۶۴/۱): وصلاة الجنازة اربع تكبيرات ولو ترک واحده منها لم تجز صلاته هكذا فی الكافی فيكبر للافتتاح ويقول سبحانک اللهم الخ ثم يكبر اخرىٰ ويصلّی علی النبی ﷺ ثم يكبر أخرىٰ ويدعو للميت وجميع المسلمين وليس فيها دعآء موقت وعن رسول الله ﷺ انه كان يقول، اللهم اغفر لحينا وميتنا الخ فان كان الميت صغيراً عن ابی حنيفةؒ انه يقول اللهم اجعله لنافرطاً الخ...... ثم يكبر الرابعة ثم يسلم تسليمتين.

وفی الدر المختار مع التنوير (۲۱۲/۲): وهی اربع تكبيرات كل تكبيرة قائمة مقام ركعة يرفع يديه فی الأولىٰ فقط...... ويثنی بعدها وهو سبحانک اللهم وبحمدک" ويصلی علی النبی ﷺ كما فی التشهد بعد الثانية...... ويدعو بعد الثالثة...... ويسلّم بلا دعاء بعد الرابعة".

(۳۹۱) نمازِ جنازہ کی ثناء میں اور درود شریف میں زیادتی کا حدیث سے ثبوت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نمازِ جنازہ میں جو ثناء پڑھی جاتی ہے جس میں وجل ثناؤک کی زیادتی ہے اسی طرح درود شریف میں زیادتی ہے، آیا یہ حدیث سے ثابت ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......ثناء کے متعلق جو مشہور روایات ہیں ان میں وجل ثناؤک کے الفاظ نہیں ہیں، اسی طرح درود شریف میں بھی کوئی زیادتی نہیں ہیں لیکن بعض شاذ روایات میں یہ زیادتی موجود ہے، لہٰذا اگر کہہ دی جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

لمافی فتح القدیر(۱/۲۹۰): وان كان روى فى الجملة عن ابن عباس فى حديث طويل من قوله وذكره ابن ابى شيبة وابن مردوية فى كتاب الدعا له ورواه الحافظ ابو شجاع فى كتاب فردوس عن ابن مسعودؓ ان من أحب الكلام الى الله عزوجل ان يقول العبد سبحانك اللهم وبحمدك و تبارك إسمك وتعالى جدك وجل ثناؤك ولا اله غيرك وابغض الكلام الى الله ان يقول الرجل للرجل اتق الله فيقول عليك نفسك.

وفى فتح القدير(۱/۳۱۷): وروى البيهقى عن يحيى بن السباق عن رجل من بنى الحارث عن ابن مسعود عنه ﷺ اذا تشهد أحدكم فى الصلاة فليقل اللهم صل على محمد وعلى آل محمد وبارك على محمد وعلى آل محمد وارحم محمدا وآل محمد كما صليت وباركت وترحمت على ابراهم وعلى آل ابراهم إنك حميد مجيد.

(۳۹۲) نمازِ جنازہ مکروہ اوقات میں پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نمازِ جنازہ کن کن اوقات میں مکروہ ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......نمازِ جنازہ کا پڑھنا سورج کے طلوع وغروب کے وقت اور عین دوپہر کے وقت مکروہ ہے البتہ جنازہ اُسی وقت تیار ہو جائے تو صحیح ہے۔

لمافی نور الایضاح(ص۵۷): ثلاثة أوقات لايصح فيها شيئ من الفرأض والواجبات التى لزمت فى الذمة قبل دخولها عند طلوع الشمس الى ان ترتفع وعند استوائها إلى ان تزول وعند اصفرارها إلى أن تغرب ويصح أداء ماوجب فيها مع الكراهة. كجنازة حضرت وسجدة آية تليت فيها كما صح عصر اليوم عند الغروب مع الكراهة.

وفى الهندية(۱/۵۲): ثلاث ساعات لا تجوز فيها المكتوبة ولا صلاة الجنازة ولا سجدة تلاوة...... أما لو وجبتا فى هذا الوقت واديتا فيه جاز لأنها أديت ناقصة كما وجبت. كذا فى السراج الوهاج.

وفى الشامية(۱/۳۷۴): (قوله وصلاة جنازة) فيه أنها تصح مع الكراهة كمافى البحر...... (قوله فلو وجبتا فيها)، أى بأن تليت الآية فى تلك الأوقات أو حضرت فيها الجنازة، قوله أو تحريما) افاد ثبوت الكراهة التنزيهية اهـ.

(۳۹۳) نماز جنازہ میں تکبیرات چھوٹنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نمازِ جنازہ مکروہ وقت میں پڑھنا کیسا ہے؟ نیز اگر نماز جنازہ میں کسی کی کچھ تکبیرات چھوٹ جائیں تو اب وہ انہیں کیسے ادا کرے گا؟

الجواب حامداًومصلیاً......(۱)۔نمازِ جنازہ اگر مکروہ وقت میں حاضر ہوجائے اس کو مکروہ وقت میں پڑھنے میں کوئی قباحت نہیں اور اگر جنازہ مکروہ وقت سے پہلے حاضر کردیا جائے پھر اس کو مکروہ وقت میں ادا کرنا جائز نہیں۔

(۲)۔اگر نمازِ جنازہ میں کسی کی کچھ تکبیریں چھوٹ جائیں تو وہ ان کو امام کے سلام پھیرنے کے بعد ادا کرے گا پھر اگر جنازہ اٹھائے جانے کا خوف نہ ہو تو تکبیرات کے ساتھ ساتھ دعا ماثورہ وغیرہ بھی پڑھنی چاہئے اور اگر جنازہ اٹھائے جانے کا خوف ہو تو پھر صرف تکبیرات کہہ لے دعاوغیرہ نہ پڑھے۔

لمافی الشامية(۱/۳۷۳): واعلم أن الاوقات المكروهة نوعان: الأول الشروق والاستواء والغروب، والثانی مابين الفجر والشمس وما بين صلاة العصر الى الاصفرار. فالنوع الأول لاينعقد فيه شئ من الصلوات التی ذكرناها اذا شرع بها فيه وتبطل ان طرأعليها الاصلاة جنازة حضرت فيها و سجدة تليت آيتها فيها وعصر يومه و النفل والنذر المقيدبها وقضاء ماشرع به فيها ثم افسده فتنعقد هذه الستة بلا كراهة أصلا فی الأولىٰ منها، ومع الكراهة التنزيهية فی الثانية والتحريمية فی الثالثة وكذا فی البواقی.

وفی الدر المختار(۲/۲۱۷): (فلوجاء) المسبوق (بعد تكبيرة الامام لرابعة فاتته الصلاة) لتعذر الدخول فی تكبيرة الامام وعند ابی يوسف يدخل لبقاء التحريمة فاذا سلم الامام كبر ثلاثا كمافی الحاضر وعليه الفتوى.

(۳۹۴) نماز جنازہ میں امامت کا زیادہ مستحق کون ہے؟ اور عصبہ کا شرعی معنی

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جنازہ کی نماز میں امامت کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟ عصبہ کا شرعی معنی کیا ہے ان کی ترتیب کیا ہے وہ کتنے افراد پر مشتمل ہے نیز اگر کسی شخص کا دوسرے شہر میں انتقال ہوجائے تو اس میت کو اپنے وطن اصلی میں لاکر دفن کرنا، نماز پڑھنا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......نماز جنازہ کی امامت میں سب سے مستحق بادشاہ یا اس کا نائب ہے بشرطیکہ یہ موجود ہوں اور اگر یہ موجود نہ ہوں تو قاضی اس کے بعد شہر کا امیر ہے اگر امیر شہر نہ ہو تو اس کا نائب یعنی قائم مقام اور اگر یہ نہ ہو تو پھر قاضی کا خلیفہ اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر امامت کا

زیادہ استحقاق میت کے محلے کی مسجد کے امام کو حاصل ہے اوراس کے بعد میت کا ولی قریب نکاح میں ولایت کی ترتیب کی طرح یعنی اولاً میت کے سب سے زیادہ قریب کو درجہ بدرجہ آخر تک جس کی تفصیل ذیل میں ذکر کی جاتی ہے۔

(2)......شریعت میں عصبہ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کیلئے کوئی متعین حصہ مال وراثت میں مقرر نہ کیا گیا ہو بلکہ ذوی الفروض (جن کے متعین حصے بیان کیے گئے ہیں) کے حصے سے جو مال بچ جائے ان کو ملتا ہو، البتہ جب ذوی الفروض نہ ہوں تو سارا مال ان کو ملتا ہو پھر عصبہ کی دو قسمیں ہیں۔(۱)۔عصبہ بالنسب، (۲)۔عصبہ بالسبب اور عصبہ بالنسب کی تین قسمیں ہیں۔(۱)۔عصبہ بنفسہ، (۲)۔عصبہ بغیرہ، (۳)۔عصبہ مع غیرہ۔اب مذکورہ بالا اقسام میں جنازہ کی امامت میں عصبہ بنفسہ کا اعتبار ہوتا ہے جس کی چار قسمیں ہیں۔

(۱)۔میت کا جزء جیسے بیٹا، (۲)۔میت کا اصل جیسے باپ، (۳)۔میت کے باپ کا جزء جیسے میت کا بھائی

(۴)۔میت کے باپ کے باپ کا جز جیسے میت کا چچا۔

(3)......اگر کسی شخص کا انتقال دوسرے شہر میں ہو جائے تو بہتر یہی ہے کہ اسی شہر میں دفن کر دیا جائے البتہ اگر میت کو اپنے وطن میں واپس لا کر اپنے وطن میں دفن کیا جائے تب بھی شرعاً جائز ہے البتہ ایسا کرنا مکروہ ہوگا۔

لما فی اعلاء السنن(۸/۲۵۱): عن الحسین بن علی(مرفوعا) "اذا حضرت الجنازة فالامام احق بالصلاة علیها عن غیره، رواه ابن منیع.

وفی القدوری(ص۳۹):واولی الناس بالامامة علیه السلطان ان حضر فان لم یحضر فیستحب تقدیم امام الحی ثم الولی.

وفی الشامیة(۲/۲۳۹): (قوله ولا بأس بنقله قبل دفنه) قیل مطلقا، وقیل الیٰ مادون مدة السفر وقیده محمد بقدر میل اومیلین لان مقابر البلد ربما بلغت هذه المسافة فیکره فیمازاد قال فی النهر عن عقد الفرائد وهو الظاهر واما نقله بعد دفنه فلا مطلقا.

وفی الدر المختار (۳/۷۶): (الولی فی النکاح العصبة بنفسه) وهو من یتصل بالمیت حتی المعتقة وفی الشامیة تحته: (قوله العصبة بنفسه) خرج به العصبة بالغیر کالبنت تصیر عصبة بالا بن ولا ولایة لها علی امها المجنونة وکذا العصبة مع الغیر کالاخوات مع البنات ولا ولایة للاخت علی اختها المجنونة.

وفی مراقی الفلاح مع الطحطاوی (ص۶۰۵): (فان نقل قبل الدفن قدر میل اومیلین) ونحوذلک (لابأس به) لان المسافة الی المقابر قد تبلغ هذا المقدار (وکره نقله لأکثرمنه) ای اکثر من المیلین کذا فی الظهیریة وقال شمس الائمة السرخسی: وقول محمد فی الکتاب لابأس ان ینقل المیت قدر میل اومیلین بیان ان النقل من بلد الی بلد مکروه قاله قاضیخان وقد قال قبله لومات فی غیر

بلدة يستحب تركه فان نقل الى مصر آخر لابأس به لما روى ان يعقوب صلوات الله عليه مات بمصر ونقل الى الشام وسعد بن ابى وقاص مات فى ضيعة على اربعة فراسخ من المدينة ونقل على اعناق الرجال الى المدينة قلت: يمكن الجمع بان الزيادة مكروهة فى تغير الرائحة اوخشيتها وتنتفى بانتفائها لمن هو مثل يعقوب عليه السلام او سعدؓ لانهما من احياء الدارين (قوله أى اكثر من الميلين) كثرة فاحشة اما الزيادة عليهما بقدر يسير فلا تضرفلا ينافى قوله قبل ونحوذلك (قوله بيان ان النقل من بلد الى بلد مكروه) اى تحريما لان قدر الميلين فيه ضرورة ولا ضرورة فى النقل الى بلد آخر وقيل: يجوز ذلك الى مادون مدة السفر وقيل فى مدة السفر ايضاً كذا فى حلبى وفيه ان كلام محمد مطلق عن قيد لضرورة وايضا لاتظهر الكراهة فى نقله من بلد الى بلد الا اذا كانت المسافة اكثر من ميلين ......قوله(فان نقل الى مصرآخر لابأس به) وظاهره عدم كراهة النقل من بلد الى بلد مطلقا، قوله (لما روى ان يعقوب الخ) وموسىٰ عليه السلام نقل تابوت يوسف عليه السلام من مصر الى الشام بعد زمان قوله (قلت الخ) اصله للكمال فانه قال فى رده كلام صاحب الهداية فى التجنيس انه لا اثم فى النقل من بلد الى بلد لما نقل ان يعقوب الخ مانصه ان ذلك شرع من قبلنا ولم تتوفرفيه شروط كونه من شرعنا ولان اجساد الانبياء عليهم السلام اطيب مايكون حال الموت كالحياة والشهداء كسعد رضى الله عنه ليسوا كغيرهم ممن جيفتهم اشد نتنامن جيفة البهائم فلا يلحق بهم.

(۳۹۵) نومولود جورویانہیں اورتین گھنٹے بعدمرگیااس کی نمازجنازہ کاحکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک بچہ پیدا ہوااورروپا بھی نہیں تین گھنٹے کے بعدفوت ہوگیا کیااس پرنمازِ جنازہ پڑھی جائے گی؟

الجواب حامداًومصلیاً......صورت مسئولہ میں بچہ جب زندہ پیدا ہوایعنی اس میں ایسے اثرات تھے، جواس کی زندگی پردلالت کرتے ہوں، مثلاً کھانسے، جمائی لے، روئے یاکسی اندام کوحرکت دے (صرف نفس اندام کے سمیٹنے اور پھیلانے کااعتبارنہیں ہے) پھرفوت ہواتواس پرنماز جنازہ پڑھی جائے گی۔

لمافى الشامية مع الدر المختار (۲/۲۲۷): ومن ولد فمات يغسل ويصلى عليه، قوله أى وجد منه مايدل على حياته أى من بكاء أو تحريك عضو أو طرف ونحوذلك بدائع، وهذا معناه فى الشرع كمافى البحر: وقال فى الشرنبلالية: يعنى الحياة المستقرة، ولا عبرة لانقباض وبسط اليد وقبضها.

لأن هذه الاشياء حركة المذبوح ولا عبرة بها الخ.

(۳۹۶) مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھنا اور اس کی جائز صورتیں کون کون سی ہیں؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اکثر یہاں دیکھا جاتا ہے کہ جنازہ محراب کے اندر رکھ کر محراب کے سرے پر امام کھڑے ہو جاتے ہیں اور مقتدی حضرات مسجد میں صف آرا ہوتے ہیں بعد میں نماز جنازہ پڑھادی جاتی ہے، کیا یہ طریقہ صحیح ہے اور عذر یہ پیش کیا جاتا ہے کہ جگہ کی کمی کی وجہ سے ایسا کرنا پڑتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... نمازِ جنازہ مسجد میں پڑھنے کی تین صورتیں ہیں احناف کے نزدیک تینوں مکروہ ہیں، البتہ ایک صورت کو احناف نے مستثنیٰ کیا وہ یہ ہے کہ جنازہ باہر ہو، اور امام اور بعض افراد بھی باہر ہوں، تو جائز ہے کیونکہ علت عدم جواز نہیں پائی جاتی ہے اور اس کے علاوہ باقی صورتیں ناجائز ہیں۔

لما في الهندية (۱/۱۶۵): وصلاة الجنازة في المسجد الذي تقام فيه الجماعة مكروهة. سواء كان الميت والقوم في المسجد او كان الميت خارج المسجد والقوم في المسجد او كان الامام مع بعض القوم خارج المسجد والقوم الباقي في المسجد او الميت في المسجد والامام والقوم خارج المسجد، هو المختار كذا في الخلاصة ولاتكره بعذر المطر ونحوه الخ.

وفي شرح العناية على هامش فتح القدير (۲/۱۲۸): وان كانت الجنازة والامام وبعض القوم خارج المسجد. والباقي فيه لم تكره بالاتفاق الخ.

(۳۹۷) جو شخص جل گیا صرف ہڈیاں رہ گئیں تو اس پر نمازِ جنازہ پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص جل گیا گوشت پوست وغیرہ سب کچھ ختم ہو گیا صرف ہڈیاں باقی رہ گئیں ڈھانچہ بالکل ختم ہو گیا اس پر جنازہ وغیرہ کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صرف ہڈیوں پر نماز جنازہ پڑھنا جائز نہیں اس لئے کہ نمازِ جنازہ پورے جسم یا جسم کے اکثر حصہ پر مشروع ہے اور پورا جسم گوشت پوست ہڈیوں کے مجموعہ کا نام ہے صرف ہڈیوں کو جسم اور بدن نہیں کہا جاتا۔ جیسا کہ صاحب بحر علامہ ابن نجیم کی عبارت سے سمجھ میں آتا ہے کہ اگر بدن پھولا پھٹا نہ ہو بدن سلامت ہو تو پھر قبر کے سامنے میت پر نمازِ جنازہ پڑھا جائے گا اگر پھول پھٹ جائے تو پھر اس پر جنازہ نہیں پڑھا جائے گا اس لئے کہ وہ پھر پورے بدن کے حکم میں نہیں ہوتا بلکہ اعضاء کے حکم میں ہوتا ہے۔

وفي البحر الرائق (۲/۱۸۲): لأنه لا يصلى عليه بعد التفسخ لان الصلوة شرعت على بدن الميت فاذا تفسخ لم يبق بدنه قائماً.

مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ امداد الاحکام (۸۳۰/۱) میں اس قسم کے سوال کے بارے میں لکھتے ہیں:

قلت والظاهر ان البدن يطلق على مجموع اللحم والعظام لا على العظام وحدها.

خیر الفتاویٰ (۲۷۸/۳) پر ہے: ''ہڈیوں کے ڈھانچے پر نمازِ جنازہ پڑھنا جائز نہیں ......الخ۔''

(۳۹۸) خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں میں ایک عورت اپنے آشنا کے ساتھ شہر فرار ہوگئی، اب اس کے بھائی وغیرہ کو لوگ عار دلاتے ہیں اور مختلف طعنے دیتے ہیں۔ گزشتہ روز اس عورت کے بھائی نے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کرلی ہے۔ کیا اس شخص کی نماز جنازہ میں شرکت کرنا شرعاً درست ہے؟ اور گاؤں والوں کا اس عورت کے گھر والوں کو اس طرح طعنہ وغیرہ دینا از روئے شریعت کیسا ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً...... صورت مسئولہ میں ایسے شخص کی نمازِ جنازہ ادا کی جائے گی مگر اس نمازِ جنازہ میں اہلِ علم وفضل کا شریک ہونا مناسب نہیں ہے خواہ مقتدی کی حیثیت سے ہو یا امام کی حیثیت سے، گاؤں والوں کا اس طرح طعن وتشنیع کرنا از روئے شرع ناجائز ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں ایسے طعنہ دینے والوں کیلئے دردناک عذاب کی وعید سنائی ہے۔

لمافی القرآن الكريم(النور: ۱۹): **ان الذين يحبون ان تشيع الفاحشة فى الذين امنوا لهم عذاب اليم فى الدنيا والاخرة والله يعلم وانتم لاتعلمون.**

وفى الشامية (۲۱۱/۲، ۲۱۲): قد يقال **لادلالة فى الحديث على ذلك لأنه ليس فيه سوى أنه عليه الصلاة والسلام لم يصل عليه،** فالظاهر أنه امتنع **زجرا لغيره عن مثل هذا الفعل** كما امتنع عن الصلاة على المديون ولا يلزم من ذلك عدم صلاة **أحد عليه من الصحابة، اذا لا مساواة بين صلاته وصلاة غيره.**

وفى الفقه الاسلامى(۱۵۰۹/۲): ومن **قتل نفسه عمداً يغسل ويصلى عليه، على المفتى به عند الحنفية وعند الشافعية** وان كان اعظم وزراً **من قاتل غيره لأنه فاسق غير ساع فى الأرض بالفساد وان كان باغياً على نفسه** كسائر فساق المسلمين. **ورأى قوم كابى يوسف وابن الهمام انه لا يصلى عليه لما فى صحيح مسلم** انه عليه السلام **اتى برجل قتل نفسه فلم يصل عليه......**

وقال المالكية ايضاً وينبغى لاهل الفضل **ان يجتنبوا الصلاة على المبتدعة ومظهرى الكبائر ردعاً لامثالهم**

(۳۹۹) نومولود بچی کو جان بوجھ کر مار دینے کے بعد بغیر جنازہ پڑھے دفنا دیا اس پر جنازہ پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے دوست کے گھر لڑکی پیدا ہوئی، لڑکی تو زندہ پیدا ہوئی لیکن اس کو جان بوجھ کر مارا گیا اور اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھائی، اب اس کا کیا حکم ہے؟ مفصل ومدلل جواب تحریر فرمائیں مع حوالہ جات۔

الجواب حامداً ومصلیاً......مذکورہ واقعہ کو پڑھ کر بہت افسوس ہوا کہ ایک مسلمان نے ایسی حرکت کی، جس کے سبب وہ حیوانیت کو بھی پیچھے چھوڑ گیا۔ بچیوں کو مارنا مسلمانوں کا شیوہ نہیں، مشرکین عرب زمانۂ جاہلیت میں بچیوں کو زندہ درگور کرتے تھے اور بچی کی پیدائش کو عار سمجھتے تھے بلکہ اُس وقت بھی شرفاء عرب یہ حرکت نہیں کرتے تھے، رذیل اور جاہل اس طرح کی حرکتیں کرتے تھے۔ یہ حرکت عملاً کفر اور اللہ تعالیٰ کے فیصلہ سے جو کہ حکیم ذات ہے ناراضگی کا اظہار ہے اس پر توبہ واستغفار کیا جائے اور دل سے ندامت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑایا اور رویا جائے وگرنہ سخت پکڑ کا اندیشہ ہے اگر باپ نے قتل کیا ہے تو دیت بھی لازم ہوگی، اسی طرح نمازِ جنازہ نہ پڑھنے کی وجہ سے جو گناہ لازم آیا اس کیلئے بھی کثرت سے توبہ واستغفار کیا جائے۔

تنبیہ......اگر باپ کے علاوہ کسی اور نے قتل کیا ہے تو قتل کی کیفیت اور وضاحت لکھ کر حکم دریافت کرلیا جائے۔

لما فی القرآن الکریم(بنی اسرائیل: ۳۱):ولاتقتلوا اولادکم خشیة املاق نحن نرزقهم وایاکم ان قتلهم کان خطأً کبیراًo

وفی الدر المختار (۵۳۵،۵۳۴/۶): أی لایقتص الأصول وإن علوا مطلقا ولو إناثا من قبل الأم فی نفس أو أطراف بفروعهم وإن سفلوا لقوله علیه الصلوٰة والسلام((لایقاد الوالد بولده)) وهو وصفٌ معلل بالجزئیة فیتعدی لمن علا لأنهم أسباب فی إحیائه فلا یکون سببا لإفنائهم وحینئذ فتجب الدیة فی مال الاب فی ثلاث سنین لأن هذا عمد والعاقلة لاتعقل العمد.

(۴۰۰) نمازِ جنازہ جوتوں کے ساتھ پڑھنا نیز سلام پھیرتے وقت امام کس کی نیت کریگا

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جنازہ کی نماز جوتوں کے ساتھ پڑھنا کیسا ہے؟ نیز امام کو سلام پھیرتے وقت کس کی نیت کرنی چاہیے میت کی یا دیگر لوگوں کی یعنی مقتدیوں کی؟

الجواب حامداً ومصلیاً......(۱)۔ جنازے کی نماز جوتے پہن کر پڑھنا جائز ہے بشرطیکہ جوتے اور وہ جگہ جہاں کھڑا ہے پاک ہو، اور اگر

جوتے پاؤں سے نکال کراس کے اوپر کھڑا ہوا جائے تو پھر صرف جوتوں کا پاک ہونا ضروری ہے۔
(۲)۔ جنازے کی نماز میں سلام پھیرتے وقت امام مقتدیوں کی نیت کرے گا، میت کی نیت نہیں کرے گا کیونکہ میت خطاب کا اہل نہیں ہے۔

لمافی البحر(۲/۱۷۹): لو قام علی النجاسة وفی رجلیه نعلان لم یجز ولو افترش نعلیه وقام علیهما جازت وبهذا یعلم مایفعل فی زماننا من القیام علی النعلین فی صلاة الجنازة لکن لابد من طهارة النعلین.

وفی الهندیة(۱/۱۶۴): ولاینوی المیت فی التسلیمتین بل ینوی بالاولیٰ من عن یمینه وبالثانیة من عن شماله کذا فی سراج الوهاج.

وفی الدر المختار مع الشامیة(۱/۶۵۷): وصلاته فیهما افضل. (قوله وصلاته فیهما) ای فی النعل والخف الطاهرین افضل مخالفة للیهود تاتارخانیة، وفی الحدیث صلوا فی نعالکم ولا تشبهوا بالیهود.

وفیه ایضاً(۲/۲۱۳): قوله ناویا المیت مع القوم) کذا فی الفتح...... وظاهره أنه ینوی الملئکة الحفظة أیضا ثم رأیته صریحاً فی شرح درر البحار وذکر فی الخانیة والظهیریة والجوهرة انه لا ینوی المیت قال فی البحر وهو الظاهر لأن المیت لا یخاطب بالسلام حتی ینوی به اذ لیس اهلا له وأقره فی النهر.

(۴۰۱) نمازِ جنازہ میں سلام سے پہلے ہاتھ چھوڑنا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نمازِ جنازہ میں سلام ہاتھ چھوڑ کر پھیرنا چاہئے یا پہلے؟
الجواب حامداًومصلیاً...... تکبیرات کے ختم ہونے پر سلام سے پہلے ہاتھ چھوڑ دینے چاہئیں۔

لمافی خلاصة الفتاویٰ(۱/۵۵): والاعتماد سنة وانما یعتمد کما فرغ من التکبیر بالیمنی علی الیسری ......وعند محمد رحمه الله الاعتماد سنة القراء ة حتی اذا فرغ من التکبیر یرسل فاذا شرع فی القراء ة یعتمد وفی القنوت فی الوتر اختلف المشائخ فیه والاصح هو الاعتماد وفی القومة بین الرکوع والسجود یرسل ولایعتمد وکذا فی کل قیام لا ذکر فیه ولا یطول کتکبیرات العیدین وفی صلوة الجنازة یعتمد.

وفی الهندیة (۱/۷۳): کل قیام فیه ذکر مسنون فالسنة فیه الاعتماد کما فی حالة الثناء والقنوت وصلاة الجنازة وکل قیام لیس فیه ذکر مسنون کمافی تکبیرات العیدین فالسنة فیه الارسال کذا فی

النهاية وهو الصحيح كذا فى الهداية فيه كان يفتى شمس الائمة السرخسى.

(۴۰۲) مسبوق اپنی بقیہ رکعات پڑھنے کیلئے کب کھڑا ہو؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱)۔چھوٹی ہوئی رکعتوں والا شخص اپنی نماز پوری کرنے کیلئے کس وقت اٹھے، امام کے ایک طرف سلام پھیرنے کے بعد یا دونوں طرف کے بعد؟

(۲)۔اور نماز جنازہ میں ہاتھ کس وقت چھوڑے جائیں امام کے سلام کہنے سے پہلے یا بعد؟ جوابات دیکر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداًومصلیاً......(۱)۔مسبوق اپنی بقیہ رکعتوں کو ادا کرنے کیلئے اس وقت اٹھے جب امام دوسری جانب سلام پھیر لے۔

(۲)۔نماز جنازہ میں چوتھی تکبیر کے بعد سلام سے پہلے ہاتھ چھوڑ دینے چاہئیں۔

وفى الشامية (۱/۵۹۷): (قوله وينبغى أن يصبر الخ) أى لا يقوم بعد التسلمية أو التسلمتين بل ينتظر فراغ الامام بعدهما كمافى الفيض والفتح والبحر...... قال فى الحلية: وليس هذا بلازم بل المقصود مايفهم أن لا سهو على الإمام أو يوجد له ما يقطع حرمة الصلاة اهـ وقيده فى الفتح بحثاً بما إذا اقتدى بمن يرى سجود السهو بعد السلام أما اذا اقتدى بمن يراه قبل السلام فلا.

وفى خلاصة الفتاوىٰ (۱/۲۲۵): ولا يجوز الاستخلاف ولا يعقد بعد تكبير الرابع لانه لا يبقى ذكر مسنون حتى يعقد فالصحيح أنه يحل اليدين ثم يسلم تسليمتين هكذا فى الذخيرة.

(۴۰۳) امام کا محراب میں کھڑے ہوکر نماز جنازہ پڑھانا

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسجد کے باہر جنازہ رکھا گیا اور امام صاحب محراب کے اندر کھڑے تھے؟ کیا امام صاحب کا محراب میں کھڑے ہوکر نماز جنازہ پڑھانا صحیح ہے؟ اور کیا محراب کا حکم مسجد کا حکم ہے یا مسجد سے خارج ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......نماز جنازہ کیلئے بہتر طریقہ یہ ہے کہ مسجد سے باہر کوئی جگہ الگ مقرر کی جائے اور نماز جنازہ مسجد کی حدود (اگرچہ محراب ہی کیوں نہ ہو) میں پڑھنا مکروہ ہے۔ کیونکہ محراب مسجد کے حکم میں ہے البتہ اگر کوئی عذر مثلاً جگہ کی تنگی وغیرہ ہو تو اُس صورت میں بہتر یہ ہے کہ امام کچھ مقتدیوں کے ساتھ محراب کے باہر کھڑے ہوکر نماز جنازہ پڑھا سکتا ہے۔

لمافى الدر المختار (۲/۲۲۵): (واختلف فى الخارجة) عن المسجد وحده أو مع بعض القوم (والمختار الكراهة) مطلقا خلاصة بناء على أن المسجد انما بنى للمكتوبة الخ.

(صـ۲۲۶) وقال الشامی رحمه الله تعالیٰ تحته: إنما تكره فی المسجد بلا عذر، فإن كان فلا

(۴۰۴) دوبارہ نمازِ جنازہ پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جب یہاں پر کوئی میت ہوتی ہے تو بسا اوقات اس کو گاؤں لے جاتے ہیں۔ کبھی میت کے ''ولی'' بیٹا وغیرہ یہاں بھی ہوتے ہیں اور گاؤں میں بھی ہوتے ہیں تو آیا شریعت کی روشنی میں میت کا دوبارہ جنازہ پڑھانا کیسا ہے؟ جبکہ یہاں پر بھی بیٹے نے نمازِ جنازہ پڑھائی ہو، اور وہاں پر بھی بیٹا ہے جس نے جنازہ نہیں پڑھا ہے۔ مفصل بیان فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......مسلمان میت پر اس کے ولی بیٹے وغیرہ کے ہوتے ہوئے ایک مرتبہ نماز جنازہ پڑھ لی جائے تو دوبارہ (چاہے ولی موجود ہو یا نہ ہو) نمازِ جنازہ نہیں پڑھنی چاہئے، اس لئے کہ ایک مرتبہ نمازِ جنازہ پڑھنے سے فرض ساقط ہو جاتا ہے۔

لما فی فتاویٰ الهندية (۱۶۴/۱): وإن صلى عليه الولی لم يجز لأحد أن يصلى بعده ولو أراد السلطان أن يصلى عليه فله ذلك لانه مقدم عليه ولو صلى عليه الولی وللميت اولياء أخر بمنزلته ليس لهم أن يعيدوا كذا فی الجوهرة النيرة.

وفی رد المحتار (۲۲۳/۲): فإن صلى غير الولی او السلطان أعاد الولی لأن الحق للأولياء وان صلى الولی لم يجز لأحد أن يصلى بعده ونحوه فی الكنز وغيره فقوله لم يجز لأحد يشمل السلطان ثم رأيت فی غاية البيان قال مانصه هذا على سبيل العموم حتى لا تجوز الإعادة لا للسلطان ولا لغيره.

(۴۰۵) قبر کے اندر صحیح سلامت نعش نکل آئے تو اس پر دوبارہ نماز جنازہ پڑھنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قبر کھودتے وقت قبر کے اندر سے صحیح سلامت نعش نکل آئے تو اس پر دوبارہ نماز جنازہ پڑھی جائے گی یا نہیں اسی طرح اس کو غسل دیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......میت کو دفن کرنے کے بعد نہ نکالا جائے ہاں اگر کسی عذر کی بنا پر میت کو قبر سے صحیح سلامت نکالا جائے تو ان پر دوبارہ نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جائے گی، اسی طرح اس کو غسل بھی نہیں دیا جائے گا۔

لما فی الدر المختار (۲۰۵/۲): (و) آدمی (منبوش طری) لم يتفسخ (يكفن كالذى لم يدفن) مرة بعد اخرى (وان تفسخ كفن فی ثوب واحد)

وفی الشامية (۲۰۵/۲): (قوله كالذى لم يدفن) ان يكفن فی ثلاثة اثواب...... اى لو نبش ثانيا وثالثا

واکثر کفن کذلک مادام طریا من اصل ماله عندنا.

(۴۰۶) نمازِ جنازہ کے بعد دس دس قدم چلنے کا طریقہ

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نمازِ جنازہ کے بعد دس دس قدم چلنے کا کیا طریقہ ہے؟ امام نمازِ جنازہ کے بعد جنازہ گاہ میں چارپائی کا ایک پایا پکڑ کر چلتا ہے پھر دوسرا پایا پکڑ کر چلتا ہے پھر تیسرا پھر چوتھا کیا ایسا کرنا صحیح ہے۔ نیز اس کو لازم سمجھنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں دس دس قدم چلنا صحیح ہے لیکن امام کا چارپائی کا پایا پکڑ کر وہیں جنازہ گاہ میں گھمانا ثابت نہیں ہے صحیح طریقہ یہ ہے کہ میت کا دائیں طرف والا پایا اپنے دائیں کندھے پر رکھ کر دس قدم چلیں پھر اس کے پیچھے والا پایا پکڑ کر دس قدم چلیں پھر میت کے بائیں طرف والا پایا اپنے بائیں کندھے پر آگے کی طرف سے دس قدم چلیں اسی طرح پیچھے والا پایا دس قدم چلیں اسطرح چالیس قدم ہوجائیں گے اور یہ چلنا قبرستان کی طرف ہے نہ کہ وہیں جنازہ گاہ میں گھمانا۔ اور اس کو لازم بھی نہ سمجھا جائے اگر اس طریقے سے چلا جائے تو صحیح ہے صرف امام کا چارپائی کا پایا پکڑنے والا طریقہ خلاف سنت ہے۔

لمافی الهندية(۱/۱۶۲): ثم ان فی حمل الجنازة شيئين نفس السنة وكمالها اما نفس السنة فهی ان تاخذ بقوائمها الاربع علی طريق التعاقب بان تحمل من كل جانب عشر خطوات وهذا يتحقق فی حق الجمع واما كمال السنة فلا يتحقق الافی واحد وهو ان يبدأ الحامل بحمل يمين مقدم الجنازة كذا فی التاتارخانية فيحمله علی عاتقه الايمن ثم الموخر الايمن علی عاتقه الايمن ثم المقدم الايسر علی عاتقه الايسر ثم المؤخر الايسر علی عاتقه الايسر هكذا فی التبيين.

وفی الشامية (۲/۲۳۱): وفی شرح المنية ويستحب ان يحملها من كل جانب اربعين خطوة للحديث المذكور رواه ابوبكر النجار الخ........ (قوله كذلک)ای عشر خطوات وهی معنی كذلک الثانية ويمين الحامل يمين الميت ويسار الجنازة ويساره يساره ويمين الجنازة قهستانیط.

(۴۰۷) عورت کیلئے جنازہ میں شرکت کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا عورت نمازِ جنازہ میں شرکت کرسکتی ہے؟ یعنی جماعت کے پیچھے عورتیں کھڑی ہوسکتی ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... عورتیں نمازِ جنازہ میں فتنے کی وجہ سے شرکت نہیں کرسکتیں البتہ اگر ساتھ کھڑی ہوگئیں تو نماز درست ہوجائے گی۔

لمافی البحر الرائق(۲/۱۸۰): وأما مايفسدها فما أفسد الصلاة أفسدها الاالمحاذة......

وفی جوهر النيرة(۱/۱۳۰): وان قامت امرأة الی جانب رجل لم تفسد عليه صلاته.

وفی حاشية الطحطاوی علی مراقی الفلاح(صـ۲۴۶): (ولا يحضرن الجماعات لمافيه من الفتنة والمخالفة) (قوله ولا يحضرن الجماعات) لقوله ﷺ "صلاة المرأة فی بيتها أفضل من صلاتها فی حجرتها وصلاتها فی مخدعها أفضل من صلاتها فی بيتها". قال الطحطاوی تحته: فالأفضل لها ماكان استرلها لافرق بين الفرائض وغيرها كالتراويح الاصلاة الجنازة فلا تكره جماعتهن فيما لأنها لم تشرع مكررة فلو انفردت تفوتهن.

(قوله والمخالفة) أی مخالفة الأمر لان الله تعالیٰ امرهن بالقرار فی البيوت فقال تعالیٰ وقرن فی بيوتكن وقال ﷺ "بيوتهن خير لهن لو كن يعلمن"

وفی الدرالمختار(۱/۵۶۶): (ويكره حضورهن الجماعة) ولو لجمعة وعيدووعظ (مطلقا) ولو عجوزا ليلا (علی المذهب المفتی به لفساد الزمان واستثنیٰ الكمال بحثا العجائز المتفانية.

وفی الشامية (۱/۵۶۶): (قوله علی المذهب المفتی به) أی مذهب المتاخرين قال فی البحر: وقد يقال هذه الفتوی التی اعتمدها المتأخرون ...... وفيه نظر بل هو مأخوذ من قول الإمام وذلک أنه انما منعها لقيام الحامل وهو فرط الشهوة بناء علی أن الفسقة لا ينتشرون فی المغرب...... الخ.

(قوله واستثنیٰ الكمال الخ) أی مما افتی به المتأخرون لعدم العلة السابقة فيبقی الحكم فيه علی قول الإمام فافهم.

(۴۰۸) عورتیں جنازے کی نماز پڑھا سکتی ہیں؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا عورتیں جنازے کی نماز پڑھا سکتی ہیں کیونکہ الدرالمختار(۱/۵۶۵) پرایک عبارت ہے جس سے جواز کی صورت معلوم ہوتی ہے عبارت ملاحظہ ہو "ويكره تحريما(جماعة النساء) ولو فی التراويح فی غير صلاة جنازة" اب آپ سے معلوم کرنا ہے کہ کیا یہ بات درست ہے یانہیں اگرنہیں تو اس عبارت کو کہاں منطبق کریں گے اوراس کا محمل کیا ہوگا؟ کیا کسی خاص صورت میں فقہاء کہتے ہیں یا یہ بات مطلقاً ہے اگراس جنازے میں مرد بھی شریک ہوں تو اس صورت میں کیا حکم ہوگا؟ اگراکیلی عورتیں ہیں تو اس صورت میں جواز معلوم ہورہا ہے تو باقی فرائض اورتراویح میں اس کی کیوں ممانعت ہے؟ پھر تو کچھ سال پہلے جوامریکہ میں واقعہ پیش آیا تھا کہ عورت نے امامت کرائی تھی کیا وہ درست ہے اس عبارت کے نتیجے میں، براہ کرم تمام پہلوؤں کا قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں کہ کوئی جز میرے سوال کا باقی نہ رہے۔اللہ آپ کو جزائے خیر عطاء کرے، آمین۔

الجواب حامداً ومصلیاً......نماز جنازہ میں عورت صرف خواتین کی امامت کرسکتی ہے جبکہ دیگر نمازوں میں مکروہ ہے چاہے خواتین کی امامت ہی کیوں نہ ہو۔ سوال میں درج ''الدر'' کی عبارت کا مطلب اور محمل یہی ہے۔ نیز نمازِ جنازہ میں اگر مرد حضرات عورت کی اقتداء میں شریک ہوجائیں تو مردوں کی نماز باطل ہوجائے گی کیونکہ مرد کیلئے کسی بھی نماز میں عورت کی اقتداء درست نہیں، البتہ اس صورت میں نماز جنازہ ادا ہوجائے گی اعادہ نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ عورت کی نماز درست ہونے کی بناء پر سب کی طرف سے فریضہ ادا ہوگیا۔

نیز سوال میں مذکور ''امریکہ میں پیش آمدہ واقعہ'' کا جواز سوال میں درج ''الدر'' کی عبارت سے ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اس عبارت سے فقط نماز جنازہ میں عورت کی امامت کا جواز صرف خواتین کیلئے ثابت ہوتا ہے۔ نماز جنازہ میں صرف خواتین کیلئے عورت کی امامت کا جواز اور دیگر نمازوں میں ممانعت کی وجہ فرق یہ ہے کہ اگر کسی نمازِ جنازہ میں صرف خواتین ہوں تو نماز جنازہ پڑھنے کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں۔

(۱)۔ بغیر جماعت کے علیحدہ علیحدہ نماز ادا کرلیں۔ (۲)۔ کسی خاتون کی اقتداء میں جماعت کرالیں۔

اول الذکر صورت میں اگر کوئی خاتون دیگر خواتین سے پہلے نماز جنازہ پوری کرتی ہے تو اس کی نماز سے فریضہ ادا ہوجائے گا کیونکہ نماز جنازہ فرض علی الکفایہ ہے کسی ایک فرد کے پڑھنے سے فریضہ ادا ہوجاتا ہے لہٰذا دیگر خواتین کی نمازیں نفل بن جائیں گی جبکہ نماز جنازہ نفلاً مشروع نہیں ہے۔ لہٰذا نماز جنازہ میں جبکہ صرف خواتین موجود ہوں مؤخر الذکر صورت متعین ہے۔ نماز جنازہ کے علاوہ دیگر نمازوں میں یہ علت نہیں پائی جاتی ہے۔ کیونکہ وہ ہر ایک پر الگ الگ فرض یا سنت ہوتی ہیں ان کو علیحدہ علیحدہ پڑھنے کی صورت میں اگر کوئی خاتون دیگر خواتین سے پہلے نماز سے فارغ ہوتی ہے تو دیگر خواتین کی نمازیں نہ تو نفل بن جاتی ہیں اور نہ ہی ان سے فریضہ ساقط ہوتا ہے۔ لہٰذا نمازِ جنازہ کے علاوہ دیگر نمازوں میں عورت کی امامت مطلقاً مکروہ ہے۔

لمافی المدونة الکبری(۱/۱۷۸): عن ابن ابی ذئب عن مولی لبنی هاشم اخبره عن علی بن ابی طالب انه قال: لا تؤم المرأة.

وفی الدرالمختار (۱/۵۶۵): ویکره تحریماً (جماعة النساء) ولو فی التراویح فی غیر صلاة جنازة. لانها لم تشرع مکررة فلو انفردن تفوتهن بفراغ احداهن ولو امت فیها رجالاً لا تعاد لسقوط الفرض بصلاتها

وفی الشامیة تحته: قال فی الفتح، واعلم ان جماعتهن لا تکره فی صلاة الجنازة لا نها فریضة وترک التقدم مکروه فدار الامر بین فعل المکروه لفعل الفرض او ترک الفرض لترکه فوجب الاوّل. بخلاف جماعتهن فی غیرها، ولو صلین فرادی فقد تسبق احداهن فتکون صلاة الباقیات نفلاً والتنفل بها مکروه، فیکون فراغ تلک موجباً لفساد الفرضیة لصلاة الباقیات کتقیید الخامسة بالسجدة لمن ترک القعدة الاخیرة ......ومفاده ان جماعتهن فی صلاة الجنازة واجبة، حیث لم یکن غیرهن ولعل وجهه الاحتراز عن فساد فرضیة صلاة الباقیات اذا سبقت احداهن، وفیه ان الرجال لو

صلوا منفردين يلزم فيها مثل ذلك فيلزم عليه وجوب جماعتهم فيها مع ان المصرح به ان الجماعة فيها غير واجبة فتأمل.

وفی تقریرات الرافعی علی حاشیة ابن عابدین(۱/۷۲): انما يتم بارجاع ضمير "لانها" فريضة للجماعة كما فعل فی حاشية البحر وهو خلاف الظاهر بل هو راجع لصلاة الجنازة فانها فرض كفاية على كل منهن قال السندی نقلاً عن شرح المنية و يستحب ان يصلين منفردات وتجوز جماعتهن. فمراد الفتح وغيره من الوجوب معناه اللغوی ای ثبت الاوّل ويكون مقدما على الترك لا على الانفراد المستحب.

(۴۰۹) متوفیہ عورت کے کفن ودفن کا خرچ کس کے ذمہ ہے باپ یا خاوند؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زن متوفیہ کے کفن ودفن کا خرچ کس کے ذمہ ہے باپ کے ذمہ ہے یا خاوند کے ذمہ؟ محقق جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... زوجہ متوفیہ کے کفن ودفن کا خرچہ خاوند کے ذمہ لازم ہے۔

لمافی حلبی کبیر(۱/۵۸۲): وكفن الزوجة على الزوج عند ابی يوسف وفی شرح السراجية لمصنفها اماالمرأة اذا لم يكن لها مال فكفنها و مؤنتها على الزوج عند ابی حنيفة وابی يوسف الخ.

وفی الهندية (۱/۱۶۱): وعلى قول ابی يوسفؒ يجب الكفن على الزوج وان تركت مالا وعليه الفتوى الخ.

(۴۱۰) میت کو اپنے آبائی گاؤں میں منتقل کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے ایک شہر کے اندر وفات پائی اس کو اس کے آبائی گاؤں لے جاتے ہیں کیا میت کو منتقل کرنا جائز ہے جبکہ اس نے اس شہر کی وصیت بھی کی ہو، کہ مجھ کو یہاں ہی دفن کرنا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اگر میت کا آبائی گاؤں ایک دو میل سے زیادہ دور ہے تو پھر منتقل کرنا مکروہ ہے۔

لمافی الشامية(۲/۲۳۹): (قوله ولا بأس بنقله قبل دفنه) قيل مطلقا وقيل إلى مادون مدة السفر وقيده محمد بقدر ميل أو ميلين لان مقابر البلد ربما بلغت هذه المسافة فيكره فيما زاد قال فی النهر عن عقد الفرائد: وهو الظاهر.

وفی الفقه الاسلامی(۲/۱۵۳۷): وقال الحنفية والمالكية: لا بأس بنقل الميت من بلد إلى آخر إن

كان لم يدفن، والنقل عند الحنيفة جائز قدر ميل أو ميلين لكن يندب دفنه في جهة موته أي في مقابر أهل المكان الذي مات فيه أو قتل ،انتهى.

(۴۱۱) قبر کتنی گہری کھودی جائے

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قبر کھودتے وقت قبر کتنی گہری کھودی جائے؟

الجواب حامداًومصلیاً...... قبر کی گہرائی کم از کم نصف قدِ آدم ہونی چاہئے اور اگر آدمی کے قد کے برابر کی جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

لمافي حلبي كبير(ص۵۹۶): مقدار عمق القبر قدر نصف قامة ذكره في الروضة وفي الذخيرة الى صدر الرجل او وسط القامة فان زادوا فهو افضل وان عمقوا مقدار قامة فهو احسن فعلم بهذا ان الادنى نصف القامة والاعلى القامة وما بينهما بينهما.

وفي بحر الرائق(۱۹۳/۲): واختلفوا في عمق القبر فقيل قدر نصف القامة وقيل الى الصدر وان زادوا فحسن.

وفي النتف في الفتاوىٰ(ص۸۴): واما القبر فالمستحب فيه خمس خصال والمكروه فيه عشر خصال امّا المستحب فيه فاولها ان يحفر القبر الى مبلغ السرة.

وفي طحطاوي (۳۸۱/۱): ويحفر القبر...... طوله على قدر طول الميت وعرضه على قدر نصف طوله قوله فان زاد فحسن فلو كان على قدر قامته فهو احسن.

وفي الدرالمختار(۲۳۳/۲،۲۳۴): (وحفر قبره) في غير داره (مقدار نصف قامة) فان زاد فحسن وفي الشامية تحته: (قوله مقدار نصف قامة الخ) او الى حد الصدر وان زاد الى مقدار قامة فهو احسن كما في الذخيرة فعلم انّ الادنى نصف القامة والاعلى القامة وما بينهما شرح المنية وهذا حدالعمق والمقصود منه المبالغة في منع الرائحة ونبش السباع.

(۴۱۲) قبر کی گہرائی کتنی ہو؟ میت کو گھر میں رکھا جائے یا مسجد میں؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قبر جب شق کی صورت میں ہو تو میت کو دفن کرنے کے بعد، جو اوپر بانس یا پتھر وغیرہ رکھ کر مٹی ڈالی جاتی ہے، اس میں یعنی پتھروں/ بانس اور میت کے درمیان کتنا فاصلہ ہونا چاہئے۔ ہمارے ہاں میت اور ان پتھروں یا بانس کے درمیان بہت فاصلہ رکھا جاتا ہے، تقریباً یہ پتھر اور بانس زمین کے برابر ہوتے ہیں اور میت بہت نیچے، شریعت میں اس کا کیا حکم ہے کیا اس کی کوئی حد متعین ہے، از روئے شریعت اس کا کیا حکم ہے، جبکہ اس مٹی کے کم ڈالنے کی وجہ سے قبر کی

چھت گرنے کی صورت میں بعض اوقات میت نظر بھی آتی ہے۔

(۲)......نماز جنازہ مسجد کے کمپاؤنڈ یا صحن میں پڑھنا افضل ہے یا قبرستان میں جبکہ قبرستان میں جنازہ پڑھنے کی جگہ بھی ہوتی ہے، لیکن مسجد میں جنازہ پڑھنے سے کثیر تعداد میں لوگ شرکت کرتے ہیں جبکہ قبرستان میں لوگ کم شرکت کرتے ہیں؟

(۳)......بعض مقامات پر میت کو گھر میں جگہ تنگ ہونے یا کسی اور مصلحت کی بنا پر، لاکر مسجد کے احاطہ میں رکھ دیا جاتا ہے، میت کو اپنے عزیز واقارب کے گھروں میں رکھنا اچھا ہے یا مسجد کے احاطہ میں؟

الجواب حامداًومصلیاً......(۱)۔صورت مسئولہ میں جب قبر شق کی صورت میں ہو تو اس کی گہرائی قامت الرجل (آدمی کے قد کے برابر) کے برابر مستحب ہے، البتہ بانس پتھر یا سلیپ وغیرہ رکھنے کی جگہ کی صراحت نہیں ہے لیکن بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب گہرائی متعین ہے تو یہ چیزیں اوپر ہی رکھی جائیں گی البتہ بانس، پتھر یا سلیپ وغیرہ رکھنے میں احتیاط سے کام لیا جائے تاکہ کھلنے کا اندیشہ نہ ہو، اگر پھر بھی کسی وجہ سے کھل جائیں تو دوبارہ اچھی طرح بند کرلی جائیں۔

(۲)۔اگر شدید عذر ہو مثلاً بارش ہورہی ہو یا باہر جنازہ پڑھنا ممکن نہ ہو تو پھر تو مسجد کے اندر بھی جنازہ پڑھنا درست ہے البتہ اگر کوئی عذر نہ ہو تو پھر اگر میت اور امام سمیت کچھ مقتدی مسجد سے باہر ہوں تو بھی جنازہ پڑھنا بلا کراہت کے درست ہوگا واضح رہے کہ لوگوں کا کثیر تعداد میں شرکت نہ کرنا کوئی عذر نہیں ہے۔

(۳)۔میت کو نہ گھر میں رکھنا درست ہے اور نہ ہی مسجد میں بلکہ فوراً کفن دفن کے انتظامات کرنے چاہئیں۔

لما فی البخاری(۱/۱۷۶): عن ابی هريرة عن النبی ﷺ قال اسرعوا بالجنازة فان تک صالحة فخير تقدمونها وان تک سوی ذلک فشر تضعونه عن رقابکم.

وفی أبی داؤد(۲/۹۸): عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ من صلی علی جنازة فی المسجد فلاشئی له.

وفی مسلم(۱/۳۱۳): عن عائشة انها لما توفی سعد بن ابی وقاص ارسل ازواج النبی ﷺ أن يمروا بجنازته فی المسجد فيصلين عليه ففعلوا فوقف به علی حجرهن يصلين عليه...... فبلغهن ان الناس عابوا ذلک وقالوا ماكانت الجنائز يدخل بها المسجد. (الحديث)

عن ابی سلمة بن عبدالرحمن ان عائشة لما تو فی سعد بن ابی وقاص قالت ادخلوا به المسجد حتی اصلی عليه فأنكر ذلک عليها. (الحديث)

وفی المبسوط للسرخسی(۲/۶۸): وعندنا اذا كانت الجنازه خارج المسجد لم يكره ان يصلی الناس عليها فی المسجد انما الكراهة فی ادخال الجنازة.

وفی شامية (۲/۲۳۴): (قوله مقدار نصف قامة الخ) او الی حد الصدر وان زاد الی مقدار قامة فهواحسن.

(۴۱۳) قبر کھودنے کی گہرائی میں مرد وعورت کی قبر میں فرق ہے یا نہیں؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت کے لئے قبر کتنی گہری کھودنی چاہئے اس کی حد کیا ہے اور مرد وعورت کی قبر کا ایک ہی حکم ہے یا ان کی قبروں میں فرق ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... قبر کی گہرائی انسان کے نصف قد تک ہونی چاہئے اگر زیادہ ہو تو اور بہتر ہے، مرد وعورت کا کوئی خاص فرق گہرائی میں ضروری نہیں۔

وفی التاتارخانية(۲/۱۷۲): وفی بعض النوادر عن محمدؒ انه قال ينبغی ان يكون مقدار العمق الی صدر رجل وسط القامة قال وكلما ازداد فهو أفضل.

وفی الشامية (۲/۲۳۴): قوله نصف قامة او الیٰ حد الصدر، وان زاد الی مقدار قامة فهو أحسن كمافی الذخيرة.

(۴۱۴) میت کو بوقت ضرورت صندوق میں بند کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک میت کے اعضاء کو انتشار کے خوف سے اگر صندوق میں بند کر کے قبر میں رکھیں، آیا شرعاً مذکورہ عذر کی وجہ سے میت کو اس طرح قبر میں دفنانا جائز ہے، فقہاء کرام کی عبارات سے جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... میت کو بوقت ضرورت صندوق میں بند کر کے دفنانا جائز ہے۔

لمافی الهندية (۱/۱۶۶): وحكی عن الشيخ الامام ابی بكر محمد بن الفضل رحمه الله انه جوز اتخاذ التابوت فی بلادنا لرخاوة الارض قال ولو اتخذ تابوت من حديد لا بأس به لكن ينبغی ان يفرش فيه التراب ويطين الطبقة العلياء الخ.

وفی الشامية(۲/۲۳۴): التنوير مع الدر: (ولا بأس باتخاذ التابوت) ولو من حجر او حديد (له عند الحاجة كرخاوة الارض.

(۴۱۵) بلاضرورت میت کو تابوت میں دفن کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت کو تابوت کے اندر رکھ کر نمازِ جنازہ پڑھنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... بلاضرورت میت کو تابوت کے اندر رکھنا اور جنازہ پڑھانا مکروہ ہے، اگر ضرورت ہو تو جائز ہے مثلاً زمین گیلی ہو یا کوئی اور ضرورت ہو تو بلا کراہت جائز ہوگا۔

لمافی الهندیة(۱/۱۶۶): وحکی عن الشیخ الامام ابی بکر محمد بن الفضل رحمه الله انه جوز اتخاذ التابوت فی بلادنا لرخاوة الارض قال ولو اتخذ التابوت من حدید لا بأس به لکن ینبغی ان یفرش فیه التراب ویطین الطبقة العلیا مما یلی المیت ویجعل اللبن الخفیف علی یمین المیت وعلی یساره لیصیر بمنزلة اللحد

وفی خلاصة الفتاویٰ(۱/۲۲۶): وعن الامام ابی بکر محمد بن الفضل، انه جوز اتخاذ التابوت فی بلادنا لرخاوة الارض قال ولو اتخذوا تابوتاً من حدید فلا باس به.

(۴۱۶) میت کیلئے قبر میں چٹائی بچھانے کا حکم اور نبی ﷺ کیلئے چٹائی بچھانے کی وجہ

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سننے میں آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال جس چٹائی پر ہوا تھا وہی چٹائی آپ کیلئے لحد میں بچھائی گئی تھی۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ میت کیلئے قبر میں چٹائی بچھانا جائز ہے یا نہیں اگر جائز نہیں تو پھر آپ ﷺ کیلئے کیوں بچھائی گئی؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... میت کے لئے قبر میں چٹائی بچھانا درست نہیں، آپ نے جو سنا ہے کہ حضور علیہ الصلاۃ والسلام کیلئے لحد میں چٹائی بچھائی گئی یہ آپ نے غلط سنا ہے اصل میں حضور علیہ الصلاۃ والسلام کی ایک سرخ رنگ کی چادر تھی جس کو آپ علیہ السلام کبھی نیچے بچھایا کرتے تھے اور کبھی اس کو اوپر لیا کرتے تھے جب آپ علیہ السلام کا وصال ہوا تو حضرت شقرانؓ صالح (جو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے) نے یہ سوچ کر کہ اب آپ کے بعد اس چادر کو پہننے کا کوئی اہل نہیں رہا اس لئے یہ فرما کر اسے قبر میں ڈال دیا۔ واللہ لا یلبسها احد بعده ابدا یعنی آپؐ کے بعد کوئی دوسرا اس چادر کو نہیں اوڑھ سکتا۔ علامہ ابن عبدالبر نے کہا کہ اس چادر کو مٹی ڈالنے سے پہلے ہی نکال لیا تھا اور بعض حضرات کہتے ہیں یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے۔

لمافی المرقاة(۴/۶۷): عن ابن عباسؓ قال جعل فی قبر رسول الله ﷺ قطیفة حمراء فی النهایة القطیفة هی کساء له خمل وهو المهدب ومنه الحدیث تعس عبدالقطیفة ای الذی یعمل لها ویهتم بتحصیلها قال النووی وهذه القطیفة ألقاها شقران مولی من موالی رسول الله ﷺ وقال کرهت ان یلبسها احد بعده علیه الصلوة السلام وقدنص الشافعی وغیره من الفقهاء علی کراهة وضع القطیفة والمخدة ونحوهما تحت المیت فی القبر فقیل ان ذلک من خواصه علیه الصلوة السلام فلا یحسن فی غیره قال الدار قطنی نقلا عن وکیع ان ذلک من خصائصه علیه الصلوة السلام قال التوربشتی

وذلک انه علیه الصلوة السلام کما فارق اهل الدنیا فی بعض أحکام حیاته فارقهم فی بعض احکام مماته فان الله تعالیٰ حرم علی الارض لحوم الانبیاء وحق لجسد عصمه الله عن البلی والاستحالة ان یفرش له فی قبره لان المعنی الذی یفرش للحی له لم یزل عنه ﷺ بحکم الموت ولیس الامر فی غیره علی هذا النمط وقال بعضهم تنازع علیؓ وعباسؓ فقصد شقران بوضعها دفع ذلک ذکره ابن حجر وهو بعید جدا.......... قال ابن عبد البر فی الاستیعاب انها أخرجت قبل اهالة التراب.

وفی البحر الرائق(۲/۱۹۳): وذکر فی الظهیریة معزیا الی السرخسی فی الجامع الصغیر انه لایجوز ان تطرح المضربة فی القبر وماروی عن عائشةؓ فغیر مشهور.

وفی الدر المختار(۲/۲۳۴): (ولا) یجوز ان (یوضع فیه مضربة) وما روی عن علیؓ فغیر مشهور لا یوخذبه. وفی الشامی (قوله ولا یجوز الخ) ای یکره ذلک قال فی الحلیة ویکره ان یوضع تحت المیت فی القبر مضربة او مخدة او حصیرا ونحو ذلک ولعل وجهه انه اتلاف مال بلا ضرورة فالکراهة تحریمیة ولذا عبر بلا یجوز. (قوله وماروی عن علیؓ) یعنی من فعل ذلک نهر ثم ان الشارح تبع فی ذلک المصنف فی منحه والذی وجدته فی الظهیریة عن عائشةؓ وکذا عزاه الی الظهیریة فی البحر والنهر، قال فی شرح المنیة وما روی انه جعل فی قبره علیه الصلوة والسلام قطیفة. قیل لان المدینة سبخة وقیل ان العباس وعلیا تنازعاها فبسطها شقران تحته لقطع التنازع وقیل کان الصلاة والسلام یلبسها ویفترشها فقال شقرانؓ والله لایلبسک احد بعده أبداً فالقاها فی القبر.

(قوله فغیر مشهور) ای غیر ثابت عنه او المراد انه لم یشتهر عنه فعله بین الصحابة لیکون اجماعا منهم بل ثبت عن غیره خلافه ففی شرح المنیة وکره ابن عباسؓ ان یلقیٰ تحت المیت شئ رواه الترمذی وعن أبی موسیٰ لا تجعلوا بینی وبین الارض شیئاً.

(۴۱۷) عورت کو قبر میں اتارتے وقت پردہ ڈالنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عورتوں کو دفن کرتے وقت ان کی قبر پر پردہ ڈالنا کیسا ہے؟ شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً......صورت مسئولہ میں پردہ ڈالنا سنت ہے۔

وفی اعلاء السنن(۸/۳۱۳): عن الثوری عن ابی اسحاقؒ قال شهدت جنازة الحارث فمد واقبره ثوباً فجبذه عبدالله بن یزید وقال انما هو رجل رواه ابن ابی شیبة فهذا هو الصحیح.

وفی البدائع(۱/۳۱۹): ویسجی قبر المرأۃ بثوب لماروی انّ فاطمۃؓ سجی قبرھا بثوب ونعش علی جنازتھالان مبنی حالھا علی السترفلو لم یسج ربما انکشفت عورۃ المرأۃ فیقع بصر الرجال علیھا.

وفی رد المحتار(۲/۲۳۶): ویسجی قبرھا ای بثوب ونحوہ استحباباً حال ادخالھا القبر حتیٰ یسوی اللبن علی اللحد کذا فی شرح المنیۃ والامداد.

(۴۱۸) قبروں کے اردگرد چاردیواری بنانے کاحکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل قبروں کے اردگرد دلکڑیوں سے چاردیواری بنائی جاتی ہیں جس کا مقصود قبر کومزین کرنا بھی ہوتا ہے اور قبر کی حفاظت بھی، اور اگر صرف حفاظت کیلئے ہوتو کیسا ہے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں۔

الجواب حامداًومصلیاً...... قبروں کے اردگرد چاردیواری بنانا جائز ہے بشرطیکہ قبر کی حفاظت مقصود ہو۔ اور اگر چاردیواری بنانے سے مقصود زیب وزینت ہوتو اس صورت میں مکروہ ہے۔

لمافی مراقی الفلاح(صـ۵۰۳): انما یکرہ الا جر اذا ارید بہ الزینۃ اما اذا ارید بہ دفع اذی السباع او شی آخر لایکرہ.

وفی حاشیۃ الطحطاوی(صـ۵۰۴): وقد اعتاد اھل مصروضع الاحجار حفظا للقبور عن الاندراس والنبش ولا باس بہ وفی الدرر ولا یجصص ولا یطین ولا یرفع علیہ بناء وقیل لا بأس بہ ھو المختار.

وفی حاشیۃ الطحطاوی علی الدر(۱/۳۸۲): قولہ وقیل لا بأس بہ) ینبغی تقیید الجواز علی ھذا القول بما اذا ......

(۴۱۹) حفاظت کی غرض سے قبر پر بغیر چھت کے چاردیواری بنانے کاحکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قبر پر چار پانچ فٹ بلند صرف چاردیواری بغیر چھت کے بغرض حفاظت بنانا جائز ہے یانہیں، نیز چبوترہ بنا کر اس کے اوپر قبر بنانا تاکہ بارش کے سیلاب سے حفاظت رہے اور زائرین کے بیٹھنے کیلئے صفائی رہے جائز ہے یانہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً...... صورت مسئولہ میں بغرض حفاظت چاردیواری بنانا جائز ہے بشرطیکہ فخر ونمود، ریاکاری، زینت مقصود نہ ہو، نیز سیلاب وغیرہ سے جو خطرہ قبر کو لاحق ہے وہی خطرہ چبوترے کو بھی لاحق ہوسکتا ہے جو مناسب معلوم نہیں ہوتا البتہ اگر واقعی اس میں قبر کی حفاظت ہے اور زیب وزینت، اسی طرح زائرین کے لئے بیٹھنے کا اہتمام مقصود نہ ہوتو ضرورۃً جائز ہے۔

لمافی مراقی الفلاح(صـ۵۰۳،۵۰۴):انمایکره الآجر اذااريد به الزينة امااذا اريد به دفع أذى السبّاع اوشئ آخر لايكره ...... (ويكره) البناء عليه (للإحكام بعد الدفن) لأنه للبقاء و القبر للفناء...... اهـ.

وفي الدرالمختار(۲/۲۳۷): (ولا يجصص) للنهي عنه، (ولا يطين) ولا يرفع عليه بناء وقيل لابأس به وهو المختار) ،وفي الشامية:(قوله لا يرفع عليه بناء) اى يحرم لوللزينة ......اهـ.

وفي الدرالمختار(۲/۲۳۶): (ويسوى اللبن عليه والقصب لا الآجر) المطبوخ والخشب لوحوله ......

وفي الشامية تحته: وقال مشايخ بخارى لايكره الآجر في بلدتنا للحاجة اليه لضعف الأراضي.

(۴۲۰) قبر کے اوپر میت کے نام کا کتبہ لگانے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قبروں کے اوپر اہل قبور کے ناموں کے کتبے لگانا جائز ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً...... صورت مسئولہ میں اگرضرورت اس کی ہوکہ قبر کا نشان رہ جائے قبر کا اثر مٹ نہ جائے تو جائز ہے ورنہ مکروہ ہے۔

لمافي رد المحتار(۲/۲۳۷): (قوله لا بأس بالكتابة الخ) لان النهي عنها وان صح فقد وجد الاجماع العملي بها فقد اخرج الحاكم النهي عنها من طرق ثم قال هذه الاسانيد صحيحة وليس العمل عليها فان ائمة المسلمين من المشرق الى المغرب مكتوب على قبورهم وهو عمل اخذ به الخلف عن السلف...... نعم يظهر ان محل هذا الاجماع العملي على الرخصة فيها ما اذا كانت الحاجة داعية اليه في الجملة كما اشار اليه في المحيط بقوله وان احتيج الى الكتابة حتى لا يذهب الاثر ولا يمتهن فلا بأس به فاما الكتابة بغير عذر فلا حتى انه يكره كتابة شئ عليه من القران او الشعر او اطراء مدح له ونحو ذلك حلية ملخصا.

وفي الهندية (۱/۱۶۶): ويكره ان يبنى على القبر او يقعد اوينام عليه او يوطأ عليه او يقضى حاجة الانسان من بول او غائط او يعلم بعلامة من كتابة ونحو كذا في التبيين.

(۴۲۱) قبروں پر نام، تاریخ وغیرہ لکھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کی قبر کو بطور نشان باقی رکھنے اور اس خیال سے کہ قبر کی بے حرمتی اور توہین نہ ہو، لوگ اس کو پامال نہ کریں، تو اس پر نام اور تاریخ وفات لکھی جاسکتی ہے یا نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً...... قبر پر بوقت ضرورت نام، تاریخ وغیرہ لکھی جاسکتی ہے۔

لمافی مراقی الفلاح(ص۵۰۵): (ولا بأس) ایضاً (بالکتابة فی حجر صین به القبر ووضع (علیه لئلا یذهب الاثر) فیحترم للعلم بصاحبه.

وفی الدر المختار(۲/۲۳۷): لابأس بالکتابة ان احتیج الیها حتی لا یذهب الاثر ولا یمتهن.

(۴۲۲) پکی اور خوبصورت قبر بنانے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ لوگ قبریں عموماً شوق میں سیمنٹ کی خوبصورت بناتے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ پکی قبر منع ہے آپ بتائیں کہ کیا پکی اور خوبصورت قبر بنانا جائز نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... قبر کو پکا کرنا اور خوبصورت کرنا مکروہ ہے۔

لمافی الهندیة(۱/۱۶۶): ویسنم القبر قدر الشبر ولایربع ولا یجصص ولا بأس برش الماء علیه ویکره أن یبنی علی القبر.

وفی الدر المختار(۲/۲۳۷): (ولا یجصص) للنهی عنه (ولا یطین ولا یرفع علیه بناء) (قال ابن عابدین رحمه الله تحت قوله ولا یجصص) ای لا یطلی بالجص بالفتح ویکسر قاموس (قوله ولا یرفع علیه بناء) ای یحرم لو للزینة، ویکره لو للاحکام بعدالدفن.

(۴۲۳) پرانی یا نئی قبر گر جائے اس کو دوبارہ بنانے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر قبرستان میں ایک پرانی قبر یا نئی قبر گر جائے تو دوبارہ بنانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... قبر گرنے کی صورت میں دوبارہ بنانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

لمافی التاتارخانیة(۲/۱۷۰، ۱۷۱): وفی النوازل سئل ابو نصر عن تطیین القبر: قال: لا بأس به وفی الغیاثیة وعلیه الفتوی:...... الحجة واذا خربت القبور فلا بأس بتطیینها لماروی ان النبی علیه السلام مرّ بقبر ابنه ابراهیم فرأی فیه حجرا سقط منه فسده واصلحه ثم قال: من عمل عملا فلیتقنه:...... وفی کفایة الشعبی: کان عصام بن یوسف یطوف حول المدینة یعمر القبور الخربة.

وفی الهندیة(۱/۱۶۶): واذا خربت القبور فلا باس بتطیینها کذا فی التاتارخانیة: وهو الاصح وعلیه الفتویٰ کذا فی جواهر الاخلاطی.

وفی الشامیة(۲/۲۳۷): وفی شرح المنیة عن منیة المفتی: المختار انه لا یکره التطیین.

(۴۲۴) قبر پر سبز پتی پھول اور خوشبو رکھنے کی شرعی حیثیت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ قبروں پر سبز پتی یا پھول اور خوشبو وغیرہ رکھتے ہیں، یہ فعل سنت ہے، مستحب ہے یا مباح ہے یا بالکل بے فائدہ ہے؟ شرعی دلیل سے جو ثابت ہو مدلل بیان فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... قبروں پر سبز پتی، پھول اور خوشبو وغیرہ رکھنا یہ نہ سنت ہے اور نہ مستحب، بلکہ یہ ایک بے فائدہ چیز ہے اور شریعت میں اس کی کوئی اصل اور ثبوت نہیں ہے اور آج کل لوگ اس کام کو کارِ ثواب سمجھتے ہیں لہٰذا اس کا ترک کرنا واجب ہے۔

لمافی شرح مسلم(۱/۱۴۱): قال النووی، ففیه انه رضی الله عنه تبرک بفعل مثل فعل النبی ﷺ وقد انکر الخطابی مایفعله الناس علی القبور من الاخواص ونحوها متعلقین بهذا الحدیث وقال لا اصل له ولا وجه له، والله اعلم.

وفی عمدة القاری (۳/۱۲۱): وکذلک مایفعله اکثر الناس من وضع مافیه رطوبة من الریا حین والبقول ونحوهما علی القبور لیس بشی وانما السنة الغرز،

وفی معارف السنن(۱/۳۲۶): قال الشیخ المحدث الاکبر العلامة محمد یوسف بنوری نور الله مرقده: اتفق الخطابی والطرطوشی والقاضی عیاض علی المنع وقولهم اولی بالاتباع حیث اصبح مثل تلک المسامحات والتعللات مثاراً للبدع المنکرة والفتن السائرة فتری العامة یلقون الزهور علی القبور و بالأخصّ علی قبور الصلحاء والاولیاء والجهلة منهم از دادوا اصراراً علی ذلک وتغالوا فیه واوضحت ذلک منشاء فی الجهة لعقائد فاسده تأباها الشریعة النقیة وظنوا ذلک سببا للثواب والاجر الجزیل فالمصلحة العامة فی الشریعة تقتضی منع ذلک بتاتا استئصالاً لشأفة البدع وحسماً لمادة المنکرات المحدثة وبالجملة هذه بدعة مشرقیة منکرة وبجنبها بدعة اخری مغربیة قدراجت فی کثیر من البلاد المشرقیة التی تدعی بلاد اسلامیة الخ وکل هذه بدع ومنکرات لااصل لها فی الدین ولا مستندلها من الکتاب والسنة ویجب علی اهل العلم ان ینکروها وان یبطلوا هذه العادات ما استطاعوا انتهی.

(۴۲۵) پوسٹ مارٹم وغیرہ کی غرض سے میت کو قبر سے نکالنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آجکل بعض اوقات پوسٹ مارٹم کرنے کیلئے میت کو قبر سے نکالا جاتا ہے کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ اور وہ کونسا عذر ہے جس کی وجہ سے میت کو دفن کرنے کے بعد قبر سے نکالا جاسکتا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......میت کو قبر میں دفن کرنے کے بعد بلا عذر شرعی نکالنا جائز نہیں۔اور پوسٹ مارٹم میں چونکہ میت کی توہین ہے نیز یہ کوئی عذر شرعی بھی نہیں اس لئے پوسٹ مارٹم کیلئے میت کو قبر سے نکالنا درست نہیں اور وہ عذر جس کی بنا پر میت کو دفن کے بعد نکالنا جائز ہے یہ ہے کہ مثلاً وہ زمین مغصوبہ ہو یا شفیع نے شفعہ کر کے لی ہو، اور وہ اس کا مطالبہ کر رہا ہو تو پھر میت کو قبر سے نکالنا جائز ہے۔

لمافی الهندية (۲/۴۷۰): الميت بعدما دفن بمدة طويلة اوقليلة لايسع اخراجه من غير عذر ويجوز اخراجه بالعذر والعذر أن يظهر ان الأرض مغصوبة او اخذها الشفيع بالشفعة كذا فى الواقعات الحسامية ...... الخ.

(۴۲۶) میت گھر میں موجود ہو تو اس جگہ تلاوت کلام پاک کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص کا انتقال ہو گیا ہے اور اس کی میت جب تک گھر میں موجود ہوتی ہے تو اس جگہ تلاوت قرآن شریف کرنی چاہئے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......غسل سے پہلے میت کے پاس قرآن پاک کی تلاوت مکروہ ہے البتہ جب میت کو غسل دیدیا جائے تو پھر اس کے پاس تلاوت کرنا درست ہے۔

لما فى الهندية (۱/۱۵۷): ويكره قراءة القران عنده حتى يغسل كذا فى التبيين الخ.

وفى حاشية الطحطاوى على الدر (۱/۳۶۵): قوله تكره القراءة) اى تحريما اخذا من التعليل الآتى (قوله عنده) اى بعد موته (قوله تنزيها) اى تبعيدا والا ولىٰ فى التعبير زيادة بقوله.

(۴۲۷) نمازِ ظہر، نمازِ جنازہ اور کسوف میں کون سی نماز مقدم ہوگی؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نمازِ جنازہ، کسوف اور صلاۃ ظہر جمع ہو گئیں تو ان میں سے کس کو مقدم کیا جائے گا؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں سب سے پہلے فرض پڑھ لے، اس کے بعد نمازِ جنازہ پڑھ لے، اس کے بعد صلاۃ کسوف پڑھے۔

لمافى خلاصة الفتاوىٰ (۱/۲۲۳): اما بعد غروب الشمس بدؤا بالمغرب ثم بصلوة الجنازة ثم بسنة المغرب كذا افتى شمس الائمة الحلوانى.

وفى الهندية (۱/۱۵۳): وأن غربت كاسفة أمسك عن الدعآء واشتغل بصلاة المغرب وان اجتمع الكسوف والجنازة بدأ بالجنازة.

(۴۲۸) نمازِ جنازہ سے پہلے قرآن لے جانا

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱)۔ جنازہ سے پہلے قرآن لے جانا جائز ہے یا ناجائز؟

(۲)۔ جنازہ کے بعد مولوی صاحب کے ساتھ لوگ بیٹھ جاتے ہیں اور قرآن مجید کے نیچے روپے باندھ لیتے ہیں اور یہ روپے ان لوگوں کو دیئے جاتے ہیں جو جمع ہوتے ہیں کیا یہ جائز ہے یا ناجائز؟

(۳)۔ پھر چالیس دن تک یہ لوگ قبرستان میں جا کر مردے کی قبر پر قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں کیا یہ جائز ہے یا ناجائز؟

(۴)۔ پھر یہ لوگ چار جمعے یا سات جمعے کرتے ہیں اور اس کے ساتھ قرآن مجید ختم بھی کرتے ہیں اور ساتھ میں خیرات بھی کرتے ہیں اس کے علاوہ قرآن مجید کے ایک یا دو پارے پڑھنے پر ان کو دس یا بیس روپے دیتے ہیں کیا یہ جائز ہے یا ناجائز؟

(۵)۔ اور یہ لوگ اپنے مُردے کے سال پورا ہونے کے بعد خیرات کرتے ہیں اس میں غریب بھی ہوتے ہیں جس کی وصیت نہیں ہوتی لیکن رواج کے مارے یہ لوگ پھر بھی اس کو کرتے ہیں کیا یہ جائز ہے یا ناجائز؟

(۶)۔ ایک آدمی ہے جس کو اللہ تعالیٰ اولاد دے اور پھر آٹھ نو سال اس کی کوئی اولاد نہ ہو، اور وہاں کا رواج اس طرح کا ہے کہ ایک بابا وہاں گھوڑے پر آتا ہے اور جس کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے اس کو کہتا ہے کہ پانچ سو یا ہزار روپے دیدو اسی طرح میرے ماں باپ نے مجھے مجبور کیا کہ آپ بابا کے پاس جاؤ یا دوسری شادی کرو مگر میرا یہ یقین تھا کہ جس اللہ نے پہلے بچے دیئے ہیں وہ اللہ پاک اب بھی دے سکتے ہیں۔ مگر گھر میں اگر ماں باپ اور بھائی کہیں تو ان کا کہنا ماننا کیا گناہ ہوگا؟ اس بارے میں مطلع فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......استفتاء میں مذکور سوالات کے جوابات بالترتیب حسب ذیل ہیں:

(۱)۔ یہ بات تو حقیقت اور مسلم ہے کہ قرآن مقدس ایک مبارک اور برکت والی کتاب ہے۔ اس کا اپنے پاس رکھنا موجب برکت وثواب ہے، لیکن شریعت اسلامی میں مسلمان اپنے ہر معاملے میں قرآن وسنت کا پابند ہے کسی بھی دینی معاملے میں اپنی طرف سے بنایا ہوا بے اصل فعل شریعت میں قابل قبول نہیں ہے اور نہ ہی شریعت ایسے کاموں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے بلکہ شریعت نے ایسے کاموں کو ضلالت اور گمراہی سے تعبیر کیا ہے۔ لہٰذا مذکورہ مروجہ طریقہ یعنی قرآن مجید کو جنازے سے پہلے لے کر جانا چونکہ نہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور نہ ہی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ثابت ہے باوجودیکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم، خیر اور دین کے معاملے میں بہت حریص تھے، کسی بھی کام میں اگر ذرا سی خیر اور نیکی ہوتی تو صحابہ کرامؓ وہ کام ضرور سرانجام دیتے۔ لیکن مذکورہ مروجہ طریقہ نہ تو صحابہ کرامؓ سے اور نہ ہی سلف صالحین سے ثابت ہے لہٰذا یہ طریقہ من گھڑت اور بدعت ہے اور اس کو ترک کرنا لازمی ہے۔

لما فی تفسیر ابن کثیر (۱۴۱/۴): كل فعل وقول لم يثبت عن الصحابة رضى الله عنهم هو بدعة، لأنه لو كان خيراً لسبقونا اليه لأنهم لم يتركو خصلةً من خصال الخير إلا وقد بادروا اليها.

وفی مشکوٰۃ(صـ۲۷): ولما جاء فی الحدیث النبوی، عن عائشة رضی الله عنها، قالت، قال رسول الله ﷺ، من أحدث فی امرنا هذا ما لیس منه فهو ردّ.

وفی المرقاۃ(۱/۲۱٦): قال النووی، البدعة کل شئ عمل علیٰ غیر مثال سبق، وفی الشرع، إحداث مالم یکن فی عهد رسول الله ﷺ.

(۲)۔ مذکورہ مروجہ طریقہ کہ قرآن مقدس کے نیچے کچھ روپے باندھے جاتے ہیں، یہ طریقہ نہ تو صحابہ کرامؓ سے ثابت ہے اور نہ سلف صالحین سے ثابت ہے اور نہ ہی کسی امام مجتہد سے نقل ہے لہٰذا یہ طریقہ خالص بدعت ہے اور قابل ترک ہے۔

لمافی مشکوۃ(صـ۲۷): لماجاء فی الحدیث، عن عائشة رضی الله عنها، قالت، قال، رسول الله ﷺ من أحدث فی امرنا هذا مالیس منه فهو ردّ.

(۳)۔ میت کے ایصال ثواب کیلئے قرآن مجید کی تلاوت گھر میں اور قبر پر دونوں جگہ جائز ہے اور موجب ثواب ہے، لیکن اس میں اپنی طرف سے دنوں کی تخصیص اور تعین کرنا کہ چالیس دن تک ہی پڑھیں گے یہ درست نہیں ہے، کسی بھی عبادت میں اپنی طرف سے دن اور وقت کا تعین اور تخصیص کرنا بدعت ہے، ورنہ فی نفسہٖ قبر پر تلاوت کرنا جائز بھی ہے اور میت کو اس کا ثواب بھی پہنچتا ہے اور اس سے عذاب میں کمی بھی واقع ہوتی ہے۔

لمافی فتح القدیر(۲/۱۴۲): واختلف فی اجلاس القارئین لیقرؤا عند القبر والمختار عدم الکراهة.

وفی البحر (۲/۱۹۵): ولا بأس بقراءة القرآن عند القبور ور ما تکون افضل من غیره، ویجوز أن یخفف الله عن اهل القبور شیأ من عذاب القبر او یقطعه عند دعآء القارئ وتلاوته.

وفی البزازیة علی هامش الهندیة (۴/۸۱): مات فأجلس وارثه من یقرأ القرآن لابأس به أخذ بعض المشایخ.

وفی الهندیة(۱/۱٦٦): قراءة القرآن عند القبور عند محمد رحمه الله تعالیٰ لاتکره، ومشائخنا أخذوا بقوله وهل ینتفع والمختار انه ینتفع.

وفی الشامیة(٦/۵۷): ولو زار قبر صدیق او قریب له وقرأ عنده شیأ من القرآن فهو حسن.

(۴،۵)۔ صدقہ، خیرات، تلاوتِ قرآن مقدس، ذکر اور کوئی بھی نیک عمل کر کے اس کا ثواب میت کو پہنچانا جائز اور مستحسن امر ہے اور ان اعمال کا ثواب میت کو پہنچتا بھی ہے، لیکن سوال میں مذکورہ مروجہ طریقے میں تین خرابیاں پائی جاتی ہیں جن خرابیوں نے ان امور کو ناجائز بنا دیا ہے۔ اول...... یہ کہ لوگ چار جمعے، سات جمعے اور سال کے بعد خیرات کرتے ہیں، اور ان چار جمعوں، سات جمعوں یا سال کے بعد خیرات کرنے کی تخصیص اور تعین قرون اولیٰ سے ثابت نہیں ہے لہٰذا یہ بدعت ہے۔ دوم...... لوگ ختم قرآن پر کھانا کھلاتے ہیں، اور یہ صورت بھی درست نہیں ہے۔ سوم...... ایک یا دو پارے پڑھنے پر پڑھنے والے کو دس، یا بیس روپے دیے جاتے ہیں، یہ صورت بھی ناجائز ہے، اور اس صورت میں نہ میت کو ثواب ملتا ہے اور نہ تلاوت کرنے والے کو، بلکہ پڑھنے والا اور پیسے دینے والا دونوں گنہگار ہو جاتے

ہیں، اور علاوہ ازیں ان چار جمعوں، سات جمعوں کے بعد خیرات کرنا، ان میں عموماً، نام ونمود، ریا اور دکھلاوا اور رسم ورواج کا کرشمہ کارفرما ہوتا ہے، جیسا کہ سائل کے سوال سے بھی معلوم ہوتا ہے، ان امور میں رضاء الٰہی مقصود نہیں ہوا کرتی، اور لوگ یہ امور اس لئے سرانجام دیتے ہیں کہ نہ کرنے کی صورت میں برادری اور خاندان میں عزت نہ رہے گی وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا ان امور سے احتراز کرنا چاہئے اور دنوں کی تعین کیے بغیر میت کے ایصال ثواب کیلئے صدقہ، خیرات کرنا چاہئے۔

لمافی الشامية(۲/۲۴۳): وفی البحر، من صام او صلّی او تصدق وجعل ثوابه لغيره من الاموات والأحياء جاز ويصل ثوابها إليهم عند اهل السنة و جماعة.

وفی البحر(۲/۱۹۲): ان اتخذ ولی الميت طعاماً للفقراء كان حسناً اذا كانوا بالغين، وان كان فی الورثة صغيرلم يتخذ ذلک من التركة.

وفی الطحطاوی علی المراقی(صـ۵۱۰): قال فی البزازية ويكره اتخاذ الطعام فی اليوم الاول والثالث وبعد الاسبوع...... واتخاذ الدعوة بقراء ة القرآن.

وفی الشامية(۶/۵۷): ونقل العلامة الخلوتی...... عن شيخ الاسلام تقی الدين ما نصه ولا يصح الاستئجار على القرا ءة واهدائها الى الميت...... وقد قال العلماء ان القاری إذا قرأ لاجل المال فلا ثواب له فایّ شئ يهديه الى الميت.

وفی الشامية(۶/۵۶): ان القرآن بالاجرة لا يستحق الثواب لا للميت ولا للقارئ وقال العينی فی شرح الهداية ويمنع القاری للدنيا، والآخذوالمعطی آثمان، فالحاصل ان ماشاع فی زماننا من قرآءة الاجزآء بالاجرة لايجوز.

وفی الشامية(۲/۲۴۰): ويكره اتخاذ الطعام فی اليوم الاول والثالث وبعد الاسبوع ونقل الطعام الی القبر فی مواسم واتخاذ الدعوة لقراء ة القران......وقال (صـ۲۴۱) وهذه الافعال كلها للسمعة والرياء فيحترز عنها لانهم لا يريدون به وجه الله تعالیٰ.

(۲)۔ اولاد کا دینا یا نہ دینا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے تصرف اور قدرت میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی کسی کو اولاد نہیں دے سکتا۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہیں نرینہ اولاد دے دیں اور جسے چاہیں لڑکی دے دیں اور جسے چاہیں بالکل ہی اولاد سے محروم کر دیں۔ اس سلسلے میں نیک اور اللہ والے لوگوں سے دعا تو کرائی جاسکتی ہے۔ لیکن اس طرح سے کہ عقیدہ میں کوئی خرابی پیدا نہ ہو، اس مسئلہ میں لوگوں کو اپنا عقیدہ درست کرنا چاہئے، آپ اپنے والدین کو سمجھائیں اور اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے والدین کی ہدایت کی دعا کیا کریں اس معاملے میں آپ کیلئے ان کی اطاعت ضروری نہیں ہے، بلکہ اگر عقیدہ میں کچھ فرق ہے تو اُن کا کہنا ماننا اس معاملے میں بالکل جائز نہیں ہے۔

لمافی القرآن الكريم(الشوری: ۴۹،۵۰): لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ، يَهَبُ لِمَنْ

يَّشَآءُ اِنَاثاً وَيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ، اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَاناً وَ اِنَاثاً، وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْماً، اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ.

وفی تفسیر لابن کثیر(۴/۱۰۸): فجعل الناس اربعة اقسام: منهم من یعطیه البنات، ومنهم من یعطیه البنین ومنهم من یعطیه من النوعین ذکورا و اناثا ومنهم من یمنعه هذا وهذا فیجعله عقیماً لانسل له ولا ولدله.

وفی کنز العمال(۶/۶۷): الحدیث: لاطاعة لمخلوق فی معصیة الخالق.

(۴۲۹) نماز جنازہ میں تین سے زائد صفوں میں طاق عدد کی رعایت نیز جنازہ کی آخری صف کا اجر

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نماز جنازہ میں اگر صفیں تین سے زائد ہوں تو کیا اس وقت بھی طاق عدد کی رعایت ضروری ہے؟ پانچ یا سات ہوں نیز کیا نماز جنازہ کی آخری صف میں اجر زیادہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ فرض نماز میں پہلی صف کا اجر ہے؟

الجواب حامداًومصلیاً...... بلاشبہ نماز جنازہ میں طاق صفوں کی فضیلت روایات سے ثابت ہے لیکن فقہی کتابوں کی عام عبارتیں تین صفوں تک نشاندہی کرتی ہیں اس لئے اس کی رعایت بہتر ہے۔ اوراسی طرح نماز جنازہ کی آخری صف میں اجر بھی زیادہ ہوتا ہے جیسا کہ فرض نماز میں پہلی صف کا اجر زیادہ ہوتا ہے۔

لمافی جامع الترمذی(۱/۲۰۰): عن مرثد بن عبدالله الیزنی قال کان مالک بن هبیرة اذا صلی علی جنازة فتقال الناس علیها جزاهم ثلثة اجزاء ثم قال قال رسول الله ﷺ من صلی علیه ثلثة صفوف فقد اوجب.

وفی تحفة الاحوذی(۲/۱۴۳): واقل الصف ان یکون اثنین علی الاصح قاله القاری قلت ولاحد لاکثره.

وفی المشکوة(ص۱۴۷): عن مالک بن هبیرة قال سمعت رسول الله ﷺ یقول ما من مسلم یموت فیصلی علیه ثلثة صفوف من المسلمین الا اوجب.

وفی المرقاة (۴/۱۴۹): قال ابن الملک فی شرح الوقایة: ذکر الکرمانی ان افضل الصفوف فی صلاة الجنازة آخرها وفی غیرها اولها اظهاراً للتواضع.

وفی الدر المختار(۲/۲۱۴): وافضل صفوفها آخرها اظهاراً للتواضع.

وفی الشامية(۲/۲۱۴): فلو كان الصف الاول افضل فی الجنازة ايضاً لكان الافضل جعلهم صفاً واحداً ولكره قيام الواحد وحده.

(۴۳۰) نمازِ جنازہ کی آخری صف میں کھڑے ہونے کی فضیلت کی کیا وجہ ہے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جنازہ میں سب سے پچھلی صف میں کھڑے ہونے سے زیادہ ثواب ملتا ہے اور جتنا میت سے دور ہوگا اتنا ہی ثواب زیادہ ملے گا۔ آیا اس بات میں کوئی حقیقت ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو اس کی علت کیا ہے؟ دلائل سے مسئلے کو مزین فرمادیں تو نوازش ہوگی۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... نمازِ جنازہ میں آخری صف افضل ہے کیونکہ اقرب للتواضع ہے۔

لمافی حلبی کبیر (۱/۵۸۸): افضل صفوف الرجال فی الجنازة آخرها وفی غيرها أولها اظهارا للتواضع لتكون شفاعته أدعى للقبول.

وفی الشامية(۲/۲۱۴):وقوله : وافضل صفوفها آخرها الخ كذا فی القنية وبحث فيه فی الحلية بإطلاق مافی صحيح مسلم عنه ﷺ خير صفوف الرجال اولها وشرها آخرها وبأن اظهار التواضع لايتوقف على التاخر : اقول قد يقال ان الحديث مخصوص بالصلاة المطلقة لأنها المتبادرة ولقوله ﷺ من صلى عليه ثلاثة صفوف غفرله رواه ابو داؤد وقال حديث حسن والحاكم وقال صحيح على شرط مسلم ولهذا قال فی المحيط يستحب أن يصف ثلاثة صفوف حتى لو كانوا سبعة يتقدم أحدهم للامامة ويقف وراء ه ثلاثة ثم اثنان ثم واحد فلو كان الصف الاول افضل فی الجنازة ايضا: لكان الأفضل جعلهم صفا واحدا ولكره قيام الواحد وحده كما كره فی غيرها هذا ما ظهرلی.

(۴۳۱) کیا حاضرینِ جنازہ کیلئے نماز جنازہ فرض عین ہے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جنازہ جب مسجد یا جنازہ گاہ میں آجائے تو اس وقت وہاں موجود سب افراد پر اس کا پڑھنا فرض عین ہوجاتا ہے یا پھر صرف بعض لوگوں کا پڑھنا کافی ہے۔ اگر کوئی نمازِ جنازہ میں شریک نہ ہوتو کیا وہ گناہگار ہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... ہر مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حقوق ہیں جن میں سے ایک اس کی وفات پر اس کی نماز جنازہ میں شریک ہونا ہے اور نماز جنازہ فرض کفایہ ہے لہٰذا صورت مسئولہ میں اگرچہ بعض افراد کا نماز جنازہ ادا کرنے سے باقی لوگوں سے فرض ساقط ہوجاتا ہے لیکن حاضرین کیلئے ایک مسلمان کا حق ہونے کی وجہ سے جنازہ میں شریک نہ ہونا مناسب نہیں نیز بعض حضرات نے حاضرینِ جنازہ پر

نماز جنازہ کوفرض عین کہا ہے لیکن یہ قول شاذ ہے۔

لمافی صحیح مسلم(۲/۲۱۳): عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ خمس تجب للمسلم على اخيه ردالسلام وتشميت العاطس واجابة الدعوة وعيادة المريض واتباع الجنائز.

وفی الهندية(۱/۱۶۵): لا ينبغي ان يرجع من جنازة حتى يصلى عليه.

وفی حاشية الطحطاوی علی مراقی الفلاح (ص۴۷۷،۴۷۸): (فرض كفاية) بالاجماع...... والاصل فيه قوله تعالىٰ "وصل عليهم" (التوبة:۱۰۳) وقوله عليه الصلوة والسلام صلوا على كل برٍ وفاجرٍ وانما كانت فرض كفاية لقوله عليه السلام "صلوا على صاحبكم ولو كانت فرض عينٍ ماتركها ولان فی الايجاب ای العينی على الجميع استحالة وحرجاً فاكتفى بالبعض.

وفی الدرالمختار(۲/۲۰۷): والصلاة عليه...... فرض كفاية بالاجماع: الشامية (۱/۵۳۸): وفرض الكفاية معناه فرض ذو كفاية ای يكتفى بحصوله من ای فاعل كان.

وفی تقريرات الرافعی علی رد المحتار(۲/۱۱۹): (قول المصنف فرض كفاية) فی السندی ثم انه قيل كون صلاة الجنازة فرض كفاية مقيد بما اذا لم يكن الناس حاضرين في مجلس الجنازة لانه ذكر في فتاویٰ قاضيخان وظهير الدين والمستصفى قال السيد الامام ناصر الدين واذا لم يكن الناس حاضرين في مجلس الجنازة و لم يعاينوها فالصلاة عليها فرض كفاية واما عند حضورهم ومشاهدتهم فالصلاة واجبة على كل واحد من الناس باداء نفسه لانها حينئذ فرض عين ولا خلاف فيه اصلاً كذا رأيته بخط بعض الفضلاء ونقله الملا على قاری عن فتوی ابی المعالی وهكذا وجدته بها مش المنح وقد طالعت في مختار الفتاویٰ ومتانة الروايات وغيرهما من المعتبرات المتعددة فلم اجد احداً ذكر انها تصير فرض عين على الحاضرين فلتراجع المسئلة وقوله ﷺ "صلّوا على صاحبكم" مع حضوره دليل على عدم افتراضها على كل حاضر اھ. لكن الاولىٰ مراجعة الكتب التی نسب لها القول بالافتراض عند الحضور وقد راجعت فتاویٰ قاضيخان فلم اجد هذه المسئلة فيها.

(۴۳۲) امام پرنمازِ جنازہ کے بعد تدفین تک شریک رہنے اور تقریر کرنے کی شرط لگانا کیسا ہے؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض علاقوں میں خطباء جب نمازِ جنازہ پڑھا لیتے ہیں تو پھراُن کے مقتدیوں کی طرف سے اس کو اجازت نہیں ہوتی، یہاں تک کہ میت دفن ہوجاتی ہے پھراس کے بعد قبر کے ایک طرف پرسورۃ

بقرہ کا پہلا رکوع اور دوسری طرف آخری رکوع پڑھ لیتے ہیں پھر اس کے بعد تقریر کرتے ہیں اور پھر رخصتی ہوتی ہے اگر کوئی اس طرح نہیں کرتے تو وہ اُن کو امام نہیں رکھتے یہاں تک کہ یہ شرائط مان لے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ مقتدیوں کا امام پر یہ الزام صحیح ہے یا نہیں؟ دوسری بات یہ ہے کہ یہ مذکورہ طریقہ صحیح ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......اس طرح کی شرائط لگانا صحیح نہیں ہے، البتہ مذکورہ طریقہ کہ سورۃ بقرۃ کا پہلا رکوع اور آخری رکوع پڑھنا صحیح ہے۔

لمافی الشامیة(۲/۲۳۷): (قوله وجلوس الخ) لمافی سنن ابی داؤد کان النبی ﷺ اذا فرغ من دفن المیت وقف علی قبره وقال: استغفروا لأخیکم واسألو الله له التثبیت فانه الآن یسأل وکان ابن عمر یستحب ان یقرا علی القبر بعد الدفن اوّل سورة البقرة وخاتمتها، اهـ.

(۴۳۳) جنازہ کے بعد صفیں بکھر جانے پر دعا و وعظ وغیرہ کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱)۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جنازہ کے بعد اگر صفوں کو توڑا جائے تو دعا کرنا جائز ہے۔ کیا یہ مسئلہ ان لوگوں کا صحیح ہے، اگر صحیح ہے تو اس کی دلیل بیان فرمائیں، بڑی مہربانی ہوگی۔

(نوٹ)۔ ہمارے علاقوں میں رواج ہے کہ نماز جنازہ کے بعد دعا کا اہتمام کرتے ہیں۔

(۲)۔ میت کو دفن کرنے کے بعد بعض لوگ قبر پر وعظ اور دعا کرتے ہیں۔ اگر ان کا ثبوت ہو، تو مع دلائل ارشاد فرمائیں بڑی نوازش ہوگی۔

(۳)۔ قبر پر سورۃ البقرۃ کے اوائل واواخر کو سراً پڑھنا چاہئے یا جہراً؟ اور اس وقت باقی لوگ بیٹھے ہوں گے یا کھڑے ہوں گے؟ نیز یہ بتائیں کہ اگر سورۃ البقرۃ کے اوائل واواخر کا التزام کسی جگہ شروع ہو جائے تو بدعت تو نہ بنے گی۔ جبکہ احادیث مبارکہ سے ثابت ہے۔

ان تمام صورتوں کو مضبوط دلائل کے ساتھ ارشاد فرمائیں، بڑے مشکور ہوں گے۔

الجواب حامداً ومصلیاً......(۱)۔ نمازِ جنازہ کے بعد دعا کرنا جائز نہیں، بلکہ بدعت ہے۔ خواہ صفوں میں کھڑے کھڑے کی جائے یا صفیں توڑ کر کی جائے۔ اور جو لوگ نمازِ جنازہ کے بعد صفیں توڑ کر دعا کرنے کو جائز کہتے ہیں یہ بالکل غلط ہے۔ فقہاء کرام ومحدثین عظام نے نمازِ جنازہ کے بعد مطلقاً دعا کرنے کو منع فرمایا ہے۔

(۲)۔ میت کو دفن کرنے کے بعد تھوڑی دیر قبر کے پاس بیٹھنا مستحب ہے اور اس وقت قرآن پاک کی تلاوت کرنا اور میت کیلئے دعا کرنا جائز ہے۔ اور اسی طرح اس وقت میں ایسا وعظ کرنے کی بھی گنجائش ہے جو موت اور آخرت کی یاد دلانے کیلئے ہو، اور اس میں دوسرے منکرات اور بدعات کا ارتکاب نہ کیا جاتا ہو۔

(۳)۔ سب سے بہتر اور اچھا طریقہ یہ ہے کہ دفن کرنے کے بعد کوئی میت کے سرہانے سورۃ البقرۃ کے اوائل پڑھے اور دوسرا میت کی

پائنتی (پاؤں کی طرف) سورۃ البقرۃ کے اواخر پڑھے اور باقی لوگوں کو بھی اگر یہ یاد ہوں تو یہی پڑھیں ورنہ جو بھی سورۃ یا آیات ان کو یاد ہوں وہ پڑھیں۔ نیز دفن کرنے کے بعد اگرچہ قبر کے پاس بیٹھنا، دعا کرنا، سورۃ البقرۃ کے اوائل واواخر پڑھنا مستحب ہے لیکن ان امور کا التزام کرنا (یعنی ان کو ضروری سمجھنا) درست نہیں ہے۔ دفن کرنے کے بعد اگر کوئی ان امور کے بغیر جانا چاہے تو اس کیلئے بغیر کراہت کے جانا درست ہے۔

لما مشكوة المصابيح مع مرقاة المفاتيح(۸۰/۴): وعن عمرو ابن العاص قال لابنه وهو فى سياق الموت اذا أنامت فلا تصحبنى نائحة ولا نار فاذا دفنتمونى فشنوا على التراب شنا ثم اقيموا حول قبرى قدر ما ينحر جذور ويقسم لحمها حتى استأنس بكم واعلم ماذا أراجع به رسل ربى رواه مسلم.

وفى المرقاة تحت قوله (ثم اقيموا حول قبرى) لعله للدعاء بالتثبيت وغيره وتحت قوله (حتى استأنس بكم) اى بدعائكم واذكاركم وقراتكم واستغفاركم وقدورد فى خبر أبى داؤد انه عليه الصلاة والسلام كان اذا فرغ من دفن الرجل يقف عليه ويقول استغفر والله لأخيكم واسألوا له التثبيت وفى رواية التثبت فانه الآن يسئل.

وفيه ايضاً(صـ۸۱): وعن عبدالله بن عمر (رضى الله عنهما) قال سمعت النبى ﷺ يقول اذا مات احدكم فلا تحبسوه واسرعوا به الى قبره وليقرأ عند رأسه فاتحة البقرة وعند رجليه بخاتمة البقرة رواه البيهقى فى شعب الايمان وقال والصحيح انه موقوف عليه.

وفى الهندية (۱۶۶/۱): ويستحب اذا دفن الميت ان يجلسوا ساعة عند القبر بعد الفراغ بقدر ما ينحر جزور ويقسم لحمها يتلون القرآن ويدعون للميت كذا فى الجوهرة النيرة. قراءة القرآن عند القبور عند محمد رحمه الله تعالىٰ لا تكره، ومشايخنا رحمهم الله اخذوا بقوله وهل ينتفع والمختار انه ينتفع هكذا فى المضمرات.

وفى الدر المختار(۲۳۶،۲۳۷/۲): ويستحب حثيه من قبل رأسه ثلاثا، وجلوس ساعة بعد دفنه لدعاء وقراءة بقدر ما ينحر الجزور ويفرق لحمه وفى الشامى تحت(قوله وجلوس الخ) لمافى سنن أبى داؤد ((كان النبى ﷺ اذا فرغ من دفن الميت وقف على قبره وقال: استغفر والأخيكم واسألو الله له التثبيت فإنه الآن يسأل)) وكان ابن عمر(رضى الله عنهما) يستحب ان يقرأ على القبر بعد الدفن اول سورة البقرة وخاتمتها ...... وفى الشامية (۳۸۱/۲): وكذا قالوا بسنية قراءة السور الثلاثة فى الوتر مع الترك، احيانا لئلا يعتقد وجوبها.

(۴۳۴) نمازِ جنازہ کے بعد اجتماعی دعا کرنے کا حکم

سوال ...کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض ائمہ مساجد کو دیکھا گیا ہے کہ صلوٰۃ جنازہ کے بعد اجتماعی دعا کرتے ہیں، کیا شریعت میں اس کا کوئی ثبوت ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... جنازہ کی نماز میت کیلئے دعا بھی ہے اس لئے نماز جنازہ کے بعد جنازہ کو روک کر سب کا مل کر دعا مانگنے کا التزام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے ثابت نہیں ہے اور نہ یہ طریقہ سلف صالحین سے ثابت ہے اور ہر وہ کام جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے ثابت نہ ہو، وہ مردود ہے چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ: **من عمل عملاً ليس عليه امرنا فهو رد.** (مسلم شریف ۲/۷۷)

لمافی خلاصة الفتاویٰ (۱/۲۲۵): لايقوم بالدعاء بعد صلوة الجنازة...... الى ولا يقوم بالدعاء فى قراءة القرآن لاجل الميت بعد صلوة الجنازة وقبلها الخ.

وفی فتاویٰ سراجیه(صـ۲۳):ليس فى صلوة الجنازة دعاء موقت اذافرغ من الصلوة لايقوم بالدعاء.

(۴۳۵) میت کو دفن کرنے کے بعد کی دعا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت کو دفن کرنے کے بعد کونسی دعا پڑھنی چاہئے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... میت کو دفن کرنے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مندرجہ ذیل دعا ثابت ہے۔

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَهُ وَارْحَمْهُ وَعَافِهِ وَاعْفُ عَنْهُ وَاَكْرِمْ نُزُلَهُ وَوَسِّعْ مَدْخَلَهُ وَاغْسِلْهُ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ وَنَقِّهِ مِنَ الْخَطَايَا كَمَا نُقِّيَتِ الثَّوْبُ الْأَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ وَاَبْدِلْهُ دَاراً خَيْراً مِنْ دَارِهِ وَأَهْلاً خَيْراً مِنْ أَهْلِهِ وَزَوْجاً خَيْراً مِنْ زَوْجِهِ وَاَدْخِلْهُ الْجَنَّةَ وَاَعِذْهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَعَذَابِ النَّارِ.

لمافی المسلم (۱/۳۱۱): عن عوف بن مالك رضى الله عنه صلى رسول الله ﷺ على جنازة فحفظت من دعائه "اللهم اغفرله وارحمه وعافه واعف عنه واكرم نزله ووسع مدخله واغسله بالماء والثلج والبرد ونقه من الخطايا كما نقيت الثوب الأبيض من الدنس وابدله داراً خيراً من داره وأهلاً خيراً من أهله وزوجا خيرا من زوجه وادخله الجنة واعذه من عذاب القبر ومن عذاب النار".

(۴۳۶) تلقین جہراً کرنا چاہئے یا سراً؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تلقین علی القبر جہراً کرنا چاہئے یا سراً؟ جواب دیکر ثواب۔

دارین حاصل کریں۔

الجواب حامداًومصلیاً...... یہ صراحت تو کہیں نہیں ملی، البتہ فقہاء کے کلام اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ تلقین میں میت کو مخاطب کیا جاتا ہے لہٰذا اتنی اونچی آواز سے تلقین ہو کہ وہ سن سکے۔

لمافی الفقه الاسلامی(۲/۱۵۶۵): ويقعد الملقن عند رأس القبر فيقال له: ياعبدالله ابن أمة الله اذكر ماخرجت عليه من دار الدنيا: شهادة ان لا اله الا الله وان محمدا رسول الله وان الجنة حق والنار حق وان البعث حق و ان الساعة اتية لاريب فيها وان الله يبعث من فى القبور وانک رضيت بالله ربا وبالاسلام دينا وبمحمد نبيا وبالقرآن إما ما وبالكعبة قبلة وبالمؤمنين اخوانا. انتهى. رواه الطبرانى فى الكبير.

(۴۳۷) جنازہ میں شرکت سے تعزیت کی ادائیگی کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تعزیت کیلئے نماز جنازہ کے بعد میت کے اہل خانہ کے پاس جانا ضروری ہے یا صرف نماز جنازہ میں شرکت کر لینے سے تعزیت ادا ہو جاتی ہے۔ دوبارہ اہل میت کے پاس جانا ضروری نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً...... نماز جنازہ اور تعزیت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ نماز جنازہ میت کا حق ہے جبکہ تعزیت میت کے اہل وعیال و عزیز واقارب سے کی جاتی ہے تعزیت کرنا مسنون ہے، تعزیت کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اہل میت کو تسلی دے اور ان کو صبر کی ترغیب اور رضا بالقدر کی تلقین کرے، میت کے لئے مغفرت کی دعا کرے۔ تین دن تک تعزیت کرسکتا ہے اس کے بعد تعزیت نہ کرے ہاں اگر وہ غائب ہے یا اہل میت میں سے کوئی غائب ہے تو پھر تین دن کے بعد بھی تعزیت کرسکتا ہے۔ البتہ جنازہ سے قبل بھی تعزیت کرسکتا ہے مگر جنازہ کے بعد تعزیت کرنا زیادہ بہتر ہے لہٰذا صرف جنازہ میں شرکت سے تعزیت نہیں ہوگی بلکہ اہل میت کے پاس جا کر ان کو تسلی وغیرہ دینے سے تعزیت ہوگی۔

لمافی المشكوة المصابيح(صـ۱۵۱): عن عبدالله بن مسعود قال قال رسول الله ﷺ من عزّى مصابا فله مثل اجره.

وفى مصنف عبدالرزاق(۳/۳۹۲): ان الحسن مرّ بأهل الميت فوقف عليهم فقال اعظم الله اجركم وغفرالله لصاحبكم ثم مضى ولم يقعد.

وفى الشامية (۲/۲۳۹): (قوله: وبتعزية أهله) اى تصبيرهم والدعاء لهم به قال فى القاموس: العزاء الصبر أو حسنه وتعزى.

(صـ۲۴۰) وتستحب التعزية للرجال والنساء اللاتى لايفتن (صـ۲۴۱) (قوله: واولها افضل) وهى

بعد الدفن افضل منها قبله، لأن اهل الميت مشغولون قبل الدفن بتجهيزه ولأن وحشتهم بعد الدفن لفراقه أكثر، وهذا اذا لم يرمنهم جزع شديد والاقدمت لتسكينهم.

(۴۳۸) میت کی تعزیت کیلئے مسجد میں بیٹھنے کے مروجہ طریقے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت کی تعزیت کے سلسلہ میں آج کل عموماً لوگ مسجدوں میں بیٹھتے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ اس طرح تعزیت کے لئے مسجد میں بیٹھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......تعزیت کیلئے مسجد میں بیٹھنا بعض علماء کے نزدیک مکروہ ہے۔

لمافي الهندية(۱/۱۶۷): ولا بأس لاهل المصيبة ان يجلسوا في البيت او في مسجد ثلاثة ايام والناس يأتونهم ويعزونهم......

وفي الدر المختار(۲/۲۴۱): وبالجلوس لهافي غير مسجد ثلاثة ايام......

وفي الشامية: قوله في غير مسجد، امّا فيه فيكره كمافي البحر عن المجتبى، وجزم به في شرح المنية والفتح لكن في الظهيرية لا بأس به لاهل الميت في البيت او المسجد والناس يأتونهم ويعزونهم......

وفي الفقه الاسلامي(۲/۵۴۳،۵۴۴): لا بأس بالجلوس للتعزية في غير المسجد ثلاثة ايام وقال في الفتاوى الظهيرية لا بأس بها لاهل الميت في البيت او المسجد والناس يأتونهم ويعزونهم......

(۴۳۹) معمر عورت کا اپنے اقارب کی قبر پر جانے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی عورت قبرستان میں اپنے شوہر، بھائی، باپ یا بیٹے کی قبر پر جائے اور اس کی عمر تقریباً پچاس (۵۰) سال ہو تو اس عورت کا قبرستان جانا جائز ہے یا نہیں؟ برائے کرم جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں اس عورت کا قبرستان میں جانا جائز ہے بشرطیکہ مروجہ بدعات وغیرہ سے بچی رہے۔

لمافي الشامية(۲/۲۴۲): (قوله ولو للنساء) وقيل تحرم عليهن: والأصح أن الرخصة ثابتة لهن بحر وجزم في شرح المنية بالكراهة لما مرفي اتباعهن الجنازة. وقال الخير الرملي: إن كان ذلك لتجديد الحزن والبكاء والندب على ماجرت به عادتهن فلاتجوز، وعليه حمل حديث "لعن الله زائرات القبور" وإن كان للاعتبار والترحم من غير بكاء والتبرك بزيارة قبور الصالحين فلا بأس

اذا کن عجائز ویکرہ اذا کن شواب کحضور الجماعۃ فی المساجد اھ وھو توفیق حسن.

(۴۴۰) میت کے ایصال ثواب کیلئے دن مقرر کرنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقوں میں پہلے یہ رواج چلا آ رہا تھا کہ میت کے تیسرے دن خیرات وغیرہ کھانا تیار کرتے تھے اور پورے علاقے والوں کی ضیافت کرتے تھے ایصال ثواب کی نیت سے۔ علماء کی بھرپور محنت کی وجہ سے لوگ اس سے باز آ گئے۔ لیکن ابھی تیسرے دن کی جگہ پانچویں دن خیرات کرتے ہیں۔ تو پانچویں دن خیرات کرنا کیسا ہے؟ اور کیا اس کا کھانا درست ہے یا نہیں؟ اگر کوئی امام کھالے تو ان کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟ اور ان کا امام رہنا کیسا ہے؟ اور کیا اس کو امامت سے دور کرنا جائز ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... شریعت مطہرہ نے صدقہ وخیرات کرنے کی بہت رغبت دلائی ہے اور اس میں بہت ثواب بتلایا ہے، اور اعمال صالحہ کا ایصال ثواب کرنے سے میت کے حقوق کی ادائیگی بھی ہوتی ہے۔ لیکن شریعت مطہرہ میں اس کیلئے نہ ہی کوئی خاص دن متعین ہے اور نہ ہی اجتماع وغیرہ کو متعین کیا ہے ہر شخص انفرادی طور پر بھی ایصال ثواب کرسکتا ہے۔ اپنی طرف سے خاص دن متعین کرنا اور اسی دن صدقہ کرنے کو ثواب سمجھنا بدعت ہے پس صورت مسئولہ میں خاص دن متعین کیا گیا ہے اور اسی دن صدقہ کرنے کو ثواب سمجھا جاتا ہے علاوہ ازیں اس میں دوسرے مفاسد بھی ہیں مثلاً اہل بدعت سے مشابہت، بے جا اسراف، ریا ونمود وغیرہ اس لئے یہ بدعت ہے اور اس سے اجتناب لازم ہے۔ جو رسومات أفعال غیر مشروعہ وبدعات پر مشتمل ہوں ان میں شریک ہونا جائز نہیں، لہٰذا جو امام ان رسومات میں ثواب سمجھ کر شریک ہوتا ہے وہ بدعتی ہے اس کو امام بنانا مکروہ ہے۔ متبع سنت شخص کو امام بنایا جائے۔ البتہ جو شخص کبھی کسی عذر یا لاعلمی کی وجہ سے شریک ہوا ہو، اس کو معذور سمجھا جائے۔

لمافی مشکوۃ المصابیح(صـ ۳۱):عن ابراھیم بن میسرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ من وقّر صاحب بدعۃ فقد اعان علی ھدم الاسلام. رواہ البیھقی فی شعب الایمان مرسلا.

وفی ابن ماجہ(صـ۱۱۶):باب ماجاء فی النھی عن الاجتماع الی اھل المیت وصنعۃ الطعام...... عن جریر بن عبداللہ قال کنانری الاجتماع الی اھل المیت وصنعۃ الطعام من النیاحۃ.

وفی الدرالمختار(۱/۵۵۹،۵۶۰):(ویکرہ)...... (إمامۃ عبد)...... (ومبتدع) أی صاحب بدعۃ وھی اعتقاد خلاف المعروف عن الرسول لابمعاندۃ بل بنوع شبھۃ.

وفی الشامیہ(۲/۲۴۰): مطلب فی کراھۃ الضیافۃ من أھل المیت: وقال ایضاً، ویکرہ اتخاذ الضیافۃ من الطعام من أھل المیت لأنہ شرع فی السرور لا فی الشرور، وھی بدعۃ مستقبحۃ. وروی الامام أحمد و ابن ماجہ بإسناد صحیح عن جریر بن عبداللہ قال ((کنا نعدّ الاجتماع الی أھل

المیت وصنعهم الطعام من النیاحة)) اهـ وفی البزازیة ویکره اتخاذ الطعام فی الیوم الأوّل والثالث وبعد الأسبوع ونقل الطعام إلی القبر فی المواسم، واتخاذ الدعوة لقراءة القرآن وجمع الصلحاء والقراء للختم أو لقراءة سورة الأنعام أو الاخلاص. والحاصل أن اتخاذ الطعام عند قراءة القرآن لأجل الأکل یکره. وفیها من کتاب الاستحسان: وإن اتخذ طعاما للفقراء کان حسنا اهـ وأطال فی ذلک فی المعراج. وقال: وهذه الأفعال کلها للسمعة والریاء فیحترز عنها لأنهم لایریدون بها وجه الله تعالیٰ اهـ

(۴۴۱) اگر کسی کی زمین میں بنی قبر کے اوپر بدعات اور رسومات ہونے لگیں تو کیا کریں؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے گاؤں سے تھوڑی دور ایک بڑا درخت ہے جس کے نیچے عرصہ دراز سے ایک قبرنما ڈھیری بنی ہوئی ہے جس کو سب لوگ ''شہید'' کہتے ہیں اس ''شہید'' کے بارے میں پورے گاؤں میں کوئی آدمی ایسا نہیں جو اس کی تاریخ جانتا ہو بس ''شہید'' کے نام سے جانی جاتی ہے اور مشہور ہے۔ اب اس کے اردگرد مٹی گارے کی چھوٹی سی چاردیواری بنی ہوئی ہے اس موجود درخت پر رنگ برنگے بالخصوص سبز رنگ کے کپڑوں کے ٹکڑے لٹکے ہوئے ہیں۔ خشک سالی کے موسم میں لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس شہید پر مٹی کا لیپ کرو، چاول پکاؤ وغیرہ تو پھر بارش ہوگی۔ اب کچھ عرصہ سے اس شہید کے متصل ایک آدمی نے جگہ خریدی ہے اور رہائش رکھی ہے جو کہ بڑے اہتمام سے اس شہید کو سنبھال رہے ہیں۔

یہ جگہ میری نہیں ہے بلکہ ایک حاجی صاحب کی ہے جو کہ بفضل خدا صحیح العقیدہ ہیں تبلیغی جماعت کے ساتھ وابستہ ہیں اور کافی سارا وقت لگا چکے ہیں۔ ذاتی طور پر وہ اس شہید کے حق میں بھی نہیں ہیں۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ میں ان حاجی صاحب کی اجازت سے اس درخت کو مزدوری پر جڑ سے اکھیڑ دوں، یا کسی پر جڑ سے اکھیڑنے کی شرط پر بیچ دوں اور وہ رقم کسی مسجد یا مدرسہ میں دے دوں تو کیسا ہے یہ کوئی گناہ تو نہیں ہوگا؟ یا کوئی اور طریقہ آپ کے ذہن میں ہو تو مہربانی کرکے بتادیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں اس طرح قبر کی تزئین وآرائش کا بندوبست کرنا اور قبر کے پاس جاکر صاحب قبر سے مانگنا، سب ناجائز وحرام ہیں۔ جس شخص کی یہ جگہ ہے اس پر یہ لازم ہے کہ وہ ایسی تمام شرکیہ رسومات کو اس جگہ سے ختم کرے ورنہ اس برائی کا گناہ اس شخص پر ہے جس کی یہ جگہ ہے۔ اور درخت کی مالیت کے متعلق درخت کے مالک کو اختیار ہے چاہے تو وہ اپنے تصرف میں لے آئے یا اس کو کسی مسجد ومدرسہ وغیرہ میں دے دے۔

لمافی عمدة القاری(۱۸۳/۸): ورأی ابن عمر رضی الله عنهما فسطاطاً علی قبر عبدالرحمٰن فقال انزعه یا غلام فإنما یظله عمله. قوله فإنما یظله ای لا یظله الفسطاط بل یظله العمل الصالح فدلّ هذا علی أن نصب الخیام علی القبر مکروه ولا ینفع المیت ذلک ولا ینفعه الا عمله الصالح الذی

قدمه.

وفي مشكوة المصابيح(ص-۴۳۶): عن أبي سعيد الخدري عن رسول الله ﷺ قال من رأى منكم منكراً فليغيره بيده فإن لم يستطع فبلسانه فإن لم يستطع فبقلبه وذلك أضعف الايمان.

وفي الشامية(۲/۲۳۷): أما البناء عليه فلم أر من اختار جوازه...... وعن أبي حنيفة يكره أن يبنى عليه بناء من بيت أو قبة :و نحو ذلك لماروى جابرؓ نهى رسول الله ﷺ عن تجصيص القبور وان يكتب عليها وان يبنى عليها.

(۴۴۲) مجالس تعزیت، اوران میں رُلا دینے والے مضامین کا پڑھنا، نیز شخصیات کی تاریخ وفات پر اجتماع کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

(۱)...... کسی کی وفات کے بعد تین دن تک مجلس تعزیت تو صراحۃً روایات میں ہے۔ تین دن کے بعد مجالس تعزیت کا انعقاد جائز ہے؟ اور کس کی دلیل سے، ۱۴سو سال بعد بھی اگر کسی بزرگ کیلئے مجالس عزاء قائم کی جائیں تو کیا شرعاً کوئی ممانعت کی وجہ ہے؟

(۲)...... تعزیتی جلسوں میں میراثی اور مدحی قصائداور اطراءِ مادح پر مشتمل بیانات سے رُلانا کیا یہ جاہلیت کی مجالس نوحہ کی نشاۃ ثانیہ تو نہیں ہے؟

(۳)...... وفات کی تاریخ پر سوانحی مضامین کا تکرار ہر سال کیا یہ برسی منانے کے حکم میں نہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً...... شریعت مقدسہ میں کسی آدمی کے مرنے پر اس کے ورثاء کو اس بات کی اجازت دی ہے کہ وہ تین دن تک اپنے دکھ اور غم کا اظہار کریں اور تعزیت کیلئے آنے والے لوگوں کی سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے گھر میں بیٹھے رہیں تا کہ آنے والے لوگ بسہولت تعزیت کر کے لوٹ جائیں اوران تین دنوں کے اندر بھی شریعت نے اعتدال کا حکم دیا ہے اور شامیانے لگانے اور دعوت وغیرہ کے اہتمام کو فقہاء نے اقبح القبائح میں شمار کیا ہے اور تین دن کے بعد تعزیت کو نے مکروہ لکھا ہے الا یہ کہ تعزیت کرنے والا یا جس کی تعزیت کی جارہی ہے وہ غائب ہو تو پھر اس کی اجازت ہے لہٰذا تین دن کے بعد تعزیتی مجالس قائم کرنا شریعت سے ثابت نہ ہونے کی وجہ سے درست نہیں۔

(۲)...... جب اوپر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ تعزیتی جلسوں کا انعقاد شریعت محمدی سے ثابت نہیں تو ان جلسوں میں مدحی قصائد پڑھنا یا بیانات کر کے لوگوں کو رُلانا ان کی شناعت وقباحت میں اور اضافہ کر دیتا ہے اور اس کے ذریعے سے رسومات جاہلیت کی یاد تازہ ہوتی ہے لہٰذا ایسے جلسوں کا انعقاد شریعت محمدی کی رُو سے جائز نہیں۔

(۳)...... اگر کسی شخصیت کی وفات کی تاریخ پر سوانحی مضامین اور بیانات میں التزام اور کارِثواب سمجھے بغیر اس کی دینی خدمات کا ذکر کر دیا جائے اور مروجہ خرافات (مثلاً کھانے کا التزام، لوگوں کو اعلان کر کے جمع کرنا، اس کو دین کا حصہ اور کارثواب سمجھنا، اور بعض مقامات پر

مردوزن کا اختلاط وغیرہ) نہ پائی جاتی ہوں تو یہ برسی کے حکم میں نہیں، تاہم اگر اس کو بھی کارِثواب سمجھا جائے اور ایام کا التزام کیا جائے تو یہ بدعت میں داخل ہوگا۔

لما فی تبیین الحقائق (۱/۵۸۹): (فصل) ولا بأس بتعزیة اهل المیت وترغیبهم فی الصبر لقوله علیه الصلوة و السلام من عزا مصاباً فله مثل أجره ویقول له اعظم الله أجرک وأحسن عزاءک وغفرلمیتک ولابأس بالجلوس لها الی ثلاثة ایام من غیر ارتکاب محظور من فرش البسط والاطعمة من أهل المیت لأنها تتخذ عند السرور وعن أنس أنه علیه الصلوة والسلام قال لاعقر فی الاسلام وهو الذی کان یعقر عند القبر بقرة أوشاة.

وفی الفقه الاسلامی (۱۵۷۲/۲): هی ان یسلی أهل المیت ویحملهم علی الصبر بوعد الأجر ویرغبهم فی الرضا بالقضاء والقدر ویدعوللمیت المسلم وتکون الی ثلاثة لیال بایامها وتکره بعدها الا لغائب حتی لایجدد له الحزن ولإذن الشارع فی الاحداد فی الثلاث بقوله ﷺ لایحل لامرأة تؤمن بالله والیوم الاخر ان تحد علی میت فوق ثلاثة ایام الاعلی زوجها أربعة أشهر وعشراً...... وقال الحنفیة لابأس بالجلوس للتعزیة فی غیر المسجد ثلاثة أیام، واولها افضلها وقال فی الفتاویٰ الظهیریة لابأس بها لأهل المیت فی البیت او المسجد والناس یأتونهم ویعزونهم ویکره المبیت عند أهل المیت وتکون التعزیة فی بیت المصاب...... (وبعد صفحة قال) ولابأس کما ذکر الحنفیة برثاء المیت بشعراوغیره لکن یکره الافراط فی مدحه لاسیما عند جنازته لحدیث من تعزی بعزاء الجاهلیة فأعضُوه بِهَن أبیه ولا تکنوا وهذا أمرتأدیب ومبالغة فی الزجر عن دعوی الجاهلیة.

(۴۴۳) خودکشی کرنے والے کی قیامت میں سزا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ خودکشی کرنے والے شخص کی نماز جنازہ پڑھنا ضروری ہے یا نہیں؟ نیز بعض لوگ کہتے ہیں کہ جو خودکشی کرے تو وہ جس طرح اپنے آپ کو مارتا ہے قیامت تک اسی طرح وہ اپنے آپ کو مارتا رہے گا۔ کیا لوگوں کا یہ کہنا شرعاً درست ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... خودکشی کرنا گناہ کبیرہ ہے اور ایسے شخص کے متعلق احادیث مبارکہ کے اندر سخت وعیدیں آئی ہیں چنانچہ احادیث مبارکہ کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان جس طریقے سے خودکشی کرتا ہے جب تک وہ جہنم میں رہے گا اسی حالت میں رہے گا، البتہ خودکشی کرنے والے شخص کو مفتی بہ قول کے مطابق غسل بھی دیا جائے گا اور نمازِ جنازہ بھی پڑھی جائے گی، لیکن علماء، صلحاء اور مقتدا حضرات اس میں شرکت نہیں کریں گے تاکہ دوسرے لوگوں کو تنبیہ ہو، اور اس سے عبرت حاصل کریں۔

لمافی البخاری(١٨٢/١):عن ثابت بن الضحاک عن النبی ﷺ قال من حلف بملة غیر الاسلام کاذباً متعمداً فھو کما قال ومن قتل نفسه بحدیدة عذب بھا فی نار جھنم قال وقال حجاج بن منھال حدثنا جریر بن حازم عن الحسن قال حدثنا جندب فی ھذا المسجد فما نسیناه وما نخاف ان یکذب جندبٌ علی النبی ﷺ قال کان برجل جراح فقتل نفسه فقال اللّٰہ بدرنی عبدی بنفسه حرمت علیه الجنة.

عن ابی ھریرةؓ قال قال النبی ﷺ الذی یخنق نفسه یخنقھا فی النار والذی یطعنھا یطعنھا فی النار.

وفی الدر المختار (٢١١/٢): (من قتل نفسه) ولو (عمداً یغسل ویصلی علیه) به یفتی وان کان اعظم وزراً من قاتل غیره، ورجح الکمال قول الثانی بما فی مسلم ((أنه علیه الصلوة والسلام أتی برجل قتل نفسه فلم یصل علیه))

وفی الشامیة تحته: (قوله به یفتی) لأنه فاسق غیر ساع فی الارض بالفساد وان کان باغیاً علی نفسه کسائر فساق المسلمین زیلعی..............

أقول قد یقال لا دلالة فی الحدیث علی ذلک لأنه لیس فیه سوی انه علیه الصلوة والسلام لم یصل علیه فالظاھر أنه امتنع زجراً لغیره عن مثل ھذا الفعل کما امتنع عن الصلوة علی المدیون ولا یلزم من ذلک عدم صلاة احد علیه من الصحابة اذلا مساواة بین صلاته وصلاة غیره قال تعالیٰ ان صلاتک سکن لھم ثم رأیت فی شرح المنیة بحثاً کذلک.

(٤٤٤) جانتے بوجھتے مرزائی کا جنازہ پڑھانے والے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ معلوم ہونے کے باوجود ''مرزائی'' کا جنازہ پڑھانے والا امام شرعاً فاسق اور قابل معزول ہے یانہیں؟

الجواب حامداًومصلیاً......اس بات کے معلوم ہونے کے باوجود کہ ''مرزائی'' کا جنازہ ہے، پھر بھی اس کی نماز جنازہ پڑھاتا ہے تو ایسا شخص دائرہ اسلام سے خارج ہوجائے گا۔اس کو امام بنانا اور اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں۔

لما فی الشامی(٥٢٣/١): وقد علمت أن الصحیح خلافه، فالدعاء به کفر لعدم جوازه عقلا ولا شرعا ولتکذیبه النصوص القطعیة بخلاف الدعاء للمؤمنین کما علمت، فالحق مافی الحلیة علی الوجه الذی نقلناه عنھا لاعلی مانقله ح فافھم.

(۴۴۵) قبرستان پر چھت اور عمارت بنانے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک خاندان کا ایک قبرستان ہے جس پر چھت بنا رہے ہیں تو قبرستان میں عمارت بنانا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مذکورہ میں اگر میت کے دفن کرنے کے بعد قبر کی مضبوطی کیلئے چھت بنائی جائے ہوتو یہ مکروہ ہے، اور اگر تزیین کیلئے بنائے جاتی ہوتو یہ حرام ہے اور قبرستان میں عمارت چونکہ قبروں ہی کے اوپر بنائی جاتی ہے اس لئے وہ بھی اس حکم میں داخل ہے۔

وفی الهندية(۱/۱۶۶): ويكره ان يبنى على القبر.

وفی الشامية(۲/۲۳۷): (قوله ولا يرفع عليه بناء) اى يحرم لوللزينة ويكره لوللاحكام بعد الدفن.

(۴۴۶) جنازہ گاہ میں وقتیہ نماز پڑھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قبرستان میں ایک جگہ نمازِ جنازہ پڑھنے کیلئے تعمیر کی گئی ہے اس میں نمازِ جنازہ پڑھتے ہیں پھر اسی قبرستان میں دفن کرتے ہیں اگر اس وقت نماز کا وقت داخل ہوجائے تو اسی جگہ فرض نماز باجماعت ادا کر سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... وہ جگہ جو قبرستان میں نماز جنازہ پڑھنے کیلئے مخصوص کی گئی ہو، یا وہ جگہ جو عید کی نماز کیلئے مخصوص کی گئی ہو، نماز پڑھنے کے واسطے مسجد ہی کے حکم میں داخل ہے۔ اور اس میں ضرورتاً وقتیہ نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنا بغیر کسی کراہت کے جائز ہے۔

لمافی طحطاوی على المراقی(ص۲۹۰): وفی زاد الفقير وتكره الصلاة فی المقبرة الا ان يكون فيها موضع اعد للصلاة لانجاسة فيه ولا قذر فيه الخ.

وفی الدر المختار(۱/۶۵۷): (و)اما (المتخذ لصلاة جنازة او عيد) فهو (مسجد فی حق جواز الاقتداء) وان انفصل الصفوف رفقا بالناس (لافی حق غيره) به يفتی الخ.

وفی الشامية (قوله به يفتی نهاية) عبارة النهاية والمختار للفتوىٰ انه مسجد فی حق جواز الاقتداء.

(۴۴۷) نمازِ جنازہ کی فرضیت کب ہوئی؟ حضرت خدیجہ الکبریٰؓ کی نمازِ جنازہ پڑھی گئی تھی یا نہیں؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ نمازِ جنازہ کب فرض ہوئی قبل ہجرت یا بعد ہجرت، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی نمازِ جنازہ پڑھائی گئی یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......نمازِ جنازہ ہجرت کے پہلے سال میں شروع ہوئی اور حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی وفات ہجرت سے پہلے ہوئی تھی تو اس وجہ سے حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھائی گئی تھی۔

لمافی حاشية الطحطاوی علی المراقی (ص٥٧٨): قال الواقدی: لم تكن شرعت يوم موت خديجة، وموتا رضی الله عنها بعد النبوة بعشر سنين علی الأصح.

وفی أوجز المسالک (١٩١/٤): وفی الانوار الساطعة شرعت صلاة الجنازة بالمدينة المنورة فی السنة الاولیٰ من الهجرة فمن مات مكة المشرفة لم يصل عليه اهـ.

وفی البداية والنهاية (جزء٢، ١٢٥/٣): قال عروة بن الزبير وقد كانت خديجةؓ توفيت قبل ان تفرض الصلاة ثم روی من وجه آخر عن الزهری انه قال توفيت خديجةؓ بمكة قبل خروج رسول الله ﷺ الی المدينة وقبل ان تفرض الصلوٰة.اهـ.

(۴۴۸) خلفاءِ راشدین کی نمازِ جنازہ کن کن حضرات نے پڑھائی؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حضرات خلفاءِ راشدینؓ کی نمازِ جنازہ کن کن حضرات نے پڑھائی تھی؟ بحوالہ نقل کریں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......حضرات خلفاءِ راشدینؓ کی نمازِ جنازہ جن حضرات نے پڑھائی تھی ان کے اسماءِ گرامی یہ ہیں:

(١)۔حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے

(٢)۔حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے

(٣)۔حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے

(۴)۔حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی نمازِ جنازہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے پڑھائی تھی۔

وفی تاريخ الخلفاء: وأخرج ابن سعد عن سعيد بن المسيب أن عمر رضی الله عنه صلی علی أبی بكر بين القبر والمنبر وكبّر عليه أربعا. (ص٦٥)

أصيب عمر يوم الأربعاء لأربع بقين من ذی الحجة ودفن يوم الأحد مستهل المحرم الحرام، وله ثلاث وستون سنة ...... وصلی عليه صهيب فی المسجد.(ص١٠٨)

قال قتادة: صلی عليه الزبير ودفنه، وكان أوصی بذلک إليه.(ص١٢٩)

وأقام علیّ الجمعة والسبت، وتوفی ليلة الأحد، وغسله الحسن والحسين، وعبدالله بن جعفر وصلی عليه الحسن. (ص١٣٩)

(۴۴۹) ڈاکوؤں وغیرہ کے ہاتھوں مارے جانے والے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کو مثلاً ڈاکو یا قطاع الطریق شہید کردے یا دو فریقین کی لڑائی میں یہ شخص غلطی سے مارا گیا ہو تو کیا اس پر شہید کے دنیاوی احکام جاری ہوں گے یعنی اس کو غسل اور کفن دیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... صورت مسئولہ میں اگر زید کو ڈاکو یا قطاع الطریق وغیرہ قتل کردیں۔ پھر وہ دنیاوی نفع حاصل نہ کر سکے یعنی کھانا پینا علاج کرنا وغیرہ تو زید پر شہید کے دنیاوی احکام جاری ہوں گے اگر یہ فریقین کی لڑائی میں غلطی سے مارا گیا تو وہ شہید اخروی ہوگا۔

لمافی البخاری (۱/۹۰): عن ابی هريرة ان رسول الله ﷺ قال بينما رجل يمشي بطريق وجد غصن شوك على الطريق فاخره فشكر الله له فغفرله. ثم قال الشهداء خمسة المطعون والمبطون والغريق وصاحب الهدم والشهيد فى سبيل الله.

وفى الفقه الاسلاميه وادلته (۲/۱۵۸۳): فقال الحنفية: الشهيد من قتله اهل الحرب او اهل البغى او قطاع الطريق او اللصوص فى منزله ليلا او نهاراً باى آلة: مثقل او محدد او وجد فى المعركة وبه اثر كجرح وكسر وحرق وخروج دم من اذن او عين او قتله مسلم ظلما عمدا بمحدد وكان مسلما مكلفاً (بالغا عاقلا) طاهرا (خالياً من حيض او نفاس او جنابة) ولم يرتث بعد انقضاء الحرب اى لايموت عقب الاصابة.

وفى الشامية (۲/۲۴۸): (قوله حتى لو وجب الخ) تفريع على مفهوم قوله بنفس القتل، فان المال لم يجب بنفس القتل العمد لان الواجب به القصاص، وانما سقط بعارض وهو الصلح او شبهة الابوة، فلا يغسل فى الرواية المختارة. كمافى الفتح والحاصل انه اذا وجب بقتله القصاص وان سقط لعارض اولم يجب بقتله شئ اصلا فهو شهيد كما علمته اما اذا وجب به المال ابتداء فلا، وذلك بان كان قتله شبه العمد كضرب بعصا او خطا كرمى غرض فاصابه او ماجرى مجراه كسقوط نائم عليه.

وفى ابى داؤد (۲/۴۴۳): جابر بن عتيك اخبره ان رسول الله ﷺ، جاء يعود عبدالله بن ثابت فوجده قد غلب فصاح به رسول الله ﷺ فلم يجبه فاسترجع رسول الله ﷺ وقال غلبنا عليك يا ابا الربيع فصاح النسوة وبكين فجعل ابن عتيك يسكتهن فقال رسول الله ﷺ دعهن فاذا وجب فلا تبكين باكية قالو او ما الوجوب يا رسول الله قال الموت قالت ابنته والله ان كنت لارجوان تكون شهيد افانك قد كنت قضيت جهازك قال رسول الله ﷺ ان الله عزوجل قد اوقع اجره على قدر

نیتہ وما تعدون الشهادة قالوا القتل فی سبیل الله قال رسول الله ﷺ الشهادة سبع سوی القتل فی سبیل الله، المطعون شهید والغرق شهید وصاحب ذات الجنب شهید والمبطون شهید وصاحب الحریق شهید والذی یموت تحت الهدم شهید والمرأة تموت بجمع شهید.

(۴۵۰) سیاسی قائدین وکارکنان اور رافضی، بدعتی وغیرہ کا مارا جانا شہادت ہوگا؟

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سیاسی جماعتوں کے کارکنان وقائدین جو کہ باہم سیاسی چپقلشوں کی بنیاد پر لڑتے ہیں اور بعض اوقات ان میں سے کچھ مارے جاتے ہیں۔ یا اسی طرح کسی کو نامعلوم افراد مار دیتے ہیں۔ تو دریافت طلب بات یہ ہے کہ (۱)...... ایسے مارے جانے والے کیا شہید ہوں گے؟ (۲)...... ان میں جو بے گناہ مارا جائے کیا اس کو بغیر غسل دیئے دفنانا (شہادتِ دنیاوی کے اعتبار سے) جائز ہے؟۔ (۳)...... ان میں جو (رافضی یا بدعتی یا کوئی اور فاسق یا قاتل) مارا جائے۔ کیا وہ بھی شہید ہوگا؟۔ (۴)...... رافضی امامیہ کے جنازے میں یا قبر پر حاضر ہونا جائز ہے؟۔ (۵)...... کیا ایسا شخص کہ جو سراسر (مسلمان مجاہدین کا مخالف اور کفار کا مسلمانوں کے مقابلے میں) ساتھی ہو۔ اس کو کوئی قتل کر دے تو کیا وہ شہید ہوگا؟ اور اس کو قتل کرنے والا کیا گنہگار رہوگا؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... (۱،۲)...... شریعت اسلامیہ میں شہیدِ کامل (دنیاوی واخروی) اس شخص کو کہا جاتا ہے جس میں چھ شرائط پائی جاتی ہوں، (۱) مکلّف ہونا، (۲) مسلمان ہونا، (۳) ظلماً قتل ہونا، (۴) نفسِ قتل سے عوض مالی کا واجب نہ ہونا، (۵) طاہر ہونا، (۶) زخمی ہونے کے بعد کوئی دنیاوی فائدہ نہ اٹھانا۔ لہٰذا جس شخص میں مذکورہ بالا چھ شرائط بیک وقت موجود ہوں وہ شخص شہید کامل کہلائے گا اور اس کا حکم یہ ہے کہ اس کو بغیر غسل دیئے نماز جنازہ پڑھ کر دفن کیا جائے۔

البتہ شہید کی ایک دوسری قسم ہے شہید اخروی، جس کی فقہاء کرام نے ایک طویل فہرست ذکر کی ہے مثلاً مبطون یعنی پیٹ کی بیماری میں مبتلا ہو کر مرنے والا، مطعون یعنی طاعون کی بیماری میں مبتلا ہو کر مرنے والا، غریق پانی میں ڈوب کر مرنے والا، غریب حالتِ سفر میں مرنے والا طالبعلم، حالت جنابت میں مارا جانے والا وغیرہ۔ اس کا حکم یہ ہے کہ غسل بھی دیا جائے گا اور نماز بھی پڑھی جائے گی البتہ آخرت میں یہ لوگ شہادت کا مرتبہ پائیں گے۔

(۳)...... چونکہ شہید کیلئے ایک شرط مسلمان ہونا ہے، لہٰذا جس شخص کے عقائد کفریہ ہوں تو وہ اگر مارا جائے تو وہ شہید نہیں کہلائے گا البتہ مقتول کے بدعتی یا فاسق یا قاتل ہونے سے اس کی شہادت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا اگر چہ اس معصیت کا الگ سے اس کو گناہ ہوگا۔

(۴)...... جس شخص کے عقائد کفریہ ہوں اس کی نماز جنازہ اور قبر پر حاضر ہونا ناجائز ہے۔

(۵)...... مسلمانوں میں سے جو شخص مسلمانوں اور مجاہدین کا مخالف ہو اور دلی طور پر کفار کا ساتھی ہو، اگر چہ وہ مجرم تو ضرور ہے، امام وقت اگر مناسب سمجھے تو اس کو تعزیر کا حق ہے لیکن عام شہری کو یہ حق حاصل نہیں کہ اس کو قتل کر دے اگر قتل کر دیا تو اس پر دنیا میں شہید کے احکام جاری ہوں گے اور قاتل گناہگار رہوگا۔

لما فی الدرالمختار (۲/۲۴۷): (هو کل مکلف مسلم طاهر)...... (ص۲۴۸) (قتل ظلماً) بغیر حق (**بجارحة**) ای بما یوجب القصاص (ولم یجب بنفس القتل مال) بل قصاص ...... (ص۲۴۹) (ولم **یرتث**) فلو ارتث غسل کما سیجئ(وکذا) یکون شهیداً (لوقتله با غ اوحربی اوقاطع طریق ولو) **تسببا** او (**بغیر** آلة جارحة) فان مقتولهم شهید بای الة قتلوه...... (او وجد جریحاً میتاً فی معرکتهم) **المراد** بالجراحة علامة القتل ...... (ص۲۵۰) (ویصلی علیه بلاغسل ویدفن بدمه وثیابه) ...... (**ویغسل** من وجد قتیلاً فی مصر) او قریة (فیما) ای فی موضع(یجب فیه الدیة)...... (ولم یعلم قاتله) **اوعلم ولم** یجب القصاص فان وجب کان شهیداً کمن قتله اللصوص لیلاً فی المصرفانه لاقسامة **ولادیة فیه** للعلم بان قاتله اللصوص غایة الامران عینه لم تعلم فیلحفظ فان الناس عنه غافلون (**اوقتل** بحد او قصاص) (ص۲۵۱) ای یغسل وکذا بتعزیر او افتراس سبع (اوجرح وارتث) ...... (ص ۲۵۲) **وهذا** کله اذا کان (بعد انقضاء الحرب ولوفیها) ای فی الحرب (لا) یصیر مرتثا بشئ **مما ذکر** وکل ذلک فی الشهید الکامل والا فالمرتث شهید الاخرة وکذا الجنب ونحوه.

وفی الفقه الاسلامی وادلته (۲/۱۵۸۸):فالشهداء ثلاثة، شهید فی حکم الدنیا والآخرة: وهو شهید **المعرکة** اما حکم الدنیا فلا یغسل ولا یصلی علیه عند الجمهور کما ابنت واما حکم الاخرة فله **ثواب خاص** وهو الشهید الکامل الشهادة.

وشهید فی حکم الدنیا فقط وهو عند الشافعیة من قتل فی قتال الکفار بسببه وقدغل من الغنیمة **اوقتل مدبراً** او قاتل ریاءً اونحوه ای لایغسل ولا یصلی علیه ولا ثواب له فی الاخرة.

شهید فی حکم الاخره فقط کا لمقتول ظلماً من غیر قتال والمبطون اذا مات بالبطن والمطعون...... **والغریق**، والغریب، وطالب العلم ...... وحکم هؤلاء الشهداء فی الدنیا ای شهداء الاخرة ان الواحد **منهم یغسل** ویکفن ویصلی علیه اتفاقاً کغیره من الموتی اما فی الاخرة فله ثواب الاخرة فقط وله **اجر الشهداء** یوم القیامة.

المعصیة و الشهادة: المعصیة لاتمنع الاتصاف بالشهادة فیکون المیت شهیدا عاصیاً لان الطاعة **لاتلغی المعصیة** الا فی الصغائر قال تعالیٰ ان الحسنات یذهبن السیئات سورة هود (۱۱/۱۱۴).

(۴۵۱) دہشتگردوں کی فائرنگ سے چوکی پر موجود پولیس ملازم قتل ہوگیا، کیا وہ شہید ہے؟

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جو پولیس یا حکومتی ملازم کسی حادثہ میں قتل ہوجاتا ہے

جیسے عام طور پر دہشت گرد آ کر چوکی پر فائر کردیتے ہیں جس کی وجہ سے عام طور پر پولیس والے مرجاتے ہیں تو کیا وہ شہید کے حکم میں داخل ہوں گے یا نہیں، اگر ہوں گے تو کیا حقیقی ہوں گے یا حکمی؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... یہ حقیقی شہید کے حکم میں ہوں گے۔

لما في الهندية(۱/۱۶۸): ومن قتل مدافعا عن نفسه أو ماله أو عن المسلمين أو أهل الذمة بأى آلة قتل بحديد أو حجر أوخشب فهو شهيد.

وفي الدر المختار مع رد المحتار(۲/۲۴۹): (كذا) يكون شهيدا (لوقتله باغ أو حربي أو قاطع طريق ولو) تسببا الخ ...... قال العلامة ابن العابدين تحت (قوله أو قاطع طريق) والمكابرون في المصر ليلا بمنزلة قطاع الطريق كما في البحر عن شرح المجمع، فمن قتلوه ولو بغير محدد فهو شهيد كمالو قتله القطاع، وكذا من قتله اللصوص ليلا كما سيأتي وذكر في البحر أنه زاد في المحيط سببا رابعا وهو من قتل مدافعا ولو عن ذمي فانه شهيد بأى آلة قتل وان لم يكن واحداً من الثلاثة أى ممن قتله باغ أو حربي أو قاطع طريق وقال في النهر: كونه شهيدا وان قتل بغير محدد مشكل جدًا لوجوب الدية بقتله. فتدبره ممعنا النظر فيه اهـ قلت يمكن حمله على ما اذا لم يعلم قاتله عينا، كمالو خرج عليه قطاع طريق أو لصوص أونحوهم.

(۴۵۲) ہندوؤں کے میلوں وغیرہ میں کسی حادثہ کا شکار ہونے والے کی نمازِ جنازہ کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی آدمی اپنے کو قتل کردے یعنی زہر کھا کر مرجائے یا پھانسی پر چڑھ جائے یا کافروں کی طرف سے منعقدہ کسی فنکشن میلہ اور ہندو تہوار وغیرہ میں شرکت کر کے ان کی تماشاؤں میں مشغول ہو کر کسی حادثہ کا شکار ہوگیا اور ان کے رسم ورواج کے مطابق کسی تقریب تہوار وغیرہ میں شامل ہو کر مرگیا اس شخص کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی یا نہیں؟ اگر جمعیت علماء پہلے سے ان لوگوں کے متعلق یہ فیصلہ دے چکا ہے کہ ان کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائیگی تا کہ دوسرے لوگ اس سے پرہیز کریں یعنی عبرت حاصل کریں تو اس کا کیا حکم ہے؟ اگر محلے کے امام مسجد نے اس شخص کا جنازہ پڑھا دیا تو اس امام کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اگر امام کے علاوہ کسی اور نے اس کا جنازہ پڑھا دیا تو اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... ہندوؤں اور غیر مسلموں کے تہواروں اور میلوں میں شرکت کرنا جائز نہیں۔ اگر کوئی شخص ان میلوں میں شرکت کرتے ہوئے کسی حادثے کا شکار ہو کر مرجائے، اسی طرح اگر خودکشی کرے تو اس کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی۔ البتہ ان کی نماز جنازہ میں اگر جید علماء زجراً شرکت نہ کریں تو یہ درست ہوگا۔ جیسا کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خودکشی کرنے والے کی نمازِ جنازہ میں شرکت نہیں کی تھی۔ لیکن جمعیت علماء کا یہ فیصلہ کہ نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی، درست نہیں۔ اس لئے کہ آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ ہر

نیک وبد پرنماز جنازہ پڑھا کرو، اور نماز جنازہ پڑھانے والے امام پر کوئی گناہ نہیں ہوگا اور اس کو جنازہ پڑھانے کا ثواب ملے گا۔

وفی النسائی(۱/۲۱۵): عن جابر بن سمرةؓ أن رجلا قتل نفسه بمشاقص فقال رسول الله ﷺ أما أنا فلا أصلّی علیه.

وفی کنز العمال(۶/۵۴)(حدیث: ۱۴۸۱۵): صلوا خلف کل بروفاجر وصلوا علی کل برّ وفاجر ...... الخ.

وفی اعلاء السنن (۸/۳۷۳): قال النوویؒ: أخذ بظاهره من قال: "لا یصلی علی قاتل نفسه لعصیانه" "وهو مذهب الاوزاعی وأجاب الجمهور: بأنه ﷺ لم یصلّ علیه بنفسه زجراً للناس عن مثل فعله وصلت علیه الصحابة وهذا کما ترک ﷺ فی أوّل الامر الصلاة علی من علیه دین زجراً لهم عن التساهل فی الاستدانة وعن اهمال وفاء ها وأمر أصحابه بالصلاة علیه فقال" صلّوا علی صاحبکم.

وفی الدر المختار(۲/۲۱۱): (من قتل نفسه) ولو (عمداً یغسل ویصلی علیه) به یفتی وإن کان اعظم وزرا من قاتل غیره (وتحته فی الشامیة) أقول: قد یقال: لا دلالة فی الحدیث علی ذلک لأنه لیس فیه سوی أنه علیه الصلوة والسلام لم یصلّ علیه، فالظاهر أنه امتنع زجراً لغیره عن مثل هذا الفعل. کما امتنع عن الصلوة علی المدیون ولا یلزم من ذلک عدم صلوة أحد علیه من الصحابةؓ إذلا مساواة بین صلاته وصلاة غیره.

(۴۵۳) جہاد میں اگر کوئی اپنے فعل کی وجہ سے قتل ہو جائے تو اس کے غسل کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی جہاد میں اپنے ہی اسلحہ وغیرہ سے مارا جائے تو اسے عام میت کی طرح غسل وغیرہ دیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... اسے غسل دیا جائے گا۔

لما فی التاتارخانیة(۲/۱۶۲): ومن قتل نفسه خطأ بان ناول رجلا من العدو لیضربه فاخطأ واصاب نفسه ومات فانه یغسل ویکفن ویصلی علیه.

وفی الهندیة (۱/۱۶۳): ومن قتل نفسه خطأ بان ناول رجلا من العدو لیضربه بالسیف فاخطأ واصاب نفسه، ومات غسل وصلی علیه.

(۴۵۴) میت کے سینے پر انگلی سے کلمہ وغیرہ لکھنے اور قبر میں آیات قرآنیہ رکھنے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت کے چہرے یا سینے پر انگلی سے کلمہ وآیات وغیرہ لکھنا

یا کاغذ پر لکھی ہوئی آیتوں کا قبر میں رکھنا شرعاً کیسا ہے؟ اور اسی طرح جنازہ دفن کرنے کے بعد میت کے گھر پر کوئی پڑوسی یا اس کا رشتہ دار (کڑوی روٹی) کھانا کھلائے جسے کڑوی روٹی کہتے ہیں۔ کیا یہ لوگوں کو کھلانا شرعاً جائز ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً......(۱)۔ میت کے چہرے یا سینے پر بغیر سیاہی کے انگلی کے ساتھ کوئی آیت یا کلمہ وغیرہ لکھنا جائز ہے لیکن اسے ضروری نہ سمجھا جائے۔

(۲)۔ کاغذ پر لکھی ہوئی آیات کا میت کے ساتھ قبر میں رکھنا درست نہیں اس میں قرآن کریم کی بے حرمتی ہے۔

(۳)۔ جب کسی گھر میں فوتگی ہو جائے تو میت کے پڑوسیوں کیلئے مستحب ہے کہ وہ اہل میت کے کھانے کا انتظام کریں اور خود اہل میت کے ساتھ بیٹھ کر انہیں کھلائیں، لیکن آجکل جو عام رواج بن گیا ہے کہ کسی شخص کے انتقال پر اس کا پڑوسی یا کوئی رشتہ دار تمام شرکاء جنازہ کیلئے کھانے کا انتظام کرتا ہے اور اسے لازمی سمجھا جاتا ہے۔ اور سب شرکاء انتظام نہ ہونے کی صورت میں اسے برا سمجھتے ہیں اس کی شرعاً کوئی گنجائش نہیں۔ اور جہاں تک کڑوی روٹی کھلانے کا تعلق ہے تو یہ بدعت قبیحہ ہے اس سے اجتناب کیا جائے۔ البتہ میت کے وہ رشتہ دار جو دور سے آئے ہوں یا ایسے رشتہ دار جن کا اہل میت کے پاس رہنا ضروری ہو، ان کا اہل میت کے ہاں کھانا کھانا درست ہے۔

لمافی فتح القدیر (۱۴۲/۲): **ویستحب لجیران اهل المیت والاقرباء الاباعد تهیئة طعام لهم یشبعهم یومهم ولیلتهم لقوله ﷺ "اصنعوا لأل جعفر طعاماً فقد جاء هم ما یشغلهم...... ولانه بر ومعروف ویلح علیهم فی الاکل لان الحزن یمنعهم من ذلک فیضعفون.**

وفی الشامیة (۲۴۶/۲): تکره کتابة القرآن وأسماء الله تعالیٰ **علی الدراهم والمحاریب والجدوان وما یفرش، وما ذاک الا لاحترامه وخشیة وطئه ونحوه مما فیه اهانة فالمنع هنابا لاولیٰ مالم یثبت عن المجتهد أو ینقل فیه حدیث ثابت. نعم نقل بعض المحشین عن فوائد الشرجی أن مما یکتب علی جبهة المیت بغیر مداد با لاصبع المسبحة. بسم الله الرحمٰن الرحیم. وعلی الصدرک لا اله الا الله محمد رسول الله وذلک بعد الغسل قبل التکفین.**

وفی الشامیة (۲۴۰/۲): ویکره اتخاذ الضیافة **من الطعام من اهل المیت لانه شرع فی السرور لافی الشرور وهی بدعة مستقبحةٌ.**

(۴۵۵) میت کو غسل دیتے وقت ذکر و دعا کرنے کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی مُردوں کو غسل دیتا ہے۔ وہ دورانِ غسل کبھی ذکر واذکار اور وضوء کی دعاؤں کا ورد کرتا ہے۔ اور کبھی چھوڑ دیتا ہے۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ میت کو غسل دیتے وقت غاسل اور اس کے معاونین ذکر واذکار اور دعائیں پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ نیز اگر میت غسل خانے میں ہو تو کیا حکم ہے؟ اور اگر غسل خانے کے علاوہ دوسری

صاف جگہ میں غسل کا بندوبست ہوا ہو تو پھر وہاں کیا حکم ہوگا مذکورہ ذکرواذکار ودعاؤں کا؟ نیز اگر جائز ہو تو پھر غاسل دوسروں کو اس کے پڑھنے کی ترغیب دے سکتا ہے یا نہیں؟ جواب دے کر عنداللہ ماجور ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... شرعاً انسان نجاست کی جگہ میں اور ستر کھلا ہونے کی حالت میں بلند آواز سے ذکرواذکار نہیں پڑھ سکتا ہے مگر دل میں پڑھ سکتا ہے البتہ اگر موضع نجاست نہ ہو، اور کشف عورت بھی نہ ہو تو پھر بلند آواز سے ذکرواذکار پڑھ سکتا ہے۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں میت کو جس جگہ غسل دیا جارہا ہے اگر وہ موضع نجاست نہیں ہے اور نہ میت کو نجاست لگی ہوئی ہے اور نہ ستر کھلا ہوا ہے تو اس صورت میں غاسل اور اس کے معاونین ذکرواذکار ودعاءِ وضو بلند آواز سے پڑھ سکتے ہیں ہاں اگر وہ موضع نجاست ہے یا کشف عورت پایا جارہا ہے تو اس صورت میں دل میں ذکرواذکار ودعاءِ وضو پڑھیں گے اور اگر میت کو غسل خانہ میں غسل دیا جارہا ہے تو پھر بھی یہی حکم ہے کہ نجاست ہونے اور کشف عورت کی صورت میں دل میں ذکر وغیرہ پڑھیں گے نہ ہونے کی صورت میں بلند آواز سے ذکر وغیرہ پڑھیں گے البتہ قرآن شریف کی تلاوت کرنا میت کے پاس بیٹھ کر غسل دینے سے پہلے مکروہ ہے۔

لما في مراقي الفلاح(ص۵۶۴): وتكره قراءة القرآن عنده حتى يغسل تنزيها للقرآن عن نجاسة الحدث بالموت والخبث فانه يزول عن المسلم بالغسل تكريماً له بخلاف الكافر قوله: (عن نجاسة الحدث) ...... والحاصل انهم اختلفوا في نجاسة الميت فقيل نجاسة خبث وقيل حدث ويشهد للثاني ماروينا ه من تقبيله ﷺ عثمان بن مظعون وهو ميت قبل الغسل اذلو كان نجسا وضع فاه الشريف على جسده ولا ينافي ذلك ماذكروه من انه لو حمله انسان قبل الغسل فصلى به لا تصح صلاته وكذا كراهة القراء ة عنده قبل الغسل لجواز ان يكون ذلك لعدم خلوه عن نجاسة غالبا والغالب كالمحقق.

وفي الهندية(۱/۵۰): ويستحب له عند الدخول في الخلاء ان يقول اللهم اني اعوذبك من الخبث والخبائث ...... كذا في التبيين ولا يتكلم ولا يذكر الله تعالىٰ ولا يشمت عاطسا ولا يرد السلام ولا يجيب المؤذن فان عطس يحمد الله بقلبه ولا يحرك لسانه...... كذا في السراج الوهاج.

وفي الدر المختار(۱/۱۰۸،۱۰۹): والبداء ة بالتسمية قولا وتحصيل بكل ذكر...... قبل الاستنجاء وبعده الاحال انكشاف وفي محل نجاسة فيسمي بقلبه.

وفي الشامية(۱۹۴/۲): وذكر . ط. ان محل الكراهة اذا كان قريبا منه اما اذا بعد عنه بالقراء ة فلا كراهة اهـ ...... وتكره قراء ة القرآن في موضع النجاسة كالمغتسل والمخرج والمسلخ وما اشبه ذلك واما في الحمام فان لم يكن فيه احد مكشوف العورة وكان الحمام طاهرا لا باس بان يرفع صوته بالقراءة وان لم يكن كذلك فان قرأ في نفسه ولا يرفع صوته فلا باس به ولا باس بالتسبيح

والتهليل وان رفع صوته ...... فتحصيل من هذا ان الموضع ان كان معدا للنجاسة كالمخرج والمسلخ كرهت القراءة مطلقا والا فان لم يكن هناك نجاسة ولا احد مكشوف العورة فلا كراهة مطلقا وان كان فانه يكره رفع الصوت فقط ان كانت النجاسة قريبة فتامل.

(۴۵۶) عورت کے کفن میں تہبند کو شلوار کی طرح سینے کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کیا عورت کے کفن میں ستر کے اہتمام کیلئے شلوار کی صورت میں ہلکی سی سلا کر کے کفن میں شامل کر سکتے ہیں جبکہ معروف شلوار نہیں بنائے بالکل معمولی سی سلائی کرتے ہیں جو دو تین منٹ میں پوری ہو جاتی ہے کسی بداعتقادی یا رسم کی وجہ سے بھی نہیں ہے صرف ستر کی بناپر سلائی کرتے ہیں۔

الجواب حامداًومصلیاً...... مرد کا مسنون کفن تین کپڑے ہوتے ہیں، اور عورت کا مسنون کفن پانچ کپڑے ہوتے ہیں، ضرورت کے وقت اس میں کمی وبیشی ہوسکتی ہے، اور اسی طرح کفن میں سنت یہ بھی ہے کہ کفن کا عدد ''وتر'' طاق ہو، نہ کہ ''شفعاً'' جفت ہو، اور کفن میں یہ بات بھی مستحب اور افضل ہے کہ کفن زیادہ قیمتی نہ ہو، اور نہ اس میں اسراف ہو، بلکہ ضرورت کے مطابق ہو، اور اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ میت کا کفن زندوں کے لباس کی طرح سلا ہوا نہ ہو، کیونکہ اس سے زینت لازم آتی ہے، البتہ اگر ضرورت ہو تو ضرورت کی وجہ سے سلانا جائز ہے۔ صورت مسئولہ میں اگر یہ ''شلوار جیسا سلا ہوا کپڑا'' ان پانچ کپڑوں میں سے ہو، اور تستر کی خاطر ہو، اور ضرورت بھی ہو تو اس کپڑے کو کفن میں شامل کرنا جائز ہے، اور اگر ان پانچ کپڑوں کے علاوہ ہو، اور ضرورت بھی نہ ہو تو یہ جائز نہیں ہے۔ بلکہ اسراف ہوگا۔

لمافي الشامية(۲/۲۰۲): (قوله ولا بأس بالزيادة على الثلاثة) كذا في النهر عن غاية البيان ونقله قبله عن المجتبىٰ الكراهة لكن قال في الحلية عن الذخيرة معزيا إلى عصام: إنه إلى خمسة ليس بمكروه ولا بأس به اهـ. ثم قال: ووجه بأن ابن عمر كفن ابنه واقدا في خمسة اثواب قميص وعمامة وثلاث لفائف وأدار العمامة إلى تحت حنكه رواه سعيد بن منصور اهـ.

قال في البحر بعد نقل الكراهة عن المجتبىٰ واستثنىٰ في روضة الزندوستي ما إذا وصى بأن يكفن في أربعة أو خمسة فإنه يجوز بخلاف ما اذا اوصى ان يكفن في ثوبين فإنه يكفن في ثلاثة ولو أوصى أن يكفن بألف درهم كفن كفنا وسطا اهـ. قلت: الظاهر ان الإستثناء الذى في الروضة منقطع إذ لو كره لم تنفذ وصيته كما لم تنفذ بالأقل تأمل...... (قوله لحديث الخ) وفي صحيح مسلم عنه ﷺ ''إذا كفن أحدكم اخاه فليحسن كفنه'' وروى ابو داؤد عنه ﷺ ''لا تغالوا في الكفن فإنه يسلب سلبا سريعاً'' الخ.

وفي الشامية(۲/۱۹۸): (قوله اى يكره تحريما) لمافي القنية من أن التزيين بعد موتها والامتشاط

وقطع الشعر لا يجوز نهر، فلو قطع ظفره أو شعره أدرج معه في الكفن قهستاني عن العتابي.......
وايضاً (صـ۲۰۲) (قوله إزار الخ) هو من القرن إلى القدم والقميص من أصل العنق إلى القدمين بلاد خريص وكمين الى قول والدخريص: الشق الذى يفعل فى قميص الحى ليتسع للمشى(قوله وتكره العمامة الخ) هى بالكسر مايلف على الرأس قاموس قال ط: وهى محل الخلاف واما ما يفعل على الخشبة من العمامة والزينة ببعض حلى فهو من المكروه بلاخلاف لما تقدم انه يكره فيه كل ما كان للزينة اهـ.

وفى المحيط البرهانى(۳/۶۴): وقيل معناه يزاد على ما عليه من الشياب ثوب جديد تكرّماً له، وإن كان عليه يبلغ السنة، وينقصون ماشاووا، وإن كان ما عليه يبلغ السنة، ويخيطونه ان شاؤ واكمايفعل ذلك لغيره من الموتى، انما لا يزال عنه اثر الشهادة فأما فيما سوى ذلک فهو كغيره من الموتى...... وايضاً (صـ۲۶) ولنا: حديث ابن عباسؓ، أن النبى ﷺ كفن فى حلة وقميص، والحلة اسم الثوبين عند العرب، ازار ورداء، ولأن اشرف لباس الأحياء القميص، فوجب تقديمه، إلا انه لا يجعل قميصه على هيئة قميص الاحياء فلا يجعل له دخريص، لأن ذلك انما يجعل فى حق الحى ليسع أسفله، فيتيسر له المشى، والميت لا يحتاج إلى ذلك، ولا يكف اطرافه، لأنه ذلك يفعل للحى، ولا حاجة للميت إليه، والأخذ بحديث ابن عباسؓ اولىٰ من الأخذ بحديث عائشةؓ، لان الرجال هم الذين حضروا رسول الله ﷺ.

(۴۵۷) حرم میں جنازہ اندر ہونے کی وجہ اور حرم میں خواتین کا نماز پڑھنا

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض دینی باتیں جو ہمارے یہاں منع ہوتی ہیں لیکن حرم شریف میں لوگ کر رہے ہوتے ہیں، اور علماء بھی اس کی اجازت دیتے ہیں یا منع نہیں کرتے، ایسی ہی ایک دو باتیں ہیں جو آپ سے معلوم کرنی تھیں۔ براہ کرم اگر آسانی اور سہولت ہو تو کرم نوازی فرمادیں۔

(۱)۔ ہمارے یہاں مسجد میں جنازہ رکھ کر نماز جنازہ نہیں پڑھائی جاتی جبکہ حرم میں جنازہ اندر ہی ہوتا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟

(۲)۔ ہمارے یہاں خواتین کو مسجد میں نماز پڑھنے کیلئے آنے سے روکا جاتا ہے جبکہ حرم میں خواتین نماز مسجد حرام میں ہی پڑھتی ہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......(۱)۔ مسجد میں جنازہ رکھ کر نماز پڑھنا مکروہ ہے جیسا کہ ابوداؤد (۲/۴۵۴) میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے مسجد میں جنازے پر نماز ادا کی تو اس کیلئے کوئی ثواب نہیں''۔ اور چونکہ اس میں مسجد کی ناپاکی کا بھی خطرہ رہتا ہے اس وجہ سے احناف نے مسجد میں جنازہ رکھ کر نماز جنازہ پڑھنے کو مکروہ کہا ہے۔ البتہ اگر جنازہ اور کچھ نمازی مسجد

سے باہر ہوں اور باقی نمازی مسجد میں ہوں تو اس صورت میں جائز ہے اور حرم میں جنازہ اندر ہی ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ باہر رکھنے میں حرج عظیم لازم آئے گا اور اس حرج کو دفع کرنے کیلئے جنازہ کو اندر رکھ کر نماز جنازہ پڑھائی جاتی ہے۔

(۲)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں عورتوں کو مسجد میں آنے سے ممانعت نہیں فرمائی بلکہ یہ فرمایا کہ اپنی عورتوں کو مسجد میں نماز پڑھنے سے منع نہ کرو لیکن ساتھ ساتھ یہ حکم بھی دیا کہ عورتوں کیلئے گھر میں نماز پڑھنا بہتر ہے اور گھر میں بھی بالکل پوشیدہ جگہ نماز پڑھنے کا حکم فرمایا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد صحابہ کرامؓ نے عورتوں کے مسجد میں جانے سے متعلق شدت اختیار کی اور فتنے کے خوف سے عورتوں کو منع کیا جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس زمانے کی عورتوں کا حال دیکھ لیتے تو ان کو مسجد میں آنے سے منع فرمادیتے۔ اسی وجہ سے متاخرین نے فتنہ کے خوف سے مطلقاً عورتوں کا مسجد میں نماز پڑھنا مکروہ لکھا ہے البتہ مسجد حرام کے متعلق علماء نے ضرورت کی وجہ سے گنجائش نکالی ہے کہ اگر مسجد حرام یا مسجد نبوی میں عورتیں نماز ادا کریں تو اس میں کراہت نہ ہوگی اور عام طور پر وہاں عورتوں کیلئے نماز پڑھنے کی الگ جگہ متعین ہوتی ہے جہاں عورتیں نماز ادا کرتی ہیں لہٰذا فتنہ کا اندیشہ نہیں ہوتا۔

لمافی سنن ابی داؤد(۲/۴۵۴)(کتاب الجنائز): ...... عن أبی هريرة (رضی الله عنه) **قال قال رسول الله ﷺ من صلی علی جنازة فی المسجد فلا شی له.**

وفيه ايضاً(۱/۸۴): باب ماجاء فی خروج النساء الی المسجد) عن ابن عمر رضی الله عنهما قال قال رسول الله ﷺ **لا تمنعوا نساء كم المساجد وبيوتهن خير لهن.**

وفيه ايضاً(۱/۸۴): عن عبدالله عن النبی ﷺ **قال صلوة المرأة فی بيتها افضل من صلاتها فی حجرتها، وصلاتها فی مخدعها افضل من صلاتها فی بيتها.**

وفی اعلاء السنن(۴/۲۶۲): ......**فيه دلالة علی جواز خروج النساء مطلقاً سواء كن شواب أو عجائز للصلاة فی مسجد الحرام أو مسجد النبی ﷺ وعليه عمل اهل الحرمين اليوم، ولكن ينبغی تقييده بوقت الضرورة كما اذا حضرت المسجد للطواف فی الحج والعمرة فلا بأس لها بأن تصلی فيه وحدها أو جماعة أو حضرت المسجد النبی للتسليم والصلوة علی النبی ﷺ فلا بأس لصلاتها فی المسجد تحية أو مكتوبة واما ان تاتی المسجد الحرام أو المسجد النبوی لاجل الصلوة فحسب فينا فيه قوله ﷺ** "صلاتک فی بيتک خير من صلاتک فی حجرتک" **الی ان قال : "ومن صلاتک فی مسجدی"** والله تعالیٰ اعلم.

وفی الهداية(۱/۸۶): (ويكره لهن حضور الجماعات) يعنی الشواب منهن لمافيه **من خوف الفتنة** (ولا بأس للعجوز ان تخرج فی الفجر والمغرب والعشاء) وهذا عند ابی حنيفةؒ **(وقالا يخرجن فی**

الصلوات كلها) لانه لا فتنه لقلة الرغبة فلا يكره كما في العيد وله ان فرط الشبق حامل فتقع الفتنة غير ان الفساق انتشارهم في الظهر والعصر والجمعة اما في الفجر والعشاء هم نائمون وفي المغرب بالطعام مشغولون.

وفي الدر المختار(۲/۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶): (وكرهت تحريماً) وقيل (تنزيها في مسجد جماعة هو) أي الميت (فيه) وحده أو مع القوم.

(واختلف في الخارجة) عن المسجد وحده او مع بعض القوم (والمختار الكراهة) مطلقاً خلاصة، بناءً على أن المسجد انما بني للمكتوبة وتوابعها كنافلة وذكر وتدريس علم وهو الموافق لا طلاق حديث أبي داؤد "من صلى على ميت في المسجد فلاصلاة له".

وفي الشامية(۲/۲۲۵): (قوله مطلقاً) اى في جميع الصور المتقدمة كمافي الفتح عن الخلاصة وفي مختارات النوازل سواء كان الميت فيه او خارجه هو ظاهر الرواية وفي رواية لايكره اذا كان الميت خارج المسجد(قوله بناء على أن المسجد الخ) أما اذا عللنا بخوف تلويث المسجد فلا يكره اذا كان الميت خارج المسجد وحده او مع بعض القوم قال في شرح المنية: واليه مال في المبسوط والمحيط" وعليه العمل وهو المختار اهـ قلت: بل ذكر غاية البيان والعناية انه لا كراهة فيها بالاتفاق.

(۴۵۸) بم دھماکے میں مرنے والے اہل تشیع کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلّہ میں شیعہ، سنی مختلف مکاتب فکر کے لوگ رہتے ہیں گزشتہ رات شیعوں کے امام بارگاہ میں دھماکہ ہوا جس کی وجہ سے وہاں موجود لوگوں میں دس پندرہ آدمی مرگئے اور اس طرح دو راہ گیر سنی مسلمان بھی مرگئے۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ شیعہ شہید ہوسکتے ہیں یا نہیں؟ اور اسی طرح جو دو مسلمان راہ گیر مرگئے ہیں وہ شہید ہیں یا نہیں؟ ان کو غسل دیا جائے گا یا نہیں؟ تفصیل سے جواب عربی حوالوں کے ساتھ تحریر فرما کر مشکور فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... اللہ تعالیٰ کا مسلمانوں کے ساتھ خصوصی فضل وکرم کا معاملہ ہے۔ کوئی مسلمان بیماری، ایکسیڈنٹ یا کسی حادثہ میں مرجائے تو شہید ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس کی شہادت اخروی ہے دنیا میں شہید کے احکام اس کے نہیں ہیں۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں دھماکہ میں مرنے والے دو سنی مسلمان شہید ہیں۔ البتہ ان کی شہادت اخروی ہے۔ اس لئے شہید کے دنیاوی احکام ان کے لئے نہیں ہیں۔ بلکہ عام اموات کی طرح غسل، کفن وغیرہ دیا جائے گا۔

باقی شیعہ کے متعلق اگر یہ ضروریات دین اور صریح نصوص کے منکر ہیں مثلاً قرآن مجید میں تحریف کے قائل ہیں۔ یا جبریل امین (علیہ

السلام) سے وحی لانے میں غلطی کرنے کا قول کرتے ہیں، یا قذف عائشہ رضی اللہ عنہا کو برحق سمجھتے ہیں، وغیرذلک تو بتصریح فقہاء یہ کافر ہیں۔ جبکہ مرتبہ شہادت مسلمانوں کیلئے ہے کوئی کافر کسی حال میں بھی مرجائے وہ شہید نہیں ہوتا۔

لما في عمدة القاری (۱۲۷/۱۴): (باب الشهادة سبع سوى القتل) اى هذ باب يذكر فيه الشهادة سبع اى سبعة انواع وكونها سبعا باعتبار الشهداء ولهذا جاء فى حديث جابر بن عتيك عن رسول الله ﷺ الشهداء سبعة انواع سوى القتل فى سبيل الله تعالىٰ المطعون شهيد والغريق شهيد وصاحب ذات الجنب والمبطون شهيد والحريق شهيد والذى يموت تحت الهدم شهيد والمراة بجمع شهيد الحديث فى الموطا.

وفى الهندية(۲۶۴/۲): الرافضى اذا كان يسب الشيخين ويلعنهما والعياذ بالله فهو كافر وان كان يفضل عليا كرم الله تعالىٰ وجهه على أبى بكر رضى الله عنه لا يكون كافرا الا انه مبتدع...... إلى قوله ولو قذف عائشة رضى الله عنها بالزنى كفر بالله...... الى قوله من أنكر امامة ابى بكر الصديق رضى الله عنه فهو كافر وعلى قول بعضهم هو مبتدع وليس بكافر والصحيح انه كافر وكذلك من انكر خلافة عمر رضى الله عنه فى اصح الاقوال كذا فى الظهيرية.

وفى الشامية على الدر(۲۳۷/۴): نعم لاشك فى تكفير من قذف السيدة عائشة رضى الله تعالىٰ عنها او انكر صحبة الصديق او اعتقد الالوهية فى على أو ان جبريل غلط فى الوحى، او نحو ذلك من الكفر الصريح المخالف للقران، ويكن لو تاب تقبل توبته.

وفى الفقه الاسلامى وادلته(۱۵۸۳/۲): فقال الحنفية: الشهيد من قتله اهل الحرب او اهل البغى او قطاع الطريق او اللصوص فى منزله ليلا او نهارا باى آلة: مثقل اومحدد او وجد فى المعركة وبه أثر كجرح وكسر وحرق وخروج دم من أذن اوعين أو قتله مسلم ظلما عمدا بمحدد وكان مسلما مكلفا (بالغا عاقلاً) طاهرا (خاليا من حيض او نفاس او جنابة) ولم يرتث بعدا انقضاء الحرب اى لا يموت عقب الاصابة...... إلى قوله وبه تبين ان شروط تحقيق الشهادة عندهم: هى الاسلام والعقل والبلوغ والطهارة من الحدث الاكبر، وان يموت عقب الاصابة.

(۴۵۹) سیلاب، زلزلہ وغیرہ میں مرنے والوں کی شہادت کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ابھی چند دن پہلے بلوچستان میں ضلع زیارت پر جو خوفناک زلزلہ آیا اور اس میں کئی گاؤں تباہ ہوگئے اور بہت سے افراد مرگئے، زید کہتا ہے کہ یہ لوگ چونکہ زیادہ گنہگار تھے اس لئے ان پر یہ

زلزلے آتے ہیں اور یہ ان کی سزا ہے جبکہ عمر کہتا ہے کہ ان لوگوں کو حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ اللہ تعالیٰ کا اس امت پر خاص فضل وکرم ہے کہ ان پر ان کے گناہوں کی وجہ سے اگر عام عذاب آجائے جیسے زلزلہ، سیلاب وغیرہ تو اس سے ان کے گناہ دھل جائیں گے اور اس میں مرنے والوں کی موت شہادت کی موت ہوگی۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ سیلاب، زلزلہ یا دوسری ناگہانی آفات سے جو اموات واقع ہوتی ہیں ان کو شہادت کہنا درست ہے، نیز اس میں مرنے والوں کے غسل اور کفن دفن عام اموات کی طرح ہوگا یا کوئی فرق ہے؟ تفصیلی جواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......شہید کی دو قسمیں ہیں:

شہید کی پہلی قسم یہ ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں میں شہید ہو، اس کی تفصیل یہ ہے کہ وہ مسلمان جو کفار کے ساتھ لڑائی میں شہید ہوجائے یا اس کو ظلماً قتل کیا جائے اور وہ کچھ دنیاوی نفع بھی حاصل نہ کر سکے، اس شہید کا حکم دنیا میں یہ ہے کہ اس کو غسل نہیں دیا جائے گا اور اس کو اپنے خون آلود کپڑوں میں دفن کیا جائے گا البتہ اس سے زائد کپڑے، کوٹ، واسکٹ، اور اسلحہ وغیرہ نکال دیا جائے گا اور آخرت میں اس کو شہید کا درجہ ملے گا۔

شہید کی دوسری قسم وہ ہے جو صرف آخرت میں شہید کہلائے گا اس کی تفصیل یہ ہے کہ وہ مسلمان جو دین کی فکر میں مرجائے یا کسی ناگہانی موت مرجائے ایسے شہید کا حکم دنیا میں یہ ہے کہ اس کو غسل اور کفن دیا جائے گا اور آخرت میں اس کو انشاء اللہ شہید کا ثواب ملے گا، لہٰذا صورت مسئولہ میں زلزلہ سیلاب، اور ناگہانی آفات میں مرنے والوں کو عام مردوں کی طرح غسل اور کفن دیا جائے گا اور ان کو شہداء کہنا درست ہے۔ البتہ رہی زید کی بات کہ یہ لوگ گنہگار تھے اس لئے ان پر زلزلے آئے ہیں تو گناہ شہادت کے منافی نہیں اگر کسی آدمی پر گناہ کی حالت میں شہادت کے اسباب میں سے کسی سبب کی وجہ سے موت واقع ہوجائے تو اس کو شہید کا ثواب ملے گا البتہ اس پر اپنے ناجائز عمل کا گناہ ہوگا۔

لمافی تکملة فتح الملهم(۴۶۲/۳): قوله والشهيد فی سبيل الله! يعنی من قتل مجاهداً فی سبيل الله تعالیٰ، وهذا الأخير هو الشهيد فی احكام الدنيا والاخرة فلا يغسل، ويدفن فی ثيابه بشرط ان لا يكون مرتثا ويلحق به عند الحنفية من قتل ظلماً بجارحة ولم يجب بنفس القتل مال، ومن قتله باغ أو حربی أو قاطع طريق ولو بغير آلة جارحة أو وجد جريحاً ميتاً فی معركتهم كما فی الدر المختار، فهؤلاء كلهم شهداء فی حكم الدنيا والاخرة، وأما الاربعة الاولی فهم شهداء فی أحكام الاخرة دون الدنيا، فيغسلون ويكفنون، ولهم فی الآخرة أجر شهيد، وقد وردت روايات اخری الحقت كثيرا من الانواع بهؤلاء الاربعة فی احكام الاخرة وكونهم مأجورين أجر الشهداء وعدّهم الحافظ ابن حجر عشرين كمامرّ وعدّهم السيوطی نحو الثلاثين، وهی "من مات بالبطن أو الغرق أو الهدم، أو بالجنب...... الخ.

وفی الفقه الاسلامی (۲/۱۵۹۰): والخلاصة، إن کل من مات بسبب مرض أو حادث أو دفاع عن النفس أو نقل من قلب المعرکة حیاً أو مات فی اثناء الغربة أو طلب العلم أو لیلة الجمعة، فهو شهید الاخرة وحکم هولاء الشهداء فی الدنیا، أی شهداء الاخرة، أن الواحد منهم یغسل، ویکفن ویصلی علیه اتفاقاً کغیره من الموتی، أما فی الاخرة فله ثواب الاخرة فقط، وله أجرا الشهداء یوم القیامة.

وفی الشامیة(۲/۲۵۳): (خاتمة) ذکر الأجهوری قال فی العارضة: من غرق فی قطع طریق فهو شهید وعلیه إثم معصیته وکل من مات بسبب معصیة فلیس بشهید، وان مات فی معصیة بسبب من اسباب الشهادة فله أجر شهادته وعلیه إثم معصیته، وکذالک لو قاتل علی فرس مغصوب أو کان قوم فی معصیة فوقع علیهم البیت فلهم الشهادة وعلیهم إثم المعصیة

(۴۶۰) گرمی کی شدت سے مرجانے والے کی شہادت کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ شہید اخروی کی بہت سی اقسام احادیث میں ذکر ہیں کیا وہ شخص جو گرمی کی شدت سے مرجائے وہ شہید اخروی ہے یا نہیں؟ آئے دن یہ سننے میں آتا ہے کہ فلاں شہر میں اتنے افراد گرمی کی شدت سے جاں بحق ہوگئے اور فلاں شہر میں اتنے۔ براہ کرم قرآن وسنت کی روشنی میں جواب سے جلد سرفراز فرمائیے۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... تتبع اور تلاش کے بعد تقریباً پچاس ایسے افراد ملے ہیں جن کو مختلف کتب میں شہداء اخروی کہا گیا ہے اور ان میں اکثر وہ شہداء ہیں جن کا ذکر احادیث میں موجود ہے اور ان تمام شہداء کے مجموعے سے دو اصول سمجھ میں آتے ہیں، ایک اصول یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو کسی دینی فکر میں مرجائے تو وہ شہید ہے جیسا کہ وہ طالب علم جو کہ علم شرعی کی طلب میں مرجائے یا وہ شخص جو اللہ کے راستہ میں بستر پر مرجائے یا وہ شخص جو کہ امت کے فساد کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو مضبوطی سے تھام لے وغیرہ وغیرہ اور دوسرا اصول یہ ہے کہ جو شخص ناگہانی موت مرجائے تو وہ شہید ہے جیسا کہ پانی میں غرق ہوکر مرگیا یا جس کو درندوں نے مار کر قتل کردیا ہو یا وہ شخص کہ جس نے ٹھنڈے پانی سے غسل کیا اور اس کی موت واقع ہوگئی ہو وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں وہ شخص جو کہ گرمی کی شدت سے مرجائے وہ بھی ناگہانی موت میں داخل ہے اور ان شاء اللہ شہید اخروی ہے۔

لمافی فتح الباری(۶/۳۳،۳۴):......ویحتمل أن یکون أراد التنبیه علی ان الشهادة لا تنحصر فی القتل بل لها أسباب أخر وتلک الاسباب اختلفت الاحادیث فی عددها ففی بعضها خمسة وفی بعضها سبعة والذی وافق شرط البخاری الخمسة فنبه بالترجمة علی أن العدد الوارد لیس علی معنی التحدید انتهی...... والذی یظهر انه ﷺ أعلم بالاقل ثم اعلم زیادة علی ذالک فذکرها فی وقت آخر ولم یقصد الحصر فی شئ من ذالک وقد اجتمع لنا من الطرق الجیدة اکثر من عشرین

خصلة فان مجموع ماقدمته مما اشتملت عليه الاحاديث التى ذكرتها أربع عشرة خصلة وتقدم فى باب من ينكب فى سبيل الله حديث أبى مالك الأشعرى مرفوعا من وقصه فرسه أو بعيره أو لدغته هامة أو مات على فراشه على اى حتف شاء الله تعالىٰ فهو شهيد وصحح الدار قطنى من حديث ابن عمر موت الغريب شهادة ولا بن حبان من حديث أبى هريرةؓ من مات مرابطا مات شهيداً الحديث وللطبرانى من حديث ابن عباس مرفوعاً المرء يموت على فراشه فى سبيل الله شهيد وقال ذالك ايضاً فى المبطون واللديغ والغريق والشريق والذى يفترسه السبع والخار عن دابته وصاحب الهدم وذات الجنب ولابى داؤد من حديث ام حرام المائد فى البحر الذى يصيبه القئ له أجر شهيد وقد تقدمت احاديث فيمن طلب الشهادة بنية صادقة انه يكتب شهيداً فى باب تمنى الشهادة ويأتى فى كتاب الطب حديث فيمن صبر فى الطاعون انه شهيد وتقدم حديث عقبة بن عامر فيمن صرعته دابته وانه عند الطبرانى وعنده من حديث ابن مسعود باسناد صحيح ان من يتردى من رؤس الجبال وتأكله السباع ويغرق فى البحار لشهيد عند الله ووردت احاديث اخرى فى أمور اخرى لم أعرج عليها لضعفها قال ابن التين هذه كلها ميتات فيها شدة تفضل الله على أمة محمد ﷺ بان جعلها تمحيصا لذنوبهم وزيادة فى أجورهم يبلغهم بها مراتب الشهداء (قلت) والذى يظهر أن المذكورين ليسو فى المرتبة سواء...... ويتحصل مما ذكر فى هذه الاحاديث ان الشهداء قسمان شهيد الدنيا وشهيد الآخرة وهو من يقتل فى حرب الكفار مقبلاً غير مدبر مخلصاً وشهيد الاخرة وهو من ذكر بمعنى انهم يعطون من جنس أجر الشهداء ولا تجرى عليهم احكامهم فى الدنيا.

وكمافى تكملة فتح الملهم (۳/۲۶۲،۲۶۳)

وكمافى الشامية(۲/۲۵۲)

(۴۶۱) ایکسیڈنٹ میں مرنے والے کی شہادت کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک دینی مدرسہ میں حفظ کررہا ہوں اور چند دن پہلے چھٹی کے موقع پر ہم گھر جارہے تھے کہ رات کو ایک جگہ پر ہماری بس دوسری گاڑی سے ٹکرا گئی اور ایکسیڈنٹ ہوا جس کے نتیجہ میں کافی سارے لوگ زخمی ہوئے اور چند حضرات موقع ہی پر مرگئے اور دو تین آدمی چند دن زخم کے حالت میں رہ کر آخر کار زخموں کی تاب نہ لاسکے اور رخصت ہوگئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ آیا یہ لوگ شہید ہیں یا نہیں؟ نیز ان کو غسل دیا جائے گا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً......صورت مسئولہ میں ایکسیڈنٹ میں فوت ہونے والے افراد صرف آخرت کے اعتبار سے شہید ہیں لہٰذا ان کو غسل

دیا جائے گا اسی طرح عام مُردوں کی طرح کفن اور دفن کا انتظام کیا جائے گا۔

لمافی تکملة فتح الملهم(۳/ ۴۶۲): قوله والشهيد في سبيل الله! يعني من قتل مجاهداً في سبيل الله تعالىٰ، وهذا الأخير هو الشهيد في احكام الدنيا والاخرة فلا يغسل، ويدفن في ثيابه بشرط ان لا يكون مرتثا ويلحق به عند الحنفية من قتل ظلماً بجارحة ولم يجب بنفس القتل مال، ومن قتله باغ أو حربي أو قاطع طريق ولو بغير آلة جارحة أو وجد جريحاً ميتاً في معركتهم كما في الدر المختار، فهو لاء كلهم شهداء في حكم الدنيا والاخرة، وأما الاربعة الاولى فهم شهداء في أحكام الاخرة دون الدنيا، فيغسلون ويكفنون، ولهم في الآخرة أجر شهيد، وقد وردت روايات اخرى الحقت كثيرا من الانواع بهؤلاء الاربعة في احكام الاخرة وكونهم مأجورين أجر الشهداء وعدّهم الحافظ ابن حجر عشرين كمامرّ وعدّهم السيوطي نحو الثلاثين، وهي "من مات بالبطن أو الغرق أو الهدم، أو بالجنب...... الخ.

وفي الفقه الاسلامي (۲/ ۱۵۹۰): والخلاصة، إن كل من مات بسبب مرض أو حادث أو دفاع عن النفس أو نقل من قلب المعركة حيّاً أو مات في اثناء الغربة أو طلب العلم أو ليلة الجمعة، فهو شهيد الاخرة وحكم هولاء الشهداء في الدنيا، أي شهداء الاخرة، أن الواحد منهم يغسل، ويكفن ويصلى عليه اتفاقاً كغيره من الموتى، أما في الاخرة فله ثواب الاخرة فقط، وله أجرا الشهداء يوم القيامة.

وفي الشامية(۲/ ۲۵۳): (خاتمة) ذكر الأجهوري قال في العارضة: من غرق في قطع طريق فهو شهيد وعليه إثم معصيته وكل من مات بسبب معصية فليس بشهيد، وان مات في معصية بسبب من اسباب الشهادة فله أجر شهادته وعليه إثم معصيته، وكذالک لو قاتل على فرس مغصوب أو كان قوم في معصية فوقع عليهم البيت فلهم الشهادة وعليهم إثم المعصية.

(۴۶۲) جو شخص اپنی یا مسلمانوں کی جان ومال کا دفاع کرتے ہوئے مر جائے وہ شہید ہے

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں دو مسلمان جماعتوں کے درمیان لڑائی ہوئی زمین کے سلسلے میں، جن میں ایک جماعت برحق اور مظلوم تھی اور دوسری جماعت بالکل ظالم تھی مظلوم جماعت سے دو آدمیوں کو پتھروں سے قتل کیا گیا اور دونوں جنگ کے موقع پر ہی وفات پاگئے اور نہ کوئی بات کی اور نہ کچھ کیا اور ان میں ایک کا قاتل بھی معلوم ہوا، اور دوسرے کا قاتل معلوم نہیں ہوا بلکہ جماعت کے ہر فرد پر شبہ قتل کیا جاسکتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان ہلاک شدگان میں سے کس کو غسل دیا جائے اور کس کو غسل نہ دیا جائے، تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... جو آدمی اپنی جان، مال، اہل یا مسلمانوں کا دفاع کرتے ہوئے مارا جائے، چاہے کسی بھی آلہ سے ہو، شرعاً شہید ہے۔ جس کا حکم یہ ہے کہ ایسے شہید کو بغیر غسل دیئے نماز جنازہ پڑھا کر دفن کیا جائے گا۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی غسل نہیں دیا جائے گا۔ بلکہ بغیر غسل دیئے نماز جنازہ پڑھا کر دفن کیا جائے۔

لما فی الهندية (۱/۱۶۸): ومن قتل مدافعا عن نفسه أو ماله أو عن المسلمين أو أهل الذمة بای آلة قتل بحديد أو حجر أو خشب فهو شهيد كذا فی محيط السرخسی.

وفيه ايضاً (۱/۱۶۸): وحكمه ان لا يغسل ويصلی عليه كذا فی محيط السرخسی ويدفن بدمه وثيابه كذا فی الكافی.

وفی الشامية (۲/۲۴۹): ومفاده أنه لو كانت إحدى الفرقتين ظالمة للأخرى بأن علموا حالهم لايغسل من قتل من الأخرى وإن جهل قاتله عينا لكونه مدافعا عن نفسه وجماعته تأمل.

(۴۶۳) عدالت کی طرف سے کسی کو ظلماً قتل کرنا

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ محمد اکرم ایک دیندار آدمی ہے پچھلے سال انہوں نے چار مہینے بھی لگائے لیکن اس کا بھائی محمد انور ایک شریر آدمی ہے اور اس نے ایک آدمی کو قتل کیا اور فرار ہو گیا جس کی وجہ سے محمد اکرم کو پولیس نے گرفتار کیا اور جھوٹے گواہوں کی گواہی کی وجہ سے عدالت نے ان کو سزائے موت سنائی جو کہ دو تین دن میں ہونے والی ہے۔ حالانکہ وہ اس قتل میں کسی طرح بھی شریک نہیں تھے۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ عدالت اگر کسی شخص کو ناحق سزا دے، جس کی وجہ سے وہ مر جائے تو وہ شہید ہوگا یا نہیں؟ اور اس کو غسل دیا جائے گا یا نہیں؟ برائے مہربانی جلد از جلد جواب عنایت فرمائیں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... شہید کی تعریف میں وہ شخص داخل ہے جس کو بغیر گناہ اور ناحق قتل کیا گیا ہو، اور جس کا بدلہ اصلاً قصاص ہو نہ کہ دیت۔ صورت مسئولہ میں اگر گواہوں کے ذریعہ ثابت ہو جائے کہ یہ گواہ جھوٹے تھے تو قصاص نہ قاضی پر لازم ہوتا ہے اور نہ ورثاء پر، بلکہ اس صورت میں ورثاء پر دیت لازم ہوگی۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر کسی کو حاکم اور یا قاضی ظلماً قتل کروالے تو اس مظلوم مقتول کو شرعاً شہید اخروی قرار دیا جاتا ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں اس شخص محمد اکرم کو غسل اور کفن دے کر دفن کیا جائے۔

لما فی الهندية (۱/۱۶۷): وهو فی الشرع من قتله أهل الحرب والبغی وقطاع الطريق او وجد فی معركة وبه جرح او يخرج الدم من عينه أو اذنه او جوفه...... او قتله مسلم ظلماً ولم تجب به دية وكذا ان قتله أهل الذمة او المستأمنون.

ولو وجبت الدية بصلح او بقتل الاب ابنه لا تسقط الشهادة لأن الواجب القصاص لكنه سقط بالصلح او الشبهة

ومن قتل مدافعاً عن نفسه او ماله او عن المسلمین او أهل الذمة بأی آلة قتل بحدید او حجر او خشب فهو شهید.

وفی الشامیة(۲/): وفی المعراج عن المجتبی: یشترط عند ابی حنیفة ای فی شبه العمد أن یقصد التأدیب دون الاتلاف.

(۴۶۴) میت کو ایصال ثواب کا مسنون طریقہ

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میت کی وفات کے بعد ایصال ثواب کرنے کا مسنون طریقہ کیا ہے؟

(۲)۔میت کی وفات کے بعد برائے ایصال ثواب جانور وغیرہ ذبح کرنا کیسا ہے؟

(۳)۔بعض جگہوں میں میت کی وفات کے بعد تیجہ، ساتواں، چالیسواں وغیرہ مناتے ہیں، اس کی کیا حیثیت ہے؟

(۴)۔بعض جگہوں میں نماز جنازہ کے بعد پیسے وغیرہ تقسیم کیے جاتے ہیں اس کی کیا حیثیت ہے؟ واضح رہے کہ یہ پیسے وغیرہ رشتہ دار اپنے مال سے ایصال ثواب کے طور پر تقسیم کرتے ہیں اور اس کو لازم بھی نہیں سمجھتے۔

(۵)۔اور نمازِ جنازہ کے بعد دعا کرنا کیسا ہے؟

الجواب حامداً ومصلیاً...... (۱)۔ ہر قسم کی بدنی ومالی عبادت کا ثواب میت کو پہنچانا جائز اور صحیح ہے بلکہ ایک مستحسن امر ہے۔جس کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ کوئی بدنی عبادت یا مالی عبادت کر کے اللہ سے دعا مانگے کہ اے اللہ! میری اس عبادت کا ثواب فلاں کو پہنچادے۔اس طرح دعا مانگنا زبان سے ضروری نہیں۔اگر دل میں نیت کرے تو بھی کافی ہے۔

لیکن واضح رہے کہ امر مباح یا مندوب کو واجب کا درجہ دے کر اس کو لازم سمجھنا یا اس کو کسی خاص وقت یا خاص مکان کے ساتھ مقید کرنا اور اسی کو دین سمجھنا اور نہ کرنے والے پر طعن وتشنیع کرنا، درست نہیں۔اس میں بدعت کی صورت پیدا ہوتی ہے۔جس سے اجتناب ضروری ہے۔

(۲)۔ برائے ایصال ثواب جانور ذبح کرنا بھی درست ہے جبکہ ذبح کرنے والا اپنے مال سے کرے۔اور اگر یہ میت کے ترکہ سے ہو جس میں غائب اور یتیم ورثاء کا حق ہوتا ہے تو پھر جائز نہیں۔البتہ اگر تمام ورثاء بالغ ہوں اور ان میں کوئی غائب نہ ہو، اور وہ خوشی سے ذبح کریں تو پھر درست ہے تاہم کسی مروجہ خاص وقت یا خاص جگہ میں ذبح کرنا بوجہ التزام وغیرہ کے درست نہ ہوگا اس سے احتراز کیا جائے۔

(۳)۔میت کی وفات کے بعد تیجہ، ساتواں، چالیسواں وغیرہ کرنا بدعت ہے۔جس کا ترک کرنا لازم ہے البتہ بلاقید کسی دن اور تاریخ کے جب چاہے برائے ایصال ثواب فقراء کو پیسے دینا یا کھانا کھلانا درست ہے۔

(۴)۔نماز جنازہ کے بعد میت کے رشتہ دار کا اپنے مال سے بطور ایصال ثواب کے پیسے یا چھوارے وغیرہ تقسیم کرنا اور بقول مستفتی اس کو

لازم نہ سمجھنا، اگر چہ درست ہے لیکن ''نماز جنازہ کے بعد'' کی تخصیص سے معلوم ہوتا ہے کہ آگے جا کر یہ بدعت کی صورت اختیار کرسکتا ہے جس کو لازم سمجھا جاسکتا ہے۔اس لئے یہ تخصیص ختم کرنا چاہیے بلکہ اس کے علاوہ جب چاہے بطور ایصال ثواب کے پیسے وغیرہ دے سکتا ہے۔

(۵)۔نماز جنازہ خود دعا ہے اور نماز جنازہ کے بعد دعا کرنا نماز جنازہ میں زیادتی کا شبہ پیدا کرتا ہے اس لئے فقہاء کرام نے نماز جنازہ کے بعد دعا کرنا ممنوع لکھا ہے۔لہٰذا نماز جنازہ کے بعد دعا کرنا بدعت ہے۔جس کا خیر القرون میں کوئی ثبوت نہیں۔

لمافي صحيح مسلم(۲/ ۴۱): عن ابى هريرة ان رجلا قال للنبى ﷺ ان ابى مات وترك مالا ولم يوص فهل يكفر عنه أتصدق عنه قال نعم.

وفى شرح المسلم للنواویؒ(۱/ ۱۲، ۱۳): فان الصدقة تصل الى الميت وينتفع بها بلا خلاف بين المسلمين وهذا هو الصواب...... وذهب جماعة من العلماء الى انه يصل الى الميت ثواب جميع العبادات من الصلاة والصوم والقراءة و غير ذلك وفى صحيح البخارى فى باب من مات وعليه نذران ابن عمر امر من ماتت امها وعليها صلوة ان تصلى عنها الخ.

وفى شرح العقائد(صـ۱۷۲): وفى دعاء الاحياء للاموات وصدقتهم اى صدقة الاحياء عنهم اى عن الاموات نفع لهم اى للاموات ......ولنا ما ورد فى الاحاديث الصحاح من الدعا للاموات خصوصا فى صلاة الجنازة وقد توارثه السلف فلو لم يكن للاموات نفع فيه لما كان له معنى وقال عليه السلام مامن ميت تصلى عليه امة من المسلمين يبلغون مائة كلهم يشفعون الا شفعوا فيه وعن سعد بن عبادة انه قال يا رسول الله ان ام سعد ماتت فاى الصدقة افضل قال الماء فحفر بيرا وقال هذا لام سعد.

وفى الشامية(۲/ ۲۴۳): مطلب فى القراءة للميت واهداء ثوابها له. (تنبيه) صرح علماء نا فى باب الحج عن الغير بان للانسان ان يجعل ثواب عمله لغيره صلاة او صوما او صدقة او غيرها كذا فى الهداية، بل فى زكاة التتارخانية عن المحيط: الافضل لمن يتصدق نفلا ان ينوى لجميع المؤمنين والمؤمنات لانها تصل اليهم ولا ينقص من اجره شئ اهـ هو مذهب اهل السنة والجماعة..... ولهذا اختاروا فى الدعاء: اللهم اوصل مثل ثواب ما قرأته الى فلان، واما عندنا فالواصل اليه نفس الثواب وفى البحر: من صام اوصلى او تصدق وجعل ثوابه لغيره من الاموات والاحياء جاز، ويصل ثوابها اليهم عند اهل السنة والجماعة كذا فى البدائع.

وفى الشامية(۲/ ۲۴۰، ۲۴۱): ويكره اتخاذ الضيافة من الطعام من اهل الميت لانه شرع فى السرور

لافی الشرور، وهی بدعة مستقبحة، وروی الامام احمد وابن ماجة باسناد صحیح عن جریر بن عبدالله قال ((کنا نعد الاجتماع الی اهل المیت وصنعهم الطعام من النیاحة)) اهـ. وفی البزازیة: ویکره اتخاذ الطعام فی الیوم الاول والثالث وبعد الاسبوع ونقل الطعام الی القبرفی المواسم، و اتخاذ الدعوة لقرائة القران وجمع الصلحاء والقراء للختم او لقراءة سورة الانعام او الاخلاص. والحاصل ان اتخاذ الطعام عند قراءة القران لاجل الاکل یکره...... واطال ذلک فی المعراج. وقال: وهذه الافعال کلها للسمعة والریاء فیحترز عنها لانهم لا یریدون بها وجه الله تعالیٰ اهـ.

وفی المرقاة شرح المشکوة(۴/۱۴۹): ولا یدعوا للمیت بعد صلاة الجنازة لانه یشبه الزیادة فی صلاة الجنازة.

وفی البزازیة علی هامش الهندیة(۴/۸۰):لایقوم بالدعاء بعد صلاة الجنائز لانه دعا مرة لان اکثرها دعاء.

وفی الدر المختار (۲/۱۲۰): ......لان الجهلة یعتقدونها سنة او واجبة وکل مباح یؤدی الیه فمکروه.

(۴۶۵) مظاہروں اور ہڑتالوں وغیرہ کے موقع پر مرنے والے پولیس اہلکاروں کا حکم

سوال......کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے یہاں بجلی کی لوڈشیڈنگ کی وجہ سے زمیندار ایکشن کمیٹی کی کال پر مظاہرہ ہوا۔شروع میں مظاہرہ پُرامن طریقہ سے جاری رہا۔تھوڑی دیر بعد مظاہرہ والوں نے تشدد کا راستہ اختیار کیا اور فائرنگ شروع ہوئی اور پولیس نے حالات کنٹرول کرنے کیلئے ہوائی فائرنگ کی جس میں چار، پانچ آدمی مر گئے جن میں دو پولیس والے بھی شامل تھے۔اب پوچھنا یہ ہے کہ یہ لوگ شہید ہیں یا نہیں؟ اور ان کو غسل دیا جائے گا یا نہیں؟ نیز اس طرح مظاہروں ہڑتالوں، انتخابات کے موقع پر یا ڈاکوؤں وغیرہ سے مقابلہ کے دوران جو پولیس والے مرتے ہیں ان کو شہادت نصیب ہوگی یا نہیں؟ تفصیل سے جواب عنایت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں اور عندالناس مشکور ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً......شہادت کی دو قسمیں ہیں دنیوی اور اخروی، شہادتِ اخروی ایسی شہادت کو کہتے ہیں جس میں آخرت میں تو شہیدوں کا ثواب ملتا ہے اور انہیں دنیاوی شہید جیسا اعزاز واکرام کیا جاتا ہے لیکن ان پر شہیدوں کے دنیوی احکام جاری نہیں ہوتے ایسی شہادت پانے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، آگ میں جل کر مرنے والا، مکان کے نیچے دب کر مرنے والا اور اتفاقی حادثے میں مرنے والا انہیں میں داخل ہے۔شہادت دنیوی جس میں دنیا میں بھی شہیدوں کے احکام جاری ہوتے ہیں اور آخرت میں بھی شہیدوں کا ثواب ملتا ہے اس سے مراد ہر وہ مکلّف مسلمان ہے جس کو ظلماً آلہ جارحہ سے قتل کیا گیا ہو، اور وہ قتل موجب قصاص ہو، اور وہ مقتول حدث اکبر سے پاک ہو، اور زخمی ہونے سے لے کر وفات تک زندگی کا کوئی فائدہ مثلاً کھانا پینا دوا کرنا وغیرہ نہ پایا جائے اور جو باغیوں، ڈاکوؤں اور میدان جنگ میں کافروں سے لڑتے ہوئے مارا جائے وہ بھی اسی شہادت دنیوی میں داخل ہے خواہ وہ کسی طرح بھی قتل کریں، اسی طرح وہ

شخص بھی اسی شہید کے حکم میں ہے جو کہ اپنی جان مال یا مسلمانوں کی حفاظت کرتا ہوا مارا جائے، ایسے شہید کا حکم یہ ہے کہ اسے غسل نہ دیا جائے بلکہ ان ہی کپڑوں سمیت نماز پڑھ کر دفن کردیا جائے، لہٰذا صورت مسئولہ میں جو پولیس والے ڈاکوؤں سے مقابلہ کرتے ہوئے مارے جاتے ہیں وہ تو دنیاوی احکام کے اعتبار سے بھی شہید ہیں۔ باقی ہڑتال ومظاہرے وغیرہ اگر جائز حق کیلئے اور ظالم حکومت کو ظلم سے روکنے کیلئے ہوں اور پُر امن مظاہرہ ہو، اس میں کسی کی جان ومال کو نقصان نہ پہنچایا جائے تو چونکہ یہ جائز بلکہ بعض حالات میں ضروری ہوتا ہے اس صورت میں اگر پولیس ان کو روکے تو وہ ظلم کرنے والے ہوں گے اب جو عوام مرجائیں وہ شہید دنیوی ہوں گے اور پولیس والے چونکہ ظالم ہیں اس لئے وہ شہید نہ ہوں گے۔ اور اگر ہڑتال والے شروفساد کریں لوگوں کی جان ومال کو نقصان پہنچایا جائے تو یہ چونکہ جائز نہیں اگرچہ ہڑتال کسی جائز حق کیلئے ہو، اس صورت میں اگر پولیس ان کو روکنے کیلئے لڑائی کرے اور دوران لڑائی پولیس والے مرجائیں تو وہ شہید ہوں گے کیونکہ یہ ظلماً قتل کئے گئے اور مدافع عن نفسہ وعن المسلمین بھی ہیں۔

لما فی تکملة فتح الملهم (۳/۳۲۴، ۳۲۵): وهذا هو الطريق المشروع للضغط على الحكومات في سبيل إقامة شرع الله وتطبيق احكامه واما ما تعلمه الناس من الغرب من الوسائل الضغط على الحكومات كالاضطرابات والمظاهرات وسد الشوارع وسفك الدماء وتخريب العمران فليس من الاسلام في شئ.

وفي الهندية (۱/۱۶۷): وهو في الشرع من قتله اهل الحرب والبغي وقطاع الطريق اووجد في معركةٍ وبه جرح او يخرج الدم من عينه او اذنه اوجوفه او به اثر الحرق او وطئته دابة العدو وهو راكبها او سائقها و كدمته او صدمته بيدها او برجلها او نفروا دابته بضرب او زجر فقتلته او طعنوه فالقوه في ماء اونار او رموه من سور او اسقطوا عليه حائطاً او رموا ناراً فينا او هبت بها ريح الينا او جعلوها في طرف خشب راسها عندنا او ارسلوا الينا ماء فاحترق او غرق مسلم، او قتله مسلم ظلماً ولم تجب به دية.

وفي الدر المختار (۲/۲۴۷): باب الشهيد (هو كل مكلف مسلم طاهر)...... (قتل ظلماً) بغير حق (بجارحة) اى بما يوجب القصاص (ولم يجب بنفس القتل مال) بل قصاص، وكذا يكون شهيدا لو قتله باغ اوحربي اوقاطع طريق ولوتسببا اوبغير اله جارحة فان مقتولهم شهيد بأى آلة قتلوه ....

(۴۶۶) شہید دنیوی میں عدم ارتثاث کی قید کا حدیث سے ثبوت

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ شہید دنیوی کی تعریف میں جو عدم ارتثاث کی قید لگائی جاتی ہے کہ اس شخص نے زخمی ہونے کے بعد موت تک دنیا کا کوئی فائدہ نہ اٹھایا ہو، آیا یہ کسی حدیث سے ثابت ہے اور جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زخمی ہونے کے بعد ارتثاث پایا گیا جیسا کہ حضرت عمرؓ وہ شہید دنیوی نہ ہوں گے؟ نیز کسی روایت سے یہ بات ثابت ہے کہ ان

کوغسل دیا گیا تھا یا نہیں؟

الجواب حامداً ومصلیاً.....شہید دنیوی کی تعریف میں فقہاء کرام جو عدم ارتثاث کی قید لگاتے ہیں یعنی اس نے زخمی ہونے کے بعد موت تک دنیا کا کوئی فائدہ نہ اٹھایا ہو، یہ احادیث سے ثابت ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جو صحابہ کرام شہید ہوئے اور انہوں نے دنیا کا کوئی نفع نہیں اٹھایا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بغیر غسل کے دفن کرنے کا حکم فرمایا جیسے شہدائے احد (صحیح البخاری ۲/۵۸۴)۔ اور جن صحابہ کرام نے شہادت کے بعد دنیا کا کوئی نفع اٹھایا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو غسل دینے کا حکم فرمایا جیسے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ (کتاب المغازی للواقدی ۲/۵۲۵) اسی طرح خلفائے راشدین کے زمانے میں جو شہداء دنیا کا کوئی نفع حاصل کرتے ان کو غسل دیا جاتا جیسے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ۔

پس یہ احادیث اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ غسل دینے اور نہ دینے میں ارتثاث اور عدم ارتثاث کی قید ملحوظ ہے۔ یعنی شہید مرتث کو غسل دیا جائے گا اور شہید غیر مرتث کو غسل نہیں دیا جائے گا۔ لہٰذا جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زخمی ہونے کے بعد ارتثاث پایا گیا ہے وہ شہید دنیوی نہ تھے بلکہ ان کو غسل دیا گیا تھا جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ۔ اور روایات سے ان کو غسل دینا ثابت ہے۔ (جیسے **موطا للإمام مالک رحمه الله (صـ ۴۷۸) مطبع نور محمد، الطبقات الكبرى لابن سعد ۲/۶۷ مكتبه دار الفكر، كتاب المغازى للواقدى ۲/۵۲۵ مؤسسة الاعلمى**)

لمافي صحيح البخاري (۲/۵۸۴): عن ابن شهاب عن عبدالرحمن بن كعب بن مالك ان جابر بن عبدالله اخبره ان رسول الله ﷺ كان يجمع بين الرجلين فى قتلى احد فى ثوب واحد ثم يقول ايهم اكثر اخذا للقران فاذا اشيرله الى احد قدمه فى اللحد وقال انا شهيد على هؤلاء يوم القيامة وامر بدفنهم بدمائهم ولم يصل عليهم ولم يغسلوا.

وفى سنن ابى داؤد (۲/۴۴۷): عن ابن عباس قال امر رسول الله ﷺ بقتلى احد ان ينزع عنهم الحديد والجلود وان يدفنوا بدمائهم وثيابهم.

وفى المؤطا للامام مالك رحمه الله (صـ۴۷۸): مالك عن نافع عن عبدالله بن عمر ان عمر بن الخطاب غسل وكفن وصلى عليه وكان شهيدا يرحمه الله.

وفى الطبقات الكبرى لابن سعد (۲/۶۷): وبعث الاشعث بن قيس ابنه قيس بن الاشعث صبيحة ضرب علىّ عليه السلام فقال: اى بنىّ انظر كيف اصبح امير المؤمنين. فذهب فنظر اليه ثم رجع فقال: رايت عينيه داخلتين فى راسه، فقال الاشعث: عينى دميغ ورب الكعبة، قال ومكث علىّ يوم الجمعة وليلة السبت وتوفى، رحمة الله عليه وبركاته، ليلة الاحد لاحدى عشرة ليلة بقيت من شهر رمضان سنة اربعين، وغسله الحسن والحسين وعبدالله بن جعفر، وكفن فى ثلثه اثواب ليس فيها قميص.

وفی کتاب المغازی للواقدی (۵۲۷/۲): قالوا: ثم امر رسول الله ﷺ ان یغسل، فغسله الحارث بن اوس بن معاذ، واسید بن حضیر، وسلمة بن سلامة بن وقش یصب الماء، ورسول الله ﷺ حاضر، فغسل بالماء الاولیٰ، والثانیة بالماء والسدر، والثالثة بالماء والکافور، ثم کفن فی ثلاثة اثواب صحاریة وادرج فیها ادراجا، واتی بسریر کان عند ال سبط، یحمل علیه الموتی، فوضع علی السریر.

(۴۶۷) بیٹھی ہوئی قبر کی مرمت کا حکم

سوال...... کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ہاں کراچی میں میت کو قبر میں دفنانے کیلئے شق کا طریقہ رائج ہے، قبر کو بند کرنے کیلئے ٹائلیں استعمال کی جاتی ہیں۔اس صورت میں اگر کوئی قبر عرصہ تقریباً ایک سال کے بعد بوجہ بارش کے مکمل طور پر بیٹھ جائے۔یہاں تک کہ قبر کے اوپر جو ٹائلیں رکھی گئی تھیں وہ بھی قبر کے اندرونی شق میں چلی جائیں،اب اس صورت میں قبر کی مرمت کی کیفیت کیا ہوگی؟ آیا جو مٹی قبر کے اندر چلی گئی اور قبر کا گڑھا تقریباً مٹی سے بھر چکا ہے اس مٹی کو نکال کر قبر کی مرمت کی جائے گی یا مزید مٹی ڈال کر اسے قبر کی صورت دے دی جائے؟ جبکہ یہ ساری مٹی میت کے اوپر ہی گری ہوئی ہے۔شرعاً جو بھی صحیح طریقہ اور کیفیت ہو بیان فرما کر ممنون ومشکور ہوں۔

الجواب حامداً ومصلیاً...... میت کو دفنانے کے بعد دوبارہ اس کو نکالنا حرام ہے۔لہٰذا مزید مٹی ڈال کر قبر کی مرمت کی جائے۔

لمافی الفتاویٰ الولوالجیة (۱/ ۱۶۸): واذا دفن المیت لغیر القبلة ورأسه فی أسفله ونصب اللبن ولم یهل التراب علیه نزع اللبن وسوی، وإن هالوا علیه التراب لم ینبش لان النبش حرام لمکان هذه الأفعال. والنبش إنما یکون بعد تمام الدفن وتمام الدفن إنما یکون بعد إهالة التراب علیه.

وفی کتاب التجنیس والمزید (۲/ ۲۷۹): المیت بعد ما دفن مدة طویلة أو قلیلة لایسع إخراجه من غیر عذر، ویجوز إخراجه بالعذر، والعذر أن یظهر أن الأرض مغصوبة أو أخذها الشفیع بالشفعة.

وفی الدر المختار (۲/ ۲۳۷، ۲۳۸): (ولایخرج منه) بعد إهالة التراب (إلا) لحق آدمی

وفی الشامیة تحته: (قوله الا لحق آدمی) احتراز عن حق الله تعالیٰ کما إذا دفن بلا غسل أ وصلاة أو وضع علی غیر یمینه أو إلی غیر القبلة لاینبش علیه بعد اهالة التراب.

وفی حاشیة الطحطاوی علی مراقی الفلاح (صـ ۶۱۵): وأما الثالث إذا غلب الماء علی القبر فقیل یجوز تحویله لما، روی أن صالح بن عبید الله رؤی فی المنام وهو یقول: حولونی غن قبری فقد آذانی الماء ثلاثا، فنظروا فإذا شقه الذی یلی الماء قد اصابه الماء فأفتی ابن عباس رضی الله عنهما بتحویله، وقال الفقیه أبو جعفر یجوز ذلک أیضاً ثم رجع ومنع.

یادداشت

یادداشت

یادداشت

یادداشت

یادداشت